اظہارِ دین

عصری اسلوب میں اسلام کا علمی اور فکری مطالعہ



مولانا وحید الدین خاں

اظہارِ دین

عصرِ حاضر میں اسلام کا علمی اور فکری اظہار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اظہارِ دین

عصرِ حاضر میں اسلام کا علمی اور فکری اظہار

Izhar-e-Deen (Urdu)
First published 2014
This book is copyright free

Goodword Books
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
e-mail: info@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Printed in India

فہرست

باب سوم

آغازِ کلام

دورِ جدید میں اسلام کی تشریح وتعبیر کے دو خاص موضوعات ہیں- ایک وہ ہے جس کو اثباتِ اسلام کہا جاسکتا ہے، یعنی اسلام کی تعلیمات کو عقلی دلائل کی روشنی میں ثابت شدہ بنانا- موجودہ زمانے میں عقلی استدلال کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، اِس لیے آج کے انسانی ذہن کو ایڈریس کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلّمہ عقلی دلائل کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کو واضح کیا جائے- اِس موضوع پر راقم الحروف کی متعدد کتابیں ہیں- اُن میں سے ایک کتاب وہ ہے جو اوّلاً مذہب اور جدید چیلنج کے نام سے چھپی تھی- بعد کو یہ کتاب مختلف عالمی زبانوں میں شائع ہوئی- عربی زبان میں اِس کتاب کا نام 'الإسلام یتحدی' ہے اور انگریزی میں اس کا نام گاڈ ارائزز (God Arises) ہے-

دورِ جدید کی نسبت سے، اسلام کی جو تشریح وتعبیر کرنا ہے، اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو توجیہِ اسلام کہا جاسکتا ہے، یعنی اسلام کی تعلیمات کی عقلی تبیین (rational interpretation of Islam)- زیر نظر کتاب اسلام کے اِسی دوسرے پہلو سے تعلق رکھتی ہے- اِس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کی اصل آئڈیالوجی کو اِس طرح واضح کیا جائے کہ وہ آج کے ذہن کے لیے قابلِ فہم (understandable) ہوسکے-

وحیدالدین

نئی دہلی، 20 دسمبر 2013

باب اول

خدا کی طرف

کہا جاتا ہے کہ حجری دور (stone age) میں ایک بار ایسا ہوا کہ دو آدمی کسی بات پر غصہ ہو گئے۔ وہ ایک دوسری کے طرف پتھر پھینکنے لگے۔ اتفاق سے ایک شخص کا پتھر دوسرے شخص کے پتھر سے ٹکرا گیا۔ اُس وقت دو پتھر کے ٹکرانے سے اسپارکنگ (sparking) ہوئی۔ پتھر سے ایک چنگاری نکلی۔ اِس چنگاری کو دیکھ کر دونوں آدمی اپنا غصہ بھول گئے۔ دونوں آدمی اپنے اپنے پتھر کو لے کر اس کو دیکھنے لگے، تاکہ وہ چنگاری کا راز دریافت کریں۔

کہا جاتا ہے کہ یہی وہ واقعہ ہے جہاں سے سچائی کی تلاش کا آغاز ہوا۔ لوگ اِس سوال پر غور کرنے لگے کہ کیا یہاں انسان اور مادہ (matter) کے سوا کوئی اور طاقت موجود ہے۔ یہ سوال دھیرے دھیرے خدا کے تصور تک پہنچا۔ یہ سیکولر مفکرین کا نظریہ ہے۔ مگر اسلام کا تصور یہ ہے کہ پہلے انسان (آدم) ہی سے خالق کے وجود کا تصور انسان کے علم میں آچکا تھا۔ پتھر کے ٹکرانے کا واقعہ اگر درست ہو تو یہ فطرت کے قانون کو تلاش کرنے کا آغاز تھا، نہ کہ خدا کو تلاش کرنے کا آغاز۔ ہر پیغمبر نے یہی بتایا کہ اِس عالمِ موجودات کا ایک خدا ہے اور انسان کو چاہیے کہ وہ اُسی خدا کو اپنا معبود بنائے اور اُسی کی عبادت کرے۔

قرآن اِس پیغمبرانہ الہام کا ایک محفوظ و مستند مجموعہ ہے۔ قرآن کی سورہ الذاریات میں انسان کے مقصد تخلیق کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ** (51: 56) یعنی میں نے جن کو اور انسان کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عبداللہ بن عباس کا قول ہے کہ اِس آیت میں **لیعبدون** سے مراد **لیعرفون** ہے، یعنی اِس آیت میں، اللہ کی عبادت سے مراد اللہ کی معرفت حاصل کرنا ہے۔

خدا کی معرفت کیا ہے۔ خدا اِس کائنات کا خالق ہے۔ اُس کی معرفت یہ ہے کہ تخلیق میں خالق کو دریافت (discover) کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیق اپنے آپ میں خالق کا مکمل تعارف ہے۔ ہمیشہ انسان تخلیق میں خالق کو دیکھتا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں نیچر کے بارے میں سائنس کی

دریافتوں نے تعارف کے اِس دائرے کو ہزاروں گنا زیادہ حد تک بڑھادیا ہے۔

یہاں اس سلسلے میں ایک بنیادی پہلو کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اِس بنیادی پہلو کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ خدا کے بارے میں انسان کا مطالعہ اس کو یقین کے بجائے کنفیوژن تک پہنچادے، وہ خدا کی طرف سفر کرتے ہوئے کسی غیر خدا کی منزل تک پہنچ جائے۔

موجودہ زمانے میں سائنس کے حوالے سے خدا کے وجود (existence of God) کو ثابت کرنے کے لیے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً:

Nature and Science Speaks about God

The Evidence of God in an Expanding Universe

اللہ یتجلی فی عصر العلم (انگریزی سے ترجمہ)

مگر سائنس کے بارے میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ سائنس کامل علم کا نام نہیں۔ سائنس اپنی دریافتوں کے باوجود جہاں تک پہنچی ہے یا پہنچ سکتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر صرف جزئی علم دے سکے۔ اِس حقیقت کو جے این سلیون (JN Sullivan) نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی دریافت کا سفر بنیادی طور پر دو مرحلوں میں طے ہوتا ہے۔ پہلا مرحلہ وہ ہے جو عقلی غور وفکر اور سائنسی معلومات کے ذریعے طے ہوتا ہے۔ یہ ذریعہ بلاشبہہ نہایت اعلیٰ ذریعہ ہے۔ لیکن وہ اپنے آخری درجے میں بھی ایک مسافرِ حق کو جہاں پہنچاتا ہے، وہ صرف احتمال (probability) ہے، یعنی — امکانی طور پر یہاں ایک خدا کا وجود ہے:

Probably there is a God.

یہاں احتمال (probability) سے مراد سادہ طور پر صرف احتمال نہیں ہے، بلکہ اُس سے مراد اعلیٰ عقلی احتمال ہے۔ اعلیٰ عقلی احتمال کو دوسرے لفظوں میں شِبہِ یقین (semi-conviction) کہا جاسکتا ہے۔ احتمال کا یہ مقام وہ مقام ہے جہاں آدمی شک (doubt) کے لمبے راستے کو طے کرکے آخر کار پہنچتا ہے۔ یہ احتمال دراصل درمیان کا ایک مقام ہے۔ اس کے پیچھے کی طرف شک ہوتا ہے

اور آگے کی طرف یقین۔ مگر یہ احتمال اتنا زیادہ قوی ہوتا ہے کہ اب شک کی طرف دوبارہ واپسی اس کے لیے ممکن نہیں ہوتی۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ وہ آگے یقین (conviction) کی طرف بڑھے۔

ایسا ایک آدمی جب پیچھے کی طرف راستہ بند پاکر آگے کی طرف جانا چاہتا ہے تو آگے کی طرف ایک قدم بڑھاتے ہی اس کو ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ اچانک اس کو محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر وجدان (intuition) کی سطح پر معرفت کا ایک نیا دروازہ کھل گیا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ جس علم کا ادراک اب تک مجھے خارجی معلومات (external data) کے ذریعے ہو رہا تھا، اُس علمی معرفت تک اب میری براہِ راست رسائی ہوگئی ہے۔ جس علم کو اِس سے پہلے میں اپنی خارجی بصارت (objective observation) کے ذریعے جاننے کی کوشش کر رہا تھا، وہ علم اب میرے لیے داخلی بصیرت (inner perception) کا حصہ بن گیا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ عقلی غور وفکر کی حد خلا (vacuum) پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ اس کے بعد فوراً دریافت کا ایک نیا دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہ وجدان کا دروازہ ہے۔

آدمی کے اندر بیک وقت دو صفتیں ہیں — عقل (reason)، اور وجدان (intuition)۔ عقل کسی مجہول چیز کا نام نہیں۔ اِسی طرح وجدان بھی کسی مجہول چیز کا نام نہیں۔ باعتبار واقعہ دونوں ہی مسلّمہ حقائق پر مبنی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عقل خارجی حقائق کی بنیاد پر کام کرتی ہے، جب کہ وجدان براہِ راست طور پر داخلی حقیقت سے جڑا ہوا ہے۔ عقل جس چیز کو خارجی شواہد کے ذریعے معلوم کرتی ہے، وجدان اُسی چیز کو داخلی فطرت کے ذریعے جان لیتا ہے۔ عقل کا سفر زمان ومکان تک محدود ہے، لیکن وجدان کا سفر زمان ومکان سے باہر (beyond time & space) تک وسیع ہے۔

احتمال سے یقین تک پہنچنے کا یہ معاملہ کسی خوش فہمی (wishful thinking) پر مبنی نہیں، وہ تمام تر علم کے اوپر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایک شخص پوری سنجیدگی کے ساتھ احتمال کے درجے تک پہنچتا ہے تو وہ اُس کے لیے ایک ایسا فطری واقعہ ہوتا ہے جو اُس انسان کے ساتھ لازماً پیش آتا ہے جو حقیقی معنوں میں احتمال کے مقام تک پہنچ گیا ہو۔

یہاں یہ سوال ہے کہ وجدان کے ذریعے حاصل ہونے والے علم کو کیوں کر مستند علم سمجھا جائے۔

اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جس آدمی کے اوپر وجدان کا یہ دروازہ کھل جائے، وہ اپنی داخلی بصیرت کے تحت ایسی باتوں کو جاننے لگتا ہے جس کا علم اُس کو پہلے حاصل نہ تھا۔ بعد کو خارجی حقائق بالواسطہ طور پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ اُس کو اپنے وجدان کے ذریعے جو علم حاصل ہوا تھا، وہ ایک حقیقی علم تھا، وہ کوئی فرضی واہمہ نہ تھا۔ راقم الحروف کو ذاتی طور پر بار بار اِس کا تجربہ ہوا ہے۔

موجودہ زمانے میں سائنسی طریقہ (sientific method) کو مستند طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ کسی چیز کو دریافت (discover) کرنے کے لیے سائنس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ — پہلے مفروضہ، اس کے بعد مشاہدہ، اور پھر تصدیق:

Hypothesis, Observation, Verification

اِس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ایک سوچنے والے دماغ میں ایک تصوراتی مفروضہ آتا ہے۔ اس کے بعد وہ متعلق شواہد کی تحقیق کرتا ہے۔ اگر یہ شواہد اس کے مفروضہ کی تصدیق کریں تو اس کے بعد اس کا مفروضہ ایک مسلّمہ حقیقت بن جاتا ہے۔ یہی معاملہ وجدان کے ذریعہ دریافت ہونے والی حقیقت کا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوتا ہے کہ پہلے ایک سچے متلاشی (true seeker) کے دماغ میں ایک تصور آتا ہے۔ اِس کے بعد وہ متعلقہ حوالوں (relevant reference) کی روشنی میں اس کی مزید تحقیق کرتا ہے، یہاں تک کہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اس کا مفروضہ درست تھا۔

راقم الحروف کو اپنی تلاش کے دوران بار بار ایسے تجربات پیش آئے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ صوفیا کے حلقے میں ایک قول کا حدیثِ قدسی کی حیثیت سے بہت چرچا ہے۔ وہ قول یہ ہے: كنتُ كنزاً مخفيا، فأحببتُ أن أعرف، فخلقتُ خلقاً، فبي عرفوني (كشف الخفاء، 2/1011) یعنی میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، پھر میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں، پھر میں نے ایک مخلوق (انسان) کو پیدا کیا، پھر انسان نے مجھ کو پہچانا۔

میرا بے آمیز وجدان کہتا تھا کہ یہ قول بالکل درست ہے۔ یہ معرفت کے معاملے کی بالکل صحیح تعبیر ہے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اِس روایت کی کوئی قابلِ اعتماد سند موجود نہیں۔ اِس لیے علما عام طور پر اِس کو مستند نہیں مانتے۔

تاہم میں اس کی تحقیق کرتا رہا۔ چناں چہ میں اِس دریافت تک پہنچا کہ خود قرآن میں اِس تصور کی اصل موجود ہے۔ قرآن کی سورہ الذاریات میں یہ آیت آئی ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51:56)۔ مشہور صحابی رسول عبد اللہ بن عباس نے اِس آیت میں ''عبادت'' سے مراد معرفت لیا ہے۔ انھوں نے اِس آیت کی تفسیر اِن الفاظ میں کی ہے: وماخلقت الجن والإنس إلا ليعرفون۔

اِس مثال میں، میرے وجدان نے مجھ کو ایک علم تک پہنچایا، وہ یہ کہ اس کی اصل خود قرآن میں موجود ہے۔ اِس کے بعد میں نے مزید غور کیا تو میں اِس دریافت تک پہنچا کہ مذکورہ قول دراصل ایک تفسیری قول ہے جس کو قائل نے آیتِ قرآنی کی رعایت سے، حدیثِ قدسی کی زبان میں بیان کر دیا۔ اِس قول کے الفاظ اگر بدل دئے جائیں اور اس کو ایک تفسیری قول کی شکل دے دی جائے تو وہ اِس طرح ہوگا: كان الله كنزاً مخفيا، فأحبّ أن يُعرف، فخلق الخلق۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک سچے متلاشی کا وجدان، عقلی بنیاد سے بھی زیادہ مضبوط بنیاد ہے۔ عقلی بنیاد آدمی کو صرف فنی سطح کے ظاہری علم تک پہنچاتی ہے، لیکن ایک سچے متلاشی کا وجدان مزید اضافے کے ساتھ حقیقت شناسی (realization of truth) کی سطح پر قائم ہوتا ہے۔ یہی وہ سطح ہے جب کہ ایک ترقی یافتہ ذہن ادراکِ حقیقت کی ایک ایسی سطح پر کھڑا ہو جاتا ہے جہاں سے وہ حقیقت کو براہِ راست دیکھ سکے، وہ اِس درجے تک پہنچ جائے کہ وہ حقیقت کو کسی دلیل کے بغیر پہچاننے لگے۔

اِس معاملے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وجدان کی سطح پر جو یقین حاصل ہوتا ہے، وہ ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے۔ اور یہ ایک واقعہ ہے کہ کوئی غیر حقیقی چیز کبھی اضافہ پذیر نہیں ہوتی۔ واہمہ اور حقیقی وجدان میں یہ فرق ہے کہ واہمہ ہمیشہ بے ثبات ہوتا ہے۔ وہ صرف وقتی طور پر آدمی کو متاثر کرتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ اِس کے برعکس، اگر کسی شخص کی رسائی حقیقی وجدان تک ہو جائے تو اُس پر کبھی زوال نہیں آتا۔ حقیقی وجدان ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے، اس کے یقین کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔

واہمہ ایک مجہول چیز ہے، اس کی کوئی شعوری بنیاد نہیں۔ اِس کے برعکس، وجدان پوری طرح

شعور پر مبنی ہوتا ہے۔ وجدان خود شعور کا ایک اعلیٰ درجہ ہے۔ وہ شعور کی تکمیل ہے۔ آدمی اگر سنجیدگی کے ساتھ سوچے تو اس کا داخلی احساس خود بتادے گا کہ کون سی بات صرف واہمہ ہے اور کون سی بات وجدانی علم سے تعلق رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل اور وجدان دونوں تلاش کی منزلیں ہیں۔ آدمی کی عقل اُس کو وجدان تک پہنچاتی ہے اور وجدان اس کو حقیقت کے اعلیٰ مرتبے تک پہنچا دیتا ہے۔ جو آدمی اِس اعلیٰ مرتبے تک پہنچتا ہے، اس کے لیے عقل اور وجدان کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی عقل مکمل طور پر وجدان ہوتی ہے، اور اس کا وجدان مکمل طور پر عقل۔ یہی وہ مقام ہے جس کو معرفتِ حق کا اعلیٰ درجہ کہا جاتا ہے۔

تاہم عقلی دریافت اور وجدانی دریافت میں یہ فرق ہے کہ عقلی دریافت ایک موضوعی دریافت (objective discovery) ہے۔ اِس کے مقابلے میں، وجدانی دریافت کی حیثیت ایک داخلی دریافت (subjective discovery) کی ہے۔ اِس بنا پر دونوں دریافتوں کے درمیان بظاہر یہ فرق باقی رہتا ہے کہ عقلی دریافت ایک قابلِ مظاہرہ (demonstrable) دریافت ہے۔ اِس کے مقابلے میں، وجدانی دریافت خارجی طور پر قابلِ مظاہرہ نہیں۔ مگر یہ فرق کوئی حتمی فرق نہیں۔ جہاں تک صاحبِ وجدان کا معاملہ ہے، اس کے اپنے لیے دونوں قسم کی دریافتیں یکساں طور پر قابلِ یقین ہوتی ہیں، صرف اِس فرق کے ساتھ کہ ایک چیز کو وہ پیشانی کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور دوسری چیز کا مشاہدہ وہ دماغ کی آنکھ سے کرتا ہے۔

تاہم یہ فرق آخری فرق نہیں۔ ایک شخص جس کو حقیقی معنوں میں وجدانی دریافت ہو، وہ اِس کے نتیجے میں عام انسان سے واضح طور پر مختلف بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ، اس کا بولنا، اس کا سلوک، اس کے اخلاق، اس کے آداب واطوار، ہر چیز دوسرے انسانوں سے اتنا زیادہ مختلف ہو جاتے ہیں کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک مختلف انسان (man with a difference) بن جاتا ہے۔ اس کی شخصیت کا یہ فرق اہلِ نظر کے لیے وہی درجہ رکھتا ہے جس کو عقل اور منطق کی زبان میں دلیل کہا جاتا ہے۔

سائنس اور الٰہیات

پروفیسر پال ڈیویز (Paul Davies) مشہور امریکی رائٹر ہیں۔ وہ ایری زونا اسٹیٹ (Arizona State) یونیورسٹی میں ایک ریسرچ سنٹر (Beyond) کے ڈائریکٹر ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام گولڈی لاکس انگما (Goldilocks Enigma) ہے۔ حال میں ان کا ایک مقالہ مجلّہ گارجین (Guardian Newspapers Limited 2007) میں چھپا ہے۔ اِس مقالے کو انگریزی اخبار ہندو (The Hindu) نے اپنے شمارہ 27 جون 2007 میں اِس عنوان کے تحت شائع کیا ہے — تخلیق پسندوں کے استدلال میں دراڑ:

Flaw in creationists' argument

مضمون نگار لکھتے ہیں کہ "سائنس داں دھیرے دھیرے ایک ناگوار سچائی (inconvenient truth) تک پہنچ رہے ہیں، وہ یہ کہ کائنات ایک نہایت محکم کائنات ہے۔ سائنس داں چالیس سال سے کائنات میں کام کرنے والے قوانینِ طبیعی کی تحقیق کر رہے ہیں۔ یہ تحقیق، کائنات کے پیچھے ایک شعوری وجود (concious being) کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ کائنات کے قوانین میں سے کسی ایک کو بھی اگر بدلا جائے تو اس کا نتیجہ نہایت مہلک ہوگا۔ کائنات اتنی زیادہ منظم ہے کہ اس کے موجودہ ڈھانچے میں معمولی تبدیلی بھی اس کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی ہے۔

مثال کے طور پر ساری کائنات ایٹم سے بنی ہے۔ اور ہر ایٹم نیوٹران اور پروٹان کا مجموعہ ہے۔ نیوٹران کسی قدر وزنی ہوتا ہے اور پروٹان کسی قدر ہلکا۔ یہ تناسب بے حد اہم ہے۔ کیوں کہ اگر اس کا الٹا ہو، یعنی پروٹان بھاری ہو اور نیوٹران ہلکا، تو معلوم قوانین کے مطابق، ایٹم کا وجود ہی نہ رہے گا۔ جب نیوکلیس نہ ہوگا تو ایٹم بھی نہ ہوگا، اور جب ایٹم نہ ہوگا تو کیمسٹری بھی نہیں ہوگی۔ اور جب کیمسٹری نہیں ہوگی تو زندگی بھی نہیں ہوگی۔

اِس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ سائنس ناقابلِ حل سوالات سے دوچار ہے۔ مثلاً

طبیعیات کے موجودہ قوانین کہاں سے آئے، وہ اپنی موجودہ محکم حالت میں کیوں قائم ہیں، وغیرہ۔ روایتی طور پر سائنس داں یہ فرض کررہے تھے کہ یہ قوانین، کائنات کا لازمی حصہ ہیں۔قوانینِ طبیعی کی حقیقت کی کھوج کرنا، سائنس کا موضوع نہیں سمجھا جاتا تھا۔مگر اب یہ سوالات سائنس دانوں کو پریشان کررہے ہیں۔

کیمبرج کے سائنس داں مارٹن ریس (Martin Rees) جو کہ ُرائل سوسائٹی' کے صدر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ طبیعیات کے قوانین، مطلق اور آفاقی نہیں ہیں، وہ ایک بڑے کائناتی نظام کے متفرق حصے ہیں۔ ہر حصے کے اپنے ضوابط ہیں۔ وہ اِس نظام کو متعدّد کائناتی نظام (the multiverse system) کہتے ہیں۔ اِن تحقیقات کے مطابق، ہماری کائنات ایک ایسی کائنات ہے جو موافقِ حیات قوانین (bio-friendly laws) کی حامل ہے۔

اس کا یہ نتیجہ ہے کہ کائنات کو ہم اِس طرح پاتے ہیں کہ وہ ہماری ضرورتوں کے عین مطابق ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہاں انسان کا قیام ناممکن ہوجاتا۔ یہ محکم قوانین جو کائنات کو نہایت منظم طور پر کنٹرول کررہے ہیں، وہ کہاں سے آئے۔

تمام مشکلات کا سبب، جدید مفکرین کے نزدیک، یہ ہے کہ مذہب اور جدید سائنس، دونوں کائنات کا جو تصور دے رہے ہیں، وہ کائنات کے علاوہ ایک ایسی ایجنسی کا تقاضا کرتے ہیں جو کائنات کے باہر سے کائنات کا نظم کررہی ہو۔ تاہم کائنات کی توجیہہ کے لیے ایک ایسے ڈزائنر کو ماننا جو کائنات سے پہلے موجود ہو، وہ اِس مسئلے کی کوئی توجیہہ نہیں۔ کیوں کہ یہ توجیہہ فوراً یہ سوال پیدا کرتی ہے کہ ڈزائنر نے اگر کائنات کو بنایا تو خود ڈزائنر کو کس نے بنایا:

Who designed the designer

اگر زندگی کی کوئی آخری معنویت (ultimate meaning) ہے، جیسا کہ میں یقین رکھتا ہوں، تو یہ جواب خود نیچر کے اندر ملنا چاہیے، نہ کہ اُس سے باہر۔ کائنات ایک محکم کائنات ہوسکتی ہے، لیکن اگر ایسا ہے تو کائنات نے خود ہی اپنے آپ کو ایسا بنایا ہے''۔

Flaw in creationists' argument, by Paul Davies

We will never explain the cosmos by taking on faith either divinity or physical laws. True meaning is to be found within nature. Scientists are slowly waking up to an inconvenient truth - the universe looks suspiciously like a fix. The issue concerns the very laws of nature themselves. For 40 years, physicists and cosmologists have been quietly collecting examples of all to convenient "coincidences" and special features in the underlying laws of the universe that seem to be necessary in order for life, and hence conscious beings, to exist. Change any one of them and the result would be lethal. To see the problem, imagine playing God with the cosmos. Before you is a designer machine that lets you tinker with the basics of physics. Twiddle this knob and you make all electrons a bit lighter, twiddle that one and you make gravity a bit stronger, and so on. It happens that you need to set 30-something knobs to fully describe the world about us. The point is that some of those metaphorical knobs must be tuned precisely, or the universe would be sterile. Example: neutrons are just a tad heavier than protons. If it were the other way around, atoms could not exist, because all the protons in the universe would have decayed into neutrons shortly after the big bag. No protons, then no atomic nucleuses, and no atoms. No atoms, no chemistry, no life. Like Baby Bear's porridge in the story of Goldilocks, the universe seems to be just right for life. So what's going on? Fuelling the controversy is an unanswered question lurking at the very heart of science - the origin of the laws of physics. Where do they come from? Why do they have the form that they do? Traditionally, scientists have treated the laws of physic as simply "given," elegant mathematical relationships that were somehow imprinted on the universe at its birth, and fixed thereafter. Inquiry into the origin and nature of the laws was not regarded as a proper part of science.

Illusory impression

But the embarrassment of the Goldilocks enigma has prompted a rethink. The Cambridge cosmologist Martin Rees, president of The Royal Society, suggests the laws of physics aren't absolute and universal but more akin to local bylaws, varying from place to place on a mega-cosmic scale. A God's eye view would show our universe as merely a single representative amid a vast assemblage of universes, each with this own bylaws. Mr. Rees calls this system "the multiverse," and it is an increasingly popular idea among cosmologists. Only rarely within the variegated cosmic quilt will a universe possess bio-friendly laws and spawn life. It would then be no surprise that we find ourselves in a universe apparently customized for habitation; we would hardly exist in one where life is impossible. The multiverse theory cuts the ground from beneath intelligent design, but it falls short of a complete explanation of existence. For a start there has to be a physical mechanism to make all those universes and allocate bylaws to them. This process demands its own laws, or meta-laws. Where do they come from? The root cause of all the difficulty can be traced to the fact that both religion and science appeal to some agency outside the universe to explain its law-like order. Dumping the

problem in the lap of a pre-existing designer is no explanation at all, as it merely begs the question of who designed the designer. But appealing to a host of unseen universes and a set of unexplained meta-laws is scarcely any better. This shared failing is no surprise, because the very notion of physical law has its origins in theology. The idea of absolute, universal, perfect, immutable laws comes straight out of monotheism, which was the dominant influence in Europe at the time science as we know it was being formulated by Isaac Newton and his contemporaries. Just as classical Christianity presents God as upholding the natural order from beyond the universe, so physicists envisage their laws as inhabiting an abstract transcendent realm of perfect mathematical relationships. Furthermore, Christians believe the world depends utterly on God for its existence, while the converse is not the case. Correspondingly, physicists declare that the universe is governed by eternal laws, but the laws remain impervious to events in the universe.

Outdated theory

I think this entire line of reasoning is now outdated and simplistic. We will never fully explain the world by appealing to something outside it that must simply be accepted on faith, be it an unexplained God or an unexplained set of mathematical laws. Can we do better? I propose that the laws are more like computer software: programmes being run on the great cosmic computer. They emerge with the universe at the big bang and are inherent in it, not stamped on it from without like a maker's mark. Man-made computers are limited in their performance by finite processing speed and memory. So too, the cosmic computer is limited in power by its age and the finite speed of light. Seth Lloyd, an engineer at MIT, has calculated how many bits of information the observable universe has processed since the big bang. The answer is one followed by 122 zeros. Crucially, however, the limit was smaller in the past because the universe was younger. Just after the big bang, when the basic properties of the universe were being forged, its information capacity was so restricted that the consequences would have been profound. Here's why. If a law is a truly exact mathematical relationship, it requires infinite information to specify it. In my opinion, however, no law can apply to a level of precision finer than all the information in the universe can express. Infinitely precise laws are an extreme idealization with no shred of real world justification. In the first split second of cosmic existence, the laws must therefore have been seriously fuzzy. Then, as the information content of the universe climbed, the laws focused and homed in on the life-encouraging form we observe today. But the flaws in the laws left enough wiggle room for the universe to engineer its own bio-friendliness. If there is an ultimate meaning to existence, as I believe is the case, the answer is to be found within nature, not beyond it. The universe might indeed be a fix, but if so, it has fixed itself.

(Paul Davies is director of Beyond, a research center at Arizona State University, and author of The Goldilocks Enigma.)

وضاحت

الٰہیات کے معاملے میں جدید ذہن سخت کنفیوژن کا شکار ہے۔ اِس کا ایک اندازہ پروفیسر پال ڈیویز کے مذکورہ مضمون سے ہوتا ہے۔ ملحد فلاسفہ اکثر یہ کہتے رہے ہیں کہ اگر مذہبی عقیدے کے مطابق، خدا نے کائنات کو بنایا تو خود خدا کو کس نے بنایا۔ مگر یہ سوال مکمل طور پر ایک غیر منطقی (illogical) سوال ہے۔ یہ منطق (logic) کی نفی ہے۔ مزید یہ کہ مذکورہ اعتراض ایک کُھلی تضاد فکری پر قائم ہے۔ یہ لوگ خود تو کائنات کو بغیر خالق کے مان رہے ہیں، مگر خالق کو ماننے کے لیے وہ ایک خالقِ خالق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حالاں کہ کائنات کا وجود اگر بغیر خالق کے ممکن ہے تو خالق کا وجود بھی بغیر خالق کے ممکن ہونا چاہیے۔

عقلی موقف

خدا کے وجود کے معاملے میں اصل غور طلب بات یہ ہے کہ خالص عقلی نقطہ نظر سے ہم کیا موقف اختیار کر سکتے ہیں اور کیا نہیں۔ اِس کے سوا کوئی اور طریقہ اِس معاملے میں سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔

یہ ایک مسلّم بات ہے کہ کائنات میں انتہائی معیاری حد تک نظم پایا جاتا ہے۔ نظم کا یہ معاملہ ہر آدمی کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ مذکورہ مضمون نگار نے ایٹم کی ساخت کو لے کر اِسی معاملے کی ایک سائنسی مثال دی ہے۔ اِس لیے جہاں تک کائنات میں نظم کا سوال ہے، یہ ہر فریق کے نزدیک، ایک مسلّم حقیقت ہے۔

عقلی موقف کے اعتبار سے دوسری اہم بات یہ ہے کہ نظم کا تصور ناظم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ جہاں نظم ہے، وہاں یقیناً اس کا ایک ناظم موجود ہے۔ ناظم کے بغیر نظم کا تصور عقلی اعتبار سے محال ہے۔ نظم کی موجودگی ایک مجبورانہ منطق (compulsive logic) پیدا کرتی ہے، یعنی کسی بھی عذر کے بغیر ناظم کی موجودگی کا اقرار کرنا۔ کسی کے ذہن میں ناظم کی موجودگی کی توجیہہ نہ ہونا، اُس کو یہ منطقی جواز نہیں دیتا کہ وہ ناظم کی موجودگی کا انکار کردے۔

ایٹم کے ڈھانچے کی مثال لے کر مضمون نگار نے جو بات کہی ہے، وہی اِس دنیا کی ہر چیز کے

بارے میں درست ہے۔ اِس دنیا کا ہر جُز، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، وہ اِس قدر محکم اور متنا سب ہے کہ اس کے ڈھانچے میں کوئی بھی تغیر سارے نظام عالم کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے سیارۂ زمین میں جو کشش (gravity) ہے، وہ آخری حد تک ہماری ضرورتوں کے مطابق ہے۔ اگر زمین کی کشش نصف کے بقدر زیادہ ہو جائے، یا نصف کے بقدر کم ہو جائے تو دونوں حالتوں میں سیارۂ زمین پر انسانی تہذیب کا بقا ناممکن ہو جائے گا۔ جیسا کہ معلوم ہے، خلا میں ہمارے دو قریبی پڑوسی ہیں — سورج اور چاند۔ اگر ایسا ہو کہ سورج وہاں ہو جہاں آج چاند ہے، اور چاند وہاں ہو جہاں آج سورج ہے، تو زمین پر انسانی زندگی تو درکنار خود زمین جل کر ختم ہو جائے گی۔

ہماری زمین پر تمام چیزیں اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہیں۔ لیکن درخت کا معاملہ استثنائی طور پر یہ ہے کہ اس کی جڑیں تو زمین میں نیچے کی طرف جاتی ہیں اور اس کا تنا اوپر کی طرف جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو کہ درخت میں یہ دوطرفہ خصوصیت نہ ہو تو اس کے بعد زمین کی سطح پر ہرے بھرے درختوں کا خاتمہ ہو جائے گا، وغیرہ۔

ذہین کائنات

کائنات میں اَن گنت چیزیں ہیں، اور ہر چیز مرکّب (compound) کی صورت میں ہے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایٹم، کائنات کا ایک ایسا واحدہ ہے جو مفرد (single) ہے اور غیر مرکب حالت میں ہے۔ مگر آئن سٹائن کے زمانے میں جب ایٹم ٹوٹ گیا تو معلوم ہوا کہ اٹیم بھی مرکب ہے، وہ کوئی مفرد چیز نہیں۔

دورِ جدید میں ہر چیز کا سائنسی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اِس مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ چیزیں جن اشیا سے ترکیب پا کر بنتی ہیں، ان کی ترکیب کے لیے ہمیشہ بہت سے آپشن (options) موجود ہوتے ہیں، مگر سائنس یہ بھی بتاتی ہے کہ نیچر ہمیشہ یہ کرتی ہے کہ بہت سے آپشن میں سے اُسی ایک آپشن کو لیتی ہے جو کائنات کی مجموعی اسکیم کے عین مطابق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اِس دنیا کی ہر چیز بالکل

پرفیکٹ نظر آتی ہے، اِس دنیا کی ہر چیز اپنے فائنل ماڈل پر ہے۔

یہ اصول جو کائنات میں رائج ہے، اُس کو ایک لفظ میں ذہین انتخاب (intelligent selection) کہہ سکتے ہیں۔ کائنات میں بلین، ٹری لین سے بھی زیادہ چیزیں موجود ہیں، لیکن ہر چیز بلا استثنا، اِسی ذہین انتخاب کی مثال ہے۔ یہ اصول اتنا زیادہ عام ہے کہ ایک سائنس داں ڈاکٹر فریڈ ہائل (Fred Hoyle) نے اِسی موضوع پر ایک کتاب تیار کر کے شائع کی ہے، اُس کا نام ہے — ذہین کائنات (The Intelligent Universe)۔ یہ کتاب ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے اور 1983 میں لندن سے چھپی ہے۔

کائنات کا یہ ظاہرہ (phenomenon) کوئی سادہ بات نہیں، وہ خدا کے وجود کا ایک حتمی ثبوت ہے۔ کائنات کی بناوٹ میں ذہانت (intelligence) کی موجودگی واضح طور پر ایک اور بات ثابت کرتی ہے۔ ذہین تخلیق (intelligent creation) واضح طور پر ذہین خالق (intelligent creator) کا ثبوت ہے۔ منطقی طور پر یہ ناقابلِ قیاس ہے کہ یہاں ذہین عمل موجود ہو، لیکن ذہین عامل یہاں موجود نہ ہو۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے بلاشبہہ لازم اور ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ذہین عمل کو ماننے کے بعد ذہین عامل کو نہ ماننا، ایسا ہی ہے جیسے ایک پیچیدہ مشین کو ماننے کے بعد اُس کے انجینئر کو نہ ماننا۔ ڈاکٹر فریڈ ہائل نے اپنی کتاب میں درست طور پر لکھا ہے کہ سائنس کے ابتدائی دور میں مسیحی چرچ نے سائنس دانوں کے خلاف جو متشددانہ کارروائی کی، وہ ابھی تک لوگوں کو یاد ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر وہ یہ اعلان کردیں کہ کائنات کے پیچھے ایک ذہین خالق کے وجود کا ثبوت مل رہا ہے تو قدیم مذہبی تشدد شاید دوبارہ واپس آجائے گا۔ مگر یہ ایک بے بنیاد خوف ہے۔ ذہین خالق کے سائنسی اعتراف کے بعد جو چیز تاریخ میں واپس آئے گی، وہ سچا خدائی مذہب ہے، نہ کہ مسیحی چرچ۔

دو انتخاب (options)

کائنات میں جو غیر معمولی نظم اور تناسب پایا جاتا ہے، اس کی توجیہہ کے لیے ہمارے پاس

دو انتخاب (options) ہیں۔ ایک، یہ کہ کائنات اپنی ناظم آپ ہے۔ مگر سائنس کی تمام تحقیقات اِس کی تردید کرتی ہیں۔ اِس لیے کہ سائنس نے کائنات میں جس نظم کو دریافت کیا ہے، وہ مکمل طور پر ایک ذہین نظم (intelligent design) ہے۔ دوسری طرف سائنس یہ بھی بتاتی ہے کہ خود کائنات کے اندر سب کچھ ہے، لیکن وہی چیز اس کے اندر موجود نہیں جس کو ذہانت (intelligence) کہا جاتا ہے۔ سائنس کی دریافت کردہ کائنات، بیک وقت کامل طور پر منظم (designed) ہے اور اسی کے ساتھ وہ کامل طور پر غیر ذہین (non-intelligent) ہے۔ ایسی حالت میں کائنات کو اپنے نظم کا خود ناظم سمجھنا، ایسا ہی ہے جیسے پتھر کے اسٹیچو کے بارے میں یہ فرض کرلیا جائے کہ اس نے اپنی بامعنیٰ ڈزائن خود تیار کی ہے۔ وہ ایک خود تخلیقی وجود (self-created being) ہے۔

اِس کے بعد ہمارے پاس کائنات کی توجیہہ کے لیے صرف ایک آپشن باقی رہتا ہے، اور وہ یہ کہ ہم ایک خارجی ایجنسی (outside agency) کو کائنات کے نظم کا سبب قرار دیں۔ اِس ایک انتخاب کے سوا، کوئی دوسرا انتخاب ہمارے لیے عملی طور پر ممکن نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اِس معاملے میں ہمارے لیے بے خدا کائنات اور باخدا کائنات کے درمیان انتخاب نہیں ہے، بلکہ باخدا کائنات (universe with God) اور غیر موجود کائنات (no universe at all) کے درمیان انتخاب ہے۔ یعنی ہم اگر خدا کا انکار کریں تو ہمیں کائنات کے وجود کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ چوں کہ ہم کائنات کے وجود کا انکار نہیں کرسکتے، اِس لیے ہم مجبور ہیں کہ ہم خدا کے وجود کو تسلیم کریں۔

واحد انتخاب

عقلی اصولوں میں سے یہ ایک اصول ہے کہ جب ایسی صورت حال ہو کہ عملی طور پر ہمارے لیے صرف ایک ہی انتخاب ممکن ہو تو اُس وقت ایک مجبور کن صورتِ حال (compulsive situation) پیدا ہوجاتی ہے، یعنی ہم مجبور ہوتے ہیں کہ اُس ایک انتخاب کو لے لیں۔ اِس کے خلاف کرنا، صرف اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ وہاں ایک سے زیادہ انتخاب موجود ہوں۔ لیکن جب ایک کے سوا کوئی

دوسرا انتخاب سرے سے موجود ہی نہ ہو تو اُس وقت لازم ہو جاتا ہے کہ ہم اِسی واحد انتخاب کو قبول کرلیں۔ زیر بحث مسئلے میں یہ واحد انتخاب خدا کے وجود کو بطور واقعہ تسلیم کرنا ہے، کیوں کہ یہاں اقرارِ خدا کے سوا کوئی اور انتخاب ہمارے لیے سرے سے ممکن ہی نہیں۔

منطقی استدلال

کسی بات کو عقلی طور پر سمجھنے کے لیے انسان کے پاس سب سے بڑی چیز منطق (logic) ہے۔ منطق کے ذریعے کسی بات کو عقلی طور پر قابل فہم بنایا جاتا ہے۔ منطق کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک ہے، انتخابی منطق (optional logic) اور دوسری ہے، مجبورانہ منطق (compulsive logic)۔ منطق کے یہ دونوں ہی طریقے یکساں طور پر قابلِ اعتماد ذریعے ہیں۔ دونوں میں سے جس ذریعے سے بھی بات ثابت ہو جائے، اس کو ثابت شدہ مانا جائے گا۔

انتخابی منطق

انتخابی منطق وہ ہے جس میں آدمی کے لیے کئی میں سے کسی ایک کے انتخاب کا موقع ہو۔ اِس قسم کے معاملے میں ہمارے پاس ایسے ذریعے ہوتے ہیں جن کو منطبق کر کے ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ کئی میں سے صرف ایک کا انتخاب کریں اور بقیہ کو چھوڑ دیں۔

مثلاً سورج کی روشنی کو لیجیے۔ آنکھ سے دیکھنے میں سورج کی روشنی صرف ایک رنگ کی دکھائی دیتی ہے، لیکن پرِزم (prism) سے دیکھنے میں سورج کی روشنی سات رنگوں میں بٹ جاتی ہے۔ اِس طرح سورج کی روشنی کے رنگ کے بارے میں ہمارے پاس دو انتخاب (options) ہو گیے۔ اب ہمارے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ دونوں میں سے جس انتخاب میں منطقی وزن زیادہ ہو، ہم اس کو لیں۔ چناں چہ اِس معاملے میں سات رنگوں کے نظریے کو مان لیا گیا۔ کیوں کہ وہ زیادہ قوی ذریعے سے ثابت ہو رہا تھا۔

مجبورانہ منطق

مجبورانہ منطق کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ مجبورانہ منطق میں آدمی کے پاس صرف ایک کا انتخاب (option) ہوتا ہے۔ آدمی مجبور ہوتا ہے کہ اُس ایک انتخاب کو تسلیم کرے۔ کیوں کہ

اس میں ایک کے سوا کوئی اور انتخاب سرے سے ممکن ہی نہیں ہوتا۔ مجبورانہ منطق کے معاملے میں صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ آدمی کو لازمی طور پر ماننا بھی ہے، اور ماننے کے لیے اس کے پاس ایک انتخاب کے سوا کوئی دوسرا انتخاب موجود نہیں۔

مجبورانہ منطق کی ایک قریبی مثال ماں کی مثال ہے۔ ہر آدمی کسی خاتون کو اپنی ماں مانتا ہے۔ وہ مجبور ہے کہ ایک خاتون کو اپنی ماں تسلیم کرے۔ حالاں کہ اُس نے اپنے آپ کو اُس خاتون کے بطن سے پیدا ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ اِس کے باوجود وہ اپنی ماں کو یقین کے ساتھ ماں مانتا ہے۔ یہ ماننا، مجبورانہ منطق کے اصول کے تحت ہوتا ہے۔ ایسا وہ اِس لیے کرتا ہے کہ اِس معاملے میں اُس کی پوزیشن یہ ہے کہ اس کو ایک خاتون کو ہر حال میں اپنی ماں ماننا ہے۔ اِسی لیے وہ اپنی ماں کو یقین کے ساتھ اپنی ماں تسلیم کر لیتا ہے۔ کیوں کہ اِس کیس میں اُس کے لیے کوئی دوسرا انتخاب موجود نہیں۔

خدا کے وجود کو ماننے کا تعلق بھی اِسی قسم کی مجبورانہ منطق سے ہے۔ خدا کے وجود کے پہلو سے اصل قابلِ غور بات یہ ہے کہ اِس معاملے میں ہمارے لیے کوئی دوسرا انتخاب ہی نہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ خدا کے وجود کو مانیں۔ کیوں کہ اگر ہم خدا کے وجود کو نہ مانیں تو ہمیں کائنات کے وجود کی، اور خود اپنے وجود کی نفی کرنی پڑے گی۔ چوں کہ ہم اپنی اور کائنات کے وجود کی نفی نہیں کر سکتے، اِس لیے ہم خدا کے وجود کی بھی نفی نہیں کر سکتے۔

انسان کا وجود، خدا کے وجود کا ثبوت

وسیع کائنات میں صرف انسان ہے جو خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ حالاں کہ انسان کا خود اپنا وجود، خدا کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اگر انسان جیسی ایک ہستی یہاں موجود ہے تو خدا بھی یقینی طور پر موجود ہے۔ انسان کے اندر وہ تمام صفتیں ناقص طور پر موجود ہیں جو خدا کے اندر کامل طور پر موجود ہیں۔ اگر ناقص ہستی کا وجود ہے تو کامل ہستی کا بھی یقینی طور پر وجود ہے۔ ایک کو ماننے کے بعد دوسرے کو نہ ماننا، ایک ایسا منطقی تضاد ہے جس کا تحمل کوئی بھی صاحبِ عقل نہیں کر سکتا۔

ڈیکارٹ (Rene Descartes) مشہور فرنچ فلسفی ہے۔ وہ 1596 میں پیدا ہوا اور

1650 میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کے سامنے یہ سوال تھا کہ انسان اگر موجود ہے تو اس کی موجودگی کا عقلی ثبوت کیا ہے۔ لمبے غور وفکر کے بعد اس نے اس سوال کا جواب اِن الفاظ میں دیا — میں سوچتا ہوں، اِس لیے میں ہوں:

I think, therefore I exist.

ڈیکارٹ کا یہ جواب منطقی اعتبار سے ایک محکم جواب ہے۔ مگر یہ منطق، جس سے انسان کا وجود ثابت ہوتا ہے، وہ اس سے بھی زیادہ بڑی بات کو ثابت کر رہی ہے، اور وہ ہے خدا کے وجود کا عقلی ثبوت۔ اِس منطقی اصول کی روشنی میں یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ — سوچ کا وجود ہے، اِس لیے خدا کا بھی وجود ہے:

Thinking exists, therefore God exists.

سوچ ایک مجرد (abstract) چیز ہے۔ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں، وہ اِسی لیے خدا کا انکار کرتے ہیں کہ خدا انھیں ایک مجرد تصور معلوم ہوتا ہے، اور مجرد تصور کی موجودگی ان کے لیے نا قابل فہم ہے، یعنی ایک ایسی چیز کو ماننا جس کا کوئی مادّی وجود نہ ہو۔ لیکن ہر انسان سوچنے والی مخلوق ہے۔ خود اپنے تجربے کی بنیاد پر ہر آدمی سوچ کے وجود کو مانتا ہے۔ حالاں کہ سوچ مکمل طور پر ایک مجرد تصور ہے، یعنی ایک ایسی چیز جس کا کوئی مادّی وجود نہیں۔

اب اگر انسان ایک قسم کے مجرد تصور کے وجود کو مانتا ہے تو اُس پر لازم آجاتا ہے کہ وہ دوسری قسم کی مجرد تصور کے وجود کو بھی تسلیم کرے۔ یہ بلاشبہہ خدا کے وجود کا ایک ایسا ثبوت ہے جس کا تجربہ ہر آدمی کرتا ہے اور جس کی صحت کو ہر آدمی بلا اختلاف مانتا ہے۔ اگر سوچ کے وجود کا انکار کر دیا جائے تو اس کے بعد یقینی طور پر انسان کے وجود کا اور خود اپنے وجود کا انکار کرنا پڑے گا۔ کوئی بھی آدمی اپنے وجود کا انکار نہیں کرسکتا، اس لیے کسی بھی آدمی کے لیے منطقی طور پر یہ ممکن نہیں کہ وہ خدا کے وجود کا انکار کرے۔

خدا کا غیر مرئی (invisible) ہونا، اِس بات کے لیے کافی نہیں کہ خدا کے وجود کا انکار کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر مرئی ہونے کی بنا پر خدا کے وجود کا انکار کرنا، ماڈرن سائنس کے زمانے میں

ایک خلافِ زمانہ استدلال (anachronistic argument) ہے۔ اس لیے کہ آئن سٹائن (وفات: 1955) کے زمانے میں جب ایٹم ٹوٹ گیا اور علم کا دریا عالمِ صغیر (microworld) تک پہنچ گیا تو اس کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں ہر چیز غیر مرئی ہے۔ پہلے جو چیزیں مرئی (visible) سمجھی جاتی تھیں، اب وہ سب کی سب غیر مرئی ہوگئیں۔ ایسی حالت میں عدم رُویت کی بنیاد پر خدا کے وجود کا انکار کرنا، ایک غیر علمی موقف بن چکا ہے۔ اس موضوع کی تفصیل کے لیے حسب ذیل دو کتابوں کا مطالعہ کافی ہے:

Unseen World, by Sir Arthur Eddington

Human Knowledge, by A. W. Bertrand Russel

خلائی مشاہدہ

موجودہ زمانے میں جو نئی چیزیں وجود میں آئی ہیں، اُن میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو خلائی سفر کہا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ راکٹ کے ذریعے خَلا میں گیے اور وہاں سے مخصوص دور بینوں کے ذریعے انھوں نے زمین کا مطالعہ کیا۔ اِن لوگوں نے اپنے خلائی مشاہدے کی بنیاد پر بہت سی نئی باتیں بتائی ہیں۔ اُن میں سے ایک بات یہ ہے کہ ایک خلاباز نے کہا کہ خلائی سفر کے دوران انھوں نے یہ تجربہ کیا کہ وسیع خلا میں کہیں بھی زمین جیسا کوئی کُرہ موجود نہیں۔ زمین پر لائف ہے اور اُسی کے ساتھ اعلیٰ پیمانے پر لائف سپورٹ سسٹم بھی۔ یہ دونوں چیزیں زمین پر انتہائی موزوں اور متناسب انداز میں پائی جاتی ہیں۔ ایک خلاباز نے زمین کے بارے میں اپنا تاثر بتاتے ہوتے کہا— صحیح قسم کا سامان صحیح جگہ پر:

Right type of material at the right place.

زمین کی یہ انوکھی صفت ہے کہ یہاں زندگی پائی جاتی ہے، یہاں چلتا پھرتا انسان موجود ہے، مگر اِس قسم کی زندگی کی موجودگی کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس کے لیے دوسرے اَن گنت اسباب درکار ہیں۔ اِن اسباب کے بغیر زندگی کا وجود اور بقا ممکن نہیں۔ زمین، اِس اعتبار سے وسیع کائنات میں

ایک انوکھا استثنا ہے۔ یہاں استثنائی طور پر انسان موجود ہے اور اسی کے ساتھ یہاں اس کے وجود اور بقا کے لیے انتہائی متناسب انداز میں تمام سامانِ حیات موجود ہے۔

وسیع کائنات میں یہ بامعنیٰ استثنا بلاشبہہ ارادی عمل اور منصوبہ بند تخلیق کا ثبوت ہے، اور جہاں ارادی عمل اور منصوبہ بند تخلیق کا ثبوت موجود ہو، وہاں ایک صاحبِ ارادہ اور ایک صاحبِ تخلیق ہستی کا وجود اپنے آپ ثابت ہوجاتا ہے۔

زمین ایک استثنا

ایک شخص اگر کائنات کا سفر کرے، وہ پوری کائنات کا مشاہدہ کرے تو وہ پائے گا کہ وسیع کائنات پوری طرح ایک غیر ذی روح (lifeless) کائنات ہے۔ اُس میں اتھاہ خلا ہے، دہشت ناک تاریکی ہے، اُس کے اندر پتھر کی چٹانیں ہیں، آگ کے بہت بڑے بڑے گولے ہیں اور یہ سب چیزیں دیوانہ وار مسلسل حرکت میں ہیں۔

اِس پُرہیبت منظر سے گذر کر جب وہ سیارۂ زمین پر پہنچتا ہے تو یہاں اس کو ایک حیران کُن استثنا نظر آتا ہے۔ یہاں استثنائی طور پر پانی ہے، سبزہ ہے، حیوانات ہیں، زندگی ہے، عقل وفہم کے پیکر انسان ہیں، پھر یہاں حیرت ناک طور پر وہ موافقِ حیات چیز موجود ہے جس کو لائف سپورٹ سسٹم کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک مکمل تہذیب (civilization) موجود ہے، جو وسیع کائنات میں کہیں بھی سرے سے موجود نہیں، یعنی بظاہر ایک انتہائی بے معنی کائنات میں ایک انتہائی بامعنیٰ دنیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ وسیع کائنات میں سیارۂ زمین ایک انتہائی نادر استثنا ہے۔ یہ استثنا کوئی سادہ بات نہیں، وہ ایک عظیم حقیقت کا مشاہداتی ثبوت ہے، اور وہ ہے قادرِ مطلق خدا کا ثبوت — استثنا مداخلت کو ثابت کرتا ہے اور مداخلت بلاشبہہ مداخلت کار کا ثبوت ہے، اور جب مداخلت کار کا وجود ثابت ہوجائے تو اس کے بعد خدا کا وجود اپنے آپ ثابت ہوجاتا ہے:

Exception proves intervention and intervention proves intervenor and when the existence of intervenor is proved, the existence of God is also proved.

سفرنگ کا مسئلہ

خدا کے وجود پر شک کرنے کے لیے جو باتیں کہی جاتی ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو پرابلم آف اِول (problem of evil) یا سفرنگ (suffering) کہا جاتا ہے۔ یہ اعتراض صرف ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے، وہ یہ کہ انسانی زندگی میں جو سفرنگ ہے، وہ تمام تر مین میڈ (man-made) ہے، مگر اس کو غلط طور پر گاڈ میڈ (God-made) سمجھ لیا گیا ہے۔ انسانی زندگی میں سفرنگ کے حوالے سے جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ اِسی غلط انتساب کا نتیجہ ہے۔

اِس غلط فہمی کا اصل سبب یہ ہے کہ لوگ جب کسی انسان کی زندگی میں سفرنگ کے واقعہ کو دیکھتے ہیں تو وہ اُسی مبتلا انسان کے حوالے سے اُس کی توجیہہ کرنا چاہتے ہیں۔ چوں کہ اکثر مثالوں میں خود اُسی مبتلا انسان کے اندر اس کی توجیہہ نہیں ملتی، اس لیے اس سفرنگ کو لے کر وہ یہ کہنے لگتے ہیں کہ یا تو اس دنیا کا کوئی خدا نہیں، یا اگر خدا ہے تو وہ ظالم اور غیر منصف خدا ہے، مگر یہ انتساب بجائے خود غلط ہے۔

انسان کی زندگی میں جو سفرنگ پیش آتی ہے، اس کا سبب کبھی انسان خود ہوتا ہے اور کبھی اس کے والدین ہوتے ہیں اور کبھی اس کا سبب وہ سماج ہوتا ہے جس میں وہ رہ رہا ہے اور کبھی وسیع تر معنوں میں اجتماعی نظام اُس کا ذمے دار ہوتا ہے۔ اِسی کے ساتھ کبھی کوئی سفرنگ فوری سبب سے پیش آتی ہے اور کبھی اس کے اسباب پیچھے کئی پشتوں تک پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔

غلط ریفرنس میں مطالعہ

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ شبہے کا سبب، اصل صورتِ حال کا غلط ریفرنس میں مطالعہ ہے، یعنی جس ظاہرے کو انسان کی نسبت سے دیکھنا چاہیے، اُس کو خدا کی نسبت سے دیکھنا۔ حالاں کہ یہ سائنسی حقائق کے سرتاسر خلاف ہے۔

مثال کے طور پر موجودہ زمانے میں ایڈز (AIDS) کا مسئلہ ایک خطرناک مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر خود طبّی تحقیق کے مطابق، یہ انسانی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔ میڈیکل سائنس میں یہ مستقل نظریہ ہے کہ کئی بیماریاں اَجداد سے نسلی طور پر منتقل ہوتی ہیں۔ ایسی بیماریوں کو اجدادی

بیماری (atavistic disease) کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح مختلف قسم کی وبائیں پھیلتی ہیں جس میں ہزاروں لوگ مرجاتے ہیں، یا خرابیٔ صحت کا شکار ہوجاتے ہیں۔ یہ بھی خودطبی تحقیق کے مطابق، انسان کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔

دہلی میں معروف لیڈر ڈاکٹر اَرن شوری کے صاحب زادے مفلوج ہوکر وھیل چیئر پر رہتے ہیں۔ اِس ''سفرنگ'' کا سبب بھی یہ ہے کہ چھوٹی عمر میں امریکا کے ایک اسپتال میں اُن کو غلط انجکشن لگ گیا، اِس بنا پر وہ جسمانی اعتبار سے مفلوج ہوگیے۔ اِسی طرح تشدد اور جنگوں کے نتیجے میں بے شمار لوگ مرجاتے ہیں یا ناکارہ ہوجاتے ہیں، یہ سب بھی انسانی کارروائیوں کی بنا پر ہوتا ہے، وغیرہ۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانی سفرنگ کو نیچر سے منسوب کرنا، سرتاسر ایک غیر علمی بات ہے۔ سائنس کی تمام شاخوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نیچر مکمل طور پر خرابیوں سے پاک ہے۔ نیچر اِس حد تک محکم ہے کہ اس کی کارکردگی کے بارے میں پیشگی طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر نیچر کے اندر قابلِ پیشین گوئی کردار نہ ہوتو سائنس کی تمام سرگرمیاں اچانک ختم ہوجائیں گی۔

تقابلی مطالعہ

پرابلم آف اِول کے اِس معاملے کا علمی مطالعہ کرنے کا پہلا اصول وہ ہے جس کو تقابلی طور پر سمجھنا (in comparision that we understand) کہا جاتا ہے۔ تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ مسئلہ محدود طور پر صرف انسانی دنیا کا مسئلہ ہے، جب کہ انسان پوری کائنات کے مقابلے میں ایک بہت ہی چھوٹے جُز کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقیہ کائنات اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ مکمل طور پر ایک بے نقص کائنات (zero-defect world) ہے۔ کائنات میں بے شمار سرگرمیاں ہر آن جاری رہتی ہیں، لیکن اُس میں کہیں بھی کوئی خرابی (evil) دکھائی نہیں دیتی۔

انسانی دنیا میں بیماریاں ہیں، انسانی دنیا میں حادثات ہیں، انسانی دنیا میں ظلم ہے، انسانی دنیا میں کرپشن ہے، انسانی دنیا میں بے انصافی ہے، انسانی دنیا میں استحصال ہے، انسانی دنیا میں لڑائیاں ہیں، انسانی دنیا میں نفرت اور دشمنی ہے، انسانی دنیا میں سرکشی ہے، انسانی دنیا میں فسادات ہیں،

انسانی دنیا میں جرائم ہیں، اِس قسم کی بہت سی برائیاں انسانی دنیا میں پائی جاتی ہیں، لیکن انسان کے سوا، بقیہ کائنات اِس قسم کی برائیوں سے مکمل طور پر خالی ہے۔ یہی فرق یہ ثابت کرتا ہے کہ بُرائی کا مسئلہ (problem of evil) خود انسان کا پیدا کردہ ہے، نہ کہ فطرت کا پیدا کردہ۔ اگر یہ مسئلہ فطرت کا پیدا کردہ مسئلہ ہوتا تو وہ بلاشبہہ پوری کائنات میں پایا جاتا۔

سائنٹفک مطالعہ

اس معاملے کا سائنٹفک مطالعہ بتاتا ہے کہ انسانی دنیا اور بقیہ کائنات میں ایک واضح فرق ہے، وہ یہ کہ بقیہ کائنات حتمی قسم کے قوانینِ فطرت سے کنٹرول ہو رہی ہے۔ اِس کے برعکس، انسان آزاد ہے اور وہ خود اپنی آزادی سے اپنی زندگی کا نقشہ بناتا ہے۔ یہی فرق دراصل اُس چیز کا اصل سبب ہے، جس کو بُرائی کا مسئلہ (problem of evil) کہا جاتا ہے۔

اِس معاملے کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسانی دنیا کی تمام بُرائیاں، انسانی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ ہیں۔ میڈیکل سائنس بتاتی ہے کہ بیماریوں کا سبب نیچر میں نہیں ہے، بلکہ وہ انسان کی اپنی غلطیوں میں ہے۔ یہ غلطیاں کبھی مبتلا شخص کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں، کبھی باپ دادا کی وراثت اس کا سبب ہوتی ہے، کبھی اجتماعی نظام کا کرپشن بیماریوں کے اسباب پیدا کرتا ہے۔ یہ بات بے حد قابلِ غور ہے کہ بیماری کو نیچر سے جوڑنا ملحد مفکرین کا نظریہ ہے، وہ کسی سائنٹفک دریافت پر مبنی نہیں۔ اِسی طرح لڑائیاں، گلوبل وارمنگ، مختلف قسم کی کثافت، فضائی مسائل (ecological problems) وغیرہ، سب کے سب انسانی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ ہیں۔

خدا کا تخلیقی پلان

خالق نے انسان کو یہ آزادی (freedom) کیوں دی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خالق نے چاہا کہ وہ انسان کو ایک عظیم انعام دے۔ یہ عظیم انعام جنت ہے، جو ابدی خوشیوں کی جگہ ہے۔ جنت میں جگہ پانے کا حق دار صرف وہ شخص ہوگا جو اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرے۔ جو آزاد ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ڈسپلن اور کنٹرول میں رکھے۔ جہاں آزادی ہوگی، وہاں آزادی کا غلط استعمال بھی ہوگا۔ لیکن

آزادی اتنی زیادہ قیمتی چیز ہے کہ کسی بھی اندیشے کی بنا پر اس کو ساقط نہیں کیا جا سکتا۔

اس معاملے کو سمجھنے کے لیے خدا کے تخلیقی پلان (creation plan) کو جاننا ضروری ہے۔ خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، انسان کو اس دنیا میں مکمل آزادی دی گئی ہے۔ ایسا خدا نے مصلحتِ امتحان کے لیے کیا ہے۔ انسانی زندگی میں سفرنگ کے جو واقعات ہوتے ہیں، وہ تمام تر اسی آزادی کے غلط استعمال کے نتیجے میں ہوتے ہیں، کبھی براہِ راست طور پر اور کبھی بالواسطہ طور پر، کبھی سفرنگ میں مبتلا شخص کے ذاتی عمل کی وجہ سے اور کبھی دوسرے انسانوں کے عمل کی وجہ سے، کبھی کسی فوری غلطی کے نتیجے کے طور پر اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پچھلی نسلوں کی غلطی کی بنا پر اُس کا نتیجہ بعد کی نسلوں کے سامنے آتا ہے۔

کائناتی معنویت کی توجیہہ

خدا کے وجود کی بحث کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق، کائنات کی معنویت (meaning) سے ہے۔ خدا کو ماننا، نہ صرف کائنات کے وجود کی توجیہہ ہے بلکہ خدا کا عقیدہ کائنات کو کامل طور پر بامعنیٰ بنا دیتا ہے۔ خدا کو نہ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ بامعنیٰ کائنات ایک بےمعنیٰ انجام پر ختم ہوجائے۔ جب کہ خدا کو ماننا، یہ بتاتا ہے کہ کائنات آخر کار ایک بامعنیٰ انجام پر پہنچنے والی ہے۔

انسان کے اندر پیدائشی طور پر انصاف اور بے انصافی کا تصور پایا جاتا ہے۔ انسان پیدائشی طور پر یہ چاہتا ہے کہ جو شخص انصاف کے اصولوں کے تحت زندگی گزارے، اُس کو انعام ملے۔ اور جو شخص ناانصافی کا طریقہ اختیار کرے، اس کو سزا دی جائے۔ اِس فطری تقاضے کی تکمیل صرف باخدا کائنات (universe with God) کے نظریے میں ملتی ہے، بے خدا کائنات (universe without God) کے نظریے میں اِس فطری تقاضے کا کوئی جواب نہیں۔

ہر انسان پیدائشی طور پر اپنے اندر خواہشوں کا سمندر لیے ہوئے ہے۔ موجودہ دنیا میں اِن خواہشوں کی تکمیل (fulfillment) ممکن نہیں۔ بے خدا کائنات کے نظریے میں انسان کے لیے یہ حسرت ناک انجام مقدر ہے کہ اس کی فطری خواہشیں کبھی پوری نہ ہوں۔ لیکن باخدا کائنات کے نظریے میں یہ امکان موجود ہے کہ آدمی اپنی خواہشوں کی کامل تسکین، بعد از موت کے

مرحلۂ حیات میں پالے۔

وقت کا شعور

انسانی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان ایک ٹائم کانشش مخلوق ہے۔ وہ اپنے وقت کو حال اور مستقبل میں بانٹ کر دیکھتا ہے۔ مگر دوسری طرف یہ ایک واقعہ ہے کہ ہر آدمی کو اپنی زندگی میں صرف حال (present) ملتا ہے۔ ہر آدمی اپنے مستقبل سے محروم ہو کر مایوسی کی حالت میں مرجاتا ہے۔ وہ اپنے حال میں بہتر مستقبل کے لیے عمل کرتا ہے، لیکن اس کی محدود عمر میں اس کا وہ بہتر مستقبل اس کو نہیں ملتا اور وہ مایوسی کے ساتھ اِس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

ایک بار ہم نے انٹرنیٹ پر یہ سوال ڈالا کہ بڑے بڑے لوگوں میں وہ کون ہیں جو اپنی آخری عمر میں مایوسی کا شکار ہوئے اور ڈپریشن (depression) کی حالت میں مَرے۔ اِس کے جواب میں انٹرنیٹ نے جو فہرست دی، اس میں چار سو دو بڑے بڑے اشخاص کے نام موجود تھے۔ (کوئی شخص سرچ انجن پر جا کر اِس فہرست کو دیکھ سکتا ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے: (Risk Factor: Depression)۔ کائنات کے باخدا نظریے میں انسان کے اِس فطری سوال کا جواب موجود ہے، لیکن کائنات کے بے خدا نظریے میں اِس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں۔

زَوجین کا اصول

کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی گئی ہے— منفی برقی ذرّے کا جوڑا مثبت برقی ذرہ، درخت کے پھولوں میں نر اور مادہ، حیوانات میں مذّکر اور مؤنث۔ انسان میں عورت اور مرد، وغیرہ۔ یہ ایک کائناتی قانون ہے کہ یہاں ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر اپنی تکمیل کرتی ہے۔

اِس لحاظ سے انسانی زندگی کا بھی ایک جوڑا ہونا چاہیے، یعنی موت سے پہلے کی نامکمل زندگی کے ساتھ موت کے بعد کی کامل زندگی۔ باخدا کائنات کے نظریے میں اُس کا یہ تکمیلی جوڑا موجود ہے، لیکن بے خدا کائنات کے نظریے میں اُس کا یہ تکمیلی جوڑا موجود نہیں۔

آئڈیل ازم کی ناکامی

تمام فلاسفہ اور مفکرین موجودہ دنیا کو ابدی (eternal) سمجھتے رہے ہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اِسی موجودہ عالم میں ہم کبھی نہ کبھی اپنی مطلوب دنیا بنالیں گے۔ آئڈیل سوسائٹی، آئڈیل ریاست، آئڈیل نظام کے تصورات اِسی فکر کے تحت پیدا ہوئے۔ ایسے تمام مفکرین اِن تصورات سے اپنی آخری عمر تک مسحور رہے۔

لوگوں کے نزدیک تہذیب (civilization) اِسی انسانی خواب کی تعبیر تھی۔ موجودہ صنعتی ترقیوں کے بعد لوگوں نے یہ سمجھا کہ تہذیبی ارتقا آخر کار اُنھیں اِس منزل تک پہنچانے والا ہے، جب کہ اِسی موجودہ دنیا میں وہ اپنی جنت تعمیر کرلیں۔ لیکن یہ تصور مکمل طور پر باطل ثابت ہوا۔

دنیا کا خاتمہ

جدید سائنس کے بانی سر آئزاک نیوٹن (وفات: 1727) نے 1704 میں قوانینِ طبیعی کا مطالعہ کرکے بتایا تھا کہ موجودہ دنیا 2060 میں ختم ہوجائے گی۔ (ٹائمس آف انڈیا، 18 جون 2007)۔ اب دنیا بھر کے تمام سائنس داں خالص مشاہدات کی بنیاد پر یہ بتارہے ہیں کہ گلوبل وارمنگ کے نتیجے میں دنیا کا خاتمہ یقینی بن چکا ہے۔ تہذیب کا مزید ارتقا اب سرے سے یہاں ممکن ہی نہیں۔

الون ٹافلر (Alvin Toffler) کی کتاب 'فیوچر شاک' پہلی بار 1970 میں چھپی۔ الون ٹافلر نے بتایا تھا کہ دنیا انڈسٹریل ایج سے نکل کر اب سپر انڈسٹریل ایج میں داخل ہورہی ہے۔ تہذیب کا اگلا دَور مکمل آٹومیشن (complete automation) کا دور ہوگا۔ پُش بٹن کلچر (push button culture) اِس حد تک ترقی کرے گا کہ ہر کام آٹومیٹک طور پر ہونے لگے گا۔ لیکن گلوبل وارمنگ کا مسئلہ تکمیلِ تاریخ کے بجائے خاتمۂ تاریخ (end of history) کا پیغام لے کر سامنے آگیا۔

تاریخ انسانی کا یہ ظاہرہ بلاشبہہ آج کا سب سے بڑا سوال ہے۔ اِس سوال کی اطمینان بخش توجیہہ صرف باخدا کائنات کے نظریے میں موجود ہے۔ بے خدا کائنات کے نظریے کے تحت، اِس ظاہرے کی کوئی اطمینان بخش توجیہہ کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔

اِس طرح کی مثالیں واضح طور پر ثابت کرتی ہیں کہ بے خدا کائنات کے نظریے میں ایک بہت بڑا خلا موجود ہے، وہ یہ کہ اِس نظریے کو ماننے کی صورت میں ایک انتہائی بامعنیٰ کائنات ایک انتہائی بے معنیٰ انجام پر ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

دوسری طرف، باخدا کائنات کا نظریہ اِس نقص سے مکمل طور پر خالی ہے۔ باخدا کائنات کے نظریے کو ماننے کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ بامعنیٰ کائنات کا انجام ایک انتہائی بامعنیٰ مستقبل پر منتہی ہوتا ہے۔ یہ واقعہ، باخدا کائنات کے نظریے کے حق میں ایک ایسی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے جو عقل اور منطق کو پوری طرح مطمئن کرنے والا ہے۔

جدید الحاد——ایک تجزیہ

فکری اعتبار سے انسان کی تاریخ کو دو بڑے دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے—— قبل سائنس دور، اور بعد سائنس دور۔ قبل سائنس دور میں فکری اعتبار سے، مذہب انسان کے لیے رُجحان ساز بنا ہوا تھا۔ ماڈرن سائنس کے ظہور کے بعد یہ صورت حال بدل گئی۔ اب سائنس کو عمومی طور پر رجحان ساز (trendsetter) کا درجہ حاصل ہو گیا۔ سائنس بذاتِ خود نہ مذہب کے موافق ہے اور نہ مذہب کے خلاف، لیکن بعض وجوہ سے اس کا یہ عملی نتیجہ نکلا کہ موجودہ زمانے میں تقریباً تمام فکری معاملات میں الحادی نظریہ غالب آ گیا۔ ایسا کیوں کر ہوا، یہاں اس کا ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

موجودہ سیارۂ ارض پر انسان ہزاروں سال سے رہ رہا ہے۔ وہ روزانہ بہت سی چیزوں کو ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مثلاً سورج کا نکلنا، بارش کا برسنا اور ہواؤں کا چلنا، وغیرہ۔ روایتی طور پر انسان یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ براہِ راست طور پر خدا کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کے لیے ایک مسلّمہ یا ایک بدیہی صداقت (axiom) بن چکا تھا۔ مؤحّد انسان اور مشرک انسان، دونوں کسی نہ کسی طور پر اس کو بطور ایک مسلّمہ حقیقت کے مانتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خالق (مُسبِّب) اور نتیجے کے درمیان کسی سبب (cause) کا تصور فکری یا عملی طور پر موجود نہ تھا۔

جدید سائنس کے ظہور کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ہر نتیجے سے پہلے بظاہر اس کا ایک مادّی سبب (material cause) موجود ہے۔ مثال کے طور پر جدید سائنس کا بانی سر آئزاک نیوٹن (وفات: 1727ء) اپنے باغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے سیب کا ایک درخت تھا۔ درخت سے ایک سیب ٹوٹ کر نیچے گرا۔ نیوٹن سوچنے لگا کہ پھل درخت سے ٹوٹ کر نیچے کیوں آیا، وہ اوپر کی طرف کیوں نہیں چلا گیا۔ آخر کار اُس نے دریافت کیا کہ ہماری زمین میں قوتِ کشش (gravitational pull) ہے، اِس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ چیزیں اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہیں، وہ نیچے سے اوپر کی طرف نہیں جاتیں۔

یہ سائنسی مطالعہ بڑھا، یہاں تک کہ سائنس دانوں نے دریافت کیا کہ اِس دنیا میں جو واقعات

ہوتے ہیں، اُن سب کے پیچھے ہمیشہ ایک سبب (cause) موجود رہتا ہے، ہر نتیجہ کسی سبب کے تحت ظہور میں آتا ہے۔ سائنس دانوں نے اپنی اِس دریافت کو قانونِ تعلیل (principle of causation) کا نام دیا۔ واقعات کو مبنی بر اسباب سمجھنے کا یہ ذہن پھیلتا رہا، یہاں تک کہ وہ انسان کی تمام علمی اور فکری سرگرمیوں پر چھا گیا۔ واقعات کی توجیہہ کے لیے پہلے، خدا کا حوالہ دیا جاتا تھا، اب واقعات کی توجیہہ کے لیے خدا کے بجائے، سبب (cause) کا حوالہ دیا جانے لگا۔

سائنس کی یہ دریافت ابتدائی طور پر اپنے اندر صرف ایک طبیعی مفہوم رکھتی تھی۔ خدا کے حوالے سے واقعات کی توجیہہ نہ کرنے کے باوجود وہ خدا سے انکار کے ہم معنی نہ تھی۔ مگر ملحد مفکرین نے، نہ کہ سائنس دانوں نے، نظریاتی ہائی جیک (hijack) کے ذریعے اس کو خدا سے انکار کے ہم معنیٰ بنا دیا۔ یہیں سے وہ نظریہ شروع ہوا جس کو جدید الحاد (modern atheism) کہا جاتا ہے۔

سائنس کی اِس دریافت کو لے کر جدید ملحدین نے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اب ہمیں واقعات کی توجیہہ کے لیے خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ واقعات اگر طبیعی اسباب کا نتیجہ ہیں، تو وہ مافوق الطبیعی اسباب کا نتیجہ نہیں ہوسکتے:

If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes.

جیسا کہ آئندہ ہم واضح کریں گے کہ اِس استدلال میں واضح طور پر ناقابلِ حل منطقی خلا (logical gap) موجود تھا، اس کے باوجود جدید اہلِ علم کے درمیان اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کو خدا کا بدل سمجھا جانے لگا، یہاں تک کہ یہی طرزِ فکر تمام جدید علمی شعبوں میں چھا گیا۔ چند مثالوں سے اِس کی وضاحت ہوتی ہے۔

1- اِن میں سے ایک ماڈرن میٹریل ازم (modern materialism) ہے۔ میٹریل ازم ایک فلسفہ بھی ہے، اور ایک کلچر بھی۔ عملی طور پر دیکھیے تو میٹریل ازم کا خلاصہ یہ ہے کہ — اپنی آرزوؤں کی جنت کے حصول کے لیے اب اِس کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں کہ اگلی دنیا (آخرت) برپا ہو اور

وہاں خدا اپنی خصوصی عنایت کے طور پر ہمیں جنت عطا کرے۔ اب ہم کو وہ سبب معلوم ہو گیا ہے جس کے ذریعے اِسی دنیا میں جنت کی تعمیر ممکن ہے، یہ سبب جدید ٹکنالوجی ہے۔

چناں چہ جدید ٹکنالوجی اور جدید انڈسٹری کے ذریعے اِس جنتِ ارضی کی تعمیر کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔ مادّیت (materialism) کے نام سے ایک پوری تہذیب ظہور میں آگئی۔ آج کا انسان، خدا سے غافل ہو کر اس تہذیبی جنت کے حصول کے لیے ٹوٹ پڑا۔ جدید انداز کے مکانات اور جدید انداز کے شہر اور جدید انداز کا لائف اسٹائل ہر طرف وجود میں آنے لگا۔ تہذیبِ جدید کے تحت اِس مادّی جنت کی تعمیر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ بعد کی تحقیقات نے خود اُس کی تعمیر ہی کو سرے سے ناممکن ثابت کردیا۔ طبیعیاتی سائنس نے مزید مطالعے کے بعد بتایا کہ ہماری دنیا میں ضابطۂ ناکارگی (law of entropy) نافذ ہے۔ اِس کے تحت، دنیا مسلسل طور پر خاتمے کی طرف جارہی ہے، اور ایک دن آئے گا جب کہ وہ مکمل طور پر ختم ہو جائے۔

اکیسویں صدی میں پہنچ کر اِس میں مزید اضافہ ہوا۔ اب معلوم ہوا کہ خاتمے کی یہ مدت بہت قریب آگئی ہے۔ عین ممکن ہے کہ صرف پچاس سال کے اندر وہ تمام ذرائع اور وسائل بالکل تباہ ہو جائیں، جن کی مدد سے مفروضہ مادّی جنت تعمیر کی جارہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ عن قریب وہ اسباب ہی ختم ہو جائیں گے، جن کی بنیاد پر مادّی جنت کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

2- اِس معاملے کی ایک مثال ڈارون ازم (Darwinism) ہے۔ پچھلے ہزاروں سال سے انسان یہ مانتا چلا آرہا تھا کہ انواعِ حیات، بہ شمول انسان، کو پیدا کرنے والا خدا ہے۔ یہ خداوندِ عالم ہے جو براہِ راست اپنی تخلیق کے ذریعے تمام انواعِ حیات کو وجود میں لاتا ہے۔ مگر چارلس ڈارون نے مفروضہ طور پر یہاں بھی ایک ''سبب'' کو دریافت کرلیا، جو مختلف انواعِ حیات کو وجود میں لانے کا ذمے دار تھا۔ یہ سبب، ڈارون کے الفاظ میں، نیچرل سلیکشن (natural selection) تھا، یعنی حیاتیاتی عمل کے دوران طبیعی اسباب کے تحت مختلف انواعِ حیات ظہور میں آتی چلی گئیں۔ گویا کہ انواعِ حیات، یا انسان کو وجود میں لانے والا عُنصر ایک مادّی سبب (material cause) ہے، نہ کہ غیر مادّی خدا۔

ڈارون کا دریافت کردہ یہ سبب (cause) کبھی بھی علمی اعتبار سے ثابت شدہ نہ تھا، وہ صرف ایک مفروضہ تھا۔ مزید یہ کہ خود علماءِ حیاتیات اِس کو ایک ثابت شدہ نظریے کے بجائے صرف ایک کام چلاؤ نظریہ (workable theory) کا درجہ دیتے ہیں۔ حتی کہ خود چارلس ڈارون کو اپنے اِس دریافت کردہ مفروضہ پر آخری عمر میں شک پیدا ہو گیا تھا، چناں چہ وہ مایوسی کی حالت میں مرا۔

اِس واضح منطقی خامی کے باوجود، ڈارون کے نظریے کو جدید علمی حلقوں میں عمومی مقبولیت (general acceptance) کا درجہ حاصل ہو گیا۔ حتی کہ آج بھی یہ غیر ثابت شدہ نظریہ تمام دنیا کی یونی ورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے۔

3- اِسی کی ایک مثال مارکس ازم (Marxism) بھی ہے۔ کارل مارکس (وفات: 1883) نے سماجی معاشیات (social economy) کے معاملے میں بھی اِسی مفروضہ اصول کو منطبق کیا۔ بطور خود اس نے اُس سبب (cause) کو دریافت کیا جس کے تحت، انسانی سماج کے اندر انقلابی تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور سماج ایک خود کار مادّی عمل کے تحت، ایک حالت سے ترقی کر کے دوسری حالت تک پہنچ جاتا ہے۔

کارل مارکس نے اِس سبب کو تاریخی ناگزیریت (historical determinism) یا جدلیاتی مادّیت (dialectical materialism) کا نام دیا۔ اُس نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ سماج کے اندر ناگزیر داخلی اسباب کے تحت، دو طبقے (classes) پیدا ہوتے ہیں۔ تاریخی اسباب کے تحت، اِن طبقوں کے درمیان ٹکراؤ پیش آتا ہے، اِس کے بعد ایک طبقہ مٹ جاتا ہے اور دوسرا طبقہ اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اِس طرح داخلی اسباب کے تحت، انسانی سماج ترقی کرتا رہتا ہے۔

کارل مارکس اور اس کے ساتھیوں کا دریافت کردہ یہ سبب (cause) بھی صرف مفروضہ ثابت ہوا۔ مارکس کی پیشین گوئیوں کو غلط ثابت کرتے ہوئے، وہ کبھی واقعہ نہ بن سکا۔ جیسا کہ معلوم ہے، سوویت روس میں 1917 میں مصنوعی طور پر یہ انقلاب لایا گیا، مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ یہ نظریہ سوویت روس میں پیدا ہوا، اور سوویت روس ہی کے قبرستان میں وہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب: ''مارکس ازم — تاریخ جس کو رد کر چکی ہے'')۔

4- جدید کنزیومرازم (modern consumerism) بھی اسی نوعیت کی ایک مثال ہے۔ انسان کے اندر بے پناہ حد تک یہ خواہش ہے کہ وہ اپنے لیے ہر قسم کی راحت اور آسائش کا سامان حاصل کرے۔ جدید صنعتی ترقیوں نے بظاہر اِس کو ممکن بنا دیا۔ گویا کہ جدید صنعت وہ سبب (cause) تھا جس کے نتیجے کے طور پر انسان کو ہر قسم کی استعمالی اشیا (consumer goods) حاصل ہو سکتی تھیں۔ چناں چہ لوگ ہر جگہ قائم ہونے والے شاپنگ سنٹروں پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن آخر میں معلوم ہوا کہ یہ ''سبب'' بھی صرف ایک غلط مفروضہ تھا۔ سامانِ استعمال کی تیاری صرف اِس قیمت پر ہوئی کہ موجودہ دنیا انسان کے لیے قابلِ استعمال ہی نہ رہی۔

مثال کے طور پر کاروں اور ہوائی جہازوں نے بظاہر سفر کو آسان کر دیا، مگر اس کا ناقابلِ برداشت حد تک منفی نتیجہ کاربن ایمیشن (carbon emissions) اور گرین ہاؤس گیس (green house gases) کی شکل میں نکلا، جس کا حل تلاش کرنے میں تمام سائنس داں عاجز ہو رہے ہیں۔ ائر کنڈیشننگ کے سامانوں کی تیاری کا یہ بھیانک نتیجہ نکلا کہ زندگی بخش اوزون لیئر (Ozone layer) میں بہت بڑا سوراخ (hole) پیدا ہو گیا، جو خود انسانی زندگی کے لیے ایک ناقابلِ حل چیلنج بن گیا، وغیرہ۔ معلوم ہوا کہ غیر مضر انداز میں استعمالی اشیا بنانے کے لیے پلوشن فری انڈسٹری (pollution free industry) درکار ہے، اور پلوشن فری انڈسٹری کو قائم کرنا سرے سے انسان کے بس ہی میں نہیں۔

5- اِسی معاملے کی ایک مثال بدھ ازم میں پائی جاتی ہے۔ بدھ ازم کو موجودہ زمانے میں تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اِس مقبولیت کا راز بھی وہی چیز ہے، جس کو اوپر ہم نے قانونِ تعلیل (principle of causation) کے تحت بیان کیا ہے۔

جدید سائنس کے زیر اثر موجودہ زمانے میں وہ ذہن بنا، جو ہر چیز کو سبب اور علّت (cause and effect) کی اصطلاح میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بدھ ازم نے زندگی اور موت کے

ظاہرہ کے بارے میں اِس اصول کو منطبق کیا۔ اگرچہ یہ انطباق تمام تر قیاسی تھا، لیکن بظاہر اسباب پر مبنی ہونے کی بنا پر وہ جدید مغربی ذہن کے درمیان بہت زیادہ مقبول ہو گیا۔

موجودہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی غریب خاندان میں پیدا ہوتا ہے اور کوئی امیر خاندان میں، کوئی مصیبت میں جیتا ہے اور کوئی آرام میں۔ بدھ ازم نے مفروضہ طور پر اس کا ایک سبب دریافت کرلیا، وہ یہ کہ ہر آدمی اپنے پچھلے کرم (عمل) کے لازمی نتیجے کے طور پر اپنے عمل کے انجام کو بھگت رہا ہے۔ یہ توجیہہ چوں کہ بظاہر ''سبب'' کے اصول پر مبنی تھی، اِس لیے وہ جدید ذہن کو پسند آ گئی اور ان کے درمیان بہت زیادہ مقبول ہوگئی۔ گویا کہ یہاں بھی مادّی سبب نے غیر مادّی خدا کی جگہ لے لی۔

لیکن بدھ ازم کی یہ توجیہہ خود سائنسی تحقیق کے مطابق، سرتاسر غیر ثابت شدہ تھی۔ علمِ نفسیات کے شعبے میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا حافظہ (memory) انسانی شخصیت کا ناقابلِ تقسیم حصہ ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی انسان اپنے پچھلے جنم کے اعمال کے مطابق، ایک خاص صورت میں نیا جنم لیتا ہے تو اس کو اپنے پچھلے جنم کی ساری باتیں یاد رہنا چاہئیں۔ کیوں کہ یہ اُس کی پچھلی شخصیت (personality) ہی ہے، جو نئی شخصیت کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، کسی بھی انسان کو اپنے پچھلے جنم کا معاملہ یاد نہیں۔ بدھ ازم کے نظریے کے مطابق، ہر عورت اور مرد جس کو آج ہم دیکھتے ہیں، خواہ وہ کسی بھی مذہب یا کمیونٹی سے تعلق رکھتا ہو، وہ خود اپنے پچھلے جنم کا نیا جنم ہے، مگر اِن میں سے کسی کو بھی اپنے پچھلے جنم کی بات یاد نہیں۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی ہندو عورت یا کسی ہندو مرد کو پُراسرار طور پر سامنے لایا جاتا ہے، جو اپنے پچھلے جنم کے احوال بتاتا ہے، مگر اِس قسم کا شعبدہ کوئی دلیل نہیں۔ کیوں کہ علمی اعتبار سے ایسا واقعہ صرف اُس وقت دلیل بن سکتا ہے، جب کہ تمام ہندوؤں اور غیر ہندوؤں کو اپنے پچھلے جنم کی بات یاد ہو، نہ کہ صرف چند پُراسرار افراد کو۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گوتم بدھ نے جب سمادھی لگائی تھی تو انھوں نے ماضی میں سفر کیا تھا، اور اپنے پچھلے تما جنموں کو دیکھ لیا تھا، مگر یہ دعویٰ تمام تر صرف ایک بے بنیاد دعویٰ ہے۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق،

اِس کا کوئی ثبوت نہیں کہ گوتم بدھ نے خود اپنی زبان سے ایسا کہا تھا۔ یہ صرف بعد کے شارحین ہیں، جنھوں نے اپنے قیاس اور استنباط کے ذریعے اِس قسم کی بات کہی ہے، اور بعد کے شارحین کا استنباط اِس معاملے میں ہرگز کوئی دلیل نہیں بن سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ قانونِ تعلیل (principle of causation) اپنی ابتدا ہی میں صرف ایک مفروضے کی حیثیت رکھتا تھا، وہ کوئی علمی دلیل نہ تھا۔ اس کی شہرت یا مقبولیت اس کے علمی وزن کی بنیاد پر نہیں ہوئی، بلکہ صرف جذباتیت کی بنیاد پر ہوئی۔ لوگوں نے جلد بازی میں ایک ایسے مفروضے کو حقیقت سمجھ لیا، جو اپنے آغاز کے پہلے دن ہی صرف ایک مفروضہ تھا، نہ کہ کوئی واقعی حقیقت۔

جدید ملحدین کے اس استدلال میں واضح طور پر ایک بہت بڑا منطقی خلا تھا، وہ یہ کہ کسی واقعے کا جو سبب (cause) سائنس بتا رہی ہے، وہ اپنے آپ میں کوئی آخری بات نہیں، اس کے بعد بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ یہ سبب کیوں کر وقوع میں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سبب (cause) اصل معاملے کی توجیہہ نہیں کرتا، سبب خود اِس کا محتاج ہے کہ اُس کی کوئی توجیہہ تلاش کی جائے:

Cause does not explain, cause itself is in need of an explanation.

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج'' (God Arises)۔

خدا کا وجود اور سائنس

آئن اسٹائن کے بارے میں لوگوں کے درمیان کنفیوژن (confusion) پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ آئن اسٹائن کا کیس منکرِ خدا (atheist) کا کیس تھا۔ کچھ دوسرے لوگ اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں۔ مگر آئن اسٹائن کے مختلف بیانات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آئن اسٹائن منکرِ خدا نہیں تھا، بلکہ وہ خدا کے وجود کے بارے میں شک کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

1945 میں امریکی بحریہ کے ایک جونیر افسر گائے رینر (Guy Raner) نے خط کے ذریعہ آئن اسٹائن سے سوال کیا تھا کہ — کیا آپ ڈکشنری کے مفہوم کے اعتبار سے، منکرِ خدا ہیں، یعنی وہ آدمی جو خدا کے وجود میں عقیدہ نہیں رکھتا۔ اِس کے جواب میں آئن اسٹائن نے لکھا کہ آپ مجھ کو لاادریہ کہہ سکتے ہیں، مگر میں پروفیشنل قسم کے منکر خدا سے اتفاق نہیں رکھتا۔

In 1997, Skeptic, a hard unbelief science magazine, published for the first time a series of letters Einstein exchanged in 1945 with a junior officer in the US navy named Guy Raner on the same topic. Raner wanted to know if it was true that Einstein converted from atheism to theism when he was confronted by a Jesuit priest with the argument that a design demands a designer and since the universe is a design there must be a designer. Einstein wrote back that he had never talked to a Jesuit priest in his life but that from the viewpoint of such a person, he was and would always be an atheist. He added it was misleading to use anthropomorphical concepts in dealing with things outside the human sphere and that we had to admire in humility the beautiful harmony of the structure of this world as far as we could grasp it. But Raner persisted "Are you from the viewpoint of the dictionary", he wrote back, "an atheist, one who disbelieves in the existence of a God, or a Supreme Being." To this Einstein replied: "You may call me an agnostic, but I do not share the crusading spirit of the professional atheist whose fervour is mostly due to a painful act of liberation from the fetters of religious indoctrination received in youth. (*The Times of India,* New Delhi, May 18, 2012)

عقیدۂ خدا کے بارے میں آئن اسٹائن کا جو موقف ہے، وہی موقف تقریباً تمام سائنس دانوں کا ہے، خدا سائنسی مطالعہ (scientific study) کا موضوع نہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ سائنس داں خدا کا انکار نہیں کرتے، وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ لاادریہ (agnostic) بتاتے ہیں۔ یعنی ایک ایسا موقف جب کہ انسان نہ انکار کرنے کی پوزیشن میں ہو اور نہ اقرار کرنے کی پوزیشن میں۔

یہ صحیح ہے کہ سائنس کے مطالعے کا موضوع مادی دنیا (material world) ہے، مگر مادی دنیا کیا ہے، وہ خالق کی تخلیق (creation) ہے، اِس لیے سائنس کا مطالعہ بالواسطہ طور پر خالق کی تخلیق کا مطالعہ بن جاتا ہے۔ ایک سائنس داں خالق کے عقیدے کا انکار کرسکتا ہے، لیکن تخلیقات میں خالق کی جو نشانیاں (signs) موجود ہیں، اُن کا انکار ممکن نہیں۔

اصل یہ ہے کہ سائنس نے جس مادّی دنیا (physical world) کو دریافت کیا ہے، اس میں حیرت انگیز طور پر ایسی حقیقتیں پائی جاتی ہیں جو اپنی نوعیت میں غیر مادی ہیں۔ مثلاً معنویت، ڈزائن، ذہانت اور بامقصد پلاننگ، وغیرہ۔ مادی دنیا کی نوعیت کے بارے میں یہ دریافت گویا خالق کے وجود کی بالواسطہ شہادت ہے۔

خدا کے وجود کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے ایک سائنسی طریقہ یہاں قابلِ انطباق (applicable) ہے، وہ یہ کہ یہ دیکھا جائے کہ سائنس کی دریافت کردہ دنیا کس نظریے کی تصدیق کر رہی ہے، انکارِ خدا کے نظریے کی تصدیق یا اقرار خدا کے نظریے کی تصدیق۔ اِس اصولِ استدلال کو سائنس میں ویری فکیشن ازم (verificationism) کہا جاتا ہے۔

سائنس میں استدلال کا ایک اصول ہے، جس کو اصولِ مطابقت (principle of compatibility) کہا جاتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نظریہ جو بذاتِ خود قابلِ مشاہدہ نہ ہو، لیکن وہ مشاہدہ کے ذریعے دریافت کردہ معلومات سے مطابقت رکھتا ہو، تو اِس بالواسطہ شہادت کی بنا پر اِس نظریے کو حقیقت کا درجہ دے دیا جائے گا۔ جس نظریے کے حق میں اِس قسم کی مطابقت موجود ہو، اس کو بالواسطہ تصدیق کی بنا پر بطور حقیقت تسلیم کرلیا جائے گا۔ سائنس کے اِس اصول استدلال کو اگر عقیدۂ خدا کے

معاملے میں منطبق کیا جائے تو اصولی طور پر خدا کا عقیدہ ایک ثابت شدہ عقیدہ بن جاتا ہے۔

جو سائنس داں اپنے کیس کو لاادریہ (agnosticism) کا کیس بتاتے ہیں، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر فرار کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ خود اپنے علم کے مطابق، خدا کا انکار نہیں کر سکتے، وہ کہہ دیتے ہیں کہ ان کا کیس لاادریہ (agnostic) کا کیس ہے۔

عقیدہ خدا اور سائنس

خالص سائنسی نقطہ نظر کے مطابق، خدا کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں۔ سائنس نے اپنے طریقِ مطالعہ کے ذریعے جس چیز کو دریافت کیا ہے، وہ ہے — الیکٹران (electron) اور نیوٹران (neutron) اور پروٹون (proton)۔ مگر اِسی کے ساتھ یہ واقعہ ہے کہ اب تک کسی سائنس داں نے الیکٹرانس اور نیوٹرانس اور پروٹانس کو نہیں دیکھا ہے، نہ آنکھ سے اور نہ خوردبین سے، پھر سائنس داں اُن کے وجود پر یقین کیوں رکھتے ہیں۔ سائنس داں کے پاس اِس کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ ہم اُن کو براہِ راست نہیں دیکھتے، لیکن ہم اُن کے اثرات (effects) کو دیکھ رہے ہیں:

Though we cannot see them, we can see their effects.

مزید مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ مسئلہ صرف کاز اینڈ افیکٹ (cause and effect) کا مسئلہ نہیں ہے۔ اِس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خود سائنس کے مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ کائنات میں اعلیٰ درجے کی ذہانت (intelligence) ہے۔ کائنات میں اعلیٰ درجے کی ہم آہنگی (harmony) ہے۔ کائنات میں اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی ہے۔ اس بات کو ٹاپ کے سائنس دانوں نے تسلیم کیا ہے۔ مثلاً جیمس جینز، آرتھر ایڈنگٹن، البرٹ آئن اسٹائن، ڈیوڈ فوسچر (David Foster) اور فریڈ ہائل (Fred Hoyle)، وغیرہ۔ اب یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ، ایک سائنس داں کے الفاظ میں، کائنات کی جنس، ذہن ہے:

Molecular biology has conclusively proved that the "matter" of organic life, our very flesh, really is mind-stuff.

عقیدہ خدا اور سائنس کے معاملے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ مذہب میں جس خدا کو بطور عقیدہ پیش کیا گیا تھا، وہ اگر چہ سائنس کا براہِ راست موضوع نہیں، لیکن سائنس کی دریافتیں بالواسطہ

طور پر عقیدہ خدا کی علمی تصدیق (affirmation) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سائنس نے خدا کے عقیدے کو ثابت نہیں کیا ہے، البتہ یہ کہنا درست ہے کہ سائنس نے عقیدہ خدا کے ثبوت کا ڈاٹا فراہم کر دیا ہے۔

سائنس کے اسٹینڈرڈ ماڈل میں ایک چیز مسنگ لنک (missing link) کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ ماڈل فعل (action) کو بتاتا تھا، مگر وہ فاعل (actor) کو نہیں بتاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں، قرآن کائنات کا جو ماڈل دے رہا ہے، اس میں فعل اور فاعل دونوں موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن میں سبب (cause) کے ساتھ مسبّب (causative factor) کو بھی بتایا گیا ہے۔ سائنس جب فعل (ذہانت) کی تصدیق کر رہی ہے تو منطقی طور پر اس کا جواز نہیں کہ وہ فاعل (ذہن) کی تصدیق نہ کرے۔

خدا کا وجود

البرٹ آئن اسٹائن (Albert Einstein) اگرچہ ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا تھا، لیکن سائنسی مطالعے کے بعد وہ خدا کے وجود کے بارے میں تشکیک میں مبتلا ہو گیا۔ اپنی وفات سے ایک سال پہلے 3 جنوری 1954 کو اس نے ایک اسرائیلی فلسفی ایرک (Eric B. Gutkind) کو جرمن زبان میں ایک خط لکھا۔ اس خط کا ایک جملہ یہ تھا کہ — خدا کا لفظ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ صرف انسانی کمزوریوں کی ایک پیداوار ہے:

> The word God was nothing more than the expression and product of human weaknesses.

آئن اسٹائن نے جس چیز کو ''انسانی کمزوری'' بتایا ہے، وہ کمزوری نہیں ہے، بلکہ وہ انسان کی ایک اعلیٰ خصوصیت ہے۔ اس خصوصی کو درست طور پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان ایک توجیہہ طلب حیوان (explanation-seeking animal) ہے۔ انسان کی یہی خصوصیت تمام علمی ترقیوں کی بنیاد ہے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر انسان چیزوں کی توجیہہ تلاش کرتا ہے اور پھر وہ بڑی بڑی ترقیوں تک پہنچتا ہے۔ انسان کے اندر اگر یہ خصوصیت نہ ہوتی تو انسانی تہذیب (human civilization) پوری کی پوری غیر دریافت شدہ حالت میں پڑی رہتی۔

خود آئن اسٹائن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اپنی عمر کے آخری 30 سال کے دوران وہ ایک سوال کا سائنسی جواب پانے کی کوشش کرتا رہا، مگر وہ اِس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ یہ سوال آئن اسٹائن کے الفاظ میں، یونی فائڈ فیلڈ تھیوری (unified field theory) کی دریافت ہے۔ سائنسی اعتبار سے یہ سوال اتنا زیادہ اہم ہے کہ آج وہ تمام نظریاتی سائنس دانوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اب اِس سوال کو عام طور پر تھیوری آف ایوری تھنگ (Theory of Everything) کہا جاتا ہے۔

یہ 'تھیوری آف ایوری تھنگ' کیا ہے۔ یہ دراصل ایک ایسا ریاضیاتی فارمولا دریافت کرنا ہے جو تمام کائناتی مظاہر کی سائنسی توجیہہ کر سکے۔ تھیوری آف ایوری تھنگ کا مطلب ہے:

Theory that explains everything.

ایک سائنسی ادارہ (European Organization for Nuclear Research) کے تحت سوئزر لینڈ میں ایک پروجیکٹ قائم کیا گیا۔ اسکا نام یہ تھا— لارج ہیڈرون کولائڈر (Large Hadron Collider)۔ یہ پروجیکٹ 1998 میں قائم کیا گیا۔ اِس پروجیکٹ پر ایک سو ملین ڈالر خرچ ہوئے۔ اِس میں دنیا کے ایک سو ملک اور دس ہزار سائنس دانوں اور انجینئروں کا تعاون شامل تھا۔ اگر چہ یہ پروجیکٹ کامیاب نہ ہوسکا، تاہم اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ 'تھیوری آف ایوری تھنگ' کو دریافت کیا جائے۔

'تھیوری آف ایوری تھنگ، یا زیادہ درست طور پر، ایکسپلنیشن آف ایوری تھنگ کی تلاش پر تقریباً 90 سال گزر چکے ہیں، مگر اِس معاملے میں سائنس دانوں کو کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ مظاہرِ کائنات کی توجیہہ خدا کے وجود کو مان کر حاصل ہوتی ہے۔ کوئی ریاضیاتی فارمولا کبھی اِس کا جواب نہیں بن سکتا۔ ریاضیاتی فارمولے میں اِس سوال کا جواب تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے پیاس کو بجھانے کے لیے پانی کے سوا کسی اور چیز کو اس کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرنا۔

سائنس اور عقیدۂ خدا

1927 میں بلجیم کے ایک سائنس داں جارجز لیمٹری (Georges Lemaitre) نے

بگ بینگ کا نظریہ پیش کیا۔ اِس نظریے پر مزید تحقیق ہوتی رہی، یہاں تک کہ اِس کی حیثیت ایک مسلّمہ واقعہ کی ہوگئی۔ آخر کار 1965 میں بیگ گراؤنڈ ریڈی ایشن (background radiation) کی دریافت ہوئی۔ اِس سے معلوم ہوا کہ کائنات کے بالائی خلا میں لہردار سطح پائی جاتی ہیں۔ یہ بگ بینگ کی شکل میں ہونے والے انفجار کی باقیات ہیں۔ اِن لہروں کو دیکھ کر ایک امریکی سائنس داں جویل پرائمیک (Joel Primack) نے کہا تھا کہ — یہ لہریں خدا کے ہاتھ کی تحریر ہیں:

The ripples are no less than the handwriting of God.

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب 'عظمتِ اسلام'، صفحہ 33)

جارج اسموٹ 1945 میں پیدا ہوا۔ وہ ایک امریکی سائنس داں ہے۔ اس نے 2006 میں فزکس کا نوبل پرائز حاصل کیا۔ یہ انعام اُن کو 'کاسمک بیک گراؤنڈ ایکسپلورر' کے لیے کام کرنے پر دیا گیا۔ 1992 میں جارج اسموٹ نے یہ اعلان کیا کہ بالائی خلا میں لہردار سطحیں پائی جاتی ہیں۔ یہ بگ بینگ کی باقیات ہیں۔ اُس وقت جارج اسموٹ نے اپنا تاثر اِن الفاظ میں بیان کیا تھا — یہ خدا کے چہرے کو دیکھنے کے مانند ہے:

George Fitzgerald Smoot III (born February 20,1945) is an American astrophysicist, cosmologist. He won the Nobel Prize in Physics in 2006 for his work on the Cosmic Background Explorer. In 1992 when George Smoot announced the discovery of ripples in the heat radiation still arriving from the Big Bang, he said it was "like seeing the face of God". (*God For The 21st Century,* Templeton Press, May 2000, 204 pages)

دو عظیم فکری انقلابات

Two Great Intellectual Revolutions

مذہبی نقطۂ نظر سے انسانی تاریخ میں دو بڑے فکری انقلابات پیش آئے ہیں۔ ایک انقلاب وہ جو اپنی آخری صورت میں ساتویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ اِس انقلاب کے ہیرو وہ لوگ تھے جن کو اسلامی تاریخ میں 'اصحابِ رسول' کہا جاتا ہے۔ دوسرا فکری انقلاب لانے والوں کو حدیث میں 'اخوانِ رسول' کا نام دیا گیا ہے۔ اصحاب رسول نے شرک (polythiesm) کے فکری غلبہ کو ختم کیا تھا اور توحید (monotheism) کے بند دروازوں کو کھولا تھا۔ اخوانِ رسول کے لیے یہ مقدر ہے کہ وہ موجودہ زمانے میں الحاد کے فکری غلبہ کو ختم کر کے دوبارہ توحید کو اس کا غالب مقام عطا کریں۔

اسلام کے مطابق، امت کے دو گروہ ایسے ہیں جن کو خصوصی تاریخی درجہ حاصل ہے— اصحابِ رسول، اوراخوانِ رسول۔ یہ دونوں پُراسرار الفاظ نہیں ہیں اور نہ کسی پراسرار فضیلت کی بنا پر اُن کو یہ امتیازی درجہ عطا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں گروہ اسلام کی تاریخ میں دو بڑے کارنامے انجام دیں گے۔ اِسی کارنامے کی بنا پر وہ بڑا درجہ پائیں گے اصحابِ رسول کے کارنامے کا تعلق، اسلام کے دورِاول سے ہے،اوراخوانِ رسول وہ لوگ ہیں جو اسلام کے دورِ آخر میں اپنا کارنامہ انجام دیں گے۔

اصل یہ ہے کہ تاریخ کے دو دور ہیں۔ پہلا، دورِشرک اور دوسرا، دورِالحاد۔ قدیم بادشاہت کے زمانے میں شرک کو ریاستی مذہب (state rligion) کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اِس بنا پر قدیم زمانے میں مذہبی جبر (religious persectution) کے حالات پیدا ہوئے۔ اصحابِ رسول نے یہ کیا کہ غیر معمولی جدوجہد اور قربانی کے ذریعے شرک کا رشتہ سیاسی اقتدار سے منقطع کر دیا اور اِس طرح شرک کو مکمل طور پر ایک بے زور عقیدہ بنا دیا، اصحابِ رسول کا یہی وہ غیر معمولی عمل تھا جس کی بنا پر دنیا میں مذہبی آزادی (religious freedom) کا دور آیا اور شرک محض ایک بے زور شخصی عقیدہ بن کر رہ گیا۔

بعد کے زمانے میں ایک نیا فتنہ پیدا ہوا جس کو سائنسی الحاد کہا جا سکتا ہے۔ الحاد (atheism)

ہمیشہ سے دنیا میں پایا جاتا رہا ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں ملحد مفکرین کو یہ موقع ملا کہ وہ بظاہر سائنسی دلائل کے ذریعے الحاد کو نئی طاقت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرسکیں۔ مثال کے طور پر ڈارون ازم (Darwinism) کو الحاد کی حمایت میں سائنسی دلیل کے طور پر پیش کرنا۔

موجودہ زمانے کا سائنسی الحاد اصلاً سائنسی الحاد نہیں ہے، بلکہ وہ مغالطہ آمیز قسم کے بظاہر سائنسی دلائل کی بنیاد پر الحادی فکر کی عمارت کھڑی کرنا ہے۔ اب اُن لوگوں کو اخوانِ رسول کا درجہ ملے گا جو اِس فریب کا پردہ چاک کریں اور الحاد کا رشتہ مفروضہ دلائل سے منقطع کردیں اور اِس طرح الحاد کو بے دلیل اور علمی اعتبار سے بے وزن بنادیں۔

پچھلے دور میں اصحابِ رسول نے جو کارنامہ انجام دیا، اُس کے لیے اللہ تعالیٰ نے سیکڑوں سال کے عمل کے دوران مخصوص تاریخی حالات پیدا کیے تھے۔ یہ تاریخی حالات وہ مواقع تھے جن کو اصحاب رسول نے سمجھا اور اُن کو دانش مندانہ طور پر استعمال کرکے مطلوب انقلاب برپا کیا۔ اِسی طرح بعد کے زمانے میں اخوانِ رسول کے ذریعے جو فکری انقلاب واقع ہوگا، اس کے لیے ضروری مواقع بھی خدا کی طرف سے پیدا کیے جانے والے ہیں۔ اخوانِ رسول کا کام بھی یہی ہے کہ وہ اپنے دور میں پیدا ہونے والے مواقع کو سمجھیں اور اُن کو دانش مندانہ طور پر استعمال کرکے اُس تاریخی عمل کو انجام دیں جس کو ظہور میں لانا اُن کے لیے مقدر کیا گیا ہے۔ ذیل میں دوسرے دور کے حالات کا مختصر طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

جدید الحاد

الحاد (atheism) کوئی نیا ظاہرہ نہیں۔ قدیم زمانے میں بھی کسی نہ کسی صورت میں الحادی فکر پایا جاتا رہا ہے۔ لیکن قدیم زمانے میں الحاد کے لیے کوئی فکری بنیاد (rational base) موجود نہ تھی۔ اِس لیے قدیم زمانے میں الحاد کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہوسکا۔

موجودہ زمانے میں جب سائنسی تحقیقات سامنے آئیں تو دورِ جدید کے ملحدین نے محسوس کیا کہ وہ سائنسی تحقیقات کو اپنے حق میں ایک علمی ثبوت کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں۔ اِس طرح وہ فلسفہ وجود میں آیا جس کو سائنسی فلسفہ (scientific philosophy) کہا جاتا ہے۔ سائنسی فلسفہ کیا ہے۔

سائنسی فلسفہ دراصل مبنی بر سائنس الحاد (science-based atheism) کا دوسرا نام ہے۔ اِس طرح بیسویں صدی عیسوی میں بہت سے فلسفی اٹھے جنھوں نے سائنسی تحقیقات کو ملحدانہ فلسفے کے حق میں استعمال کیا۔ اِس طرح وہ جدید الحاد وجود میں آیا جس کو سائنسی الحاد کہا جاسکتا ہے۔ اِس موضوع پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ بطور مثال یہاں صرف ایک کتاب کا نام درج کیا جاتا ہے:

Julian Huxley, *Religion Without Revelation*

سائنسی الحاد، خالص منطقی اعتبار سے، ایک غیر علمی الحاد ہے۔ سائنسی الحاد کے داعیوں نے غیر علمی طور پر سائنسی حقیقتوں کو اپنے حق میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ چناں چہ اِسی زمانے میں ایک اور طبقہ پیدا ہوا جو نسبتاً زیادہ سنجیدہ تھا۔ وہ سائنسی حقائق کے غیر علمی استعمال کے خلاف تھا۔ اِس دوسرے طبقے نے کوشش کی کہ سائنسی حقائق کو اس کے صحیح تناظر (perspective) میں پیش کیا جائے۔ یہ دوسرا طبقہ اپنے اعلان کی حد تک مذہبی نہیں تھا، وہ بظاہر سیکولر تھا۔ لیکن اُس نے یہ اہم کام انجام دیا کہ اس نے جدید ملحدین کو خالص علمی اعتبار سے مکمل طور پر رد کردیا۔ اِس معاملے کے چند خاص پہلو ہیں۔

1- اُس کا ایک پہلو یہ ہے کہ جدید سائنس (physical science) نے اپنا میدان تمام تر مادّی اشیاء کی تحقیق کو بنایا۔ اِس کے نتیجے میں بڑی بڑی مادی حقیقتیں دریافت ہوئیں اور مادی نظریات قائم ہوئے۔ اِس صورتِ حال کو استعمال کرتے ہوئے جدید ملحدین نے یہ کیا کہ انھوں نے سچائی کی مادّی تعبیر (material interprtation of truth) کا نظریہ وضع کیا۔ انھوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ حقیقت وہی ہے جو مادی اصطلاحوں میں بیان کی جاسکے، جو چیز مادی اصطلاحوں میں بیان نہ کی جاسکے، وہ حقیقت بھی نہیں۔ اِس نظریے کے رد میں کئی مفکرین نے قیمتی کتابیں لکھیں۔ بطور مثال ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Bertrand Russel, *Human Knowledge*

2- اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ فزیکل سائنس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں، اُن کے پیچھے کوئی سبب کارفرما ہوتا ہے۔ مثلاً پانی کو گرم کرنے سے اسٹیم کا وجود میں آنا۔ سائنس

کے اس پہلو کو لے کر وہ الحاد موافق نظریہ وضع کیا گیا جس کو اصولِ تعلیل (principle of causation) کہا جاتا ہے۔ اِس نظریے کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا گیا کہ ہماری دنیا میں جو واقعات وجود میں آتے ہیں، وہ کسی مادی سبب کا نتیجہ ہوتے ہیں، نہ کہ کسی خالق کی کارفرمائی کا نتیجہ۔ اِس نظریہ کی تردید میں متعدد قیمتی کتابیں لکھی گئیں۔ مثال کے طور پر اُن میں سے ایک کتاب کا نام یہاں درج کیا جاتا ہے:

James Jeans, *The Mysterious Universe*

3- اِس معاملے میں غالباً سب سے زیادہ گم راہ کن رول چارلس ڈارون کا ہے۔ اس نے حیاتیاتی نمونوں کے مطالعے کے دوران یہ پایا کہ مختلف حیاتیاتی نمونوں کے درمیان مشابہت (similarity) پائی جاتی ہے۔ اِس کو لے کر اس نے یہ دعویٰ کیا کہ تمام ذی حیات اشیاء ایک ہی مشترک اصل سے نکلی ہیں۔ یہ تصور نظریۂ ارتقا (theory of evolution) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ نظریہ جدید دور میں بہت زیادہ پھیلا۔ اس کے بارے میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں، یہاں تک کہ جدید علمی حلقے میں اس کو عمومی مقبولیت (general acceptance) حاصل ہوگئی۔

اپنی حقیقت کے اعتبار سے، یہ نظریہ تمام تر علمی مغالطے پر قائم ہے۔ چناں چہ اس کے بارے میں سیکولر علما نے تحقیق کی اور اِس نظریے کی تردید میں متعدد قیمتی کتابیں شائع ہوئیں۔ مثال کے طور پر اُن میں سے ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Lunn, *Revolt Against Reason*

دورِ جدید کے یہ اہلِ علم جن کو ہم نے سیکولر اہلِ علم کہا ہے، انھوں نے بہت بڑا تائیدی رول انجام دیا ہے۔ قدیم زمانے میں بہت سے لوگوں نے عظیم تائیدی رول انجام دیا تھا۔ انھوں نے وہ مواقع پیدا کیے تھے جن کو استعمال کر کے اصحابِ رسول نے شرک کے رد اور توحید کے اثبات کا تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ اِسی طرح موجودہ زمانے کے مذکورہ سیکولر اہلِ علم نے ایک عظیم تائیدی رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے وہ مواقع پیدا کیے ہیں جن کو استعمال کر کے دوبارہ الحاد کے رد اور توحید کے اثبات کا مطلوب عمل انجام دیا جا سکے۔ بعد میں آنے والے جس گروہ کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے،

اُس کا کام غالباً یہی ہوگا کہ وہ جدید مواقع کو پہچانے اور ان کو دانش مندانہ استعمال کے ذریعے دوبارہ الحاد کی تردید اور توحید کے اثبات کا مطلوب کارنامہ انجام دے۔

سائنس الحاد کی تردید

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، قدیم زمانے میں یہ مطلوب تھا کہ شرک کو رد کرکے توحید کا اثبات کیا جائے۔ یہ کارنامہ اصحابِ رسول نے اپنی کامل صورت میں ساتویں صدی عیسوی میں انجام دیا۔ انھوں نے اپنے زمانے میں پیدا شدہ مواقع کو استعمال کرتے ہوئے ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس نے انسانی تاریخ میں ایک نئے عمل (process) کا مؤثر آغاز کیا۔ یہ عمل جاری رہا، یہاں تک کہ شرک، نظریاتی بنیاد (ideological base) سے محروم ہوگیا۔ اب وہ صرف ایک بے روح رسم کے طور پر کچھ توہم پسند لوگوں میں باقی ہے، عملی اعتبار سے وہ ایک زندہ قوت کے طور پر کہیں موجود نہیں۔

یہی معاملہ الحاد کا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں الحاد بظاہر سائنسی دلائل کے زور پر ابھرا تھا۔ لیکن جلد ہی خود سیکولر حلقے میں ایسے مفکرین پیدا ہوئے جنھوں نے عملی طور پر الحاد کی بظاہر اِس سائنسی بنیاد کو ڈھا دیا اور حقیقت کے اعتبار سے الحاد کو ایک بے دلیل نظریے کی حیثیت دے دی۔ اِس طرح موجودزمانے میں دوبارہ مکانی طور پر وہ موافق حالات پیدا ہوئے ہیں جن کو لے کر کچھ لوگ الحاد کو مکمل طور پر رد کردیں اور اس کے بجائے توحید کو ایک ثابت شدہ نظریہ بنادیں، اور اِس طرح وہ اُس رول کو انجام دیں جس کو اخوانِ رسول کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔

یہ حالات پیدا ہوچکے تھے اور میں اکثر ان کے بارے میں غور کرتا تھا۔ آخرکار 1963 میں ایک واقعہ پیش آیا جو میرے لیے گویا کہ ایک رہنما واقعے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِس واقعے کا ذکر میں نے اپنی کتاب ''ظہورِ اسلام'' کے آغاز میں اس طرح کیا ہے:

''ستمبر 1963 کی 21 تاریخ تھی۔ راقم الحروف ندوہ (لکھنؤ) کی مسجد میں تھا اور ظہر کی سنتیں پڑھ کر جماعت کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ذہن میں خیال گھوم رہا تھا کہ اسلام کے تعارف کے لئے آج ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو وقت کی زبان اور اسلوب میں لکھی

گئی ہواور جدید انسان کو مطالعہ کے لیے دی جا سکے۔'' کاش اللہ تعالیٰ مجھے اِس کتاب کے لکھنے کی توفیق دے'' یہ تمنا بے ساختہ دعا کی شکل میں میری زبان سے نکلی اور اس کے بعد یکا یک یہ انگریزی لفظ میری زبان پر تھا:

God Arises

یہ گویا کتاب کا نام تھا جو اچانک میرے ذہن میں وارد ہوا۔ اس سے پہلے کبھی یہ فقرہ میرے ذہن میں نہیں آیا تھا، حتی کہ کتاب کے نام کی حیثیت سے اس کی معنویت بھی اُس وقت پوری طرح واضح نہ تھی۔ شام کو عصر کی نماز کے بعد میں حسب معمول لکھنؤ کی نریندر لائبریری گیا جو ندوہ کے قریب دریائے گومتی کے کنارے واقع ہے۔ وہاں ویبسٹر کی لغت میں لفظ Arises کے استعمال دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ لفظ بائبل کی ایک آیت میں استعمال ہوا ہے۔ پورا فقرہ یہ ہے:

Let God arise, let His enemies be scattered.
Let them also that hate Him flee before Him.
As smoke is driven away, so drive them away;
As wax metlteth before the fire, so let
the wicked perish at the presence of God

خدا اٹھے، اس کے دشمن تتر بتر ہوں۔ وہ جو اس کا کینہ رکھتے ہیں، اس کے حضور سے بھاگیں، جس طرح دھواں پراگندہ ہوتا ہے، اسی طرح تو انھیں پراگندہ کر۔ جس طرح موم آگ پر پگھلتا ہے، شریر خدا کے حضور فنا ہوں''۔

یہ میرے لیے ایک انسپریشن (inspiration) تھا۔ یہ گویا ایک قسم کا الہامی تجربہ تھا جو مسجد کے اندر اذان اور اقامت کے درمیان پیش آیا۔ اِس پر غور کرنے کے بعد میں نے سمجھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اشارہ ہے، تاکہ میں پیدا شدہ جدید علمی مواقع کا جائزہ لوں اور اُن کو الحاد کی تردید اور توحید کے علمی اثبات کے لیے استعمال کروں۔ یہ گویا سیکولر اہلِ علم کے پیدا کردہ علمی امکانات کو اسلامائز کرنا تھا۔ اور جدید دور میں اظہارِ دین کے اُس علمی واقعے کو بروئے کار لانا تھا جس کے امکانات وقوع میں آچکے ہیں، لیکن ابھی ان کو استعمال نہ کیا جاسکا۔

اِس موضوع پر میں پہلے بھی کام کر رہا تھا۔لیکن مذکورہ تجربے کے بعد میرے شعور میں ایک نئ بیداری آئی اور میں اِس قابل ہو گیا کہ زیادہ حوصلے کے ساتھ اِس علمی خدمت کو انجام دوں۔آخر کار، طویل کوشش کے بعد وہ کتاب وجود میں آئی جو مذکورہ تجربے کی روشنی میں گاڈ ارائزز (God Arises) کے نام سے 1985 میں شائع ہوئی۔اِس سے پہلے یہ کتاب اردو اور عربی زبان میں چھپ چکی تھی۔ لیکن مذکورہ انگریزی ایڈیشن مزید اضافے کے ساتھ اس کا زیادہ جامع ایڈیشن تھا۔

اِس کے بعد یہی موضوع (modern challenges to Islam) میرا مستقل موضوع بن گیا۔ اس کے بعد مضامین اور کتابوں کی شکل میں میری سیکڑوں کوششیں مختلف زبانوں میں شائع ہوئیں۔ میری اِن تمام تحریروں کا موضوع مشترک طور پر صرف ایک تھا، اور وہ ہے — اسلام اور عصری تحدیات۔ اِس کے بعد براہِ راست یا بالواسطہ طور پر یہی میری زندگی کا مستقل موضوع بن گیا۔

خدا کا وجود

آج کی شام کے لئے جو موضوع ہے، وہ یہ ہے — خدا کی دریافت کس طرح کی جائے:
How to discover God?

خدا کی دریافت کا معاملہ کوئی اکیڈمک معاملہ نہیں، یہ ہر انسان کا ایک ذاتی سوال ہے۔ ہر عورت اور مرد فطری طور پر اُس ہستی کو جاننا چاہتے ہیں جس نے اُن کو وجود دیا۔ میں بھی دوسروں کی طرح، اِس سوال سے دوچار ہوا ہوں۔ میری پیدائش ایک مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اِس کے اثر سے میں روایتی طور پر خدا کو ماننے لگا۔ بعد کو جب میرے شعور میں پختگی (maturity) آئی تو میں نے چاہا کہ میں اپنے اِس عقیدے کو ریزن آؤٹ (reason out) کروں۔ اِس معاملے کی تحقیق کے لئے میں نے تمام متعلق علوم کو پڑھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، خدا کا موضوع تین علمی شعبوں سے تعلق رکھتا ہے — فلسفہ، سائنس اور مذہب۔ یہاں میں فلسفہ اور سائنس کی نسبت سے اپنے کچھ تجربات بیان کروں گا۔

سب سے پہلے مجھے فلسفہ میں اِس سوال کا ایک جواب ملا۔ مطالعہ کے دوران میں نے فرانس کے مشہور فلسفی رینے ڈیکارٹ (وفات: 1650) کو پڑھا۔ وہ انسان کے وجود کو ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا کہ — میں سوچتا ہوں، اِس لئے میں ہوں (I think, therefore I am)۔

ڈیکارٹ کا یہ فارمولا جس طرح انسان کے وجود پر منطبق ہوتا ہے، اُسی طرح وہ خدا کے وجود کے لیے بھی قابلِ انطباق (applicable) ہے۔ میں نے اِس قول پر اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ — انسان کا وجود خدا کے وجود کو قابلِ فہم بناتا ہے:

Existence of man makes the existance of God understandable.

خدا کے وجود کے بارے میں یہ میرا پہلا فلسفیانہ استدلال تھا۔ میں نے کہا کہ — میرا وجود ہے، اِس لیے خدا کا بھی وجود ہے (I am, therefore God is)۔

فلسفہ کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تقریباً تمام فلسفی کسی نہ کسی طور پر ایک برتر ہستی کا اقرار

کرتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے ''خدا'' کا لفظ استعمال کرنے سے احتراز کیا، لیکن کچھ دوسرے الفاظ بول کر وہ خدا جیسی ایک ہستی کی موجودگی کا اعتراف کرتے رہے۔ مثلاً جرمنی کے مشہور فلسفی فریڈرک ہیگل (وفات: 1831) نے اِس برتر ہستی کو ورلڈ اسپرٹ (world spirit) کا نام دیا، وغیرہ۔

اِس کے بعد میں نے چاہا کہ میں سائنسی طریقِ استدلال (scientific method) کے ذریعے اِس معاملے کی تحقیق کروں۔ سائنسی مطالعہ میں جو مسلّمہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے، وہ مشاہدات پر مبنی ہوتا ہے۔ مگر اس مشاہداتی استدلال کے دو دور ہیں۔ سائنس کا مطالعہ جب تک عالمِ کبیر (macro world) تک محدود تھا، اُس وقت تک اِس استدلال کا صرف ایک طریقہ رائج تھا۔ لیکن جب سائنس کا مطالعاتی سفر عالمِ صغیر (micro world) تک پہنچ گیا تو اِس استدلال میں ایک تبدیلی واقعہ ہوئی۔ وہ یہ کہ پہلے اگر مشاہداتی استدلال (observational argument) کو درست مانا جاتا تھا، تو اب استنباطی استدلال (inferential argument) کو بھی یکساں طور پر درست (valid) مانا جانے لگا، یعنی پہلے اگر آرگومینٹ فرام سین ٹو سین (argument from seen to seen) کا اصول رائج تھا تو اب آرگومینٹ فرام سین ٹو اَن سین (argument from seen to unseen) کا اصول بھی درست استدلال کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔ اِن دونوں طریقوں کو فنی زبان میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

1. Observation, hypothesis, verification
2. Hypothesis, observation, verification

ایک سادہ مثال سے اس معاملے کی عملی وضاحت ہوتی ہے۔ مثلاً آپ سیب کو شمار کرنا چاہتے ہیں تو آپ کہتے ہیں — دو سیب جمع دو سیب، برابر چار سیب۔ یہ مشاہداتی استدلال کی ایک مثال ہے۔ دوسرے استدلال کی مثال یہ ہے کہ نیوٹن (وفات: 1727) نے دیکھا کہ ایک سیب درخت سے گر کر نیچے آیا۔ یہ ایک مشاہدہ تھا۔ اُس نے سوچنا شروع کیا کہ سیب درخت سے ٹوٹ کر اوپر کیوں نہیں گیا، وہ نیچے کیوں آگیا۔ اِس سوچ کے بعد وہ ایک استنباط تک پہنچا، وہ یہ کہ زمین میں قوتِ کشش ہے۔ اِس

کے بعد اس نے دوسرے متعلق شواہد (relevant data) کا جائزہ لیا تو اِس بات کی تصدیق ہوگئی کہ اس کا استنباط درست (valid) تھا۔ سائنسی میتھڈالوجی کو سمجھنے کے لیے میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ یہاں میں ایک کتاب کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ مشہور برٹش فلسفی برٹرینڈ رسل (وفات: 1970) کی کتاب ہیومن نالج (Human Knowledge) ہے۔ اِس کتاب میں مصنف نے بتایا ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں — چیزوں کا علم، سچائیوں کا علم:

Knowledge of things, knowledge of truths

چیزوں کی دریافت میں مشاہداتی طریقِ استدلال کارآمد ہے، لیکن خدا کے وجود کا معاملہ سچائی کے موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس لیے اس معاملے میں وہی استدلال قابل انطباق ہے جس کو استنباطی استدلال (inferential argument) کہا جاتا ہے۔

غالباً 1965 کی بات ہے، میری ملاقات ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص سے ہوئی۔ وہ فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ اُن سے خدا کے وجود کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے ایک سوال کیا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے پاس کرائٹیرین کیا ہے:

What criterion do you have to prove the existence of God.

میں نے جواب دیا کہ — وہی کرائٹیرین جو آپ کے پاس اِس نوعیت کی کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے ہو (Same criterion that you have to prove anything else)۔

اِس کے بعد میں نے اُن کے سامنے مذکورہ طریقِ استدلال کی وضاحت کی۔ میں نے کہا کہ خدا کے وجود کا معاملہ سچائی (truth) کے موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ سچائی کی نوعیت کی کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے جس کرائٹیرین کو استعمال کرتے ہیں، اُسی کرائٹیرین کو خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیجئے، اور پھر آپ جان لیں گے کہ خدا کا وجود بھی اُسی علمی معیار سے ثابت ہوتا ہے، جس علمی معیار سے اِس نوعیت کی دوسری چیزیں ثابت ہورہی ہیں۔

سنجیدہ اہلِ علم نے اِس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ مثلاً برٹرینڈ رسل نے اعتراف کیا ہے کہ تھیالوجین

عام طور پر خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے وہ طریقہ استعمال کرتے ہیں جس کو ڈزائن سے استدلال (argument from design) کہا جاتا ہے۔ برٹرینڈ رسل کے مطابق، یہ طریقہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے پورے معنوں میں سائنسی منطق (scientific logic) پر مبنی ہے۔ اِس لیے یہ استدلال اصولی طور پر اتنا ہی حقیقی ہے، جتنا کہ کوئی دوسرا سائنسی استدلال۔ اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے:

Where there is design, there is designer and when designer is proved, the existence of God is also proved.

اشیا کا سائنسی مطالعہ 1609 میں شروع ہوا، جب کہ اطالوی سائنس داں گلیلیو (وفات: 1642) نے ابتدائی دوربین (telescope) کے ذریعے ستاروں کا مشاہدہ کیا۔ اس کے بعد دوربینی مشاہدے میں مزید ترقی ہوئی، یہاں تک کہ 1949 میں پیلومر آبزرویٹری (کیلی فورنیا) قائم ہوئی جس کے ذریعے زیادہ بڑے پیمانے پر آسمانی مشاہدہ ممکن ہوگیا۔ اِس کے بعد الیکٹرانک دوربین ایجاد ہوئی جس کو 1990 میں امریکا کی ہبل آبزرویٹری میں نصب کیا گیا۔

اِس قسم کے مطالعے کے ذریعے معلوم ہوا کہ تقریباً 15 بلین سال پہلے خلا میں بگ بینگ کا واقعہ ہوا جس کے بعد ستاروں اور سیاروں کی موجودہ دنیا وجود میں آئی۔ اِس کے بعد تقریباً ایک بلین سال پہلے لٹل بینگ (little bang) ہوا جس کے ذریعے موجودہ شمسی نظام (solar system) وجود میں آیا۔ اس کے بعد سیارۂ ارض پر واٹر بینگ (water bang) ہوا اور زمین پانی سے بھر گئی۔ اس کے بعد زندگی اور زندگی سے متعلق تمام چیزیں پیدا ہوئیں۔

بگ بینگ کے واقعہ کے مزید مطالعے کے لیے 1989 میں امریکا کے ادارہ ناسا (NASA) نے ایک خصوصی سٹلائٹ (Cosmic Background Explorer) خلا میں بھیجا۔ اِس سٹلائٹ نے بالائی خلا کی جو تصویریں بھیجی ہیں، اُن سے معلوم ہوا ہے کہ کائنات کے بیرونی حصے میں لہر دار سطح (ripples) موجود ہیں۔ تصویر میں اِن لہروں کو دیکھ کر ایک مغربی سائنس داں بولٹزمن (Boltzmann) نے کہا — وہ کون خدا تھا جس نے یہ نشانیاں لکھ دیں:

Who was the God who wrote these signs?

یہ بات صرف بگ بینگ سے نکلی ہوئی لہروں تک محدود نہیں ہے، بلکہ کائنات میں پھیلی ہوئی بے شمار چیزوں کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ایک سنجیدہ انسان جب کائنات کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے—وہ کون خدا تھا جس نے اِن تمام نشانیوں کو لکھا:

Who was the God who wrote all these signs?

کائنات کا جب سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری کائنات ایک بے نقص (zero-defect) کائنات ہے۔ وسیع خلا میں بے شمار ستارے اور سیارے مسلسل طور پر حرکت میں ہیں، مگر ہمارے شہروں کے برعکس، خلا میں کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوتا۔ گویا کہ عظیم خلا میں نہایت وسیع پیمانے پر ایک ایکسڈنٹ فری ٹریفک (accident-free traffic) قائم ہے۔ ہماری زمین پر نیچر روزانہ بہت سے واقعات ظہور میں لا رہی ہے۔ یہ گویا ایک عظیم صنعتی نظام ہے۔ مگر یہ نظام زیرو ڈیفیکٹ انڈسٹری (zero-defect industry) کی سطح پر چل رہا ہے۔ یہ بے مثال کائناتی کنٹرول اور یہ آفاقی توازن پکار رہا ہے کہ بلاشبہہ اِس کے پیچھے ایک عظیم خدا ہے جو اِن واقعات کو ظہور میں لا رہا ہے۔

کائنات میں واضح طور پر ایک ذہین منصوبہ بندی (intelligent planning) پائی جاتی ہے۔ ایک چھوٹے ذرے سے لے کر عظیم کہکشانی نظام تک یہ منصوبہ بندی نمایاں طور پر ہمارے مشاہدے میں آتی ہے۔ یہ منصوبہ بندی بلاشبہہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اِس کائنات کے پیچھے ایک بہت بڑا ذہن (mind) کارفرما ہے یہ عقیدہ اتنا ہی سائنسی ہے، جتنا کہ ایکس رے کی قابلِ مشاہدہ تصویر کو دیکھ کر نا قابلِ مشاہدہ ایکس ریز (X-Rays) کے وجود کو ماننا۔

موجودات کے مشاہدے سے ایک عظیم حقیقت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اُس میں جگہ جگہ یکسانیت کے ساتھ استثنا (exception amidst uniformity) کی مثالیں موجود ہیں۔ استثنا (exception) اُس کو کہا جاتا ہے جو عام قانون کے خلاف ہو، جو عام قانون کی پابندی نہ کرے:

Exception: That does not follow the rule

نیچر میں اِس معاملے کی ایک سادہ مثال یہ ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد کے ہاتھ میں پانچ انگلیاں

ہوتی ہیں۔ یہ انگلیاں ہر ایک میں یکساں طور پر ہوتی ہیں۔ لیکن ہر ایک کے ہاتھ میں اس کے انگوٹھے کا نشان (finger print) ایک جیسا نہیں ہوتا۔ ہر ایک کا نشان دوسرے کے نشان سے الگ ہوتا ہے۔ اِس عموم میں یہ استثنا ایک برتر ہستی کی بالقصد مداخلت کے بغیر ممکن نہیں۔

نیچر میں اِس قسم کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ سائنس دانوں کے اندازے کے مطابق، خلا میں تقریباً 125 بلین کہکشائیں موجود ہیں۔ ہر کہکشاں (galaxy) کے اندر تقریباً 200 بلین ستارے پائے جاتے ہیں۔ لیکن شمسی نظام (solar system) ایک استثنائی نظام ہے جو صرف ہماری اُس قریبی کہکشاں میں پایا جاتا ہے جس کو ملکی وے (milky way) کہا جاتا ہے۔ عظیم کائنات میں یہ استثنا ایک طاقت ور ہستی کی بالقصد مداخلت کے بغیر نہیں ہوسکتا:

> Exception means intervention, and when intervention is proved, intervenor is also proved. And intervenor is only the other name of God.

ہماری کہکشاں جس میں شمسی نظام واقع ہے، وہ اِس نوعیت کی ایک انوکھی مثال ہے۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ اِس کہکشاں کا درمیانی حصہ ناقابلِ برداشت حد تک گرم ہے۔ اگر ہمارا شمسی نظام، کہکشاں کے درمیانی حصے میں ہوتو ہماری زمین پر کسی قسم کی زندگی اور نباتات کا وجود ہی ممکن نہ رہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہمارا شمسی نظام، کہکشاں کے ایک کنارے واقع ہے۔ اِس بنا پر وہ کہکشاں کے پُر خطر درمیانی ماحول کے اثر سے بچا ہوا ہے۔ یہ استثنا واضح طور پر ایک منصوبہ بند مداخلت کا ثبوت ہے، اور منصوبہ بند مداخلت بلاشبہہ خدائے برتر کی موجودگی کا ثبوت ہے۔

ہمارے شمسی نظام کے اندر بہت سے سیارے (planets) پائے جاتے ہیں۔ اُنھیں میں سے ایک سیارہ وہ ہے جس کو زمین کہا جاتا ہے۔ دوسرے تمام سیارے اپنے مدار (orbit) پر گھومتے ہیں۔ مگر ہماری زمین اپنے مدار پر گردش کرتے ہوئے اپنے محور (axis) پر بھی گھومتی ہے۔ زمین کی یہ دہری گردش (double rotation) ایک انتہائی استثنائی گردش ہے جو کسی بھی ستارے یا سیارے میں نہیں پائی جاتی۔ یہ استثنا اِس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس کے پیچھے ایک ایسے برتر عامل کو تسلیم کیا

جائے جس نے اپنی خصوصی مداخلت کے ذریعے یہ بامعنیٰ استثنا خلا میں قائم کررکھا ہے۔

ہماری زمین پر استثنا کی ایک ایسی انوکھی مثال پائی جاتی ہے، جو ساری کائنات میں کہیں بھی موجودنہیں، یہ لائف سپورٹ سسٹم (life support system) ہے۔ اِس لائف سپورٹ سسٹم کے بغیر زمین پر انسان کا یا کسی اورنوعِ حیات کا وجود ممکن نہ تھا۔ لائف سپورٹ سسٹم کا یہ استثنائی انتظام خدا کی موجودگی کا ایک ایسا ثبوت ہے جس کا انکار کوئی سنجیدہ انسان نہیں کرسکتا۔

البرٹ آئن سٹائن (وفات: 1955) کو بیسویں صدی عیسوی کا سب سے بڑا سائنسی دماغ مانا جاتا ہے۔ آئن سٹائن نے کائنات کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اُس نے کائنات کے ہر حصے میں حیرت ناک حدتک معنویت (meaning) پائی۔ یہ دیکھ کر اُس نے کہا کہ عالم فطرت کے بارے میں سب سے زیادہ ناقابلِ فہم بات یہ ہے کہ وہ قابلِ فہم ہے:

> The most incomprehensible fact about nature is that it is comprehensible.

آئن سٹائن اپنے اِس قول میں بالواسطہ طور پر خدا کے وجود کا اقرار کررہا ہے۔ اگر اس کے قول کو بدل کر کہا جائے تو وہ اِس طرح ہوگا کہ — خدا کے بغیر عالمِ فطرت مکمل طور پر ناقابلِ فہم رہتا ہے، اور خدا کے ساتھ عالمِ فطرت مکمل طور پر قابلِ فہم بن جاتا ہے:

> Without God, nature is totally inocmprehensible, and with God, nature becomes totally comprehensible.

کائنات بلاشبہہ ایک بامعنیٰ کائنات (meaningful world) ہے۔ سائنس داں وہ لوگ ہیں جو کائنات کا نہایت گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ عام انسان کے مقابلے میں کائنات کی معنویت سے بہت زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ چناں چہ سائنس دانوں نے عام طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔ سائنس داں اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر ''خدا'' (God) کا لفظ بولنے سے احتراز کرتے ہیں۔ لیکن نام کے بغیر وہ اِس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

مثلاً سرجیمز جینز (وفات: 1947) نے اپنی کتاب (*The Mysterious Universe*)

میں کہا ہے کہ کائنات ایک ریاضیاتی ذہن (mathematical mind) کی شہادت دیتی ہے۔ برٹش عالمِ فلکیات سرفریڈ ہائل (وفات: 2001) نے اس حقیقت کا اعتراف یہ کہہ کر کیا ہے کہ ہماری کائنات ایک ذہین کائنات (intelligent universe) ہے۔ امریکی سائنس داں پال ڈیویز (Paul Davis) نے اقرار کیا ہے کہ کائنات کے پیچھے ایک باشعور ہستی (conscious being) موجود ہے۔ برٹش سائنس داں سر آرتھر اڈنگٹن (وفات: 1944) نے اِس حقیقت کا اعتراف یہ کہہ کر کیا ہے کہ کائنات کا مادّہ ایک ذہین مادہ ہے:

The stuff of the world is mind-stuff

خدا کا وجود بلاشبہہ اُس طرح ایک ثابت شدہ واقعہ ہے جس طرح کوئی اور ثابت شدہ واقعہ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کا وجود صرف ایک پُراسرار عقیدہ کی بات نہیں، خدا کا وجود اُس طرح ایک علمی مسلّمہ ہے جس طرح کوئی اور علمی مسلّمہ۔ اب یہ سوال ہے کہ خدا ایک ہے یا کئی خدا ہیں جو کائنات کی تخلیق اور اس کے انتظام کے ذمّے دار ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خدا کا عقیدہ شرک پر مبنی ہے یا توحید پر۔ اِس معاملے میں علم کا فیصلہ مکمل طور پر توحید کے حق میں ہے۔

برٹش سائنس داں نیوٹن کو جدید سائنس کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ نیوٹن سے پہلے دنیا میں توہمات (superstitions) کا زور تھا۔ اُس وقت یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ خداؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مثلاً سن گاڈ (sun god)، مون گاڈ (moon god)، رین گاڈ (rain god)، وغیرہ۔ نیوٹن نے اِس معاملے کا سائنسی مطالعہ کیا۔ اُس نے کہا کہ چار طاقتیں (forces) ہیں جو کائنات کے نظام کو کنٹرول کرتی ہیں۔ وہ چار طاقتیں یہ ہیں:

1- قوتِ کشش (gravitational force)

2- برقی مقناطیسی قوت (electromagnetic force)

3- طاقت ور نیوکلیر قوت (strong nuclear force)

4- کم زور نیوکلیر قوت (weak nuclear force)

مگر سائنسی مطالعے کے ذریعے جو دنیا دریافت ہوئی، اُس میں اتنی زیادہ ہم آہنگی (harmony) پائی جاتی تھی کہ یہ ناقابلِ تصور تھا کہ اتنی زیادہ ہم آہنگ کائنات کو کئی طاقتیں کنٹرول کررہی ہوں۔ اِس لیے سائنسی ذہن اِس تعدّد پر مطمئن نہ تھا۔ مختلف سائنس داں اِس تعداد کو گھٹانے کے لیے کام کررہے تھے، یہاں تک کہ 1979 میں ایک نئی تحقیق سامنے آئی۔ اِس تحقیق کے مطابق، کائنات کو کنٹرول کرنے والی طاقتیں چار نہیں تھیں، بلکہ وہ صرف تین تھیں۔ اِس دریافت تک پہنچنے والے تین نوبل انعام یافتہ سائنس داں تھے۔ اُن کے نام یہ ہیں:

Sheldon Glashow (b. 1932), Steven Weingberg (b. 1933)
Dr. Abdussalam (d. 1996)

تاہم سائنسی ذہن تین کی تعداد پر بھی مطمئن نہ تھا۔ وہ اِس تعداد کو مزید گھٹا کر ایک تک پہنچانا چاہتا تھا۔ یہ کام برٹش سائنس داں اسٹفن ہاکنگ (پیدائش: 1942) کے ذریعے انجام پایا۔ اسٹفن ہاکنگ کو نظریاتی سائنس میں سب سے بڑا زندہ سائنس داں مانا جاتا ہے۔ اس نے پیچیدہ ریاضیاتی حساب (mathemetical calculations) کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ صرف ایک طاقت (force) ہے جو پوری کائنات کو کنٹرول کررہی ہے۔ یہ نظریہ اب تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان ایک مسلّمہ کے طور پر مان لیا گیا ہے۔ عمومی زبان میں اس کو سنگل اسٹرنگ نظریہ (single string theory) کہا جاتا ہے۔

سنگل اسٹرنگ نظریہ گویا کہ ایک خدا (توحیدِ الٰہ) کے عقیدے کے حق میں ایک سائنسی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ وہ مذہبی عقیدے کو علمی مسلّمہ کی حیثیت دے رہا ہے۔ اب خالص سائنس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِس کائنات کا ایک خدا ہے۔ یہ خدا ایک ہے اور صرف ایک:

The concept of God is purely a scientific concept, and this God is one and one alone.

نوٹ: یہ تقریر انگریزی زبان میں 9 مئی 2009 کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) کے ایک پروگرام میں کی گئی۔

سائنس دانوں کا مذہب

سائنس کیا ہے۔ سائنس کے لفظی معنی علم (knowledge) کے ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں سائنس سے مراد وہ شعبۂ علم ہے جس میں منضبط انداز میں عالمِ فطرت کا مطالعہ کیا جاتا ہے:

Science: The systematized knowledge of nature and the physical world.

سائنسی علوم میں مطالعے کی بنیاد علم الحساب (mathematics) ہوتا ہے۔ اِس بنا پر اِن علوم میں قطعی نتائج تک پہنچنا ممکن ہوجاتا ہے۔ اِس لیے سائنسی علوم کو علومِ قطعیہ (exact sciences) کہا جاتا ہے۔ سائنس داں اِس شعبۂ علم کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ اِس میں اپنے آپ کو مشغول کرتا ہے۔ علومِ قطعیہ میں اِس مشغولیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سائنس داں کے اندر قطعی طرزِ فکر (exact thinking) پیدا ہوجاتی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سائنس دانوں کا ذہن ادیبوں اور شاعروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ سائنس داں اپنی فکر کے اعتبار سے بے حد حقیقت پسند ہوتا ہے۔ اپنے میدانِ مطالعہ کی بنا پر سائنس داں کے لیے ناممکن ہوجاتا ہے کہ وہ خیالی انداز میں سوچے، وہ ثابت شدہ حقیقت کا انکار کردے۔ سائنسی مطالعہ ایک سائنس داں کو کامل طور پر ایک سنجیدہ انسان بنا دیتا ہے۔

بہت سے اہلِ علم نے اِس معاملے کا مطالعہ مذہب کے زاویۂ نظر سے کیا ہے۔ انھوں نے پایا ہے کہ تمام سائنس داں کسی نہ کسی طور پر اپنے اندر وہ احساس پاتے تھے جس کو مذہبی احساس (religious feeling) کہا جاتا ہے۔ اِس سلسلے میں یہاں دو کتابوں کے نام لکھے جاتے ہیں:

Einstein and Religion, by Max Jammer

The God Delusion, by Richard Dawkins

اِس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ کوئی سائنس داں جب فطرت کا مطالعہ کرتا ہے، تو وہ نہایت گہرائی کے ساتھ اِس حقیقت کا ادراک کرتا ہے کہ فطرت کے نظام میں کامل درجے کی معنویت اور

ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔سائنس داں کوفطرت کے اِس نظام کے اندر ایک پُراسرار قسم کی طاقت کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اِس پوزیشن میں نہیں پاتا کہ وہ اس کی توجیہہ کرسکے۔ اس کے باوجود وہ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اِس پُراسرار احساس کو مشہور جرمن سائنس داں آئن اسٹائن نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے—ایک شخص جو فطرت کا مطالعہ کرے، اُس کا سب سے زیادہ خوب صورت تجربہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت میں گہری پُراسراریت ہے۔تم مشکل سے کوئی ایسا آدمی پاؤ گے جو گہرا سائنسی ذہن رکھتا ہو، پھر بھی وہ مذہبی احساسات سے خالی ہو:

> The most beautiful experience one may enjoy is a 'sense of mystery; you will hardly find one among the profounder sort of scientific minds without a 'religious feeling' (*The Times of India,* New Delhi, April 5, 2008, p. 20. Quoted by, Andrew Whitaker, Professor of Physics at Queen's University, Belfast, Ireland.)

سائنس داں فطرت میں اپنے اِس تجربے کو کاسمک ریلیجن (cosmic religion) سے تعبیر کرتے ہیں۔ تاہم سائنس داں عام طور پر خدا (God) کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ شخصی خدا (personal God) کے تصور کو ماننا نہیں چاہتے۔ کیوں کہ شخصی خدا کے ساتھ اتھارٹی (authority) کا تصور جڑا ہوا ہے، اور اتھارٹی کے ساتھ انعام اور سزا کا تصور، اور یہ وہ چیز ہے جس کو کوئی سائنس داں، یا جدید ذہن ماننے کے لیے تیار نہیں۔

سائنس داں فطرت کے مطالعہ کے دوران ایک حیرت انگیز قسم کے پُراسرار احساس سے دوچار ہوتا ہے۔ اِس کو ایک احساسِ استعجاب (sense of awe) کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہی احساس کسی سائنس داں کے لیے سب سے بڑی داخلی طاقت ہوتا ہے۔ آئن اسٹائن کے ایک سوانح نگار نے اس کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں— آئن اسٹائن اِس کو کاسمک ریلیجن کہتا ہے۔ فطرت کے نظام میں حیران کُن انضباط کی موجودگی، سائنس داں کے لیے ایک ایسا سوال بنی ہوئی ہے جو اُس کو مذہب جیسی ایک سوچ کی طرف لے جاتی ہے:

He called it 'cosmic religion' and it was a sense of awe at the nobility and marvelous order which are reflected in nature and in the world of thought. He believed that throughout history, the greatest religious geniuses have followed cosmic religion, and that exploring this order in the laws of science was the motivation for the most celebrated scientists such as Newton and Kepler. Without this feeling of confidence in order and simplicity, science, he felt degenerated into uninspired empiricism.

سائنس، نیچر کے مطالعے کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں سائنس خدا کی تخلیق کا مطالعہ کرتی ہے۔ اِس مطالعے میں فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ تخلیقی قوانین میں خالق کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ سائنس داں کا موضوع اگر چہ فطرت کے قوانین کا مطالعہ ہے، لیکن فطرت کو اس کے فاطر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اِس لیے فطرت کے مطالعے کا بالواسطہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سائنس داں، فطرت کی دریافت کے ساتھ فاطر کے بہت قریب آجاتا ہے۔

تقریباً تمام سائنس دانوں نے بالواسطہ انداز میں خدا کے وجود کا اعتراف کیا ہے۔ سر آیزاک نیوٹن (وفات: 1727) اور کپلر (وفات: 1630) نے اس ہستی کو آرڈر (order) کا نام دیا ہے۔ اس کے بعد اسپنوزا (وفات: 1677) اور آئن اسٹائن (وفات: 1955) نے اس کو کاسمک اسپرٹ (cosmic spirit) بتایا۔ اس کے بعد سر آرتھر ایڈنگٹن (وفات: 1944) اور سر جیمز جینز (وفات: 1946) نے اس کو ریاضیاتی مائنڈ (mathematical mind) کا نام دیا۔

تاہم غالباً کسی بھی سائنس داں نے اِس خالق کا اعتراف خدا یا پرسنل گاڈ (personal God) کے الفاظ میں نہیں کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سائنس دانوں نے خدا کے وجود کا اعتراف بالواسطہ انداز میں تو ضرور کیا، لیکن براہِ راست انداز میں خدا کے وجود کا کھلا اعتراف ابھی تک سائنٹفک کمیونٹی کی طرف سے نہیں آیا۔

سائنس کے دو بڑے شعبے ہیں — نظریاتی سائنس (theoretical science) اور عملی سائنس (practical science)۔ خدا کا موضوع نظریاتی سائنس سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس

معاملے میں بدقسمتی سے ایسا ہوا کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں پہنچ کر نظریاتی سائنس میں تحقیق کا کام تقریباً ختم ہوگیا۔ اب صرف انطباقی سائنس (applied science) کے میدان میں تحقیق کا کام ہونے لگا۔ کیوں کہ انطباقی سائنس میں مادّی مفاد (material interest) بہت زیادہ شامل ہوگیا۔

نظریاتی سائنس کے میدان میں مزید بڑا کام کرنے کے لیے نہایت اعلیٰ دماغ درکار ہے۔ صرف ڈگری یافتہ لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔ موجودہ زمانے میں اِس قسم کا بڑا سائنسی دماغ صرف ایک ہے، اور وہ برطانیہ کا اسٹفن ہاکنگ (Stephen Hawking) ہے۔ اسٹفن ہاکنگ نے نظریاتی سائنس کے میدان میں عملاً بھی کچھ بڑے کام کیے ہیں۔ مثلاً سنگل اسٹرنگ تھیوری (Single String Theory) جو توحید کے نظریے کو اصولی طور پر ثابت کرتی ہے۔ لیکن نظریاتی سائنس کے میدان میں کام کرنے کے لیے اعلیٰ سائنس دانوں کی ایک پوری جماعت درکار ہے۔ اور بدقسمتی سے آج ایسی جماعت موجود نہیں۔

جدید سائنس کی تاریخ بتاتی ہے کہ تدریجی طور پر سائنس اب یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ سائنس داں کائنات میں دماغ (mind) جیسے کسی عنصر کی کارفرمائی تسلیم کرتے ہیں۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ کہنا درست ہوگا کہ دماغ کو ماننا بالواسطہ طور پر خدا کو ماننے کے ہم معنیٰ ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اِس بالواسطہ سائنس کو براہِ راست سائنسی اقرار کے درجے تک پہنچایا جائے۔ یہ بلاشبہہ موجودہ زمانے کا سب سے بڑا علمی اور فکری کام ہے۔ یہ کام کوئی اعلیٰ سائنسی دماغ ہی کرسکتا ہے۔ یہ کام صرف وہ شخص انجام دے گا جو اعلیٰ ریاضیات (higher mathematics) کی زبان میں اس کو انجام دے سکتا ہو۔ شاید یہ کام ڈاکٹر عبدالسلام (وفات: 1996) انجام دے سکتے تھے، جن کو 1979 میں سائنس کا نوبل پرائز ملا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے تعصّبانہ مزاج کی بنا پر یہ امکان واقعہ نہ بن سکا۔

خدا کی عظمت

خدا کی معرفت ایمان اور اسلام کی اساس (basis) ہے۔ جتنی اعلیٰ معرفت، اتنا ہی اعلیٰ ایمان۔ اِس معرفت کی تکمیل اُس وقت ہوتی ہے، جب کہ آپ خدا کو اس کے کمالِ عظمت کے ساتھ دریافت کریں۔ ایک بندہ جب خدا کو اس کی عظمتوں کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اس کا وہی حال ہوتا ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الذین إذا ذکر اللہ وجلت قلوبہم (8:2) یعنی خدا کی یاد سے اُن کے دل دہل اٹھتے ہیں۔ جدید فلکیاتی سائنس (modern astronomy) کا اِس معاملے میں ایک مثبت کنٹری بیوشن (contribution) یہ ہے کہ اس نے خالق کی ناقابلِ قیاس عظمت کا ادراک کرنے کے لیے ایک فریم ورک (frame work) دے دیا ہے۔ اِس فریم ورک کی مدد سے انسان خداوند ذوالجلال کی ناقابلِ بیان عظمت کا ایک تصور اپنے ذہن میں لاسکتا ہے۔

جدید سائنس کئی سو سال سے فلکیات کا مطالعہ کررہی ہے۔ 1508 میں دور بین (telescope) کی ایجاد ہوئی، اور 1609 میں پہلی بار اٹلی کے سائنس داں گلیلیو (Galileo) نے خلا کا دوربینی مشاہدہ کیا۔ یہ فلکیاتی مشاہدہ برابر بڑھتا رہا۔ پچھلے زمانے میں دوربینی رصدگاہ کسی پہاڑ پر نصب کی جاتی تھی۔ اب خلائی سائنس کا زمانہ آگیا ہے۔ اب انسان نے خلائی رصدگاہ (space observatory) بنالی ہے۔ اِس کے ذریعے کائنات کا مشاہدہ اتنی زیادہ دور تک کرنا ممکن ہوگیا ہے جس کی دوری کو صرف سالِ نور (light years) کی اصطلاح میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اِس طرح خدا کی عظمت کو تصور میں لانے کے لیے ایک نیا وسیع تر دائرہ انسان کے علم میں آگیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک تازہ ترین فلکیات دریافت (discovery) سامنے آئی ہے۔ اِس میں بتایا گیا ہے کہ خلا میں نصب الکٹرانک دوربینوں کے ذریعے ایک بہت بڑا بلیک ہول دریافت ہوا ہے۔ یہ بلیک ہول پورے نظامِ شمسی (solar system) کو نگل سکتا ہے۔ نظام شمسی کا دائرہ کتنا زیادہ بڑا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے اِس نظام کا بعید ترین سیارہ پلوٹو (Pluto) ہے جو

سورج کے گرد بیضوی دائرے میں چکر لگا رہا ہے۔ یہ دائرہ ساڑھے سات بلین میل پر مشتمل ہے۔

مذکورہ بلیک ہول اب تک کے دریافت کردہ تمام بلیک ہول سے زیادہ بڑا ہے۔ اس کا حجم 6 بلین سورج سے بھی زیادہ ہے۔ اِس بلیک ہول کا نام M 87 رکھا گیا ہے۔ یہ بلیک ہول ہماری کہکشاں (Milky Way) سے 50 ملین سال نور کی دوری پر واقع ہے:

This black hole can eat the solar system

Astronomers have discovered what they say is the biggest ever black hole which weighs the same as 6.8 billion suns and could swallow our entire solar system. According to the scientists, the black hole, identified as M87, is as large as the orbit of Neptune and is by far the largest and most distant galaxy in the nearby universe. As a point of comparison, the black hole at the centre of the Milky Way is 1,000 times smaller than this one which has been observed some 50 million light years away. (*The Times of India*, New Delhi, Tuesday, January 18, 2011 Page 19)

یہ واقعہ اور اِس طرح کے دوسرے واقعات معرفتِ الٰہی کے لیے عظیم خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ واقعات خدا کی قدرت کو ناقابلِ قیاس حد تک عظیم بنا دیتے ہیں۔ جو آدمی اِن واقعات پر سوچے گا، اس کا دل خدا کی عظمت کے تصور سے دہل اٹھے گا، اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے۔ یہ واقعات ایک انسان کو اپنے بارے میں انتہائی عجز اور خدا کے بارے میں انتہائی قدرت کی یاد دلاتے ہیں۔ اِن واقعات پر غور کرنا بلاشبہہ اعلیٰ معرفت کے حصول کا کائناتی خزانہ ہے۔

معرفت یہ ہے کہ آدمی ایک طرف اپنی محدودیت (limitation) کو جانے اور دوسری طرف وہ خدا کی لامحدودیت کو دریافت کرے۔ اِس دریافت کے نتیجے میں جو کیفیت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے، اُسی کا نام معرفت ہے۔ یہ معرفت جس کو حاصل ہوجائے، اس کے لیے گویا دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں کے دروازے کھل گئے۔ یہی وہ خوش قسمت انسان ہے جس کے بارے میں آخرت میں کہا جائے گا کہ — تم جنت کے دروازوں میں سے جس دروازے سے چاہو، جنت میں

داخل ہو جاؤ۔ آج کے بعد تمھارے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی حزن۔

تسخیرِ کائنات

انسان کے لیے اللہ کی ایک نعمت وہ ہے جس کو تسخیر کہا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی دو آیتیں یہ ہیں: اَللّٰہُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْکُ فِیْہِ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○ وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (45:12-13) یعنی اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے سمندر کو مسخر کردیا، تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔ اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو تمھارے لیے مسخر کردیا، سب کو اپنی طرف سے۔ بے شک اِس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔

تسخیر کا مطلب ہے کسی چیز کو بزور قابلِ استعمال یا قابلِ انتفاع بنانا۔ اللہ جو پوری کائنات کا خالق ہے، اس نے کائنات کے ہر جز کو قوانینِ فطرت (laws of nature) کا پابند بنا رکھا ہے۔ اِس بنا پر یہ ممکن ہوگیا ہے کہ انسان مخلوقات کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرے۔ خدائی قوانین کے ذریعے کائنات اگر اِس طرح مسخر نہ ہوتی تو انسان کے لیے اس کو استعمال کرنا ناممکن ہوجاتا۔

اِس کی ایک مثال سمندر کی ہے۔ سمندروں کی شکل میں پانی کے جو قدرتی ذخائر ہیں، وہ کرۂ ارض کے تقریباً تہائی حصہ (71 %) پر پھیلے ہوئے ہیں۔ زمین ایک گول کرہ ہے جو مسلسل طور پر گردش کررہا ہے۔ ایک زبردست قانون پانی کے ذخائر کو زمین پر قائم کئے ہوئے ہے۔

ایک طرف زمین کی غیر معمولی کشش زمین کے ذخائر کو اپنی طرف کھینچے ہوئے ہے، اور دوسری طرف سمندر کے اوپر ہوا کا تقریباً پانچ میل موٹا غلاف ہے جو سمندر کے اوپر دباؤ بنائے ہوئے ہے۔ اِن دوطرفہ اسباب کی بنا پر ایسا ہے کہ سمندروں کی گہرائی میں پانی مسلسل طور پر موجود ہے، ورنہ پورا ذخیرۂ آب اڑ کر فضا میں تحلیل ہوجاتا۔ یہی معاملہ سمندر میں چلنے والی کشتیوں کا ہے۔ یہاں بھی خدا کا مقرر کیا ہوا ایک قانونِ فطرت کام کررہا ہے۔ یہ ایک آبی قانون ہے جس کو آج کل کی زبان میں

ہائڈرواسٹیٹکس (hydrostatics) کہا جاتا ہے جس کا ایک شعبہ بائنسی (buoyancy) ہے۔

بائنسی (buoyancy) سے مراد پانی کا یہ انوکھا قانون ہے کہ جب کوئی چیز پانی میں ڈالی جاتی ہے تو وہ پانی کے اندر جتنی جگہ گھیرتی ہے، اُسی کے بقدر وہاں اَپ ورڈ پریشر پیدا ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں کشتی پانی کی سطح پر تیرنے لگتی ہے:

Buoyancy: The upward pressure by any fluid on a body partly or wholly immersed therein: it is equal to the weight of the fluid displaced.

تسخیر کا دوسرا واقعہ وہ ہے جس کا تعلق بالائی خلا سے ہے۔ زمین کے اوپر جو وسیع خلا ہے، وہ بہت بڑے بڑے نہایت گرم ستاروں سے بھرا ہوا ہے، اِس لیے اس کو ستاروں کی دنیا (starry universe) کہا جاتا ہے۔ یہ تمام ستارے ہماری زمین سے ایک مقرر دوری پر واقع ہیں۔ یہ مقرر دوری اگر قائم نہ رہے تو ہماری پوری زمین جل کر راکھ ہو جائے۔

زمین کی سطح سے رات کے وقت جب کھلے آسمان کو دیکھا جائے تو اوپر کی فضا میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ستارے نظر آتے ہیں۔ یہ ستارے بہت بڑے بڑے ستارے ہیں، لیکن دوری کی وجہ سے وہ چھوٹے نظر آتے ہیں۔ آنکھ سے دیکھنے میں تقریباً دس ہزار ستارے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ستارے وہ ہیں جو ہماری قریبی کہکشاں (Milky Way) سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِس کے علاوہ، وسیع خلا میں بے شمار بڑے بڑے ستارے ہیں جو مسلسل حرکت کر رہے ہیں۔ ایک سو بلین سے زیادہ کہکشائیں (galaxies) ہیں اور ہر کہکشاں میں تقریباً ایک سو بلین ستارے پائے جاتے ہیں۔

اِس وسیع عالمِ نجوم کو انسان اپنی فطری آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اللہ تعالی نے ہماری دنیا میں ایسے مادی اسباب رکھ دئے جن کو انسان دریافت کرے اور ان کو ترقی دے کر طاقت ور دوربین (telescope) بنائے۔ چناں چہ موجودہ زمانے میں خلائی دوربین کو استعمال کر کے انسان بے شمار ستاروں اور کہکشاؤں کو دیکھتا ہے۔

سمندروں (اور حیوانات) کے معاملے میں تسخیر کا مطلب یہ تھا کہ انسان قانونِ فطرت کو

جانے اوراس کی مدد سے اِن چیزوں کواپنی ضرورت کے لیے استعمال کرے۔ عالمِ نجوم کے معاملے میں تسخیر کا مطلب اُن کواپنی ضرورت کے لیے استعمال کرنا نہیں ہے، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ وسیع عالمِ نجوم کوانسان آلات کی مدد سے دیکھے، وہ ان پر غور وفکر کرے۔ وہ غور وفکر کے ذریعے عالمِ نجوم کواعلی معرفت کے حصول کا ذریعہ بنائے۔

سمندروں اور حیوانات کی تسخیر انسان کی خدمت کے لیے ہے۔ اور عالمِ نجوم کی تسخیر اِس لیے ہے کہ ان کے ذریعے سے آدمی خالق کی عظمت کو دریافت کرے۔ وہ اُن میں غور وفکر کرکے اپنے لیے معرفتِ اعلی کا رزق حاصل کرے۔

گرہن ایک خدائی معجزہ

گرہن (eclipse) ایک فلکیاتی ظاہرہ ہے۔ اکلپس (eclipse) کا لفظ قدیم یونانی زبان کے لفظ (ékleipsis) سے ماخوذ ہے۔ خلا میں گرہن کے مختلف واقعات ہوتے رہتے ہیں، لیکن معروف طور پر دو قسم کے گرہن کو گرہن کہا جاتا ہے۔ ایک سورج گرہن (Solar eclipse) اور دوسرا چاند گرہن (Lunar eclipse)۔ عام طور پر سورج گرہن سال میں دو بار یا تین بار ہوتا ہے اور چاند گرہن سال میں دو بار واقع ہوتا ہے۔ چاند گرہن چند گھنٹوں تک رہتا ہے، جب کہ کامل سورج گرہن کچھ منٹ تک رہتا ہے:

A lunar elicpse lasts for a few hours, whereas a total solar eclipse lasts for only a few minutes at any given place.

گرہن کا یہ واقعہ محکم فلکیاتی قانون کے تحت پیش آتا ہے۔ یہاں تک کہ بہت پہلے ان کی قطعی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر 2010 میں 15 جنوری کو سورج گرہن ہوا۔ علماءِ فلکیات کی پیشگی خبر کے مطابق، پہلے سے لوگوں کو اِس گرہن کا علم تھا۔

گرہن کیا ہے۔ گرہن دراصل سایہ پڑ جانے کا دوسرا نام ہے۔ گردش کے دوران جب چاند، زمین اور سورج کے درمیان آجائے تو سورج اس آڑ کی بنا پر جزئی یا کلّی طور پر دکھائی نہیں دے گا۔ اِسی

کا نام سورج گرہن ہے۔ اور جب زمین، چاند اور سورج کے درمیان آجائے تو چاند پر جزئی یا کلی طور پر زمین کا سایہ پڑ جائے گا۔ اِسی کا نام چاند گرہن ہے:

Eclipse: In astronomy, partial or complete obscuring of one celestial body by another as viewed from a fixed point. Solar eclipses occur when shadow of Moon falls on Earth, which happens two or three times per year. Lunar eclipses occur when shadow of Earth falls on Moon; at most two seen per year.

قدیم زمانے میں گرہن کے بارے میں عجیب قسم کے توہماتی عقائد قائم تھے۔ مثلاً کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ آسمان میں ایک بہت بڑا اژدہا ہے، وہ کبھی غصہ ہو کر چاند کو نگل لیتا ہے، اس وقت چاند گرہن پڑتا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ زمین پر جب کسی بادشاہ یا کسی بڑے آدمی کی موت ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے سورج پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اسی کا نام سورج گرہن ہے، وغیرہ۔

اِس قسم کے توہماتی تصورات ہزاروں سال تک قوموں میں رائج تھے، یہاں تک کہ دوربین (telescope) ایجاد ہوئی۔ گلیلیو نے پہلی بار 1609 میں دور بین کے ذریعہ سیاراتی نظام (planetary system) کا مشاہدہ کیا۔

اس کے بعد دوربین کو ترقی ہوئی اور مزید مشاہدات کئے گئے۔ یہاں تک کہ معلوم ہوا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کا تعلق مذکورہ قسم کے توہماتی تصورات سے نہیں ہے، یہ تمام تر ایک فلکیاتی مظہر ہے۔ وہ صرف اس لئے واقع ہوتا ہے کہ گردش کے دوران دو خلائی اجسام (celestial bodies) کے درمیان تیسرا جسم آجاتا ہے۔ اس کی بنا پر وہاں ایک آڑ قائم ہو جاتی ہے۔ اسی آڑ کی بنا پر پیش آنے والے واقعہ کا نام گرہن ہے۔

قدیم زمانے میں گرہن صرف ایک توہماتی (superstitious) واقعہ بنا ہوا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی میں سائنسی مشاہدہ کے ذریعہ معلوم ہوا کہ یہ سادہ نوعیت کا ایک خلائی واقعہ ہے۔ اس واقعہ میں کوئی پُراسراریت شامل نہیں۔ گرہن کے موضوع پر موجودہ زمانے میں کثیر تعداد میں

کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

Eclipses of the Sun and Moon (1937) by Sir F.W. Dyson
Eclipse Phenomena in Astronomy (1969) by F. Link
Eclipses in the Second Millennium BC (1954) by G. Van Bergh

گرہن کی تاریخ کا پہلا دور وہ ہے جب کہ اس معاملے میں توہماتی عقائد کا رواج تھا۔ گرہن کا دوسرا دور موجودہ زمانے میں دوربین کی ایجاد (1608) کے بعد شروع ہوا۔ گرہن کی تاریخ کا تیسرا دور وہ ہے جو اسلام کے ذریعہ انسان کے علم میں آیا، وہ یہ کہ گرہن کا تعلق نہ توہمات سے ہے اور نہ وہ صرف ایک مادی نوعیت کا فلکیاتی واقعہ ہے، بلکہ وہ خالقِ کائنات کے باشعور تخلیقی نظام کا ایک حصہ ہے۔ وہ خدا کی قدرتِ کاملہ کا ایک مظہر ہے، وہ انسان کے لیے خداوندِ عالم کا ایک تعارف ہے، گرہن خاموش زبان میں خدا کی حکیمانہ تخلیق کا اعلان کررہا ہے۔

ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ ابراہیم مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں شوال 10 ہجری (632ء) میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اتفاق سے اسی دن سورج گرہن پڑا۔ قدیم توہماتی رواج کے مطابق، مدینہ کے کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ سورج گرہن پیغمبر کے بیٹے کی موت کی وجہ سے ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بہت ناپسند ہوئی۔ آپ نے لوگوں کو جمع کرکے تقریر کی۔ آپ نے فرمایا: إنّ الشمس والقمر لا یخسفان لموت أحد من الناس، ولٰکنہما آیتان من آیات اللہ، فإذا رأیتموھا فصلّوا (صحیح البخاری، کتاب الکسوف) یعنی سورج اور چاند میں کسی انسان کی موت سے گرہن نہیں لگتا، وہ اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہے۔ جب تم ایسا دیکھو تو نماز پڑھو۔

”چاند گرہن اور سورج گرہن خدا کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں“ — یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ دراصل اس معاملے کے اصل معنوی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چاند گرہن اور سورج گرہن جس طرح ہوتا ہے، اس پر غور کیا جائے تو وہ آدمی کے لئے خدا کی دریافت کا ذریعہ بن جائے گا۔ وہ سادہ طور پر فلکیاتی نشانی کے بجائے، زیادہ گہرے معنوں میں خدائی نشانی ثابت ہوگا۔

چاند گرہن یا سورج گرہن ایک انوکھا تخلیقی معجزہ ہے، اس کے پیچھے خالقِ کائنات کی معجزانہ صنّاعی نظر آتی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، گرہن اُس وقت پیش آتا ہے جب کہ تین خلائی اجسام، زمین، چاند، سورج، گردش کرتے ہوئے ایک سیدھ میں آجائیں۔ تینوں کے سائز میں بہت زیادہ فرق ہے۔ چاند کو اگر سرسوں کے دانے کے برابر سمجھا جائے تو اس کے مقابلے میں زمین فٹ بال کے برابر ہوگی اور سورج ہمالیہ پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا ہوگا۔

یہ تین مختلف سائز کے اجسام حرکت کرتے ہوئے ایسے تناسب سے ایک سیدھ میں آجاتے ہیں کہ زمین سے دیکھنے والا ان کو یکساں سائز میں دیکھنے لگے۔ جب تینوں کے درمیان چاند ہو تو سورج گرہن واقع ہوگا۔ اور جب ان کے درمیان زمین ہو تو چاند گرہن واقع ہوگا۔ یہ وسیع خلا میں ایک انتہائی انوکھی پوزیشننگ کا معاملہ ہے:

It is a unique well- calculated positioning of three moving bodies, highly inequal in size, in the vast space.

گرہن (eclipse) اُس وقت واقع ہوتا ہے جب کہ وسیع خلا کے تین اَجرام، زمین، چاند، سورج، انتہائی متناسب دوری کے ساتھ بالکل ایک سیدھ میں آجائیں۔ یہ ایک انتہائی حیرت ناک ظاہرہ ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے انسائیکلو پیڈیا بریٹنکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ — ایک انتہائی غیر معمولی توافق کی بنا پر سورج اور چاند کا سائز اور دوری ایسے ہوجاتے ہیں کہ زمین سے بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے گویا کہ دونوں بالکل برابر ہوں:

By a remarkable coincidence, the sizes and distances of the Sun and Moon are such that they appear as very nearly the same angular size as the earth. (EPB 6/189)

گرہن کے اِس عجیب واقعے کو مقالہ نگار نے محض اتفاق (coincidence) قرار دیا ہے۔ مگر یہ بالکل غیر منطقی بات ہے۔ اِس قسم کا نادر اتفاق اولاً تو ممکن نہیں اور بالفرض اگر ایسا ہوجائے تو وہ بمشکل ایک بار ہوسکتا ہے، لیکن فلکیاتی تاریخ بتاتی ہے کہ گرہن کا یہ واقعہ لاکھوں برس سے اِسی طرح

پابندی (regularity) کے ساتھ ہر سال پیش آرہا ہے۔ اِس قسم کی کامل باضابطگی ہرگز اتفاقاً نہیں ہوسکتی۔ یقینی طور پر وہ ایک قادرِ مطلق ہستی کی مسلسل کارفرمائی کے باعث ہی ممکن ہے۔ اتفاق کا لفظ اِس حیرت ناک فلکیاتی ظاہرے کی توجیہہ کے لیے آخری حد تک ناکافی ہے۔

گرہن، خلا میں پیش آنے والے اُن بے شمار معجزاتی واقعات میں سے ایک ہے جن کے بارے میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (36:38) یعنی یہ عزیز اور علیم خدا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے:

That is the dispostion of the Almighty, the All Knowing.

وسیع خلا میں بے شمار اجزا ہیں۔ یہ تمام اجزا مکمل طور پر خداوندِ عالم کے کنٹرول میں ہیں۔ سیاروں اور ستاروں کی گردش انتہائی حد تک خدا کے مقرر ضابطہ کی پابندی میں ہوتی ہے۔ شمسی نظام اِسی کا ایک نمونہ ہے جس کے اندر ہماری زمین واقع ہے۔ یہ نظام اپنی خاموش زبان میں اعلان کررہا ہے کہ اِس کائنات کا ایک قادرِ مطلق خدا ہے جو وسیع خلا میں اُن پر کامل کنٹرول کئے ہوئے ہے۔

اِنھیں معجزاتی واقعات میں سے ایک گرہن کا واقعہ ہے۔ سورج گرہن اور چاند گرہن ہمارے قریبی مشاہدے کی چیزیں ہیں۔ لوگ اُس کو عجوبہ کے طور پر یا زیادہ سے زیادہ ایک فلکیاتی کورس کے طور پر دیکھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے الفاظ میں، وہ خدا کی ایک عظیم نشانی ہے۔ اِسی لیے اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب گرہن واقع ہو تو لوگ خدا کی عبادت کریں۔ اِس عبادت کو صلاۃِ کُسوف اور صلاۃِ خُسوف کہا جاتا ہے۔ گرہن کے وقت خدا کی عبادت کرنا اِس بات کا اعتراف ہے کہ گرہن ایک خدائی ظاہرہ ہے، نہ کہ محض ایک فلکیاتی ظاہرہ۔

خدا کا وجود

انسان جب رحمِ مادر (womb) کے خول میں ہوتا ہے، تو اس کو اُس وقت خول کے باہر کی دنیا کے بارے میں کوئی علم نہیں ہوتا۔ اِس خول کے باہر ایک پوری دنیا موجود ہوتی ہے، لیکن بچے کو اِس کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ خود انسان کا بھی ہے۔

انسان کی تمام معلومات زمان ومکان (time and space) کے اندر تک محدود ہوتی ہیں۔ وہ زمان ومکان کے باہر کی حقیقتوں کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتا۔

برٹش فلسفی جان اسٹوارٹ مِل (وفات: 1873) جب نوجوانی کی عمر میں تھا، اُس وقت اس کے باپ جیمس مل (وفات: 1836) نے اُس سے کہا کہ خدا کا عقیدہ ایک غیر عقلی عقیدہ ہے۔ کیوں کہ اگر یہ کہا جائے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا، تو سوال یہ ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا:

If God created man, who created God.

یہ بات جان اسٹوارٹ مل نے اپنی آٹو بائگریفی میں لکھی۔ اِس کے بعد اِس بات کو برٹرنڈ رسل (وفات: 1970) اور جولین ہکسلے (وفات: 1975) جیسے فلاسفہ دہرانے لگے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ جیمس مل کے تقریباً سو سال بعد 1916 میں البرٹ آئن اسٹائن (وفات: 1955) نے نظریۂ اضافیت (theory of relativity) پیش کیا۔ اِس نظریے کے تحت آئن اسٹائن نے دکھایا کہ اِس دنیا میں انسان کا ہر علم اضافی (relative) ہے، نہ کہ حقیقی (real)۔ آئن اسٹائن نے ثابت کیا کہ انسان کے پاس کوئی مطلق فریم آف ریفرنس موجود نہیں:

No absolute frame of reference exists.

جیمس مل کے زمانے میں انسان کا علم ایک سائنٹفک خول (scientific womb) کے اندر محدود تھا۔ آئن اسٹائن نے سو سال بعد انسان کو اِس خول کی موجودگی کی خبر دی۔ ایسی حالت میں اب انسان کے لیے عقلی رویہ صرف یہ ہے کہ وہ بالاتر حقائق کے بارے میں اپنی علمی محدودیت (limitations) کا اعتراف کرے، نہ کہ وہ اُن کے بارے میں یقین کے ساتھ علمی بیانات دینے لگے۔

خدا کا فلسفیانہ تصور

آرین مذاہب میں وحدتِ وجود (monism) کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس کے مطابق، خدا کا اپنا کوئی فارم نہیں ہے۔ وہ ایک نراکار خدا (formless God) ہے۔ اِس تصور کے مطابق، خدا کی اپنی کوئی الگ ہستی نہیں ہے۔ دنیا میں جو چیزیں دکھائی دیتی ہیں، وہ سب کی سب اِسی بے وجود خدا کا

وجودی اظہار ہیں۔ یہ تصور دراصل ایک فلسفیانہ تصور ہے۔فلاسفہ عام طور پر اِسی معنیٰ میں خدا کو مانتے رہے ہیں۔ وہ خدا کو اسپرٹ (spirit) یا آئیڈیا (idea) جیسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔یہی فلسفیانہ تصور آرین مذاہب میں ایک عقیدے کے طور پر شامل ہو گیا۔

خدا کا یہ غیر وجودی تصور محض ایک بے بنیاد قیاس (speculation) ہے۔حقیقی معنوں میں اس کی کوئی استدلالی بنیاد موجود نہیں۔پہلی بات یہ کہ تخلیق کی صورت میں ہم جس کائنات کا تجربہ کرتے ہیں، وہ پورے معنوں میں ایک فارم (form) ہے۔

یہ کہنا ایک غیر منطقی بات ہے کہ ایک خدا جو محض ایک اسپرٹ یا آئڈیا تھا جس کی اپنی کوئی ہستی نہ تھی، اس نے اتنے بے شمار قسم کے فارم پیدا کر دیے۔خدا وہی ہے جس کے اندر تخلیق کی صفت پائی جاتی ہو، اور اسپرٹ یا آئڈیا میں تخلیق کی صفت سرے سے موجود نہیں۔اِس لیے یہ نظریہ بداہۃً ہی قابلِ رد ہے:

Prima facie it stands rejected.

سائنس نے جو دنیا دریافت کی ہے، اس کی تمام چیزیں ایٹم سے مرکب ہیں۔اس کو لے کر کہا جاتا ہے کہ سائنس کے مطالعے سے کائنات میں وحدت (oneness) کا ثبوت ملتا ہے، یعنی تمام مادی چیزوں میں استثنا کے باوجود یکسانیت (unifortmity amids exception) مگر یہ استدلال درست نہیں۔کائنات میں مادّی اجزا کے اعتبار سے ضرور وحدت ہے، لیکن اِن مادی اجزا کی ترکیب سے جو چیز بنی، اس کے اندر غیر معمولی ڈزائن (design) موجود ہے، اور ڈزائن صرف ایک ذہن کی تخلیق ہوتی ہے، نہ کہ کسی بے فارم اسپرٹ کی تخلیق۔

معنی خیز استثنا

کائنات میں بے شمار الگ الگ چیزیں پائی جاتی ہیں، لیکن کائنات کا ایک عجیب ظاہرہ یہ ہے کہ اس میں عمومی طور پر یکسانیت (uniformity) نہیں ہے، بلکہ اُس کے ہر حصے میں استثنا ات (exceptions) پائے جاتے ہیں۔کائنات کی یہ استثنائی مثالیں اِس بات کا ثبوت ہیں کہ اِس کائنات کا ایک عظیم خالق ہے۔استثنا (exception) ذہین مداخلت (intelligent intervention) کا

ثبوت ہے اور ذہنی مداخلت ایک ذہین خالق (intelligent Creator) کا ثبوت ہے۔

مثلاً وسیع کائنات میں شمسی نظام (solar system) ایک استثنا ہے۔شمی نظام میں سیارۂ ارض (planet earth) ایک استثنا ہے۔زمین کا انتہائی متناسب سائز ایک استثنا ہے۔زمین کی اپنے محور (axis) پر گردش ایک استثنا ہے۔زمین پر لائف سپورٹ سسٹم (life support system) ایک استثنا ہے۔زمین پر زندگی ایک استثنا ہے۔زمین پر انسان ایک استثنا ہے، وغیرہ۔

اِس قسم کے مختلف استثنا جو ہماری دنیا میں پائے جاتے ہیں، وہ سادہ طور پر صرف استثنا نہیں ہیں، بلکہ وہ انتہائی حد تک بامعنی استثنا (meaningful exception) ہیں۔وسیع کائنات میں اِس قسم کے بامعنٰی استثنات یقینی طور پر اِس بات کا ثبوت ہیں کہ اِس کائنات کا ایک خالق ہے۔اُس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اِس کائنات کو بنایا ہے۔ اُس نے جہاں چاہا، چیزوں میں یکسانیت (uniformity) کا طریقہ اختیار کیا، اور جہاں چاہا، کسی چیز کو دوسری چیزوں سے ممیّز اور مستثنٰی بنا دیا۔

مثلاً زندہ اجسام کے ڈھانچے میں باہم یکسانیت (uniformity) پائی جاتی ہے، لیکن اِسی کے ساتھ ہر ایک کا جنیٹک کوڈ (genetic code) ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر ایک کے ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں، لیکن ہر ایک کے انگوٹھے کا نشان (thumb impression) ایک دوسرے سے الگ ہے۔یکسانیت کے درمیان یہ استثنا یقینی طور پر ایک ذہین تخلیق (intelligent creation) کا ثبوت ہے، نہ کہ اندھے اتفاقات کا نتیجہ۔

بگ بینگ، لٹل بینگ

انسان ہمیشہ یہ سوچتا رہا ہے کہ موجودہ کائنات کیسے بنی۔وہ عقلی سطح پر اِس کا جواب پانا چاہتا تھا۔بیسویں صدی عیسوی کے رُبع اوّل میں پہلی بار انسان کو اِس کا عقلی جواب ملا۔فلکیاتی سائنس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ تقریباً 13 بلین سال پہلے، خلا میں ایک انفجار (explosion) ہوا۔اِس انفجار کو عام طور پر بگ بینگ (Big Bang) کہا جاتا ہے۔فلکیاتی سائنس کے اعتبار سے، اِسی بگ بینگ کے بعد بتدریج موجودہ کائنات وجود میں آئی۔

تاہم ایک سوال کا عقلی جواب ابھی باقی تھا، وہ یہ کہ ہمارا شمسی نظام (solar system) کیسے بنا۔ شمسی نظام، ساری کائنات میں ایک استثنائی نظام ہے۔ اِس نظام کے اندر سیارۂ زمین ایک انتہائی استثنائی قسم کا سیارہ ہے۔ علماءِ فلکیات اِس بات کی عقلی توجیہ نہیں کر سکے تھے کہ کائنات میں استثنائی قسم کا موجودہ شمسی نظام کیسے بن گیا۔

بگ بینگ کی دریافت کے تقریباً سو سال بعد، اکیسویں صدی کے ربع اول میں، سائنس دانوں نے سوئزر لینڈ میں کچھ خصوصی تجربات کیے۔ اِن تجربات کے دوران یہ معلوم ہوا کہ بگ بینگ کے واقعے کے بہت بعد خلا میں ایک چھوٹا انفجار رہوا۔ اِس کو سائنس دانوں نے لٹل بینگ (Little Bang) کا نام دیا ہے۔ اِس لٹل بینگ کے بعد شمسی نظام وجود میں آیا اور بتدریج وہ استثنائی سیارہ بنا جس کو زمین (planet earth) کہا جاتا ہے۔

بگ بینگ اور لٹل بینگ کی یہ دونوں سائنسی دریافتیں بتاتی ہیں کہ کائنات کی تخلیق ایک اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی کے ذریعے ہوئی۔ یہ کائنات کسی اتفاق (accident) کے ذریعے وجود میں نہیں آئی، بلکہ وہ ایک بالقصد منصوبے کے ذریعے وجود میں آئی۔ یہ واقعہ اپنے آپ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اِس کائنات کی ایک منزل ہے۔ یہ کائنات پورے معنوں میں ایک بامعنیٰ کائنات ہے، اور ایک بامعنیٰ کائنات کسی بے معنیٰ انجام پر ختم نہیں ہوسکتی۔

تاریخِ عالم پر ایک تبصرہ

سیکولر نظریے کے مطابق، دنیا کی تاریخ چار بڑے اَدوار پر مشتمل ہے— بگ بینگ کا واقعہ، مادّی ترقیات، تہذیب کی ترقی، خاتمۂ تاریخ:

Big Bang, material development, civilizational development, abrupt end.

سیکولر نظریے کے مطابق، تقریباً پندرہ بلین سال پہلے بگ بینگ کے ذریعے موجودہ کائنات کا آغاز ہوا۔ اِس کے بعد لمبے ارتقائی عمل کے ذریعے موجودہ مادّی دنیا بنی۔ انسان کے ظہور کے بعد

تہذیبی ترقی شروع ہوئی۔ اکیسویں صدی عیسوی میں گلوبل وارمنگ (global warming) کا ناقابلِ حل مسئلہ سامنے آ گیا۔اوراب تمام سائنس داں یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری دنیا میں جو طبیعی تغیرات ہورہے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ 2050 سے پہلے ہی اِس دنیا کا خاتمہ ہوجائے گا۔

موجودہ دنیا کی یہ سیکولر تصویر ناقابلِ فہم حد تک عجیب ہے۔ سیکولر نظریہ بتاتا ہے کہ پچھلے پندرہ بلین سال سے ہماری دنیا میں مسلسل طور پر بامعنٰی ارتقا جاری رہا ہے، یہاں تک کہ موجودہ کائنات بنی، جو انتہائی حد تک بامعنی کائنات تھی۔ اب گلوبل وارمنگ کے ذریعے اگر دنیا کسی مزید مستقبل کے بغیر آخری طور پر فنا ہوجائے تو یہ ایک بامعنی آغاز کا ایک بے معنٰی انجام ہوگا، جو بلاشبہہ عقلی طور پر ناقابلِ فہم ہے۔ مثال کے طور پر نظریۂ ارتقا یہ کہتا ہے کہ انواعِ حیات کے درمیان بقائے اصلح (survival of the fittest) کا عمل جاری رہا ہے۔ اِس نظریے کے مطابق، اِسی ارتقائی عمل کا یہ نتیجہ تھا کہ انسان جیسی ایک اعلیٰ نوع وجود میں آئی۔ اب یہ سرتا سر ایک غیر عقلی (irrational) بات ہے کہ بقاءِ اصلح کا عمل اپنے آخر میں صرف ایک معکوس انجام پر ختم ہوجائے:

It is unthinkable that the survival of the fittest may lead to the extinction of the fittest.

خود فطرت کا قانون یہ تقاضا کرتا ہے کہ کائناتی پراسس اپنے آخر میں ایک بہتر دنیا کو وجود میں لانے کا ذریعہ ہے۔

سائنس کی گواہی

انٹرنیٹ موجودہ زمانے میں معلومات کا عالمی خزانہ ہے۔ انٹرنیٹ کو الکٹرانک انسائکلو پیڈیا کہا جاسکتا ہے۔ اگر آپ انٹرنیٹ پر جائیں اور حسب ذیل الفاظ ٹائپ کریں — تھاٹ کنٹرولڈ وھیل چیئر (Thought-Controlled Wheel Chair) تو اسکرین پر معلومات کا ایک صفحہ کھل جائے گا۔ وہ بتائے گا کہ کسی خارجی آلہ کے بغیر دماغ کے ذریعے وھیل چیئر کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

وھیل چیئر پر بیٹھا ہوا ایک شخص اپنے ہاتھ کو استعمال کئے بغیر محض اپنے دماغ کے ذریعے وھیل چیئر کو اپنی مرضی کے مطابق، جس طرح چاہے چلا سکتا ہے۔ جاپان کی موٹر کمپنی (Toyota Motors) نے

یکم جولائی 2009 کو لوگوں کے سامنے اِس ٹکنالوجی کا مظاہرہ کیا۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ کس طرح خدا اپنی مرضی کے تحت پوری کائنات کو کنٹرول کررہا ہے۔ تھاٹ کنٹرولڈ وھیل چیئر کا کامیاب مظاہرہ تھاٹ کنٹرولڈ یونی ورس (thought-controlled universe) کا ایک عملی ثبوت ہے۔

مذکورہ سائنسی دریافت اِس حقیقت کو قابلِ فہم بنا دیتی ہے کہ ایک برتر خدائی ذہن (divine mind) ساری کائنات کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں لیے ہوئے ہے۔

Thought-Controlled Wheel Chair

Japan's Toyota Motor said yesterday it had invented a way to allow a person to steer an electric wheelchair through simple thought, using a helmet-like device that measures their brain waves. They said that they have developed a way of steering a wheelchair by just detecting brain waves, without the person having to move a muscle or shout a command. Toyota's system, developed in collaboration with researchers in Japan, is among the fastest in the world in analyzing brain waves, it said in a release on Monday. (*The Times of India,* New Delhi, July 1, 2009)

سائنس سے معرفت تک

سائنس کیا ہے۔ سائنس دراصل منظم علم کا نام ہے۔ سائنس سے مراد وہ علم ہے جس میں کائنات کا مطالعہ موضوعی طور پر ثابت شدہ اصولوں کی روشنی میں کیا جائے:

Science: The systematized knowledge of nature and the physical world.

کائنات کی حقیقت کے بارے میں انسان ہمیشہ غوروفکر کرتا رہا ہے۔ سب سے پہلے روایتی عقائد کی روشنی میں، اس کے بعد فلسفیانہ طرزِ فکر کی روشنی میں، اور آخر میں سائنس کے مسلّمہ اصولوں کی روشنی میں۔ طبیعیاتی سائنس کے میدان میں پچھلی چار صدیوں میں تین انقلابی تبدیلیاں پیش آئی ہیں۔ اوّل، برٹش سائنس داں نیوٹن کا مفروضہ کہ کائنات کی بنیادی تعمیری اینٹ مادّہ ہے۔ اِس کے بعد

بیسویں صدی کے آغاز میں جرمن سائنس داں آئن سٹائن کا نظریہ سامنے آیا کہ کائنات کی بنیادی تعمیری اینٹ توانائی ہے۔ اوراب آخر میں ہم امریکن سائنس داں ڈیوڈ بام کے نظریاتی دور میں ہیں، جب کہ سائنس دانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد یہ مان رہی ہے کہ کائنات کی بنیادی تعمیری اینٹ شعور ہے۔ یہ تبدیلیاں لازمی طور پر ایک نئے فلسفے کو جنم دیتی ہیں، جب کہ فلسفہ مادّیت سے گزر کر روحانیت تک پہنچ گیا ہے:

> In the realm of the physical science, we have had three major paradigm shifts in the last four centuries. First, we had the Newtonian hypothesis that *matter* was the basic building block of the universe. In the early twentieth century, this gave way to the Einsteinian paradigm of *energy* being the basic building block. And the latest is the David Bohm era when more and more scientists are accepting *consciousness* to be the basic building block. These shifts have had inevitable consequences for the New Age philosophy, which has moved away from the philosophy of crass materialism to that of spirituality.

وہ دور جس کو سائنسی دور کہا جاتا ہے، اُس کا آغاز تقریباً پانچ سو سال پہلے مغربی یورپ میں ہوا۔ دھیرے دھیرے عمومی طور پر یہ تاثر بن گیا کہ سائنس حقیقت کو جاننے کا سب سے اعلیٰ ذریعہ ہے۔ جو بات سائنس سے ثابت ہوجائے، وہی حقیقت ہے، جو بات سائنسی اصولوں کے ذریعے ثابت نہ ہو، وہ حقیقت بھی نہیں۔

ابتدائی صدیوں میں سائنس خالص مادّی علم کے ہم معنی بن گئی۔ چوں کہ مذہبی حقیقتیں مادی معیارِ استدلال پر بظاہر ثابت نہیں ہوتی تھیں، اِس لیے مذہبی حقیقتوں کو غیر علمی قرار دے دیا گیا۔ لیکن علم کا دریا مسلسل آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب کہ خود سائنس مادی علم کے بجائے عملاً غیر مادّی علم کے ہم معنی بن گئی۔ پچھلی صدیوں کی علمی تاریخ بتاتی ہے کہ سائنس کے ارتقا کے ذریعے پہلی بار استدلال کی ایک ایسی علمی بنیاد وجود میں آئی جو عالمی طور پر مسلّمہ علمی استدلال کی حیثیت رکھتی تھی،

پھر اِس میں مزید ارتقا ہوا، اور آخر کار سائنس ایک ایسا علم بن گیا جو مسلّمہ عقلی بنیاد پر یہ ثابت کر رہا تھا کہ کائنات ایک بالاتر شعور کی کارفرمائی ہے۔ ایک سائنس داں نے کہا کہ — کائنات کا مادّہ ایک ذہن ہے:

The stuff of the world is mind-stuff. (Eddington)

جب یہ بات ثابت ہوجائے کہ کائنات کی تخلیق کے پیچھے ایک عظیم ذہن (mind) کی کارفرمائی ہے۔ کائنات کے اندر جو معنویت ہے، جو منصوبہ بندی ہے، جو بےنقص ڈزائن ہے، وہ حیرت انگیز طور پر ایک اعلیٰ ذہن کے وجود کو بتاتا ہے۔ کائنات میں اَن گنت چیزیں ہیں۔ لیکن ہر چیز اپنے فائنل ماڈل پر ہے۔ کائنات میں حسابی درستگی اتنے زیادہ اعلیٰ معیار پر پائی جاتی ہے کہ ایک سائنس داں نے کہا کہ کائنات ایک ریاضیاتی ذہن (mathematical mind) کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جب علم کا دریا یہاں تک پہنچ جائے تو اس کے بعد صرف یہ کام باقی رہ جاتا ہے کہ اِس دریافت کردہ شعور یا اس ذہن کو مذہبی اصطلاح کے مطابق، خدا (God) کا نام دے دیا جائے۔

یہ اخلاقی بحران کیوں

مسٹر رجَت ملہوترا ایک انٹرنیشنل بینک میں مینیجر ہیں۔ بینک نے اپنے اعلیٰ عہدے داروں کو مختلف ملکوں میں سیاحت کے لیے بھیجا۔ اِس ٹیم میں مسٹر رجت ملہوترا بھی شامل تھے۔ 15 دسمبر 2007 کو تھائی لینڈ سے اُن کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک خدا پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں دوسری زندگی کو اور جنت، دوزخ کو مانتا ہوں۔ سفر میں اکثر میں اپنے ساتھیوں سے خدائی موضوعات پر بات کرتا ہوں، مگر میں نے دیکھا کہ اِن لوگوں کو اِس طرح کے موضوعات سے کوئی دل چسپی نہیں۔

لیکن جب ہم لوگ کسی بڑے شہر میں پہنچتے ہیں تو میں دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ شاپنگ کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میرے سوا، ٹیم کا ہر آدمی نہایت دل چسپی کے ساتھ خریداریاں کرتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ فرق کیوں ہے۔ کیوں ایسا ہے کہ وہ خدا کے موضوع پر بات کرنے میں کوئی دل چسپی نہیں لیتے، لیکن جب شاپنگ کا موقع آتا ہے تو یہ لوگ نہایت دھوم کے ساتھ شاپنگ کرتے ہیں۔ میں جب اُن سے اِس کا سبب پوچھتا ہوں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ جب ہم واپس ہو کر گھر پہنچیں گے تو ہمارے گھر والے ہم سے پوچھیں گے کہ تم فلاں فلاں ملک میں گئے، وہاں سے تم ہمارے لیے کیا لائے۔ انھوں نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ ٹیلی فون پر برابر اپنے گھر والوں سے بات کرتے رہتے ہیں اور خوشی کے لہجے میں یہ کہتے ہیں کہ ہم تمھارے لیے یہ چیز لا رہے ہیں اور وہ چیز لا رہے ہیں۔

اس موضوع پر میں نے غور کیا تو مجھے ایک عرب عالم کی بات یاد آئی۔ یہ محمد العارف ہیں۔ وہ اِس وقت مانچسٹر (برطانیہ) میں رہتے ہیں۔ ایک سفر کے دوران اُن سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ برطانیہ آکر مجھے یہ دریافت ہوئی کہ موجودہ زمانے کی اخلاقی بُرائیوں کی جڑ کیا ہے۔ وہ ہے— انعام کو مُنعم سے الگ کر دینا۔ آج کا انسان، خدا کے انعامات کو تو خوب خوب استعمال کر رہا ہے، لیکن وہ خدا کا اعتراف نہیں کرتا جو کہ منعم ہے، جو اِن تمام انعامات کو دینے والا ہے۔ یہ تجزیہ بلاشبہہ درست ہے اور یہی موجودہ زمانے کی تمام برائیوں کی اصل جڑ ہے۔

موجودہ زمانے کی سب سے بڑی فکری بُرائی یہ ہے کہ اِس زمانے میں خالق کومخلوق سے الگ کردیا گیا۔ انسان کا اپنا وجود اور اس کے باہر کی تمام چیزیں خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ انسان اِن چیزوں کو آخری ممکن درجے تک استعمال کررہا ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو اِس سے بے نیاز سمجھتا ہے کہ وہ خدا کا اعتراف کرے، جو تمام موجودات کا خالقِ حقیقی ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان اِسی تفریق کے نتیجے میں موجودہ زمانے کی تمام برائیاں پیدا ہوئی ہیں۔

دونوں قسم کے ذہن سے دو الگ الگ کلچر پیدا ہوتے ہیں۔ خالق کا اعتراف آدمی کے اندر ذمّے داری کا ذہن پیدا کرتا ہے۔ اِس سے مسئولیت (accountability) کا احساس جاگتا ہے۔ یہ احساس آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اخلاقی ڈسپلن کے ساتھ زندگی گزارے، کیوں کہ اس کو یہ ڈر ہوتا ہے کہ اگر اس نے اپنی اخلاقی ذمے داری کو پورا نہیں کیا تو لازمی طور پر وہ خدا کی پکڑ میں آجائے گا۔ خدائی قانون کے مطابق، وہ سخت سزا کا مستحق بن جائے گا جس سے بچنا اُس کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ اِس کے برعکس معاملہ اُس انسان کا ہے جو اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے آزاد سمجھتا ہو۔ ایسے آدمی کا حال یہ ہوگا کہ وہ انسانوں کی بستی میں خوش پوش حیوان کی مانند رہنے لگے گا، اُس کا پورا کردار غیر ذمے دارانہ کردار بن کر رہ جائے گا۔

موجودہ زمانے میں یہ غیر ذمّے دارانہ کلچر اپنی آخری حد تک پہنچ چکا ہے۔ آج کا انسان اپنے آپ ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ وہ اِس نفسیات میں جیتا ہے کہ میں جو چاہوں کروں، مجھے کسی اور سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اِس غیر ذمے دارانہ کلچر کے نمونے ہر روز سماج میں اور میڈیا میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ بطور نمونہ یہاں میں صرف دو حوالے نقل کروں گا۔

اگر آپ آج کل کے کسی بڑے انگریزی اخبار کو پڑھیں تو آپ اُس کے ہر شمارے میں جدید سماج کے نمونے اس کے تقریباً ہر صفحے پر پائیں گے۔ ہر شمارے میں برہنگی (nudity) اتنی زیادہ نمایاں ہوگی کہ آپ کا جی چاہے گا کہ آپ اخبار پڑھنا ہی بند کردیں۔ مثال کے طور پر 17 دسمبر 2007 کے ٹائمس آف انڈیا (Delhi Times) کے صفحۂ اوّل کو دیکھیے۔ اُس میں ایک فلم ایکٹریس کی

رنگین تصویر چھپی ہے۔ اِس کے ساتھ جو خبر شائع ہوئی ہے، اس کے اوپر جلی حرفوں میں یہ عنوان درج ہے— مجھے اپنے کسی فیصلے پر ندامت نہیں ہوتی:

I don't regret any decision.

فلم ایکٹریس کا یہ جملہ نمائندہ طور پر یہ بتا رہا ہے کہ آج کے انسان کا اصل اخلاقی مسئلہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جدید افکار ونظریات کے تحت، ایسا ہوا ہے کہ انسان کے اندر ضمیر (conscience) کا عمل تقریباً ختم ہوگیا۔ ضمیر ایک فطری آواز ہے جو انسان کو صحیح اور غلط کا احساس دلاتی ہے، لیکن موجودہ زمانے میں جدید افکار ونظریات کے تحت، انسان کی ایسی کنڈیشننگ ہوئی ہے کہ اس کے اندر ضمیر کا عمل تقریباً ختم ہوگیا۔ اور جب ضمیر کا عمل ختم ہوجائے تو اس کے بعد عملی طور پر یہی ہوگا کہ انسان اور حیوان کے درمیان اخلاقی اعتبار سے کوئی فرق باقی نہ رہے۔

جنگل کے حیوان اپنی جِبلّت (instinct) پر قائم رہتے ہیں۔ ان کی جبلت میں صحیح اور غلط، یا حق اور باطل کا فرق موجود نہیں، اِس لیے وہ اِس قسم کے احساسات سے خالی ہوکر زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن انسان پیدائشی طور پر صحیح اور غلط، یا حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے کا احساس لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جدید افکار ونظریات کے تحت، اِباحیت (permissiveness) کا جو کلچر پیدا ہوا، اس میں اور اس انسانی احساس میں ایک تضاد پایا جاتا تھا۔ اِس تضاد کو دور کرنے کے لیے نہایت خوب صورت نظریات گھڑے گئے اور پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اس کو تمام لوگوں میں پھیلا دیا گیا۔ بطور نمونہ یہاں اِس کی ایک مثال درج کی جاتی ہے۔

نئی دہلی کے مشہور انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (16 دسمبر 2007) میں مسٹر جیمس (Mames P Krehbiel) کے نام سے اخبار کے صفحہ 27 پر ایک مضمون چھپا ہے۔ اُس کے مندرجات کے مطابق، اس کا عنوان یہ ہے— اپنے آپ کو خطا کار نہ سمجھو:

Don't feel guilty

اِس مضمون میں جدید ذہن کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ خطا کا احساس آدمی کے اندر

سیلف بلیم (self-blame) کی نفسیات پیدا کرتا ہے، ایسا آدمی شکست خوردہ ذہنیت کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے، اس کا کانفڈینس لیول (confidence level) بہت گر جاتا ہے، ایسے آدمی کے اندر غیر ضروری طور پر منفی مزاج پیدا ہو جاتا ہے، وہ حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ کھو بیٹھتا ہے، ماں باپ کی روک ٹوک اور اخلاقی پابندیوں کی بات کو اِس مضمون میں نگیٹیو پیرنٹنگ (negative parenting) بتایا گیا ہے، کیوں کہ اِس سے بچے کے اندر اپنے بارے میں کم تری کا احساس پیدا ہوتا ہے، وغیرہ۔

یہ بلا شبہہ صورتِ حال کا غلط تجزیہ ہے۔ آدمی کے اندر جب غلطی کا احساس پیدا ہوتا ہے تو وہ اس کے اندر اپنی اصلاح (self-correction) کا جذبہ ابھارتا ہے، نہ کہ سیلف ڈفیٹ (self-defeat) کا جذبہ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے اندر اس کا ضمیر کم زور ہونے کے باوجود ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ ایسی حالت میں جو آدمی اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرے، وہ ہمیشہ بے یقینی کے احساس میں مبتلا رہے گا۔ اِسی کا دوسرا نام بے حوصلگی ہے۔ اِس کے برعکس، جو آدمی غلطی کرنے کے بعد اس کا اعتراف کرلے، وہ اپنی اصلاح کرکے اپنے اندر مزید یقین پیدا کرلے گا، وہ زیادہ حوصلے کے ساتھ عمل کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ یقین اور اعتماد کا سرچشمہ آدمی کا یہ احساس ہے کہ میں سچائی کے راستے پر ہوں۔ میں اپنے ضمیر کے مطابق چل رہا ہوں۔ میں نے فطرت کے نظام سے بغاوت نہیں کی ہے۔ میں اُن اصولوں کا پابند ہوں جن کے اوپر پوری کائنات قائم ہے۔ برسرِ حق ہونے کا احساس آدمی کے حوصلے کو بڑھاتا ہے۔ اِس کے برعکس، جو آدمی غلطی کرنے کے باوجود اپنے کو غلط نہ مانے، وہ داخلی بے یقینی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ یہ واقعہ کبھی شعوری طور پر ہوتا ہے اور کبھی غیر شعوری طور پر، مگر جہاں تک نتیجے کا تعلق ہے، دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

فکری اعتبار سے اِس غلطی کا آغاز بہت پہلے سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، اِس دور میں عالمی افکار پر سب سے زیادہ جو لوگ اثر انداز ہوئے ہیں، وہ مغربی علما اور سائنس داں ہیں۔ چناں چہ اِس معاملے میں بھی جو صورتِ حال عالمی سطح پر پیدا ہوئی، اِس کی ذمے داری زیادہ تر مغربی علما پر جاتی ہے۔

یہ دراصل مغربی علما ہی تھے جنھوں نے انسانی فکر کی دنیا میں وہ حالات پیدا کیے جس کے نتیجے میں ارادی یا غیرارادی طور پر، وہ صورتِ حال پیدا ہوئی جس کو اخلاقی بحران (moral crisis) کہا جاتا ہے۔

اِس معاملے میں سب سے زیادہ نمایاں نام اٹلی کے مشہور سائنس داں گلیلیو (Galileo) کا ہے۔ گلیلیو 1564 میں پیدا ہوا، اور 1642 میں اِس کی وفات ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ گلیلیو وہ شخص ہے جس نے ماڈرن سائنس کی بنیاد رکھی۔ گلیلیو پہلا شخص ہے جس نے دوربین کے ذریعے ستاروں اور سیاروں کا اور شمسی نظام مشاہدہ کیا۔ اگرچہ آخری عمر میں وہ اندھا ہوگیا تھا، لیکن سائنس کے مختلف شعبوں میں اس کی خدمات بہت زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے۔

گلیلیو نے ایک طرف یہ تاریخی کام کیا کہ اس نے میتھ میٹکس اور فزکس کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا، جب کہ اس سے پہلے دونوں الگ الگ شعبے بنے ہوئے تھے:

Galileo was the first man who perceived that mathematics and physics, previously kept in separate compartments, were going to join forces. (EB,7/853)

گلیلیو کے اِس عمل سے فزکس کو بہت ترقی ہوئی۔ لیکن اِس مثبت کام کے ساتھ گلیلیو نے ایک ایسا کام بھی کیا، جس کے دور رس منفی نتائج برآمد ہوئے۔ وہ یہ کہ گلیلیو نے چیزوں کے کمّیاتی پہلو (quantitative aspect) کو چیزوں کے کیفیاتی پہلو (qualititative aspect) سے جدا کردیا۔ اِس طرح اس نے سائنس کی تحقیقات کو صرف اُن چیزوں تک محدود کردیا جو ناپی اور تولی جاسکتی تھیں، دوسری چیزیں اپنی تمام اہمیت کے باوجود سائنسی تحقیق کا موضوع نہ رہیں۔ اِس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ انسان کے لیے غیر اہم قرار پاگئیں، کیوں کہ موجودہ زمانے میں فکری اعتبار سے سائنس کا غلبہ ہے۔ آج کا انسان اُنھیں چیزوں کو اہمیت دیتا ہے، جو سائنس کے اعتبار سے اہم قرار پائیں۔ اِس مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر الیکسس کیرل (وفات: 1944) نے اپنی کتاب انسانِ نامعلوم (*Man the Unknown*, 1935) میں لکھا ہے:

"یہ غلطی جو ہماری تمام مصیبتوں کی ذمے دار ہے، گلیلیو کے تولیدی نظریہ (genial idea) کی

ایک غلط تعبیر کا نتیجہ ہے۔ گلیلیو نے چیزوں کی ابتدائی صفات کو، جو اَبعاد اور وزن پر مشتمل ہیں اور جن کی آسانی سے پیمائش کی جاسکتی ہے، اُن ثانوی صفات سے الگ کر دیا، جو شکل، بُو اور رنگ وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کی پیمائش نہیں کی جاسکتی۔ کمّیت کو کیفیت سے جدا کر دیا گیا ہے۔ اِس غلطی سے غیر معمولی نتائج پیدا ہوئے۔ انسان کے اندر وہ چیزیں، جن کی پیمائش نہیں کی جاسکتی، اُن چیزوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں جن کی پیمائش کی جاسکتی ہے۔ مثلاً فکر اور خیال کا وجود اتنا ہی اہم ہے، جتنا خوں ناب (blood serum) کے طبیعی کیمیاوی توازن کا وجود اہم ہے۔ کمّی اور کیفی اشیا کے درمیان یہ فرق اور وسیع ہوگیا، جب ڈیکارٹ نے جسم اور روح کے درمیان فرق کرنا شروع کیا۔ اِس کے بعد سے دماغ کے مظاہر ناقابلِ تشریح بن گئے۔ مادّی اشیا کو روحانی اشیا سے بالکل الگ کر دیا گیا‘‘ (*Religion and Science*, p. 73)

انسانی فکر میں اِس تبدیلی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ خالق اور مخلوق کے درمیان تعلق ختم ہوگیا، یا صرف رسمی طور پر باقی رہا۔ انسان دنیا میں اِس طرح رہنے لگا، جیسے کہ وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں، وہ اپنی قسم کا مالک آپ ہے، اُس کو یہ حق ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ اِسی سے ہیومن ازم (Humanism) کا فلسفہ پیدا ہوا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ — خدا کی سیٹ پر اب خود انسان کو قبضہ حاصل ہوگیا۔ چناں چہ ہیومن ازم کے نظریے کو اِن الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے:

Transfer of seat from God to man.

انسان جب اپنے آپ کو خدا کی نسبت سے دیکھے تو اس کے اندر اللہ اکبر کی نفسیات پیدا ہوتی ہے، یعنی ہر قسم کی بڑائی صرف خدا کے لیے ہے۔ میں اُس کے مقابلے میں صرف ایک عاجز مخلوق کی حیثیت رکھتا ہوں۔ ایسا انسان خدا کو کبیر مان کر، اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں صغیر بنا لیتا ہے۔ اِس سے انسان کے اندر تواضع (modesty) کی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عجز اور تواضع کا احساس ہی تمام اعلیٰ اخلاقی اقدار کا سرچشمہ ہے۔

اِس کے برعکس معاملہ اُس انسان کا ہے جو خدا کو حذف کر کے سوچے۔ ایسے انسان کے پاس

تقابل کے لیے صرف دوسرے انسان ہوتے ہیں۔ فطری طور پر اس کے اندر یہ احساس ابھرتا ہے کہ کوئی مجھ سے بڑا نہیں، دوسرے جو لوگ ہیں، وہ یا تو میرے برابر ہیں، یا مجھ سے چھوٹے ہیں۔ ہر آدمی کے اندر کوئی نہ کوئی خاص صفت ہوتی ہے، اِس لیے ہر آدمی کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھے۔ وہ اِس کی ضرورت نہ سمجھے کہ اُس کو کسی کے آگے جھکنا چاہیے۔ اِس قسم کا احساس بلا شبہہ تمام اخلاقی اقدار کی نفی کے ہم معنیٰ ہے۔

مثال کے طور پر برطانیہ کا مدبّر لارڈ کرزن (وفات: 1925) غیر معمولی ذہین آدمی تھا۔ اس کا مطالعہ بھی کافی وسیع تھا۔ چناں چہ جب وہ لوگوں سے ملتا تو اس کو محسوس ہوتا کہ دوسرے لوگ اُس سے کم ہیں۔ اس کے اندر اپنے بارے میں برتری کا احساس پیدا ہو گیا۔ لارڈ کرزن کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ — اُس کے معاصرین میں کوئی اس کے برابر کا نہ تھا:

He had no equal

اِس احساسِ برتری کی بنا پر لارڈ کرزن کا پورا رویّہ غیر متوازن بن گیا۔ وہ دوسرے تمام لوگوں کے لیے منفی احساس میں جینے لگا، یہاں تک کہ سخت مایوسی کے عالم میں وہ مر گیا۔ یہی کم و بیش اُن تمام انسانوں کا حال ہوتا ہے جو خدا کو حذف کر کے اپنا فکر بنائیں۔ جن کی اخلاقیات کا سرچشمہ خدا نہ ہو، وہ اپنے آپ میں جئیں گے اور اپنے آپ ہی میں مر جائیں گے۔

دورِشرک، دورِالحاد

مذہبی نقطہ نظر سے تاریخ کے دو دور ہیں —— دورِشرک، دورِالحاد۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے ہزاروں سال تک دنیا میں شرک (polythiesm) کا غلبہ تھا۔ موجودہ زمانہ عمومی تقسیم کے اعتبار سے، الحاد (atheism) کا زمانہ ہے۔ تاہم الحاد انکارِ مذہب کا نظریہ ہے، جب کہ سیکولرزم مذہب کے بارے میں عملاً ناطرف داری کا نظریہ۔

دورِشرک اور دورِالحاد کے درمیان ایک چیز مشترک ہے اور وہی چیز ہے جس کو قرآن کی درج ذیل آیت میں 'خرص' کہا گیا ہے: وَقَالُوا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ۗ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (43:20) یعنی وہ کہتے ہیں کہ اگر رحمان چاہتا تو ہم اُن کی عبادت نہ کرتے۔ اُن کو اِس کا کوئی علم نہیں، وہ محض اٹکل سے بات کر رہے ہیں۔

'خرص' کا لفظی مطلب ہے اٹکل سے بات کرنا۔ اِس سے مراد دراصل چیزوں کی قیاسی تعبیر (speculative interpretation) ہے۔ قدیم زمانے میں مشرکین نے یہی غلطی کی تھی۔ انھوں نے یہ کیا کہ فطرت کا جو ظاہرہ اُن کو بڑا (great) نظر آیا، اس کو انھوں نے الٰہ (god) کا درجہ دے دیا۔ یہی چیز ہے جس کی طرف قرآن میں اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ (6:78)۔

موجودہ زمانے میں سائنس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اِس قدیم متھ (myth) کو توڑ دیا۔ سائنس نے اپنے تجربات کے ذریعے ثابت کیا کہ جن چیزوں کو انسان نے خدا سمجھ لیا تھا، اُن کے اندر کوئی خدائیت (divinity) نہیں ہے۔ تمام چیزیں صرف فطرت (nature) کے اجزا ہیں۔ بہ الفاظ دیگر، کائنات کی تمام چیزیں صرف مخلوق ہیں، وہ کسی بھی درجے میں خالق نہیں۔ مشرکانہ کلچر کے نظریاتی خاتمے کا آخری دن 20 جولائی 1969 تھا، جب کہ امریکی ایسٹروناٹ نیل آرم اسٹرانگ (Neil Armstrong) چار روزہ خلائی سفر طے کرکے چاند تک پہنچا اور چاند کی سطح پر اس نے اپنا قدم رکھ دیا۔

الحاد کا دور

شرک کا مطلب ہے— کسی غیر خدا کو خدا کا شریک (partner) قرار دے کر اس کی تعظیم یا عبادت کرنا۔ موجودہ زمانے میں جب شرک کا دور ختم ہوا تو اس کے بعد یہ ہونا چاہیے تھا کہ دنیا میں توحید کا دور آ جائے، لیکن اُس وقت اہلِ مغرب دنیا کے فکری قائد بنے ہوئے تھے اور جیسا کہ معلوم ہے، قرونِ وسطی (middle ages) کے زمانے میں مغرب کے اہلِ علم اور چرچ کے درمیان شدید ٹکراؤ ہوا۔ اِس ٹکراؤ کی تفصیل جان ولیم ڈریپر (J. W. Draper) کی درج ذیل کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے:

Conflict Between Science and Religion (1874)

قرون وسطی کے بعد یورپ میں انیسویں صدی میں جدید الحادی فکر کا دور آیا۔ یہ دور کسی علمی تحقیق کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ وہ تمام تر ردعمل (reaction) کے نتیجے میں پیش آیا۔ اِس زمانے میں علمی تحقیق کا معیار یہ قرار پایا کہ وہ تمام تر سیکولر انداز میں ہو، یعنی خدا کو حذف کرکے واقعات کی توجیہہ کرنا۔ اِس طرزِ فکر کے نتیجے میں وہ غیر مذہبی فلسفہ پیدا ہوا جس کو الحاد (atheism) کہا جاتا ہے۔

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے، ایک توجیہہ طلب حیوان (explanation-seeking animal) ہے۔ قدیم مشرکانہ دور میں یہ توجیہہ قیاسی بنیاد پر کی جاتی تھی۔ موجودہ ملحدانہ دور میں یہ توجیہہ علمی تحقیق کے نام پر کی جانے لگی۔ اِس نئے دور میں مغربی دنیا میں بہت سے مفکر پیدا ہوئے جو خدا کو حذف کرکے حیات اور کائنات کی توجیہہ کرتے تھے۔

اِس طریقِ تحقیق کے نتیجے میں ایک نیا دور پیدا ہوا۔ مزید یہ کہ اِسی دور میں پرنٹنگ پریس بھی وجود میں آیا۔ پہلے کتابیں محدود طور پر ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں، اب وہ چھپ کر عمومی طور پر پھیلنے لگیں۔ اِس طرح یہ ہوا کہ جدید الحاد مطبوعہ کتابوں میں منتقل ہو کر تمام دنیا کے فکر پر چھا گیا۔ جدید ملحدانہ دور میں جو مفکرین پیدا ہوئے اور ان کے ذریعے جو غیر مذہبی طرز فکر وجود میں آیا، اس کے پیچھے بہت سے ذہن کارفرما تھے۔ تاہم علامتی طور پر چار افراد کو اِس معاملے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اِن چار افراد نے

انسانی تاریخ کو ایک نیا رخ یا الحادی رخ دیا۔ اُن کے نام یہ ہیں — آئزاک نیوٹن، چارلس ڈارون، سگمنڈ فرائڈ، کارل مارکس:

1. Isaac Newton: from divine interpretation to mechanical interpretation
2. Charles Darwin: from Special Creation to Natural Selection.
3. Sigmund Freud: from harnessing desires to following desires.
4. Karl Marx: from duty-conscious society to right-conscious society.

1۔ برٹش سائنس داں آئزاک نیوٹن (وفات: 1727) اصلاً صرف ایک سائنس داں تھا۔ اس کا موضوع تھا مادی دنیا میں حرکت (motion) کی توجیہہ کرنا۔ اس نے دریافت کیا کہ مادی دنیا میں حرکت کا نظام میکانکل قوانین (mechanical laws) کے تحت ہوتا ہے۔ مثلاً شمسی نظام میں سیاروں کی گردش کا قانون۔ نیوٹن کی دریافت کا کوئی تعلق مذہبی عقائد سے نہ تھا، لیکن ملحد مفکرین نے اِس دریافت کو الحاد کے حق میں استعمال کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر واقعات فطری اسباب کے تحت پیش آتے ہیں تو وہ فوق الفطری سبب کے تحت نہیں ہوسکتے:

> If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes.

یہ استدلال بلاشبہہ ایک غیر منطقی استدلال تھا، کیوں کہ نیوٹن کی تشریح جس چیز کو بتا رہی تھی، وہ صرف ظاہری سبب تھا۔ اِس کے بعد بھی یہ سوال تھا کہ اسباب کے پیچھے مسبِّب (cause of the causes) کون ہے۔ اِس معاملے میں ملحدین کا استدلال تمام تر ایک مغالطے پر مبنی تھا، وہ کوئی سائنسی استدلال نہ تھا۔ لیکن ملحد مفکرین کی یہ توجیہہ وقت کے ذوق کے مطابق تھی، اِس لیے وہ عمومی طور پر پھیل گئی۔

2۔ چارلس ڈارون (وفات: 1882) کا ارتقائی نظریہ بنیادی طور پر انتخابِ طبیعی (natural selection) کے اصول پر مبنی ہے۔ ڈارون نے اور اس کے ساتھیوں نے اپنی کتابوں کے

ذریعے یہ تاثر دیا کہ ارتقا (evolution) کا یہ نظریہ ایک سائنسی نظریہ ہے۔ مگر علمی تعریف (definition) کے مطابق، ارتقا کا نظریہ ہرگز سائنسی نظریہ (scientific theory) نہ تھا، وہ صرف ایک قیاسی نظریہ (speculative theory) کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر وقت کے عمومی ذوق کی بنا پر حیاتیاتی ارتقا کے اِس نظریے کو عام مقبولیت حاصل ہوگئی۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ حیاتیاتی مظاہر کی توجیہ کے لیے اب خالق کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں، خالق کے وجود کو مانے بغیر تمام حیاتیاتی مظاہر کی توجیہ ممکن نہیں

مگر یہ صرف ایک مغالطہ تھا۔ سائنس کی مزید دریافتوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ارتقا کا یہ نظریہ علمی اعتبار سے بالکل بے بنیاد ہے۔ سائنس کی جدید دریافت بتاتی ہے کہ فطرت میں کامل درجے کی ذہین ڈزائن (intelligent design) پائی جاتی ہے۔ اِس دریافت نے علمی طور پر نظریہ ارتقا کا خاتمہ کر دیا ہے۔ کیوں کہ ذہین ڈزائن ایک ذہین ڈزائنر (intelligent designer) کی موجودگی کو ثابت کرتی ہے، وہ بے شعور قسم کے انتخابِ طبیعی کا نتیجہ نہیں ہوسکتی۔

3۔ سگمنڈ فرائڈ (وفات: 1939) کا نظریہ یہ تھا کہ انسان کی ذہنی ترقی اِس طرح ممکن ہے کہ اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی خواہشوں کو بے روک ٹوک پورا کر سکے۔ فرائڈ کے اِس نظریے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی تصور کے مطابق، حرام وحلال کی پابندیاں ختم ہوگئیں۔ انسان آزاد ہوگیا کہ وہ خود اپنی خواہش کے تحت جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔

لیکن بعد کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا کہ فرائڈ کا یہ نظریہ ایک غیر فطری نظریہ ہے۔ چناں چہ وہ انسان کی ذہنی ترقی میں مانع ہے، نہ کہ مددگار۔ نفسیات کا جدید مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کی ذہنی ترقی چیلنج کے ذریعے ہوتی ہے، نہ کہ بے قید آزادی کے ذریعے۔ مذہب کی عائد کردہ اخلاقی پابندیاں ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِس چیلنج کے ذریعے انسان کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) پیدا ہوتی ہے۔ اِس طرح انسان اپنی توانائی کے ضیاع سے بچتے ہوئے ذہنی ترقی کے راستے پر سفر کرتا رہتا ہے۔

4۔ کارل مارکس (وفات: 1883) نے زندگی کا جو فلسفہ دیا، وہ اپنی عملی تدبیر کے اعتبار سے

یہ تھا کہ اقتصادی ذرائع کو انفرادی کنٹرول سے نکال کر سماجی کنٹرول میں دے دیا جائے۔ مارکس کے نزدیک انسانی حقوق کے تحفظ کا یہی واحد راستہ تھا۔ مگر عملی تجربے کے لحاظ سے اِس فلسفے کا مطلب یہ تھا کہ تمام اقتصادی ذرائع کو اسٹیٹ کے کنٹرول میں دے دیا جائے۔ اِس نظریے کا مقصد بظاہر ایک غیرطبقاتی سماج (classless society) پیدا کرنا تھا، مگر عملاً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو شدید قسم کے متحارب طبقے پیدا ہوگئے۔

اِس نظریے سے دو بڑی برائیاں پیدا ہوئیں — ایک، یہ کہ مسابقت (competition) کا ختم ہوجانا، جو کہ تمام ترقیوں کے لیے فطری محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری برائی جو اشتراکی نظریے کے تحت پیدا ہوئی، وہ یہ کہ لوگ عمومی طور پر رائٹ کانشس (right-conscious) بن گئے، جب کہ کسی سوسائٹی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس کے افراد ڈیوٹی کانشس (duty-conscious) ہوں۔ یہاں پہنچ کر طبقاتی کشمکش نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ کیوں کہ زندگی میں ڈیوٹی کا تعین ہوسکتا ہے، لیکن رائٹ کا کوئی تعین نہیں۔

خلاصہ کلام

قدیم دورِ شرک کا بگاڑ یہ تھا کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان تعلق کو صحیح بنیاد پر قائم کرنے میں مانع بن گیا۔ انسان کو یہ کرنا تھا کہ وہ اپنی سوچ کو اور محبت اور خوف کے جذبات کو مکمل طور پر خدا سے وابستہ کرے۔ اِسی کا نام توحید ہے اور اِسی توحید سے انسان کے اندر تمام اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن مشرکانہ کلچر نے خدا کے شرکا (partners) قرار دے کر انسان کو اس کے مرکزِ اصلی سے ہٹا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان اپنے مطلوب ارتقا سے محروم ہو کر رہ گیا۔

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے، ایک مرکزِ وابستگی چاہتا ہے۔ انسان کی اِس فطری طلب کا مرجع صرف ایک ہے، اور وہ اس کا خالق ہے۔ بندے کا خالق سے تعلق قائم ہونا ایسا ہی ہے جیسے بجلی کے بلب کا پاور ہاؤس سے تعلق قائم ہونا۔ شرک کی برائی یہ تھی کہ اس نے انسان کی اِس طلب کے لیے اس کو ایک غیر واقعی بدل (false substitute) دے دیا۔ اِس بنا پر ایسا ہوا کہ انسان کو اس کی

فطری طلب کا مرکز نہیں ملا اور نتیجۃً انسان اپنی شخصیت کے اُس ارتقا سے محروم ہو گیا جو اس کے لیے پیدائشی طور پر مقدر تھا۔

جدید الحاد کے دور میں دوبارہ انسان ایک اور اعتبار سے اِسی محرومی کا شکار ہو گیا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو علمِ قلیل دیا گیا ہے۔ انسان کے لیے آزادی بہت اچھی چیز ہے، لیکن انسان اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے کامل آزادی کا تحمل نہیں کرسکتا۔ انسان کے لیے حقیقت پسندی یہ ہے کہ وہ اپنی اِس محدودیت (limitation) کو جانے اور مقیّد آزادی (guided freedom) پر راضی ہو جائے۔ جدید الحاد نے آزادی کو خیر مطلق (summon bonum) قرار دے کر انسان کو اس کی فطرت کے راستے سے ہٹا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بظاہر ہر قسم کی ترقیوں کے باوجود انسان اُس اہم ترین چیز سے محروم ہو گیا جس کو ذہنی سکون (peace of mind) کہا جاتا ہے۔

مذہب اور عقلیات

قدیم ترین زمانے سے مذہب کے دائرے میں یہ کوشش کی جاتی رہی ہے کہ مذہب کے عقائد کو عقلی اصولوں کے مطابق، صحیح ثابت کیا جائے۔ مذہب میں چوں کہ خدا کے عقیدے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اِس لیے فطری طور پر بڑے بڑے دماغ اِس میں مصروف رہے ہیں کہ وہ عقلی دلائل کی بنیاد پر خدا کے وجود کو ثابت شدہ بنائیں۔ خدا ہماری دنیا کا خالق اور مالک ہے۔ اِس اعتبار سے بلا شبہہ یہ تمام کاموں میں سب سے زیادہ بڑا کام ہے کہ خدا کے وجود کو انسانی عقل کے معیار پر ثابت شدہ بنایا جائے۔ انسان ہمیشہ عقل کی روشنی میں سوچتا ہے، اِس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ انسان اپنی عقل کے معیار پر خدا کی معرفت حاصل کرے، تا کہ خدا کے بارے میں وہ اُس اعلیٰ یقین کا درجہ پا سکے جو خداوندِ عالم کی نسبت سے مطلوب ہے۔

مگر عجیب بات ہے کہ پوری انسانی تاریخ اِس معاملے میں ایک مایوس کُن تصویر پیش کرتی ہے۔ بڑے بڑے دماغوں کی کوششوں کے باوجود یہ مقصد اپنے مطلوب معیار پر حاصل نہ ہوسکا۔ اِس کا دوسرا عظیم تر نقصان یہ ہے کہ پوری تاریخ میں، کچھ استثنائی افراد کو چھوڑ کر، عام طور پر انسان خدا کی اعلیٰ معرفت سے محروم رہا ہے۔ خدا کا نام لینے والے تو بے شمار تعداد میں موجود رہے ہیں، اور آج بھی موجود ہیں، لیکن وہ انسان جو خدا کی اعلیٰ معرفت سے بہرہ ور ہو، جس کو خدا کی معرفت اُس اعلیٰ درجے میں حاصل ہو، جو سینے کے اندر ایک طوفان برپا کر دیتی ہے، جو دل و دماغ کے اندر ایک زلزلہ کے ہم معنیٰ بن جاتی ہے، جب کہ انسان کی زبان سے حمدِ خداوندی کا وہ کلمہ نکلے جو کائناتی میزان کو بھر دینے والا ہو، انسانی تاریخ تھوڑے سے افراد کو چھوڑ کر، ایسے خدا پرست افراد سے خالی ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ انسان کو اس کے اعلیٰ معیارِ عقل پر خدا کے عقیدہ کو اس کے لیے قابلِ ادراک نہ بنایا جا سکا۔

مذہب اور عقلیات کی یہ کہانی فلاسفہ (philosophers) سے شروع ہوتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے دماغ فلسفیانہ غور وفکر میں مشغول رہے ہیں۔ اِن لوگوں نے چاہا کہ وہ خدا کے عقیدے کو

اعلیٰ تعقّل کی سطح پر قابلِ فہم بنائیں۔ لیکن وہ سب کے سب اِس مقصد میں ناکام رہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ اِن فلسفیوں کے پاس غور وفکر کے لیے جو فریم ورک (framework) تھا، وہ ایک محدود فریم ورک تھا۔ اِس محدود فریم ورک کے تحت، اُنھیں خدا کے عقیدے کو ایک ثابت شدہ حقیقت بنانا تھا، لیکن اُن کا محدود فریم ورک، خدا کو اپنے تصور میں لانے کے لیے بالکل ناکافی تھا۔ اِس لیے غیر معمولی فکری کوشش کے باوجود، وہ خدا کے بارے میں اعلیٰ معرفت کا شعور دینے میں ناکام رہے۔

مثال کے طور پر تمام فلاسفہ کا مشترک ذہن اپنے فلسفیانہ فریم ورک کی بنا پر یہ تھا کہ وہ اعلیٰ حقیقت کو ایک غیر شخصی وجود (impersonal being) تصور کرتے تھے۔ اِس بنا پر انھوں نے خدا کو عالمی روح (world spirit) یا عالمی تصور (world idea) جیسا نام دیا۔ مثلاً برکلے اور کانٹ اور ہیگل، وغیرہ۔ اِس تصور کے تحت، وہ فلسفیانہ فکر پیدا ہوا، جس کو آئڈیل ازم (idealism) کہا جاتا ہے۔ فلسفیانہ الٰہیات (philosophical theology) کا دوسرا نام آئڈیل ازم ہے۔

اِس کے بعد ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا دور آیا۔ عباسی خلافت کے زمانے میں ایک نیا علم پیدا ہوا، جو علمِ کلام (theology) کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اِس علم میں مشغول ہوئے، وہ متکلمین (theologists) کے نام سے مشہور ہیں۔ متکلمین اسلام کے اِس گروہ نے از سرِ نو یہ کوشش کی کہ وہ مذہبی عقیدہ، یا خدائی عقیدہ کو عقل کی اصطلاحوں میں بیان کریں۔ لیکن ان کی کمزوری یہ تھی کہ اُن کے پاس فریم ورک کے نام سے جو چیز موجود تھی، وہ دوبارہ یونانی منطق (Greek logic) تھی۔

یونانی منطق، دراصل قیاسی منطق (syllogism) کا دوسرا نام ہے۔ یہ منطق کا وہ طریقہ ہے، جو سائنسی منطق (scientific logic) کے ظہور میں آنے سے پہلے استعمال ہوتا تھا۔ مسلم متکلمین کے پاس دلیل قائم کرنے کے لیے یہی قدیم منطق قابلِ حصول تھی۔ یہ منطق تعقل پسند انسان کو مطمئن کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ اِس بنا پر مسلم متکلمین بھی عقلیاتِ اسلام کے سفر کو زیادہ آگے نہ بڑھا سکے۔ وہ بھی اِس معاملے میں اُسی طرح ناکام ثابت ہوئے، جس طرح اُن سے پہلے فلاسفہ (philosophers) اِس معاملے میں ناکام ثابت ہو چکے تھے۔

اِس کے بعد انیسویں صدی اور بیسوی صدی میں جدید سائنس (modern science) کا زمانہ آیا۔ اِس زمانے میں فطرت میں چھپے ہوئے نئے حقائق دریافت ہوئے۔ اِن حقائق نے تاریخ میں پہلی بار وہ علمی بنیاد فراہم کی، جس کی مدد سے الٰہیات (theology) کو ازسرِ نو سائنسی الٰہیات (scientific theology) کے طور پر مرتب کیا جاسکے۔ سائنسی الٰہیات کے ظہور نے اِس بات کو آخری حد تک ممکن بنا دیا کہ خدا پرستانہ عقائد کو خود اُس علمی معیار پر مدلل کیا جاسکے، جس کو انسان کے نزدیک مسلّمہ عقلی معیار کی حیثیت حاصل ہوچکی ہے۔

مگر عجیب بات ہے کہ یہ جدید سائنسی امکان اپنی اعلیٰ ترین صورت میں سامنے آیا، لیکن اُس کو الٰہیات کے شعبے میں استعمال نہ کیا جاسکا۔ جدید سائنس کے ظہور کے بعد علم کے سیکڑوں شعبوں میں ایک انقلاب آ گیا۔ ہر شعبے میں یہ کوشش کی گئی کہ علوم کو جدید سائنسی معیار پر ڈیولپ کیا جاسکے۔ علمِ خلیّات (cytology) سے لے کر علمِ فلکیات (astronomy) تک بے شمار علمی شعبوں کو سائنسی ترقی کا درجہ ملا، لیکن الٰہیات کا علم اِس اعتبار سے ایک مستثنیٰ علم بنا رہا۔

بیسویں صدی، سائنس کی زبردست سرگرمیوں کی صدی ہے، مگر الٰہیات کے اعتبار سے یہ صدی کسی حقیقی سرگرمی سے خالی نظر آتی ہے۔ میرے علم کے مطابق، بیسویں صدی میں دو ایسے آدمی اٹھے، جو ایک طرف تو پورے معنوں میں سائنٹسٹ تھے، اور دوسری طرف، بظاہر وہ اس بات کا شعور رکھتے تھے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ الٰہیات کو جدید سائنس کی بنیاد پر مرتب کیا جائے۔ اور اِس طرح، الٰہیات کو وہی درجہ دے دیا جائے جو درجہ دوسرے علومِ انسانی کو حاصل ہے۔ یہ دو آدمی حسب ذیل تھے:

سرجیمز جینز Sir James Jeans (1877-1946)

ڈاکٹر عبد السلام Dr. Abdus-Salam (1926-1996)

سرجیمز جینز اور ڈاکٹر عبد السلام، دونوں نے جدید الٰہیات کے موضوع پر کچھ جُزئی، لیکن اہم کام انجام دیا۔ مثلاً سرجیمز جینز نے اپنی کتاب (*The Mysterious Universe,* 1930) میں خالص سائنسی تجزیہ (Scientific analysis) کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ

کائنات اتنی زیادہ بامعنیٰ ہے کہ وہ اللل ٹپ (at random) طور پر وجود میں نہیں آسکتی، یقیناً وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وجود میں آئی ہے۔ سرجیمز جینز نے لکھا ہے کہ کائنات کا خالق ایک ریاضیاتی ذہن (mathematical mind) معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام ایک پروفیشنل سائنٹسٹ تھے۔ نظریاتی فزکس (theoretical physics) میں انھوں نے کیمبرج یونی ورسٹی (لندن) سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ جدید الٰہیات کے اعتبار سے اُن کا کام بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جس ریسرچ پر اُن کو فزکس کا نوبل پرائز (1979) ملا، وہ الٰہیات کے اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ زیر نظر موضوع پر ڈاکٹر عبدالسلام کی ایک کتاب (*Ideal and Realities*) ہے، جو پہلی بار 1984 میں چھپی۔

سر آئزک نیوٹن (وفات: 1727) کے زمانے سے یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ چار بنیادی طاقتیں (forces) ہیں، جو پوری کائنات کو کنٹرول کرتی ہیں۔ آئن سٹائن (وفات: 1955) نے اِس تعداد کو گھٹانا چاہا، لیکن وہ اِس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے خالص ریاضیاتی بنیاد پر یہ ثابت کیا کہ کائنات کو کنٹرول کرنے والی طاقتیں چار نہیں ہیں، بلکہ تین ہیں۔ اِس تحقیق پر اُن کو فزکس کا نوبل پرائز دیا گیا۔ بعد کو نظریاتی فزکس کے مشہور برٹش پروفیسر اسٹفین ہاکنگ (پیدائش: 1942) نے اِس تعداد کو مزید گھٹایا، اور یہ ثابت کیا کہ کائنات کو کنٹرول کرنے والی طاقت صرف ایک ہے۔ اِس طاقت کو انھوں نے واحد ڈور (single string) کا نام دیا۔

اِس طرح خالص سائنٹفک ریسرچ کے ذریعے یہ ثابت ہوا کہ کائنات میں تعدّد (plurality) نہیں ہے، بلکہ توحید (oneness) ہے۔ گویا کہ کائنات کا نیچر مؤحّدانہ (monotheistic) ہے، اس کا نیچر مشرکانہ (polytheistic) نہیں ہے۔ اِس سائنٹفک تحقیق میں ڈاکٹر عبدالسلام کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے پہلی بار ''چار طاقتوں'' کے نظریے کو توڑا، اور سائنسی طور پر ''ایک طاقت'' کو ماننے کا راستہ ہموار کیا۔

سرجیمز جینز اور ڈاکٹر عبدالسلام، دونوں یہ صلاحیت رکھتے تھے کہ وہ سائنسی الٰہیات

(scientific theology) کو مرتب کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیں۔ لیکن دونوں اِس موضوع پر صرف جُزئی کام کر سکے، وہ اِس موضوع کا تکمیلی باب نہ لکھ سکے۔ بظاہر دونوں کا عذر ایک تھا۔ دونوں ہی اپنی اکیڈمک سرگرمیوں اور پروفیشنل مشغولیت سے اتنا زیادہ وابستہ رہے کہ اُن کو سائنسی الٰہیات کے موضوع پر مزید کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ موضوع، دوسرے تمام اہم موضوعات کی طرح، مکمل ڈیڈی کیشن (dedication) کا تقاضا کرتا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی اِس کام کی یہ ضروری قیمت نہ دے سکا۔ اِس لیے دونوں میں سے ہر ایک اِس کام کو انجام دینے سے قاصر رہا۔

اسلام کو عقلی بنیاد (rational basis) دینے کے لیے کچھ اور لوگوں نے کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن اصل ضرورت کے اعتبار سے یہ کتابیں کسی حقیقی اہمیت کی حامل نہ تھیں۔ اصل مقصد جدید سائنٹفک مائنڈ کو ایڈریس کرنا تھا، مگر اِن کتابوں سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

1- حجۃ اللہ البالغۃ، شاہ ولی اللہ دہلوی

2- تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ڈاکٹر محمد اقبال
(*The Reconstruction of Religious Thought in Islam*)

3- **قصّۃ الإیمان، بین العلم و الفلسفۃ و القرآن**، شیخ ندیم الجسر

4- قرآن اور علمِ جدید، ڈاکٹر محمد رفیع الدین

میں نے اِن کتابوں کا، اور اِس طرح کے دوسرے بہت سے مضامین اور مقالات کا مطالعہ کیا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ یہ تمام کتابیں اصل مسئلے کی نسبت سے بہت ناقص ہیں۔ وہ ایک طاقت ور چیلنج کا صرف کمزور جواب ہیں۔ یہاں پہنچ کر میرے اندر ایک نیا احساس جنم لینے لگا۔ میں نے کئی ایسے خواب دیکھے، جو اِس بات کا اشارہ تھے کہ غالباً قضاءِ الٰہی کا یہ فیصلہ ہے کہ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود، میں اِس خدمت کو انجام دوں۔

موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلم رہنما کسی نہ کسی ردّعمل کے تحت اٹھے۔ ان کی زندگی کا

کورس ردعمل کی نفسیات کے تحت بنا۔ مگر میرا معاملہ ایک استثنائی معاملہ تھا۔ کسی قسم کے ردعمل نے میری زندگی کا کورس متعین نہیں کیا، بلکہ فطرت کا ایک واقعہ تھا، جس نے میری زندگی کا رخ متعین کیا۔

یہ واقعہ 27 جولائی 1955 کو پیش آیا۔ اُس وقت میں اعظم گڑھ (یوپی) میں تھا۔ اِس سال اُس علاقے میں نہایت شدید بارش ہوئی تھی۔ قریبی ندی ٹونس (Tons River) کا پانی پھیل کر شہر کی آبادی تک پہنچ گیا۔ برٹش دور میں یہاں 1871 میں شہر کے کنارے ایک بہت بڑا بند بنایا گیا تھا۔ یہی بند سیلاب سے حفاظت کا واحد ذریعہ تھا۔ مگر اِس سال سیلاب کا پانی اتنا زیادہ بڑھا کہ لال ڈِگی کا یہ بند اُس کو روکنے کے لیے ناکافی ثابت ہوا۔ یہ میرے لیے ایک بھیانک تجربہ تھا۔ اِس تجربے کو میں نے اُسی زمانے میں قلم بند کیا تھا جو اخبار ''دعوت'' (نئی دہلی) کے شمارہ 5 ستمبر 1955 میں چھپا تھا۔ اُس میں، میں نے اپنے اِس مشاہدے کو ان الفاظ میں لکھا تھا:

''26 اور 27 جولائی 1955 کی درمیانی رات کو ضلع کلکٹر (اعظم گڑھ) کی طرف سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے یہ اعلان ہوا — ''لال ڈگی کا بند ابھی ٹوٹنا چاہتا ہے۔ آپ لوگ اپنی جانوں کو بچانے کے لیے اونچی جگہوں پر چلے جائیں''۔ اُس وقت رات کے ایک بجے تھے۔ سارا شہر جاگ اٹھا اور عجیب سنسنی پھیل گئی۔ لوگ اپنے کچے اور پکے گھروں سے نکل کر بند کی طرف دوڑے۔ سیکڑوں آدمیوں نے پھاوڑا اور بوریا لے کر اُس جگہ مٹی ڈالنی شروع کر دی، جہاں سے بند پھٹ گیا تھا۔ ایسے ایسے لوگ جنھوں نے شاید زمین پر کبھی ننگے پاؤں قدم بھی نہ رکھا ہوگا، وہ اپنے سروں پر مٹی کا ٹوکرا لے کر ڈھو رہے تھے۔ درجنوں پیٹرومیکس کی روشنی میں ساری رات کام ہوا اور دوسرے دن دوپہر تک ہوتا رہا۔ بالآخر انجینئر نے کہہ دیا کہ اب بند قابو سے باہر ہے۔ آخر کار بارہ بجے دن کے بعد بند ٹوٹ گیا اور پانی سڑکوں پر بہنے لگا۔ سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ دکانیں بند ہو گئیں۔ لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف بھاگ رہے تھے اور پانی ان کے پیچھے اِس طرح دوڑ رہا تھا کہ گویا وہ اُن کا پیچھا کر رہا ہے۔ زندگی کے مسائل سمٹ کر بس سیلاب کے گرد جمع ہو گئے، اور چند دنوں کے لیے شہر میں قیامت کا منظر دکھائی دینے لگا۔'' (قرآن کا مطلوب انسان، صفحہ 61)

فطرت کا یہ واقعہ میرے لیے قیامت کی یاددہانی کے ہم معنیٰ تھا۔ یہ گویا، بڑی قیامت سے پہلے چھوٹی قیامت تھی جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اِس واقعے کو دیکھ کر جو تاثر میرے اوپر ہوا، وہ میری پوری زندگی پر چھا گیا۔ اِس کے بعد میری تقریروں اور تحریروں میں اِنذارِ آخرت کا پہلو نمایاں وصف کے طور پر شامل ہوگیا۔ میرے استاد مولانا امین احسن اصلاحی (وفات: 1998) سے ایک شخص نے پوچھا کہ قرآن کا خلاصہ کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ — سرگذشتِ انذار۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات بلاشبہہ درست ہے، اور جو لوگ میری تقریر اور تحریر سے واقف ہیں، ان کا کہنا ہے کہ میری تقریر اور تحریر میں یہی انداز غالب نظر آتا ہے۔

اِسی طرح میری زندگی میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ اِس واقعے نے میری تحریر میں سائنسی اسلوب کو گہرائی کے ساتھ شامل کردیا۔ فروری 1955 کا واقعہ ہے۔ لکھنؤ کے امین الدولہ پارک میں جماعتِ اسلامی ہند کے زیر اہتمام ایک اجتماع ہوا۔ اِس موقع پر اسلام کے عقلی اثبات پر راقم الحروف کی ایک تقریر ہوئی۔ تقریر کے بعد جب اعلان کیا گیا کہ وہ چھپی ہوئی صورت میں یہاں بک اسٹال پر موجود ہے، تو انسانوں کا ایک ہجوم اُس کو لینے کے لیے اسٹال پر ٹوٹ پڑا۔ تقریر کے مطبوعہ نسخے ہاٹ کیک (hot cake) کی طرح فروخت ہوگئے۔ بعد کو یہ تقریر پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوئی۔ اردو میں اُس کا نام تھا ''نئے عہد کے دروازے پر''، ہندی میں ''نو یُگ کے پرویش دُوار پر'' اور انگریزی میں:

On the Threshold of a New Era

اِس مقالے کی ترتیب کے دوران میں نے جو مطالعہ کیا، اُس سے دعوت کا ایک پہلو زیادہ واضح ہو کر سامنے آیا، وہ یہ کہ جدید سائنسی دریافتوں نے جو نیا مواد (data) فراہم کیا ہے، وہ ہم کو موقع دیتا ہے کہ ہم زیادہ مدلل اور موثر انداز میں دعوتِ حق کا کام کرسکیں۔ اِس اعتبار سے دیکھئے تو سائنس گویا کہ اسلام کا علمِ کلام (theology) ہے۔ سائنسی دریافتوں نے یہ موقع فراہم کیا ہے کہ حق کی دعوت کو ایسے اسلوب میں پیش کیا جائے، جو جدید انسان کے لیے قولِ بلیغ (4:63) کے ہم معنیٰ بن جائے۔

اِسی زمانے میں مجھ پر قرآن کی ایک آیت کا مفہوم زیادہ واضح انداز میں کھُلا۔ یہ آیت قرآن کی سورہ حم السجدہ میں ہے، مگر عجیب بات ہے کہ پچھلے زمانے میں قرآن کی تفسیریں کثیر تعداد میں لکھی گئیں، لیکن اِس آیت کی گہری معنویت مفسرین سے اوجھل رہی۔ اِس آیت کا ترجمہ یہ ہے:
''عن قریب لوگوں کو ہم دکھائیں گے اپنی نشانیاں، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی، یہاں تک کہ اُن پر یہ کھل جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے'' (41: 63)۔ قرآن کی اِس آیت میں دراصل اُس دور کی پیشین گوئی ہے جس کو جدید سائنسی دور کہا جاتا ہے۔ جدید سائنس میں فطرت کو مطالعے کا موضوع بنایا گیا۔ یہ فطرت پوری کی پوری، خدا کی تخلیق ہے۔ اِس تخلیق کے اندر خالق کی نشانیاں (signs of God) بے شمار تعداد میں موجود تھیں، مگر وہ مخفی انداز میں تھیں۔ جدید سائنس (modern science) نے اِن نشانیوں کو کھولا، یہاں تک کہ یہ نشانیاں انسانی معلومات کے دائرے میں آگئیں۔

فطرت کی اِن نشانیوں کے دو پہلو تھے۔ ایک، اُن کا ظہور۔ اور دوسرے، تبیینِ حق کے لیے اُن کا استعمال۔ اِس معاملے میں پہلا کام سائنس دانوں کو کرنا تھا۔ انھوں نے غیر معمولی کوشش کے ذریعے اِس کام کو بھرپور طور پر انجام دے دیا۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی، اِنھیں سائنسی دریافتوں کی صدی ہے۔ یہ دریافتیں کتابوں کی صورت میں چھپ کر ہر جگہ پھیل گئیں۔ اِس کے بعد اِس سلسلے میں دوسرا کام یہ تھا کہ مسلم علما اور اہلِ علم اِن معلومات سے واقفیت حاصل کریں اور مطلوب علمی انداز میں یہ بتائیں کہ یہ معلومات کس طرح اسلامی عقائد کے لیے استدلال کی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ قرآن کی پیشگی خبر کے باوجود دورِ جدید میں اٹھنے والے مسلم علما اور اہلِ علم اِس جدید امکان سے بے خبر رہے اور نتیجۃً وہ اُس کو تبیینِ حق کے لیے استعمال بھی نہ کر سکے۔

حدیث میں خواب کو نبوت کا چھیالیسواں درجہ بتایا گیا ہے، یعنی ختمِ نبوت کے بعد بھی الہامِ خداوندی کا ایک درجہ باقی ہے جس کے ذریعے خدا اپنے بندوں کو خصوصی رہنمائی دیتا رہتا ہے۔ یہ خواب کا ذریعہ ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ مجھ پر بہت سی باتیں خواب کے ذریعے کھلیں۔ یہ بات بھی مجھ پر خواب کے ذریعہ واضح ہوئی کہ تبیینِ حق کے اِس اہم کام کے لیے مجھ کو اٹھنا ہے، اپنے تمام تر عجز کے

باوجود اللہ کے بھروسے پر مجھ کو یہ کام انجام دینا ہے۔ اِسی ذیل کا ایک تجربہ وہ ہے جو گویا کہ مجھے بین النوم والیقظہ پیش آیا:

ستمبر 1963 کی 21 تاریخ تھی۔ راقم الحروف ندوہ (لکھنؤ) کی مسجد میں تھا اور ظہر کی سنتیں پڑھ کر جماعت کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ذہن میں یہ خیال گھوم رہا تھا کہ اسلام کے تعارف کے لئے آج ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو وقت کی زبان اور اسلوب میں لکھی گئی ہو اور جدید انسان کو مطالعہ کے لئے دی جاسکے۔ ''کاش اللہ تعالیٰ مجھے اِس کتاب کے لکھنے کی توفیق دے''۔ یہ تمنا بے ساختہ دعا کی شکل میں میری زبان سے نکلی اور اس کے بعد یکایک یہ انگریزی لفظ میری زبان پر تھا: God Arises

یہ گویا کتاب کا نام تھا جو اچانک میرے ذہن میں وارد ہوا۔ اِس سے پہلے کبھی یہ فقرہ میرے ذہن میں نہیں آیا تھا، حتی کی کتاب کے نام کی حیثیت سے اس کی معنویت بھی اس وقت پوری طرح مجھ پر واضح نہ تھی۔ شام کو عصر کی نماز کے بعد میں حسب معمول نریندر دیو لائبریری گیا جو ندوہ کے قریب دریائے گومتی کے کنارے واقع ہے۔ وہاں ویبسٹر (Webster) کی لغت میں لفظ arises کے استعمالات دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ لفظ بائبل کی ایک آیت میں استعمال ہوا ہے۔ پورا فقرہ یہ ہے:

Let God arise, let His enemies be scattered,
Let them also that hate Him flee before Him,
As smoke is driven away, so drive them away;
As wax melteth before the fire, so let the
Wicked perish at the presence of God.
(Psalms 68: 1-2)

خدا اٹھے۔ اس کے دشمن تتر بتر ہوں۔ وہ جو اس کا کینہ رکھتے ہیں، اس کے حضور سے بھاگیں۔ جس طرح دھواں پراگندہ ہوتا ہے، اسی طرح تو انھیں پراگندہ کر۔ جس طرح موم آگ پر پگھلتا ہے، شریر خدا کے حضور فنا ہوں۔

زبور کی یہ دعا حقیقۃً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی پیشین گوئی ہے۔ یہ اسی منصوبۂ الٰہی کا ذکر ہے جو قرآن میں سورہ صف (آیت: 9-8) اور سورہ فتح (آیت: 28) میں وارد ہوا ہے۔ آپ کے

ذریعہ اللہ تعالیٰ جس عظیم الشان سطح پر اپنے دین کا اظہار کرنے والا تھا، اسرائیلی پیغمبر (داؤد) کی زبان سے بشکل دعا اس کو کہلایا گیا۔ حضرت داؤد نبی آخرالزماں سے ڈیڑھ ہزار برس قبل پیدا ہوئے تھے۔

اِس طرح گویا اذان اور اقامت کے درمیان مسجد کے اس تجربے میں مجھ کو کتاب کا نام اور اس کا موضوع دونوں بتا دیا گیا۔ عمر کی چھٹی دہائی میں پہنچنے کے بعد میری بہترین تمنا یہ تھی کہ میں اسلام پر ایک کتاب تیار کرسکوں جو اردو اور عربی کے علاوہ انگریزی میں *God Arises* کے نام سے شائع ہو۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو پکار رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ — اے میری امت، خدا کے دین کو، وقت کے افکار کی طرف سے بہت بڑا چیلنج درپیش ہے۔ اٹھو، اور اِس چیلنج کا موثر جواب دے کر، خدا کے دین کو دوبارہ سرفرازی عطا کرو۔

عالمِ تصور میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ پیغمبر نے بار بار اپنی امت کو پکارا، لیکن امت کا کوئی شخص نہیں اٹھا، جو اس پکار پر لبیک کہے۔ آخر کار، میں اپنے عاجز قدموں کے ساتھ اٹھتا ہوں، اور کہتا ہوں کہ اے اللہ کے رسول، اگر چہ میں آپ کا ایک کم زور امتی ہوں، لیکن میں خدا کے بھروسے پر اِس کام کو انجام دوں گا، اور پھر خدا کے رسول، دوبارہ وہی بات کہتے ہیں جو آپ نے مکہ میں اُس وقت کہی تھی، جب کہ آپ کی پکار کے بعد بڑوں میں سے کوئی نہیں اٹھا، اور بنو ہاشم کے ایک نوجوان نے کہا تھا کہ میں آپ کی پکار پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہوں۔ اُس وقت آپ نے فرمایا: أنتَ یا علي، أنتَ یا علي۔ عالمِ تصور میں، خدا کے رسول کا یہ جواب پا کر میرا حوصلہ بڑھا، اور میں نے طے کرلیا کہ مجھے یہ کام انجام دینا ہے۔ میرا سہارا صرف ایک احساس تھا، جو حضرت مسیح کے الفاظ میں یہ تھا — انسان سے تو یہ کام نہیں ہوسکتا، مگر خدا سے ہوسکتا ہے۔

میں نے جب یہ فیصلہ کیا کہ مجھے سائنسی دریافتوں کی مدد سے جدید اسلامی لٹریچر تیار کرنا ہے، تو یہ میرے لیے کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا۔ یہ میرے جیسے انسان کے لیے ہمالیہ پہاڑ کو اپنے سر پر اٹھانے سے زیادہ مشکل تھا۔ اِس مقصد کے لیے مجھے انگریزی زبان میں بھر پور قدرت حاصل کرنا تھا۔ جدید افکار (modern thought) کو سمجھنے کے لیے مختلف علوم کو گہرائی کے ساتھ پڑھنا تھا۔ جدید الحاد کا موقف کیا ہے، اس کو براہِ راست مطالعے کے ذریعے جاننا تھا۔

اُس زمانے میں، میں نے مختلف شہروں کے سفر کیے۔ مختلف شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں۔ مختلف لائبریروں سے کتابیں حاصل کیں۔ اُس زمانے میں میری دیوانگی کا عالم یہ تھا کہ میں ہر وقت پڑھتا رہتا تھا یہاں تک کہ راستہ چلتے ہوئے کتاب میرے ہاتھ میں ہوتی تھی اور میں اس کو کھول کر پڑھتا رہتا تھا۔ میری ماں زیب النسا (وفات: 1985) اکثر یہ کہتی تھیں کہ یہ شخص کسی نہ کسی دن سڑک پر چلتے ہوئے کسی گاڑی سے ٹکرا جائے گا اور سڑک ہی پر اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ میرے اِس دیوانہ وار مطالعے کی کسی نے بھی حوصلہ افزائی نہیں کی، لیکن میں ہر چیز سے بے پرواہو کر اپنے کام میں لگا رہا۔

آزادیٔ ہند (1947) کے بارے میں ایک کتاب ہے جو دو مصنفین نے مشترک طور پر لکھی تھی۔ اِن میں سے ایک شخص برطانیہ کا تھا، اور دوسرا فرانس کا۔ اِس کتاب کا نام ہے۔ آدھی رات کی آزادی (*Freedom at Midnight*)۔

اپنی اِس کتاب کی تیاری میں مذکورہ دونوں مصنفین نے بے شمار چیزوں کا مطالعہ کیا۔ کتاب کے چھپنے کے بعد ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا تھا:

We lived like hermits, and we produced 'Freedom at Midnight'

اسلام پر عصری اسلوب (modern idiom) میں کتاب تیار کرنے کے لیے میرا بھی یہی حال ہوا۔ مذکورہ مثال کو لیتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ — میں نے رہبان کی مانند زندگی گزاری، اور میں نے خدا کے موضوع پر اپنی کتاب تیار کی:

I lived like hermit, and I produced my book on God.

جیسا کہ عرض کیا گیا، موجودہ زمانے میں سائنسی تحقیقات کے ذریعے فطرت کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، وہ گویا کہ خدائی نشانیاں ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ آفاق اور انفس میں آیاتِ الٰہی کے ظہور کے ہم معنیٰ ہیں (41:53)۔ اِس سلسلے میں اپنے مطالعے کے نتائج کو میں نے اپنی مختلف کتابوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہاں مختصر طور پر چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

1- قدیم فلاسفہ اپنے فلسفیانہ فریم ورک کی بنا پر شخصی خدا (personal God) کے طور پر

خدا کا ادراک نہیں کر پاتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے خدا کو غیر شخصی خدا (impersonal God) بتایا۔ مگر غیر شخصی خدا صرف ایک خیالی خدا تھا، وہ (cosmic rays) یا قوتِ کشش (gravity) کے مانند تھا۔ خدا کے عقیدے کی حیثیت سے اس کی کوئی معنویت نہ تھی۔

لیکن سائنس کی تحقیقات کے بعد ایک نئی دنیا انسان کے سامنے آئی، ایک ایسی دنیا جو لازمی طور پر یہ تقاضا کر رہی تھی کہ کائنات کے وجود و بقا کے پیچھے ایک زندہ شعور ہے، نہ کہ صرف مادّی عمل۔ اس طرح سائنس دانوں نے خدا کا نام لیے بغیر، خدا جیسی ایک ہستی کا اعتراف کرلیا۔ اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے درج ذیل کتاب کا مطالعہ کیجئے:

Sir Fred Hoyle, *The Intelligent Universe* (1983)

اِس طرح، غیر شخصی خدا (Impersonal God) کے فلسفیانہ قیاس کے لیے کوئی علمی بنیاد (Scientific base) باقی نہ رہی۔ سائنس کی نئی دریافتوں نے بتایا کہ خالص علمی اور عقلی اعتبار سے شخصی خدا (personal God) کا تصور زیادہ قابل فہم ہے۔

2- یہی معاملہ علّۃ العِلل (cause of the causes) کا ہے۔ قدیم متکلمین نے درست طور پر خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے علّۃ العلل کا نظریہ پیش کیا تھا، لیکن ہزار برس پہلے کے زمانے میں جو معلومات انسان کو حاصل تھیں، اُن کے مطابق، علّۃ العلل کی حیثیت صرف ایک قیاس کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی میں فلکیاتی تحقیقات کے دوران ایک نئی دریافت ہوئی، جس کو بگ بینگ کہا جاتا ہے۔ بگ بینگ کا نظریہ اب ایک ثابت شدہ نظریہ بن گیا ہے۔

بگ بینگ کے نظریے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ تقریباً پندرہ بلین سال پہلے ایک کائناتی گولا (cosmic ball) تھا۔ یہ کائناتی گولا موجودہ کائنات کے تمام ذرات (particles) پر مشتمل تھا۔ اِس کاسمک بال کے باہر، ہر طرف صرف خلا پایا جاتا تھا۔ پھر اچانک ایک وقتِ خاص پر اِس کاسمک بال کے اندر ایک انفجار (explosion) ہوا اور پھر دفعتاً اس کے اَن گنت ذرات وسیع خلا میں پھیل گئے۔ پھر دھیرے دھیرے لمبے عمل کے دوران موجودہ کائنات بنی۔

بگ بینگ کی اِس دریافت کے بعد قدیم متکلمین کا علۃ العلل کا نظریہ محض قیاسی نظریہ نہیں رہا، بلکہ وہ ایک ایسا نظریہ بن گیا ہے، جس کی پشت پر ایک خالص سائنسی بنیاد موجود ہے۔ کاسمک بال میں انفجار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی خارجی عامل (factor) موجود تھا جس کی مداخلت سے یہ انفجار وجود میں آیا۔ کیوں کہ طبیعیاتی قوانین کے مطابق، خودبخود یا کسی داخلی سبب سے ایسا انفجار ہرگز ممکن نہ تھا۔ اِس طرح، علّۃ العلل کا نظریہ اب ایک ثابت شدہ نظریہ بن چکا ہے، نہ کہ صرف ایک قیاسی نظریہ۔

3- کائنات میں بظاہر بہت زیادہ تنوع پایا جاتا ہے۔ اِس تنوع کی بنا پر شرک کا عقیدہ پیدا ہوا۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ جب تخلیق میں تنوع ہے، تو اس کا خالق بھی کئی ہونا چاہیے۔ نیوٹن کے زمانے میں یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ چار طاقتیں ہیں جو پورے عالم کو کنٹرول کرتی ہیں۔ وہ چار طاقتیں ہیں:

1- قوتِ کشش (gravitational force)

2- برقی مقناطیسی قوت (electromagnetic force)

3- طاقت ور نیوکلیر قوت (strong nuclear force)

4- کم زور نیوکلیر قوت (weak nuclear force)

یہ قدیم سائنسی نظریہ بظاہر شرک کے عقیدے کی موافقت کر رہا تھا۔ لیکن سائنس داں اِس قسم کے چار نظریے پر مطمئن نہ تھے۔ ان کو نظر آتا تھا کہ کائنات میں بہت زیادہ ہم آہنگی (harmony) پائی جاتی ہے۔ ایسی ہم آہنگ کائنات میں چار طاقتوں کا نظریہ انھیں بے جوڑ نظر آتا تھا۔ چناں چہ سائنس دانوں کی تحقیق جاری رہی، یہاں تک کہ یہ ثابت ہوگیا کہ کائنات کو کنٹرول کرنے والی طاقت صرف ایک ہے۔ اِس دریافت کو سنگل اسٹرنگ تھیوری (single string theory) کہا جاتا ہے۔

اِس جدید سائنسی دریافت نے شرک (polytheism) کے نظریے کا علمی طور پر خاتمہ کر دیا۔ اب علم اور عقل کی بنیاد صرف توحید (monotheism) کے نظریے کو حاصل ہے۔ اب توحید کا نظریہ ایک ثابت شدہ سائنسی نظریے کی حیثیت رکھتا ہے، نہ کہ سادہ طور پر صرف ایک مذہبی عقیدہ۔

4- قدیم زمانے میں علماءِ الٰہیات، خدا کے وجود کو اِس طرح ثابت کرتے تھے کہ —

کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں ہر چیز میں کامل ڈزائن پایا جاتا ہے۔ اور جہاں ڈزائن (design) ہو، وہاں ڈزائنر (designer) کا وجود بھی اپنے آپ ثابت ہو جاتا ہے:

When there is a design, there is a designer. and when the designer is proved, God is also proved.

یہ استدلال خالص منطقی اعتبار سے ایک درست استدلال تھا، لیکن قدیم زمانے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہ ثانوی (secondary) درجے کا استدلال ہے۔ وہ اوّل درجے کا استدلال نہیں۔ کیوں کہ یہ استدلال ایک استنباط (inference) پر مبنی تھا، نہ کہ براہِ راست مشاہدے کی بنیاد پر۔

سائنسی تحقیق جب تک عالمِ کبیر (macro world) تک محدود تھی، اُس وقت تک یہ استدلال بظاہر درست نظر آتا تھا۔ کیوں کہ اُس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ تمام حقیقی چیزیں اپنا مادّی جسم رکھتی ہیں، اِس بنا پر وہ قابلِ مشاہدہ (visible) ہیں۔ گویا کہ جو چیز دوربین یا خوردبین کے ذریعے نہ دیکھی جاسکتی ہو، وہ کوئی حقیقی چیز بھی نہیں۔ لیکن بیسویں صدی میں سائنس کی تحقیقات، عالمِ کبیر سے گزر کر عالمِ صغیر (microworld) تک پہنچ گئیں۔ یہ سائنس کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب تھا۔ اِس کے بعد یہ ثابت ہوا کہ یہاں ایسی چیز بھی موجود ہوسکتی ہے، جو نہ خوردبین سے دیکھی جاسکے اور نہ دوربین سے۔ اِس طرح کی چیزوں کو مشاہداتی ذرائع سے معلوم نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی چیز کے وجود کو صرف استنباط (inference) کے ذرائع سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

سائنس کی اِس ترقی کے بعد یہ ہوا کہ معقول استدلال (valid argument) کا قدیم تصور ختم ہوگیا۔ اب علمی طور پر یہ مان لیا گیا کہ استنباطی استدلال (inferential argument) بھی اتنا ہی معقول (valid) ہے، جتنا کہ براہِ راست مشاہدے کی بنیاد پر قائم کیا ہوا استدلال۔

اسلام اور عقل

اسلام اور عقل ایک قدیم موضوع ہے۔ اِس موضوع پر بہت سی چھوٹی اور بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مسلمانوں کے علمی ذخیرے میں اِس سلسلے میں جو کتابیں موجود ہیں، اُن میں

حسب ذیل چار کتابیں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں:

1- قواعد الأحکام في إصلاح الأنام (دوجلدیں) عزالدین بن عبدالسلام (وفات: 1262ء)

2- إعلام الموقعین (چار جلدیں) ابن الجوزیہ (وفات: 1350ء)

3- الموافقات في أصول الشریعة (چار جلدیں) ابواسحاق الشاطبی (وفات: 1388ء)

4- حجة الله البالغة (دوجلدیں) شاہ ولی اللہ الدہلوی (وفات: 1763ء)

یہ چاروں کتابیں اپنے موضوع پر بلاشبہہ نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ تاہم ان میں ایک مشترک کمی یہ ہے کہ وہ سب جدید دورِ عقل (modern age of reason) سے پہلے لکھی گئی ہیں۔ قدیم زمانے میں عقلی غور وفکر مبنی بر قیاس ہوتا تھا، موجودہ زمانے میں عقلی غور وفکر مبنی بر سائنس ہوتا ہے۔ اِس طرح اب تعقل کا فریم ورک بدل گیا ہے۔ اب اسلامی عقلیات وہی ہے جو سائنسی فریم ورک کی بنیاد پر تیار کی جائے۔

عقل (reason) کیا ہے۔ علمی تعریف کے مطابق، عقل اُس ذہنی صلاحیت کا نام ہے جس کے مقدمات سے نتائج اخذ کیے جائیں۔ پچھلے زمانے میں یہ مقدمات قیاسی ہوا کرتے تھے۔ اب ہم سائنسی مقدمات (scientific premises) کے دور میں ہیں۔ آج کی اسلامی عقلیات وہ ہوگی جس میں سائنسی مقدمات کے ذریعے نتائج اخذ کیے گئے ہوں۔ اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن کی سورہ البقرہ میں قانونِ شہادت کو بتاتے ہوئے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے (2:282)۔

قدیم زمانے میں اِس فرق کا سبب یہ سمجھا جاتا تھا کہ مرد کا تعلق صنفِ قوی سے ہے اور عورت کا تعلق صنفِ ضعیف سے۔ مگر موجودہ زمانے میں جدید تحقیقات نے ہم کو یہ موقع دے دیا ہے کہ ہم اِس فرق کی توجیہہ خالص سائنسی بنیاد پر بیان کرسکیں۔

عقل کا مسئلہ

عقل (reason) کیا ہے۔ عقل خالق کا ایک قیمتی عطیہ ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ — اللہ تعالی نے سب سے افضل چیز جو پیدا کی، وہ عقل ہے (ما خلق الله خلقاً أکرم علیه من العقل)۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام کمالات کا انحصار عقل پر اور عقل کے استعمال پر ہے،

عقل کے بغیر کوئی بھی انسانی ترقی ممکن نہیں۔عقل نہ ہو تو انسان پتھر کے ایک اسٹیچو کی مانند ہو جائے گا۔وہ نہ حق کو حق سمجھ سکے گا اور نہ باطل کو باطل۔

عقل بذاتِ خود معیار (criterion) نہیں ہے۔عقل، فہم وادراک کی صلاحیت (ability) ہے۔عقل کی حیثیت آلہ یا فیکلٹی (faculty) کی ہے، عقل کی حیثیت مستقل بالذات جج کی نہیں۔ عقل، حقائق سے نتیجہ اخذ کرنے کی استعداد کا نام ہے:

Reason: The intellectual faculty by which conclusions are drawn from premises.

عقل (reason) اور وحی (revelation) کو ایک دوسرے کا حریف بتانا بلاشبہہ ایک غلطی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ وحی ایک مستقل ذریعہ علم ہے، جب کہ عقل بذاتِ خود کوئی ذریعہ علم نہیں۔خود وحی کی صحت پر جب کوئی شخص یقین کرتا ہے تو وہ بھی یہی کرتا ہے کہ وہ اپنی خداداد عقل کو استعمال کر کے اُس پر غور کرتا ہے اور پھر یقین کے درجے میں پہنچ کر وہ وحی کی صداقت کو دریافت کرتا ہے۔اِس اعتبار سے یہ کہنا درست ہوگا کہ عقل، وحی کی مددگار ہے، نہ کہ وحی کی مدِّمقابل۔

عقل، خالق کی دی ہوئی ایک فطری صلاحیت ہے، عقل کسی کی ذاتی ایجاد نہیں۔اِس معاملے میں غلطی کا آغاز یہاں سے ہوا کہ دوسری تمام چیزوں کی طرح عقل کے معاملے میں بھی کچھ لوگوں نے عقل کا غلو آمیز تصور (extreme version) پیش کیا۔انھوں نے انتہا پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے خود ساختہ طور پر یہ دعوی کیا کہ عقل بذاتِ خود حصولِ علم کا معیاری ذریعہ ہے۔مذہبی طبقے نے اِس تصورِ عقل کو درست سمجھ لیا اور وہ غیر ضروری طور پر عقل یا عقلی غور وفکر کو مذہب کا مخالف سمجھنے لگے اور وہ اِس طرح کی غیر علمی باتیں کرنے لگے کہ — عقل کا دائرہ الگ ہے اور وحی کا دائرہ الگ۔عقل کا دائرہ وہاں پر ختم ہو جاتا ہے، جہاں سے وحی کا آغاز ہوتا ہے، وغیرہ۔اصل یہ ہے کہ عقل الگ ہے اور عقل پرستی الگ۔

قرآن میں 'عقل' کا مادّہ (root) تقریباً 50 بار استعمال ہوا ہے۔قرآن میں بار بار عقل کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اپنی عقل کے ذریعے وحی کی صداقت کو دریافت کرو۔مثال کے طور پر

قرآن کی سورہ یوسف میں یہ آیت آئی ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (12:2)
یعنی ہم نے اِس کتاب کو عربی قرآن بنا کر اتارا ہے، تا کہ تم سمجھو:

We have sent down the Quran in Arabic, so that you may understand (by applying reason).

اِسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تم اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے نبوت کی صداقت کو دریافت کرو (10:16)، وغیرہ۔ انسان کو فطری طور پر مختلف صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ اُنھیں میں سے ایک صلاحیت، عقل ہے۔ مثلاً پاؤں کے اندر چلنے کی صلاحیت، ہاتھ کے اندر پکڑنے کی صلاحیت، آنکھ کے اندر دیکھنے کی صلاحیت، کان کے اندر سننے کی صلاحیت، وغیرہ۔ اِسی طرح انسان کو عقل دی گئی ہے جو سوچنے اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اِسی کے ساتھ انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے۔ انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرے یا وہ اُس کا غلط استعمال کرے، اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ کان اور آنکھ کا صحیح استعمال بھی ہے اور اس کا غلط استعمال بھی۔

عقل انسان کو اِس لیے دی گئی ہے کہ وہ ڈاٹا (data) جمع کرے اور پھر حاصل شدہ ڈاٹا کا تجزیہ کرکے صحیح علم تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ تاہم عقل بذاتِ خود علم کا ذریعہ نہیں، اِس لیے عقل صحیح فیصلہ تک بھی پہنچ سکتی ہے اور غلط فیصلے تک بھی۔ جو لوگ عقل کو بذاتِ خود علم کا ذریعہ سمجھتے ہیں، وہ دراصل عقلی مدرسہ فکر (school of thought) کے انتہا پسند (extremists) لوگ ہیں۔ ایسے انتہا پسند لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں، حتی کہ خود مذہب اور عقیدے کے دائرے میں بھی۔

دورِ سائنس اور مذہب

انسان اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے، جہاں تخلیق (creation) ہے، لیکن اِس تخلیق کا خالق (Creator) بظاہر یہاں دکھائی نہیں دیتا۔ اِس دنیا میں ڈزائن ہے، لیکن بظاہر اس دنیا میں ڈزائنر (designer) نظر نہیں آتا۔ اِس دنیا میں واقعات ہو رہے ہیں، لیکن واقعات کو وجود میں لانے والا آنکھوں سے اوجھل ہے۔ پوری کائنات ایک عظیم انڈسٹری کی طرح کام کر رہی ہے، لیکن اِس انڈسٹری کا انجینئر کسی خوردبین یا دوربین کے ذریعے دکھائی نہیں دیتا۔

انسان کو اِسی سوال کا جواب دینے کے لیے دنیا میں پیغمبر ظاہر ہوئے۔ پیغمبروں نے ہر زمانے میں انسان کو بتایا کہ یہاں محسوسات کے پیچھے ایک غیر محسوس ہستی موجود ہے۔ یہ خدا ہے، اُس کو مانو اور اس کی عبادت کرو۔ گویا کہ پیغمبروں کا رول ایک اعتبار سے، ایک قسم کا استنباطی رول (inferential role) تھا، یعنی انھوں نے انسان کو بتایا کہ تم کو چاہیے کہ تم اپنی عقل کو استعمال کرو اور دکھائی دینے والی چیزوں سے استنباط کر کے، نہ دکھائی دینے والے خدا پر اپنے یقین کی بنیاد قائم کرو۔

پیغمبروں نے اپنے اِس استنباطی رول کو مستند بنانے کے لیے یہ کیا کہ انھوں نے معجزے دکھائے۔ قرآن میں یہ بات اِن الفاظ میں آئی ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ (57:25) یعنی پیغمبروں نے خرقِ عادت معجزے دکھائے، تاکہ انسان یہ یقین کر سکے کہ پیغمبر جو خبر دے رہے ہیں، وہ ایک درست خبر ہے۔ مثال کے طور پر پیغمبر موسیٰ پندرھویں اور سولھویں صدی قبل مسیح کے درمیانی زمانے میں مصر میں آئے۔ اُس وقت وہاں فرعون (Ramesses II) حکومت کر رہا تھا۔ فرعون نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی معجزہ دکھاؤ (7:106)۔ فرعون کے اِس مطالبے پر پیغمبر موسیٰ نے اپنا عصا زمین پر ڈالا، جو زندہ اژدہا بن کر زمین پر چلنے لگا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم 610ء میں پیغمبر کی حیثیت سے مکہ میں ظاہر ہوئے۔ آپ سے پہلے جو پیغمبر آئے، اُن کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے پیغام کی صداقت کے طور پر مذکورہ قسم کے معجزے دکھاتے رہے۔

لیکن پیغمبر اسلام، جو سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی تھے، ان کے بعد خارقِ عادت معجزات کا طریقہ ختم کر دیا گیا (17:59)۔ پیغمبرِ اسلام کے بعد کسی پیغمبر کا آنا موقوف ہو گیا، اور اِسی کے ساتھ خارقِ عادات معجزات پیش کرنے کا سلسلہ بھی۔ اب پیغمبرانہ دعوت غیر پیغمبر داعیوں کے ذریعے دنیا میں جاری ہے، لیکن اب کوئی پیغمبر آنے والا نہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک طرف یہ ہوا کہ دینِ حق اپنی اصل حالت میں پوری طرح محفوظ ہو گیا، یہاں تک کہ اب اُس میں کسی تحریف یا تبدیلی کا امکان نہیں۔ اب پیغمبرانہ مذہب کا متن بھی محفوظ ہے اور وہ زبان بھی محفوظ ہے جس میں یہ متن اوّلاً نازل ہوا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ معجزے کا بدل کیا ہے۔ پہلے دعوت کی صداقت معجزے کے ذریعے متحقّق کی جاتی تھی، اب دعوت کی صداقت کو متحقق کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ یہ ذریعہ جدید سائنس ہے۔ موجودہ زمانے میں سائنس، قدیم معجزے کا بدل ہے۔ آج سائنس ٹھیک وہی استدلالی رول انجام دے رہی ہے، جو قدیم زمانے میں معجزات کے ذریعے انجام پاتا تھا۔

مذہب کے حق میں استدلال کے یہ دونوں دَور قرآن میں واضح طور پر بتا دیے گئے ہیں۔ پہلے دورِ استدلال کے بارے میں قرآن میں یہ آیت ہے: إِنَّآ أَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِٱلۡبَيِّنَٰتِ (57:25) یعنی ہم نے پیغمبروں کو اپنی صداقت کے ثبوت کے لیے معجزے دیے۔ دوسرے دورِ استدلال کو قرآن میں مستقبل کے صیغے میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے:

سَنُرِيهِمۡ ءَايَٰتِنَا فِي ٱلۡأٓفَاقِ وَفِيٓ أَنفُسِهِمۡ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ أَنَّهُ ٱلۡحَقُّ (41:53)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ساتویں صدی عیسوی کے رُبع اوّل میں ہوا۔ آپ کے ظہور کے تقریباً ایک ہزار سال بعد جدید سائنس ظاہر ہوئی۔ جدید سائنس کا یہ ظہور محض اتفاقی نہ تھا، وہ پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے انقلاب کا ایک براہِ راست نتیجہ تھا۔ پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے انقلاب کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اُس نے پہلی بار شرک کے غلبے کو ختم کر دیا۔ شرک کے غلبے کے خاتمے کے بعد تاریخ میں ایک نیا پراسس شروع ہوا۔ اِس پراسس کے نقطۂ انتہا کا دوسرا نام سائنس ہے۔

شرک کیا ہے۔ شرک دراصل نیچر ورشپ (nature worship) کا دوسرا نام ہے۔ انسان نے

قدیم زمانے میں فطرت کے مظاہر کو پرستش کا موضوع بنا دیا تھا۔ اِس طرح شرک، نیچر کی تحقیق اور تسخیر کے عمل کے سلسلے میں ایک قسم کا ذہنی مانع (mental block) بن گیا تھا۔ کیوں کہ جس چیز کو آپ پرستش کا موضوع بنالیں، اُس کو عین اُسی وقت آپ تحقیق کا موضوع نہیں بنا سکتے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے انقلاب کے بعد تاریخ میں ایک نیا عمل شروع ہوا۔ انسان نیچر کی تحقیق میں مصروف ہوگیا۔ یہ تحقیق مسلسل جاری رہی، یہاں تک کہ وہ دریافتیں شروع ہوئیں، جن کو سائنسی دریافتیں کہا جاتا ہے۔ فطرت کے اندر چھپے ہوئے راز معلوم واقعات بن کر سامنے آنے لگے۔ یہ عین وہی چیز تھی جس کو قرآن میں آفاق اور انفُس میں آیات کے ظہور سے تعبیر کیا گیا تھا۔ جدید سائنس دراصل نیچرل سائنس کا دوسرا نام ہے، اور یہ بلاشبہہ قرآن کی پیشین گوئی کا جواب بن کر ظاہر ہوئی ہے۔

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو جدید سائنس قدیم طرز کے معجزات کا بدل ہے۔ جدید سائنس، دینِ حق کا علمِ کلام (Theology) ہے۔ جدید سائنس اُس دین کو علمِ انسانی کے معیار پر ثابت شدہ بنا رہی ہے، جس کو قدیم زمانے میں خارقِ عادت معجزات کے ذریعے ثابت شدہ بنایا جاتا تھا۔

واضح ہو کہ جدید سائنس کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظریاتی سائنس (theoretical science) اور دوسرے، ٹکنکل سائنس (technical science)۔ نظریاتی سائنس، جدید ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے حقائقِ کون یا حقائقِ کائنات کو دریافت کر رہی ہے۔ اِس کے مقابلے میں ٹکنکل سائنس اس کے عملی پہلو کا نام ہے۔ ٹکنکل سائنس کے ذریعے جدید مشینی تہذیب وجود میں آئی ہے۔ اِس مقالے میں ہماری بحث ٹکنکل سائنس سے نہیں ہے، بلکہ نظریاتی سائنس سے ہے۔ موجودہ زمانے میں نظریاتی سائنس کا ایک مشہور سائنس داں اسٹفن ہاکنگ (Stephen Hawking) ہے۔ اِس موضوع پر اسٹفن ہاکنگ کی کئی کتابیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔

یہ بات ایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں ملتی ہے: ما من الأنبیاء نبیٌ إلا أعطي من الأیات ما مثلُه أمن علیه البشر۔ وإنّما کان الّذی أوتیتُه وحیاً أوحاه الله إلیَّ۔ فأرجوا أن أکون أکثرهم تابعاً یومَ القیامة (صحیح البخاري، رقم الحدیث: 4981) نبیوں میں سے ہر نبی کو

ایسی نشانیاں دی گئیں، جن کو اُس زمانے کے لوگ مانتے تھے۔ اور مجھ کو وحی (قرآن) کا معجزہ دیا گیا۔ اِس لیے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت میں مجھ پر ایمان لانے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔

اصل یہ ہے کہ قدیم زمانے میں علم انسانی کا ارتقا بہت کم ہوا تھا، اِس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ خود علمِ انسانی کے مسلّمات کے حوالے سے دینِ حق کی صداقت کو مدلل کیا جائے۔ اِس لیے قدیم زمانے میں پیغمبروں کے ذریعے خارقِ عادت معجزات دکھائے گئے۔ یہ معجزات معاصر انسان کے مانوس دائرے کے اعتبار سے ہوتے تھے۔ مگر قرآن کے بعد دنیا میں جو انقلاب آیا، اس کے بعد بتدریج ایسا ہوا کہ علمِ انسانی میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ اب یہ ممکن ہو گیا کہ خود علمِ انسانی کے مسلّمات کی سطح پر دینِ حق کو مدلل کر کے پیش کیا جاسکے۔

دونوں دور میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ معجزہ معاصر انسان کو اپنے عجز کا تجربہ کراتا تھا، لیکن اُس میں یہ پہلو شامل نہ تھا کہ مدعو کو خود اپنے مسلّمات کی سطح پر دینِ حق کی دلیل نظر آنے لگے۔ بعد کے زمانے میں جب علمی مسلمات کی سطح پر استدلال ممکن ہو گیا تو فطری طور پر یہ ہوگا کہ اِس قسم کا استدلال مقابلۃً ایک عمومی اور عالمی استدلال بن جائے گا۔ اِس طرح یہ ممکن ہو جائے گا کہ بعد کے زمانے میں ہر انسانی گروہ پیغامِ نبوت کی اہمیت کو سمجھے اور خود اپنے مسلّمات کی روشنی میں اُس پر یقین کر سکے۔ اِس کا ایک فائدہ فطری طور پر یہ ہوگا کہ بعد کے زمانے میں اِس پیغام کو ماننے والوں کی تعداد میں اضافے کا امکان بھی زیادہ بڑھ جائے گا۔

قدیم معجزاتی دلیل اور جدید سائنسی دلیل دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں ہی استنباط (inference) کی سطح پر دینی عقائد کی دلیل فراہم کرتے ہیں۔ قدیم زمانے میں جب ایک پیغمبر حسّی معجزہ دکھاتا تھا تو ایسا نہیں ہوتا تھا کہ معجزہ ایک آئینہ ہو، جس میں پیغمبر کا اصل دعویٰ مشاہداتی طور پر نظر آنے لگے۔ جو کچھ ہوتا تھا، وہ یہ کہ معجزہ دیکھ کر مدعو یہ استنباط کر سکتا تھا کہ جب یہ شخص ایک ایسا واقعہ کر رہا ہے جس پر دوسرے انسان قادر نہیں، تو ضرور اِس شخص کو خدا کی نصرت حاصل ہے۔

یہی معاملہ سائنسی دلیل کا بھی ہے۔ سائنسی دلیل میں ایسا نہیں ہوتا کہ پیش کردہ دلیل براہِ راست معنوں میں اصل دعوے کا مظاہراتی ثبوت بن جائے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ پیش کردہ دلیل بالواسطہ معنوں میں یہ موقع دیتی ہے کہ استنباطی طور پر وہ اصل دعوے کو قابلِ فہم اور قابلِ یقین بنا دے۔ تاہم

جدید سائنسی دلیل میں ایک مزید پہلو موجود ہے، جس کی بنا پر یہ ہوتا ہے کہ پیش کردہ دلیل بالواسطہ معنوں میں یہ موقع دیتی ہے کہ استنباطی طور پر وہ اصل دعوے کو قابلِ فہم اور قابلِ یقین بنادے۔ تاہم جدید سائنسی دلیل میں ایک مزید پہلو موجود ہے، جس کی بنا پر اس کو آرگومینٹ پلس (argument plus) کہا جاسکتا ہے، وہ یہ کہ جدید سائنسی دلیل خود مدعو کے عقلی مسلّمہ (rational axiom) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔

یہ فرق اُس جدید علم کی بنا پر پیدا ہوا ہے، جس کو نیوکلیر سائنس کہا جاتا ہے۔ قدیم فزیکل سائنس، عالمِ کبیر (macro world) کی سطح پر مبنی تھی۔ مگر بیسویں صدی میں اس کے اندر ترقی ہوئی، اور ایک نئی سائنس وجود میں آئی جس کو نیوکلیر سائنس کہا جاتا ہے۔ نیوکلیر سائنس کے تحت، انسان اِس قابل ہوگیا کہ وہ عالمِ صغیر (micro world) تک رسائی حاصل کرسکے، جب کہ اِس سے پہلے وہ صرف عالمِ کبیر تک محدود تھا۔ اُس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہر حقیقی چیز اپنا ایک مادّی جسم رکھتی ہے جس کو ناپا اور تولا جاسکے، لیکن عالمِ صغیر کی دریافت نے یہ صورتِ حال بدل دی۔ اب یہ معلوم ہوا کہ چیزیں اپنے آخری تجزیے میں اتنا زیادہ ''صغیر'' ہوجاتی ہیں کہ اُن کو صرف امکانی لہروں (waves of probability) کا نام دیا جاسکتا ہے۔

عالمِ صغیر کے بارے میں اِس نئی دریافت نے علم میں جو انقلاب پیدا کیا، اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ علمی استدلال کا معیار بدل گیا۔ اب یہ معلوم ہوا کہ استنباطی استدلال بھی اتنا ہی معقول استدلال ہے، جتنا کہ غیر استنباطی استدلال یا براہِ راست استدلال۔ کیوں کہ علم کا دریا اب جس مقام پر پہنچا تھا، وہاں براہِ راست استدلال کا طریقہ قابلِ عمل ہی نہ رہا۔ اب لازم ہوگیا کہ استنباطی استدلال کو بھی معقول استدلال کا درجہ دیا جائے، تاکہ نئے دریافت کردہ عالمِ صغیر کے قوانین کو مرتب کیا جاسکے۔

علمِ انسانی میں اِس ارتقا کے بعد یہ ممکن ہوگیا ہے کہ مذہبی عقائد کو عین اُسی سطح پر ثابت شدہ بنایا جاسکے، جس سطح پر مادّی دنیا کی چیزوں کو ثابت شدہ بنایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ — دنیا میں ڈزائن کا وجود یہ ثابت کرتا ہے کہ یہاں ایک ڈزائنر موجود ہے، اپنی نوعیت کے اعتبار سے ویسا ہی ایک معقول استدلال ہے، جیسا کہ مادّی دنیا کے بارے میں سائنسی استدلالات۔

چند مثالیں

یہاں ہم اِس نوعیت کی چند مثالیں درج کریں گے۔ اِن مثالوں سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح جدید سائنس، قدیم طرز کے معجزات کا بدل فراہم کررہی ہے۔ کس طرح اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ دینی حقائق، جو پچھلے زمانے میں خارقِ عادت معجزات کی سطح پر پیغمبر کے معاصرین کے سامنے پیش کیے جاتے تھے، اُن کو اب خود علمِ انسانی کے معروف مسلّمات کی بنیاد پر پیش کیا جاسکے۔ گویا کہ اب جدید علمِ کلام نے قدیم معجزے کی جگہ لے لی ہے۔ آج کے ایک داعی کو اپنی دعوت کے حق میں معجزہ دکھانا نہیں ہے، بلکہ اُس کے لیے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ وہ وقت کے علمی مسلّمات کی روشنی میں اپنی دعوت کو مدلل کرے۔ وہ جدید ذہن کو خود اُس معیار پر ایڈریس کرسکے جس کا اعتراف وہ پہلے سے کیے ہوئے ہے۔

1- مذہب کے اعتبار سے سب سے پہلا مسئلہ وجودِ خداوندی کے اِثبات کا ہے۔ اِس معاملے میں علمِ انسانی میں ایک نیا ارتقائی واقعہ وجود میں آیا ہے۔ پہلے، خدا کو صرف عقیدے کا ایک مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ اب وہ انسانی سائنس کے دائرے کی چیز بن چکا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ جدید سائنس نے خدا کے وجود کو ایک سائنسی دلیل کی حیثیت دے دی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، سائنس کے مطالعے کا موضوع خدا یا خالق کا وجود نہیں ہے۔ سائنس کا موضوع نیچر یا تخلیق (creation) کا مطالعہ ہے۔ سائنسی مطالعے کے ابتدائی دور میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ تمام چیزیں معلوم اسباب کے تحت وجود میں آتی ہیں، اِس لیے کسی مسبّب کو مطالعے کا موضوع بنانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن بعد کے سائنسی مطالعے نے اِس نظریے کو بے بنیاد ثابت کردیا۔ سائنس کے تفصیلی مطالعے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ نیچر یا کائنات میں ہر وقت اَن گنت واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ ہر واقعے میں نیچر کے سامنے بے شمار انتخابات (options) ہوتے ہیں، لیکن نیچر ہر موقع پر اُسی انتخابات کو لیتی ہے جو سب سے زیادہ بامعنیٰ ہو۔

اِس مطالعے نے سائنس دانوں کو یہ ماننے پر مجبور کیا ہے کہ اِس کائنات کے پیچھے ایک ذہین دماغ (intelligent mind) یا ریاضیاتی دماغ (mathematical mind) ہے۔ نیچر کے پیچھے ایک برتر ذہانت کی موجودگی کو مانے بغیر اس کی توجیہہ ممکن نہیں۔ اِس معاملے کو

ایک سائنس داں نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے— کائنات کا مادّہ ایک ذہین مادّہ ہے:

The stuff of the world is mind-stuff.

2- قدیم زمانے میں یہ کہا جاتا تھا کہ خدا کو ماننے کی صورت میں اُس کو ابدی ماننا پڑتا ہے، جب کہ ہمیں اس کا براہِ راست کوئی علم نہیں۔ مگر کائنات ہمارے لیے ایک معلوم اور مشہود چیز کی حیثیت رکھتی ہے، پھر خدا کو ابدی ماننے کے بجائے کیوں نہ خود کائنات کو ابدی مان لیا جائے۔ لیکن بگ بینگ (Big Bang) کی دریافت کے بعد اِس قسم کے عقیدے کو ماننا ناممکن ہو گیا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، 2006 کا فزکس نوبل پرائز دو امریکی پروفیسروں کو مشترک طور پر دیا گیا۔ یہ دونوں پروفیسر بگ بینگ کے سائنسی نظریے پر کام کر رہے تھے اور اُس پر انھوں نے ایک کتاب چھاپی تھی۔ دونوں پروفیسروں کے نام یہ ہیں:

John C. Mather(60), George F. Smoot (61)

امریکا کے ادارہ ناسا نے 1989 میں ایک راکٹ بیرونی خلا میں بھیجا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ بگ بینگ دھماکے سے نکلنے والے ریڈی ایشن (Cosmic Background Radiation) کا مطالعہ کرے اور اس کا فوٹو لے کر زمین پر بھیجے۔ اس راکٹ کا نام یہ تھا:

Cosmic Background Explorer

اِس تحقیق کے ذریعے حاصل کردہ معلومات کا تجزیہ کرنے سے بگ بینگ کے نظریے پر مزید روشنی پڑی ہے۔ اُس نے اِس نظریے کو اسٹرانگ سپورٹ (strong support) دی ہے، اور کائنات کی عمر کا حتمی تعیّن کر دیا ہے۔ اِس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ بگ بینگ کا واقعہ 13 بلین سال پہلے ہوا۔ رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں:

It helped pinpoint the age of the universe, and supported the Big Bang theory of its birth (*The Times of India,* October 4, 2006, p. 17).

بگ بینگ کا نظریہ ابتدائی طور پر بیسویں صدی عیسوی کے رُبع اوّل میں دریافت ہوا۔ اِس کا مطلب یہ

تھا کہ کائنات کا آغاز ایک عظیم انفجار (explosion) سے ہوا۔ اس کے بعد اِس نظریے پر کام ہوتا رہا، یہاں تک کہ اب یہ نظریہ ایک ثابت شدہ واقعہ بن چکا ہے۔

بگ بینگ کا نظریہ علم العقائد یا تھیالوجی کے اعتبار سے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ اِس سے خالص انسانی علم کی سطح پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ کائنات ابدی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک وقتِ خاص پر پیدا ہوئی۔ اس کی یہ پیدائش ایک بہت بڑے دھماکے کے ذریعے ہوئی۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقی طور پر نہیں ہوسکتا۔ اس کو وقوع میں لانے کے لیے ایک خارجی عامل (external factor) درکار ہے۔ اس طرح بگ بینگ کا واقعہ اِس نظریے کے حق میں ایک مضبوط منطقی سپورٹ بن گیا ہے کہ اِس کائنات کو ایک پیدا کرنے والے نے پیدا کیا۔ بگ بینگ کا واقعہ معلوم ہونے کے بعد اس کی کوئی دوسری نظریاتی توجیہہ ممکن نہیں۔

3- کائنات کی ترکیب اِس طرح ہوئی ہے کہ یہاں ہر صداقت (truth) کا مادّی مظاہرہ (physical demonstration) پایا جاتا ہے۔ اِس طرح ایک غور کرنے والے انسان کے لیے تمام غیر مرئی صداقتیں (invisible truths) مرئی سطح (visible level) پر قابلِ فہم بن جاتی ہیں۔ اِس قسم کی مثالوں میں سے ایک مثال وہ ہے جس کو موجودہ زمانے کی فلکیاتی اصطلاح میں بلیک ہول (Black Hole) کہا جاتا ہے۔ بلیک ہول کا نظریہ تقدیر اور تدبیر، یا انسانی آزادی اور خدائی جبر کے درمیان نازک تعلق کو قابلِ فہم بنا رہا ہے۔

فلکیات (astronomy) کے جرمن عالم کارل (Karl Schwarzschild) نے 1907 میں اپنے قیاس کے تحت یہ پیشین گوئی کی کہ خلا میں ایسے بڑے بڑے ستارے ہوسکتے ہیں جن کی قوتِ کشش اتنی زیادہ ہو کہ وہ اپنی روشنی کو بھی روکے ہوئے ہوں اور ان کی روشنی باہر نہ آسکتی ہو۔ چوں کہ انسان کسی چیز کو صرف روشنی کی مدد سے دیکھ سکتا ہے، اِس لیے یہ عظیم ستارے خلا میں موجود ہونے کے باوجود انسان کے لیے ناقابلِ مشاہدہ ہیں۔ اِس نظریے پر تحقیق جاری رہی، یہاں تک کہ فلکیات دانوں نے ایسے ستاروں کی امکانی موجودگی پر اتفاق کرلیا، اور ایسے ستاروں کا نام 'بلیک ہول' رکھا گیا۔

الٰہیات کے میدان میں قدیم زمانے سے یہ بحث جاری ہے کہ اِس دنیا میں انسان آزاد ہے، یا مجبور۔

بظاہر انسان اِس دنیا میں اپنے آپ کو آزاد پاتا ہے، لیکن جب خدا قادرِ مطلق ہے تو یہ بات ناقابلِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ خدا کی قدرتِ کاملہ کے درمیان انسان کو خود مختاری حاصل ہو۔ اِس تصور پر بہت زیادہ لکھا گیا ہے۔ اردو شاعر میر تقی میر (وفات: 1810) نے اِسی بات کو اِس طرح نظم کیا ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر، یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

مگر یہ اعتراض ایک غیر منطقی اعتراض ہے۔ کیوں کہ خدا کو اگر ہر قسم کا اختیار حاصل ہے تو اُس کو یقیناً یہ بھی اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی مقام پر اپنی قدرت کو محدود کرلے۔ وہ کامل اختیار رکھتے ہوئے عارضی مصلحت کی بنا پر اپنے اختیار کو وقتی طور پر روک لے۔ یہ قیاس بظاہر ایک نظری قیاس ہے، لیکن بلیک ہول کی دریافت نے اِس قیاس کے لیے مظاہراتی سطح پر ایک عملی تصدیق فراہم کردی۔ بلیک ہول کا نظریہ اِس قیاس کو قابلِ فہم بنا رہا ہے۔

ایمسٹرڈم (نیدر لینڈس) میں ماہرینِ طبیعیات (physicists) کی ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اِس موقع پر فزکس کا نوبل پرائز پانے والے ایک سائنس داں مسٹر جیمس واٹسن (James Watson Cronin) نے اپنے مقالے میں بتایا کہ ہماری کائنات کا 96 فی صد حصہ سیاہ مادّہ (dark matter) پر مشتمل ہے۔ اُس کی روشنی یا ریڈی ایشن ہم تک نہیں پہنچتا، اِس لیے ہم اُس کو براہِ راست طور پر دیکھ نہیں پاتے:

Dark matter can not be detected directly, because it does not emit or reflect light or radiation.

جیمس واٹسن نے مزید کہا کہ — ہم سمجھتے ہیں کہ ہم کائنات کو جانتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم ہر چیز کے صرف 4 فی صد حصے کو جان سکتے ہیں:

We think we understand the universe, but we only understand four percent of everything. (*The Times of India,* September 23, 2007, p. 20)

4- قرآن خدا کی طرف سے آئی ہوئی ایک محفوظ کتاب ہے۔ قرآن کے آغاز ہی میں یہ آیت

شامل ہے: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (2:2) یعنی یہ خدا کی کتاب ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں۔ اِس کے ساتھ قرآن کا یہ اعلان تھا کہ وہ ابدی طور پر سارے انسانوں کے لیے کتابِ ہدایت ہے۔ وہ کسی زمانے یا کسی مقام کے لیے نہیں ہے، بلکہ ہر دور اور ہر انسانی گروہ کے لیے ہے۔

قرآن کے اِس دعوے کی صداقت کے لیے ضروری تھا کہ بعد کے زمانے کے حالات اس کی تصدیق کرتے رہیں۔ بعد کے زمانے میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہ آئے جو اِس بیان کی تردید کرنے والا ہو۔ قرآن کا یہ بیان حیرت انگیز طور پر اس معیار پر پورا اترا ہے۔ راقم الحروف نے اِس موضوع سے متعلق اس کے مختلف پہلوؤں پر کئی مضامین اور کتابیں تیار کی ہیں۔ مثلاً تاریخی پہلو، نفسیاتی پہلو، حیاتیاتی پہلو اور سائنسی پہلو، وغیرہ۔ یہاں اِس سلسلے میں صرف ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔

قرآن کی سورہ یونس میں یہ بتایا گیا تھا کہ پندرھویں صدی قبل مسیح میں خدا نے مصر کے فرعون (Ramesses II) کو سمندر میں غرق کیا۔ کیوں کہ اُس نے خدا کے پیغمبر موسیٰ کا انکار کیا تھا۔ اُس وقت خدا نے کہا تھا کہ — آج ہم تمھارے جسم کو محفوظ کر دیں گے، تا کہ وہ تمھارے بعد آنے والوں کے لیے ایک نشانی بنے: فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً (10: 52)۔

ساتویں صدی کے رُبع اوّل میں جب قرآن میں یہ آیت اُتری تو اِس واقعے پر دو ہزار سال سے زیادہ مدت گزر چکی تھی۔ اُس زمانے میں نہ پرنٹنگ پریس تھا اور نہ کمیونکیشن، اور نہ معلوم تاریخ میں اِس کا کوئی ریکارڈ موجود تھا۔ چناں چہ تمام لوگ اِس واقعے کو بھول چکے تھے۔ اُس زمانے میں کوئی بھی شخص نہ اِس واقعے کو جانتا تھا اور نہ اُس کو یہ خبر تھی کہ کبھی فرعون کا جسم ظاہر ہو کر قرآن کی اِس آیت کی تصدیق کرنے والا ہے۔ اِس آیت کے نزول کے ہزار سال بعد انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں سائنس نے ایسے طریقے دریافت کیے، جن کے ذریعے قدیم اَجسام کی تاریخ ٹھیک ٹھیک طور پر معلوم کی جاسکے۔ مزید یہ کہ سائنس کی ترقی نے لوگوں کے اندر بہت بڑے پیمانے پر تجسس کا ذہن پیدا کیا۔ لوگ ہر میدان میں نئی نئی چیزیں دریافت کرنے کے لیے عالمی سطح پر سرگرم ہو گئے۔

اِسی دوران مغربی یورپ کے کچھ اسکالر مصر پہنچے۔ انھوں نے قاہرہ کے قریب واقع اَہرام کی

تحقیق شروع کی۔ طویل کوشش کے بعد انھوں نے دریافت کیا کہ اہرام کے اندر مصر کے قدیم بادشاہوں کے مردہ اجسام مومیائی حالت میں موجود ہیں۔ چناں چہ خصوصی اہتمام کے ساتھ ان اجسام کو نکالا گیا۔ اِس کے بعد ان اجسام کی جانچ شروع ہوئی۔ سائنس کے جدید طریقوں کے مطابق، ان کی عمر کا تعیّن کیا گیا۔ اِس تحقیق کے دوران حیرت انگیز طور پر معلوم ہوا کہ مصر کے قدیم بادشاہ فرعون کی لاش ایک اہرام میں موجود تھی۔ سائنسی ٹکنیک کے ذریعے جب اس کی عمر کا پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت موسیٰ کا ہم زمانہ شاہِ مصر فرعون کا جسم ہے، جس کی بابت قرآن میں 14 سو سال پہلے اعلان کیا گیا تھا کہ وہ محفوظ حالت میں موجود ہے، اور مستقبل میں وہ انسان کے علم میں آجائے گا۔

اِس حقیقت کا علم اِس سے پہلے کسی بھی انسان کو حاصل نہ تھا۔ قرآن میں اِس کا صراحتاً ذکر ہونا، اِس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن اُس خدا کی کتاب ہے جو ساری باتوں کو جانتا ہے (عالم الغیب والشہادۃ)۔ اس نے اپنے علم کے تحت قرآن میں یہ آیت اُتاری۔ اِس واقعے میں واضح طور پر جدید سائنس، قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کی تصدیق بن گئی۔

فرانس کے ڈاکٹر موریس بکائی (وفات: 1998) نے 1975 میں اپنے ساتھیوں کے ہم راہ مصر کا سفر کیا، اور قاہرہ کے میوزیم میں جا کر وہاں براہِ راست طور پر اِس محفوظ جسم کا مشاہدہ کیا۔ اِس واقعے پر پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد انھوں نے اپنی کتاب میں نہایت حیرت کے ساتھ یہ الفاظ درج کیے ہیں — وہ لوگ جو مقدس کتابوں کی سچائی کے لیے جدید ثبوت چاہتے ہیں، وہ قاہرہ کے مصری میوزیم میں شاہی ممیوں (Mummies) کے کمرے کو دیکھیں۔ وہاں وہ قرآن کی اُن آیتوں کی شان دار تصدیق پالیں گے جو کہ فرعون کے جسم سے بحث کرتی ہیں:

> Those who seek among modern data for proof of the veracity of the Holy Scriptures, will find a magnificent illustration of verses of the Quran dealing with the Pharaoh's body by visiting the *Royal Mummies Room of the Egyptian Museum, Cairo!*

5- دین کے عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ رسالت کا عقیدہ ہے، یعنی یہ عقیدہ کہ انسان کی

رہنمائی کے لیے خدا کی طرف سے ہر زمانے میں پیغمبر آئے۔ اِس سلسلے کے آخری پیغمبر محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ رسالت کے عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے رہنما اصول خود اپنی عقل سے دریافت نہیں کرسکتا۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اِس معاملے میں خدا کے پیغمبروں پر یقین کرے اور اُن سے اپنے لیے رہنمائی حاصل کرے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف خدا کے آخری پیغمبر ہیں، بلکہ آپ پر جو خدا کی ہدایت آئی، وہ اپنی کامل شکل میں اور اپنی اصل حالت میں پوری طرح محفوظ ہے۔ پیغمبر اسلام پر جو پہلی وحی اتری تھی، وہ سورہ العلق کی صورت میں قرآن میں موجود ہے۔ اِس ابتدائی وحی میں اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ: اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ، الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (96:3-5) یعنی پڑھ، اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔ انسان کو اُس چیز کا علم دیا جس کا علم اُس کو نہ تھا۔

اِس آیت میں گویا کہ اِس بات کا اعلان ہے کہ انسان خود سے اپنی رہنمائی وضع نہیں کرسکتا۔ دنیوی زندگی کے شعبے مثلاً زراعت، باغ بانی اور انجینئرنگ، وغیرہ کے معاملے میں وہ اپنے تجربات کے ذریعے کچھ علم حاصل کرسکتا ہے، جو انسان کی موجودہ زندگی کی ضرورتوں سے متعلق ہیں۔ لیکن انسان کی ابدی رہنمائی کے لیے جو برتر علم درکار ہے، اُس کو انسان خود سے حاصل نہیں کرسکتا۔ زندگی کے اِس برتر شعبے میں اُس کے لئے پیغمبرانہ رہنمائی سے مدد لینا ضروری ہے۔

قدیم زمانے میں جو بڑے بڑے فلسفی پیدا ہوئے، اُن سب کا موضوع یہی تھا کہ انسانی زندگی کے لیے رہنمایانہ اصول دریافت کیے جائیں، لیکن کئی ہزار سال تک بڑے بڑے دماغوں کی کوششوں کے باوجود فلسفہ اِس قسم کی کسی رہنمائی کو دریافت نہ کرسکا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فلسفیانہ کاوشوں نے انسان کو جو چیز دی، وہ صرف کنفیوژن (confusion) تھا، نہ کہ کوئی یقینی رہنمائی۔

کارل مارکس (وفات: 1883) نے فلسفے کی ناکامی پر ایک کتاب لکھی جس کا نام یہ تھا— فلسفے کا افلاس (*Poverty of Philosophy*)۔ یہ کتاب کارل مارکس نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے اعتبار سے لکھی تھی، لیکن عمومی اعتبار سے بھی یہ درست ہے کہ فلسفیانہ غور وفکر، جو تمام تر عقل کی بنیاد

پر ہوتا ہے، وہ انسان کو رہنمائی کے ابدی اصول دینے کے معاملے میں پوری طرح ناکام ہے۔ فلسفیانہ شعبے کی یہی ناکامی تھی جس کی بنا پر ایسا ہوا کہ موجودہ سائنس کے ظہور کے بعد فلسفے کا دَور ختم ہوگیا۔ اب فلسفے کی حیثیت زیادہ تر ایک تاریخی شعبے کی ہے، نہ کہ زندہ شعبۂ علم کی۔

یہی معاملہ باطنیّت (mysticism) کے ساتھ پیش آیا۔ باطنی نقطہ نظر کے حاملین کا خیال تھا کہ وہ باطنیّت کے تجربے کے ذریعے سچائی کو دریافت کرسکتے ہیں، مگر ایسا نہ ہوسکا۔

باطنیت کیا ہے، اس کی تعریف اِس طرح کی جاتی ہے:

Mysticism: The doctrine that it is possible to attain the higher truth through contemplation and love without the medium of human reason, or without any other external source.

مسٹی سزم کی تاریخ کئی ہزار سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ بے شمار لوگوں نے مسٹی سزم کے ذریعے سچائی کو پانا چاہا، لیکن لمبے تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ مسٹی سزم کے ذریعے آخری چیز جو انسان کو ملتی ہے، وہ صرف ایک ہے اور وہ وَجد (ecstasy) ہے۔ مگر سچائی کے معاملے میں وَجد کی کوئی حقیقت نہیں۔ انسان کے وجود میں سب سے بڑی چیز شعور یا ذہن ہے۔ اِس لیے سچائی کو پانے والا وہی شخص ہے جو ذہن یا شعور کی سطح پر سچائی کو پائے، نہ کہ وجد کی سطح پر۔ وجد دراصل بے شعوری کی ایک حالت ہے جس کو بے خودی کے خوب صورت لفظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ سچائی دراصل شعور کی سطح پر حقیقتِ اعلیٰ کی دریافت کا نام ہے۔

شعور کی سطح پر حقیقتِ اعلیٰ کی دریافت کی ایک مادّی مثال بجلی کے بلب اور پاور ہاؤس میں ملتی ہے۔ بلب ابتدائی حالت میں ایک بے نور شے ہے۔ اس کے اندر نہ خود روشنی ہے اور نہ وہ دوسروں کو روشنی دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن جب پاور ہاؤس سے اس کا کنکشن قائم ہوجاتا ہے تو اچانک وہ ایک روشن وجود بن جاتا ہے۔ اب وہ خود بھی روشن ہوتا ہے اور دوسروں کو روشنی دینے کی صلاحیت کا مالک بن جاتا ہے۔ سچائی کو پانے کا معیار کیا ہے، وہ اِس مادّی واقعے سے معلوم ہوتا ہے۔ سچّائی کو پانا شعوری معنوں میں ایک روشنی کو پانا ہے۔ مسٹی سزم اِس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ مسٹی سزم سے آدمی کو جو چیز ملتی ہے، وہ صرف بے شعوری ہے، نہ کہ شعور۔ اور انسان جیسی باشعور ہستی کے لیے بے شعوری کبھی

حقیقتِ اعلیٰ کی دریافت کے ہم معنیٰ نہیں بن سکتی۔ اِس معاملے میں آخری چیز جس کا نام لیا جا سکتا ہے، وہ سائنس ہے۔ جدید سائنس نے بلاشبہہ انسان کو بہت سی چیزیں دی ہیں۔ مثلاً ٹیلی کمیونکیشن اور کنزیومر گڈس (consumer goods)، وغیرہ۔ مگر جہاں تک سچائی کا معاملہ ہے، سائنس نے خود ہی یہ اعلان کر دیا ہے کہ سچائی کی دریافت اس کا میدانِ عمل نہیں۔

ایک مغربی اسکالر نے درست طور پر لکھا ہے کہ علم کا میدان بہت وسیع ہے۔ علم کی دو قسمیں ہیں۔ چیزوں کا علم (knowledge of things)، اور سچائی کا علم (knowledge of truth)۔ اہلِ علم کے درمیان بلا اختلاف یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ سائنس کا دائرہ صرف چیزوں کے علم تک محدود ہے۔ سچائی کا علم سائنس کے دائرے سے مکمل طور پر باہر ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ سائنس اِس مقابلے میں بطور امیدوار بھی شامل نہیں۔

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کا راستہ متعین کرنے کے لیے گہرے علم کی ضرورت ہے۔ اِس ضرورت کو ڈاکٹر الیکسس کیرل نے اپنی کتاب انسانِ نامعلوم (*Man the Unknown*) میں بخوبی طور پر واضح کیا ہے۔ مگر اِسی کے ساتھ یہ بھی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان خود اپنی کوششوں سے اِس ناگزیر علم کو دریافت نہیں کر سکتا۔ ایک طرف، علم کا ناگزیر ہونا اور دوسری طرف، انسان کا اس ناگزیر علم کو دریافت کرنے کے لیے نااہل ہونا، بتاتا ہے کہ اِس معاملے میں انسان کو ایک خارجی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اِس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے پیغمبر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بلاشبہہ پیغمبر ہی وہ انسان ہے، جو خدا کے نمائندے کی حیثیت سے ہمارا حقیقی رہنما ہے۔

حیاتیاتی ارتقا کا نظریہ

حیاتیاتی ارتقا (evolution) کا نظریہ برٹش عالمِ طبیعیات (naturalist) چارلس ڈارون (Charles Darwin) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ڈارون 1809 میں پیدا ہوا، اور 1882 میں اس کی وفات ہوئی۔ 2009 میں اس کی پیدائش پر دوسو سال پورے ہو گئے۔ اِس نسبت سے 2009 میں ڈارون کا اور اس کے نظریے کا کافی چرچا کیا گیا۔ ڈارون سے پہلے فرانسیسی عالمِ طبیعیات لامارک (Jean Baptiste Lamarck) وغیرہ نے بھی ابتدائی صورت میں ارتقا کا نظریہ پیش کیا تھا۔ لیکن ڈارون نے اِس نظریے کو زیادہ منظم انداز میں پیش کیا۔

نظریۂ ارتقا کیا ہے۔ اِس سے مراد یہ نظریہ ہے کہ — نباتات اور حیوانات کی تمام انواع ایک ابتدائی صورت سے ترقی کرکے اپنی موجودہ حالت تک پہنچیں ہیں۔ یہ ارتقا نسل در نسل تبدیلیوں کے وراثتی انتقال کے ذریعے ہوا:

> Evolution: Theory that all species of animals and plants developed from earlier forms by hereditary transmission of slight variations in genetic composition to successive generations.

چارلس ڈارون نے اپنی کتاب اصل الانواع (The Origin of Species) میں لکھا تھا کہ خدا (God) نے پہلی بار زندگی کی ابتدائی صورت ایک خلیہ والے (single-cellular) امیبا کی شکل میں پیدا کی۔ اس کے بعد اپنے آپ تبدیلیوں (mutations) اور فطری انتخاب (natural selection) اور بقاءِ اصلح (survival of the fittest) کے ذریعے مختلف انواعِ حیات بنتی چلی گئیں، یہاں تک کہ آخر میں انسان جیسی ترقی یافتہ مخلوق وجود میں آئی۔ یہ سب کچھ ارتقائی عمل (evolutionary process) کے ذریعے خود بخود پیش آیا۔ ڈارون نے اپنی کتاب میں خالقِ اوّل کے طور پر خدا کا نام لیا تھا، لیکن بعد کو نظریہ ارتقا کے حامیوں کے درمیان، خدا کا نام مکمل طور پر حذف ہو گیا۔

ارتقائی سفر کا یہ پورا عمل موجودہ زمین پر پیش آیا تھا۔ لیکن بعد کی تحقیقات نے بتایا کہ

موجودہ قسم کے ارتقائی عمل کا ہماری زمین پر پیش آنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ مثال کے طور پر زمین کی عمر اُس سے بہت زیادہ کم ہے جو مذکورہ قسم کے ارتقائی عمل کے لیے درکار ہے۔

نظریہ ارتقا یہ فرض کرتا ہے کہ ایک نوعِ حیات سے دوسری نوعِ حیات کا وجود میں آنا، حیاتیاتی تبدیلیوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ مثلاً بکری کے اندر نسل در نسل بے شمار تبدیلیاں وجود میں آئیں، یہاں تک کہ اِن تبدیلیوں کے جمع ہونے سے بکری کی آخری نسل میں زرافہ جیسا حیوان پیدا ہوگیا۔ یہ لمبا سفر ان گنت تبدیلیوں کے ذریعے ہوا۔ ایک ریاضی داں پروفیسر پاچو (Patau) نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ کسی نوعِ حیات میں ایک بہت معمولی قسم کی مفروضہ تبدیلی کو وجود میں لانے کے لیے ایک ملین نسلیں درکار ہوں گی:

Even a minor change in any species would take one million generations to be completed.

لیکن حیاتیاتی تبدیلیوں (mutations) کا یہ عمل اگر بالفرض وقوع میں آسکے، تب بھی اِس طویل حیاتیاتی عمل کا موجودہ زمین (planet earth) پر وقوع میں آنا ممکن نہیں۔ کیوں کہ زمین کی عمر اِس طرح کے طویل عمل کے لیے سراسر ناکافی ہے۔ چارلس ڈارون کے زمانے میں زمین کی عمر معلوم نہ تھی۔ مگر اب ٹکنالوجی کی ترقی کے بعد زمین کی عمر قطعی طور پر معلوم ہوچکی ہے۔

ارضیاتی سائنس دانوں کا خیال ہے کہ زمین ابتدائی طور پر دو بلین سال پہلے وجود میں آئی۔ اُس وقت وہ نہایت گرم تھی۔ اِس کے بعد زمین ٹھنڈی ہوئی اور پانی وجود میں آیا۔ ارضیاتی تحقیق (geological studies) کے مطابق، ایک بلین 23 کرور سال پہلے زمین ٹھنڈی ہوکر اِس قابل ہوئی کہ زندگی جیسی چیز اُس کے اوپر وجود میں آسکے۔ اب اگر ڈارونزم کے مفروضہ کے مطابق، انسان اور دوسری انواعِ حیات ارتقائی عمل کے ذریعے وجود میں آئی ہیں تو زمین کی مذکورہ عمر ایسے عمل کے لیے انتہائی حد تک ناکافی ہے۔ ایک بلین 23 کرور سال کے اندر اِس قسم کے ارتقائی عمل کی تکمیل سرے سے ممکن ہی نہیں۔

بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں جب زمین کی عمر دریافت کی گئی تو ارتقا پسند علما کو محسوس ہوا کہ اُن کا نظریہ موجودہ زمین کی نسبت سے قابلِ عمل ہی نہیں ہے۔ اب انھوں نے قدیم نظریۂ ارتقا میں ایک اور تصور کا اضافہ کیا۔ انھوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ زندگی کی ابتدائی صورت زمین کے سوا کسی اور سیارہ (planet) پر ظہور میں آئی، پھر وہاں سے سفر کرکے وہ زمین پر پہنچی اور زندگی کا اگلا ترقیاتی عمل موجودہ زمین پر پیش آیا۔ اس نظریے کو اصطلاحی طور پر پَینس پرمیا (panspermia) کہا جاتا ہے۔

اِس کے بعد ایک نئی دوڑ شروع ہوئی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد خلائی سائنس (space science) کا زمانہ آ گیا۔ اِسی کے ساتھ الیکٹرانک دوربینیں ایجاد ہوگئیں۔ چناں چہ ایسے خلائی راکٹ بنائے گئے جن پر طاقت ور الیکٹرانک دوربینیں نصب تھیں۔ یہ راکٹ زمین سے اوپر خلا میں بھیجے گئے۔ زمین سے کافی بلندی پر گردش کرتے ہوئے انھوں نے کائنات کے بعید ترین حصوں کے فوٹو لیے اور اُن کو زمین پر بھیجا۔ اِن تصویروں کو کمپیوٹر پر محفوظ کرلیا گیا۔ مگر تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ہماری زمین کے سوا کہیں بھی کوئی دوسرا سیارہ ایسا موجود نہیں ہے جہاں زندگی جیسی چیز نشوونما پا سکے۔ اِس طرح پینس پرمیا کا نظریہ عملی طور پر ختم ہوگیا۔

اب یہ سوال تھا کہ زمین کی محدودیت کے اندر مفروضہ ارتقائی عمل کس طرح وقوع میں آیا۔ اِس سوال کو حل کرنے کے لیے دوبارہ ایک نئی تحقیق شروع ہوئی۔ اِس تحقیق میں کئی اعلیٰ سائنس داں شامل تھے۔ اب اِس تحقیق کے نتائج امریکا کے مشہور جرنل نیچر (Nature) میں شائع کیے گئے ہیں۔ اِس تحقیق کا خلاصہ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (13 فروری 2009) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نظریۂ ارتقا کے بارے میں اِس قسم کی تحقیق جرمنی اور کینیڈا، وغیرہ میں بھی ہوئی۔ اِس تحقیق کے نتائج مجلہ سائنس (Science) کے شمارہ 13 فروری 2009 میں شائع ہوئے ہیں۔

ارتقا کے بارے میں نئی رسرچ ارتقا کے اصل سوالات کو حل نہیں کرتی۔ وہ صرف یہ کرتی ہے کہ نظریہ ارتقا کی توجیہہ کے لیے ایک نیا ٹکنکل لفظ (technical term) دیتی ہے۔ ارتقا کا روایتی تصور تبدیلیوں (mutations) کے اصول پر قائم تھا، یعنی نسل در نسل چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کے

جمع ہونے سے ایک نوع کا دوسری نوع کی صورت اختیار کر لینا۔ کلاسکل تبدیلی (classical mutation) کا نظریہ اِس سوال کا جواب نہیں دیتا تھا کہ خود یہ تبدیلی کیسے واقع ہوتی ہے۔ کیوں کہ کسی بھی ریسرچ سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ یہ بے شمار تبدیلیاں تدریجی (gradual) طور پر اپنے آپ ہو سکتی ہیں۔

نئی ریسرچ نے صرف یہ کیا ہے کہ اُس نے آتش فشانی انشقاق (volcanic eruption) پر قیاس کرتے ہوئے وہ نظریہ وضع کیا جس کو انھوں نے جنینیاتی تبدیلی (genetic change) کا نام دیا ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ یہ تبدیلی تدریجی انداز میں نہیں ہوئی، بلکہ انفجاری انداز میں ہوئی:

These are like volcanoes in the genome, blowing out pieces of DNA.

تاہم اِس نئی ریسرچ کے بعد بھی اصل مسئلہ بدستور باقی ہے۔ یہ ریسرچ مفروضہ طور پر جو کچھ بتاتی ہے، وہ صرف تبدیلیوں کے وقوع کی مفروضہ توجیہہ ہے، نہ کہ اِس بات کی توجیہہ کہ زمین کی محدود مدت میں بے شمار تبدیلیاں کیسے وقوع میں آئیں۔ ہماری زمین کی محدود مدت کی نسبت سے یہ نئی ''تحقیق'' بھی اتنا ہی ناکافی ہے، جتنا کہ قدیم کلاسکل توجیہہ۔

نظریہ ارتقا کا یہ دعویٰ ہے کہ واحد الخلیہ (single cellular) امیبا میں تبدیلیاں ہوئیں، اِس کے بعد وہ کثیر الخلیہ (multi-cellular) حیوان بن گیا۔ مچھلی کے اندر تبدیلیاں ہوئیں، یہاں تک کہ وہ چڑیا بن گئی۔ بکری کے اندر تبدیلیاں ہوئیں، یہاں تک کہ وہ زرافہ بن گئی۔ بلی کے اندر تبدیلیاں ہوئیں، یہاں تک کہ وہ شیر بن گئی۔ بندر کے اندر تبدیلیاں ہوئیں، یہاں تک کہ وہ انسان بن گیا۔

مذکورہ نئی تحقیق صرف یہ کرتی ہے کہ وہ اِن تبدیلیوں کو تدریجی نوعیت کی تبدیلی قرار دینے کے بجائے اُن کو انفجاری نوعیت کی تبدیلی بتاتی ہے۔ مگر اِس نئی ''تحقیق'' کے بعد بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ ان گنت تبدیلیوں (countless changes) کے اِس عمل کے لیے جو بے حد لمبی مدت درکار ہے، موجودہ سیارۂ ارض پر ان کا وقوع میں آنا ممکن نہیں۔ کیوں کہ سیارۂ ارض کی عمر معلوم طور پر اُس سے بہت زیادہ کم ہے جو کہ اِن مفروضہ تبدیلیوں کے لیے درکار ہے۔

اِس ''تحقیق'' میں ارتقائی عمل کے لیے درکار مطلوب مدت کے مسئلے کو اِس طرح حل کیا گیا ہے کہ یہ فرض کرلیا گیا کہ حیاتیاتی ارتقا بذریعہ انفجار (explosion) پیش آیا ہے۔ محققین نے اِس معاملے کو آتش فشانی انشقاق (volcanic eruption) پر قیاس کیا ہے۔ اُن کا ماننا ہے کہ جس طرح ایک آتش فشانی پہاڑ اچانک پھٹتا ہے اور اس کے اندر سے لاوا (lava) کی صورت میں ایک نئی چیز نکل آتی ہے، اُسی طرح انفجار کے ذریعے زندگی کی مختلف صورتیں ایک کے بعد ایک نکلتی چلی گئیں۔

اِس ارتقائی انشقاق (evolutionary eruption) کا مطلب یہ ہے کہ — واحد الخلیہ نوع میں انشقاق ہوا، اس کے بعد اچانک کثیر الخلیہ نوع وجود میں آ گئی۔ مچھلی کے اندر انشقاق ہوا، اِس کے بعد اچانک چڑیا وجود میں آ گئی۔ بکری کے اندر انشقاق ہوا، اس کے بعد اچانک زرافہ وجود میں آ گیا۔ بلّی کے اندر انشقاق ہوا، اس کے بعد اچانک شیر وجود میں آ گیا۔ بندر کے اندر انشقاق ہوا، اس کے بعد اچانک انسان وجود میں آ گیا، وغیرہ۔

انشقاق (eruption) کا یہ نظریہ کسی حقیقی سائنسی دریافت پر مبنی نہیں ہے۔ وہ دوبارہ اُسی طرح غیر متعلق قیاسات (irrelevant suppositions) پر مبنی ہے، جیسا کہ ڈارون نے اِسی طرح کے غیر متعلق قیاسات پر بنا رکھتے ہوئے ابتدائی طور پر اپنا نظریہ ارتقا وضع کیا تھا۔

نظریہ ارتقا میں بے شمار قسم کی گم شدہ کڑیاں (missing links) موجود تھیں، تاہم اِن گم شدہ کڑیوں کو قیاسی طور پر فرض کرتے ہوئے ارتقا کا نظریہ تسلیم کرلیا گیا۔ یہی معاملہ جدید تحقیق کا بھی ہے۔ اِس تحقیق میں بھی بے شمار قسم کی نامعلوم کڑیاں ہیں، لیکن اِن نامعلوم کڑیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے محض قیاس کی بنیاد پر یہ جدید نظریہ وضع کرلیا گیا۔

ارتقا کا نظریہ یہ فرض کرتا ہے کہ انواعِ حیات میں مسلسل تغیرات ہوئے ہیں۔ یہ تغیرات ماحول کے تعامل سے وجود میں آتے ہیں، یا آئے ہیں۔ اِس ارتقائی اصول کو موافقت (adaptation) کہا جاتا ہے۔ یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ اِس موافقت کے نتیجے میں جو تغیرات پیش آتے ہیں، وہ نسل در نسل جمع ہوتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ایک نوع دوسری نوع میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

موافقت (adaptation) کے اِس مفروضہ نظریے کے حق میں کوئی دلیل یا مثال موجود نہیں۔ البتہ کچھ غیر متعلق مثالیں پیش کی جاتی ہیں، مگر یہ مثالیں مغالطے سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ایک مشہور مثال پتنگا (moth) کی ہے۔ مشاہدے سے معلوم ہوا کہ جو پتنگے سبز درختوں اور پودوں کے درمیان رہتے ہیں، وہ ہرے (green) ہو جاتے ہیں، اور جو پتنگے پتھریلے علاقوں میں رہتے ہیں، اُن کا رنگ پتھریلا رنگ بن جاتا ہے۔ اِس مثال سے ارتقا کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز اِس سے ثابت ہوتی ہے، وہ یہ کہ خارجی ماحول ظاہری رنگ پر اثر انداز ہوتا ہے، جیسا کہ سرد ممالک میں رہنے والے لوگ اکثر سفید فام ہوتے ہیں اور گرم ممالک میں رہنے والے لوگ اکثر سیاہ فام۔ مگر نظریہ ارتقا کے ضمن میں جو اصل بحث ہے، وہ جسم کے خارجی رنگ (colour) میں تبدیلی کی نہیں ہے، بلکہ نوع (species) میں تبدیلی کی ہے، اور پتنگے کی مثال سے نوع میں تبدیلی کا اصول ثابت نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حیاتیاتی ارتقا کا نظریہ 1859 میں بھی ایک غیر سائنسی نظریہ تھا، جب کہ چارلس ڈارون کی کتاب اصل الانواع (The Origin of Species) پہلی بار چھپی اور 2009 میں بھی وہ اتنا ہی غیر سائنسی ہے، جب کہ امریکی جرنل نیچر (Nature) میں کچھ امریکی پروفیسروں کے ''نتائجِ تحقیق'' شائع ہوئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ حیاتیاتی ارتقا کے نظریے کو موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ طبقے میں عمومی قبولیت (general acceptance) حاصل ہو چکا ہے، مگر واقعات بتاتے ہیں کہ اِس نظریے کی یہ مقبولیت اِس لیے نہیں ہوئی ہے کہ سائنسی طور پر وہ ثابت ہو گیا ہے۔ اس کا سبب یقینی طور پر صرف یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ زندگی کی تشریح خدا کے بغیر کرنا چاہتا ہے۔ جدید طبقے کو یہ نظر آتا ہے کہ نظریۂ ارتقا کی صورت میں اس کو ایک ورک ایبل نظریہ (workable theory) حاصل ہو گیا ہے۔ اِس کے سوا کوئی بھی حقیقی علمی بنیاد نظریہ ارتقا کے حق میں موجود نہیں۔

نظریۂ ارتقا اور مذہب

نظریہ ارتقا کے ابتدائی زمانے میں مسیحی چرچ اُس کا سخت مخالف بن گیا تھا۔ مگر اب غالباً

حالات کے دباؤ کے تحت، مسیحی چرچ نے نظریۂ ارتقا کی واقعیت کو تسلیم کرلیا ہے۔ اِس سلسلے میں میڈیا میں جو رپورٹیں آئی ہیں، اُن کا ایک حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

The Vatican has admitted that Charles Darwin's theory of evolution should not have been dismissed and claimed it is compatible with the Christian view of creation. According to the Telegraph, Archbishop Gianfranco Ravasi, the head of the pontifical Council for Culture, said while the church had been hostile to Darwin's theory in the past, the idea of evolution could be traced to St Augustine and St Thomas Aquinas. Father Giuseppe Tanzella-Nitti of the Pontifical Santa Croce University in Rome, added that 4th century theologian St Augustine had "never heard the term evolution, but knew that big fish eat smaller fish" and forms of life had been transformed "slowly over time".

(*The Times of India,* New Delhi, February 12, 2009, p. 19)

نظریۂ ارتقا کے بارے میں اِس قسم کی رائے کا اظہار کچھ مسلم اہلِ علم نے بھی کیا ہے۔ مثلاً الجزائر کے شیخ ندیم الجسر (قصة العلم بين الفلسفة والعلم والقرآن)، اور پاکستان کے ڈاکٹر محمد رفیع الدین (قرآن اورعلمِ جدید) وغیرہ۔ اِن لوگوں کا کہنا ہے کہ حیاتیاتی ارتقا کا نظریہ خدا کے انکار کے ہم معنیٰ نہیں ہے، کیوں کہ وہ زندگی کو ابتداءً وجود میں لانے کے لیے خدا کو سببِ اول (first cause) کے طور پر مانتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر زندگی کی مختلف انواع مفروضہ ارتقائی طریقے کے مطابق، وجود میں آئیں، تب بھی ان کو ابتدائی طور پر وجود میں لانے والا ایک خدا (God) تھا۔

لیکن یہ توجیہہ درست نہیں۔ مذہبی نقطۂ نظر کے مطابق، خدا کی حیثیت صرف ''سببِ اول'' کی نہیں ہے، بلکہ خدا مسلسل طور پر ہماری زندگی میں شامل ہے۔ مذہبی عقیدے کے مطابق، خدا مسلسل طور پر کائنات کو کنٹرول کر رہا ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان تعلق ایک مسلسل تعلق ہے جو بلا انقطاع ہر لمحہ جاری رہتا ہے، پھر یہ کہ خدا محاسب اور مُجازی ہے۔

قیامت کے دن خدا مالکِ یوم الدین کی حیثیت سے تمام انسانوں کے ابدی مستقبل کا فیصلہ

کرنے والا ہے۔ خدا کی یہ تمام حیثیتیں، نظریہ ارتقا میں حذف ہوجاتی ہیں۔ ایسی حالت میں حیاتیاتی ارتقا کا نظریہ مذہبی اعتبار سے کبھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔

خدا اور بندے کے درمیان جو تعلق مطلوب ہے، وہ ایک زندہ تعلق ہے۔ وہ ذکر اور دعاء اور عبادت اور تفکر اور تدبر اور توسّم کے ذریعے ہر وقت اور ہر لمحہ قائم رہتا ہے۔ انسان ہر لمحہ خدا سے مانگتا ہے، اور ہر لمحہ وہ خدا کی طرف سے پاتا ہے۔ انسان جس طرح وجود میں آنے کے لیے خدا کا محتاج ہے، اُسی طرح وہ اپنی بقا کے لیے بھی مکمل طور پر خدا کا محتاج ہے۔ خدا اگر ایک لمحے کے لیے انسان کو نظر انداز کردے تو انسان تباہ ہو کر رہ جائے۔ مذہبی عقیدے کے مطابق، خدا نہ صرف خالق (creator) ہے، بلکہ وہ رازق اور قیوم (sustainer) بھی ہے۔ ایسی حالت میں نظریہ ارتقا عملاً خدا کی نفی ہے، نہ کہ خدا کی تصدیق۔

ڈارون اور ڈارون ازم

چارلس رابرٹ ڈارِون (وفات: 1882) نظریہ ارتقا کی نسبت سے بہت مشہور ہے۔ اِس سلسلے میں اُس نے دو کتابیں لکھیں۔ اِن دونوں انگریزی کتابوں کے نام یہ ہیں:

On the Origin of Species
The Descent of Man

'اوریجن آف اسپیشیز' کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آغازِ انواع کے موضوع پر ہے۔ مگر اصلاً اُس کا موضوع انواعِ حیات کی تعبیر ہے۔ اِس لحاظ سے غالباً اس کا زیادہ صحیح نام تعبیرِ انواع (Interpretation of Species) ہونا چاہیے۔

ڈارون کی کتاب کے چھپنے کے بعد مسیحی چرچ کی طرف سے اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ چناں چہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ڈارون ازم خدا کے وجود کی نفی ہے، مگر یہ درست نہیں۔ ڈارون کی کتاب 'اوریجن آف اسپیشیز' میں ایک سے زیادہ بار خدا (God) کا نام آیا ہے۔ اُس نے اپنی یہ کتاب اِن الفاظ کے ساتھ ختم کی ہے کہ — خالق نے ابتدا میں زندگی کی ایک یا کئی شکلیں پیدا کیں اور پھر اُس سے

بہت سی انواعِ حیات وجود میں آگئیں۔تخلیق کا یہ تصور کتنا عظیم ہے:

There is grandeur in this view of life, with its several powers, having been originally breathed by the Creator into a few forms or into one: and that, whilst this planet has gone cycling on according to the fixed law of gravity, from so simple a beginning endless forms most beautiful and most wonderful have been, and are being evolved.

ڈارون اپنی آخری عمر میں ناقابلِ تشخیص اَمراض کا شکار ہوگیا۔کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی کتاب میں دی ہوئی متضاد تعبیرات (contradictory explanations) سے سخت غیر مطمئن تھا۔اُس پر دو بار دِل کا دورہ پڑا اور اِسی میں اُس کا انتقال ہوگیا (B-5/496)

ارتقا یا مغالطہ

ریڑھ کی ہڈی انسان کے جسم کا ایک کم زور حصہ ہے۔ ریڑھ کے نیچے کا حصہ بہت جلد متاثر ہوجاتا ہے اور وہ تکلیف شروع ہوجاتی ہے جس کو پیٹھ کا درد (backache) کہا جاتا ہے۔ نظریۂ ارتقا کے حامی اِس کو ارتقائی عمل سے جوڑتے ہیں۔اُن کا کہنا ہے کہ انسان ابتداءً چوپائے کی شکل میں تھا، جیسا کہ گھوڑا ہوتا ہے۔ پھر اُس نے پیچھے کے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی، یہاں تک کہ وہ انسان کی صورت میں ایک سیدھا حیوان بن گیا۔اب اس کے پچھلے پاؤں بدستور پاؤں رہے، اور اگلے دونوں پاؤں ہاتھ کی مانند ہوگئے۔ سیدھا حیوان بننے کے بعد اس کا سارا بوجھ ریڑھ کی ہڈی پر آ گیا۔یہی سبب ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کا نچلا حصہ نہایت آسانی سے تکلیف کا شکار ہوجاتا ہے۔

یہ سرتاسر ایک مغالطہ ہے۔ چار پیروں والے حیوان کا دو پیروں والا حیوان بن جانا صرف ایک غیر ثابت شدہ قیاس ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف قدیم زمانے کے انسان کو نہیں ہوتی تھی، یہ صرف موجودہ زمانے کے انسان کا مسئلہ ہے۔موجودہ زمانے کا انسان کمفرٹ کلچر (comfort culture) میں جیتا ہے۔ اِس قسم کی بیماریاں اِسی کمفرٹ کلچر کا

نتیجہ ہیں، اس کا نظریہ ارتقا سے کوئی تعلق نہیں۔

Backache is a common health problem

With reference to the Backache is a common health problem 'Talking back' (TOI, June 13) by Jug Suraiya, backache is indeed one of the most common complaint that people suffer from at some stage in their lives. The most common causes behind the problem are poor posture, improper lifting or bending. A sedentary lifestyle with little or no exercise and overexertion of the body can be harmful too. One explanation for the vulnerability of the lower back is that it is one of the weakest parts in the human body, having evolved from walking on fours to walking upright. This unique evolutionary adaptation is a relatively recent change. As a result, the stresses acting upon the vertebral column are unique in many respects and result in a variety of problems that are peculiar to the human species. A proper posture can go a long way towards providing relief from backaches. (Subhash Kaura, *The Times of India,* New Delhi, June 15, 2009)

ذہین وجود

اسٹفن ہاکنگ (Stephen Hawking) موجودہ زمانے کا ایک ممتاز برٹش سائنس داں ہے۔ کائنات کے طویل مطالعے کے بعد اس نے کہا کہ میرا ریاضیاتی ذہن یہ بتاتا ہے کہ زمین کے ماورا بھی انسان کے مانند کوئی ذہین وجود ہونا چاہیے۔ اِس وجود کو اس نے اجنبی زندگی (Alien life) کا نام دیا ہے۔ اِس معاملے میں اسٹفن ہاکنگ کی سادہ منطق یہ ہے کہ ہماری کائنات میں تقریباً ایک سو بلین کہکشائیں ہیں۔ ہر کہکشاں میں کئی سو ملین ستارے ہیں۔ اتنی بڑی کائنات میں یہ بات ناقابلِ قیاس ہے کہ صرف زمین وہ واحد سیارہ ہو جہاں زندگی کا ارتقا ہوا ہے۔ میرے ریاضیاتی ذہن کے مطابق، ستاروں کی یہ عظیم تعداد ہی اِس نظریے کو پوری طرح معقول ماننے کے لیے کافی ہے:

Hawking has suggested that extraterrestrials are almost certain to exist. Hawking's logic on aliens is, for him, unusually simple. The universe has 100 billion galaxies, each containing hundreds of millions of stars. In such a big place, Earth is

unlikely to be the only planet where life has evolved. "To my mathematical brain, the numbers alone make thinking about aliens perfectly rational",
(*The Times of India*, New Delhi, April 26, 2010, p. 17)

سیارۂ زمین پر ذہین وجود کا ہونا، اولاً جس چیز کو ثابت کرتا ہے، وہ استثنا (exception) ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اِس استثنا کی توجیہہ کیا ہے۔ اسٹفن ہاکنگ نے ارتقا (evolution) کے مفروضہ نظریے کو توجیہہ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ مگر زیادہ معقول بات یہ ہے کہ اِس استثنا کی توجیہہ، مداخلت (intervention) کی بنیاد پر کی جائے۔ کیوں کہ مداخلت اپنے آپ میں ثابت ہے، اور جب مداخلت کو مان لیا جائے تو خالق کا وجود اپنے آپ ثابت ہوجاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں بہت سی نئی حقیقتیں دریافت ہوئی ہیں۔ یہ نئی حقیقتیں خالق کے وجود کو ثابت کررہی تھی، لیکن ارتقائی مفروضے کے تحت ان کو ارتقائی عمل کا نتیجہ قرار دے دیا گیا۔ مگر یہ محض ایک قیاس ہے، اور ایک قیاس سے دوسرے قیاس کو ثابت کرنا، بلاشبہہ ایک غیر منطقی استدلال کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک رپورٹ

مقابل کے صفحے پر دو رپورٹیں درج کی گئی ہیں۔ یہ نظریہ ارتقا کی کچھ حالیہ رسرچ پر مبنی ہیں، مگر یہ رسرچ کے نام پر صرف مغالطہ (fallacy) کے واقعات ہیں۔ اس قسم کی مغالطہ آمیز تحقیقات سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ حیاتیاتی ارتقا کے سلسلے میں پہلا سوال یہ تھا کہ زندگی (life) کا آغاز کس طرح ہوا۔ ڈارون نے اپنی کتاب اصل الانواع (*The Origin of Species*) میں مفروضہ طور پر یہ مان لیا کہ زندگی کا آغاز خدا (God) نے کیا۔ مگر دوبارہ یہ سوال تھا کہ حیاتیاتی ارتقا کے نظریے کے مطابق، عضویاتی ارتقا (organic evolution) کیسے ہوا اور ایک نوع دوسری نوع میں کیسے تبدیل ہوئی۔ مثلاً یہ فرض کیا گیا تھا کہ بکری نے ارتقا کرتے کرتے زرافہ کی صورت اختیار کرلی، مگر بکری اور زرافہ کے بیچ میں بہت سی درمیانی کڑیاں تھیں جو کہ واقعے کی دنیا میں موجود نہ تھیں۔ یہاں یہ مان لیا گیا کہ یہ سب گم شدہ کڑیاں (missing links) ہیں، مگر آج تک گم شدہ کڑی کا نظریہ غیر ثابت شدہ بنا ہوا ہے۔

Gene That Gives us Edge Over Apes Decoded

London: Researchers have discovered a new gene which they say helps explain how humans evolved from chimpanzees. The gene, called miR-941,is carried only by humans and it appeared after humans evolved from apes and played a crucial role in human brain development and could shed light on how we learned to use tools and language. Researchers from the University of Edinburgh compared it to 11 other species of mammals, including chimpanzees, gorillas, mice and rats. This finding, published in Nature Communications, brings us closer to answering one of science's leading questions: What makes the human body different from other mammals? A previous study that also analysed the differences between apes and humans found that the evolutionary genetic advantages that help humans live longer than apes also make them more vulnerable to diseases of ageing, including heart disease, cancer, and dementia. Scientists led by Dr. Martin Taylor at the Institute of Genetics and Molecular Medicine showed that miR-941had an important part in the development of the human brain and can even help explain how we acquire language and learn to use tools. This new gene is the first known gene to be found in humans and not in apes. According to the team, it appears to have a certain purpose in the human body. (*The Times of India,* New Delhi, Nov. 16, 2012 p. 19)

Did genetic accident lead to human intelligence

London: Scientists have discovered the origin of intelligence after identifying a'genetic accident 500million years ago when the genes that enabled humans to think and reason evolved. Researchers led by the University of Edinburgh have discovered how humans and other mammals evolved to have intelligence. They found that intelligence in humans developed as the result of an increase in the number of brain genes in our evolutionary ancestors. Scientists also believe that the same genes that improved our mental capacity are also responsible for a number of brain disorders. The researchers suggest that a simple invertebrate animal living in the sea 500million years ago experienced a'genetic accident,which resulted in extra copies of these genes being made. This animal's descendants benefited from these extra genes, leading to behaviourally sophisticated vertebrates_including humans". One of the greatest scientific problems is to explain how intelligence arose during evolution", professor Seth Grant, of the University of Edinburgh, who led the research, said. (*The Times of India,* New Delhi, Dec. 4, 2012, p. 19)

نظریہ ارتقا کے مطابق، انسان کوئی اسپیشل مخلوق نہیں، وہ حیوانات کی اگلی ترقی یافتہ قسم ہے۔ مگر یہاں یہ سوال تھا کہ انسان تمام حیوانات بشمول چمپینزی سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ یہ اختلاف یا فرق کہاں سے آیا۔ اب ارتقا پسند حضرات یہ دعوی کرر ہے ہیں کہ انھوں نے انسان کے اندر ایک نیا جین (gene) دریافت کرلیا ہے۔ اِس مختلف جین کی بنا پر ایسا ہے کہ انسان کے اندر ایسا دماغ ہے جو کسی حیوان کے اندر نہیں۔ انسان کے اندر نطق (speech) کی صلاحیت ہے، اور انسان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ اوزار (tools) بنائے اور ان کو استعمال کرے۔

مگر انسان کے اندر پائی جانے والی امتیازی صلاحیت (distinctive qualities) کی توجیہہ صرف یہ کہہ کر نہیں ہوسکتی کہ انسان کے اندر حیوان سے مختلف ایک امتیازی جین پایا جاتا ہے، کیوں کہ دوبارہ یہ سوال ہے کہ یہ امتیازی جین کہاں سے آیا۔ محض ارتقائی پراسس یا اتفاق (accident) کا لفظ اِس انتہائی پیچیدہ واقعے کی توجیہہ نہیں کرسکتا۔

گاڈ پارٹکل کیا ہے

گاڈ پارٹکل (God Particle) کیا ہے۔ گاڈ پارٹکل کا مطلب خدائی ذرہ نہیں، گاڈ پارٹکل دراصل ایک سائنسی مسئلے کی سائنسی تشریح (scientific description) ہے۔ گاڈ پارٹکل کا تصور دراصل خدا کا مشینی بدل (mechanical substitute of God) ہے۔ گاڈ پارٹکل کی دریافت کا براہِ راست طور پر مذہبی عقیدے سے کوئی تعلق نہیں۔

God Particle: The Standard Model of physics is used by scientists to explain the building blocks of the universe. According to this model the universe began with a big bang. The Big Bang theory is widely accepted within the scientific community. This theory states that 13.7 billion years ago the universe was in the shape of a very dense and compact cosmic ball. Then an explosion occurred in this compact ball, and all its constituents started flying apart with the speed of light. All the particles released from this cosmic ball were drifting apart from each other at the speed of light, which is the maximum speed of any object in the universe. Everything in the universe is made up of atoms. These atoms are in turn made up of electrons and protons. But, after the explosion of the Big Bang, electrons and protons were speeding away from each other. These particles could bind together to form atoms only if they their speed was decreased. And their speed could be decreased only by being given mass. This is why the Higgs boson is so important. Higgs boson is a subatomic particle. Physicists say its job is to give mass to the particles that make up atoms. Atoms then combined to form molecules, then molecules combined to form compounds, and these compounds gave rise to all the constituents of the universe as it exists today. If the Higgs boson were taken away, the particles which make up atoms, would have zipped through the cosmos at the speed of light, unable to join together to form the atoms that make up everything in the universe, from planets to people. Then all creation would be unthinkable.

4 جولائی 2012 کو سائنس دانوں نے ایک دریافت کا اعلان کیا۔ اس کو نیر ڈسکوری (near discovery) کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک سب ایٹمک پارٹکل (sub-atomic particle) کی دریافت ہے جس کے بارے میں پچھلے تقریباً 50 سال سے ریسرچ ہو رہی تھی۔ اِسی درمیان 1993 میں ایک امریکی سائنس داں لیان لیڈرمین (Leon Lederman) نے ایک کتاب تیار کی۔ اس کا ٹائٹل اس نے گاڈ ڈیم پارٹکل (*Goddamn Particle*) تجویز کیا۔ اُس وقت تک یہ پارٹکل ایک پراسرار پارٹکل بنا ہوا تھا۔ لیان لیڈرمین اپنی کتاب میں اِس پارٹکل کا کوئی واضح تصور نہیں دے سکا تھا۔ اس نے جھنجھلاہٹ میں اپنی اِس کتاب کا نام 'گاڈ ڈیم پارٹکل' رکھ دیا۔ 'گاڈ ڈیم' ایک بگڑا ہوا نام ہے۔ اردو میں کہتے ہیں خدا کی لعنت۔ خراب موسم ہو تو کہا جائے گا، گاڈ ڈیم ویدر (Goddamn weather)۔ پبلشر کو کتاب کا یہ نام پسند نہیں آیا۔ اس نے بطور خود 'ڈیم' کا لفظ نکال دیا اور کتاب کو 'گاڈ پارٹکل' کے نام سے چھاپ دیا۔ اُس وقت سے عوامی طور پر اِس ذرے کو گاڈ پارٹکل کہا جانے لگا۔ تاہم سائنس دانوں کے نزدیک اِس ذرّے کا نام ہگس بوزان (Higgs Boson) ہے۔

بوزان کا لفظ دراصل 'بوس' کے نام سے لیا گیا ہے۔ ستیندر ناتھ بوس (SN Bose) ایک انڈین سائنس داں تھے۔ ان کی وفات 1974 میں ہوئی۔ انھوں نے 1924 میں 'سب ایٹمک پارٹکل' (behaviour of subatomic particles) کے بارے میں ایک پیپر تیار کیا تھا۔ اس پیپر کو البرٹ آئن سٹائن (وفات: 1955) اور دوسرے سائنس دانوں نے بہت پسند کیا تھا۔ اُس وقت سے اِس پارٹکل کا نام بوزان (boson) پڑ گیا ہے۔ اِس مخصوص پارٹکل کو 'بوزان' کا نام سب سے پہلے برٹش سائنس داں پال ڈیراک (Paul Dirac) نے دیا تھا۔

اسکاٹ لینڈ کے ایک سائنس داں پیٹر ہگس (Peter Higgs) نے 1964 میں اِس موضوع پر زیادہ واضح انداز میں ایک مفصل پیپر تیار کیا، جس کا ٹائٹل یہ تھا:

Broken Symmetries and the Masses of Gauge Bosons

اس وقت سے زیرِ تلاش پارٹکل کو ہگس بوزان کہا جانے لگا۔

سائنسی نقطہ نظر سے ہگس بوزان کی اہمیت بہت زیادہ تھی، اِس لیے وہ ساری دنیا کے سائنس دانوں کے لیے تلاش کا موضوع بن گیا۔آخرکار 1998 میں اِس موضوع کی تحقیق کے لئے ایک خصوصی سرنگ بنائی گئی۔اِس سرنگ کو ایک یورپین ادارہ نے تیار کیا تھا۔اس کا نام یہ ہے:

European Oganization for Nuclear Research

اِس سرنگ کا نام یہ تھا— لارج ہیڈرون کولائڈر (Large Hadron Collider)۔اِس پروجیکٹ میں دنیا کے ایک سو ملک شریک ہوئے اور 10 ہزار سائنس دانوں اور انجینئروں نے اِس میں کام کیا۔4 جولائی 2012 کو اس پروجیکٹ کے نتیجہ (result) کا اعلان کیا گیا۔سائنس دانوں نے اعلان کیا کہ اِس تحقیق میں وہ 'نیر ڈسکوری' تک پہنچ گئے ہیں۔

'ہگس بوزان' دراصل فزکس کے اسٹینڈرڈ ماڈل کا ایک گم شدہ پارٹکل ہے جو اِس بات کی توجیہ کرتا ہے کہ ابتدائی انفجار کے بعد کائنات کیسے وجود میں آئی۔فزکس کے اسٹینڈر ماڈل کو سائنس داں کائنات کے بلڈنگ بلاک (building block) کی توجیہہ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔اِس ماڈل کے مطابق، کائنات کا آغاز بگ بینگ سے ہوا۔بگ بینگ کا نظریہ سائنس دانوں کے نزدیک عمومی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے۔یہ نظریہ بتاتا ہے کہ 13 بلین سال پہلے کائنات ایک بہت بڑے کاسمک بال کی صورت میں تھی۔کائنات کے تمام پارٹکل اس کے اندر شدت سے باہم پیوست تھے۔پھر اِس کاسمک بال میں ایک انفجار ہوا اور اس کے تمام اجزا چاروں طرف روشنی کی رفتار سے سفر کرنے لگے۔روشنی کی رفتار معلوم طور پر سب سے زیادہ ہے جو ایک لاکھ 86 ہزار میل فی سکنڈ ہوتی ہے۔کاسمک بال سے جو پارٹکل خارج ہوئے، وہ نہایت تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے دور بھاگ رہے تھے۔ہر چیز جو اِس کائنات میں ہے، وہ ایٹم سے بنی ہے۔یہ تمام ایٹم الیکٹران اور پروٹان کے ملنے سے بنتے ہیں۔ضرورت تھی کہ یہ تمام پارٹکل باہم ملیں، لیکن بگ بینگ کے انفجار کے بعد الیکٹران اور پروٹان بھاگ رہے تھے، کیوں کہ اُن میں کمیت (mass) نہیں تھی۔یہ ذرات باہم مل کر ایٹم کو صرف اُس وقت بنا سکتے تھے جب کہ ان کی رفتار کم ہو، اور ان کی رفتار صرف اُس وقت کم ہو سکتی تھی جب کہ ان کے اندر کمیت پیدا ہو جائے۔

ہگس بوزان کی اہمیت یہ ہے کہ وہ اِس سائنسی مسئلے کا جواب فراہم کرتا ہے۔ہگس بوزان ایک سب ایٹمک پارٹکل کا نام ہے۔سائنس دانوں کے مطابق،ہگس بوزان کا کام یہ ہے کہ وہ ایٹم کے پارٹکل کو کمیت عطا کرے۔اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایٹم مل کر مالی کیول (molecule) بنائیں اور پھر مالی کیول کے بننے سے کمپاؤنڈ بنے۔پھر کمپاؤنڈ کے ملنے سے وہ تمام چیزیں بنتی ہیں جو کہ اِس وقت کائنات میں موجود ہیں۔اگر ہگس بوزان نہ ہوتے تو پارٹکل میں کمیت پیدا نہ ہوتی جو کہ باہم مل کر ایٹم بناتے ہیں۔اِس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام پارٹکل روشنی کی رفتار سے خلا میں سفر کرنے لگتے، پھر یہ ناممکن ہوجاتا کہ وہ باہم مل کر ایٹم بنائیں اور اس کے بعد کائنات کی تمام چیزیں وجود میں آئیں، ستاروں سے لے کر سیاروں تک اور غیر ذی روح اشیا سے لے کر ذی روح اشیا تک۔

قرآن کی تصدیق

قرآن کی سورہ النساء میں ارشاد ہوا ہے: أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (4:82) یعنی کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، اگر یہ (قرآن) اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اُس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

قرآن ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں اترا۔یہ سائنس کی دریافتوں سے بہت پہلے کا زمانہ تھا۔اِس قبل دریافت زمانے میں قرآن کی اِس آیت کا اترنا گویا یہ دعوی کرنا تھا کہ بعد کی دریافت شدہ حقیقتیں قرآن کے عین مطابق ہوں گی، قرآنی بیانات اور دریافتوں کے درمیان کبھی عدم مطابقت (inconsistency) نہ ہوگی۔اِس طرح یہ واقعہ اِس بات کی تصدیق ہوگا کہ قرآن عالم الغیب کی کتاب ہے، کیوں کہ عالم الغیب کے سوا کوئی بھی پیشگی طور پر اِن حقیقتوں کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔

اِس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بگ بینگ کا تصور اور ہگس بوزان کا تصور پیشگی طور پر قرآن میں موجود تھا۔اِس سلسلے میں قرآن کی سورہ الانبیاء کی درج ذیل آیت کا مطالعہ کیجئے:

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (21:30)۔

قرآن کی اِس آیت میں تخلیق کے تین مرحلوں کا ذکر ہے — پہلے مرحلے کو 'رتق' کہا گیا ہے۔ رتق کا مطلب ہے منضم الأجزاء یعنی کائنات کے تمام پارٹکل کا باہم جڑا ہوا ہونا۔ اِس میں کاسمک بال کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ دوسرے مرحلے کو قرآن میں 'فتق' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فتق کا مطلب ہے: الفصل بین المتصلین، یعنی باہم ملی ہوئی چیزوں کا ایک دوسرے سے الگ ہوجانا۔ اس میں بگ بینگ کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ اِس کے بعد تیسرے مرحلے میں پانی (الماء) کے بننے کا ذکر ہے۔ یہاں پانی کا ذکر علامتی طور پر ہے، یعنی پانی اور دوسری تمام چیزیں۔

پانی ایک جوہری مادہ (substance) ہے۔ اِس طرح کے بہت سے جوہری مادّے کائنات میں پائے جاتے ہیں۔ پانی ہائڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کے ایک ایٹم کے ملنے سے بنتا ہے۔ یہی معاملہ دوسری تمام مادّی چیزوں کا ہے۔ ہر چیز ایٹم کے ملنے سے بنی ہے اور ایٹم اُس وقت بنا جب کہ اس کے پارٹکل میں کمیت (mass) پیدا ہوئی۔ اِس طرح، اِس آیت میں پانی کا ذکر کرکے اِس نوعیت کی دوسری تمام مادی چیزوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، یعنی 'فتق' کے واقعے کے بعد تمام پارٹکل میں کمیت کا پیدا ہونا اور پھر پارٹکل کا مجتمع ہو کر تمام چیزوں کا وجود میں آنا۔

قرآن، سائنس کی کتاب نہیں ہے، البتہ قرآن میں مظاہر فطرت کے بہت سے حوالے دئے گئے ہیں جو کہ سائنس کا موضوع تحقیق ہیں۔ قرآن کا مقصد صرف یہ ہے کہ فطرت میں موجود آیات (signs) کا حوالہ دے کر قرآن کی آئڈیالوجی کو علمی طور پر ثابت کرنا۔ اِس طرح قرآن میں فطرت کے بہت سے مظاہر کے متفرق حوالے (fragmentary references) دئے گئے ہیں۔ اِن حوالوں کے بارے میں قدیم زمانے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ گویا کہ قرآن میں یہ حوالے مستقبل کی انسانی نسلوں کو شامل کرتے ہوئے دئے گئے تھے۔ اِس طرح انسان کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ وہ قرآن کے اِن حوالوں کا تقابل بعد کے حالات سے کر کے قرآن کی صداقت کی تصدیق حاصل کرے۔

ایک تاریخی جائزہ

قرآن میں ایک تاریخی واقعے کو اِس طرح بیان کیا گیا ہے: **وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ** (22:8)۔ اِس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، وسیع تر انطباق کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ زندگی کے بارے میں بغیر ہدایت، خدائی اسکیم سے لڑتے ہیں:

Some people defy the divine scheme without having a guidance.

اِس آیت کی روشنی میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ پوری انسانی تاریخ پر ایک تبصرہ ہے۔ ساری تاریخ میں مسلسل یہ ہوتا رہا ہے کہ بڑے بڑے دماغ کسی رہنمائی کے بغیر محض اپنی ذاتی اُپج سے زندگی اور کائنات کی تشریح کرتے رہے۔ اِس طرح انھوں نے انسانیت کے بڑے حصے کو گمراہی کے راستے پر ڈال دیا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

فلسفے کی مثال

تمام علوم میں فلسفہ شاید سب سے قدیم علم ہے۔ بڑی تعداد میں اعلیٰ دماغ، فلسفیانہ غور میں مشغول رہے ہیں لیکن فلسفہ انسانی علم میں کوئی مثبت اضافہ نہ کرسکا۔ مثال کے طور پر تقریباً تمام فلسفیوں نے یہ کیا کہ انھوں نے کائنات کے مختلف مظاہر کو وحدت کی اصطلاح میں بیان کرنے کی کوشش کی۔ اِس طرح انھوں نے یہ کیا کہ انھوں نے خالق اور تخلیق دونوں کو ایک قرار دے دیا۔ ان کے نزدیک ایک ہی حقیقت تھی جو مختلف اشیا کی صورت میں اپنا ظہور کررہی تھی۔ اسی فلسفیانہ تفکیر کے نتیجے میں تخلیق کے بارے میں وہ نظریہ پیدا ہوا جس کو وحدتِ وجود (monism) کہا جاتا ہے، سنسکرت میں اسی کو اَدُوئت واد کہتے ہیں۔

یہ نظریہ انسانی فطرت کے خلاف تھا۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک بڑے کا تصور نہایت گہرائی کے ساتھ پیوست ہے۔ انسان اپنے داخلی تقاضے کے تحت، ایک ایسی ہستی کو پانا چاہتا ہے جو اُس سے برتر ہو، جو اس کے لیے اعتماد کا سرچشمہ بن سکے۔ مگر وحدتِ وجود کے

نظریے میں اِنسان کی اس تلاش کا جواب نہیں۔ کیوں کہ یہ نظریہ بتاتا ہے کہ انسان خود ہی خدا ہے۔ انسان کے باہر کوئی اور ہستی موجود نہیں جس کو وہ اپنا مرکز ومحور بنا سکے۔ اِس طرح وحدتِ وجود کے نظریے نے انسان کی سب سے بڑی طلب کو اس کا مطلوب فراہم کیے بغیر حیرانی اورسرگشتی کی حالت میں چھوڑ دیا۔

دوسری طرف یہ ہوا کہ پوری تاریخ میں پیغمبر اٹھتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ زندگی کی تشریح کا زیادہ صحیح تصور 'وحدتِ وجود' نہیں ہے بلکہ توحید (monotheism) ہے۔ اِس پیغمبرانہ تصور کے مطابق، یہاں ایک قسم کی ثنویت (dualism) پائی جاتی ہے۔ یعنی خالق اور تخلیق دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ایک خدا ہے جس نے انسان کو اور ساری کائنات کو پیدا کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خالق الگ ہے، اور تخلیق اُس سے الگ۔

اِس پیغمبرانہ تصور کے مطابق، یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف انسان اور کائنات کی قابلِ فہم تشریح مل جاتی ہے، بلکہ انسان کو وہ مطلوب بھی حاصل ہوجاتا ہے جس کا تقاضا اس کا پورا وجود کررہا تھا۔

فلسفیانہ توجیہ کے نادرست ہونے کے بہت سے پہلو ہیں، مگر اس کی نادرستگی کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ وہ فطرتِ انسانی کے لیے ایک متبائن (incompatable) تصور کی حیثیت رکھتا ہے، اور جو چیز فطرتِ انسانی کے لیے متبائن تصور کی حیثیت رکھتی ہو، وہ اپنے آپ میں قابلِ رد ہے۔ اس کے بعد اس کو رد کرنے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

پیغمبرانہ ہدایت آدمی کو فکری عمل کے لیے رہنما اصول (guideline) دیتی ہے۔ اِن اصولوں سے رہنمائی لینے والا آدمی فکری بھٹکاؤ سے بچ جاتا ہے۔ وہ اِس قابل ہوجاتا ہے کہ صحیح سمت کا اتباع کرتے ہوئے درست شاہ راہ پر اپنا سفر جاری رکھے، یہاں تک کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے۔

سائنس کی مثال

فلسفی کے بعد دوسرا سب سے بڑا علم وہ ہے جس کو سائنس یا علومِ قطعیّہ (exact sciences) کہا جاتا ہے۔ سائنس اُس علم کا نام ہے جس میں مظاہرِ فطرت کی تحقیق کرکے فطرت کے اصول اخذ

کیے جائیں اور ان کی روشنی میں مادّی دنیا کی تعمیر کی جائے۔ یہ علم ابتدائی صورت میں بہت پہلے سے موجود تھا، لیکن وہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچا ہے۔

سائنس نے انسان کو بہت سی چیزیں دی ہیں۔ یہاں تک کہ تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوگیا کہ مادّی قوانین کا اتباع کرکے اپنے لیے ایک پُرکشش دنیا بنائی جاسکے۔ انسان ہمیشہ سے راحت اور آسائش کی زندگی کا طالب رہا ہے۔ سائنس نے پہلی بار ایسا کیا کہ بظاہر اس نے اِس بات کو ممکن بنادیا کہ انسان اپنی خواہشوں کو واقعے کی صورت دے سکے۔

لیکن جہاں تک فکری پہلو کا تعلق ہے، سائنس نے انسان کو ایک بہت بڑی بے راہ روی میں ڈال دیا، ایک ایسی بے راہ روی جو اپنے نتیجے کے اعتبار سے کامل تباہی کے ہم معنیٰ ہے۔

وہ فکری گمراہی یہ ہے کہ دنیا میں مختلف قسم کے جو سامانِ حیات موجود ہیں، ان کو سائنس نے صرف یہ حیثیت دی کہ وہ لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کے طور پر ہیں۔ حالاں کہ خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، ان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ ٹسٹ سپورٹ سسٹم (test support system) کے طور پر ہیں۔ سامان حیات کے سائنسی تصور کی روشنی میں انسان اور اس سامانِ حیات کے درمیان جو تعلق بنتا ہے، وہ وہی ہے جو حیوانات کا اِن چیزوں کے ساتھ بنا ہوا ہے۔ حیوان اِن چیزوں کو صرف ذریعۂ انتفاع کے طور پر دیکھتا ہے، جس سے کوئی ذمّے داری وابستہ نہ ہو۔ سائنسی خاکے میں یہی حال انسان کا بھی ہوجاتا ہے۔

سائنسی تصور کے مطابق، انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ دنیوی ساز وسامان سے انتفاع اس کے لیے صرف رائٹ (right) کا ایک مسئلہ ہے، وہ ڈیوٹی (duty) کا مسئلہ نہیں۔ یہ تصور انسان کو اُس سطح پر لے جاتا ہے، جس کو حیوانی سطح کہا جاتا ہے۔

اس کے برعکس، سامانِ حیات کے بارے میں پیغمبرانہ تصور یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں امتحانی پرچہ (test papers) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے ساتھ براہِ راست طور پر ذمے داری کا تصور جُڑا ہوا ہے۔ اِس طرح پیغمبرانہ تصور آدمی کو مکمل طور پر ڈیوٹی کانشش (duty concious) بنادیتا ہے۔ سائنسی تصور کے

مطابق، یہ حال ہوتا ہے کہ ہر آدمی زندگی کو اِس نظر سے دیکھنے لگتا ہے کہ وہ اس لیے دنیا میں ہے کہ وہ بقدر امکان آرام اور آسائش کی چیزیں حاصل کرے اور پھر مرجائے۔ جب کہ پیغمبرانہ تصور کا مطلب یہ ہے کہ اِس دنیا میں انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے، وہ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ انسان اس کے اندر اپنا امتحان دے، اور پھر موت کے بعد کی ابدی زندگی میں اس کے مطابق، انعام یا سزا کی صورت میں اس کا نتیجہ پائے۔

پیغمبرانہ تصور کے مطابق، خالق نے ہماری زندگی کو دو دَوروں میں تقسیم کیا ہے— موت سے پہلے، اور موت کے بعد۔ موت سے پہلے کا مرحلہ عمل کرنے کا مرحلہ ہے، اور موت کے بعد کا مرحلہ اپنے عمل کا انجام پانے کا مرحلہ۔ سائنسی تصور کے مطابق، زندگی کی معنویت کو سمجھنے کا معیار یہ ہے کہ آدمی اس عارضی مرحلۂ حیات کو کتنا زیادہ پُر آسائش بنا سکا، جب کہ پیغمبرانہ تصور کے مطابق، سارا معاملہ جنت سے تعلق رکھتا ہے۔

پیغمبرانہ تصور کے مطابق، انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ دنیا میں ملی ہوئی ہر چیز کو امتحان کا ایک پرچہ سمجھے۔ وہ چیزوں کے درمیان اِس احساس کے ساتھ رہے کہ اُسے دنیا میں اُس روش کو اختیار کرنا ہے جو موت کے بعد کے طویل تر مرحلۂ حیات میں اس کو کامیاب بنا سکے۔

انسان کی دریافت

ایک فلسفی نے کہا ہے کہ — انسان کی تاریخ اندھیرے میں بھٹکنے کی تاریخ ہے۔ یہ تبصرہ بالکل درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان پوری تاریخ میں بے خبری کے اندھیروں میں بھٹکتا رہا ہے۔ انسان کی اِس بے خبری کو تین عنوان کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔

1۔ آئڈیل ازم (Idealism)

2۔ بہیو یرازم (Behaviourism)

3۔ یوٹلیٹرین ازم (Utilitarianism)

یہاں میں نے آئڈیل ازم کا لفظ اس کے کلاسکل معنی میں استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے لغوی معنی میں اس کو استعمال کیا ہے۔ انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر اپنے اندر

آئڈیل کا ایک تصور لیے ہوئے ہے، ہر انسان اس آئڈیل کو پانا چاہتا ہے۔ اِس معاملے میں عوام اور خواص کا کوئی فرق نہیں۔ عوام کی اکثریت اپنی غفلت کی بنا پر آئڈیل کی تلاش کے بارے میں شعوری طور پر باخبر نہیں ہوگی، تاہم غیر شعوری طور پر اس کا کیس پوری طرح یہی ہے۔ البتہ خواص، یعنی فلسفی اور مفکر اور رفارمر سب کے سب اِس میں مبتلا رہے ہیں۔

مگر دوسری طرف تاریخ یہ بتاتی ہے کہ تمام لوگ، بلا استثنا آئڈیل کے بارے میں اپنی تلاش میں ناکام رہے۔ آئڈیل سماج، آئڈیل اسٹیٹ، آئڈیل ادارہ، آئڈیل نظام، یہی ہر ایک کا محبوب نشانہ رہا ہے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ ہر ایک اپنے نشانے کو پورا کرنے میں ناکام رہا، اور آخر کار وہ مایوسی کے عالم میں مر گیا۔

1۔ قدیم یونان کا مشہور فلسفی افلاطون (Plato) 427 قبل مسیح میں پیدا ہوا، اور 347 قبل مسیح میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے سُقراط (Socrates) سے تعلیم وتربیت حاصل کی تھی۔ مشہور فلسفی ارسطو (Aristotle) اس کا شاگرد تھا۔ افلاطون کو اپنے زمانے میں اتنا بڑا درجہ ملا کہ وہ اُس زمانے کے شاہی خاندان کا معلم بن گیا۔ لیکن اس کی سوانح عمری میں ہمیں یہ الفاظ لکھے ہوئے ملتے ہیں کہ — وہ ایک مایوس انسان کی طرح مرا:

He died as a disappointed person.

ایسا کیوں ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ افلاطون نے یونان میں آئڈیل اسٹیٹ قائم کرنے کو اپنا مقصد بنایا۔ اس نے اِس موضوع پر کتاب لکھی۔ اس نے وقت کے شاہی خاندان کی اپنے آئڈیل نظریے کے مطابق، تعلیم وتربیت کی۔ اُس کے نزدیک اس کا آئڈیل اسٹیٹ اتنا کامل تھا کہ اس نے اِس موضوع پر اپنی کتاب میں سزا (punishment) کا قانون شامل نہیں کیا۔

مگر عملاً یہ ہوا کہ اس کا آئڈیل اسٹیٹ سرے سے قائم ہی نہ ہو سکا، نہ کسی شہر میں اور نہ پورے ملک میں۔ آخر کار وہ سخت مایوسی میں مبتلا ہوا، اور اِسی مایوسی کے عالم میں حسرت کے ساتھ مر گیا۔

یہی انجام، بلا استثنا ہر فلسفی اور ہر مفکر اور ہر رفارمر کا ہوا ہے۔ ہر ایک نے اپنے ذہن میں ایک

آئڈیل دنیا بنانے کا خواب دیکھا۔ مگر کوئی بھی شخص اپنی آئڈیل دنیا نہ بنا سکا۔ آپ کسی بھی مشہور آدمی کی سوانح عمری پڑھیے تو آخر میں ہر ایک کے بارے میں یہ لکھا ہوا ملے گا کہ وہ اپنے نشانے کو پانے میں ناکام رہا اور آخر کار مایوسی کے عالم میں مر گیا — روسو، مارکس، ڈارون، جان آسٹن، لارڈ کرزن، وغیرہ ہر ایک کا خاتمہ محرومی کے احساس کے ساتھ ہوا۔

انسان کی اِس عمومی ناکامی کا سبب یہ تھا کہ ہر ایک نے یہ غلطی کی کہ اس نے خدا کی تخلیقی اسکیم (creation plan) کو سمجھے بغیر خود اپنے ذہن سے اپنا ایک آئڈیل نقشہ بنایا اور وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑا۔ حالاں کہ خالق کے تخلیقی پلان کو سمجھے بغیر اِس قسم کی کوشش سراسر عبث تھی۔ ایسی کوشش کبھی اِس دنیا میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اسی ناکام تجربے کی بنا پر لوگوں میں عمومی طور پر وہ تصور رائج ہوگیا جس کو ایک جملے میں اِس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ — آئڈیل کبھی حاصل نہیں ہوسکتا:

Ideal can't be achieved.

مگر حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے یہ قول درست نہیں۔ انسان کے دماغ میں جو آئڈیل بسا ہوا ہے، وہ یقینی طور پر قابلِ حصول ہے، مگر موت سے پہلے کی دنیا میں نہیں بلکہ موت کے بعد کی دنیا میں۔ خالق کے تخلیقی پلان کے مطابق، یہ آئڈیل دنیا جنت ہے، اور وہ مستحق افراد کو صرف موت کے بعد کی زندگی میں حاصل ہوگی۔ انسان کی غلطی یہ ہے کہ وہ آئڈیل دنیا کو موت سے پہلے کی زندگی میں پانا چاہتا ہے۔ حالاں کہ خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، یہ آئڈیل دنیا صرف موت کے بعد کی زندگی میں حاصل ہونے والی ہے۔

خدا کے تخلیقی پلان سے اِس بے خبری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر انسان کا یہ کیس بن گیا کہ وہ امید کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کرے اور محرومی کا احساس لے کر مر جائے۔ حالاں کہ اگر وہ خدا کے تخلیقی پلان کو جانے اور اس کے مطابق عمل کرے تو اس کے لیے موت سے قبل کی زندگی میں بھی امید ہے اور موت کے بعد کی زندگی میں بھی امید۔ ایسا آدمی فطری طور پر کبھی ذہنی تناؤ (tension) میں مبتلا نہیں ہوگا اور وہ اِس المیے سے بھی بچ جائے گا کہ محرومی کے احساس پر اس کا خاتمہ ہو۔

تاریخ میں بہت سے مفکر اور رفارمر گذرے ہیں جو یہ چاہتے تھے کہ موجودہ دنیا میں آئڈیل اسٹیٹ، آئڈیل نظام، آئڈیل سماج، آئڈیل ادارہ بنے، مگر بلا استثنا ہر ایک اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موت سے پہلے کی یہ موجودہ دنیا اِس مقصد کے لیے بنائی ہی نہیں گئی۔

اصل یہ ہے کہ خالق نے اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، ہر انسان کو مکمل آزادی دی ہے۔ اِس دنیا میں ایسا کوئی میکانزم نہیں جو لوگوں کو مجبور کرے کہ وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال نہ کریں۔ چنانچہ پوری تاریخ میں ہمیشہ یہ ہوتا رہا کہ افراد نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کرکے پورے نظام کو غلط رُخ پر ڈال دیا اور ابتدائی مُصلح کے پورے نقشے کو تباہ کرڈالا۔

فلسفی افلاطون نے اپنے زمانے کے بادشاہ سکندر اعظم (Alexander the Great) کو شہزادگی کے زمانے میں تربیت دے کر تیار کیا کہ وہ افلاطون کے آئڈیل اسٹیٹ کو قائم کرے۔ لیکن سکندر اعظم جب بڑا ہوا تو اس نے افلاطون کی تعلیم کو چھوڑ کر اپنی پسند کا راستہ اختیار کرلیا۔

جرمن فلسفی کارل مارکس (وفات: 1883) کے اقتصادی نظریات کی بنیاد پر کمیونسٹ پارٹی بنی۔ لینن اور اسٹالن کی قیادت کے تحت، کمیونسٹ پارٹی کی حکومت بھی زمین کے بڑے رقبے پر قائم ہوگئی۔ لیکن یہ حکومت مکمل طور پر ناکام رہی۔ کمیونسٹ لیڈر ٹراٹسکی (Trotsky leon) نے کمیونسٹ نظام کی اِس ناکامی کو خود کمیونسٹ لیڈروں کی غدّاری کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اِس موضوع پر ٹراٹسکی نے ایک کتاب شائع کی جس کا ٹائٹل یہ تھا:

Revolution — Betrayed

جرمن سائنس داں آئن سٹائن (Albert Einstein) نے جوہری توانائی (atomic energy) کو دریافت کیا۔ اِس دریافت میں عظیم مثبت فائدہ چھپا ہوا تھا، لیکن پولٹکل لیڈروں نے جوہری توانائی کی دریافت کو لے کر ایٹم بم بنا ڈالا اور ساری دنیا میں جنگی تیاری کا جنون پیدا کردیا۔

انڈیا کے لیڈر مہاتما گاندھی نے زبردست جدوجہد کے ذریعے انڈیا کو انگریزوں سے آزاد

کرایا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ آزادی کے بعد انڈیا میں ایسا سماج بنایا جائے گا جو انسانی خدمت اور سیوا پر مبنی ہوگا۔ اِس مقصد کے لیے انھوں نے ایک ماڈل بستی کے طور پر مہاراشٹر میں ''سیوا گرام'' بنایا۔ مگر آزادی کے بعد مہاتما گاندھی کے تمام ساتھی، سیوا کے نظریے کو چھوڑ کر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی طرف دوڑ پڑے۔ انھوں نے گاندھی کی نصیحتوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ اِس منظر کو دیکھ کر مہاتما گاندھی نے کہا — اب میری کون سنے گا

اِس قسم کے واقعات تمام مصلحین کے ساتھ پیش آئے۔ اِن تمام واقعات کا مشترک سبب یہ تھا کہ انسان نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کر کے ہر اصلاحی اسکیم کو تہہ و بالا کر دیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کبھی بھی کوئی اصلاحی اسکیم اپنے مطلوب معیاری معنوں میں کامیاب نہ ہوسکی۔

2۔ انسان کا دوسرا المیہ یہ ہے کہ قانونِ فطرت کے تحت، ہر انسان کنڈیشننگ کا کیس ہے۔ اِس بنا پر ہر انسان درست سوچ (right thinking) سے محروم رہتا ہے۔ وہ کنڈیشنڈ شخصیت کے ساتھ جیتا ہے اور کنڈیشنڈ شخصیت کے ساتھ ہی مرجاتا ہے۔ اپنی عدم واقفیت کی بنا پر اس کو کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ وہ اپنے کنڈیشنڈ مائنڈ کی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ ہر آدمی اپنی سوچ اور اپنے جذبات کے اعتبار سے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے، مگر اپنی بے خبری کی بنا پر وہ اِسی مصنوعی شخصیت کو اصل شخصیت سمجھ لیتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں پہلی بار انسان نے کنڈیشننگ کے اِس معاملے کو جانا۔ امریکا کے پروفیسر جے بی واٹسن (John Broadus Watson) نے لمبی تحقیق کے بعد 1925 میں اپنی کتاب بہیویرازم (Behaviourism) شائع کی۔ اِسی کتاب کے نام پر نفسیات میں بہیویرسٹ اسکول (Behaviourist School) قائم ہوا، جو اتنا عام ہوا کہ عرصے تک دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں وہ علم النفس کے نصاب کے طور پر پڑھایا جاتا رہا۔

لیکن پروفیسر واٹسن کی یہ دریافت صرف ایک ادھوری دریافت تھی۔ اِس دریافت کے مطابق، کنڈیشنڈ انسان ہی اصل انسان تھا۔ اِس نفسیاتی اسکول میں یہ مان لیا گیا کہ جو چیز انسان کی شخصیت کی تشکیل

کرتی ہے وہ اس کا پیدائشی نیچر نہیں ہے، بلکہ وہ بعد از پیدائش اس کے ماحول کا نرچر (nurture) ہے، مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ کنڈیشننگ کا یہ معاملہ انسان کے لیے ایک امتحان ہے۔ ہر انسان کو اپنی تعمیر شخصیت کے لیے یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے کنڈیشنڈ مائنڈ کی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ قدرت نے پیاز کی صورت میں اِس معاملے کا ایک نمونہ انسان کے لیے رکھ دیا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، پیاز میں ایک کے بعد ایک پرتیں (layers) ہوتی ہیں۔ اِن پرتوں کو ہٹایا جائے تو آخر کار اس کا اصل مغز سامنے آجائے گا۔

ایسا ہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان کی اصل شخصیت وہ ہے جو فطرت کی طرف سے اس کو پیدائشی طور پر ملتی ہے، پھر خارجی ماحول سے اس کے اوپر کنڈیشننگ کی پرت چڑھتی رہتی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ باشعور ہونے کے بعد اپنی ڈی کنڈیشننگ کر کے وہ ان خارجی پرتوں کو ہٹائے، یہاں تک کہ فطری انسان سامنے آجائے۔

ہر انسان پیدائشی طور پر مسٹر نیچر ہے، لیکن ماحول کے اثر سے وہ مسٹر کنڈیشنڈ بن جاتا ہے۔ ایسا خدا کے تخلیقی نظام کے تحت ہوتا ہے۔ انسان کو خدا نے شعور اور آزادی کی صلاحیت بخشی ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے شعوری فیصلے کے تحت، اپنی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ وہ اپنے آپ کو دوبارہ انسانِ فطری (Mr. Nature) بنائے۔ یہی انسان کا امتحان ہے، اور اِس امتحان میں کامیاب ہونے والوں ہی کے لیے خدا نے اپنے ابدی انعامات کا اعلان کیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان کی کنڈیشننگ ہوتی ہے، مگر پوری معلوم تاریخ میں ڈی کنڈیشننگ کا نظریہ کبھی موجود نہیں رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قانونِ فطرت کے تحت، ہر زمانے میں لوگوں کی کنڈیشننگ ہوتی رہی، لیکن عدم واقفیت کی بنا پر وہ اپنی ڈی کنڈیشننگ نہ کر سکے۔ ایسی حالت میں محفوظ طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پوری تاریخ ایسے افراد سے خالی ہے جو اپنی ڈی کنڈیشننگ کر کے اپنے آپ کو مسٹر نیچر بنا سکے ہوں۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ تاریخ کے تمام مفکرین اور فلاسفہ اپنے اصلاحی یا فکری کردار کو ادا کرنے کے لیے نااہل تھے۔ وہ اِس مقصد کے لیے تیار ذہن (prepared mind) کی

حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

تمام فکری نظاموں میں اسلام اِس معاملے میں ایک استثنا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں سے ایک بنیادی تعلیم وہ ہے جس کو تزکیہ (purification) کہا جاتا ہے۔ تزکیہ کسی پُراسرار چیز کا نام نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تزکیہ اُسی عمل کا نام ہے جس کے لیے ہم نے ڈی کنڈیشننگ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنا محاسبہ (introspection) کرے۔ وہ اپنی فکری اورنظریاتی غلطیوں کو ڈھونڈ کرنکالے اوران کی اصلاح کرے۔ یہ عمل تمام تر ایک ذہنی عمل ہے۔ آدمی بے لاگ طور پر اپنے اوپر نظرثانی کرتا ہے۔ یہ عمل مسلسل طور پر ساری عمر جاری رہتا ہے۔ اِس طرح آدمی تزکیہ کے عمل کے ذریعے اپنی اصلاح کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایک مزکّٰی اور مطہّر شخصیت (purified personality) بن جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کے لفظ کو ڈی اسٹریسنگ (de-stressing) کے ہم معنٰی لفظ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اِس استعمال کے اعتبار سے ڈی کنڈیشننگ کا مطلب ہوتا ہے ذہنی تناؤ کو ختم کرنا۔

مگر میرے نزدیک یہ ڈی کنڈیشننگ کے لفظ کا نادرست استعمال ہے۔ میرے نزدیک ڈی کنڈیشننگ سے مراد یہ ہے کہ پروفیسر واٹسن کے تصور کے مطابق، کنڈیشننگ کے ساتھ برعکس عمل کیا جائے۔ جس کنڈیشننگ کو پروفیسر واٹسن نے حتمی سمجھ لیا تھا، اس کو حتمی نہ سمجھتے ہوئے فکری عمل کے ذریعے اس کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے، اسی کا نام ڈی کنڈیشننگ ہے۔ میرے علم کے مطابق، مفکرین نے اگرچہ ڈی کنڈیشننگ کو اِس مخصوص معنی میں استعمال نہیں کیا ہے، لیکن میرے نزدیک ڈی کنڈیشننگ کا صحیح ترین مفہوم یہی ہے۔

اِس موضوع پر ایک بار میری گفتگو ایک کمیونسٹ پروفیسر سے ہورہی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ڈی کنڈیشننگ کو ہم بھی مانتے ہیں، مگر ہم اس کو ڈی کلاسنگ (de-classing) کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ڈی کنڈیشننگ، اور ڈی کلاسنگ دونوں بالکل الگ الگ اصطلاحیں ہیں۔ ڈی کلاسنگ ایک

سماجی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے — بے طبقاتی سماج (classless society) بنانا۔ مگر ڈی کنڈیشننگ مکمل طور پر ایک نفسیاتی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے ذہن کی فکری آلودگی کو دور کرکے ذہن کو دوبارہ خالص فطری حالت پر لے جانا۔

3۔ اِس معاملے میں تیسری چیز وہ ہے جس کو اِفادی نظریہ (Utilitarianism) کہا جاتا ہے۔ انسان ہمیشہ سے مادّی مفادات کا طالب رہا ہے۔ مگر موجودہ زمانے میں اِس تصور نے با قاعدہ فلسفے کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اِسی فلسفے کو یوٹلٹیرین ازم کہا جاتا ہے۔ اِس افادی فلسفے کو پہلے برطانوی فلسفی بنتھم (Jeremy Bentham) نے پیش کیا تھا۔ بنتھم 1748 میں انگلینڈ میں پیدا ہوا، اور 1832 میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد اِس افادی فلسفے کو انیسویں صدی کے مشہور فلسفی جان اسٹوارٹ مِل (John Stuart Mill) نے، اور دوسرے فلسفیوں نے آگے بڑھایا، یہاں تک کہ عملاً یہ فلسفہ جدید دنیا کا سب سے بڑا فلسفہ بن گیا۔ آج شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام انسان اِسی فلسفے کے تحت سوچتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔

یوٹلیٹیرین اسکول میں بہت سے نام شمار کیے جاتے ہیں، اور ان کے درمیان بعض ظاہری اختلافات بھی ہیں، مگر عملاً یہی فلسفہ آج کی دنیا کا سب سے بڑا فلسفہ ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر آج تمام دنیا کے لوگ اس فلسفے کو قبول کیے ہوئے ہیں۔ وہ چیز جس کو مادّیت (materialism) کہا جاتا ہے، وہ دراصل یوٹلیٹرین ازم ہی کا دوسرا نام ہے۔

یوٹلیٹرین اسکول، یا میٹیریلسٹ اسکول کے مطابق، موجودہ دنیا ہی وہ جگہ ہے جہاں آدمی اپنی تمناؤں اور خواہشوں کو پورا کرسکتا ہے۔ ویبسٹر کے مطابق، اس نظریے کی سادہ تعریف یہ ہے:

The doctrine that the worth or value of anything is determined solely by its utility.

یوٹلیٹرین ازم کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ وہی چیز ہے جس کو عوامی زبان میں اِس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ — کھاؤ، پیو اور خوش رہو:

Eat, drink and be merry.

یہ تصور دنیا کی ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ اِسی تصور کو ہندستان کے شہنشاہ بابر (وفات: 1530) نے اپنے ایک شعر میں اِس طرح بیان کیا تھا— بابر بہ عیش کوش کہ عالَم دوبارہ نیست!

مگر پوری تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ نشانہ قابلِ حصول نہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہر آدمی سو سال سے کم مدّت کے لیے موجودہ دنیا میں جینے کا موقع پاتا ہے۔ اِس محدود مدّت میں اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنی آرزوؤں کے مطابق، یہاں اپنی مطلوب دنیا بنا سکے، ایسی آرزوئیں جو کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے لامحدود حیثیت رکھتی ہیں۔ طرح طرح کی رکاوٹیں اس کا راستہ روک دیتی ہیں۔ حادثات اور بیماری اور دوسرے ناموافق اسباب اس کے لیے اپنے منصوبے کی تکمیل میں فیصلہ کُن رکاوٹ بن جاتے ہیں اور اگر بالفرض کوئی شخص اپنی خواہشوں کا ایک محل بنالے، تب بھی بہت جلد ایسا ہوتا ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر موت آتی ہے اور یک طرفہ فیصلے کے تحت، اس کی خواہشوں کے محل کو ڈھا دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ فطرت کے مقرر نقشے کے مطابق، انسان کی زندگی دو دَورں میں تقسیم ہے— موت سے پہلے، اور موت کے بعد۔ موت سے پہلے کا زمانہ عمل کرنے کا زمانہ ہے اور موت کے بعد کا زمانہ اپنے عمل کے مطابق، اس کا انجام پانے کا زمانہ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ امتحان ہال، کسی اسٹوڈنٹ کے لیے ٹسٹ دینے کی جگہ ہے، اور امتحان ہال کے باہر کی دنیا جاب (job) حاصل کرنے کی دنیا۔ جو لوگ موت سے قبل کی دنیا میں اپنی تمناؤں کا محل بنانا چاہتے ہیں وہ اُس طالبِ علم کی مانند ہیں جو امتحان ہال کے اندر اپنے لیے جاب تلاش کرنے لگے، حالاں کہ ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔

پہلی عالمی جنگ جب ہوئی تو اُس وقت انگریز، انڈیا کے اوپر حکومت کر رہے تھے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد انھوں نے نئی دہلی کے علاقے میں ایک شان دار دنیا تعمیر کی۔ اس میں وہ وسیع محل بھی شامل تھا جس کا نام اُس وقت ''وائس رِگل لاج'' رکھا گیا تھا، اور اب اس کو ''راشٹر پتی بھون'' کہا جاتا ہے۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ وہ اِس شان دار دنیا میں ابدی طور پر پُرعیش زندگی گزار سکیں گے، مگر ایسا نہ ہوسکا۔ دوسری عالمی جنگ نے ان کے سنہرے خواب کو درہم برہم کر دیا۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد ایک فرانسیسی مدبّر نئی دہلی آیا تھا۔ اس نے انگریزوں کی بنائی ہوئی اِس خوش نما دنیا کو دیکھا تو اس نے کہا کہ — انھوں نے کیسی شاندار دنیا بنائی، صرف اس لیے کہ ایک دن وہ اس کو چھوڑ دیں:

What a magnificent world they built to leave.

انگریزوں سے پہلے دہلی میں مغل خاندان کا راج تھا۔ 1857ء میں ان کی حکومت ختم ہوگئی۔ دہلی میں ان کی چھوڑی ہوئی شان دار عمارت ''لال قلعہ'' کی شکل میں موجود ہے۔ لال قلعہ کے ایک حصے میں میوزیم ہے۔ اِس میوزیم میں جو چیزیں موجود ہیں، اُن میں سے ایک وہ ٹوٹا ہوا پتھر ہے جس کے اوپر یہ فارسی شعر کندہ ہے — آسمان کے نیچے ان کی سلطنت ہمیشہ باقی رہے:

ہمیشہ باد بہ زیرِ سپہرِ بُوقلموں!

اس ٹوٹے ہوئے پتھر کے ساتھ جو تشریحی عبارت لکھی ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پتھر ایک قدیم محل میں نصب تھا۔ وہ محل اب بالکل مٹ چکا ہے۔ اس کا یہ پتھر یادگار کے طور پر لال قلعہ کے میوزیم میں رکھ دیا گیا ہے۔

یہی معاملہ پوری تاریخ میں تمام انسانوں کا ہوا ہے۔ ہر چھوٹے بڑے انسان نے اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے اپنا محل بنانے کی کوشش کی، مگر کسی کے لیے بھی اس کا محل آرزوؤں کی تکمیل کا محل نہ بن سکا۔ یہ تاریخی تجربہ بتاتا ہے کہ یوٹپیٹرین ازم کا نظریہ ایک غیر فطری اور غیر واقعی نظریہ ہے۔ یہ ایک ناممکن کو حاصل کرنے کی کوشش ہے، جو موجودہ دنیا میں کبھی کسی کے لیے واقعہ نہیں بنی اور نہ آئندہ وہ کسی کے لیے واقعہ بن سکتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ یوٹپیٹرین ازم کا نظریہ خدا کے تخلیقی نقشے کے خلاف ہے۔ خدا نے انسان کو ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس کی مدتِ حیات (life span) کو اس نے دو مختلف حصوں میں بانٹ دیا۔ اس کا مختصر حصہ، قبل از موت دنیا میں رکھا گیا اور اس کا بقیہ تمام حصہ، بعد از موت کی زندگی میں رکھ دیا گیا ہے۔ قبل از موت کا عرصۂ حیات ٹسٹ کے لیے ہے اور بعد از موت کا عرصۂ حیات اپنی

کارکردگی کے مطابق، انعام پانے کے لیے۔

یہ ٹسٹ کیا ہے۔ یہ ٹسٹ بنیادی طور پر یہ ہے کہ آدمی اختیار کے باوجود اپنے کو بے اختیار بنا لے، وہ آزادی کے باوجود اپنی آزادی کا غلط استعمال نہ کرے۔ وہ سب کچھ کرنے کی طاقت رکھنے کے باوجود خدا کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کرے۔

دنیا میں انسان کو اگرچہ کامل آزادی دی گئی ہے، لیکن اِسی کے ساتھ وہ ایک کمزور مخلوق کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً وہ حادثے کا شکار ہوتا ہے، وہ بیمار ہوتا ہے، وہ بوڑھا ہوتا ہے، وہ لامحدود طور پر اپنی خواہشوں کو پورا نہیں کر پاتا۔ طرح طرح کے ناموافق حالات اس کے لیے رُکاوٹ بن جاتے ہیں، یہاں تک کہ آخر کار وہ بے بسی کے ساتھ مر جاتا ہے۔ یہی تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ ہر انسان، خواہ وہ کوئی بھی ہو، بیک وقت کمزوری اور آزادی دونوں کا مجموعہ بنا رہتا ہے۔ کوئی بھی ایسا نہیں کر پاتا کہ وہ اپنی آزادی سے اپنی کمزوری کو جدا کر سکے۔

جنت نہ صرف ابدی ہوگی بلکہ وہ ایک ایسی کامل جگہ ہوگی جہاں ہر قسم کی محدودیت (limitations) کو ختم کر دیا گیا ہوگا، جہاں آدمی نہ صرف آزاد ہو بلکہ وہ اپنی ہر قسم کی آرزوؤں کو پورا کرنے کے مواقع بھی رکھتا ہو۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ جنت کو جنت میں عظیم اقتدار (great kingdom) حاصل ہوگا (76:20) اسلامی تصور کے مطابق، جنت مکمل طور پر فساد سے پاک ہوگی۔ ایسی حالت میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ جنت میں کوئی ایسا شخص جگہ نہیں پا سکتا جو اپنے اقتدار کو فساد کے لیے استعمال کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت کے اِس ماحول میں صرف اُن لوگوں کو داخل کیا جائے گا جو موت سے پہلے کے عرصۂ حیات میں یہ ثابت کر چکے ہوں کہ وہ اتنے زیادہ باشعور ہیں کہ کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی انھیں اِس پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ وہ اپنے اقتدار کو کسی معمولی درجے میں بھی فساد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہر لمحہ موجود رہتے ہیں جو اس کی زندگی کے

ہر واقعے کو رکارڈ کرتے رہتے ہیں، خواہ وہ نیت ہو، یا قول، یا عمل۔ اس معاملے کو اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ فرشتے ہر لمحہ انسان کی نگرانی کررہے ہیں۔ اگر وہ صحیح کام کرتا ہے تو وہ اپنے رجسٹر پر اس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھ دیتے ہیں کہ یہ شخص جنت کا مستحق ہے:

He is a deserving candidate for Paradise.

اس کے برعکس، اگر وہ دیکھتے ہیں کہ آدمی غلط کام کررہا ہے تو وہ اپنے رجسٹر میں یہ اندراج کرلیتے ہیں کہ — یہ شخص جنت میں داخلے کا استحقاق نہیں رکھتا:

He is not a deserving candidate for Paradise.

یہی تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ ہر عورت اور مرد کا معاملہ اسی قانونِ الٰہی کے تحت ہے۔ کامیاب انسان وہ ہے جو اِس حقیقت کو ہر وقت اپنے سامنے رکھے اور دنیا میں انتہائی محتاط زندگی گزارے۔ اِس کے برعکس، وہ لوگ ناکام ہیں جو اِس حقیقت کو بھلا کر زندگی گزاریں اور نتیجۃً ابدی تباہی میں مبتلا ہوکر رہ جائیں۔

بغیر ہدایت

نظریۂ ارتقا کو ماننے والے لوگ زمین پر انسان کی تاریخ کو لاکھوں سال قدیم بتاتے ہیں، لیکن تاریخ کے رکارڈ کے مطابق، زمین پر انسان کی عمر بہ مشکل پچیس ہزار سال پیچھے تک جاتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو انسانی زندگی کے دو پہلوؤں میں بہت زیادہ فرق ملے گا — انسان نے مادّی چیزوں میں تو بہت زیادہ ترقی کی، لیکن انسانی علوم میں لمبی مدت گذرنے کے باوجود کوئی ترقی نہ ہوسکی۔ مٹیریل ترقی کا خواب انسان نے بڑی حد تک پورا کرلیا، لیکن ذہنی اور روحانی ترقی کی سمت میں ابھی تک کوئی قابلِ ذکر پیش قدمی نہ ہوسکی۔ اسی کا ایک اظہار درج ذیل کتاب ہے جو پہلی بار 1935 میں چھپی۔ اس کا نام یہ ہے: Dr. Alexis Carrel, *Man the Unknown*

اصل یہ ہے کہ ترقی کے لیے ہمیشہ گائڈ لائن کی ضرورت ہوتی ہے۔ مٹیریل ورلڈ یا فزکل ورلڈ کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی گائڈ لائن خود اِن اشیا کے اندر موجود ہے۔ تجربے کے ذریعے اس قانون کو دریافت کرکے ترقی کا سفر جاری رکھا جاسکتا ہے۔

مثلاً سواری کے میدان میں یہ ہوا کہ پہلے انسان گھوڑے پر سواری کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے پہیے دار گاڑی بنائی۔ اس کے بعد سمندری جہاز بنائے گیے۔ پھر اس نے بائسکل تیار کی۔ اس کے بعد موٹر کار بنی اور پھر ہوائی جہاز اور راکٹ تیار کیے گیے۔ اِن تمام سواریوں کو بنانے کے لیے گائڈ لائن لا آف نیچر کی صورت میں خود اُن چیزوں کے اندر موجود تھی جس کو استعمال کرکے مختلف قسم کی سواریاں بنائی گئیں۔ مگر انسان کے بارے میں سب کچھ لامعلوم تھا۔ مثال کے طور پر انسان جب پیدا ہوتا ہے اور سماج کے اندر رہنا شروع کرتا ہے تو اس کے ذہن کی کنڈیشننگ ہونے لگتی ہے، یہاں تک کہ ہر آدمی مسٹر کنڈیشنڈ بن جاتا ہے، یہ کنڈیشننگ، آدمی کو اس قابل نہیں رکھتی کہ وہ اپنی دنیا کے بارے میں بے آمیز رائے قائم کرسکے۔ مگر یہ حقیقت صرف بیسویں صدی کے رُبع اوّل میں معلوم ہوسکی اور وہ بھی صرف پچاس فیصد۔ یہ واقعہ پھر بھی لامعلوم رہا کہ کنڈیشنڈ مائنڈ کی ڈی کنڈیشننگ کرکے اس کو دوبارہ فطری سوچ پر لایا جاسکتا ہے۔

قرآن خدا کی کتاب ہے۔قرآن کی اصل حیثیت یہی ہے کہ وہ انسان کے لیےایک قابل اعتماد گائڈلائن ہے۔مذکورہ سوال کا جواب قرآن کی اِس آیت پرغور کرنے سے معلوم ہوتا ہے: **ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علمٍ ولا ھدًی ولا کتاب منیر** (22:8)۔

اِس آیت پرغور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی سائنس میں ناکامی کا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے گائڈنس کے بغیر انسانی زندگی کو سمجھنا چاہا اوراس کی تشکیل کرنے کی کوشش کی۔ یہی واحد وجہ ہے جس کی بنا پرانسانی سائنس ترقی سے محروم رہی۔ کیوں کہ جب گائڈنس موجود نہ ہوتو آدمی کو اپنےعمل کا نقطہ آغاز ہی نہیں ملے گا، اور جب حقیقی نقطہ آغاز کو جانے بغیرسفرشروع کیا جائےتو ایسا سفر کبھی اپنی منزل تک پہنچنے والانہیں۔

خالق کےتخلیقی نقشے کوجانے بغیر

کسی پیچیدہ مشین کو بنانے والاانجینئر ہی اس کی گائڈبک دے سکتا ہے، یہی معاملہ موجودہ دنیا کا ہے۔موجودہ دنیا کوخدا نے اپنےتخلیقی نقشے کےمطابق بنایا ہے۔ یہ تخلیقی نقشہ زندگی کی حقیقی تعمیر کے لیےضروری ہے۔ خالق کےتخلیقی نقشے کوجانے بغیرزندگی کا جوتصور قائم کیا جائے گا، وہ حقیقتِ واقعہ کےمطابق نہ ہوگا۔اور جومنصوبہ حقیقتِ واقعہ کےمطابق نہ ہواس کے لیے ناکامیابی یقینی ہے۔

خدا کی کتاب قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدانے اِس دنیا کوٹسٹ کے لیے بنایا ہے۔اس دنیا سےانسان کےتعلق کی نوعیت وہی ہے جوامتحان ہال سے ایک طالب علم کی ہوتی ہے۔امتحان ہال میں کوئی طالب علم اس لیے جاتا ہے کہ وہاں وہ مطلوب ٹسٹ دے کراپنے آپ کواس بات کا اہل ثابت کرے کہ امتحان ہال کے باہر کی دنیامیں وہ جگہ پانے کا مستحق ہے۔

اسی طرح موجودہ دنیاانسان کے لیےخدائی ٹسٹ دینے کی جگہ ہے۔موت سے پہلے کی اِس دنیامیں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ ٹسٹ میں اپنے آپ کوکامیاب ثابت کرے،تاکہ موت کے بعد کی دنیا میں وہ خداکےابدی انعامات کا مستحق قرار پائے۔

انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ خدا کی گائڈبک کے ذریعے دنیا کے بارے میں خداکےتخلیقی نقشے کو

جانے، اور اس سے مطابقت کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔ جو لوگ ایسا کریں وہی کامیاب انسان ٹھیریں گے اور جو لوگ ایسا نہ کریں وہ ناکام ہو کر رہ جائیں گے۔

آئڈیل زندگی کی تعمیر

مشہور یونانی فلسفی افلاطون (Plato) تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے یونان میں پیدا ہوا۔ اس کا نشانہ یہ تھا کہ یونان میں ایک اسٹیٹ بنائی جائے جو ہر اعتبار سے آئڈیل ہو۔ اس نے اپنے کتاب آئڈیل اسٹیٹ (Ideal State) میں اس کا نقشہ پیش کیا۔ اس کے نزدیک آئڈیل اسٹیٹ بنانا پوری طرح ممکن تھا۔ افلاطون یونان کے شاہی خاندان کا معلم تھا۔ اِس طرح اس کو موقع مل گیا کہ وہ شہزادوں کی تعلیم وتربیت کر کے ایسا مطلوب سیاسی کردار تیار کرے جو اس کی اسٹیٹ میں وہ رول ادا کر سکے جس کو اس نے فلاسفر کنگ (Philosopher King) کا نام دیا تھا۔ مگر افلاطون کی مفروضہ آیڈیل اسٹیٹ کبھی قائم نہ ہو سکی۔

اِس کا سبب یہ نہ تھا کہ اس کے شاگرد سکندر اعظم نے بعد کے مرحلے میں اس کی پیروی نہ کی، بلکہ اس کا سبب فطرت کے تخلیقی نقشے سے بے خبری تھی۔ خدا نے یہ دنیا اس لیے نہیں بنائی کہ یہاں آئڈیل اسٹیٹ بنائی جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، آئڈیل اسٹیٹ اِس دنیا میں بنانا ممکن ہی نہیں۔ افلاطون نے ایک ناقابلِ عمل منصوبے کو عمل میں لانا چاہا، اس لیے وہ ناکام ہو کر رہ گیا۔ خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، اگر وہ کسی عملی منصوبے کو زیرِ عمل لانے کی کوشش کرتا تو ضرور وہ کامیاب ہو سکتا تھا۔

ڈی کنڈیشننگ کے بغیر تفکیری عمل

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كلُّ مولود يولد على الفطرة، فأبواه يهوّدانه أو ينصّرانه، أو يمجّسانه (صحیح البخاری، کتاب الجنائز) یعنی ہر پیدا ہونے والا اپنی اصل فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا مسیحی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

اس حدیثِ رسول میں جو بات کہی گئی ہے وہ اب خود سائنسی ریسرچ کے تحت ثابت ہو چکی ہے۔ اب خالص علمی طور پر یہ مان لیا گیا ہے کہ کوئی عورت یا مرد جس ماحول میں پرورش پاتے ہیں، اُس ماحول کے

مطابق، ان کے ذہن کی کنڈیشننگ ہوجاتی ہے۔ یہ اصول اتنا زیادہ عام ہے کہ کوئی بھی شخص اس سے مستثنیٰ نہیں۔ کنڈیشننگ کا یہ عمل غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔ چناں چہ یہ پراسس ہر آدمی کے ذہن میں جاری رہتا ہے اور کوئی آدمی بطورِ خود یہ جان نہیں پاتا کہ اس کے ذہن میں مسلسل طور پر کنڈیشننگ کا عمل جاری ہے۔

کنڈیشننگ کا یہ معاملہ پہلی بار بیسویں صدی کے آغاز میں سامنے آیا۔ امریکا میں نفسیات کے پروفیسر واٹسن (J.B. Watson) نے اِس موضوع پر لمبی تحقیق کے بعد 1925 میں اپنی مشہور کتاب بہیویرازم (Behaviourism) چھاپی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہر آدمی لازمی طور پر کنڈیشننگ کا معمول بنتا ہے، کوئی بھی انسان اس سے بچ نہیں سکتا۔ واٹسن کا یہ نظریہ اتنا مقبول ہوا کہ عرصے تک وہ یونیورسٹیوں میں نفسیات کے نصاب میں پڑھایا جاتا رہا۔

لیکن واٹسن کے نظریے میں ایک بھیانک کمی تھی۔ اس نے یہ فرض کرلیا کہ یہ کنڈیشننگ جو ہوتی ہے، وہی اصل صورت حال ہے۔ اس نظریے کے مطابق، انسانی شخصیت کی تشکیل وتعمیر نیچر (nature) سے نہیں ہوتی بلکہ نرچر (nurture) سے ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جو آدمی جیسا بن گیا، وہی اس کی ابدی شخصیت ہے۔ اس کو دوبارہ اس کی ابتدائی فطرت کی طرف نہیں لوٹایا جاسکتا۔

یہ نظریہ اگرچہ بیسویں صدی کے آغاز میں پیش کیا گیا، لیکن عملاً وہ پوری تاریخ پر چھایا رہا۔ پچھلے ہزاروں سال کے درمیان جو عورت اور مرد پیدا ہوئے، وہ سب اِس حقیقت سے بے خبر رہے کہ ان کے لیے تفکیری عمل کا آغاز یہ ہے کہ وہ اپنے کنڈیشنڈ مائنڈ کی ڈی کنڈیشننگ کریں، وہ اپنے ذہن کے اوپر سے مصنوعی پردوں کو ہٹا کر اپنے آپ کو اپنی اصل فطرت کی طرف واپس لے جائیں۔ خالق نے خارجی دنیا میں پیاز کی صورت میں اس معاملے کی ایک مادّی مثال رکھ دی تھی۔ پیاز اشارے کی زبان میں لوگوں کو بتا رہی تھی کہ پہلے اپنے ذہن کے خارجی پردوں کو ہٹاؤ، اس کے بعد ہی تم چیزوں کو اُن کی بے آمیز صورت میں سمجھ سکتے ہو۔ مگر انسان نے نہ پیاز کی اس مثال سے سبق سیکھا، اور نہ پروفیسر واٹسن اور ان کے ہم نوا اِس حقیقت کو دریافت کرسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ بے خبری کے راستے پر چلتی رہی۔

مثال کے طور پر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو تمام سیاسی، یا غیر سیاسی تحریکیں ردّ عمل کی

تحریکیں نظر آتی ہیں۔ روسو کی تحریک، بادشاہت کے خلاف ردّعمل کی تحریک تھی۔ مارکس کی تحریک سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ردعمل کی تحریک تھی۔ جمال الدین افغانی کی تحریک مغربی استعمار کے خلاف ردعمل کی تحریک تھی۔ گاندھی کی تحریک برٹش اقتدار کے خلاف ردعمل کی تحریک تھی۔ آیت اللہ خمینی کی تحریک شاہ ایران کے خلاف ردعمل کی تحریک تھی۔ سید قطب کی تحریک یہودیوں کی زائن ازم (Zionism) کے خلاف ردعمل کی تحریک تھی، وغیرہ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ردعمل کی تحریک ہمیشہ منفی ذہن کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آدمی کسی کے بارے میں نفرت میں مبتلا ہوتا ہے اور پھر وہ اس کے خلاف ردعمل کی تحریک چلانے لگتا ہے۔ یہی پوری انسانی تاریخ کی کہانی ہے۔ تمام عورت اور مرد کسی نہ کسی اعتبار سے نفرت میں جیتے رہے، وہ مثبت نفسیات میں جینے والے نہیں بنے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ کنڈیشننگ کے معاملے سے بے خبر تھے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ نہ سکے کہ اپنے ذہن کی ڈی کنڈیشننگ کے بغیر وہ حقائق کو بے آمیز صورت میں دیکھ نہیں سکتے، جب کہ حقائق کو بے آمیز صورت میں دیکھنا ہی مثبت طرز فکر کی پہلی شرط ہے۔

ذہنی انقلاب کے بغیر روحانیت

روحانیت (spirituality) ہمیشہ سے انسان کی دل چسپی کا موضوع رہا ہے۔ اس کے نام ہر حلقے میں الگ الگ لیے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً مسٹسزم (Mysticism) اور مراقبہ (Meditation) اور تصوّف (Sufism)، وغیرہ۔ روحانیت کے محاذ پر ہزاروں سال سے زبردست سرگرمیاں جاری ہیں، مگر ابھی تک ان سرگرمیوں کا کوئی حقیقی فائدہ حاصل نہ ہوسکا۔ تمام کوششوں اور ریاضتوں کے بعد جو چیز حاصل ہوئی، وہ صرف بے شعور وجد (ecstasy) ہے، نہ کہ روحانی ارتقا جو کہ ان سرگرمیوں کا اصل مطلوب تھا۔

اصل یہ ہے کہ قدیم زمانے سے لوگ یہ ماننے لگے کہ انسان کا ذہن سوچ کا مرکز ہے، اور انسان کا دل جذبات وعواطف کا مرکز۔ کیوں کہ روحانیت کو عواطف کی نوعیت کی چیز سمجھ لیا گیا، اس لیے انسان ہمیشہ مبنی بَر قلب روحانیت (heart-based spirituality) پر عقیدہ رکھتا رہا۔ اس مفروضے کی بنیاد پر باقاعدہ فلسفہ وضع کیا گیا۔ یہ مان لیا گیا کہ انسان کا دل ہر قسم کے روحانی خزانوں کا

سرچشمہ ہے۔ اور دل میں چھپے ہوئے احساسات کو جگا کر روحانی فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔

لیکن موجودہ زمانے میں سائنسی تحقیقات نے اس مفروضے کو بے بنیاد ثابت کر دیا۔ اب یہ قطعیت کے ساتھ معلوم ہو چکا ہے کہ فکر اور جذبات دونوں کا واحد مرکز صرف انسان کا ذہن (mind) ہے۔ جہاں تک دل کا تعلق ہے، وہ صرف گردش خون (circualtion of blood) کا ذریعہ ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الرسالہ، نومبر 2004، صفحہ 23؛ جون 2005، صفحہ 6؛ فروری 2006، صفحہ 28؛ اگست 2006، صفحہ 33)

یہی وجہ ہے کہ ہزاروں سال کی روحانی ریاضت کے نتیجے میں انسان کو جو چیز ملی، وہ صرف وجد (ecstasy) تھا، نہ کہ روحانی بنیاد پر ذہنی ارتقا۔ اس قسم کی روحانیت دراصل، روحانیت کی ایک کم تر صورت (reduced form) ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں روحانی ارتقا۔

جیسا کہ معلوم ہے، وجد ایک مبہم کیفیت کا نام ہے، جب کہ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسا ذہن رکھتا ہے جس کے اندر سوچنے کی صلاحیت ہے۔ انسانی تاریخ کی تمام ترقیاں سوچ کی صلاحیت کو عمل میں لانے سے حاصل ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں، روحانیت اگر کوئی چیز ہے تو اس کو بھی ذہن کی سطح پر حاصل ہونا چاہیے۔ تمام انسانی ترقیوں کا سرچشمہ انسان کے ذہن میں تفکیری عمل ہے، اِسی طرح روحانی ترقی کا ذریعہ بھی تفکیری عمل کو ہونا چاہیے۔ روحانیت دراصل معرفتِ حقیقت کا اعلیٰ درجہ ہے، وہ مبہم بے خودی جیسے کوئی چیز نہیں۔ اس لیے حقیقی روحانیت وہی ہے جو کسی آدمی کو ذہن کی سطح پر حاصل ہو، نہ کہ قلب کی سطح پر۔

اس حقیقت سے بے خبری کی بنا پر ایسا ہوا کہ پوری تاریخ میں انسان حقیقی روحانیت کے حصول سے محروم رہا۔ اس نے جس چیز کو روحانیت سمجھا، وہ روحانیت نہیں تھی۔ اور جو اصل روحانیت تھی اس سے بے خبری کی بنا پر وہ اس کو حاصل کرنے کی طرف اپنا سفر ہی شروع نہ کر سکا۔ تاریخِ انسانی کا یہ شاید سب سے بڑا المیہ ہے، اس سے بڑا المیہ اور کوئی نہیں۔

انسانی تاریخ کے چار دور

Four Phases of Human History

خدا کے تخلیقی پلان (creation plan of God) کے مطابق، انسانی تاریخ کے چار دور ہیں۔ یہ چار ادوار گویا کہ انسانی معرفت کے چار ادوار ہیں۔ یہ ایک طویل ربانی سفر ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان خدا کی معرفت (realization of God) حاصل کرے، تا کہ اُس کو خدا کی ابدی جنت میں قیام کی سعادت حاصل ہو سکے۔

معرفت کیا ہے۔ معرفت خدا کی دریافت کا نام ہے جو بلاشبہہ سب سے بڑی حقیقت ہے۔ خدا سب سے زیادہ ظاہر بھی ہے، اور سب سے زیادہ مستور (the most obvious, the most unknown) بھی۔ معرفت کے حصول کے لیے انسان کو ایک پورا سمندر پار کرنا ہوتا ہے۔ جو لوگ اِس سمندر کو پار کرنے کا ثبوت دیں، وہی صاحب معرفت ہیں، اور انھیں کے لیے یہ مقدر ہے کہ وہ ابدی جنتوں میں داخل ہوں۔

جنت کی قیمت معرفت

قرآن کی سورہ الذاریات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وما خلقت الجنّ والإنس إلاّ لیعبدون** (51: 65) یعنی میں نے جن اور انسان کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے تا کہ وہ میری عبادت کریں۔ مجاہد تابعی (وفات: 722ء) نے حضرت عبداللہ بن عباس (وفات: 687ء) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اِس آیت میں عبادت سے مراد معرفت ہے: قال مجاہد إلاّ لیعبدون، أي إلاّ لیعرفوني (القرطبی، جلد 17، صفحہ 55) یعنی اِس آیت میں خدا کی عبادت سے مراد خدا کی معرفت ہے۔ یہی قول ابن جُریج تابعی (وفات: 767ء) سے بھی منقول ہے: قال ابنُ جُریج إلاّ لیعبدون، أي إلاّ لیعرفون (تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر، جلد 4، صفحہ 338)۔

اِس سلسلے میں ایک متعلق روایت بعض کتابوں میں آئی ہے۔ بعض محدثین نے اِس روایت پر

اس کی سند کے اعتبار سے کلام کیا ہے۔ لیکن سترھویں صدی عیسوی کے مشہور فقیہ علی بن محمد نور الدین ملاّ علی قاری (وفات: 1606ء) نے کہا کہ: لٰکن معناه صحيح، مُستفاد من قوله تعالیٰ: وما خلقتُ الجن والإنس إلا ليعبدون، أي ليعرفوني (کشف الخفاء، جلد 2، صفحہ 1011) یعنی اس کا مفہوم صحیح ہے، اور وہ اِس آیتِ قرآنی سے ماخوذ ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔

اِس روایت کے الفاظ یہ ہیں: كنتُ كنزاً مخفيا فأحببتُ أن أُعرف، فخلقتُ خلقاً فبي عرفوني (کشف الخفاء، رقم: 2016) یعنی میں ایک مخفی خزانہ تھا، پھر میں نے چاہا کہ مجھ کو جانا جائے، پھر میں نے انسان کو پیدا کیا، پھر انھوں نے مجھے جانا۔

اِس سے اور متعدد دوسرے حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان سے اصل مقصود یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کی معرفت (realization) حاصل کرے۔ یہی معرفت تمام انسانی کمالات کا سرچشمہ ہے۔ انسان کو جب حقیقی معنوں میں خدا کی معرفت حاصل ہوجائے تو اِس سے اُس کے اندر تمام خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہی اس کے لیے ہر قسم کے شر سے دور رہنے کا محرک بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معرفت ہی دینِ خداوندی کی اصل روح ہے۔

خدا نے اپنے تخلیقی پلان (creation plan) کے مطابق، اِس دنیا میں معرفت کے حصول کا اعلیٰ ترین انتظام کیا ہے۔ جو شخص اِس معاملے میں سنجیدہ ہو، وہ کبھی معرفت کے حصول سے محروم نہیں رہ سکتا۔ خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، اِس انتظام کے چار درجے ہیں۔ اِس اعتبار سے، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسانی تاریخ کے چار دور ہیں (phases) ہیں۔ ابتدائی تین دور سے گزرتے ہوئے اب انسانی تاریخ اپنے چوتھے دور میں داخل ہوچکی ہے۔ اِس کے بعد کوئی پانچواں دور نہیں۔ اِس کے بعد قیامت ہے اور ہر انسان کا اپنے ابدی انجام کے دور میں پہنچ جانا۔ تاریخ کے یہ چار دور حسب ذیل ہیں:

1. Realization at the level of unconsciousness
2. Realization at the level of consciousness
3. Realization through partial uncovering of the truth
4. Realization through total uncovering of the truth.

لاشعور کی سطح پر معرفت

قرآن میں ابتدائی انسان کے بارے میں جو باتیں بتائی گئیں ہیں، اُن میں سے ایک وہ ہے جس کو 'عہدِ الست' کہا جاتا ہے، یعنی پہلا خدائی عہد (first divine covenant)۔ اِس واقعہ کا ذکر قرآن کی سورہ نمبر سات میں آیا ہے۔ قرآن کی اِس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو گواہ ٹھیرایا خود اُن کے اوپر — کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں۔ یہ اِس لیے ہوا کہ کہیں تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم کو تو اِس کی خبر نہ تھی'' (7:172)

اِس آیت کے تحت، عبد اللہ بن عباس کی ایک روایت نقل ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ردّھم في أصلاب أبائهم حتى أخرجهم قرناً بعد قرن (الرد على الجهمية لابن منده، رقم الحديث: 38) یعنی خدا نے ذریت بنی آدم کو دوبارہ اُن کے آباء کے صُلب میں لوٹا دیا اور پھر مختلف ادوار میں وہ ان کو پیدا کرتا رہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا نے آغازِ حیات میں تمام انسانوں کو بیک وقت پیدا کیا، پھر اُن سے مذکورہ عہد لیا۔

یہ عہد کیا تھا۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے، یہ عہد معرفت کا عہد تھا۔ ابن جریر طبری نے اِس سلسلے میں اپنی تفسیر میں یہ روایت نقل کی ہے: قال ابن عباس... ثمّ أخذ عهودهم على الإيمان والمعرفة له (جامع البيان عن تأويل آي الفرقان، جلد 9، صفحہ 114) یعنی ذریتِ آدم کو پیدا کرنے کے بعد خدا نے اُن سے ایمان اور معرفت کا عہد لیا۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنی معرفت کو ہر انسان کے لاشعور میں داخل کر دیا۔ اب ہر انسان جو پیدا ہوتا ہے، وہ لاشعور کی سطح پر معرفتِ خداوندی کو لے کر پیدا ہوا ہے۔ اِس معاملے میں کسی عورت، یا کسی مرد کا کوئی استثنا (exception) نہیں۔

مگر تاریخ بتاتی ہے کہ آغازِ حیات سے اب تک بہت کم لوگ ایسے نکلے جو اپنے اِس لاشعور کو پڑھیں، جو اپنی فطرت کی اِس داخلی آواز کو سن سکیں۔ اِس فطری معاملے کی بنا پر ایسا تو ہوا کہ ہر شخص کسی

نہ کسی درجے میں حق کا متلاشی (seeker) بنا،لیکن بہت تھوڑے افراد کو چھوڑ کر،کوئی بھی اپنی تلاش کو اس کی آخری منزل تک نہ پہنچا سکا۔

اِس عمومی ناکامی کا سبب کیا ہے۔ اِس کا جواب قرآن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے۔قرآن کی سورہ القیامہ میں ارشاد ہوا ہے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ○ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (75:14-15) یعنی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر آپ گواہ ہے، خواہ وہ کتنے ہی عذر پیش کرے۔

اِس قرآنی بیان سے معلوم ہوا کہ انسان کی اِس ناکامی کا اصل سبب عُذرات (excuses) ہیں۔انسان کی داخلی فطرت ہر موقع پر اس کی خاموش رہنمائی کرتی ہے۔اِسی فطرت کو قرآن میں داخلی برہان (12:24) کہا گیا ہے۔لیکن انسان یہ کرتا ہے کہ وہ ایک عُذر (excuse) لے کر، فطرت کی اِس آواز کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص کسی زندہ یا مردہ ہستی کو بڑا مان کر اُس کی پرستش شروع کر دے گا۔ پھر اُس کا ربانی لاشعور اندر سے اس کو آواز دے گا کہ پرستش تو صرف خالق کا حق ہے،تم مخلوق کی پرستش کیوں کر رہے ہو۔مگر یہاں اس کا ذہن ایک خودساختہ عذر تلاش کر لے گا۔وہ کہے گا کہ میں اس زندہ یا مردہ ہستی کو خدا نہیں مانتا، بلکہ ان کو خدا کا مقرب مانتا ہوں۔یہ لوگ خدا کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے ہیں۔وہ میرے لیے خدا کے یہاں وسیلہ بن سکتے ہیں۔اس لئے میں ان کے آگے جھک کر ان کو راضی کر رہا ہوں، تاکہ وہ خدا کے یہاں میرے سفارشی بن سکیں۔

اِس قسم کا عذر بلاشبہہ ایک بے بنیاد عذر ہے۔وہ ہرگز خدا کے یہاں قبول کیا جانے والا نہیں۔ لیکن بے شمار لوگ ایسے ہیں جو اِس قسم کے خودساختہ خیال میں جیتے رہے اور اسی میں مر گئے۔

اسی طرح ایک شخص کسی معاملے میں ایک آدمی کے اوپر غصہ ہو جائے گا۔وہ اس سے انتقام لینا چاہے گا۔اب اس کے اندر کی خدائی آواز اس کو پکارے گی اور کہے گی کہ انتقام لینا ایک گناہ کا کام ہے۔تم اُس شخص سے درگزر کا معاملہ کرو اور اس کو معاف کر دو۔مگر اس کا ذہن فوراً ایک عذر تلاش

کرلے گا۔ وہ کہے گا کہ ایسے آدمی کو سبق سکھانا ضروری ہے۔ اگر تم اِس وقت خاموش ہوگئے تو وہ اور دلیر ہوجائے گا اور تمھارے خلاف مزید کارروائی کرے گا۔

یہ عذر بھی ایک بے بنیاد عذر ہے۔ ایسا عذر کبھی خدا کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ لیکن بے شمار لوگ اِس خود ساختہ عذر میں جیتے ہیں اور اِسی میں مرجاتے ہیں۔

شعور کی سطح پر معرفت

لاشعور کی سطح پر معرفت کا انتظام کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے شعور کی سطح پر انسان کی ہدایت کے لیے دوسرا انتظام فرمایا۔ اب خدا نے معرفت کو منطوق آواز (spoken language) کی صورت میں ظاہر کیا۔ یہ کام خدا کے پیغمبروں کے ذریعے انجام پایا۔ اِس مقصد کے لیے خدا نے مسلسل طور پر پیغمبر بھیجے۔ اِن پیغمبروں کو خدا نے بذریعہ وحی، معرفت کا علم دیا۔ پھر انھوں نے لوگوں کی قابلِ فہم زبان میں اُن کو زندگی کی اِس حقیقت سے باخبر کیا، تاکہ لوگ شعور کے درجے میں اُس معرفت کو حاصل کرسکیں، جو لاشعور کے درجے میں ان کی فطرت میں پیوست کردی گئی تھی۔

مگر عجیب بات ہے کہ حصولِ معرفت کا یہ دوسرا انتظام بھی انسان کے لیے کافی ثابت نہیں ہوا۔ دوبارہ یہی ہوا کہ انسان، پیغمبروں اور داعیوں کی ساری کوشش کے باوجود وہ ان کو نظر انداز کرتا رہا۔ وہ پیغمبروں کی تمام تر دعوتی جدوجہد کے باوجود شعور کی سطح پر حقیقت کو دریافت نہ کرسکا۔

ایسا کیوں ہوا۔ اِس کا جواب قرآن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کی سورہ یٰسٓ میں ارشاد ہوا ہے: يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (36:30) یعنی افسوس ہے بندوں کے اوپر، جو پیغمبر بھی ان کے پاس آیا، وہ اس کا استہزا کرتے رہے:

Alas for human beings! They ridicule every prophet that comes to them.

کوئی آدمی جب کسی کا استہزا کرتا ہے، یا اس کا مذاق اڑاتا ہے تو اس کا سبب صرف ایک ہوتا ہے، اور وہ ہے اس کو حقیر سمجھنا۔ چناں چہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قدیم عرب میں پیغمبر کی

حیثیت سے آئے، تو وہاں کے سرداروں نے کہا: وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (43: 31) یعنی یہ قرآن دونوں بستیوں (مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اتارا گیا۔

اِس معاملے کی مزید وضاحت قرآن کے ایک اور بیان سے ہوتی ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی سورہ الانعام کی چند آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: ''اور وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو معاملے کا فیصلہ ہو جاتا، پھر انھیں کوئی مہلت نہ ملتی۔ اور اگر ہم کسی فرشتے کو پیغمبر بنا کر بھیجتے، تو اُس کو بھی ہم آدمی بناتے اور اُن کو اُسی شبہہ میں ڈال دیتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا، تو اُن میں سے جن لوگوں نے مذاق اُڑایا، اُن کو اُس چیز نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے'' (6: 8-10)۔

قرآن کا یہ بیان پیغمبروں کی تاریخ پر ایک تبصرہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر پیغمبر بظاہر عام انسانوں کی طرح انسان ہوتا تھا۔ اِس لیے جب خدا اُس پر وحی بھیجتا اور وہ لوگوں سے کہتا کہ مجھے خدا نے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے تمھارے پاس بھیجا ہے، تو وہ یہ دیکھ کر اس کو نظر انداز کر دیتے کہ تم تو ہم کو ایک معمولی انسان دکھائی دیتے ہو، پھر کیوں ہم تم کو خدا کا پیغمبر مانیں۔

اِس کا جواب مذکورہ آیت میں یہ دیا گیا کہ خدا کے قانون کے مطابق، یہ التباس کا ایک معاملہ ہے۔ امتحان کی مصلحت کی بنا پر اِس دنیا میں ہمیشہ سچائی کے ساتھ ایک شبہہ کا عنصر (element of doubt) موجود رہتا ہے۔ اِس مصلحت کی بنا پر یہی ہوگا کہ خدا کا پیغام کسی غیر معمولی فرشتے کے ذریعے نہیں دیا جائے گا، بلکہ ایک انسان کے ذریعے دیا جائے گا۔ تم سچائی کو صرف اُسی وقت پا سکتے ہو جب کہ تم شبہہ کے پردے کو پھاڑو اور خالص جوہرِ ذاتی (merit) کی بنیاد پر حق کے داعی کو پہچانو۔

معرفت بذریعہ آیاتِ کائنات

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے معرفتِ حق کے لیے ایک اور انتظام کیا۔ یہ انتظام تھا— خدا کی تخلیق میں چھپی ہوئی نشانیوں کو ظاہر کرنا۔ اِس خدائی منصوبہ کا ذکر قرآن کی سورہ حم السجدہ میں

پیشگی طور پر کیا گیا تھا۔ اِس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''مستقبل میں ہم اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی۔ یہاں تک کہ اُن پر پوری طرح یہ کھل جائے کہ یہ قرآن حق ہے'' (41: 53)۔

خدا نے اپنے اِس خصوصی منصوبہ کو موجودہ زمانے میں سائنس دانوں کے ذریعے پورا کیا۔ موجودہ زمانے میں سائنس دانوں نے عالمِ طبیعیات (physical world) میں جو دریافتیں کی ہیں، وہ دریافتیں گویا کہ آلاء اللہ کا مشاہداتی اظہار ہیں۔ خدا نے اپنے پیغمبر ابراہیم کو مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (6:76) کا خصوصی مشاہدہ کرایا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اپنی اِن نشانیوں (sign) کو خود علمِ انسانی کے ذریعے عمومی سطح پر لوگوں کے لیے قابلِ مشاہدہ بنا دیا۔

موجودہ زمانے میں اِس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ راقم الحروف نے بھی اِس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ امریکا کے ایک سائنس داں ڈاکٹر کریسی ماریسن (وفات: 1951) نے اِس موضوع پر ایک کتاب شائع کی ہے۔ اِس کتاب کا انگریزی ٹائٹل (*Man Doesn't Stand Alone*) ہے۔ اِس کتاب کا عربی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اِس عربی ایڈیشن کا نام بامعنیٰ طور پر یہ ہے: **اللہ یتجلّٰی فی عصر العلم**۔

مگر دوبارہ ایسا ہوا کہ بہت کم ایسے انسان نکلے جو اِس سائنسی انقلاب سے معرفت کی غذا لے سکیں۔ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت نے دوبارہ یہ غلطی کی کہ اُس نے انحراف کا ایک طریقہ اختیار کیا اور انسان دوبارہ معرفت کے حصول سے محروم رہا۔

اصل یہ ہے کہ جدید سائنس کے دو شعبے ہیں۔ ایک ہے، نظریاتی سائنس (theoretical science)، اس کا دوسرا شعبہ وہ ہے جس کو انطباقی سائنس (applied science) کہا جاتا ہے۔ نظریاتی سائنس کامل طور پر معرفت کی سائنس تھی۔ اُس کے مطالعے سے انسان، خدا کو اور خدائی حقیقتوں کا علم حاصل کرسکتا تھا۔ لیکن انسان نے نظریاتی سائنس سے یہ خدائی رزق نہیں لیا، وہ بدستور معرفت سے محروم بنا رہا۔

انطباقی سائنس وہ ہے جس کو دوسرے لفظوں میں ٹکنکل سائنس (technical science) کہا جاتا ہے۔ سائنس کی دریافتوں نے ایک نئی ٹکنالوجی دی۔ اِس جدید ٹکنالوجی کے ذریعے نئی مشینیں بنیں، نئی قسم کی بلڈنگیں تیار کی گئیں، نئی قسم کی سواریاں بنیں، نئی قسم کی اشیاءِ صرف (consumer goods) وجود میں آئیں۔ سماجی ترقی کا وہ اعلیٰ نظام قائم ہوا جس کو جدید تہذیب (modern civilization) کہا جاتا ہے، وغیرہ۔

مذکورہ قسم کی صنعتی ترقیوں سے جدید انداز کے پُرکشش شہر وجود میں آئے۔ اِن ترقیوں کے نتیجے میں انسان کو عیش اور راحت کا جو سامان ملا، وہ مادی اعتبار سے اتنا پرکشش تھا کہ انسان اس میں کھو گیا۔ انسان نے شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھا کہ جدید ترقیوں کے بعد اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ اِسی دنیا میں اپنی جنت بنا سکے۔ وہ بعد از موت دورِ حیات (post death period) میں ملنے والی جنت کا انتظار نہ کرے، بلکہ قبل از موت دورِ حیات (pre-death period) میں اپنی جنت بنا کر اُس میں عیش کی زندگی گزارے۔

جدید سائنس، انسان کے لیے معرفت کی روشنی تھی، لیکن انسان اُس سے معرفت کی روشنی حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اِس طرح یہ ہوا کہ خدا نے معرفت کا جو تیسرا دروازہ کھولا تھا، وہ بھی انسان کی نادانی سے اس کے اوپر بند پڑا رہا۔

معرفت بذریعہ فائنل اظہار

خدا کے تخلیقی پلان (creation plan of God) کے مطابق، انسان سے جو معرفت مطلوب ہے، وہ براہِ راست مشاہدہ کے بغیر مطلوب ہے۔ اِسی بلا مشاہدہ معرفت کو قرآن میں ایمان بالغیب (2: 3) کہا گیا ہے۔

اوپر معرفت کے جن تین درجوں کا ذکر کیا گیا، اُن کا تعلق اِسی قسم کی بلا مشاہدہ معرفت سے ہے۔ انسان کی پچھلی تاریخ، معرفت کے اِنھیں تینوں درجات کی تاریخ کا دوسرا نام ہے۔ مگر جب انسان اِس نوعیت کی معرفت کے حصول میں ناکام رہے، تو وہ وقت آجاتا ہے جب کہ حقیقت سے پردہ

اٹھا دیا جائے، تا کہ انسان اُن حقیقتوں کو براہِ راست طور پر دیکھ لے جن کو وہ بالواسطہ طور پر دیکھنے میں ناکام ہوگیا تھا۔ یہ بات قرآن میں بار بار مختلف انداز سے بتائی گئی ہے۔

اِس نوعیت کی چند قرآنی آیتوں کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''اور موت کی بے ہوشی حق کے ساتھ آپہنچی، یہ وہی چیز ہے جس سے تم بھاگتے تھے۔ اور صور پھونکا جائے گا، یہ ڈرانے کا دن ہوگا۔ ہر شخص اِس طرح آگیا کہ اُس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔ تم اِس دن سے غفلت میں رہے، پس ہم نے تمھارے اوپر سے پردہ ہٹا دیا، تو آج تمھاری نگاہ تیز ہے'' (50: 19-22)

مذکورہ قرآنی آیت میں انسانی تاریخ کے آخری دور (final phase of human history) کا ذکر ہے۔ انسانی تاریخ کے اِسی آخری دور کا دوسرا نام قیامت (Doomsday) ہے۔ حالات بتاتے ہیں کہ اب اِس آخری دور کے ظاہر ہونے کا وقت بالکل قریب آپہنچا ہے۔ تمام دنیا کے سائنس داں متفقہ طور پر جس گلوبل وارمنگ (global warming) کی خبر دے رہے ہیں، وہ دراصل گلوبل وارننگ (global warning) ہے۔

سائنس دانوں کے مشاہدے کے مطابق، انسانی تاریخ کے خاتمہ کا عمل تیزی سے شروع ہو چکا ہے۔ بہت جلد ایسا ہوگا کہ زمین کے اوپر قائم کردہ لائف سپورٹ سسٹم بالکل تباہ ہو جائے گا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت جلد دنیا انسان کے لیے ناقابلِ رہائش (inhabitable) بن جائے گی۔ جدید سائنسی مشاہدہ یہ بھی بتاتا ہے کہ تباہی کا یہ عمل اتنا زیادہ مہلک ہے کہ وہ اب ناقابلِ اعادہ (irreversible) بن چکا ہے۔ اب اس کو دوبارہ پیچھے کی طرف لوٹایا نہیں جا سکتا۔

قرآن کے مطابق، دنیا کا آخری خاتمہ اُس وقت ہوگا جب کہ فرشتہ اسرافیل اپنا صور پھونک دے۔ تاہم اِس آخری انجام سے پہلے خدا کچھ نشانیاں ظہور میں لا رہا ہے۔ یہ انسان کے لیے گویا آخری موقع ہے، تا کہ اب سے وہ ہوش میں آئے اور اپنی اصلاح کرکے اپنے آپ کو ابدی جنت کا مستحق بنا لے — موجودہ گلوبل وارمنگ اور اُس سے پیدا ہونے والے حالات اِسی قسم کی

ایک پری فائنل وارننگ (pre-final warning) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گلوبل وارمنگ دراصل قربِ قیامت کی علامت (sign) ہے۔قرآن اور حدیث میں اِس علامت کا ذکر صراحت کے ساتھ موجود ہے۔جیسا کہ معلوم ہے، سمندر کرۂ ارض کے تین چوتھائی حصے پر محیط ہے۔قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ایک وقت آئے گا، جب کہ سخت گرمی کے نتیجے میں سمندروں کا پانی کھولنے لگے گا۔ چناں چہ فرمایا: وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (81:6)یعنی جب سمندروں کو (آگ سے) بھڑکا دیا جائے گا:

And when the seas are set on fire (81: 6)

قیامت سے پہلے پیش آنے والی اِس حقیقت کو حدیث میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیاہے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إذا كان يوم القيامة أدنيت الشمس من العباد (الترمذي، رقم الحديث: 2421) یعنی جب قیامت کا دن قریب آجائے گا تو سورج انسان کے قریب ہوجائے گا۔سورج کے قریب آنے کا مطلب یہ ہے کہ سورج کی گرمی قریب آجائے گی۔

موجودہ زمانے میں جس سائنسی انقلاب کا ظہور ہوا، وہ خدا کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے نیچر (Nature) میں چھپی ہوئی خدا کی نشانیاں ظاہر ہوں تا کہ انسان اُن سے سبق لے اور خالق کی معرفت حاصل کر کے خالق کی ابدی رحمتوں کا مستحق بنے۔مگر انسان نے ان چیزوں کو صرف اپنے مادی مقصد کے لیے استعمال کیا۔اور بظاہر شان دار صنعتی تمدن کی ایک دنیا بنا کر اس میں رہنے لگا۔

صنعتی دریافتوں کا مقصد خالق کی معرفت کا حصول تھا، نہ کہ خود اپنے لیے مادی عیش کی ایک دنیا بنانا۔یہ سائنسی دریافتوں کا ایک غلط استعمال (misuse) تھا۔خدا نے اس کو پسند نہیں کیا۔اِس بنا پر مختلف قسم کی صنعتی خرابیاں (industrial evils) پیدا ہوگئیں۔مثلاً وہ خرابی جس کو گرین ہاؤس گیس، یا کاربن ایمشن (carbon emission) کہا جاتا ہے۔

کاربن ایمیشن کوئی نیا مسئلہ نہیں، وہ ہمیشہ سے موجود تھا۔مگر اس سے پہلے یہ تھا کہ خدا کا بنایا ہوا

فطری نظام اس کاربن کو اپنے اندر جذب (absorb) کر لیتا تھا۔ اب یہ ہوا کہ خدا کے فطری نظام نے صنعتی کاربن کو جذب کرنا چھوڑ دیا۔ انسان کے پاس اِس نظام کا کوئی بدل موجود نہ تھا، اِس لیے انسانی سرگرمیاں دھیرے دھیرے صنعتی کثافت (industrial pollution) کی صورت اختیار کر گئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا ایک قسم کا گیس چیمبر (gas chamber) بن گئی۔

یہ گویا اِس بات کا اعلان تھا کہ انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا میں بطور خود اپنی ایک جنت بنا سکے۔ جس طرح موجودہ عارضی دنیا کی تخلیق خدا نے کی ہے، اُسی طرح ابدی جنت کی تخلیق خدا ہی کر سکتا ہے۔ کسی اور کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں۔

اِس معاملے کا ایک علامتی واقعہ وہ ہے جو حال میں پیش آیا۔ امریکا کی ریاست کیلی فورنیا کے بڑے رقبے میں ہرے بھرے جنگل ہیں۔ اِس جنگل کے کنارے ایک دریا بہتا ہے۔ یہ علاقہ نہایت خوب صورت علاقہ ہے۔ جنگل کے دوسری طرف جدید طرز کا ایک ٹاؤن بنایا گیا۔ اس کی خوب صورتی کی بنا پر اس کا نام پیراڈائز (Paradise) رکھ دیا گیا، یعنی جنت۔ یہاں کے لوگ خوشی اور راحتوں کی زندگی گزار رہے تھے۔

اِس کے بعد یہ ہوا کہ جون 2008 میں سخت گرمی کی وجہ سے کیلی فورنیا کے اِن وسیع جنگلوں میں آگ لگ گئی۔ حکومت کی تمام کوششوں کے باوجود آگ پھیلتی گئی، یہاں تک کہ یہ آگ دریا کو پار (jump) کرکے پیراڈائز ٹاؤن میں داخل ہوگئی۔ 10 جولائی 2008 تک اِس ٹاؤن کے 75 مکانات جل کر تباہ ہو چکے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ گھبراہٹ میں ٹاؤن کو چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

اِس واقعے کی خبر میڈیا میں آچکی ہے۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (11 جولائی 2008) میں اِس واقعے کی رپورٹ حسب ذیل عنوان کے تحت شائع ہوئی ہے:

California fires spark evacuation (p. 23).

آگ لگنے کی یہ خبر اِسی پیراڈائز نامی ٹاؤن کے بارے میں ہے۔ اِس خبر کا عنوان زیادہ درست طور پر یہ ہونا چاہیے — انسانی ساخت کی مادّی جنت میں آگ:

Fire in man-made paradise

امریکا کے پیراڈائز نامی ٹاؤن میں جو آگ لگی ہے، وہی آگ اِس وقت ساری دنیا میں لگی ہوئی ہے اور وہ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اِس عالمی آگ کا نام گلوبل وارمنگ (global warming) ہے۔ یہ صورتِ حال، دنیا کی آخری تباہی سے پہلے پیش آنے والی ابتدائی تباہی ہے۔ یہ دنیا کے خاتمہ سے پہلے اُس کے خاتمہ کا آتشیں اعلان ہے۔ یہ جہنم سے پہلے جہنم کا پیشگی رمائنڈر ہے۔ یہ صورتِ حال بتا رہی ہے کہ کاؤنٹ ڈاؤن (count down) آخر سے پہلے کی گنتی (last but one) تک پہنچ چکا ہے۔

خدا نے دنیا کو دو دوروں میں تقسیم کیا تھا— قیامت سے پہلے کا دور، اور قیامت کے بعد کا دور۔ انسانیت کا قافلہ لمبے سفر کے بعد قیامت سے پہلے کے دور کی آخری شام تک پہنچ چکا۔ اِس کے بعد جو چیز پیش آنے والی ہے، وہ قیامت کے بعد کی صبح ہے۔ آنے والے اِس اگلے دن میں لوگ اپنے عمل کا انجام پائیں گے۔ اِس کے بعد کچھ لوگوں کے لیے ابدی جنت ہوگی اور کچھ لوگوں کے لیے ابدی جہنم۔ کامیاب وہ ہے جو ابدی جنت (eternal paradise) میں جگہ پائے، اور ناکام وہ ہے جو جہنم کے ابدی گڑھے (eternal hell) میں ڈال دیا جائے۔

مذہب اور سائنس

مذہب کیا ہے۔ مذہب زندگی کی سائنس ہے۔اس کے مقابلے میں معروف سائنس،طبیعیات کی سائنس ہے۔جیسا کہ معلوم ہے،طبیعیات کی سائنس یا فزیکل سائنس میں پچھلے پانچ سو سال کے اندر بہت ترقی ہوئی ہے، جب کہ اِس مدت میں مذہب میں کوئی ترقی نہ ہوسکی۔

مثلاً پانچ سو سال پہلے انسان سادہ قسم کی اونٹ گاڑی یا گھوڑا گاڑی پر سفر کرتا تھا،مگر پچھلے کئی سو سال کی مسلسل ترقی کے نتیجے میں اب انسان، سواری کے میدان میں بہت زیادہ ترقی کر چکا ہے بائسکل ،اسٹیم شِپ ،موٹر کار، ہوائی جہاز، وغیرہ، اِس ترقی کے نمونے ہیں۔

اس کے مقابلے میں مذہب کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔مذہب پر جُمود کا عالم طاری ہے۔بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب، پانچ سو سال پہلے جہاں تھا وہیں وہ آج بھی پایا جاتا ہے۔مذہب میں کوئی حقیقی ترقی دکھائی نہیں دیتی۔یہ حالت ہر مذہب کی ہے۔اس معاملے میں کسی مذہب کا کوئی استثنا نہیں۔ طبیعیاتی ترقیوں کے سیلاب میں مذہب ایک غیر ترقی یافتہ ڈسپلن بنا ہوا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ طبیعیات کی دنیا میں پچھلے پانچ سو سال سے انکوائری (inquiry) کا عمل جاری ہے۔ ہر چیز کی تحقیق ہورہی ہے۔ ہر چیز کھلے ڈائلاگ کا موضوع بنی ہوئی ہے۔اس کے نتیجے میں طبیعیات کے شعبوں میں ردّ وقبول کا عمل جاری ہے۔مثلاً پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ زمین مرکز میں ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے،مگر مشاہدہ اور تحقیق کے ذریعے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں، بلکہ سورج درمیان میں ہے اور زمین اور دوسرے سیّارے وسیع خلا میں اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔جب یہ نئی دریافت ہوئی تو اس کے فوراً بعد علمائے فلکیات نے قدیم روایتی نظریے کو ترک کر کے جدید سائنسی نظریے کو اختیار کرلیا۔

یہی انکوائری کا عمل ترقی کا اصل سبب ہے۔لیکن مذہب کے میدان میں انکوائری کا یہ عمل جاری نہ ہوسکا۔اس کا نقصان یہ ہوا کہ مذہب کی دنیا میں جُمود آ گیا۔مذہب کا عمل ایک مقام پر رُک کر رہ گیا۔

موجودہ زمانے میں مذہب کو ٹریڈیشن (tradition) کہا جاتا ہے۔ مثلاً مذہب یہودیت کو یہودی ٹریڈیشن، مذہب عیسائیت کو عیسائی ٹریڈیشن اور مذہب اسلام کو اسلامی ٹریڈیشن، وغیرہ۔ ایسا اس لیے ہوا کہ مذہب کو ایک جامد روایت مان لیا گیا، ایک ایسی روایت جو نسل درنسل ایک ہی حالت پر چلی جارہی ہے، حالاں کہ سائنس میں ایسا نہیں ہوا۔ سائنس کی دنیا میں ایسا نہیں ہوا کہ برٹش سائنس کو برٹش ٹریڈیشن، جرمن سائنس کو جرمن ٹریڈیشن اور امریکن سائنس کو امریکن ٹریڈیشن کہا جانے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معروف سائنس ایک سائنس ہے، اسی طرح مذہب بھی ایک سائنس ہے۔ مذہب کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ مذہب میں بھی آزادانہ انکوائری اور کھُلا ڈائلاگ اُسی طرح جاری کیا جائے جس طرح وہ سائنس میں عملاً جاری ہے۔ اِس طرح کی انکوائری یا ڈائلاگ جاری نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا کہ مذہب میں قدیم زمانے میں کم تر واقفیت کی بنا پر جو باتیں مان لی گئیں، وہی بدستور آج تک جاری ہیں۔ ضرورت تھی کہ بعد کی تحقیقات کو لیتے ہوئے قدیم بے اصل نظریات کو ترک کردیا جائے اور ان کی جگہ اُن باتوں کو مان لیا جائے جو بعد کی تحقیقات سے انسان کے علم میں آچکی ہیں۔

مذاہب کے حلقے میں باشعور لوگوں کے اندر خود بھی اس کا احساس پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے درمیان بار بار اِس قسم کی تحریکیں اٹھتی رہی ہیں، اگرچہ موافق فضا نہ ہونے کی وجہ سے یہ تحریکیں زیادہ کامیاب نہ ہوسکیں۔ مثلاً ہندوازم میں آریہ سماج کی تحریک، جو مورتی پوجا کے خلاف اٹھی۔ اس کا دعویٰ ہے کہ مورتی پوجا ویدوں میں نہیں ہے، یہ بعد کا اضافہ ہے۔ اِسی طرح بھکتی موومنٹ، جو ہندوازم میں بڑھی ہوئی ریچول ازم (Ritualism) کے خلاف اٹھی۔ اُس نے رسمی اعمال کے بجائے ڈووشن (devotion) پر زور دیا۔ اِسی طرح بُدھ ازم میں، نیو بدھ ازم (neobuddhism) کی تحریک۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بعد کو پیدا ہونے والے رسم ورواج سے پاک کرکے بدھ ازم کو ابتدائی دور کے بدھ ازم کی طرف واپس لے جانا۔

یہی معاملہ مسیحیت کا ہے۔ 325ء میں ہونے والی نیقیا کاؤنسل (Nicaea Council)

کے بعد مسیحیت میں کافی تبدیلی آئی۔ اب مسیحی تعلیمات کے بجائے چرچ کی روایات، مسیحیت کا ماخذ بن گئیں۔ اس کے بعد مسیحی حلقے میں سولھویں صدی میں رفارمیشن (reformation) کی تحریک اٹھی جو گویا چرچ سے بائبل کی طرف واپسی کی تحریک تھی، مگر وہ زیادہ کامیاب نہ ہوسکی۔ اس طرح، ڈی ہیلی نائزیشن (dehellenization) کی تحریک، جو انیسویں صدی کے آخر میں اٹھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یونانی اور رومی اثرات سے مسیحیت کو پاک کیا جائے، اگر چہ یہ تحریک زیادہ کامیاب نہ ہوسکی۔

اس معاملے میں اسلام کا معاملہ مختلف ہے۔ دوسرے مذاہب کے برعکس، اسلام میں اصل متن کامل طور پر محفوظ ہے۔ یہاں جو بگاڑ آتا ہے وہ مسلم قوم میں آتا ہے نہ کہ خود اسلام میں۔ اس لیے اسلام میں رفارمیشن جیسی تحریک کی ضرورت نہیں۔ البتہ اسلام میں احیا (revivalism) کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ مسلم اضافوں سے پاک کرکے اسلام کو اس کی اصل صورت میں سامنے لایا جائے۔

مثلاً مانزم (monism) کے عقیدے کو لیجیے، جس کو اَدوئت واد، یا وحدت الوجود کہا جاتا ہے۔ یعنی حقیقت کو ایک سنگل وحدت کے روپ میں دیکھنا۔ پانچ ہزار سال پہلے یونانی فلسفیوں نے آئڈنٹٹی کرائسس کے سوال پر غور کرنا شروع کیا۔ انھوں نے یہ فرض کیا کہ انسان ایک کُلی حقیقت کا حصہ ہے۔ وہ صرف اِس لیے اُس سے الگ ہوا ہے کہ ایک دن دوبارہ وہ اس سے مل جائے۔ انسان ایک الگ وجود کی حیثیت سے اپنی شناخت نہیں پارہا تھا، لیکن جب اس نے یہ مان لیا کہ وہ ایک عظیم تر حقیقتِ کُلّی کا ذاتی جُز ہے، تو اس نے گویا اپنی شناخت پالی۔ کائنات کے اندر اس کو اپنی پہچان معلوم ہوگئی۔ یہ نظریہ بہت بڑے پیمانے پر پھیلا۔

مگر اب یہ ثابت ہوچکا ہے کہ مانزم کا نظریہ صرف ایک فلسفیانہ تخیل تھا، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ بیسویں صدی میں فلکیاتی سائنس میں جو تحقیق ہوئی ہے، اس نے اِس مفروضے کو بے بنیاد ثابت کردیا ہے۔ بِگ بینگ (Big Bang) کا نظریہ جو سائنسی حلقے میں اب ایک مسلّمہ بن چکا ہے، وہ ثابت کرتا ہے کہ خالق اور مخلوق دونوں ایک نہیں ہوسکتے۔ خالق بلاشبہ تخلیق سے الگ ہے، اسی لیے وہ تخلیق کا واقعہ ظہور میں لاسکتا ہے۔ اگر خالق خود تخلیق کا حصہ ہو تو تخلیق کا واقعہ

کبھی وجود ہی میں نہ آئے اور تخلیق ہمیشہ کے لیے غیر موجود بنی رہے۔

بگ بینگ کا نظریہ یہ بتاتا ہے کہ تیرہ بلین سال پہلے پوری کائنات ایک واحد سپر ایٹم کی صورت میں تھی۔ پھر خارجی مداخلت کے ذریعے اس کے اندر انفجار (explosion) ہوا۔ اِس انفجار کے بعد سپر ایٹم کے ذرّات خلا میں پھیل گیے اور موجودہ دنیا وجود میں آئی۔ سپر ایٹم کے اندر یہ انفجار، داخلی سبب کے ذریعے نہیں ہوا، بلکہ وہ واضح طور پر ایک خارجی مداخلت کار (intervener) کے ذریعے ہوا۔ اور جب یہ مان لیا جائے کہ زیرِ مداخلت (entervened) سپر ایٹم الگ تھا اور مداخلت کار (intervener) الگ، تو اپنے آپ ادوئت واد یا مانزم کا نظریہ ختم ہوجاتا ہے۔

قدیم زمانے میں انسان نے چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو اس نے فرض کرلیا کہ چاند ایک دیوتا ہے۔ اِس طرح چاند کو ایک آسمانی دیوتا مان لیا گیا اور اس کی پرستش کی جانے لگی۔ بعد کو جب مزید تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ چاند کوئی روشن وجود نہیں۔ وہ سورج کی روشنی پڑنے سے چمکتا ہے۔ بعد کو جب خلائی سفر میں ترقی ہوئی تو انسان چاند کی طرف پرواز کرنے کا منصوبہ بنانے لگا۔ یہاں تک کہ امریکی خلا باز نیل آرم اسٹرانگ (Neil Armstrong) 21 جولائی 1969 کو چاند کی سطح پر اتر گیا۔ یہ پہلا انسان تھا جو چاند کی سطح پر اُترا۔

اِس براہِ راست مشاہدے کے بعد معلوم ہوا کہ چاند صرف ایک خشک چٹان ہے، وہ نہ تو روشن ہے اور نہ گول، اور نہ اس کے اندر کوئی امتیازی صفت ہے۔ اِس دریافت نے چاند کے تقدّس کا نظریہ علمی طور پر ختم کردیا۔ ضرورت تھی کہ اس کے بعد چاند کو دیوتا سمجھنے کے عقیدے کو مکمل طور پر ترک کردیا جائے، لیکن ابھی تک ایسا نہ ہوسکا۔

یہی معاملہ آواگون (cycle of life) کے نظریے کا ہے۔ یہ نظریہ اِس تصور پر قائم ہے کہ آدمی اپنے پچھلے جنم کے اعمال کے مطابق، دوبارہ زمین پر پیدا ہوتا ہے اور پھر اپنے کرم کی سزا بھُگت کر مرجاتا ہے، تاکہ اسی طرح دوبارہ پیدا ہو اور اپنے کرم کا نتیجہ بھُگتے۔ یہ سلسلہ 80 لاکھ سال سے بھی زیادہ مدت تک بار بار جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ نروان (نجات) کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔

یہ عقیدہ ہزاروں سال پہلے ایک فلسفیانہ نکتے کے طور پر لوگوں کے سامنے آیا۔ فلسفی نے دیکھا کہ لوگ پیدا ہوتے ہیں تو اُن میں سے کوئی امیر ہوتا ہے اور کوئی غریب، کوئی محروم ہوتا ہے اور کوئی پائے ہوئے ہوتا ہے۔ اس معاملے کو اس نے انسان کے ''کرم'' سے جوڑ کر آواگون کا فلسفہ بنا لیا۔ دھیرے دھیرے یہ فلسفیانہ نکتہ ایک باقاعدہ مذہبی عقیدہ بن گیا اور کروڑوں لوگ اس کو درست سمجھنے لگے۔

مگر موجودہ زمانے میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، انھوں نے بتایا ہے کہ محروم اور غیر محروم (haves and have nots) کا فرق انسانی عمل (کرم) کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک قانونِ فطرت ہے۔ فطرت کے نظام میں عدم مساوات (inequality) کا طریقہ رکھا گیا ہے۔ اِس کی وجہ سے انسانی سماج میں چیلنج اور کامپٹیشن کا ماحول قائم ہوتا ہے۔ تمام ترقیاں اِس چیلنج اور کامپٹیشن کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں۔ (ملاحظہ ہو آرنلڈ ٹائن بی کی کتاب: دی اسٹڈی آف ہسٹری)

اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان امیر اور غریب، پس ماندہ اور ترقی یافتہ کا فرق کوئی برائی کی بات نہیں، بلکہ وہ ایک مطلوب فطری نظام ہے، وہ تمام انسانی ترقی کا ضامن ہے۔ اِس تحقیق کے سامنے آنے کے بعد ضرورت ہے کہ آواگون کے مفروضے کو مکمل طور پر ترک کر دیا جائے۔ اور یہ مان لیا جائے کہ آواگون کا نظریہ محض ایک فلسفیانہ لطیفہ (joke) تھا، نہ کہ کوئی حقیقی نظریہ۔

اِسی طرح روحانیت کے میدان میں ہزاروں سال سے یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ انسان کا دل (heart) رُوحانی معرفت کا خزانہ ہے۔ دل کا مراقبہ (meditation) کرکے اِس روحانی خزانے کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ نظریہ اتنا پھیلا کہ تمام روحانی اسکول نے اس کو اختیار کر لیا۔ مگر موجودہ زمانے میں انسانی جسم پر جو تحقیقات ہوئی ہیں، اُن سے یقینی طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ دل کسی بھی قسم کے معارف کا خزانہ نہیں، وہ صرف گردشِ خون (cirulation of blood) کا ذریعہ ہے۔ فکر اور جذبات دونوں کا مرکز یکساں طور پر انسان کا ذہن (mind) ہے۔ اب اہلِ علم کے درمیان اِس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں۔

اِس تحقیق کے بعد اب ضروری ہوگیا ہے کہ اِس پورے معاملے پر نظر ثانی کی جائے، اور پھر

مبنی بَرقلب روحانیت (heart-based spirituality) کے نظریے کو مکمل طور پر ترک کر دیا جائے اور اس کے بجائے مبنی بَر ذہن روحانیت (mind-based spirituality) کے نظریے کو اختیار کرلیا جائے۔

قدیم زمانے میں مذہب کو ایک مقدس چیز سمجھا جاتا تھا۔ اِس بنا پر مذہب کا تنقیدی جائزہ ایک امرِ ممنوع بنا ہوا تھا، مگر موجودہ زمانے میں سائنسی انقلاب کے اثر سے یہ ہوا کہ جس طرح دوسرے تمام شعبوں کا تنقیدی جائزہ لیا جا رہا تھا، اسی طرح مذہب کا بھی تنقیدی جائزہ لیا جانے لگا۔ اِس شعبۂ تحقیق کو اب تاریخی انتقاد (historical criticism) کہا جاتا ہے۔

اِس تحقیق و تنقید کے بعد یہ ثابت ہوا ہے کہ تمام مذاہب بعد کی تبدیلیوں کے نتیجے میں اب غیر تاریخی بن چکے ہیں، ہر مذہب گویا کہ ایک میتھالوجی ہے۔ جس کے پیچھے کوئی تاریخی سند (historical credibility) موجود نہیں۔

مذاہب کے اِس عموم میں صرف ایک استثنا ہے، اور وہ مذہبِ اسلام کا ہے۔ خالص علمی جائزے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کو پورے معنوں میں تاریخی مذہب کہا جا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں علم کا تقاضا ہے کہ دوسرے مذاہب کو قابلِ احترام اثاثہ سمجھتے ہوئے یہ مان لیا جائے کہ عملی طور پر صرف اسلام قابلِ اعتبار مذہب ہے، الہامی سچائی کو جاننے کے لیے اسلام ہی واحد مستند ذریعے کی حیثیت رکھتا ہے۔

مسیحی پوپ کا بیان

مسیحی پوپ (Pope Benedict XVI) نے 12 ستمبر 2006 کو ویسٹ جرمنی کی یونیورسٹی ریجنس برگ (Regensburg) میں ایک لکچر دیا۔ یہ لکچر سات صفحات پر مشتمل تھا۔ سات صفحے کے اِس لکچر کا عنوان یہ تھا:

Faith and Reason

مسیحی پوپ نے اپنے اِس لکچر میں چودھویں صدی عیسوی کے بازنطینی کنگ، مینویل دوم

(Manual II) کے ایک قول کو نقل کیا تھا۔ وہ قول یہ تھا— مجھے محمد کی لائی ہوئی کوئی ایسی بات بتاؤ جو نئی ہو:

Show me just what Muhammad brought that was new.

بازنطینی کنگ کی یہ بات پوپ نے کسی تنقید کے بغیر نقل کی ہے۔ مگر بلاشبہہ یہ ایک ایسی بات ہے جو خلافِ واقعہ بھی ہے اور غیر سنجیدہ بھی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ نہ تھا کہ وہ کوئی نئی چیز لائے ہیں، یا انھوں نے کوئی نیا مذہب پیش کیا ہے۔ انھوں نے جو کیا وہ صرف یہ تھا کہ پچھلے مذاہب، جو ملاوٹ کا شکار ہوگیے تھے اور اِس بنا پر اصل خدائی مذہب ان کے یہاں گم ہوکر رہ گیا تھا، پیغمبر اسلام نے اس کی تصحیح کی۔ انھوں نے خدا کی مدد سے خدا کے دین کا اصل ورژن (version) دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہی پیغمبرِ اسلام کا اصل کنٹری بیوشن ہے۔ یہ کنٹری بیوشن اتنا بڑا ہے کہ اس سے بڑا اور کوئی کنٹری بیوشن نہیں ہوسکتا۔

خدا نے پچھلے زمانوں میں بہت سے پیغمبر بھیجے۔ یہ تمام پیغمبر ایک ہی خدائی دین کو لے کر آئے، لیکن قدیم زمانے میں کسی متن (text) کو اس کی اصل صورت میں محفوظ رکھنے کا کوئی باقاعدہ نظم نہ تھا۔ اس لیے پچھلے پیغمبروں کا لایا ہوا دین، تبدیلی اور ملاوٹ کا شکار ہوگیا۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی وحی کے مطابق، خدا کے اصل دین کو جانا اور اس کو اس کی اصل صورت میں محفوظ کردیا۔

خدائی مذہب کا محفوظ متن نہ ہونے کی وجہ سے انسان گمراہی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ تلاش کے باوجود اس کو سچائی نہیں ملتی تھی۔ پیغمبر اسلام کی لائی ہوئی ہدایت الٰہی نے تاریخ بشری کے اِس خلا کو پُر کردیا۔ اب یہ ممکن ہوگیا کہ کوئی مُتلاشی روح جب حق کی دریافت کرنا چاہے تو وہ اس کو یقین کے ساتھ دریافت کرسکے۔ یہ ایک عظیم خدائی تحفہ ہے جو پیغمبرِ اسلام کے ذریعے انسانیت کو ملا۔

معرفت — مقصدِ انسانیت

علما نے معرفت کو واجبِ اوّل بتایا ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ معرفت مقصدِ انسانیت ہے۔ موت سے پہلے کی زندگی آغازِ معرفت کی زندگی ہے، اور موت کے بعد کی زندگی تکمیلِ معرفت کی زندگی۔ موجودہ دنیا میں ایک انسان ابتدائی دریافت کے درجے میں خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ آخرت کی دنیا میں وہ کامل دریافت کے درجے میں خدا کی معرفت حاصل کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ معرفتِ خداوندی ایک فکری عمل (intellectual process) ہے۔ یہ فکری عمل موجودہ دنیا میں شروع ہوتا ہے اور پھر وہ ابدی طور پر آخرت کی دنیا میں جاری رہے گا۔

قرآن کی سورہ الذاریات میں بتایا گیا ہے کہ جن اور انس کو صرف اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے (51:56)۔ اِس آیت میں عبادت سے مراد معرفتِ الٰہی ہے۔ آیت کی یہ تفسیر عبداللہ بن عباس اور علی بن ابی طالب کے قول پر مبنی ہے۔ یہی جن وانس کا مقصدِ تخلیق ہے۔ اِس مقصد کا تقاضا تھا کہ جن وانس کو وہ صلاحیت کمال درجے میں عطا کی جائے جس کے ذریعے وہ اعلیٰ درجے میں معرفتِ خداوندی کو حاصل کرسکیں۔ چناں چہ جن وانس کو ایک طرف وہ اعلیٰ دماغی صلاحیت دی گئی جو اِس عظیم مقصد کے لیے مطلوب تھی۔ اور اِسی کے ساتھ خارجی اعتبار سے، اُن کو وہ وسائل دئے گئے جو اِس مقصد کی تکمیل میں مددگار بن سکیں۔

معرفت کے لفظی معنی ہیں — اِدراک (realisation)، یعنی کسی چیز کو کامل درجے میں پہچاننا۔ معرفت کو دوسرے لفظوں میں شعوری دریافت (intellectual discovery) کہہ سکتے ہیں۔ یہ دریافت کسی وقتی واقفیت کا نام نہیں ہے، یہ ایک لمبے سفر کا نام ہے۔ انسان کو جس خدا کی معرفت حاصل کرنا ہے، اس کی صفت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ اگر تمام درخت قلم بنا دئے جائیں اور تمام موجود سمندروں اور مزید سات سمندروں کو روشنائی (ink) بنا دیا جائے اور پھر خدا کے کلمات کو لکھنا شروع کیا جائے تو تمام سمندر ختم ہوجائیں گے، لیکن خدا کے کلمات ختم نہ ہوں گے (31:27)۔

جس خدا کے کمالات اتنے زیادہ ہوں، اس کی دریافت ایک وقتی واقفیت نہیں ہوسکتی، یہ بلاشبہہ دریافت کا ایک لامتناہی سفر ہے جس کا آغاز تو متعین ہوسکتا ہے، لیکن اس کا اختتام متعین نہیں۔

خدا کی معرفت کا یہ مطلب نہیں کہ مراقبہ (meditation) کر کے تصور کی دنیا میں ذاتِ الٰہی کی جھلکیاں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ اِسی طرح وجد (ecstasy) بھی معرفت کے ہم معنیٰ نہیں۔ معرفت ایک اعلیٰ شعوری حالت ہے جو تخلیقاتِ الٰہیہ میں غور وفکر کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کے مطابق، معرفت کی تعریف (definition) یہ ہے کہ ایک بندہ، رب العالمین کو اُن عظمتوں کے ساتھ دریافت کرے کہ وہی اُس کے لیے اس کی ساری محبتوں کا مرکز بن جائے (2:165)، اور اس کی خشیت کے جذبات تمام تر اُسی کے ساتھ وابستہ ہوجائیں (9:18)۔

محبت اور خشیت دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک بندہ جب تدبر اور تفکر کے ذریعے خالقِ کائنات کو اس کی صفاتِ کمال کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اس کے دل میں بے پناہ حد تک اپنے رب کا اعتراف پیدا ہوجاتا ہے۔ اِسی کے ساتھ جب وہ اِس حقیقت کو دریافت کرتا ہے کہ دینے والا خدا ہے، اُس کے سوا کوئی اور دینے والا نہیں تو اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ اندیشہ پیدا ہوجاتا ہے کہ اگر میں خدا کی رحمتوں سے محروم ہوجاؤں تو زمین وآسمان میں میرا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسنِ تقویم (95:4) کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کو وہ تمام دماغی صلاحیت عطا کردی جس کے ذریعے وہ رب العالمین کی معرفت حاصل کرسکے۔ دوسری طرف، خارجی دنیا (nature) کے اندر معرفت کے تمام اَجزا مخفی صورت میں رکھ دئے۔ اب انسان کا یہ کام ہے کہ وہ معرفت کے اِن چھپے ہوئے اجزا کو دریافت کرے اور اعلیٰ معرفت کا تجربہ کر کے اپنے اندر ربانی شخصیت (divine personality) بنائے۔

معرفت کا یہ عمل ایک مسلسل دریافت کا عمل تھا۔ اِس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک پوری تہذیب (civilization) وجود میں آئے، جو معرفت کے چھپے ہوئے حقائق کو انسان کے لیے کھول دے۔

آج تہذیب کے نام سے ہم جس تاریخی واقعے کو جانتے ہیں، وہ اگرچہ مادّی تہذیب (material civilization) ہے، لیکن اپنی حقیقی نوعیت کے لحاظ سے یہ دراصل ربانی تہذیب (divine civilization) ہے۔ موجودہ تہذیب دراصل اُس واقعے کا ظہور ہے جس کو قرآن کی سورہ حم السجدہ میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)

معرفت کا یہ سفر بہت پہلے جنات کی تخلیق سے شروع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات بنائی اور اس کے انتظام (management) کے لیے فرشتوں کو پیدا کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُس مخلوق کو پیدا کیا جس کو جن کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے، جن کی تخلیق آگ سے ہوئی (15:27) جن کو آگ سے پیدا کرنے کا مطلب غالباً یہ ہے کہ جن کی سرگرمیوں کا دائرہ سیاروں کی دنیا سے لے کر ستاروں کی دنیا تک پھیلا ہوا ہے۔ اِس کے مقابلے میں، بعد کو انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی (7:21)۔ اِس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ انسان کی سرگرمیوں کا مرکز بنیادی طور پر سیارۂ زمین (planet earth) ہوگا۔

معرفتِ خداوندی کا حصول دراصل تخلیق میں چھپے ہوئے ربانی اسرار کی دریافت پر مبنی تھا۔ یہی دریافت وہ چیز ہے جو انسان کو خالق کائنات کا تعارف کراتی ہے۔ اِس سے بندہ اور خدا کے درمیان وہ اعلیٰ شعوری تعلق قائم ہوتا ہے جس کو معرفت کہا گیا ہے۔ دریافت کا یہی تاریخی عمل ہے جس کو ہم نے تہذیب (civilization) کا نام دیا ہے۔

اِس تہذیبِ معرفت کو وجود میں لانے کا کام سب سے پہلے جن کے سپرد کیا گیا۔ مگر جیسا کی روایات میں آیا ہے، جن کے گروہوں نے آپس میں لڑائیاں کیں اور بہت زیادہ فساد برپا کیا۔ وہ تہذیبِ معرفت کا عمل شروع کرنے میں ناکام رہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معزول کر دیا۔ اور ان کی جگہ انسان کو زمین پر بسایا گیا، تاکہ وہ تہذیبِ معرفت کو وجود میں لانے کا مطلوب عمل شروع کر سکیں۔

تہذیبِ معرفت کو عمل میں لانا مکمل طور پر علم و آگہی کا عمل ہے۔ وہ شعور کی سطح (intellectual level) پر انجام پاتا ہے۔ تمام سمندروں کو سیاہی بنانا اور تمام درختوں کو قلم بنانا، جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، اس میں غالباً اِسی کی طرف اشارہ ہے۔ انسان سے یہ مطلوب تھا کہ وہ ''مطالعہ اور کتابت'' کے ذریعہ اِس عمل کو شروع کرے۔ پیغمبروں نے انسان کو اِس عمل کی طرف متوجہ کیا۔ اِس کا ذکر غالباً قرآن کی اُس آیت میں موجود ہے جس میں تعلیم بالقلم کو رب کی معرفت کا ذریعہ بتایا گیا ہے (68:4)۔ مگر انسانیت کا قافلہ پیغمبروں کی ہدایت پر چلنے میں ناکام رہا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی امت برپا کی۔ اِس امت کا اولین کام یہ تھا کہ وہ تہذیبِ معرفت کے اِس مطلوب عمل کو جاری کرے۔ امت کی طویل تاریخ بتاتی ہے کہ امتِ محمدی بہت جلد سیاسی اقتدار کے راستے پر چل پڑی۔ امت کے افراد نے مسلم ایمپائر قائم کیا، لیکن وہ ربانی تہذیب کا مطلوب ایمپائر قائم نہ کرسکے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلم صوفیا نے معرفت کے حصول کا یہ کام انجام دیا، لیکن یہ ایک غلط فہمی ہے۔ صوفیا نے جو کام کیا، وہ تصوف کا کام تھا، اور تصوف اور معرفت دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ تصوف ایک مبنی بر قلب (heart-based) عمل ہے، جب کہ معرفت ایک مبنی بر ذہن (mind-based) عمل ہے۔ صوفیا کی یہ اجتہادی غلطی تھی کہ انھوں نے قلب کو معرفت کا خزانہ سمجھ لیا اور وہ قلب پر مفروضہ محنت کرتے رہے، جب کہ قلب صرف گردشِ خون کا مرکز ہے، نہ کہ معرفت کا مرکز۔

اِس اجتہادی غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوفیا کا گروہ خدا کی شعوری معرفت کی دریافت سے محروم رہا۔ انھوں نے بطور خود جس وجد یا دیدارِ الٰہی کو دریافت کیا، وہ صرف ایک واہمہ تھا، نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی دریافت۔ بدقسمتی سے بعد کے زمانے کے اکثر مسلم علما بھی اِسی صوفیانہ نظریے سے متاثر ہوگئے۔ وہ بھی متصوفانہ اشغال کو معرفت کا ذریعہ سمجھتے رہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوفیا اور علما

دونوں حقیقی معرفت سے بے خبر رہے۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ پوری مسلم تاریخ میں غالباً کوئی عالم یا صوفی معرفت کے موضوع پر کوئی قابلِ ذکر کتاب تیار نہ کرسکا۔ جن کتابوں کو لوگ معرفت کی کتاب سمجھتے ہیں، وہ حقیقۃً تصوف کی کتابیں ہیں، نہ کہ معرفت کی کتابیں۔

معرفت کے بنیادی اصول خدا کی کتاب میں دئے گئے تھے اور اس کے تائیدی شواہد (supporting evidences) فطرت (nature) میں رکھ دئے گئے تھے۔ اب یہ انسان کا کام تھا کہ وہ فطرت کے شواہد کو دریافت کرے اور اُس کو لوگوں کے لیے ایک معلوم واقعہ بنائے۔

مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اہلِ ایمان (believers) اِس کام کو انجام نہ دے سکے۔ پیغمبروں کے معاملے میں یہ ہوا کہ اُن کے ساتھ کوئی مضبوط ٹیم نہ بن سکی جو اِس کام کو انجام دیتی۔ پیغمبرِ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن پھیلا اور ایک پوری امت آپ کے مشن سے وابستہ ہوگئی، لیکن یہاں بھی ایسا ہوا کہ امتِ محمدی بہت جلد سیاسی اقتدار میں مشغول ہوگئی۔ پہلے انھوں نے اپنا سیاسی ایمپائر بنایا اور جب یہ ایمپائر ٹوٹا تو وہ جہاد کے نام پر اُس کو دوبارہ حاصل کرنے میں لگ گئے۔ اِس طرح لمبی تاریخ گزر گئی اور اہلِ ایمان اِس ضروری کام کو انجام نہ دے سکے۔

آیاتِ معرفت کو کھولنے کے کام کے لیے اہلِ ایمان فرسٹ آپشن (first option) کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے یہ کام مطلوب طور پر انجام نہیں دیا تو اس کے بعد غیر اہلِ ایمان (non-believers) کو سکنڈ آپشن (second option) کے طور پر منتخب کیا گیا۔ یہ سکنڈ آپشن مغربی قوموں کا تھا۔ غالباً اِنھیں قوموں کو قرآن میں یاجوج اور ماجوج (الأنبیاء: 96) کہا گیا ہے۔ اِس معاملے میں غیر اہلِ ایمان کو بطور سکنڈ آپشن منتخب کرنے کا اشارہ غالباً صحیح البخاری کی ایک روایت میں ملتا ہے۔ اِس روایت کے الفاظ یہ ہیں: إنّ اللہ لیؤیّد ھذا الدین بالرجل الفاجر (صحیح البخاری، کتاب الجهاد والیسر) یعنی بے شک، اللہ اِس دین کی تائید فاجر انسان سے کرے گا۔

ربانی معرفت: ایک مطالعہ

ایک حدیثِ قدسی اِن الفاظ میں بیان ہوئی ہے: کنتُ کنزاً، فأحببتُ أن أُعرف،

فخلقتُ خلقاً، فعرّفتهم بی، فعرفونی (میں ایک خزانہ تھا بغیر پہچانا ہوا، پھر میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، پھر میں نے ایک مخلوق کو پیدا کیا، پھر اُن کو میں نے اپنی پہچان کرائی، تو انھوں نے مجھے پہچان لیا)۔

اِس روایت کو تقی الدین احمد بن تیمیہ (وفات: 728ھ) اور اُن کے ہم فکر علما نے ضعیف یا بے اصل بتایا ہے۔ لیکن کچھ دوسرے علما کا کہنا ہے کہ اس کو معنی کے اعتبار سے بے اصل نہیں کہا جا سکتا۔ علی بن محمد نور الدین الملا القاری (وفات: 1014ھ) نے لکھا ہے: معناہ صحیح مستفاد من قولہ تعالیٰ (وما خلقت الجنّ والإنس إلا لیعبدون) أی لیعرفونی، کمافسّرہ ابن عباس رضی اللہ عنہ (کشف الخفاء، 2/1011) یعنی اِس روایت کا مفہوم درست ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اِس قول سے مستفاد ہے کہ ''میں نے پیدا کیا جن اور انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے''۔ یعنی وہ میری معرفت حاصل کریں، جیسا کہ عبداللہ بن عباس نے اِس آیت کی تفسیر میں کہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی معرفت کسی انسان کی سب سے بڑی دریافت ہے۔ بلا شبہہ معرفت کا حصول ہی کسی انسان کا سب سے بڑا گول (goal) ہے۔ اِس کے سوا، کوئی بھی دوسری چیز اتنی بڑی نہیں کہ وہ انسان کا گول بن سکے۔ دوسری مطلوب چیزیں اِس معرفت کے تقاضے کے طور پر پیدا ہوتی ہیں۔ معرفت اصل ہے، اور بقیہ تمام چیزیں اسی اصل کا نتیجہ۔

معرفت کا یہ سفر انسانِ اول کی پیدائش کے ساتھ شروع ہوا، اور وہ ابد تک مسلسل جاری رہے گا۔ اِس سفر کا آغاز ہے، لیکن اِس کی کوئی انتہا نہیں۔ آدم پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی۔ آدم کو پیغمبر کا درجہ دے کر، اللہ تعالیٰ نے آدم کو معرفت کا علم بھی دے دیا۔ اِس کے بعد یہ علم نسل در نسل انسانیت کے درمیان جاری رہا۔

خدا کے تمام پیغمبر اِسی کام میں انسان کی رہنمائی کے لیے آئے۔ پیغمبر گویا کہ معرفتِ الٰہی کے مستند گائڈ (authentic guide) کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم زمانے میں ہزاروں سال تک پیغمبر آتے رہے، مگر بہت کم افراد ایسے تھے جو پیغمبر سے ہدایت لیں یا پیغمبر کا

ساتھ دیں۔ لوگ نہ دکھائی دینے والے خدا (unseen god) کی معرفت حاصل نہیں کر پاتے تھے، اِس لیے وہ دکھائی دینے والے خدا (seen god) کو پوجتے رہے۔ انسان کی یہی کمزوری ہے جس نے قدیم زمانے میں فطرت پرستی (nature worship) کا کلچر پیدا کیا۔ یہ معرفت کا پہلا دور تھا جو حضرت آدم سے لے کر حضرت ابراہیم تک جاری رہا۔ اِس قدیم دور کی طرف اشارہ قرآن کی اِس آیت میں موجود ہے: ربّ إنّهنّ أضللن كثيراً (14:38)۔

دوسرا مرحلہ

معرفت کا دوسرا مرحلہ پیغمبر ابراہیم علیہ السلام (وفات: 1985 ق م) سے شروع ہوتا ہے۔ وہ قدیم عراق کے شہر اُر (Ur) میں پیدا ہوئے۔ اللہ کی ہدایت کے مطابق، ان کے ذریعے ایک نیا منصوبہ شروع کیا گیا۔ وہ منصوبہ تھا، ایسی نسل تیار کرنا جو ماحول کی کنڈیشننگ سے پاک ہو۔ اِس مقصد کے لیے انھوں نے عرب کے صحرا میں اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو بسایا۔ یہاں صحرائی ماحول میں تقریباً ڈھائی ہزار سال تک توالد وتناسل کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ وہ نسل تیار ہوئی جس کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ اِسی نسل میں پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب 570 عیسوی میں پیدا ہوئے۔ اِس واقعے کا اشارہ قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110)

ایک مستشرق پروفیسر ڈی ایس مارگولیتھ (وفات: 1940) نے اِس اسماعیلی نسل کو ہیروؤں کی نسل (a nation of heroes) کہا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو اسماعیل کے درمیان کام کرکے ان کو تیار کیا اور ان کے ذریعے ایک بڑی ٹیم بنائی۔ یہی وہ ٹیم ہے جس کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ اِس ٹیم نے ساتویں صدی عیسوی میں اگلے دورِ معرفت کا آغاز کیا۔

تیسرا مرحلہ

اصحابِ رسول نے غیر معمولی قربانیوں کے ذریعے تاریخ میں ایک نیا انقلاب برپا کیا۔ اِس انقلاب کو ایک لفظ میں، دورِ شرک کا خاتمہ اور دورِ توحید کا آغاز کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف عرب میں، بلکہ عرب کے باہر دنیا کے دو بڑے ایمپائر، ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر کا خاتمہ کیا جو

انسانی فکر کی ترقی میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے فطرت (nature) کو معبودیت کے مقام سے ہٹایا اور اکتشافِ فطرت کا دروازہ کھولا، جس کے نتیجے میں آخر کار جدید سائنسی دور ظہور میں آیا۔

اصحابِ رسول کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے وحیِ الٰہی (قرآن) کو ایک محفوظ کلام کی حیثیت دے دی جو کہ اِس سے پہلے کبھی کسی آسمانی کتاب کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ امتِ محمدی کا یہ ایک اہم کارنامہ ہے کہ اس نے ایک ہزار سال تک قرآن کو مستند ترین انداز میں محفوظ رکھا اور اس کو انیسویں صدی عیسوی تک پہنچا دیا۔ انیسویں صدی میں پرنٹنگ پریس ایجاد ہو گیا اور یہ ممکن ہو گیا کہ قرآن کے نسخے کامل صحت کے ساتھ بڑی تعداد میں چھاپ کر ساری دنیا میں پھیلا دئے جائیں۔ اب اشاعتِ قرآن کا یہ کام اتنے بڑے پیمانے پر ہو چکا ہے کہ اُس میں اب نہ ضیاع کا اندیشہ ہے اور نہ کسی قسم کی تبدیلی کا اندیشہ۔

چوتھا مرحلہ

تہذیبِ معرفت کا چوتھا مرحلہ دراصل تیسرے مرحلے میں پیش آنے والے انقلابی پراسس کی تکمیل (culmination) ہے۔ یہ تکمیل مغربی قوموں کے ذریعے انجام پائی، جن کو قرآن میں یاجوج اور ماجوج (21:96) کہا گیا ہے۔ سفرِ معرفت کے تیسرے مرحلے کے ہیرو اہلِ ایمان (believers) تھے۔ معرفت کے چوتھے مرحلے کو انجام دینے کا کام غیر اہلِ ایمان (non-believers) سے لیا گیا۔ اِس واقعے کی طرف اشارہ ایک حدیثِ رسول میں موجود ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: إنّ اللہ لیؤید ہذا الدین بالرجل الفاجر (صحیح البخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب إنّ اللہ یؤید الدین بالرجل الفاجر)- اِس حدیثِ رسول میں ''فاجر'' سے مراد غیر اہلِ ایمان (non-believers) ہیں۔ غالباً یہی غیر اہلِ ایمان تھے جن کو قرآن اور حدیث میں یاجوج اور ماجوج کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ غیر اہلِ ایمان وہ مغربی قومیں ہیں جو یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد ابھریں۔ مغرب کی نشاۃِ ثانیہ کروسیڈس (Crusades) کی طویل جنگ میں مغربی قوموں کی ہار کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ کروسیڈس کی طویل جنگ

چودھویں صدی عیسوی میں ختم ہوئی۔ اور اِسی چودھویں صدی میں مغرب کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہوا۔

کروسیڈس کی طویل جنگ میں ایک طرف مسلم حکومتیں تھیں اور دوسری طرف تقریباً پورا مسیحی یورپ اِس طویل جنگ میں مسیحی قوموں کو ذلت آمیز شکست (humiliating defeat) ہوئی۔ یہ شکست اُن کے لیے ایک عظیم شاک (super shock) کے ہم معنی تھی۔ اِس کے بعد مغربی قوموں میں یہ ذہن پیدا ہوا کہ اُنھیں اپنے عمل کا میدان مسلّح کروسیڈس (armed crusades) کے بجائے، اسپریچول کروسیڈس (spiritual crusades) کی طرف موڑ دینا چاہیے۔ یہ اسپریچول کروسیڈس دھیرے دھیرے فطرت (nature) کی تسخیر تک پہنچ گئی۔ اِس کے نتیجے میں مسیحی قوموں کو سائنس اور صنعت کے میدان میں غیر معمولی طاقت حاصل ہوئی۔ وہ دوبارہ نئی طاقت کے ساتھ نہ صرف مسلم، بلکہ پوری دنیا پر چھا گئے — اکتشافِ معرفت کے پراسس کا آغاز اہلِ ایمان نے کیا تھا، اِس آغاز میں غیر اہلِ ایمان نے تائیدی رول ادا کیا اور اس کو تکمیل کے مرحلے تک پہنچا دیا۔

پچھلے چند سو سالوں میں مغربی محققین اور مغربی سائنس دانوں نے جو کام انجام دیا ہے، وہ سائنس برائے سائنس کے جذبے کے تحت انجام دیا گیا ہے۔ وہ اپنے آپ میں اور براہِ راست طور پر حق کی معرفت نہیں ہے۔ اِس کام کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے طالبینِ معرفت کے لیے بنیادی معلومات (data) فراہم کر دیا ہے۔ اِن معلومات کو لے کر معرفت کی ایک پوری انسائکلو پیڈیا تیار کی جاسکتی ہے، جس کے ذریعے دینی حقائق انسان کے اپنے علمی مسلّمہ کی سطح پر مدلل ہو سکیں۔

موجودہ زمانے میں جو سائنسی دریافتیں ہوئی ہیں، وہ حقیقۃً تخلیقِ خداوندی میں چھپے ہوئے قوانین کی دریافتیں ہیں۔ اِن دریافتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اسلامی عقائد کا نظام جو پہلے وحی والہام پر مبنی سمجھا جاتا تھا، اب وہ انسان کے خود اپنے علمی مسلّمہ کی بنیاد پر قائم ہو گیا ہے۔

چوتھے دور میں معرفت کا جو سفر طے ہوا، اس کے کئی پہلو تھے — اِکتشافِ فطرت کے ذریعے آفاق وانفس کی نشانیوں کی دریافت، کمیونکیشن کے ذرائع کا ظہور میں آنا، لوگوں میں تجسس کی اسپرٹ (spirit of enquiry) کا پیدا ہونا، عالمی انٹریکشن کا وہ عمل جس کو گلوبلائزیشن کہا جاتا ہے،

مذہبی جبر (religious persecution) کا ختم ہونا اور ساری دنیا میں مذہبی آزادی (religious freedom) کا دور شروع ہونا، تاریخی تحقیقات کے ذریعے یہ ثابت ہوجانا کہ دوسری تمام الہامی کتابیں غیر محفوظ اور غیر مستند ہوچکی ہیں، محفوظ اور مستند کتاب کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے، ساری دنیا میں مذہبی مفاہمت (religious understanding) کی فضا کا قائم ہونا، قرآن اور اسلام کا بڑے پیمانے پر نیوز (news) میں آنا، پولٹکل ایمپائر نہ ہوتے ہوئے، زیادہ بڑے پیمانے پر فکری ایمپائر (ideological empire) کا قیام ممکن ہوجانا، وغیرہ۔

پانچواں دور

معرفت کا پانچواں دور وہ ہے جب کہ پیدا شدہ انقلابی مواقع کو استعمال کرکے ایک طرف اعلیٰ درجۂ معرفت حاصل کیا جائے اور دوسری طرف اللہ کا پیغام ساری دنیا میں پہنچا دیا جائے۔ یہ کام قیامت سے پہلے آخری دورِ انسانیت میں انجام پائے گا۔ اِس دور کی پیشین گوئی ایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں آئی ہے: **لا یبقی علیٰ ظہر الأرض بیت مدر ولا وبر إلاّ أدخلہ اللہ کلمۃ الاسلام** (مسند احمد، جلد 4، صفحہ 6) یعنی زمین کے اوپر کوئی گھر یا خیمہ نہیں بچے گا، مگر اللہ اُس کے اندر اسلام کا کلمہ داخل کردے گا۔

آخری دور کا یہ واقعہ غالباً دو طریقے سے انجام پائے گا۔ ایک، یہ کہ کلمۂ اسلام یا کلامِ الٰہی (word of God) کے اندر اقتصادی مفاد (commercial interest) پیدا کیا جائے گا۔ لوگ عمومی طور پر خدا کی بات کو پھیلانے لگیں گے، حتی کہ اشاعتِ اسلام کے اِس عمل میں غیر مسلم بھی شریک ہوجائیں گے۔ موجودہ زمانے میں یہ واقعہ بالفعل پیش آرہا ہے۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ظہور میں آنے کے بعد ساری دنیا میں مختلف صورتوں سے اسلام کے پیغام کی اشاعت ہورہی ہے۔ بڑے بڑے پبلشر اسلام کا لٹریچر چھاپ کر پھیلا رہے ہیں، اور ٹی وی کے بڑے بڑے ادارے اسلام کے پروگرام نشر کررہے ہیں۔ سیمناروں اور کانفرنسوں کی صورت میں پوری دنیا میں ہر جگہ بہت بڑے پیمانے پر اسلام کا چرچا ہورہا ہے، وغیرہ۔

کلمۂ اسلام کی اشاعت کا دوسرا ذریعہ امتِ محمدی ہے۔ امتِ محمدی کے افراد جدید معیار پر اشاعتِ اسلام کا کام انجام دیں گے۔ اِس دور میں امت کا ایک منتخب گروہ خصوصی طور پر اشاعتِ اسلام کے اِس عمل کی توفیق پائے گا۔ غالباً یہی وہ گروہ ہے جس کو حدیث میں 'اخوانِ رسول' (**صحیح مسلم، کتاب الطهارة**) کا لفظ دیا گیا ہے۔

پانچویں دور میں اعلیٰ معرفت کے حصول کی طرف قرآن میں اشارہ موجود ہے۔ یہ اشارہ قرآن کی اِس آیت میں پایا جاتا ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) یعنی آئندہ ہم اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی، یہاں تک کہ اُن پر بخوبی یہ امر واضح ہوجائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں جدید سائنس کی اُن دریافتوں کی طرف اشارہ ہے جو خاص طور پر انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں سامنے آئی ہیں۔ یہ دریافتیں فطرت میں چھپے ہوئے قوانینِ الٰہی کی دریافت ہیں۔ اِن دریافتوں نے اِس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ انسان کے خود اپنے علمی مسلمہ (scientific criterion) پر خدائی سچائی کو مدلل کیا جاسکے۔

چھٹا دور

معرفت الٰہی کا چھٹا دور آخرت کا دور ہے۔ خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، انسانی زندگی کے دو دور ہیں — قیامت سے پہلے کا دور، اور قیامت کے بعد کا دور۔ قیامت سے پہلے کا دور عارضی دورِ حیات ہے۔ اور قیامت کے بعد کا دورِ حیات ابدی دورِ حیات۔ قیامت سے پہلے کے دور میں انسانوں کا انتخاب کیا جارہا ہے۔ قیامت کے بعد کے دور میں تمام انسانوں کو اُن کے پچھلے ریکارڈ کے مطابق، آخرت کی دنیا میں آباد کیا جائے گا۔

قیامت سے پہلے کے دور میں معرفت کے حصول کا جو پراسس شروع ہوا، اس کی تکمیل آخرت کے دور میں انجام پائے گی۔ موجودہ دنیا میں معرفت کا حصول صرف زمان ومکان (space and time) کے اندر محدود طور پر انجام پا سکتا تھا۔ لیکن آخرت کی دنیا میں معرفت کا سفر

زمان ومکان سے ماورا(beyond space and time)لامحدودطور پرانجام پائے گا۔موجودہ دنیا میں یہ عمل صرف غیرمعیاری (imperfect) درجے میں انجام پاسکتا تھا،آخرت کی دنیا میں یہ عمل معیاری(perfect)طور پرتکمیل کے درجے میں انجام پائے گا۔

معرفت کاحصول انسان کی زندگی کا اصل مقصد ہے۔اِس سفرِ معرفت کا آغاز موجودہ دنیا میں ہوا،اِس سفرِ معرفت کی تکمیل آخرت میں جنت کی دنیا میں انجام پائے گی۔موجودہ دنیا میں انسان کو ہر چیز بقدرضرورت دی گئی تھی (14:34)،آخرت کی جنت میں انسان کوتمام چیزیں بقدراشتہا دی جائیں گی (41:31)۔

اِس جنت کی وسعت کو بتاتے ہوئے قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: **وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ** (3:133) یعنی دوڑو اپنے رب کی بخشش کی طرف اوراُس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اورزمین جیسی ہے۔وہ تیار کی گئی ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے۔

ختمِ نبوت

اسلامی عقیدے کے مطابق، پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ اُسی وقت سے شروع ہوگیا جب کہ انسان کو پیدا کرکے اس کو موجودہ زمین پر آباد کیا گیا ہے۔ آدم، پہلے انسان تھے اور پہلے پیغمبر بھی (3: 23)۔ اِس کے بعد ہر دور اور ہر نسل میں مسلسل طور پر پیغمبر آتے رہے اور لوگوں کو خدا کا پیغام دیتے رہے (23: 44)۔ ساتویں صدی عیسوی کے رُبع اوّل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا۔ آپ پر خدا نے اپنی کتاب قرآن اتاری۔ اِس کتاب میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ محمد، اللہ کے رسول ہیں، اور اِسی کے ساتھ وہ نبیوں کے خاتم (33: 40) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خاتم، یا سیل (seal) کے معنیٰ کسی چیز کو آخری طور پر مہر بند کرنے کے ہیں، یعنی اس کا ایسا خاتمہ جس کے بعد اس میں کسی اور چیز کا اضافہ ممکن نہ ہو:

Seal: To close completely

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد ختمِ نبوت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ: لا نبيّ بعدي (صحيح البخاري، كتاب الأنبياء) یعنی میرے بعد کوئی اور نبی نہیں۔

ختم نبوت کا مطلب ختم ضرورتِ نبوت ہے۔ محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ اِس لیے ختم کر دیا گیا کہ اس کے بعد نئے نبی کی آمد کی ضرورت باقی نہ رہی۔ جیسا کہ معلوم ہے، محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے ساتھ استثنائی طور پر ایسا ہوا کہ وہ کامل طور پر محفوظ ہوگیا۔ اور جب دینِ خداوندی محفوظ ہو جائے، تو اس کے بعد یہی محفوظ دین، ہدایت حاصل کرنے کا مستند ذریعہ بن جاتا ہے۔ خدا کی ہدایت کو جاننے کے لیے اصل ضرورت محفوظ دین کی ہے، نہ کہ پیغمبر کی۔ قرآن کی ایک آیت میں اِس حقیقت کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

قرآن کی سورہ المائدہ میں ایک آیت ہے، جس کے بارے میں صحیح روایات میں آیا ہے کہ وہ قرآن کی آخری آیت ہے۔ اِس آیت کے الفاظ یہ ہیں۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ

عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِيۡ وَرَضِيۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا (5:3) قرآن کی اِس آیت کے تین جُز ہیں:

1- آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا، یعنی یہ آیت قرآن کی آخری آیت ہے۔اِس آیت کے ساتھ قرآن کا نزول مکمل ہوگیا۔

2- میں نے تمھارے اوپر اپنی نعمت کو پورا کر دیا، یعنی قرآن کے گرد، اصحابِ رسول کی ایک مضبوط ٹیم جمع ہوگئی، جو قرآن کی حفاظت کی ضامن ہے۔

3- اور میں نے اسلام کو بحیثیت دین تمھارے لیے پسند کرلیا، یعنی اب اسلام کو ہمیشہ کے لیے مستند دینِ خداوندی کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

قرآن میں پچیس پیغمبروں کا ذکر ہے۔ حدیث کے مطابق، قدیم زمانے میں جو پیغمبر دنیا میں آئے، ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تھی۔ مگر ان پیغمبروں پر بہت کم لوگ ایمان لائے۔ اِس بنا پر اِن پیغمبروں کے ساتھ کوئی مضبوط ٹیم نہ بن سکی، جو اُن کے بعد اُن کی لائی ہوئی کتاب کی ضامن بنے۔ چناں چہ پچھلے پیغمبروں کی لائی ہوئی کتابیں اور ان کے صحیفے محفوظ نہ رہ سکے۔

پیغمبر آخر الزماں محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب کا معاملہ ایک استثنائی معاملہ تھا۔ آپ 570 عیسوی میں عرب کے شہر مکہ میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت یہاں جو لوگ (بنو اسماعیل) آباد تھے، ان کی پرورش تمدن سے دور صحرائی ماحول میں ہوئی۔ اِس بنا پر وہ اپنی اصل فطرت پر قائم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام کو استثنائی طور پر ساتھ دینے والوں کی بڑی تعداد حاصل ہوگئی۔ بائبل میں اِس استثنائی واقعے کو بطور پیشین گوئی اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے — وہ دس ہزار قُدسیوں کے ساتھ آیا:

He came with ten thousand of saints (Deoteronomy 33:2)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی صدی ہجری میں مکہ کو چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا۔ ہجرت (622ء) کے آٹھویں سال آپ فاتحانہ طور پر دوبارہ مکہ میں داخل ہوئے تو اُس وقت آپ کے ساتھ دس ہزار صحابہ موجود تھے۔ اِس کے بعد اپنی وفات سے تقریباً ڈھائی مہینے پہلے جب آپ نے آخری حج ادا کیا اور عرفات کے میدان میں اپنے اصحاب کو خطاب فرمایا، اُس وقت آپ کے اصحاب کی تعداد ایک لاکھ سے

زیادہ تھی۔ اِس کے بعد 632 عیسوی میں جب مدینہ میں آپ کی وفات ہوئی، اُس وقت عرب کے تقریباً تمام لوگ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور آپ کے اصحاب کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ ہوگئی تھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ استثنائی طور پر یہ معاملہ ہوا کہ آپ کو اتنی بڑی تعداد میں قابلِ اعتماد رفقا حاصل ہوگئے۔ یہ ایک انتہائی طاقت ور ٹیم تھی۔ مورخین کی شہادت کے مطابق، اِس ٹیم کا ہر فرد ایک ہیرو (hero) کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس وقت عرب کے باہر دو بڑے ایمپائر موجود تھے— بازنطینی ایمپائر، اور ساسانی ایمپائر (Byzantine Empire & Sassanid Empire)۔ یہ دونوں ایمپائر اسلامی مملکت کے خلاف ہوگئے۔ اِس طرح دونوں کے درمیان ٹکراؤ ہوا۔ اِس ٹکراؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ اسلام کو جیت ہوئی اور دونوں ایمپائر ٹوٹ کر ختم ہوگئے۔ یہی وہ عظیم واقعہ ہے جس کو بائبل میں بطور پیشین گوئی اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے— ازلی پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگئے:

And the everlasting mountains were scattered (Habakkuk 3: 6)

اِس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بہت جلد بعد ایک عظیم مسلم سلطنت بن گئی جو اسلام کی پشت پر ایک مضبوط سیاسی طاقت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اصحابِ رسول اور اہلِ اسلام کا یہ سیاسی غلبہ تاریخ کا ایک استثنائی واقعہ تھا۔ مؤرخین نے عام طور پر اِس کا اعتراف کیا ہے۔ انڈیا کے ایک مورخ ایم این رائے (وفات: 1954) کی ایک کتاب (*The Historical Role of Islam*) پہلی بار 1939 میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اِس کتاب میں انھوں نے اسلامی انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے اُس کو تمام معجزات میں سب سے بڑا معجزہ قرار دیا ہے:

The expansion of Islam is the most miraculous of all miracles (p. 4)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے اصحاب، قرآن کی حفاظت کے کام میں مسلسل طور پر مشغول ہوگئے۔ قرآن کو یاد کرنا، قرآن کو لکھنا، قرآن کا چرچا کرنا، یہی اُن کا سب سے بڑا مشغلہ بن گیا۔ اِس طرح، اصحابِ رسول کی جماعت گویا کہ ایک زندہ کتب خانہ بن گئی۔ پھر جب مسلم سلطنت قائم ہوئی تو حفاظتِ قرآن کی مہم کو ایک سیاسی طاقت کی تائید بھی حاصل ہوگئی۔ حفاظتِ قرآن کا

یہ سلسلہ تقریباً ایک ہزار سال تک غیر منقطع طور پر چلتا رہا۔ یہ کسی کتاب کی حفاظت کا ایک استثنائی معاملہ تھا جو قدیم زمانے میں کسی بھی کتاب کے ساتھ پیش نہیں آیا، نہ کوئی دنیوی کتاب اور نہ کوئی دینی کتاب۔

حفاظتِ قرآن

پچھلے زمانے میں انسانوں کی رہ نمائی کے لیے جو پیغمبر آئے، وہ سب اپنے ساتھ خدا کی کتاب اور صحیفے لائے۔ مگر یہ کتابیں اور صحیفے بعد کو محفوظ نہ رہ سکے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی بھی پیغمبر کے گرد اُس کے ساتھیوں کی کوئی مضبوط ٹیم اکھٹا نہ ہوسکی۔ پیغمبر اسلام کے ساتھ استثنائی طور پر ایسا ہوا کہ آپ کو اپنے پیرووٴں (followers) کی ایک مضبوط ٹیم حاصل ہوگئی۔ یہ ٹیم قرآن کی حفاظت کی ضامن بن گئی۔

ایک مستشرق (orientalist) نے اِس معاملے کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام کی وفات کے فوراً بعد آپ کے اصحاب، حفاظتِ قرآن کے لیے سرگرم ہو گئے۔ انھوں نے اِس مقصد کے لیے تاریخ میں پہلی بار ڈبل چیکنگ سسٹم (double checking system) کا طریقہ اختیار کیا۔ یہ ایک ایسا طریقہ تھا جس کے بعد قرآن کی حفاظت میں کسی قسم کا احتمال سرے سے باقی نہیں رہتا۔

632 عیسوی میں مدینہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اُس وقت ہزاروں کی تعداد میں ایسے اصحابِ رسول موجود تھے جن کو پورا قرآن بخوبی طور پر یاد تھا۔ نیز یہ کہ پیغمبر اسلام کا طریقہ یہ تھا کہ جب بھی قرآن کا کوئی حصہ اترتا تو آپ اُسی وقت اُس کو قدیم طرز کے کاغذ (قرطاس) پر لکھوا دیتے۔ اصحابِ رسول نے یہ کیا کہ زید بن ثابت الانصاری (وفات: 665ء) کی قیادت میں ایک ٹیم بنائی۔ اِس ٹیم نے قرآن کی تمام تحریروں کو اکھٹا کیا۔ اِس کے بعد انھوں نے یہ کیا کہ قرآن کے تحریری ذخیرے کا تقابل حافظے سے کیا، اور حافظے کا تقابل تحریری ذخیروں سے کیا۔ اِس ڈبل چیکنگ کے بعد انھوں نے قرآن کا ایک مستند نسخہ (authentic copy) لکھ کر تیار کیا۔ یہ نسخہ چوکور صورت میں تھا، اِس لیے اُس کو رَبعہ (square) کہا جاتا تھا۔ یہ ربعہ، قرآن کا مستند نسخہ قرار پایا۔ لوگوں نے اِس نسخے کی مزید نقلیں تیار کیں۔ اِس طرح وہ مسلم دنیا میں ہر طرف پھیل گیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام مسلسل طور پر ایک زندہ موضوع بن گیا۔ اہلِ اسلام، ایشیا اور افریقہ کے درمیان ایک بڑے رقبے میں ہر جگہ پھیل گئے۔

اِن لوگوں کی تقریر اور تحریر کا موضوع اسلام تھا۔ قرآن کی کتابت، قرآن کی تفسیر، حدیث کی تدوین، حدیث کی شرح، پیغمبر اسلام کی سیرت، اصحابِ رسول کے حالات، اسلام کی تاریخ، فقہ کی ترتیب وتدوین، وغیرہ۔ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد سیکڑوں سال تک یہ موضوعات لاکھوں اہلِ اسلام کے درمیان تقریر اور تحریر کا موضوع بنے رہے۔ دعوت وتبلیغ کا کام قرآن ہی کے ذریعے کیا جاتا تھا، اِس لیے دعوت وتبلیغ کے دوران بھی مسلسل طور پر قرآن کو پڑھنے اور سنانے کا عمل جاری رہا۔ یہ ایک ڈبل حفاظت کا معاملہ تھا۔ اِس عمل کے دوران ایک طرف، قرآن اور حدیث کی حفاظت ہوئی اور اسی کے ساتھ عربی زبان ایک زندہ اور محفوظ زبان بنتی چلی گئی۔

یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں پرنٹنگ پریس کا دور آ گیا۔ فرانس کا حکم راں نپولین (وفات: 1821) 1798 میں مصر میں داخل ہوا۔ وہ اپنے ساتھ پرنٹنگ پریس بھی لے آیا۔ اِس سے پہلے کاغذ سازی کی صنعت 751 عیسوی میں سمرقند میں آ چکی تھی۔ اِس طرح، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تقریباً ایک ہزار سال بعد قرآن اور علوم قرآن کی حفاظت پرنٹنگ پریس کے دور میں داخل ہوگئی۔ اب قرآن کے مطبوعہ نسخے دستیاب ہونے لگے۔ دورِ طباعت میں داخل ہونے کے بعد قرآن آخری طور پر ایک محفوظ کتاب بن گیا۔ اِس کے بعد قرآن میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

ختم نبوت کے حق میں یہی سب سے بڑا ثبوت ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد استثنائی طور پر ایسے اسباب پیدا ہوئے جو خدا کی کتاب کو محفوظ کرنے کے لیے یقینی تدبیر کی حیثیت رکھتے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ تدبیر اپنے آخری انجام تک پہنچ گئی، یعنی قرآن کامل طور پر ایک محفوظ کتاب بن گیا۔ اور جب خدا کی ہدایت کتاب کی صورت میں محفوظ ہوجائے تو ایسی کتاب پیغمبر کا بدل بن جاتی ہے۔ اِس کے بعد کسی نئے پیغمبر کی آمد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

رسول کی بعثت کا مقصد

ایک روایت کے مطابق، دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے۔ اِن تمام پیغمبروں کا مقصد صرف ایک تھا— انسان کو خدا کے تخلیقی پلان (creation plan of God) سے آگاہ کرنا۔ تمام پیغمبروں نے مشترک طور پر یہی ایک کام کیا۔ انھوں نے بتایا کہ خدا نے کیوں انسان کو پیدا کیا ہے۔ اِس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ موت سے پہلے کے دورِ حیات (pre-death period) میں انسان سے کیا مطلوب ہے، اور موت کے بعد کے دورِ حیات (post-death period) میں اس کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ اِسی کو قرآن میں اِنذار اور تبشیر کہا گیا ہے۔ یہی انذار اور تبشیر تمام پیغمبروں کا مشترک مشن تھا۔ اِس کے سوا کوئی چیز اگر کسی پیغمبر کی زندگی میں نظر آتی ہے، تو وہ اس کی زندگی کا ایک اضافی پہلو (relative part) ہے، نہ کہ حقیقی پہلو (real part)۔

موجودہ دنیا میں انسان کی دو ضرورتیں ہیں۔ ایک ہے اس کی مادّی ضرورت، جس کی تکمیل فزیکل سائنس (physical science) کے ذریعے ہوتی ہے۔ انسان کی دوسری ضرورت یہ ہے کہ اُس کے پاس وہ خدائی ہدایت (divine guidance) موجود ہو جس کا اتباع کر کے وہ آخرت میں کامیاب زندگی حاصل کرے۔ اِس دوسری ضرورت کی تکمیل پیغمبرانہ الہام سے ہوتی ہے۔ تقریبِ فہم کے لیے اس کو ہم ریلجس سائنس (religious science) کہہ سکتے ہیں۔

فزیکل سائنس میں آخری سائنٹسٹ (final scientist) کا لفظ ایک غیر متعلق (irrelevant) لفظ ہے۔ فزیکل سائنس میں مسلسل طور پر ترقی کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس لیے اِس میدان میں کوئی سائنٹسٹ آخری سائنٹسٹ نہیں ہوسکتا۔ اِس کے برعکس، ریلجس سائنس ایک ہی خدائی ہدایت (divine guidance) پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ خدائی ہدایت غیر متغیر طور پر ہمیشہ ایک ہی رہتی ہے۔ اِس لیے ریلجس سائنس میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ کوئی آخری پیغمبر (final prophet) ہو جو انسان کو خدا کا آخری کلام (final word) دے دے، اور انسانیت کا قافلہ اس کی رہ نمائی میں بھٹکے بغیر مسلسل طور پر اپنے سفرِ حیات کو جاری رکھے۔

خدا کی طرف سے آنے والا ہر پیغمبر ایک ہی ابدی ہدایت لے کر لوگوں کے پاس آیا۔ لیکن بشری تقاضے کے تحت جب پیغمبر کی وفات ہوئی تو اس کے بعد اس کی لائی ہوئی خدائی ہدایت محفوظ نہ رہ سکی۔ اِس لیے بار بار یہ ضرورت پیش آئی کہ نیا پیغمبر آئے اور وہ انسان کو دوبارہ مستند ہدایت عطا کرے۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی لائی ہوئی خدائی ہدایت، قرآن اور سنت کی شکل میں کامل طور پر محفوظ ہوگئی، اِس لیے آپ کے بعد کسی اور نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔

پیغمبر کا آنا ایک بے حد سنگین معاملہ ہوتا ہے۔ جب ایک زندہ پیغمبر موجود ہو تو اُس وقت انسان کے لیے ایک ہی انتخاب (option) باقی رہتا ہے، یہ کہ وہ پیغمبر کا اقرار کرے۔ اقرار نہ کرنے کی صورت میں پیغمبر کے معاصرین کو ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اِس لیے خدا کی یہ اسکیم نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ ایک زندہ پیغمبر موجود رہے۔ خدا کی اسکیم کے مطابق، اصل مطلوب یہ ہے کہ خدا کی ہدایت ہمیشہ محفوظ اور غیر محرَّف حالت میں موجود رہے۔ جب خدائی ہدایت کا متن (text) محفوظ ہو جائے اور اُس میں تحریف کا امکان باقی نہ رہے، تو زندہ پیغمبر کا موجود ہونا، غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی واقعہ پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کے بعد پیش آیا۔ خدا کی کتاب انسان کے لیے ایک بک آف ریفرنس (book of reference) کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب ایک محفوظ بک آف ریفرنس دستیاب ہو جائے، تو اس کے بعد نئے پیغمبر کی بعثت اپنے آپ غیر ضروری ہو جاتی ہے۔

پیغمبرانہ ہدایت کی ابدیت

پیغمبر کے ذریعے خدا کی جو ہدایت آتی ہے، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ابدی ہوتی ہے۔ قرآن میں پیغمبرانہ ہدایت کو روشن آفتاب سے تشبیہہ دی گئی ہے (33: 46)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی ہدایت اُسی طرح ابدی ہوتی ہے جس طرح آفتاب کی روشنی انسان کے لیے ابدی ہوتی ہے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ تبدیلیٔ زمانہ کے حوالے سے نئے پیغمبر کی ضرورت کو بتانا، ایک غیر متعلق (irrelevant) بات ہے۔ زمانے کی تبدیلی، یا مادّی تہذیب کی نئی ترقی کا کوئی تعلق نئی نبوت سے نہیں ہے۔ زمانے کی تبدیلی سے اگر کوئی عملی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ صرف نئے اجتہاد کی ضرورت کو

ثابت کرتا ہے، نہ کہ نئے نبی کی ضرورت کو۔ مثلاً مسح علی الخفّین کے مسئلے کو لیجیے۔ قدیم زمانے میں چمڑے کے موزے ہوا کرتے تھے۔ اُس وقت چمڑے کے موزے کے حوالے سے مسح علی الخفین کا مسئلہ بتایا گیا۔ اب صنعتی ریشوں سے تیار کئے ہوئے موزوں کا زمانہ ہے۔ یہ تبدیلی اجتہاد کی ضرورت کو بتاتی ہے، نہ کہ نئے نبی کی ضرورت کو۔ اِس طرح کے بدلے ہوئے حالات میں صرف یہ کافی ہے کہ قرآن اور سنت کی روشنی میں صورتِ موجودہ پر شرعی حکم کا از سرِ نو انطباق (re-application) کیا جائے۔ اِسی کا نام اجتہاد ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں تھے، تو اس وقت وہاں آب پاشی (irrigation) کا مسئلہ تھا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ خدا کے پیغمبر ہیں۔ آپ خدا کی مدد سے ہمارے اِس مسئلے کو حل کیجیے۔ آپ نے فرمایا: مابهذا بُعثتُ إليكم (السيرة النبوية لابن هشام، جلد 1، صفحہ 316) یعنی میں تمھارے پاس اِس کام کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں:

I have not been sent to you for this purpose.

اِسی طرح جب آپ مدینہ میں تھے تو وہاں کے حالات کے اعتبار سے بعض مسائل پیدا ہوئے، جو باغ بانی (horticulture) سے تعلق رکھتے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے اِس معاملے میں آپ سے مشورہ حاصل کرنا چاہا۔ آپ نے دوبارہ ان کو وہی جواب دیا جو آپ مکہ کے لوگوں کو دے چکے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ: أنتم أعلم بأمر دنياكم (صحيح مسلم، كتاب الفضائل) یعنی تم اپنی دنیا کے معاملے میں زیادہ جانتے ہو:

You know better about your worldly matters.

آب پاشی، باغ بانی، فنِ تعمیر اور صنعت جیسی چیزوں کا تعلق انسانی تہذیب سے ہے۔ تہذیب کا عمل ہمیشہ انسانی تحقیق وجستجو پر مبنی ہوتا ہے۔ اِس معاملے کو خدا نے انسان کے اپنے اوپر چھوڑ دیا ہے۔ تاہم جہاں تک ہدایت کا معاملہ ہے، اُس کا تعلق خدائی وحی سے ہے۔ انسان کی یہی ضرورت ہے جس کے لیے خدا نے وحی ونبوت کا سلسلہ جاری کیا۔

مشہور فرانسیسی مصنف ڈاکٹر الکسس کیرل (وفات: 1944) نے 1935 میں ایک کتاب شائع کی۔ اِس کتاب کا نام — انسانِ نامعلوم (*Man the Unknown*) تھا۔ مگر زیادہ صحیح طور پر اِس کتاب کا نام — ہدایت نامعلوم (Guidance the Unknown) ہونا چاہیے۔ انسان کی صحیح ہدایت کا تعلق امورِ غیب سے ہے۔ یہ صرف خدا ہے جو امورِ غیب کا علم رکھتا ہے۔ اِس لیے صرف خدا ہی انسان کو صحیح رہنمائی دے سکتا ہے۔ ماضی میں پیغمبروں کے ذریعے یہی رہ نمائی انسان کو دی جاتی رہی۔

اب اِس خدائی رہ نمائی کا مستند متن قرآن کی صورت میں محفوظ ہے۔ اب قیامت تک کے لیے قرآن، نبوت کا بدل ہے۔ اب ضرورت صرف یہ ہے کہ انسان اِس مستند کلامِ الٰہی (word of God) کو پڑھے، وہ اُس پر تدبر کرے اور قیامت تک اُس سے اپنے لیے رہنمائی لیتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جئت فختمتُ الأنبياء (صحیح مسلم، کتاب الفضائل) یعنی میں آیا اور میں نے نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم کر دیا۔

دلیلِ نبوت

پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ میں 570ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی عمر چالیس سال ہوئی تو 610ء میں خدا نے آپ کو اپنا پیغمبر بنایا اور آپ پر قرآن اتارا۔ آپ کا مشن توحید کا مشن تھا۔ اِس مشن کے لیے آپ نے تقریباً 23 سال تک کام کیا۔ اِس کے بعد 632ء میں مدینہ میں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں آپ کی تدفین ہوئی۔ آپ نے استثنائی طور پر اپنے ساتھیوں کی ایک بڑی جماعت بنائی، جس کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ اصحابِ رسول کی اِس جماعت نے آپ کے مشن کو تکمیل کے درجے تک پہنچایا۔

رسول اور خاتم الانبیا

قرآن اور حدیث کی صراحت کے مطابق، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف نبی تھے، بلکہ وہ خاتم الانبیاء بھی تھے، یعنی آپ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں۔ آپ کے بارے میں خاتم الانبیا ہونے کا یہ اعلان صرف ایک اعلان نہیں، وہ آپ کے پیغمبر خدا ہونے پر ایک تاریخی دلیل بھی ہے۔ آپ نے

ساتویں صدی کے رُبعِ اول میں یہ اعلان کیا کہ میں خاتم الانبیا ہوں۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک کوئی شخص نبی کا دعوے دار بن کر نہیں اٹھا۔ گویا کہ آپ کے الفاظ تاریخ کا ایک فیصلہ بن گیے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یا آپ کے بعد کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو اپنے بعد آنے والی تاریخ کے بارے میں ایک بیان دے اور اس کا یہ بیان اس کے بعد تاریخ کا ایک واقعہ بن جائے۔ مثلاً کارل مارکس (وفات: 1883) نے اپنے تجزیے کی بنیاد پر یہ اعلان کیا تھا کہ کمیونسٹ انقلاب سب سے پہلے فرانس میں آئے گا، مگر اُس کا یہ اعلان واقعہ نہ بن سکا۔ اِسی طرح تاریخ میں کئی لوگ ایسے گزرے ہیں، جنھوں نے مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرنے کی جرأت کی، مگر اِس قسم کی ہر پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی، وہ تاریخی واقعہ نہ بن سکی۔

اِس عموم میں صرف ایک استثنا ہے، اور وہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ آپ نے ساتویں صدی عیسوی کے رُبع اول میں مدینہ میں یہ اعلان کیا کہ میرے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں۔ یہ بات حیرت انگیز طور پر تاریخ کا ایک واقعہ بن گئی۔ یہ استثنا بلا شبہہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ آپ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول تھے اور اِسی کے ساتھ نبیوں کے خاتم بھی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اعلان قرآن میں بار بار کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (33: 41)۔ اِس آیت کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر بھی تھے اور خدا کے آخری پیغمبر بھی۔ اِسی طرح خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان کیا کہ: أنا النبئ لاکذب (صحیح البخاری، کتاب الجهاد؛ صحیح مسلم کتاب الجهاد) یعنی میں نبی ہوں، اِس میں کوئی شک نہیں۔ اِسی طرح آپ نے فرمایا: أنا خاتم النبیین (صحیح البخاری، کتاب المناقب؛ صحیح مسلم، کتاب الفضائل؛ أبوداؤد، کتاب الفتن؛ الترمذی، کتاب الفتن؛ مسند احمد) یعنی میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں۔

دعوائے نبوت نہیں

یہ بات نہایت اہم ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پورے تاریخی دور میں ساری دنیا میں

کوئی بھی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو اپنی زبان سے اِن الفاظ میں نبوت کا دعویٰ کرے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں، بالکل اُسی طرح جس طرح حضرت موسیٰ، حضرت مسیح اور حضرت محمد، خدا کے پیغمبر تھے:

I am the prophet of God in the same sense in which Moses and Jesus and Muhammad claimed they were prophets of God.

اور جب کوئی شخص اِن الفاظ میں، نبوت کا دعویٰ کرنے والا نہیں اٹھا تو پیغمبر اسلام کا یہ دعویٰ اپنے آپ ایک ثابت شدہ حقیقت بن گیا۔ آپ کے اِس اعلان کے بعد تقریباً چودہ سو سال گزر چکے ہیں، لیکن ابھی تک کوئی بھی شخص ایسا نہیں اٹھا جو اپنی زبان سے یہ اعلان کرے کہ — میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ اِس طرح آپ کا دعویٰ گویا کہ بلا مقابلہ اپنے آپ ثابت ہو گیا۔

اِس سلسلے میں کچھ نام بتائے جاتے ہیں، جن کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ مگر یہ خیال درست نہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ آپ کے زمانے میں یمن کے مُسیلمہ (وفات: 633ء) نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ لیکن کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے کسی مستقل نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ اُس نے صرف یہ کہا تھا کہ میں محمد کے ساتھ نبوت میں شریک کیا گیا ہوں۔ اِس طرح اُس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اصل حیثیت دے دی۔ اور جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شرکتِ نبوت سے انکار کیا تو اُس کا دعویٰ اپنے آپ ختم ہو گیا۔

اِسی طرح آپ کے زمانے میں یمن میں ایک اور شخص پیدا ہوا، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ شخص اسود العنسی (وفات: 632ء) تھا۔ تاہم تاریخ کی کتابوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُس نے خود اپنی زبان سے یہ کہا تھا کہ — میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ میرے مطالعے کے مطابق، اُس کا کیس ارتداد اور بغاوت کا کیس تھا، نہ کہ دعوائے نبوت کا کیس۔

اِسی طرح آپ کے بعد ابوالمتنبّی (وفات: 965ء) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا، مگر یہ درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ المتنبّی ایک شاعر تھا اور نہایت ذہین آدمی تھا۔ اُس نے مزاحیہ طور پر ایک بار اپنے کو نبی جیسا بتایا، بعد کو اس نے اپنے اِس قول کو خود ہی واپس لے لیا۔

اِسی طرح کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانے میں ایسے دو افراد پیدا ہوئے، جنھوں نے مذکورہ الفاظ

میں، اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا— بَہاء اللہ خاں (وفات: 1892) اور مرزا غلام احمد قادیانی (وفات: 1908)، مگر تاریخی ریکارڈ کے مطابق، یہ بات درست نہیں۔

بہاء اللہ خاں نے صرف یہ کہا تھا کہ — میں مظہرِ حق ہوں۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ اِسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی نے کبھی اپنی زبان سے یہ نہیں کہا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں، جس طرح حضرت موسیٰ، حضرت مسیح اور حضرت محمد، خدا کے پیغمبر تھے۔ انھوں نے صرف یہ کہا تھا کہ میں ظلِّ نبی ہوں، یعنی میں نبی کا سایہ ہوں۔ اِس طرح کے قول کو ایک قسم کی دیوانگی تو کہا جا سکتا ہے، لیکن اس کو حقیقی معنوں میں دعوائے نبوت نہیں کہا جا سکتا۔

ہندو گروؤں کی مثال

موجودہ زمانے میں ہندوؤں میں کچھ ایسے افراد پیدا ہوئے جن کے متعلق کہا گیا کہ وہ وقت کے پیغمبر ہیں، مگر یہ بات بھی خلاف واقعہ ہے۔ مثلاً دہلی کے نرنکاری بابا گُربچن سنگھ (وفات: 1980) کے بارے میں ایک پمفلٹ مجھے ملا، جس میں نرنکاری بابا کو وقت کا پیغمبر (prophet of the time) لکھا گیا تھا۔ میں اُن سے ان کے دہلی کے آشرم میں ملا، میں نے ان کی تقریر سنی اور ان سے گفتگو کی۔ لیکن معلوم ہوا کہ نرنکاری بابا کے کچھ معتقدین ان کے بارے میں ایسا کہتے ہیں۔ لیکن خود نرنکاری بابا نے اپنی زبان سے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ — میں خدا کا پیغمبر ہوں۔

اِسی طرح کیرلا (تری وندرم) میں ایک مشہور ہندو گرو تھے۔ اُن کا نام برہما شری کرونا کرا (وفات: 1999) تھا۔ تری وندرم میں ان کا ایک بڑا آشرم تھا، جس کا نام 'شانتی گری آشرم' ہے۔ اُن کے مشن کے کچھ لوگ مجھ سے دہلی میں ملے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے بابا جی وقت کے پیغمبر ہیں۔ اِس کے بعد میں نے خود کیرلا کا سفر کیا اور تری وندرم میں ان کے آشرم میں ان سے ملا۔ میں نے ان کے معتقدین سے پیشگی طور پر بتا دیا تھا کہ میں کس مقصد سے وہاں جا رہا ہوں۔

میں نے یہ سفر فروری 1999 میں کیا تھا۔ شانتی گری آشرم میں پہنچ کر میں اُن سے ملا۔ مجھے ایک خصوصی کمرے میں لے جایا گیا، جہاں بابا جی کے ساتھ اُن کے تقریباً پچاس معتقدین موجود تھے۔

گفتگو کے دوران میں نے بابا جی برہما شری کرونا کرا سے ایک سوال کیا۔ اس کا جواب انھوں نے واضح لفظوں میں دیا۔ وہ سوال وجواب یہ تھا:

Q: Do you calim that you are a prophet of God in the same sense in which Moses, and Jesus, and Muhammad claimed they were prophets of God.

A: No, I don't make any such claim.

اِس گفتگو میں میں نے ڈائریکٹ طور پر ان سے پوچھا کہ کیا آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ خدا کے پیغمبر ہیں۔ انھوں نے صاف طور پر کہا کہ نہیں، میں ایسا دعویٰ نہیں کرتا۔ جب انھوں نے اِس طرح کہہ دیا تو اُس کے بعد میرا سوال وجواب ختم ہوگیا۔ اُس کے بعد میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ کر اُن کی باتیں سنتا رہا اور پھر چلا آیا۔ اِس سفر میں شانتی گری آشرم میں میں نے دو دن قیام کیا۔

کیا وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پوری تاریخ میں کوئی ایسا شخص نہیں اٹھا جو اپنی زبان سے یہ دعویٰ کرے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ اِس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ایسا کلام اتنا زیادہ غیر معمولی ہے کہ کوئی غیر پیغمبر اس کو اپنی زبان سے ادا نہیں کرسکتا۔

جس طرح خدا کے سوا کوئی اور شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں خدائے ربّ العالمین ہوں، اِسی طرح کوئی شخص یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر (Prophet of God) ہوں۔ پیغمبری کا دعویٰ صرف کوئی سچا پیغمبر ہی کرسکتا ہے۔ کوئی غیر پیغمبر شخص دوسرے دوسرے الفاظ بول سکتا ہے، لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ — میں خداوندِ عالم کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں۔

پیغمبر ایک تاریخی استثنا

پیغمبر کے پیغمبر ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ پوری انسانیت کے مقابلے میں ایک استثنا (exception) ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے جتنے بھی پیغمبر آئے، سب کے سب درجے کے اعتبار سے یکساں تھے (2: 185)، لیکن رول کے اعتبار سے ان کے درمیان فرق تھا۔ پچھلے پیغمبروں کا رول زمانی رول تھا، اور پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا رول ابدی رول تھا۔

قرآن اور حدیث کی تصریح کے مطابق، کسی پیغمبر کو دوسرے پیغمبر کے اوپر شخصی فضیلت حاصل نہ تھی۔ پیغمبر ہونے کے اعتبار سے ایک کا جو درجہ تھا، وہی دوسرے کا درجہ بھی تھا۔ لیکن کارِ مفوّضہ کی نسبت سے ہر ایک کی ضرورتیں الگ الگ تھیں۔ اِس بنا پر ہر ایک کو مختلف نوعیت کے ذرائع دیے گیے۔ مثلاً حضرت موسیٰ کی نصرت قوتِ عصا کے ذریعے کی گئی، تو حضرت مسیح کی نصرت قوتِ شفا کے ذریعے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے نبیوں کے درمیان ایک واضح فرق یہ ہے کہ دوسرے تمام پیغمبر روایتی دورِ تاریخ میں آئے اور روایتی دورِ تاریخ ہی میں ان کا پیغمبرانہ رول ختم ہوگیا۔ اِس کے مقابلے میں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ یہ ہے کہ آپ تاریخ کے روایتی دور میں آئے، لیکن توسیعی معنوں میں آپ کی نبوت تاریخ کے سائنسی دور تک جاری رہی۔ اِس بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو عطیات برائے نصرت دیے گیے، وہ پچھلے اَدوار کی نسبت سے مختلف تھے۔

رول کے اِسی فرق کی بنا پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیا کے درمیان دلائل کی نسبت سے فرق پایا جاتا ہے، یعنی پچھلے انبیا کے یہاں اگر روایتی نوعیت کے دلائل ہیں تو پیغمبر اسلام کے یہاں سائنسی نوعیت کے دلائل۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے پیغمبر آئے، وہ سب تاریخ کے روایتی دور میں آئے۔ اِس کے مقابلے میں پیغمبر اسلام، تاریخ کے اُس دور میں آئے جب کہ سائنسی دور شروع ہونے والا تھا۔ اِس بنا پر یہ ہوا کہ دوسرے پیغمبروں کو حِسّی معجزے دیے گیے۔ یہ معجزے صرف پیغمبر کے معاصر (contemporary) لوگوں کے لیے دلیل تھے۔ اِن معجزوں کی استدلالی حیثیت مشاہدے پر مبنی تھی۔ پیغمبر کے بعد وہ معجزہ ختم ہوگیا، اِس لیے وہ بعد کی نسلوں کے لیے دلیل بھی نہ رہا۔ معجزے کا دلیل ہونا اُن معاصر لوگوں کے لیے ہے جو اس کو دیکھیں، وہ اُن غیر معاصر لوگوں کے لیے دلیل نہیں ہے جو اس کو صرف سنیں یا پڑھیں، مگر انھوں نے اِس کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھا ہو۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے پیغمبروں کے درمیان اگر چہ درجے کے اعتبار سے فرق نہ تھا، لیکن پیغمبر اسلام ایک ایسے دورِ تاریخ میں آئے، جب کہ آپ کی دعوت اور آپ کی

زندگی سے متعلق ہر چیز محفوظ (preserve) رہ سکتی تھی — اِس بنا پر ایسا ہوا کہ آپ کی نبوت ایک مسلسل نبوت بن گئی۔ ہر پیغمبر کو خدا کی طرف سے پیغمبری کے ساتھ دلیل بھی دی جاتی تھی جس کو قرآن میں ''بُرہان'' کہا گیا ہے۔ یہ دلیل پچھلے پیغمبروں کے لیے حسی معجزہ (physical miracle) کی صورت میں ہوتی تھی، لیکن پیغمبر اسلام کے لیے یہ دلیل تاریخ کی صورت میں ہے، ایک ایسی استثنائی تاریخ جو کسی اور انسان کے ساتھ کبھی جمع نہیں ہوئی۔

نبوتِ محمدی کا ثبوت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ثبوت، دوسرے پیغمبروں کی طرح، یہ ہے کہ آپ کی زندگی ایک تاریخی استثنا (historical exception) کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی یہی استثنائی حیثیت ہے جس کو قرآن کی سورہ نمبر 17 میں 'مقامِ محمود' (praised state) بتایا گیا ہے (18: 79)۔ مقامِ محمود سے مراد مقامِ اعتراف ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو انسانوں کے درمیان اعترافِ کامل کا درجہ حاصل ہوگا۔ آپ کے گرد ایسی استثنائی تاریخ اکھٹا ہوگی کہ خود انسان کے اپنے مانے ہوئے معیار کے مطابق، آپ کی نبوت ایک مسلّمہ نبوت بن جائے گی۔

قرآن میں 'مقامِ محمود' کی آیت سے مراد، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کے بارے میں مشہور امریکی مصنف ڈاکٹر مائکل ہارٹ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ:

> He was the only man in history who was supremly successful on both the religious and secular levels.

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں لوویسٹ پوائنٹ (lowest point) 610ء کے بعد آیا، جب کہ مکہ کی ایک غیر مسلم خاتون اُمِّ جمیل نے آپ کے پاس آکر آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: **مُذمَّماً أبینا**، یعنی تم ایک قابلِ مذمت شخص (condemned person) ہو، ہم تم کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اِس کے تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال بعد 1978 میں آپ کی زندگی کا ہائیسٹ پوائنٹ (highest point) آیا، جب کہ امریکا کے ایک غیر مسلم اسکالر ڈاکٹر مائکل ہارٹ نے 570 صفحے کی

ایک کتاب (The 100) میں اعلان کیا کہ — محمد پوری انسانی تاریخ کے سب سے زیادہ کامیاب انسان تھے۔ڈاکٹر مائکل ہارٹ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سب سے زیادہ کامیاب انسان (supremely successful) کا لفظ استعمال کیا ہے۔دوسرے لفظوں میں اِس کا مطلب یہ ہے کہ آپ پوری انسانی تاریخ میں ایک استثنا (exception) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ہر لحاظ سے آپ تمام انسانوں کے درمیان کامل طور پر ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔

مستقبل کی تصدیق

قرآن ساتویں صدی عیسوی کے رُبع اوّل میں اترا۔اُس وقت قرآن کی سورہ حم السجدہ میں یہ اعلان کیا گیا کہ — عن قریب، ہم اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور خود اُن کے اندر بھی، یہاں تک کہ اُن پر کھُل جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے (41: 53)۔

اِس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے خدا نے جس صداقت کا اعلان کیا ہے، وہ ایک ابدی صداقت ہے۔ بعد کو آنے والی تاریخی تبدیلیاں اُس کو رد نہیں کریں گی، بلکہ وہ اس کی تصدیق کرتی چلی جائیں گی۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ اعلان پوری طرح سچا ثابت ہوا۔ ظہورِ اسلام کے بعد کے زمانے میں مختلف قسم کی تبدیلیاں ہوئیں اور پھر علومِ سائنس کا دور آیا، جو گویا کہ تاریخ کا سب سے بڑا فکری انقلاب تھا۔مگر بعد کو پیش آنے والے اِن انقلابات نے دینِ محمدی کی جُزئی یا کُلّی طور پر تردید نہیں کی، بعد کے زمانے میں پیش آنے والے تمام واقعات دینِ محمدی کی صداقت کا ثبوت بنتے چلے گیے — اِس قسم کا استثنا (exception) لمبی تاریخ میں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آیا۔ یہاں ہم اِس تاریخی واقعے کے بعض پہلوؤں کا ذکر کریں گے۔

توحید کی صداقت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشن کے طور پر یہ اعلان کیا کہ خدا صرف ایک ہے۔ خدا کے سوا نہ کوئی خدا ہے اور نہ کوئی اس کا شریک۔اُس وقت ساری دنیا میں انسان کے ذہن پر شرک کا تصور غالب تھا۔لوگ مخلوقات میں تعدّد دیکھتے تھے، اِس لیے انھوں نے مان لیا کہ خدائی میں بھی

تعدّد ہے، یعنی مختلف چیزوں کو مختلف خداؤوں نے بنایا ہے۔ مثلاً پانی کو کسی اور خدا نے بنایا، اور پہاڑ کو کسی اور خدا نے بنایا، اور سورج کو کسی اور خدا نے بنایا، اور چاند کو کسی اور خدا نے بنایا، وغیرہ۔

انسانی علم مظاہرِ فطرت کا مطالعہ کرتا رہا۔ اِس مطالعے میں سیکڑوں سال بیت گیے۔ یہاں تک کہ سر آئزاک نیوٹن (وفات: 1727) کے زمانے میں یہ تعدّد گھٹ کر چار تک پہنچ گیا۔ نیوٹن کے زمانے میں سائنس دانوں نے یہ مان لیا کہ کائنات کو کنٹرول کرنے والی طاقتیں بہت سی نہیں ہیں، بلکہ صرف چار طاقتیں ہیں جو پوری کائنات کو کنٹرول کرتی ہیں۔ وہ چار طاقتیں یہ ہیں:

1- قوتِ کشش (gravitational force)

2- برقی مقناطیسی قوت (electormagnetic force)

3- طاقت ور نیوکلیر قوت (strong nuclear force)

4- کم زور نیوکلیر قوت (weak nuclear force)

مگر مسئلہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ نیوٹن کے زمانے سے کائنات کا جو سائنسی مطالعہ شروع ہوا تھا، اُس سے دن بدن یہ واضح ہوتا چلا گیا کہ وسیع کائنات میں اگر چہ ان گنت چیزیں ہیں اور سب کی سب متحرک ہیں، لیکن اِن تمام متحرک اور متنوع چیزوں کے درمیان حیرت ناک حد تک ہم آہنگی (harmony) پائی جاتی ہے۔ تمام چیزیں کامل توافُق کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ یہ ہم آہنگی اور توافق اُس وقت ممکن نہیں ہوسکتی جب کہ کائنات کو متعدد طاقتیں کنٹرول کر رہی ہوں۔ چناں چہ سائنس داں مسلسل اِس کوشش میں تھے کہ وہ اِس معاملے میں تعدّد کو توحّد تک پہنچائیں۔ آخر کار برٹش سائنس داں اسٹفن ہاکنگ (Stephen Hawking) نے یہ کام اطمینان بخش طور پر انجام دیا۔

اسٹفن ہاکنگ، نظریاتی فزکس کا سب سے بڑا سائنس داں مانا جاتا ہے۔ اس نے خالص سائنسی متھڈ کو استعمال کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ کائنات کو کنٹرول کرنے والی صرف ایک طاقت ہے۔ اِس نظریہ کو سنگل اسٹرنگ تھیوری (single string theory) کہا جاتا ہے۔ اِس طرح اِس معاملے میں سائنسی نقطۂ نظر اور توحید کا اسلامی نقطۂ نظر دونوں ایک ہو گئے۔ توحید کا نقطۂ نظر جس کائنات

کا تقاضا کر رہا تھا، کائنات کی وہی نوعیت سائنسی مطالعے سے ثابت ہوگئی۔

علمِ قلیل

قرآن کی سورہ الاسراء میں اعلان کیا گیا تھا کہ انسان کو صرف علمِ قلیل حاصل ہے (17: 85)۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان تخلیقی طور پر محدودیت کا حامل ہے۔ اپنی اِس فطری محدودیت کی وجہ سے وہ صرف علمِ قلیل تک پہنچ سکتا ہے، علمِ کثیر کا حصول اس کے لیے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں انسان کو خدا کے پیغمبر کے اوپر ایمان لانا چاہیے۔ پیغمبر وحیِ الٰہی کے ذریعے اُس بات کو جان لیتا ہے جس کو انسان اپنی محدودیت کی بنا پر نہیں جان سکتا۔ اِس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کی ہدایت پیغمبر کے ذریعے حاصل کرے۔ اِس معاملے میں انسان کے لیے اس کے سوا کوئی اور انتخاب موجود نہیں۔

قرآن میں یہ بات ساتویں صدی عیسوی کے رُبعِ اوّل میں کہی گئی تھی۔ اُس وقت انسان اِس کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوا۔ قرآن کی اِس تنبیہہ کے باوجود بڑے بڑے فلسفیانہ دماغ علمِ کُلّی کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ آخر کار کئی ہزار سال کی ناکام کوشش کے بعد جدید سائنس ظہور میں آئی۔ جدید سائنس نے دوربین اور خوردبین جیسے بہت سے طریقے دریافت کیے۔ اب یہ یقین کیا جانے لگا کہ سائنسی مطالعے کے ذریعے انسان اُس مطلوب علم تک پہنچ جائے گا، جہاں تک پچھلے زمانے کا انسان نہیں پہنچ سکا تھا۔

یہ تلاش نیوٹن کے بعد سے عالمِ کبیر (macro world) کی سطح پر چلتی رہی۔ آخر کار آئن اسٹائن (وفات: 1955) کا زمانہ آیا، جب کہ انسانی علم عالمِ صغیر (micro world) تک پہنچ گیا۔ اب یہ معلوم ہوا کہ جس مادّے کو پہلے قابلِ مشاہدہ (visible) سمجھا جاتا تھا، وہ بھی اپنے آخری تجزیے میں قابلِ مشاہدہ نہیں۔ یہاں پہنچ کر یہ مان لیا گیا کہ سائنسی طریقہ انسان کو علمِ کُلی تک پہنچانے میں حتمی طور پر ناکام ہے۔

سائنس کی یہ علمی ناکامی پہلے صرف عالمِ صغیر کی حد تک دریافت ہوئی تھی، مگر بعد کی تحقیقات نے بتایا کہ خود عالمِ کبیر بھی انسان کے لیے حتمی طور پر ناقابلِ مشاہدہ ہے۔ سائنس کے آلات مادی دنیا کے بارے میں انسان کو کلی علم تک پہنچانے سے عاجز ہیں۔ انسان جس طرح عالمِ صغیر کے بارے میں علمِ قلیل رکھتا ہے، اُسی طرح وہ عالمِ کبیر کے بارے میں بھی صرف علم قلیل کا حامل ہے، اِس سے زیادہ

اور کچھ نہیں۔ یہ نظریہ بلیک ہول (Black Hole) کی دریافت کے بعد سامنے آیا۔

ایمسٹرڈم (ہالینڈ) میں ماہرینِ طبیعیات (physicists) کی ایک انٹرنیشنل کانفرنس 2007 میں ہوئی۔ اِس موقع پر فزکس کا نوبل پرائز پانے والے ایک امریکی سائنس داں جیمس واٹسن (James Watson Cronin) نے اپنے مقالے میں بتایا کہ — ہماری کائنات کا 96 فی صد حصہ ڈارک میٹر پر مشتمل ہے۔ اُس کی روشنی یا ریڈی ایشن ہم تک نہیں پہنچتی، اِس لیے ہم اُس کو ڈائرکٹ طور پر نہیں دیکھ سکتے۔ موجودہ آلات کے ذریعے ہم اُن کا احاطہ نہیں کر سکتے:

> Dark matter cannot be detected directly, because it does not emit or reflect light or radiation — or not enough to be picked up by available tools. (*The Times of India,* New Delhi, September 23, 2007, p. 20)

جیمس واٹسن نے اپنے مذکورہ بیان میں مزید کہا کہ — ہم سمجھتے تھے کہ ہم کائنات کو جانتے ہیں، مگر معلوم ہوا کہ ہم کائنات کے صرف چار فی صد حصے ہی کو براہِ راست طور پر جان سکتے ہیں:

> We think we understand the universe, but we only understand four percent of everything.

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ علم کے بارے میں مستقبل نے اُسی بات کی تصدیق کی جو بہت پہلے اُس کتاب میں کہہ دی گئی تھی جو پیغمبر اسلام، خدا کی طرف سے لائے تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے دماغ اِس یقین کے ساتھ اپنی تلاش میں لگے ہوئے تھے کہ وہ علمِ کُلی تک پہنچ سکتے ہیں، مگر قرآن میں پیشگی طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ اپنی محدودیت کی بنا پر انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ خود اپنی کوشش سے علمِ کلی تک پہنچ سکے۔ آخر کار خود انسانی علم نے قرآن کے بیان کی تصدیق کر دی۔ مستقبل نے انسانی مفروضے کو رد کر دیا اور قرآن کے بیان کی کامل تصدیق کر دی۔

دنیائے فانی کا نظریہ

قرآن میں واضح الفاظ میں موجودہ دنیا کے بارے میں یہ تصور دیا گیا تھا کہ یہ زمینی سیّارہ جس پر انسان آباد ہے، اس کی ایک محدود عمر ہے۔ یہاں انسان اپنے لیے جنت (paradise) کی تعمیر

نہیں کرسکتا۔ یہ دنیا عارضی طور پر امتحان کے لیے بنی ہے اور اس کے بعد یہاں سے اُن تمام چیزوں کا خاتمہ کردیا جائے گا جس کی مدد سے انسان یہاں زندہ رہتا ہے اور اپنے لیے اپنی مطلوب دنیا بنانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ یہاں اِس سلسلے میں دو آیتیں نقل کی جارہی ہیں :

1- یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَيۡرَ الۡاَرۡضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوۡا لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ (14: 48) یعنی جس دن یہ زمین ایک دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی۔ اور سب ایک زبردست اللہ کے سامنے پیش ہوں گے۔

2- اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَى الۡاَرۡضِ زِيۡنَةً لَّهَا لِنَبۡلُوَهُمۡ اَيُّهُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ○ وَاِنَّا لَجٰعِلُوۡنَ مَا عَلَيۡهَا صَعِيۡدًا جُرُزًا (18: 7-8) یعنی جو کچھ زمین پر ہے، اس کو ہم نے زمین کی رونق بنایا ہے، تاکہ ہم لوگوں کو جانچیں کہ اُن میں کون اچھا عمل کرنے والا ہے۔ اور ہم زمین کی تمام چیزوں کو ایک صاف میدان بنا دیں گے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت کے مطابق، موجودہ سیّارۂ زمین پر جو زندگی بخش حالات ہیں، وہ حتمی طور پر ختم ہونے والے ہیں اور مسلسل ان کا کاؤنٹ ڈاؤن ہورہا ہے۔ لیکن بڑے بڑے انسانی دماغوں نے اِس کے برعکس نظریہ قائم کیا۔ سُقراط اور افلاطون اور ارسطو سے لے کر موجودہ زمانے کے رہنماؤں تک ہر ایک نے یہ نظریہ قائم کیا کہ وہ انسانیت کے مستقبل کو آئڈیل دَور کی طرف لے جارہے ہیں — آئڈیل اسٹیٹ، آئڈیل سماج اور آئڈیل نظام، وغیرہ۔ اِس معاملے میں لوگوں کا واہمہ (obsession) اتنا بڑھا ہوا تھا کہ بار بار برعکس نتیجہ نکلنے کے باوجود انھوں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔

چارلس ڈارون (وفات: 1882) کا عضویاتی ارتقا (organic evolution) کا نظریہ سامنے آیا تو اس کے وسیع تر انطباق کے تحت یہ یقین کرلیا گیا کہ انسان کی تمدنی تاریخ مسلسل بہتر سے زیادہ بہتر کی طرف بڑھ رہی ہے۔ صنعتی سائنس کے ظہور کے بعد اِس نظریے کو مزید تقویت ملی اور یہ یقین کرلیا گیا کہ موجودہ دنیا کو جنّتی دنیا میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

اَلوِن ٹافلر کی کتاب فیوچر شاک (Future Shock) پہلی بار 1970 میں چھپی۔

اِس کتاب میں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ دنیا ترقی کرکے انڈسٹریل ایج (industrial age) میں پہنچی تھی۔ وہ مزید ترقی کرکے سپر انڈسٹریل ایج (super industrial age) کی طرف تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ امریکا کو اسپیس ٹکنالوجی میں کچھ ترقی ہوئی تو اُس نے اعلان کردیا کہ اب ہم زمینی تہذیب سے آگے بڑھ کر خلائی تہذیب (space civilization) کے دور تک پہنچ رہے ہیں۔ اب ہم زمین سے چاند تک سفر کریں اور وہاں سے مرّیخ (Mars) تک پہنچ جائیں گے:

> We want to build a space civilization for tomorrow from where humans can travel to the Moon and from there to Mars (*The Times of India,* September 26, 2007, p. 21).

یہ باتیں ہورہی تھیں کہ ہماری زمین پر وہ اختتامی دور شروع ہوگیا جس کو گلوبل وارمنگ کہا جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ (UNO) موجودہ دنیا کا سب سے بڑا عالمی ادارہ ہے۔ اقوامِ متحدہ کے تحت، ایک انٹرنیشنل پینل بنایا گیا۔ اِس پینل میں ڈھائی ہزار سائنس داں شامل کیے گئے۔ اِن سائنس دانوں کا تعلق دنیا کے ایک سو تیس (130) ملکوں سے تھا۔ یہ پینل موسمیاتی تبدیلی پر رسرچ کے لیے تھا۔ اِس پینل نے اپنی رسرچ مکمل کرکے اس کی تفصیلی رپورٹ اقوامِ متحدہ کے حوالے کردی ہے۔

یہ کسی ایک کانفرنس کی بات نہیں۔ آج کل تقریباً ہر روز میڈیا میں اِس قسم کی خبریں آرہی ہیں۔ تمام دنیا کے سائنس داں مسلسل یہ کہہ رہے ہیں کہ زمین پر زندگی کے اسباب کا مسلسل خاتمہ ہورہا ہے۔ کئی انواعِ حیات (species) اب تک ناموافق موسم کی وجہ سے ختم ہوچکی ہیں۔ اِس سلسلے کی ایک رپورٹ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (3 جنوری 2007) میں شائع ہوئی۔ اُس کا عنوان یہ تھا — انتباہی نشانیاں (Warning Signs)۔

اِس سلسلے کا ایک اور حوالہ یہ ہے۔ مشہور سائنس داں جیمس لولاک (James Lovelock) نے جدید سائنسی معلومات کی روشنی میں کہا ہے کہ 2050ء تک سطحِ ارض کا بڑا حصہ خشک ہوچکا ہوگا۔ بیش تر زندگیاں ختم ہوجائیں گی۔ ہم ایک ایسے انجام کے کنارے پہنچ چکے ہیں، جب کہ ایک ایک کرکے لوگ مرنے لگیں گے، یہاں تک کہ سارے لوگ ختم ہوجائیں گے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہوگا جس کو اِس سے

پہلے انسان نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ جو کچھ ہونے والا ہے، اُس میں اگر بیس فی صد آدمی بھی زندہ بچ جائیں تو وہ بہت خوش قسمت انسان ہوں گے:

We are on the edge of the greatest die-off humanity has ever seen. We will be lucky if 20% of us survive what is coming. (*The Times of India,* May 18, 2007, p. 22)

گلوبل وارمنگ کا موضوع موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ برننگ ٹاپک (burning topic) بن چکا ہے۔ اِس موضوع پر کثرت سے رپورٹیں اور مضامین اور کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ کسی کو مزید تفصیل جاننا ہوتو وہ انٹرنیٹ کے ذریعے بہ آسانی یہ تفصیلات جان سکتا ہے۔

غیر معمولی کامیابی

ڈاکٹر مائکل ہارٹ نے اپنی کتاب (*The 100*) میں لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام نے نہ صرف مذہبی سطح پر، بلکہ سیکولر سطح پر بھی استثنائی کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اعلیٰ کامیابی کے معاملے میں پوری انسانی تاریخ میں محمد کا کوئی ہم سر نہیں۔ اِس سلسلے میں اُن کے چند جملے یہ ہیں:

The most astonishing series of conquests in human history (p. 35). The largest empire that the world had yet seen (p. 35). The most influential political leader of all time (p. 39). It is this unparalleled combination of secular and religious influence which I feel entitles Muhammad to be considered the most influential single figure in human history (p. 40).

یعنی محمد کی کامیابی پوری تاریخ میں عجیب ترین سلسلۂ فتوحات کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے نے اور اُن کے ساتھیوں نے تاریخ کا سب سے بڑا ایمپائر قائم کیا۔ وہ پوری تاریخ کے سب سے زیادہ بااثر سیاسی رہ نما تھے۔ مذہبی اور سیکولر دونوں اعتبار سے ان کی اِس بے نظیر کامیابی کا تقاضا ہے کہ ان کو پوری تاریخ کا واحد سب سے زیادہ کامیاب انسان قرار دیا جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ حقیقت اتنی زیادہ بدیہی ہے کہ عام طور پر

مورخین نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ تاریخ میں بڑے بڑے ایمپائر قائم ہوئے۔ مثلاً یونانی ایمپائر، رومن ایمپائر، ساسانی ایمپائر، برٹش ایمپائر، مگر کوئی بھی ایمپائر اسلامی فتوحات کے برابر نہیں۔ پیغمبر اسلام کا یہ تاریخی استثنا ابھی تک قائم ہے۔ یہ اُن دلائل میں سے ایک دلیل ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ خدا کے پیغمبر تھے۔ اور آپ کو خدا کی خصوصی مدد حاصل تھی۔ خدا کی مدد کے بغیر کوئی بھی شخص اِس قسم کی استثنائی کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔

نظریۂ امن

امن کے بارے میں انسان ہمیشہ سوچتا رہا ہے۔ قدیم زمانے میں امن ایک قسم کا انتظامی معاملہ سمجھا جاتا تھا، یعنی امن ایک ایسی چیز تھی جس کو حاکمانہ اختیار کے تحت قائم کیا جاتا ہے۔ اِس نظریے کے تحت ارباب اختیار نے امن قائم کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً پیکس رومانا (Pax Romana)، پیکس برٹانکا (Pax Britanica)، پیکس امریکانا (Pax Americana)، وغیرہ۔ مگر اِس قسم کا سیاسی امن صرف جُزئی طور پر کسی سماج کے لیے مفید ہوسکتا ہے۔ اِس لیے وہ اہلِ علم کے درمیان مطلوب امن کا درجہ حاصل نہ کرسکا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے امن پر مبنی ایک باقاعدہ نظریہ (ideology) وجود میں آیا۔ اِس کو عام طور پر پیسی فزم (pacifism) کہا جاتا ہے۔ پیسی فزم کے نظریے کے تحت موجودہ زمانے میں متعدد مفکرین پیدا ہوئے۔ مثلاً سموئل کانٹ (Samuel Cant)، مارکس اریلیس (Marcus Aurelius) اور مہاتما گاندھی وغیرہ۔ اِس نظریے کی حمایت میں بہت سے مقالات اور کتابیں شائع ہوئیں۔ انسائکلو پیڈیا برٹانکا میں اِس موضوع پر تقریباً دس صفحے کا ایک مقالہ شامل ہے۔ اِس موضوع پر شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ یہاں ہم صرف تین کتابوں کا نام درج کرتے ہیں:

1. Raymon Raymond Aron, *Peace and War*, 1966
2. E.L. Alen, Francis E. Pollard, *The Case for Pacifism and Conscientious Objection*, 1946
3. Aldous Huxley, *An encyclopaedia of Pacifism*, 1937

لیکن امن کے رہنما اور مفکرین کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام افراد جس امن تک پہنچے، وہ صرف ایک منفی امن (negative peace) تھا۔ جہاں تک مثبت امن (positive peace) کا تعلق ہے، وہاں تک کوئی بھی شخص نہ پہنچ سکا۔ امن کے تمام مفکرین جس امن کی بات کرتے ہیں، وہ جنگ اور تشدد کے مقابلے میں ہوتی ہے۔ چناں چہ امن کی تعریف جنگ اور تشدد کی غیر موجودگی (absence of war and violence) سے کی جاتی ہے۔ اِسی تصور کی بنا پر یہ تمام افراد مفروضہ دشمنانِ امن کے خلاف اقدام کرتے رہے۔ کیوں کہ اُن کے نزدیک اِن دشمن طاقتوں کے خاتمے سے دنیا میں امن قائم ہوتا تھا۔

اِس نظریۂ امن میں امن کو مثبت قدر (positive value) کا مقام حاصل نہ ہو سکا۔ اِس نظریۂ امن میں امن کو صرف ایک طریقۂ کار (method) کا درجہ حاصل ہوا، نہ کہ وسیع تر معنوں میں ایک نظریۂ حیات (ideology) کا درجہ۔

پیسی فزم (pacifism) کے معاملے میں مہاتما گاندھی کا نام نمایاں طور پر شامل ہے۔ لیکن ان کا نظریۂ امن بھی ایک منفی نظریۂ امن کی حیثیت رکھتا ہے۔ نئی دہلی میں ایک خصوصی سیمنار رہوا۔ اِس سیمنار کی مکمل روداد نئی دہلی کے انگریزی اخبار 'دی پائنیر' (26 جنوری 1997) میں شائع ہوئی۔ اِس سیمنار میں راقم الحروف کے علاوہ حسب ذیل افراد شریک ہوئے — رام چندر گاندھی، رویندر کمار، سبرا تا مُکھرجی، کے آر ملکانی۔ اِس سیمنار کا موضوع یہ تھا — کیا گاندھی آج کامیاب ہوتے:

Could Gandhi have succeeded today?

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ گاندھی ماضی میں بھی کامیاب نہیں ہوئے، پھر وہ آج کیسے کامیاب ہوسکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ گاندھی کا مقصد ایک پُرامن انقلاب لانا تھا، مگر اپنے پیشِ نظر مقصد کے مطابق، وہ کوئی پُرامن انقلاب نہ لا سکے۔ انھوں نے جو کچھ کیا، وہ انقلاب نہ تھا، بلکہ محدود معنوں میں صرف حکم رانوں کی تبدیلی (coup) تھا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک ناگہانی انقلاب (coup) تھا، نہ کہ کوئی حقیقی انقلاب۔ میری یہ تقریر لفظ بہ لفظ مذکورہ اخبار میں چھپی۔ میری

تقریر کے ایک جملے کو لے کر اخبار نے اُس کا عنوان اِن الفاظ میں قائم کیا تھا:

Gandhi presided over a non-violent coup, he didn't usher in a revolution.

یہی معاملہ ہر اُس رہنما اور مفکر کا ہوا جو امن (peace) کے نام پر کام کرنے کے لیے اٹھا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ انسانی زندگی میں پرامن واقعے کو ظہور میں لانے کے لیے ایک پُرامن آئڈیالوجی (peaceful ideology) درکار رہے۔ چوں کہ کوئی شخص پُرامن آئڈیالوجی کو دریافت نہ کرسکا، اِس لیے وہ پُرامن زندگی کی تشکیل بھی نہ کرسکا۔

رہنماؤں کی اِس ناکامی کا مشترک سبب یہ ہے کہ ہر ایک امن کو سیاسی اقتدار کے ساتھ جوڑے ہوئے تھا، ہر ایک نے وقت کے سیاسی اقتدار کو امن کی راہ میں رکاوٹ سمجھا، ہر ایک اِس طرح سوچتا رہا کہ اگر امن کو حاصل کرنا ہے تو سب سے پہلے سیاسی اقتدار کی رکاوٹ کو ختم کرنا ہوگا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امن کی ہر تحریک وقت کے سیاسی اقتدار سے ٹکرا گئی۔ فطری طور پر اربابِ اقتدار نے بھی اپنی طاقت کو ان تحریکوں کے خلاف استعمال کیا۔ اِس طرح دونوں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہوگیا۔ امن کے نام پر آخر میں جو چیز قائم ہوئی، وہ صرف بدامنی اور انارکی (anarchy) تھی۔ اِس کی ایک مثال 1947 کے بعد بننے والے ''گاندھیائی انڈیا'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

تاریخ کی ان تمام مثالوں کے برعکس، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نیا فارمولا دریافت کیا۔ اِس فارمولے کا علم آپ کو خدا کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اِسی لیے قرآن میں اُس کی بابت یہ الفاظ آئے ہیں: عَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا (48:27) یعنی خدا نے وہ بات جانی، جس سے انسان بے خبر تھا۔

امن کا فارمولا

امن کا یہ فارمولا جو خدا نے اپنے علم کے تحت بتایا، وہ کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ ہر مسئلہ کے ساتھ مواقع موجود رہتے ہیں۔ اِس لیے تم مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو:

Ignore the problem, and avail the opportunities.

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی رہنمائی سے اِس فارمولے کو سمجھا اور اس کو حدیبیہ ایگری مینٹ (628ء) کی شکل میں استعمال کیا۔ حدیبیہ ایگری مینٹ گویا کہ امن فارمولے کا ایک کامیاب مظاہرہ (demonstration) تھا۔ (حدیبیہ ایگری مینٹ کی تفصیلات میری تحریروں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً ''دعوہ ایکٹوزم''، الرسالہ، فروری 2007)۔

امن کا یہ فارمولا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کبھی کوئی شخص دریافت نہ کرسکا۔ آپ نے اگرچہ اپنی زندگی میں اِس فارمولے کو نہایت کامیاب طور پر استعمال کیا تھا، لیکن میرے علم کے مطابق، کوئی بھی شخص اِس کو حقیقی طور پر سمجھ نہ سکا، حتی کہ خود مسلمان بھی اِس فارمولے کو سمجھنے سے مکمل طور پر عاجز رہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمان ہر جگہ مسائل (problems) سے لڑ رہے ہیں۔ وہ اِس حقیقت کو جان نہ سکے کہ مسائل کے باوجود اُن کے لیے نہایت اعلیٰ مواقع موجود ہیں۔ اُن کو چاہیے تھا کہ وہ مسائل کو نظر انداز کرتے اور مواقع (opportunities) کو استعمال کرتے، لیکن اپنی بے شعوری کی بنا پر وہ اِس حکمت کو دریافت کرنے میں ناکام رہے۔

پیغمبر اسلام کے اِس امن فارمولے نے تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اِس نئے دور کو ایک لفظ میں ڈی سنٹرلائزیشن آف پولٹکل پاور (decentralization of political power) کہا جاسکتا ہے۔ اِس بات کو قرآن میں وأخریٰ تحبّونها (61: 13) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس قرآنی آیت کے مطابق، سیاسی اقتدار صرف ایک ثانوی چیز ہے۔ اولین چیزیں وہ ہیں جو سیاسی اقتدار کے باہر پائی جاتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں انسٹی ٹیوشن (institution) کا تصور اِسی تاریخی پراسس (historical process) کا اگلا مرحلہ ہے۔

موجودہ زمانے میں ایسا ہوا ہے کہ سیاسی اقتدار کے باہر مختلف مقاصد کے لیے انسٹی ٹیوشن بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً تعلیم کے لیے، صنعت وتجارت کے لیے، سماجی فلاح کے لیے اور مشنری ورک کے لیے، وغیرہ۔ اِن اداروں کے ذریعے اتنے بڑے بڑے کام لیے جارہے ہیں کہ لوگوں نے حکومتی اقتدار (political power) کے بغیر مختلف عنوانات سے اپنے ایمپائر بنا رکھے ہیں۔

اِس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ماضی کے برعکس، حکومت کا دائرہ سمٹ کر اب صرف انتظامیہ (administration) تک محدود ہو گیا ہے۔ یہ تاریخ کی ایک عظیم تبدیلی ہے، مگر اِس تبدیلی کا آغاز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کیا تھا۔

اِس تبدیلی نے اِس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ حکومت سے ٹکراؤ کیے بغیر خالص پُرامن طریقِ کار کے ذریعے بہت بڑے بڑے کام کیے جاسکیں۔ باشعور قوموں نے اِس امکان سے فائدہ اٹھا کر عملاً ایسا کر رکھا ہے۔ چناں چہ اِن لوگوں نے حکومت سے باہر رہتے ہوئے اور حکومت سے ٹکراؤ کیے بغیر انتہائی اعلیٰ پیمانے پر اپنا میڈیا ایمپائر اور ایجوکیشنل ایمپائر اور انڈسٹریل ایمپائر اور مشنری ایمپائر بنالیا ہے۔ مگر جہاں تک اِس امکان کی دریافت کا تعلق ہے، وہ پہلی بار پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی رہنمائی کے تحت حاصل ہوئی۔ اِس استثنائی معرفت کی اِس کے سوا کوئی اور توجیہہ نہیں کی جاسکتی کہ یہ مانا جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے پیغمبر تھے۔

ایک غلط فہمی

کچھ لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ آج کی دنیا میں بہت سے دوسرے لوگ خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے مانے جاتے ہیں مثلاً ہندو لوگ رام اور کرشن کو پیغمبر کا درجہ دیتے ہیں۔ اِسی طرح مسیحی لوگ حضرت مسیح کو خدا کی طرف سے بھیجا ہوا خصوصی رہنما سمجھتے ہیں۔ مگر یہ صرف ایک غلط فہمی ہے، اِس کے سوا اور کچھ نہیں۔

جہاں تک رام اور کرشن کا تعلق ہے، اِس بحث کے ذیل میں اُن کو زیرِ غور لانا ممکن نہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ رام اور کرشن ایک افسانوی شخصیت (mythological figure) کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کو تاریخی شخصیت (historical figure) کا درجہ حاصل نہیں۔ انڈیا کے کسی بھی مستند تاریخی ریکارڈ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رام اور کرشن کوئی حقیقی شخصیت تھے۔ رام اور کرشن کا کوئی ریفرنس نہ انڈیا کی تاریخ میں پایا جاتا ہے اور نہ عالمی تاریخ میں۔

مثال کے طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہم خالص تاریخی ریکارڈ کی بنیاد پر یہ جانتے ہیں کہ وہ 570ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے 610ء میں مکہ میں اپنی پیغمبری کا اعلان کیا اور

اپنے مشن کا آغاز کیا۔ 622ء میں آپ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گیے اور وہاں انھوں نے اسلام کی پہلی اسٹیٹ (city state) قائم کی۔ 632ء میں آپ کی وفات مدینہ میں ہوئی اور وہیں پر آپ دفن کیے گیے۔ آپ کی قبراب بھی مدینہ میں موجود ہے۔ اِس قسم کی تاریخی معلومات (historical data) نہ رام کے بارے میں دست یاب ہیں اور نہ کرشن کے بارے میں۔

یہ حقیقت اتنی زیادہ واضح ہے کہ خود ہندو اسکالر اس کو مانتے ہیں۔ ہندو مصنفین نے اِس موضوع پر مقالات اور کتابوں کی صورت میں بہت زیادہ لکھا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

> The JNU historians reject the Ramayana as a source of historiography: "The events of the stroy of Rama, originally told in the Rama-Katha which is no longer available to us, were rewritten in the form of a long epic poem, the Ramayana, by Valmiki. Since this is a poem and much of it could have been fictional, including characters and places, historians cannot accept the personalities, the events or the locations as historically authentic unless there is other supporting evidence from sources regarded as more reliable by historians. Very often historical evidence contradicts popular beliefs." (Koenraad Elst: Ram Janmabhoomi Vs Babri Masjid, Voice of India, New Delhi, 1990 p. 14)

تحریکوں کی تاریخ

لارڈ ایکٹن (John Emerich Edward Dalberg Acton) مشہور مغربی مفکر ہے۔ وہ 1834ء میں پیدا ہوا اور 1902ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے سیاست اور حکومت کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اپنے مطالعے کی بنیاد پر اس نے سیاسی اقتدار (political power) کے بارے میں کہا کہ — اقتدار بگاڑتا ہے، اور کامل اقتدار بالکل بگاڑ دیتا ہے:

Power corrupts, and absolute power corrupts absolutely.

یہ تبصرہ بالکل درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو جب بھی اقتدار ملتا ہے تو وہ بگڑ جاتا ہے۔

دوسروں کی سیاسی بُرائی بتانے والے، اقتدار پاتے ہی خود بھی اُسی قسم کی برائی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ انسان کے اندر اپنی بڑائی کا احساس نہایت گہرے طور پر موجود ہے۔ اقتدار اِس احساس کو غذا دیتا ہے، وہ اس کو ختم نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی اقتدار تک پہنچتے ہی تمام لوگ بگڑ جاتے ہیں۔ اِس سلسلے میں تاریخ کی چند مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں:

1- تحریکوں کی تاریخ میں بہت سے مشہور لوگوں کے نام آتے ہیں۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ اِن لوگوں کو سیاسی ہنگامہ کرنے والے تو بہت سے لوگ ملے، لیکن اِن میں سے کسی کو بھی قابلِ اعتماد ساتھی نہ مل سکے۔ مشہور فلسفی ارسطو (Aristotle) اِس معاملے کی ایک تاریخی مثال ہے۔ وہ یونان میں 384 قبل مسیح میں پیدا ہوا اور 322 قبل مسیح میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ شاہِ یونان الیگزنڈر دی گریٹ (Alexander the Great) کا استاد تھا۔ وہ آئڈیل اسٹیٹ اور فلاسفر کنگ میں یقین رکھتا تھا۔

اس نے اِس مقصد کے لیے الیگزنڈر کی تعلیم و تربیت اُس وقت کی، جب کہ وہ ابھی شہزادہ تھا۔ ارسطو کو یقین تھا کہ الیگزنڈر ایک فلاسفر کنگ بنے گا اور اس کے خوابوں کی آئڈیل اسٹیٹ قائم کرے گا۔ لیکن بڑا ہونے کے بعد جب الیگزنڈر 336 قبل مسیح میں با قاعدہ بادشاہ بنا تو اس نے ارسطو کے راستے کو چھوڑ دیا اور عالمی فتوحات کے لیے نکل پڑا۔ اس کا سیاسی خواب ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ وہ صرف 33 سال کی عمر میں بیمار ہو کر بابل (عراق) میں مر گیا۔

2- یہی معاملہ کارل مارکس (Karl Marx) کا ہے۔ وہ 1818ء میں جرمنی میں پیدا ہوا اور 1883ء میں لندن میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کے افکار کی بنیاد پر بہت بڑی کمیونسٹ تحریک اٹھی۔ 1917ء میں کمیونسٹ پارٹی روس میں حکومت کرنے میں کامیاب ہوگئی، لیکن مارکس کے تمام ساتھی اصل مارکسی راستے سے ہٹ گیے۔ ایک کمیونسٹ مسٹر میلوون جیلاس (Milovan Djilas) کے الفاظ میں، طبقاتی فرق کو ختم کرنے کے نام پر کمونسٹ گروہ خود ایک نیا طبقہ (new class) بن گیا۔

ٹراٹسکی (Leon Trotesky) روس میں 1879ء میں پیدا ہوا اور 1940ء میں میکسکو سٹی میں اس کو قتل کر دیا گیا۔ ٹراٹسکی کمیونسٹ پارٹی میں لینن کے بعد نمبر دو کا لیڈر تھا، مگر 1917ء کے بعد

اُس نے دیکھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے لوگ سیاسی بگاڑ کا شکار ہو گئے۔ اس نے انقلاب سے غدّاری (Revolution Betrayed) کے نام سے ایک کتاب لکھی جو 1937ء میں چھپی۔ اِس کے بعد خود روس کے کمیونسٹ لیڈروں نے اس کو ہلاک کر دیا۔

3- یہی منظر خود انڈیا میں نظر آتا ہے۔ مہاتما گاندھی نے زبردست سیاسی تحریک چلائی۔ ان کے ساتھ ایک بھیڑ اکھٹا ہوگئی، لیکن 1947ء میں آزادی کے بعد ان کی پارٹی کے تمام لوگ مہاتما گاندھی کے راستے سے ہٹ گیے۔ یہ منظر دیکھ کر خود مہاتما گاندھی نے 1947ء کے بعد اپنی پارٹی کے لوگوں کے بارے میں کہا تھا — اب میری کون سنے گا۔ مہاتما گاندھی کے اِس جملے کو لے کر ایک کتاب ہندی میں لکھی گئی۔ اس کتاب کا ٹائٹل یہی ہے کہ — "اب میری کون سنے گا"۔ 15 اگست 1947 کو انڈیا میں سیاسی آزادی آئی۔ اس کے بعد 30 جنوری 1948ء کو دہلی میں مہاتما گاندھی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

ہیروؤں کی جماعت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو استثنائی واقعات جمع ہوئے، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کی ایک ایسی ٹیم بنانے میں کامیاب ہوئے، جیسی ٹیم پوری تاریخ میں کوئی نہ بنا سکا۔ اِس واقعے کا اعتراف مورخین نے واضح الفاظ میں کیا ہے۔ مثلاً مشہور برطانی مستشرق ڈیوڈ سموئل مارگولیتھ (David Samuel Margoliouth) 1885 میں لندن میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربک ڈپارٹمنٹ کا پروفیسر تھا۔ اُس نے عرب تاریخ اور اسلامی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انسائکلو پیڈیا برٹانکا نے اُس کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں — اُس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کو اسلامی موضوعات پر بہت سے عرب علما سے بھی زیادہ واقفیت حاصل تھی:

He came to be regarded as more knowledgeable on Islamic matters than most Arab scholars.

اسلام اور عرب تاریخ کے موضوع پر اس کی کئی کتابیں ہیں۔ اس کی ایک کتاب وہ ہے جو 1905 میں چھپی۔ یہ کتاب اسلام کے ظہور کے موضوع پر ہے اور اس کا نام یہ ہے:

Muhammad and the Rise of Islam

اِس کتاب میں پروفیسر مارگولیتھ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو ہیروؤں کی ایک قوم (a nation of heroes) کا نام دیا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اصحابِ رسول کا گروہ ایک ایسا گروہ تھا، جیسا گروہ تاریخ میں کسی اور شخص کے گرد اکھٹا نہیں ہوا۔

اِسی طرح فلِپ ہِٹّی (Philip K. Hitti) مشہور اسکالر ہیں۔ وہ 1886 میں لبنان میں پیدا ہوئے اور امریکا میں 1978 میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ عربی زبان اور اسلامی علوم کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ امریکا کی کئی یونیورسٹیوں میں عربی زبان اور مشرقی علوم کے پروفیسر رہے ہیں۔ ان کی ایک مشہور کتاب عرب تاریخ پر ہے۔ اُس کا نام یہ ہے: *History of the Arabs*

ان کی یہ کتاب پہلی بار 1937 میں چھپی۔ اِس کتاب میں انھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب (companions) کے تذکرے کے تحت لکھا ہے کہ — پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے عرب کی بنجر زمین جادو کے ذریعے ''ہیروؤں کی نرسری'' میں تبدیل کردی گئی ہو، ایسے ہیرو جن کے مثل، تعداد یا نوعیت میں، کہیں اور پانا سخت مشکل ہے:

> After the death of the prophet sterile Arabia seems to have been converted as if by magic into a nursery of heroes the like of whom, both in numbur and quality, is hard to find anywhere. (p. 142)

مستقبل کی دنیا

موجودہ زمانے میں دو مختلف آئڈیالوجی اُبھری — سیکولر آئڈیالوجی اور مذہبی آئڈیالوجی۔ سیکولر آئڈیالوجی سے مراد وہ آئڈیالوجی ہے جو خالص انسانی عقل (reason) کی بنیاد پر بنائی گئی ہے۔ اِس کے مقابلے میں، مذہبی آئڈیالوجی وہ ہے جو پیغمبر کی رہنمائی کے تحت بنی۔ موجودہ زمانے کا یہ ایک عجیب ظاہرہ ہے کہ سیکولر آئڈیالوجی اب اپنی ناکامی کے آخری دور میں پہنچ چکی ہے۔ اِس کے برعکس، تمام قرائن (clues) بتا رہے ہیں کہ مذہبی آئڈیالوجی نئی صبح کی مانند انسان کے اوپر طلوع ہونے والی ہے، بلکہ وہ طلوع ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔

جدید مادّی ترقیوں کے بعد سیکولر مفکرین نے یہ یقین کرلیا کہ بہت جلد ہمارے سیّارۂ زمین (planet earth) پر وہ بہتر دنیا بننے والی ہے، جس کا خواب ہزاروں سال سے انسان دیکھتا رہا ہے۔ اِس آئڈیالوجی کی ایک نمائندہ کتاب فیوچر شاک (*Future Shock*) ہے، جس کو اُس کے مصنف الون ٹافلر (Alvin Toffler) نے پہلی بار 1970 میں شائع کیا۔ یہ کتاب شائع ہوتے ہی بیسٹ سیلر بن گئی۔ اِس کتاب میں مصنف نے تیقن کے ساتھ یہ پیشین گوئی کی تھی کہ دنیا تیزی کے ساتھ انڈسٹریل ایج سے ترقی کرکے سُپر انڈسٹریل ایج میں داخل ہونے والی ہے۔ یہ سویلائزیشن کا اعلیٰ ترقی یافتہ مرحلہ ہوگا، جب کہ انسان کی تمام مادّی خواہشیں اپنا مکمل فلفل مینٹ (fulfilment) پالیں۔

مگر اکیسویں صدی کا آغاز اِس قسم کے تمام اندازوں کے خاتمے کے ہم معنی بن گیا۔ اب شدت کے ساتھ وہ ظاہرہ پیدا ہوا جس کو گلوبل وارمنگ کہا جاتا ہے۔ انڈسٹریل سرگرمیوں سے پیدا ہونے والی کثافت نے سیارۂ زمین پر ایسے حالات پیدا کئے، جب کہ یہ دنیا سرے سے انسان کے لیے قابلِ رہائش (habitable) ہی نہیں رہے گی۔ آج کل میڈیا میں مسلسل یہ خبریں آرہی ہیں کہ تمام دنیا کے سائنس دانوں نے گہری رسرچ کے بعد یہ پایا ہے کہ ہماری زمین میں موسمیاتی تبدیلی (climatic change) اِس خطرناک حدتک پہنچ گئی ہے کہ اب وہ غیر منقلب (irreversible) ہوچکی ہے۔

یہ سائنس کی زبان میں قیامت کی پیشین گئی ہے، یعنی زمین پر موجودہ حالات کا خاتمہ اور ایک نئی تاریخ کا آغاز۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (18 نومبر 2007) نے گلوبل وارمنگ کے موضوع پر ایک رپورٹ شائع کی تھی۔ اِس رپورٹ کے عنوان کے لئے اُس نے بامعنی طور پر اِن الفاظ کا انتخاب کیا تھا — قیامت اب زیادہ دور نہیں:

Doomsday not Far

یہ صورتِ حال ایک طرف سیکولر آئڈیالوجی کی تنسیخ کررہی ہے، اور دوسری طرف وہ ہم کو یہ قرینہ (clue) دے رہی ہے کہ اِس معاملے میں مذہبی آئڈیالوجی زیادہ درست اور مبنی بَرحقیقت ہے۔ مذہبی آئڈیالوجی جو پیغمبروں کے ذریعے معلوم ہوئی، وہ یہ ہے کہ موجودہ سیارۂ زمین اِس لیے

بنایا ہی نہیں گیا کہ یہاں انسان اپنے لیے مادی جنت کی تعمیر کرسکے۔ یہاں کے ناقص اسباب قطعیّت کے ساتھ کسی مفروضہ مادی جنت کی تعمیر میں مانع ہیں۔

اِس معاملے میں درست اور مطابقِ واقعہ بات یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے تمام اسباب، امتحانی پرچے (test papers) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں جو چیزیں انسان کو ملی ہیں، وہ بطور انعام نہیں ہیں۔ اگر یہ چیزیں بطور انعام ہوتیں، تو وہ اپنی ذات میں کامل ہوتیں۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، یہاں کی ہر چیز ناقص ہے اور اِن چیزوں کا ناقص ہونا یہ بتاتا ہے کہ یہی نظریہ درست ہے کہ یہ چیزیں امتحانی پرچے کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ انسان کو انعام کے طور پر نہیں دی گئیں۔

یہ قرینہ (clue) یہ ثابت کرتا ہے کہ اِس معاملے میں پیغمبرانہ نظریہ ہی صحیح نظریہ ہے، یعنی یہ کہ موجودہ دنیا غیر معیاری دنیا (imperfect world) ہے۔ اِس کے بعد ایک اور دنیا بنے گی جو اِس دنیا کا معیاری ورژن (perfect version) ہوگا۔ موت کے بعد بننے والی اِس معیاری دنیا میں وہ لوگ جگہ پائیں گے جو موجودہ امتحانی دنیا میں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرچکے ہوں۔

اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ تمام سیکولر فلسفی اور مفکر اور رہ نما ہزاروں سال سے یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ وہ موجودہ دنیا میں منصفانہ سماج (just society) بنائیں، مگر ساری کوشش کے باوجود اُنھیں کامیابی نہ ہوسکی۔ اِس کے برعکس، جو ہوا وہ یہ کہ ساری دنیا میں انارکی اور کرپشن اور استحصال اور بددیانتی پھیل گئی۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں اِس معاملے میں مزید اضافہ ہوا۔ حتی کہ اب تمام قرائن کے مطابق، یہ ناممکن ہوچکا ہے کہ منصفانہ سوسائٹی کی تعمیر کے مقصد کو حاصل کیا جاسکے۔ جدید ترقیوں نے لوگوں کے بگاڑ میں صرف اضافہ کیا، اِس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ انسان کا ضمیر ایک منصفانہ سماج چاہتا ہے۔ یہ ضمیر جس طرح پہلے، لوگوں کے اندر موجود تھا، اُسی طرح وہ آج بھی پایا جاتا ہے۔ اب موجودہ حالات میں منصفانہ سماج کا قیام عملاً ناممکن ہوچکا ہے۔ مثلاً موجودہ عدالتی نظام اتنا زیادہ بگڑ چکا ہے کہ اُس سے اب انصاف کی امید ہی نہیں کی جاسکتی۔ قوانین کی بھرمار کے باوجود صرف عدالت کی بے انصافیوں میں اضافہ ہوا ہے۔

یہ معاملہ دوبارہ ایک قرینہ (clue) ہے جو پیغمبرانہ تصور کی تائید کرتا ہے، یعنی یہ کہ مجرموں کو سزا دینا اور سچے انسانوں کو اُن کے عمل کا انعام دینا، موجودہ محدود دنیا میں ممکن ہی نہیں۔ انسانی ضمیر کے اِس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ایک اور دنیا درکار ہے، ایک ایسی دنیا جہاں خود خدا ظاہر ہو کر سب کا حساب لے اور انصاف کو قائم کرے۔ یہ صورتِ حال اِس پیغمبرانہ تصور کی تائید کرتی ہے کہ موت کے بعد ایک یومُ الحساب (day of judgment) آنے والا ہے۔ اُس وقت خدائی طاقت کے ذریعے منصفانہ سماج کا وہ قیام ممکن ہو جائے گا، جو انسانی طاقت کے ذریعے موجودہ دنیا میں ممکن نہیں ہوا تھا۔

پیغمبرانہ آئڈیالوجی کے مطابق، انسانی زندگی کے دو دَور ہیں — قبل از موت دورِ حیات، اور بعد از موت دورِ حیات۔ اب یہ آخری طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ قبل از موت دورِ حیات اپنی محدودیتوں کی وجہ سے اُس کامل دنیا کی تعمیر کے لیے ناکافی ہے جو انسان کا ضمیر چاہتا ہے۔ یہ مطلوب دنیا بلاشبہہ بنے گی، لیکن وہ موت کے بعد کے وسیع تر دورِ حیات ہی میں بن سکتی ہے — یہ مطلوب دنیا ایک زیرِ تعمیر دنیا ہے۔ اب وہ دن زیادہ دور نہیں، جب کہ یہ بننے والی مطلوب دنیا مکمل ہو کر ہمارے سامنے آجائے۔

پیغمبرِ انقلاب

قرآن میں پچیس پیغمبروں کا ذِکر ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار تھی۔ نبوت کا یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک ہر زمانے میں جاری رہا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ساتویں صدی عیسوی کے رُبعِ اوّل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا۔ قرآن کے مطابق، آپ خدا کے رسول بھی تھے اور نبیوں کے خاتم بھی۔

پیغمبروں کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تمام پیغمبر مشترک طور پر توحید کا پیغام لے کر آئے، لیکن پچھلے پیغمبروں کے زمانے میں یہ پیغام زیادہ تر فکری مرحلے میں رہا، وہ عملی انقلاب کے درجے تک نہیں پہنچا۔ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ ہوا کہ آپ کو اپنے اصحاب کی صورت میں ایک مضبوط ٹیم مل گئی۔ اِس طرح یہ ممکن ہو گیا کہ توحید کی دعوت کو فکری مرحلے سے آگے بڑھا کر عملی انقلاب کے درجے تک پہنچا دیا جائے۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے

زمانے میں یہ انقلاب عملی طور پر پیش آیا اور پھر وہ تاریخِ بشری کا ایک معلوم اور مسلّم حصہ بن گیا۔

پیغمبر آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اتنی زیادہ واضح ہے کہ وہ صرف آپ کے پیروؤں کے ایک ''روایتی عقیدہ'' کی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ وہ ایک مسلمہ تاریخی واقعہ ہے۔ پیغمبر آخر الزماں سے پہلے جو انبیا آئے، اُن کی زندگی مدوّن تاریخ کا جُز نہ بن سکی، مگر پیغمبر اسلام کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ آپ کی حیثیت ایک مسلّم تاریخی پیغمبر کی ہے، آپ کی نبوت پورے معنوں میں ایک ثابت شدہ نبوت ہے۔ انسانی زندگی کے جس پہلو کو بھی دیکھا جائے، اُس میں پیغمبر اسلام کی لائی ہوئی ابدی تعلیم کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیں گے۔ وہ تمام بہترین روایات اور وہ تمام اعلیٰ قدریں جن کو آج اہمیت دی جاتی ہے، وہ سب پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے عظیم انقلاب کے براہِ راست نتائج ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہہ تاریخ کے سب سے بڑے انسان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو انسانِ کامل بنا کر انسانی نسل پر اپنا سب سے بڑا احسان فرمایا ہے۔ خدا نے پیغمبر آخر الزماں کی شکل میں تاریخ میں ایک ایسا بلند ترین مینار کھڑا کر دیا ہے کہ آدمی جس طرف بھی نظر اُٹھائے، وہ آپ کو دیکھ لے۔ جب وہ اپنے رہنما کی تلاش میں نکلے تو اُس کی نظر سب سے پہلے آپ پر پڑے۔ جب وہ حق کا راستہ جاننا چاہے تو آپ کا روشن اور بلند و بالا وجود اُس کو سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کر لے۔ آپ ساری انسانیت کے لیے ہادیٔ اعظم اور رہبرِ کامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِسی لیے خدا نے آپ کو نبیوں کے خاتم (33: 40) کی حیثیت سے مبعوث فرمایا۔ دوسرے انبیا صرف اللہ کے رسول تھے، اور آپ اللہ کے رسول ہونے کے ساتھ خاتم النبیین بھی۔

راقم الحروف کی کتاب 'پیغمبر انقلاب' پہلی بار 1982 میں چھپی۔ اس وقت میں نے اِس کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مذکورہ الفاظ لکھے تھے، جو نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی نشانِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو محمودیت کے مقام پر کھڑا کیا ہے (17: 79)۔ چناں چہ نہ صرف اہلِ اسلام بلکہ عام مصنفین اور مورخین نے پیغمبر اسلام کی عظمت کو کھلے طور پر

تسلیم کیا ہے۔ بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں مسلم قوموں اور مسیحی قوموں کے درمیان لڑائیاں پیش آئیں، جن کو صلیبی جنگ (crusades) کہا جاتا ہے۔ اِن جنگوں میں مسیحی قوموں کو شکست ہوئی۔ اُس کے بعد مسیحی مصنفین نے اسلام کے خلاف ایک قلمی جنگ چھیڑ دی۔ کثرت سے ایسی کتابیں لکھی گئیں جن میں اسلام اور پیغمبر اسلام کی تصویر کو بگاڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ یہ سلسلہ لمبی مدت تک جاری رہا۔

اِس سلسلے کو توڑنے والا پہلا قابلِ ذکر شخص اسکاٹ لینڈ کا ایک مصنف ٹامس کارلائل (وفات: 1881) ہے۔ اُس نے جرأت مندانہ طور پر اِس رجحان کو بدلا۔ اُس کی مشہور کتاب ہیرو ورشپ (*On Heroes, Hero Worship*) پہلی بار 1841 میں چھپی۔ اِس انگریزی کتاب میں اُس نے پیغمبر اسلام کی مثبت تصویر پیش کی۔ اُس نے پیغمبر اسلام کو دوسرے تمام پیغمبروں کے مقابلے میں ''ہیروٗ'' کا درجہ دیا۔

اِس کے بعد کثرت سے مختلف زبانوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کتابیں شائع ہوئیں۔ اِن کتابوں میں تاریخ میں آپ کے انقلابی رول کا کھلے طور پر اعتراف کیا گیا۔ مثلاً انڈیا کے ایک اسکالر ایم این رائے (وفات: 1954) کی کتاب (*Historical Role of Islam*) 1939 میں پہلی بار دہلی سے چھپی۔ اِس میں انھوں نے لکھا کہ پیغمبر اسلام، تمام پیغمبروں میں سب سے بڑے پیغمبر تھے۔ انھوں نے سب سے بڑا تاریخی معجزہ دکھایا:

> Every prophet establishes his pretentions by the performance of miracles. On that token, Muhammad must be recognised as by far the greatest of all prophets, before or after him. The expansion of Islam is the most miraculous of all miracles. (p. 4)

پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن میں یہ پیشین گوئی آئی ہے کہ آپ کو مقامِ محمود کا درجہ عطا کیا جائے گا (17: 79)۔ مقامِ محمودیت کا ایک پہلو وہ ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا۔ دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق، موجودہ دنیا سے ہے۔ موجودہ دنیا کی نسبت سے مقامِ محمود یہ ہے کہ آپ کو تاریخی اعتبار سے ایک مسلّم نبوت (established prophethood) کا درجہ حاصل ہوگا۔

آپ سے پہلے جو انبیا آئے، وہ مدوّن تاریخ میں ریکارڈ نہ ہوسکے۔ آپ کے سوا ہر ایک کی

حیثیت، اعتقادی نبوت کی ہے نہ کہ تاریخی نبوت کی۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ آپ کو خدا نے آخری پیغمبر بنایا تھا۔آپ کے بعد کوئی دوسرا پیغمبر آنے والا نہ تھا۔اِس لیے ضروری تھا کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کی پیغمبرانہ زندگی کامل طور پر محفوظ ہو جائے، وہ تسلیم شدہ تاریخی ریکارڈ کی حیثیت حاصل کر لے۔ کیوں کہ قانونِ الٰہی کے مطابق، جب پیغمبر مستند تاریخی ریکارڈ کا درجہ حاصل کر لے تو اس کے بعد اُس کی لائی ہوئی کتاب اور اُس کی تعلیمات کا یہی ریکارڈ پیغمبر کا قائم مقام بن جاتا ہے، اِس کے بعد کسی نئے پیغمبر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

خاتم النبیین

قرآن کی سورہ الاحزاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (33: 40) یعنی محمد تمھارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، بلکہ وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔

قرآن کی اِس آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں —— رسول اللہ، اور خاتم النبیین۔ رسول اللہ ہونے کے اعتبار سے آپ دوسرے تمام رسولوں کی مانند تھے، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: لا نفرّق بین أحدٍ من رُسُله (2: 285) یعنی رسول ہونے کے اعتبار سے، ایک رسول اور دوسرے رسول کے درمیان کوئی فرق نہیں۔لیکن مذکورہ آیت کے مطابق، اِس کے سوا آپ کی ایک اور حیثیت ہے، اور وہ یہ کہ آپ رسول ہونے کے علاوہ خاتم النبیین ہیں، یعنی سلسلۂ نبوت کے آخری پیغمبر۔آپ کا خاتم النبیین ہونا دراصل آپ کی ایک مزید (additional) صفت کو بتاتا ہے، یعنی آپ کی آمد کے بعد نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

اِس قرآنی آیت میں 'خاتم' کا لفظ آیا ہے۔لغت کے اعتبار سے 'خاتَم' اور 'خاتِم' دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔دونوں کا مطلب ایک ہے، یعنی آپ سلسلہ نبوت کے آخری نبی ہیں۔آپ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اِس فیصلے کو غیر مشتبہ بنانے کے لیے،

اللہ تعالیٰ نے مزید اہتمام یہ کیا کہ آپ کی کوئی اولادِ نرینہ (male offspring) نہیں۔ ورنہ یہ امکان تھا کہ لوگ آپ کے بیٹے کو پیغمبر کا درجہ دے دیں۔

نبیوں کا خاتم ہونا صرف فہرست کی تکمیل کا معاملہ نہ تھا، بلکہ وہ اُس ضرورت کے ختم ہوجانے کا معاملہ تھا جس کی بنا پر پچھلی تاریخ میں بار بار پیغمبر بھیجے جاتے رہے ہیں۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ نئے پیغمبر کو بھیجنے کی ضرورت اُس وقت ہوتی ہے جب کہ خدا کا دین محفوظ حالت میں باقی نہ رہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (2: 213)۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دین مکمل طور پر محفوظ ہوگیا، اِس لیے بطور حقیقت اِس کی ضرورت باقی نہ رہی کہ آپ کے بعد کوئی نیا نبی آئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کئی چیزیں ایسی ملتی ہیں جو دوسرے پیغمبروں کے یہاں موجود نہیں۔ مثلاً سیاسی غلبہ۔ اِس قسم کی چیزیں تکمیلِ نبوت کے لیے نہیں ہیں، بلکہ وہ ختمِ نبوت کے لازمی تقاضے کے طور پر ہیں۔ اگر یہ مزید چیزیں آپ کی زندگی میں شامل نہ ہوتیں تو ایسا نہ ہوتا کہ نبوت کا سلسلہ آپ پر ختم ہوجائے۔ حالاں کہ منصوبۂ الٰہی کے مطابق، ایسا ہونا ضروری تھا۔

اصل یہ ہے کہ پیغمبر کے آنے کا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ شخصی طور پر اپنے زمانے کے لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچا دے، بلکہ اِسی کے ساتھ پیغمبر کے آنے کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ انسانی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کرے، وہ ہدایتِ ربّانی کے معاملے کو خود تاریخی عمل (historical process) میں شامل کردے۔ پیغمبر اسلام کے ظہور کے بعد یہ سب کچھ بہ تمام و کمال پیش آگیا، اِس لیے اب نبیوں کی آمد کی ضرورت بھی باقی نہ رہی۔ پیغمبر اسلام کی زندگی کے یہ تمام اضافی پہلو قرآن میں بتا دیے گئے ہیں۔

مثلاً قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ (8: 39) یعنی تم اُن سے قتال (جنگ) کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اِس آیت میں ’فتنہ‘ سے مراد مذہبی جبر (religious persecution) ہے۔ قدیم بادشاہی زمانے میں لمبی مدت سے دنیا میں مذہبی جبر کا نظام قائم تھا۔ اِس قسم کا نظام نہ اچانک قائم ہوتا اور نہ وہ اچانک ختم ہوتا۔ اِس قرآنی حکم کا مدّعا یہ تھا کہ

تاریخِ بشری میں ایک ایسا عمل (process) جاری ہوجائے، جس کے نتیجے میں ایسا ہو کہ مذہبی جبر مکمل طور پر ختم ہوجائے اوراس کے بجائے مذہبی آزادی کی حالت مکمل طور پر قائم ہوجائے۔

مذہبی آزادی(religious freedom) کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ وہ براہِ راست خدا کے تخلیقی پلان (creation plan) سے جُڑا ہوا معاملہ ہے۔ خدا نے انسان کوامتحان (test) کے مقصد کے تحت اِس دنیا میں رکھا ہے۔ اِس مقصد کے تحت، دنیا میں آزادی کا ماحول ہونا ضروری ہے۔ اِسی حکمت کی بنا پر پیغمبر اسلام کواستیصالِ فتنہ کا حکم دیا گیا اوراس کے مطابق، آپ کے لیے اسباب فراہم کیے گیے۔ چناں چہ آپ نے اِس کام کو انجام دیا، یہاں تک کہ انسانی تاریخ میں مذہبی آزادی (religious freedom) کا دور کامل طور پر آ گیا۔

دعوت اور حجت

خدا کی ہدایت کے دو پہلو ہیں — دعوت اور حجت۔ دعوت سے مراد یہ ہے کہ ہدایت الٰہی کو کسی کمی یا بیشی کے بغیر بتانا۔ خدا کا صحیح تعارف، خدا کے تخلیقی نقشے کا اعلان، جنت اور جہنم کے معاملے سے انسان کو باخبر کرنا، وغیرہ۔ انھیں حقیقتوں کی وضاحت کا نام دعوت ہے۔

دعوت کا یہ عمل تمام پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانے میں کیا۔ نُکاتِ دعوت کے اعتبار سے، ایک پیغمبر اور دوسرے پیغمبر کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔ البتہ ایسا ہوا کہ پچھلے پیغمبروں کا دعوتی کلام اپنی صحیح صورت میں محفوظ نہ رہ سکا۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا دعوتی ذخیرہ (قرآن اور حدیث) مکمل طور پر اپنی اصل زبان میں محفوظ ہوگیا۔ اِس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ بعد کی نسلیں بھی آپ کے دعوتی پیغام سے اُسی طرح باخبر ہوسکیں، جس طرح آپ کے ہم زمانہ لوگ باخبر ہوئے تھے۔

جہاں تک حجت کا سوال ہے، اُس کے دو درجے ہیں — روایتی استدلال اور علمی استدلال۔ استدلال ہمیشہ معلوم اشیا کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں انسانی معلومات کا دائرہ روایتی اشیا تک محدود تھا، اِس لیے قدیم زمانے میں ہمیشہ روایتی استدلال پر اکتفا کیا گیا۔ مثلاً حضرت یوسف خدا کے ایک پیغمبر تھے۔ اُن کا زمانہ 1910 تا 1800 قبل مسیح بتایا گیا ہے۔ انھوں نے قدیم مصر میں توحید کی

دعوت دی۔ اُس وقت انھوں نے فرمایا: اے میرے جیل کے ساتھیو، کیا جُدا جُدا کئی معبود بہتر ہیں، یا اللہ اکیلا زبردست (12: 39)۔ یہ روایتی استدلال کی ایک مثال ہے۔ مگر یہاں ایک اور استدلال موجود تھا، اور وہ تھا علمی استدلال (scientific reasoning)۔ یہ استدلال وہ تھا جو خدا کی پیدا کردہ نیچر (فطرت) میں موجود تھا، مگر یہ استدلال قدیم زمانے میں صرف امکان کے درجے میں تھا، وہ ابھی تک واقعہ نہیں بنا تھا۔ پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کے ذریعے جو انقلاب پیش آیا، اس نے تاریخ میں ایک نیا پراسس جاری کیا۔ اِس کے نتیجے میں ایسا ہوا کہ یہ امکانی استدلال واقعہ بن کر سامنے آگیا۔

فطرت کی تسخیر

نیچر کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو اُس سے مراد پوری دنیائے مخلوقات ہوتی ہے:

> Nature: The Sum total of all things in time and sapce; the entire physical universe.

یہ نیچر ہمیشہ سے موجود تھا، لیکن قدیم زمانے میں انسان شرک میں مبتلا ہو گیا۔ شرک دراصل مظاہرِ فطرت کی پرستش (nature worship) کا دوسرا نام ہے۔ چوں کہ انسان نیچر کو معبود کی نظر سے دیکھتا تھا، اِس لیے وہ اس کو تحقیق وتفتیش (exploration) کی نظر سے نہ دیکھ سکا۔ اِس طرح، شرک ایک مستقل ذہنی رکاوٹ (mental block) بن گیا۔ علمی دلائل جن کو قرآن میں آیات (نشانیاں) کہا گیا ہے، وہ عالم فطرت میں موجود تھیں، مگر وہ ظاہر ہو کر سامنے نہ آسکیں۔

قرآن میں پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کو ایک حکم اِن الفاظ میں دیا گیا تھا: وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ (8: 39)۔ مفسرین کے مطابق، اِس آیت میں 'فتنہ' سے مراد شرکِ جارح ہے۔ پیغمبر اور آپ کے اصحاب کو حکم دیا گیا کہ شرک کو ختم کرو، خواہ اربابِ شرک کی جارحیت کی بنا پر اُن کے مقابلے میں جنگ کرنا پڑے، چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کی کوششوں کے نتیجے میں شرک کا سیاسی اور اجتماعی غلبہ دنیا سے ختم ہو گیا۔

اِس کے بعد دنیا میں یک نیا عمل شروع ہوا۔ ایک لفظ میں اس کو فطرت کی پرستش کے بجائے،

فطرت کی تسخیر کا عمل کہا جاسکتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں دھیرے دھیرے ایسا ہوا کہ فطرت (نیچر) میں چھپے ہوئے دلائل سامنے آ گئے۔ یہ تاریخی عمل اسلام کے ابتدائی زمانے میں شروع ہوا اور یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد وہ اپنی تکمیل تک پہنچا۔ اِس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ خدائی حقیقتوں کو روایتی دلائل کے بجائے سائنسی دلائل کے ذریعے ثابت شدہ بنایا جاسکے۔ چند مثالوں سے اِس کی وضاحت ہوتی ہے:

1- خدا کے وجود پر قرآن میں ایک دلیل یہ دی گئی تھی کہ: اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (14: 10) یعنی کیا خدا کے بارے میں شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کو پھاڑنے والا ہے۔ قرآن کی اِس آیت میں لفظ فاطر (پھاڑنے والا) خدا کے وجود کا ایک ثبوت ہے۔ کیوں کہ پھاڑنا ایک بالقصد مداخلت (intervention) کا عمل ہے۔ اور بالقصد مداخلت کا عمل ایک مداخلت کار (intervener) کا ثبوت ہے۔ اور جب مداخلت کار کا وجود ثابت ہوجائے تو اپنے آپ خدا کا وجود (existence of God) ثابت ہوجاتا ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں خدا کے وجود (existence of God) کا ایک علمی ثبوت موجود ہے، لیکن اِس علمی ثبوت کی وضاحت صرف دورِ سائنس کے بعد ہوئی۔ بیسویں صدی کے رُبع اوّل میں سائنس دانوں نے اُس کائناتی واقعے کو دریافت کیا، جس کو بگ بینگ (Big Bang) کہا جاتا ہے۔ بگ بینگ کی دریافت کے بعد یہ ممکن ہوگیا کہ مذکورہ قرآنی آیت میں چھپے ہوئے سائنسی دلائل کو سمجھا جائے اور اس کو استعمال کیا جائے۔

2- قرآن کی سورہ الجاثیہ میں خدا کی ایک نعمت کا ذکر اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ (45: 12) یعنی اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے سمندر کو مسخر کردیا، تاکہ اُس کے حکم سے سمندر میں کشتیاں چلیں۔

قرآن کی اِس آیت میں ایک عظیم حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ قدیم روایتی زمانے کا انسان اس معاملے کو صرف ایک پُراسرار عقیدے کے طور پر لیتا تھا، مگر موجودہ زمانے میں اس کی توجیہہ، ایک معلوم فطری قانون کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ موجودہ زمانے میں ایک جدید سائنس ظہور میں آئی ہے،

جس کو علمِ سکونِ سیّالات (science of hydrostatics) کہا جاتا ہے۔ اِس کے مطابق، پانی یا سیّال چیزیں ایک خاص قانون کے تابع ہیں۔ اور وہ تخفیفِ وزن (buoyancy) یا ٹھوس اَجسام کو پانی میں ڈالنے سے اس کو بہ حال رکھنے یا ابھارنے کی صلاحیت ہے:

(Buoyancy) The upward pressure by any fluid on a body, partly or wholly, immersed therein, it is equal to the weight of the fluid displaced.

اِس جدید سائنس کے بعد یہ ممکن ہو گیا کہ قرآن کی مذکورہ آیت کو خالص علمِ انسانی کی بنیاد پر سمجھا جاسکے۔ اور خدا کے اِس عظیم احسان پر یقین کیا جائے کہ اُس نے سمندر کو ایک محکم قانون کا پابند بنا دیا۔ اِس بنا پر یہ ممکن ہو گیا کہ وسیع سمندروں کی سطح پر انسان کشتی اور جہاز کے ذریعے سفر کرسکے اور وہ دور دراز منزل تک بہ آسانی پہنچ جائے۔

3- خدا کی ایک نعمت کا ذکر قرآن کی سورہ ق میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **ونزّلنا من السماء ماءً مبارکاً** (50: 9) یعنی ہم نے آسمان سے مبارک پانی اتارا۔ قرآن کی اِس آیت میں خدا کی ایک عظیم نعمت کا ذکر ہے۔ قدیم زمانے میں یہ بات صرف ایک روایتی عقیدے کی حیثیت رکھتی تھی، مگر سائنسی دریافتوں کے بعد وہ ایک عظیم علمی دلیل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں بارش کا حوالہ دیا گیا ہے۔ بارش کیا ہے۔ بارش دراصل سمندر کا پانی ہے، جو بھاپ بن کر اوپر جاتا ہے اور پھر مخصوص قانون کے تحت دوبارہ وہ نیچے کی طرف لوٹتا ہے، جس کو بارش کہتے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، سمندر کا پانی کھاری ہوتا ہے۔ ایسا اِس لیے ہے کیوں کہ سمندر کے پانی میں 1/10 حصہ نمک شامل رہتا ہے۔ یہ نمک سمندر کے پانی میں تحفظی مادّہ (preservative) کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ چوں کہ پانی کے مقابلے میں نمک کا وزن کسی قدر زیادہ ہوتا ہے، اِس لیے جب سمندر کا پانی سورج کی گرمی سے بھاپ بن کر اوپر کی طرف اٹھتا ہے تو اس کا نمک کا حصہ نیچے رہ جاتا ہے۔ یہ اِزالۂ نمک (desalination) کا ایک عمل ہے، جو خدا کے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ اِسی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ سمندر کا کھاری پانی ہم کو شیریں پانی کی صورت میں دست یاب ہوتا ہے۔ اِس

عمل کے بغیر سمندر کا پانی ہمارے لیے قابلِ استعمال ہی نہ ہوتا۔

کولریج (Coleridge) ایک برٹش شاعر ہے۔ اس کی وفات 1834 میں ہوئی۔ اس نے ایک نظم لکھی ہے۔ اِس نظم میں اس نے بتایا ہے کہ لکڑی کا بنا ہوا ایک جہاز سمندر میں سفر کے لیے روانہ ہوا۔ درمیان میں سخت طوفان آیا۔ اُس کے نتیجے میں جہاز ٹوٹ گیا۔ بہت سے لوگ پانی میں ڈوب گئے۔ ایک مسافر کو جہاز کا ایک تختہ مل گیا۔ وہ اِس تختے کے اوپر لیٹ گیا اور پانی میں تیرنے لگا۔ وہ پیاسا تھا، لیکن وہ اپنی پیاس بجھا نہیں سکتا تھا، کیوں کہ اُس کے آس جو پانی تھا، وہ سب کا سب کھاری پانی تھا۔ شاعر اِس کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ — ہر طرف پانی ہے، لیکن ایک قطرہ بھی پینے کے لیے نہیں:

Water water everywhere, nor a drop to drink.

قرآن کی اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے پانی کو مبارک (purified) بنا کر آسمان سے اُتارا۔ یہ بلاشبہہ خدا کی ایک عظیم نعمت ہے۔ قدیم زمانے میں یہ معاملہ ایک روایتی عقیدے کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن موجودہ زمانے میں سائنس کی دریافتوں نے اس کو ایک عظیم قابلِ شکر حقیقت بنا دیا۔

4- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک بار سورج گرہن پڑا۔ اتفاق سے اُسی دن پیغمبر اسلام کے بیٹے ابراہیم کا کم عمری میں انتقال ہو گیا تھا۔ مدینہ کے لوگوں نے اُس کو دیکھا تو انھوں نے کہا کہ — پیغمبر کے بیٹے کا انتقال ہوا تھا، اِس لیے آج یہ سورج گرہن واقع ہوا ہے (**كشفت الشمس لموت إبراهيم**)۔ لوگوں کا ایسا کہنا قدیم زمانے کے رواج کی بنا پر تھا۔ کیوں کہ اُس زمانے میں لوگ اِسی قسم کے واقعات کو گرہن کا سبب سمجھتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے مدینہ کے لوگوں کو وہاں کی مسجد میں اکھٹا کیا اور انھیں خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: إنّ الشّمس والقمر لايخسفان لموت أحدٍ ولا لحياته، ولٰكنّهما أيتان من أيات الله، فإذا رأيتموهما فصلّوا وادعوا الله حتّى يُكشف ما بكم (صحيح البخاري، كتاب الكسوف) یعنی کسی کے مرنے اور کسی کے جینے سے چاند اور سورج میں گرہن واقع نہیں ہوتا، بلکہ وہ خدائی نشانیوں میں سے دو نشانی ہیں۔ پس جب تم اُن کو دیکھو تو

تم نماز پڑھو اور اللہ سے دعا کرو، یہاں تک کہ گرہن کھل جائے۔

اِس حدیثِ رسول میں سورج گرہن اور چاند گرہن کو نشانی (signs) کہا گیا ہے۔ قدیم زمانے کے مخاطبین اپنے روایتی فریم ورک کے اعتبار سے اتنا ہی سمجھ سکتے تھے۔ لیکن موجودہ زمانے میں لوگوں کا فریم ورک سائنٹفک فریم ورک بن چکا ہے۔ اب آج کا انسان اِس قابل ہوگیا ہے کہ وہ خالص علمی معنوں میں اِس حقیقت کو سمجھ سکے۔ اور اِس طرح زیادہ گہرائی کے ساتھ وہ معرفت کا رزق حاصل کرے۔

موجودہ زمانے میں جدید فلکیات کے تحت مطالعے کے بعد یہ معلوم ہوا ہے کہ زمین اور سورج اور چاند تین انتہائی مختلف سائز کے متحرک اَجرام ہیں۔ مگر وسیع خلا میں اُن کو ایک ناقابلِ قیاس حساب کے ذریعے ایک خاص پوزیشن کے تحت ایک سیدھ میں لایا جاتا ہے، اِسی خاص پوزیشننگ کے نتیجے میں سورج گرہن اور چاند گرہن واقع ہوتا ہے:

Eclipse is a result of unimaginably well-calculated aligning of three different moving bodies in the vast sapce.

دعوت کا نیا دور

سیرت کے موضوع پر راقم الحروف کی کتاب 'پیغمبر انقلاب' پہلی بار 1982 میں چھپی۔ اُس میں میں نے ایک حدیث نقل کرتے ہوئے لکھا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے موقع پر اپنے اصحاب کو 'العصابة' سے تعبیر کیا تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ یہ العصابة کوئی سادہ گروہ نہ تھا، بلکہ یہ وہ گروہ تھا، جس پر ڈھائی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی تھی۔ اِس طرح اُس کے افراد اِس قابل ہوئے کہ تاریخ میں وہ ایک عظیم انقلابی دور کا آغاز کریں۔

اصحابِ رسول نے نبوت محمدی کے اظہارِ اوّل کے لیے کام کیا تھا۔ اب نبوتِ محمدی کے اظہارِ ثانی کا زمانہ ہے۔ اِس دوسرے رول کے لیے آج پھر ایک العصابہ درکار ہے۔ اِسی دوسرے العصابہ کو حدیث میں 'اخوان رسول' کہا گیا ہے۔ یہ دوسرا العصابہ وہ ہوگا، جس پر پچھلی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی ہو۔

جیسا کہ میں نے اپنے دوسرے مضامین میں واضح کیا ہے، پہلے دورِ تاریخ کا آغاز

ہاجرہ اُمِّ اسماعیل نے چار ہزار سال پہلے کیا تھا۔ اِس تاریخی عمل کی تکمیل میں ڈھائی ہزار سال لگے۔ اِس کے بعد اِس تاریخی نسل میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب پیدا ہوئے۔ اِسی تاریخی نسل سے اصحابِ رسول نکلے، جنھوں نے پیغمبر کا ساتھ دے کر پہلے دور کا کارنامہ انجام دیا۔

اصحابِ رسول نے جس دورِ تاریخ کا آغاز کیا تھا، تقریباً ڈیڑھ ہزار سال میں وہ اپنے نقطۂ کمال پر پہنچ چکا ہے۔ اب دوبارہ اِس نئی نسل سے ایک فرد اٹھے گا، جس کو حدیث میں 'المہدی' کا نام دیا گیا ہے۔ اِس فرد کا ساتھ دینے کے لیے بہت سے اللہ کے بندے اٹھیں گے، غالباً اِنھیں افراد کو حدیث میں 'اخوانِ رسول' کہا گیا ہے۔ یہ گروہ نئے حالات میں اپنی غیر معمولی جدوجہد کے ذریعے نبوت محمدی کا دوبارہ اظہار کرے گا۔

نبوتِ محمدی کا یہ اظہارِ ثانی، تاریخ انسانی کے خاتمے کا اعلان ہوگا۔ اِس کے بعد موجودہ عارضی دنیا کو بدل کر نئی ابدی دنیا بنائی جائے گی، تاکہ اہلِ حق کو خدا کا ابدی انعام دیا جائے، اور اہلِ باطل کو ابدی طور پر رُسوائی کے عذاب میں ڈال دیا جائے۔

باب دوم

اسلام اور عصرِ حاضر

خالق کی طرف سے انسان کو جو نعمتیں دی گئی ہیں، ان میں سے ایک عظیم نعمت قرآن ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں بتایا گیا ہے کہ اِس میں تمام باتوں کا بیان ہے (16: 89)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ہمارے لیے معاملاتِ زندگی کو سمجھنے کے لیے ایک مستند کتابِ حوالہ (book of reference) کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کے ذریعے ہم خالق کے تخلیقی پلان (creation plan) کو سمجھ سکتے ہیں، اور زندگی کی منصوبہ بندی کے لیے صحیح نقطۂ آغاز (starting point) کو پا سکتے ہیں۔ اِسی طرح دعوت الی اللہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے بھی قرآن ایک مستند کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ حق کے دو دور ہیں۔ ایک ہے پیغمبروں کا زمانہ، اور دوسرا ہے بعد کو آنے والا زمانہ۔ پیغمبروں کے زمانے میں خدا نے آیاتِ وحی کے ذریعے حق کا اظہار فرمایا، اور اس کی مزید تائید کے لیے پیغمبروں کو معجزے دئے، یعنی ایسی نشانیاں (signs) جن کا انکار کرنا کسی انسان کے لیے ممکن نہ ہو۔

بعد کے زمانے میں پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ ختم ہوگیا، لیکن دعوت کا عمل بدستور جاری رہا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانے میں، آفاق اور انفس میں ایسی آیات ظاہر ہوں گی جو حق کی تبیین کرنے والی ہوں (41: 53)۔ اِس قرآنی وضاحت کے مطابق، تبیینِ حق کے دو دور ہیں۔ ایک ہے تبیین بذریعہ آیاتِ وحی، اور دوسری ہے تبیین بذریعہ آیاتِ فطرت۔

دعوت کے پہلے دور میں تبیینِ حق کا کام پیغمبروں کے ذریعے انجام پایا۔ دعوت کے دوسرے دور میں، قرآن کے مطابق، تبیینِ حق کا کام آیاتِ فطرت کے ذریعے انجام پائے گا۔ دوسرے دور میں تبیینِ حق کی پیشگی خبر قرآن کی سورہ حم السجدہ کی مذکورہ آیت نمبر 53 میں دی گئی ہے۔ دورِ اوّل میں تبیینِ حق کا کام خدا کے پیغمبروں کے ذریعے انجام پایا، اور دورِ ثانی میں تبیین حق کا کام علماءِ اسلام کے ذریعے انجام پائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: **العلماء ورثۃ الانبیاء** (سنن أبي داؤد، کتاب العلم،

باب الحث علی طلب العلم) یعنی امتِ محمدی کے علما نبیوں کے وارث ہیں۔

دعوت کے پہلے دور میں تبیینِ حق کا کام جن پیغمبروں نے انجام دیا، انھوں نے اپنے کام کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں (إني رسول اللہ إلیکم)۔ اِس اعلان کا حق انھیں اِس لیے تھا کہ فرشتہ جبریل کے ذریعے اُنھیں براہِ راست طور پر یہ علم دیا گیا تھا۔لیکن بعد کے دور میں جو عالم، یا علما کا جو گروہ تبیین حق کے کام کو انجام دے، اس کو مذکورہ قسم کے پیغمبرانہ اعلان یا دعویٰ (claim) کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کرنے کا حق نہیں۔

بعد کے زمانے میں تبیینِ حق کا کام کرنے والے علما کی شناخت ان کے ذاتی اعلان کے ذریعے نہ ہوگی، بلکہ ان کے کام کے ذریعے ہوگی، یعنی جو علما بعد کے دور میں ظاہر ہونے والی آیاتِ فطرت (signs of nature) کا گہرا علم حاصل کریں اور ان کو دعوتِ حق کی حمایت میں درست طور پر اور موثر طور پر استعمال کریں، وہ اِس آیت میں کی گئی پیشین گوئی کا مصداق ٹھیریں گے۔ایسے علما کو صرف ان کے کام کو دیکھ کر پہچانا جا سکتا ہے، نہ کہ ان کے اعلان کے ذریعے۔

ایک یادگار دن

29 فروری 1955 میری زندگی کا وہ دن تھا جس کو میں اپنے لیے ایک بریک تھرو (break through) سے تعبیر کرتا ہوں۔اُس دن لکھنؤ کے امین الدولہ پارک میں جماعت اسلامی ہند کے زیرِ اہتمام ایک عمومی اجتماع ہوا۔اِس موقع پر اسلام کے عقلی اثبات پر راقم الحروف کی ایک تقریر ہوئی۔بعد کو جب اعلان کیا گیا کہ یہ تقریر چھپی ہوئی صورت میں یہاں بک اسٹال پر موجود ہے، تو لوگوں کا ہجوم اس کو لینے کے لیے بک اسٹال پر ٹوٹ پڑا۔تقریر کے تمام مطبوعہ نسخے اُسی وقت فروخت ہوگئے۔یہ تقریر پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوئی۔اردو میں اس کا نام تھا ’’نئے عہد کے دروازے پر‘‘، ہندی میں ’’نو یُگ کے پرویش دوار پر‘‘ اور انگریزی میں:

On the Threshold of A New Era

اِس تقریر کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اسلام کی دعوت کو عصری اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش

کی گئی تھی۔ یہ میری زندگی میں ایک انقلابی واقعہ تھا۔ اِس واقعے نے میری آئندہ زندگی کا رخ متعین کر دیا۔ اب میں نے شعوری طور پر یہ طے کرلیا کہ مجھے عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر تیار کرنا ہے۔ اس کے بعد میں نے مذکورہ موضوع کا زیادہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ شروع کر دیا۔ اِس درمیان میں مقالہ یا پمفلٹ کی صورت میں بعض تحریریں شائع ہوئیں۔ مثلاً حقیقت کی تلاش''۔ یہ مقالہ 6 ستمبر 1958 کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے یونین ہال میں پڑھا گیا، اوراس کے بعد وہ پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوا۔

اِس موضوع پر میرے مطالعے کا ایک نتیجہ وہ تھا جو با قاعدہ کتاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ کتاب جو پہلی بار 1966 میں مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام (ندوۃ العلماء، لکھنؤ) سے شائع ہوئی۔ اِس کتاب کا اردو ٹائٹل ''مذہب اور جدید چیلنج'' تھا۔ بعد کو اِس کتاب کا عربی ترجمہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نے کیا۔ یہ عربی ترجمہ پہلی بار 1969 میں کویت اور بیروت اور قاہرہ سے ''**الاسلام یتحدّیٰ**'' کے نام سے چھپا۔ اِس کتاب کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر فریدہ خانم نے کیا، جو پہلی بار 1985 میں گاڈ ارائزز (God Arises) کے نام سے شائع ہوا۔

مذہب اور جدید چیلنج 1964 میں لکھ کر تیار ہوئی۔ میں نے اس کا مسوّدہ (manuscript) مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام (لکھنؤ) کے ذمے داروں کو برائے اشاعت دیا۔ چوں کہ اِس کتاب میں بہت زیادہ سائنسی حوالے تھے، مجلس کے ذمے داروں نے چاہا کہ اشاعت سے پہلے وہ کسی ایکسپرٹ (expert) سے اس کی تصدیق حاصل کرلیں۔ اِس مقصد کے لیے کتاب کے مسوّدے کو لکھنؤ کے ایک مسلم آئی اے ایس افسر کو دیا گیا۔ انھوں نے کتاب کے مسوّدے کو پڑھنے کے بعد مجلس کے نام ایک تحریر بھیجی۔ اِس تحریر میں کتاب کے بارے میں منفی رائے دیتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ ایسی ایک کتاب لکھنے کے لیے مصنف کا کریڈنشیل (credential) کیا ہے۔

مذکورہ مسلم افسر کی یہ تحریر مجھے دی گئی۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں نے تحریری صورت میں اس کا جواب دیا۔ میں نے اپنے جواب میں یہ لکھا کہ — اس کتاب کے مصنف کا کریڈنشیل یہ ہے کہ اِس موضوع پر پوری مسلم دنیا میں اب تک کوئی ایک کتاب بھی لکھی یا چھاپی نہیں گئی ہے۔

جدید تاریخ میں میں پہلا شخص ہوں جس نے اسلام اور جدید علمی چیلنج کے موضوع پر باقاعدہ مطالعہ کیا اور اس پر ایک مکمل کتاب تیار کی۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق، اِس موضوع پر کوئی دوسری کتاب پائی جاتی ہے، تو آپ مجھے اُس کا نام بتائیں۔ میرے اِس جواب کے بعد لوگ خاموش ہو گئے اور میری کتاب کو 1966 میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے شائع کردیا گیا، جو اِس کتاب کا پہلا ایڈیشن تھا۔ اِس کے بعد میری زندگی مختلف مراحل سے گزرتی رہی۔ یہاں تک کہ میں نے 1970 میں دہلی میں اسلامی مرکز کے نام سے ایک دعوتی ادارہ قائم کیا، اور 1976 میں 'الرسالہ' کے نام سے ایک دعوتی ماہ نامہ جاری کیا، جو اب تک پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔

اِس ادارہ (اسلامی مرکز) کے تحت، میں نے باقاعدہ طور پر کتابیں شائع کرنا شروع کیا۔ اِن کتابوں کا موضوع براہِ راست یا بالواسطہ طور پر صرف ایک ہوتا تھا، اور وہ ہے — جدید علمی چیلنج کے مقابلے میں اسلام کا مدلّل تعارف پیش کرنا۔ ماہ نامہ الرسالہ میں اِن کتابوں کا اشتہار جس عنوان کے تحت چھپتا تھا، وہ عنوان یہ تھا — عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جدید تہذیب کے ظہور اور پرنٹنگ پریس کے زمانے میں پوری مسلم دنیا میں مختلف زبانوں میں کثرت سے کتابیں چھاپی گئیں، لیکن میرے علم کے مطابق، اِن کتابوں کے تعارف کے لیے کسی نے بھی ''عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، اب بھی کوئی مسلم ادارہ ایسا نہیں ہے جو اپنی مطبوعات کے تعارف کے لیے عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر کا لفظ استعمال کرتا ہو۔ گویا کہ یہ ٹائٹل غیر متنازعہ طور پر صرف ہمارے مشن کے تحت شائع شدہ کتابوں پر منطبق ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا شخص یا ادارہ اِس معاملے میں، دعوے دار کے درجے میں بھی اس میں شریک نہیں۔

جدید تہذیب کی طرف سے جو فکری چیلنج پیدا ہوا، اس کا تعلق تمام مذاہب سے تھا۔ اِس صورتِ حال کے پیدا ہونے کے بعد دورِ جدید میں کچھ نمایاں افراد پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے عقیدہ یا اپنے مذہب کو ماڈرن معیار پر پیش کرنے کا کام کیا۔

مثال کے طور پر ڈاکٹر رادھا کرشنن (وفات: 1975) ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے۔ ان کا

مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ ہندوازم (Hinduism) پر گہرا عقیدہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ہندوازم کو جدید معیار پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ اِس سلسلے میں ان کی دو کتابوں کے نام یہ ہیں:

1. *A Source Book in Indian Philosophy*, 1957

2. *Recovery of Faith*, 1956

ڈاکٹر رادھا کرشنن موجودہ زمانے کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے، تاہم یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے جس مقدمے کی پیروی کی، وہ مقدمہ اپنے آپ میں کم زور تھا۔ اور جو مقدمہ اپنے آپ میں کمزور ہو، کوئی بڑے سے بڑا وکیل بھی اس کو مضبوط نہیں بنا سکتا۔

1938 سے 1947 تک دس سال کا زمانہ میری زندگی میں بہت اہم زمانہ تھا۔ اِس زمانے میں میرا دماغ افکار ونظریات کے اعتبار سے گویا کہ ایک میلٹنگ پاٹ (melting pot) بنا ہوا تھا۔ اُس زمانے میں پورے عالم اسلام میں مسلمانوں کے حال اور مستقبل کے بارے میں بحث چھڑی ہوئی تھی۔ ہر تحریر اور ہر تقریر میں اِسی کا چرچا ہوتا تھا۔ فطری طور پر میرا ذہن مختلف خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل میں پوری مسلم دنیا میں بڑے پیمانے پر فکری سرگرمیاں جاری تھیں۔ بہ ظاہر ان سرگرمیوں کے مختلف دھارے تھے، لیکن ایک چیز سب میں مشترک تھی، وہ یہ کہ یہ مختلف قسم کی سرگرمیاں اصلاً ردِّعمل کے تحت پیدا ہوئیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، اِس زمانے میں مغربی قوموں نے جدید ذرائع کے بل پر پوری مسلم دنیا میں سیاسی اور تہذیبی غلبہ حاصل کرلیا تھا۔ یہ صورت حال مسلم رہنماؤں کے لیے ناقابلِ قبول تھی۔ چناں چہ ہر ایک اِحیاء (revival) کے نام پر اٹھ کھڑا ہوا۔ اِن سب کا مشترک نشانہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے قدیم دورِ عروج کو دوبارہ جدید تاریخ میں واپس لایا جائے۔

مسلمانوں کے اندر اگر یہ سرگرمیاں مثبت ذہن کے تحت پیدا ہوئی ہوتیں، تو ان کا ماڈل زمانۂ رسالت ہوتا۔ اِس ابتدائی ماڈل کی پیروی میں وہ دعوت الی اللہ کو اپنا نشانہ بناتے۔ لیکن اِن سرگرمیوں کا

سرچشمہ چوں کی منفی ردعمل تھا، اِس لیے عملاً بعد کو قائم ہونے والا دورِ تاریخ لوگوں کا ماڈل بن گیا۔ لوگ عباسی سلطنت، اور عثمانی سلطنت، اور مغل سلطنت کے زمانے کو دوبارہ واپس لانے کے نشانے کے تحت، سرگرمِ عمل ہوگئے۔ اِن سرگرمیوں کے دو بڑے دھارے تھے — احیاءِ خلافت، اور احیاءِ جہاد۔

اِن دونوں دھاروں کے تحت بیسویں صدی عیسوی میں غیر معمولی کوششیں کی گئیں، لیکن اپنے مطلوب نشانے کے اعتبار سے یہ کوششیں مکمل طور پر ناکام رہیں۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ یہ لوگ صرف دورِ قدیم کی مسلم تاریخ کو جانتے تھے، اور اِسی قدیم ماڈل کو دوبارہ واپس لانے کے لیے وہ سرگرمِ عمل ہوگئے۔ وہ اِس حقیقت سے بے خبر تھے کہ کامیابی کے لیے دوسری ضروری چیز جو مطلوب ہے، وہ رعایت زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں کام کے طریقے پوری طرح بدل چکے تھے۔ یہ لوگ اپنی بے خبری کی بنا پر اِس تبدیلی کی رعایت نہ کرسکے، اِس لیے وہ اپنے مطلوب نشانے کو حاصل کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے۔

دوسرا فکری دھارا وہ تھا جس کا کہنا یہ تھا کہ اسلام کو جدید تقاضوں کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے، ورنہ اسلام کو اس کی مطلوب اہمیت حاصل نہ ہوسکے گی۔ اِس نقطۂ نظر کے حامل ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے لکھا تھا کہ — آج ضرورت ہے کہ قرآن دوبارہ نازل ہو:

The Quran has to be re-revealed today.

اِس دوسرے فکری دھارے کو امت میں قبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ یہ لوگ صرف ایک قسم کا مبتدعانہ گروہ بن کر رہ گئے۔ اِس کا سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ جن افراد نے اِس دوسرے دھارے کی نمائندگی کی، وہ اپنے مشن کے لیے پوری طرح اہل (competent) نہ تھے۔ اُن کا مدعا اصلاً غلط نہ تھا، لیکن وہ طاقت ور انداز میں اس کی درست نمائندگی نہ کرسکے۔ اِس بنا پر وہ اپنے اصل مقصد، دورِ جدید کے اعتبار سے امت کو رہنمائی دینے میں ناکام رہے۔ راقم الحروف نے اللہ کی توفیق سے، اسلام کی دعوت کو اپنا موضوع بنایا۔ اِس سلسلے میں میں نے وسیع مطالعے کے ذریعے اسلام اور جدید تحدّیات (modern challenges) کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں نے پایا کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں عام تاثر یہ ہے کہ اسلام جدید دور میں غیر متعلق (irrelevant) ہوگیا ہے۔ اسلام کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ

جدید ذہن کو ایڈریس کر سکے۔ موجودہ زمانے میں مسلم مصنفین نے جو کتابیں لکھی ہیں، وہ تقریباً سب کی سب قدیم روایتی اسلوب میں ہیں۔ اِس قسم کی کتابیں جدید تحدیات کا جواب نہیں بن سکتیں۔ یہ کتابیں آج کے ذہن کو اسلام کی صداقت پر مطمئن کرنے کے لیے یقینی طور پر ناکافی ہیں۔

اِس معاملے کا موضوعی مطالعہ (objective study) کرنے کے بعد میں نے یہ پایا کہ جدید دور کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ روایتی ذہنی فریم ورک اب ٹوٹ گیا ہے۔ آج کے انسان کا ذہنی فریم ورک اُس سے بالکل مختلف ہے جو قدیم زمانے کے انسان کا ہوا کرتا تھا۔ ماڈرن افکار کو سمجھنے کے لیے میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ اِن میں سے کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں:

1. Thomas Paine, *The Age of Reason* (1994)
2. J.F. West, *The Great Intellectual Revolution* (1965)
3. Julian Huxley, *Religion without Revelation* (1927)
4. A.A.A. Faizi, *A Modern Approach to Islam* (1963)
5. Philip Hodgkiss, *The Making of the Modern Mind* (2001)
6. John Herman Randall, *The Making of the Modern Mind* (1926)
7. Brinton Corone, *The Shaping of the Modern Mind* (1953)
8. W. T. Stace, *Religion and the Modern Mind* (1952)

کامیاب دعوت وہ ہے جو مخاطب کے مائنڈ کو ایڈریس کرے۔ موجودہ زمانے کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ قدیم روایتی لٹریچر جدید ذہن کو ایڈریس کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہے۔ گویا کہ آج داعی اور مدعو کے درمیان ایک فکری بُعد (intellectual gap) پیدا ہو گیا ہے۔ اِس لیے اسلامی دعوت کے سلسلے میں پہلا ضروری کام یہ ہے کہ اِس فکری بُعد کو ختم کیا جائے تا کہ اسلام آج کے انسان کے لیے قابلِ فہم (understandable) اور قابلِ قبول (acceptable) بن سکے۔

اِس معاملے میں، میں نے اپنے مطالعے کے ذریعے جانا کہ اِس اعتبار سے جو مسئلہ پیدا ہوا ہے، وہ بنیادی طور پر یہ ہے کہ لمبے فکری عمل کے بعد آج کے انسان کا ذہنی شاکلہ (framework) بدل گیا ہے۔ یہ تبدیلی بنیادی طور پر دو چیزوں میں ہوئی ہے:

1- روایتی معیار کی جگہ سائنسی معیار کا ظہور میں آنا۔

2- حاکمانہ معیار کے بجائے جمہوری معیار کا رواج۔

میں نے اپنے مطالعے کے دوران پایا کہ موجودہ زمانے میں مسلم مصنفین کا پیدا کردہ جو لٹریچر ہے، وہ جدید سائنٹفک معیار پر پورا نہیں اترتا۔ موجودہ دست یاب لٹریچر روایتی زبان میں لکھا گیا ہے۔ وہ اُس سائنٹفک زبان میں نہیں لکھا گیا ہے جو موجودہ زمانے میں قبولیت کا درجہ حاصل کئے ہوئے ہے۔ اِس طرح، کتاب اور قاری کے درمیان جو ذہنی بُعد (intellectual gap) پیدا ہو گیا ہے، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ لٹریچر جدید ذہن کو ایڈریس نہیں کرتا۔

یہی معاملہ دوسرے پہلو کا ہے۔ مسلمانوں کا موجودہ ذہن، قدیم بادشاہی نظام کے تحت بنا ہے، اِس لیے وہ اسلام کو جمہوری انداز میں پیش کرنے سے عاجز رہ گئے۔ چناں چہ اِن مسلمانوں کی باتیں اُس جدید ذہن کو اپیل نہیں کرتیں جو چیزوں کو صرف اُس وقت سمجھ پاتا ہے، جب کہ وہ جمہوری انداز میں پیش کی گئی ہوں۔ مثلاً خلافت کا روایتی تصور قدیم شاہی ذہن کے لیے تو قابلِ تصور تھا، لیکن جدید جمہوری ذہن کے لیے وہ قابل فہم نہیں۔ اِسی طرح توہینِ اسلام کے نام پر قتل کی سزا دینا جدید ذہن کے لیے ناقابلِ فہم ہے، کیوں کہ جدید ذہن اِس طرح کی ''گستاخی'' کے تصور سے ناآشنا ہے۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ اظہارِ خیال کی آزادی (freedom of expression) انسان کا ایک ایسا حق ہے جس کو کسی بھی عذر کی بنا پر منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

یہی معاملہ مسلّح جہاد (armed struggle) کا ہے۔ موجودہ زمانے میں صرف پُرامن جدوجہد (peaceful struggle) کو قابلِ قبول سمجھا جاتا ہے۔ حق کے حصول کے لیے پُرامن جدوجہد پوری طرح درست ہے، لیکن مسلح جدوجہد کسی بھی حال میں درست نہیں۔ اِن اسباب کی بنا پر آج کے انسان کو وہ لٹریچر اپیل نہیں کرتا جو جمہوریت کی شرطوں پر پورا نہ اترتا ہو۔

لٹریچر کے اعتبار سے اسلامی تاریخ کے تین بڑے دور ہیں۔ پہلا دور، رسالت اور صحابہ کا دور ہے۔ یہ دور ساتویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس دور میں اسلام کا مستند (authentic) یا کلاسکل لٹریچر (classical literature) وجود میں آیا۔ یہ لٹریچر عربی زبان میں ہے، اور قرآن اور

حدیث اور سیرتِ رسول اور سیرتِ صحابہ پر مشتمل ہے۔

دوسرا دور وہ ہے جو عباسی سلطنت کے زمانے میں شروع ہوا اور عثمانی سلطنت اور مغل سلطنت کے زمانے تک جاری رہا۔ یہ دور آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارھویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئیں، جو آج اسلامی کتب خانے کا تاریخی حصہ ہیں۔ یہ تمام کتابیں قبل از سائنس دور (pre-scientific era) میں لکھی گئیں۔ چناں چہ یہ کتابیں قدیم روایتی اسلوب میں ہیں، نہ کہ جدید سائنسی اسلوب میں۔

تیسرا دور وہ ہے جو مغرب کے نو آبادیاتی نظام کے زمانے میں ظہور میں آیا۔ یہ دور انیسویں صدی عیسوی اور بیسویں صدی عیسوی کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس تیسرے دور میں پرنٹنگ پریس وجود میں آچکا تھا اور کاغذ سازی کی جدید صنعت قائم ہوچکی تھی۔ چناں چہ اِس زمانے میں ہزاروں کی تعداد میں اسلامی تعلیمات کے بارے میں کتابیں لکھی اور چھاپی گئیں۔ یہ کتابیں عربی کے علاوہ دوسری مختلف زبانوں میں تھیں۔

مگر تیسرے دور کی کتابیں بھی عملاً دوسرے دور کی کتابوں کا امتداد (extention) بن گئیں، یعنی تحریر اور استدلال کا جو روایتی اسلوب دوسرے دور میں قائم ہوا، وہی بڑی حد تک، تیسرے دور میں بھی جاری رہا۔ تیسرا دور تحریر اور استدلال کے اسلوب کے اعتبار سے وہ دور تھا جس کو سائنسی دور کہا جاتا ہے، مگر تیسرے دور کی کتابیں بھی عملاً دوسرے دور کی کتابوں میں اضافے کے ہم معنی بن گئیں۔ صرف اِس فرق کے ساتھ کہ دوسرے دور میں تیار کی ہوئی کتابیں قلمی کتابیں ہوا کرتی تھیں، جب کہ تیسرے دور کی کتابیں مطبوعہ کتابوں کی صورت میں سامنے آئیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی اٹھارھویں صدی عیسوی کے مشہور عالم ہیں۔ ان کی وفات 1762 میں ہوئی۔ اسلامی عقلیات کے موضوع پر ان کی کتاب 'حجۃ اللہ البالغۃ' ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حجۃ اللہ البالغہ تیسرے دور کے آغاز میں لکھی گئی، مگر وہ پوری طرح روایتی فریم ورک کے مطابق لکھی گئی۔ اِس اعتبار سے وہ دوسرے دور ہی کی ایک تکرار تھی۔

موجودہ زمانے میں اِس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں، اُن میں سے ایک کتاب الجزائری عالم شیخ محمد حسین الجِسر (وفات: 1909) کی کتاب: الرّسالة الحميدية في حقيقة الدّيانة الإسلامية ہے۔ اِس کتاب کو مزید اضافے کے ساتھ ان کے صاحب زادے شیخ ندیم حسین الجسر (وفات: 1980) نے شائع کیا ہے۔ اِس دوسری کتاب کا نام یہ ہے: قصة الإيمان بين الفلسفة والعلم والقرآن (1961) ۔ یہ کتاب پوری کی پوری فلسفیانہ پیٹرن پر لکھی گئی ہے، نہ کہ سائنٹفک پیٹرن پر۔ اِس لیے وہ عصرِ حاضر میں اسلام کی ضرورت کو پورا نہیں کرتی۔

اِس موضوع پر ایک اور کتاب ڈاکٹر محمد اقبال (وفات: 1938) کی ہے۔ یہ کتاب مصنف کے مختلف خطبات پر مشتمل ہے۔ وہ پہلی بار 1930 میں چھپی تھی۔ اِس کتاب کا نام یہ ہے:

The Reconstruction of Religious thought in Islam.

ڈاکٹر اقبال کی یہ کتاب بھی فلسفیانہ پیٹرن پر لکھی گئی ہے، اِس لیے اس کا معاملہ بھی سابقہ کتاب جیسا ہے۔ وہ عصرِ حاضر میں اسلام کی دعوتی ضرورت کو پورا نہیں کرتی۔ میرے علم کے مطابق، غالباً صرف ایک کتاب ہے جو براہِ راست طور پر اِس موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کتاب اصلاً فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اِس کتاب کے مصنف فرانس کے ڈاکٹر موریس بکائی (Maurice Bucaille) ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار 1975 میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب کا نام یہ ہے:

The Bible, the Quran, and Science

مگر یہ کتاب بھی اصل ضرورت کو پورا نہیں کرتی۔ اِس کتاب میں قرآن کے صرف ایک پہلو پر کچھ شواہد پیش کئے گئے ہیں۔ وہ دین اسلام کا سائنسی تعارف نہیں۔ اِس اعتبار سے اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ اسلام کی ایک جُزئی خدمت کہا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، راقم الحروف نے عصری اسلوب میں اسلام کے تعارف کو اپنا خصوصی موضوع بنایا۔ میری تمام کتابیں، براہِ راست یا بالواسطہ طور پر، اِسی موضوع سے متعلق ہیں۔ میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی پوری زندگی اسی کام پر وقف کردی۔ میرے نزدیک

اِس موضوع کے بنیادی طور پر دو پہلو ہیں — سائنسی اسلوب میں اسلامی تعلیمات کی تبیین، جدید علمی دریافتوں کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کو مدلّل انداز میں پیش کرنا۔

مثال کے طور پر، 'تذکیر القرآن' اور 'مطالعۂ سیرت' پہلی قسم کی کتب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور 'مذہب اور جدید چیلنج' اور 'عقلیات اسلام' کو دوسری نوعیت کی کتابوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ میری تقریباً تمام کتابیں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اِنھیں دونوں پہلوؤں کی مثالیں ہیں۔

سائنٹفک اسلوب کیا ہے، اس کو ایک لفظ میں، مبنی بر حقیقت اسلوب کہا جاسکتا ہے، یعنی حقیقت نگاری کا اسلوب۔ پرنٹنگ پریس کے زمانے میں تصنیف وتالیف کا رواج بہت زیادہ بڑھا اور کثیر تعداد میں کتابیں شائع ہوئیں، لیکن یہ تمام کتابیں قدیم روایتی اسلوب میں تھیں۔ قدیم روایتی اسلوب میں مسجّع اور مقفّٰی (rhymed) عبارتیں، تمثیلی استدلال، خطیبانہ نثر، انشائیہ اسلوب، شاعرانہ اندازِ تحریر اور ادبی طرزِ نگارش کا رواج تھا۔ یہی اسلوب موجودہ زمانے میں بھی کم وبیش جاری رہا۔ جدید دور میں سائنس کے زیر اثر مذکورہ اسالیب متروک ہوگئے۔ جدید سائنس، حقائق کے مطالعے کا نام تھی، اِس لیے یہی اسلوب دیگر تصنیفی شعبوں میں بھی رائج ہوگیا۔ اِس اسلوب کو ترتیبِ حقائق (arrangement of facts) کہا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر موجودہ زمانے میں برٹرینڈ رسل کی کتابیں اِسی سائنٹفک اسلوب کا ایک نمونہ ہیں۔ راقم الحروف نے اِسی اسلوب کو اسلام کے تعارف کے لیے اپنایا۔

جہاں تک سائنٹفک اسلوب کے دوسرے پہلو کی بات ہے، یعنی اسلام کی توضیح وتفہیم میں سائنسی دلائل کو استعمال کرنا، اس کو دوسرے لفظوں میں، اسلام کا جدید علم کلام (modern theology) بھی کہا جاسکتا ہے۔ قدیم علم کلام، روایتی استدلال اور یونانی منطق پر قائم تھا۔ جدید علم کلام وہ ہے جو سائنسی استدلال پر قائم ہو۔ سائنسی استدلال سے مراد ہے — جدید دریافت شدہ حقائق کی روشنی میں اسلام کے عقائد کو مدلل کرنا۔ راقم الحروف نے اِس اعتبار سے متعدد کتابیں تیار کیں۔ اِن میں سے ایک کتاب وہ ہے جس کا اردو ٹائٹل 'مذہب اور جدید چیلنج' (*God Arises*) ہے۔ وہ مختلف ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں شائع ہوچکی ہے۔ عربی زبان میں اس کا ٹائٹل 'الاسلام یتحدّی' ہے۔

سائنس کی جدید دریافتوں کی بنیاد پر کلامیاتی استدلال کی ایک مثال وہ ہے جس کو ضابطۂ ناکارگی (Law of entropy) کہا جاتا ہے۔ اِس دریافت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مادّی کائنات ازلی نہیں ہوسکتی۔ قدیم یونانی فلاسفہ مادّہ (matter) کو قدیم مانتے تھے۔ اس کے زیر اثر مسلم فلسفی ابن رُشد (وفات: 1198ء) نے مادّہ کو قدیم مان لیا۔ مگر مادّہ کی قدامت کا نظریہ اسلامی عقیدے سے ٹکراتا ہے۔ کیوں کہ اِس کے مطابق، خدا اور مادّہ دونوں قدیم ہوجاتے ہیں، جب کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق، خدا قدیم اور ازلی ہے، اور مادّہ بعد کی تخلیق۔ یہ جدید دریافت اسلامی عقیدے کے حق میں سائنسی تصدیق (scientific affirmation) کی حیثیت رکھتی ہے۔ ضابطۂ ناکارگی کے قانون کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: 'مذہب اور جدید چیلنج'، صفحہ 55۔

اوپر کی بات نظریاتی اعتبار سے ذہنی فریم ورک سے تعلق رکھتی ہے۔ اب اِس معاملے کے دوسرے پہلو کو لیجئے، یعنی وہ مسئلہ جس کو عملی فریم ورک کہا جاسکتا ہے۔ اِس دوسرے معاملے میں مسلمان موجودہ زمانے میں اتنے اجنبی ہوگئے ہیں کہ موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ لوگوں کو وہ آج کی دنیا کے لیے ناموزوں (misfit) نظر آتے ہیں۔

اس کا سبب کیا ہے۔ میرے مطالعے کے مطابق، اِس کا سبب دوبارہ یہ ہے کہ اِس معاملے میں بھی دوسرے دور کا فریم ورک تیسرے دور میں بھی بدستور جاری رہا۔ حالاں کہ تیسرے دور میں ضرورت تھی کہ اِس پہلو سے قدیم ڈھانچے پر نظر ثانی کی جائے اور اس کو جدید مسلّم ڈھانچے کے مطابق بنایا جائے۔ اِس نظر ثانی کا تعلق عقائد میں نظر ثانی سے نہیں ہے، بلکہ منہاج (method) میں نظر ثانی سے ہے۔

عقائد ہمیشہ ابدی ہوتے ہیں، ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مگر منہاج (method) کا تعلق حالات سے ہے۔ فقہ کا مسلّمہ اصول اسی منہاج کے پہلو سے ہے۔ وہ فقہی اصول یہ ہے کہ: تتغیر الأحکام بتغیّر الزمان والمکان (زمان اور مکان کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں)۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بار بار مخالف گروپ کی طرف سے قتال کا چیلنج پیش آیا، مگر آپ نے اس کے جواب میں مختلف رویہ اختیار کیا۔

مثال کے طور پر مکی حالات میں آپ نے ہجرت کا طریقہ اختیار فرمایا، یعنی ٹکراؤ کے مقام کو چھوڑ دینا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر آپ نے خندق (trench) کا طریقہ اپنایا، یعنی اپنے اور مخالف کے درمیان ایک حاجز (buffer) قائم کردینا۔ اِسی طرح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے ٹکراؤ سے اعراض کرنے کے لیے فریقِ مخالف کی یک طرفہ شرطوں کو قبول کرتے ہوئے اُن سے صلح کرلی، وغیرہ۔

جمہوریت کا تعلق عملی معاملات سے ہے۔ اور اجتماعی نوعیت کے مشترک معاملات میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ اِس طرح کے معاملات میں جو صورتِ حال پیش آتی ہے، وہ نہ خیرِ مطلق ہوتی ہے اور نہ شرِمطلق، بلکہ اُن میں دونوں قسم کے پہلو شامل رہتے ہیں۔ اِس لیے اِس طرح کے کسی معاملے کو آئڈیل کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے، بلکہ عملی افادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اِس طرح کے کسی معاملے میں بہترین اصول یہ ہے کہ — مسائل کو نظر انداز کرو، اور مواقع کو استعمال کرو:

Ignore the problems, avail the opportunities.

موجودہ زمانے میں مسلم رہنماؤں نے قربانی کی حد تک غیر معمولی سرگرمیاں دکھائیں، لیکن اِن سرگرمیوں کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ رہنما اپنی سرگرمیوں میں مذکورہ حکمت کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ وہ ہر جگہ مسائل سے ٹکراتے رہے، اور مبنی بر مواقع منصوبہ بندی (opportunity-based planning) کا طریقہ اختیار کرنے میں ناکام رہے۔

پچھلے دوسو سال کے درمیان مسلم دنیا میں جو سرگرمیاں جاری رہی ہیں، ان کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ اِس پوری مدت میں مسلم رہنما ٹکراؤ کے اصول پر عمل کرتے رہے۔ ہر مقام پر انھوں نے ایک مسئلہ (problem) دریافت کیا اور اِس پرابلم سے ٹکرانے میں اپنی ساری طاقت صرف کردی۔ اُن کی سوچ یہ تھی کہ جب تک یہ پرابلم ختم نہ ہو، اُس وقت تک کوئی مثبت کام نہیں کیا جاسکتا — کہیں یہودی پرابلم، کہیں برٹش پرابلم، کہیں امریکن پرابلم، کہیں نوآبادیاتی پرابلم، کہیں ہندو پرابلم، کہیں ظالم حکومت کا پرابلم، کہیں کوئی اور پرابلم، یہی ہر جگہ مسلم رہنماؤں کا نشانۂ عمل بنا رہا۔

اس طریقِ کار کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ خدا کے تخلیقی نقشے کے خلاف تھا۔ خدا نے اپنے تخلیقی نقشے

کے مطابق، موجودہ دنیا میں انسان کو مکمل آزادی عطا فرمائی ہے۔ انسان کو اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرنے کا بھی اختیار ہے، اور اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اپنی خداداد آزادی کو غلط طور پر استعمال کرے۔ انسان کی اِس آزادی کو صرف قیامت منسوخ کرے گی۔ اِس سے پہلے کوئی شخص اس کو منسوخ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ موجودہ دنیا کے تمام مسائل اسی انسانی آزادی کے غلط استعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ چوں کہ ہم انسان کی آزادی کو منسوخ نہیں کر سکتے، اِس لیے ہم یہ بھی نہیں کر سکتے کہ اُن چیزوں کو دنیا سے ختم کر دیں جن کو ہم اپنے لیے قومی یا سیاسی مسئلہ سمجھتے ہیں۔

خدا کے قائم کردہ اِس تخلیقی نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس دنیا میں ہمارے لیے جو انتخاب (choice) ہے، وہ صحیح (right) اور غلط (wrong) کے درمیان نہیں ہے، بلکہ یہ انتخاب چھوٹے شر (lesser evil) اور بڑے شر (greater evil) کے درمیان ہے۔ کسی صورتِ حال میں ہمارے عمل کی منصوبہ بندی اِس تصور کے تحت نہیں ہو سکتی کہ ہم یہ دیکھیں کہ اصولی اعتبار سے درست کیا ہے اور نادرست کیا، اور پھر جو چیز ہمیں اصولی طور پر درست نظر آئے، اس کو حاصل کرنے کے لیے ہم پُرشور جدوجہد شروع کر دیں۔ اِس کے بجائے یہ ہونا چاہیے کہ ہم یہ دیکھیں کہ عملی اعتبار سے جو دو انتخاب ہمارے لیے ممکن ہیں، اُن میں سے کون سا انتخاب اَہوَن (easier) ہے اور کون سا غیر اہون (non-easier)۔ اِسی اصول کو فقہ میں اھون البلیّتین کہا جاتا ہے، یعنی دو مصیبتوں میں سے آسان (easier) مصیبت۔

یہ فطرت کا اصول ہے۔ اِس اصول کو اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ ہر صورت حال میں آدمی کو بلاتاخیر اپنے عمل کے لیے ایک نتیجہ خیز نقطۂ آغاز (starting point) مل جاتا ہے، اور کسی صورتِ حال میں حقیقی نقطۂ آغاز کا ملنا کامیابی کی یقینی ضمانت ہے۔ اِس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کسی مزید نقصان میں مبتلا ہوئے بغیر نتیجہ خیز عمل شروع کر دیتا ہے اور آخر کار وہ اپنے مطلوب تک پہنچ جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں حالات مکمل طور پر بدل چکے ہیں۔ اِس لیے ضروری ہے کہ منہاج کے معاملے میں نئے ماڈل کو اختیار کیا جائے۔ یہ ماڈل اصولی طور پر نتیجہ (result) کی بنیاد پر ہوگا،

یعنی جو ماڈل اسلام کے لیے بہ اعتبار نتیجہ مفید ہو، اس کو اختیار کرنا اور اُس ماڈل کو چھوڑ دینا جو نتیجے کے اعتبار سے کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہونے والا ہو۔

اِس اعتبار سے موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ جدید جمہوری ماڈل کو اختیار نہ کر سکے۔ وہ جدید جمہوری نظام میں بھی قدیم حاکمانہ ماڈل پر قائم رہنا چاہتے ہیں، حالاں کہ جدید حالات میں عملاً یہ ممکن ہی نہیں۔ اِس قسم کے اصرار کا نتیجہ صرف دو صورتوں میں برآمد ہوگا۔ یا تو مسلمان ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کریں جو بلاشبہہ خودکشی کے ہم معنیٰ ہے، یا پھر وہ منافق بن جائیں، یعنی اپنی ذہنی سوچ کے اعتبار سے وہ حاکمانہ ماڈل کو اپنائے ہوئے ہوں اور عملی اعتبار سے مصلحت کا انداز اختیار کرکے وہ اپنے مادی مفاد کو بچانے کی کوشش کریں۔

اِس معاملے میں تفصیلی مطالعے کے بعد میں نے کئی کتابیں لکھیں۔ میں نے اپنی کتابوں میں بتایا کہ جمہوری ماڈل اگرچہ بہ ظاہر ایک نیا ماڈل ہے، لیکن اُس میں اور اسلام کی حقیقی تعلیمات میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ ہم اپنی اسلامی حیثیت کو پوری طرح باقی رکھتے ہوئے جمہوری نظام میں اپنے آپ کو شامل کر سکتے ہیں۔ یہاں میں چند مثالوں کی روشنی میں اس کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

موجودہ زمانے میں جن چیزوں کی بنا پر اسلام کے بارے میں یہ عالمی تاثر قائم ہو گیا ہے کہ اسلام جدید حالات کا ساتھ نہیں دیتا، اسلام جدید دور کے لیے ایک غیر متعلق مذہب ہے۔ یہ تاثر موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی قومی روش کی بنا پر قائم ہوا ہے، نہ کہ اسلام کی اصل تعلیمات کی بنا پر۔

1- مثال کے طور پر موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنے رسول کی شان میں ''گستاخی'' کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اپنے مذہبی عقیدے کی بنا پر ان کے اوپر فرض ہے کہ وہ ایسے انسان کو قتل کر ڈالیں۔ مسلمانوں کا یہ نظریہ دورِ جدید کے تصورات سے ٹکراتا ہے۔ کیوں کہ موجودہ زمانے کا یہ مسلّمہ ہے کہ ہر شخص کو پُرامن اظہار رائے کی آزادی ہے۔ اِس آزادی کو کسی بھی حال میں ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ ٹکراؤ جدید دور اور مسلم تصورات کے درمیان ہے، نہ کہ جدید دور اور اصل اسلامی تعلیمات کے درمیان۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں بھی اظہارِ خیال کی آزادی اُسی کامل درجے میں

دی گئی ہے جس کو جدید دور کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اِس معاملے کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب ’شتمِ رسول کا مسئلہ‘ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

2- یہی معاملہ سیکولرازم کا ہے۔ موجودہ زمانے میں سیکولرازم کو اسٹیٹ پالیسی کا معیاری ماڈل سمجھا جاتا ہے۔ مگر موجودہ زمانے کے اسلام پسند مسلم رہنماؤں نے یہ اعلان کیا کہ سیکولرازم، اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم سیکولر نظام کے خلاف لڑ کر اس کا خاتمہ کریں۔ لیکن یہ ٹکراؤ بھی جدید دور اور مسلمانوں کے درمیان ہے، نہ کہ جدید دور اور اسلام کے درمیان۔ اسلام خود بھی مشترک سماج کے لیے اُسی طرح سیکولر پالیسی کا حامی ہے، جس طرح جدید دور میں سمجھا جاتا ہے۔ اِس مسئلے کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب ’دینِ کامل‘ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اسی طرح کا ایک معاملہ وہ ہے جو جمہوریت (democracy) سے تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ زمانے کے اسلام پسند مسلم لیڈروں نے اعلان کیا کہ جمہوریت ایک غیر اسلامی نظریہ ہے، اِس لیے وہ مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ دوسری طرف، جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ جمہوریت کا ماڈل سب سے بہتر سیاسی ماڈل ہے۔ مگر یہ ٹکراؤ بھی جدید ذہن اور موجودہ مسلمانوں کے درمیان ہے، نہ کہ جدید ذہن اور اصل اسلام کے درمیان۔ اسلام خود بھی سیاسی تنظیم کے لیے جمہوری طریقے کا حامی ہے۔ اسلام میں تھیاکریٹک اسٹیٹ (theocratic state) کا تصور نہیں۔ اسلام مکمل طور پر جمہوری نظام کا قائل ہے، یعنی عوام کی رائے کے مطابق، سیاسی نظام کی تشکیل۔

اِس موضوع کی وضاحت میں نے اپنی مختلف کتابوں میں کی ہے۔ مثلاً ’فکرِ اسلامی‘ اور ’مسائل اجتہاد‘ وغیرہ۔ اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک عقیدہ اور عبادت کا تعلق ہے، اِس معاملے میں اسلام کی تعلیمات مطلق حکم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن جہاں تک اجتماعی نظام کا معاملہ ہے، اس کا کوئی مطلق معیار نہیں۔ اجتماعی نظام کا معاملہ عوام کی اجتماعی صورتِ حال پر منحصر ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: كما تكونون كذلك يؤمّر عليكم (البيهقي، رقم الحديث: 6896) یعنی جیسے تم ہوگے، ویسے ہی تمھارا حکومتی نظام ہوگا۔

اجتماعی نظام کے معاملے میں اسلام کا اصول اِس پر مبنی ہے کہ عوام یا معاشرہ کی استعدادِ قبولیت کس درجے کی ہے۔ عوام کے اندر جن اجتماعی احکام کی قبولیت کی استعداد ہوگی، اُن کو آغاز میں نافذ کیا جائے گا، لیکن جن احکام کی قبولیت کی استعداد عوام کے اندر موجود نہ ہوگی، اُن احکام کی تنفیذ کا آغاز خود قانون کے نفاذ سے نہ ہوگا، بلکہ ذہن سازی کے عمل سے ہوگا۔ اسلام کے اِس اصول کو تدریج کا اصول کہہ سکتے ہیں، یعنی عوام کی استعداد کے مطابق، احکام کا تدریجی نفاذ، نہ کہ ان کا بہ یک وقت نفاذ۔

موجودہ دنیا چوں کہ امتحان کی مصلحت کے تحت بنائی گئی ہے، اِس لیے یہاں انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے۔ یہ آزادی خود خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق ہے، اِس لیے کوئی بھی طاقت اس کو منسوخ نہیں کرسکتی۔ تجربہ ہے کہ انسان زیادہ تر اِس آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اِسی بنا پر ایسا ہوا کہ تاریخ میں کبھی معیاری نظام نہ بن سکا، اور نہ آئندہ اِس کا کوئی امکان ہے۔ مومن اور غیر مومن دونوں مجبور ہیں کہ اِس غیر معیاری دنیا میں وہ اپنی زندگی کا نقشہ بنائیں۔ اِسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ — اِس دنیا میں معیار کبھی حاصل نہیں ہوسکتا:

The Ideal can not be achieved in this world.

اِس صورتِ حال کی بنا پر اسلام کا اصول یہ ہے کہ معیار کے حصول کے لیے جنگ نہ کی جائے، بلکہ کسی صورتِ حال میں عملی طور پر جو ممکن ہو، اس کو مان کر اپنی زندگی کا نقشہ بنایا جائے۔ اِس اصول کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو ہر صورتِ حال میں فوراً ہی ایک نقطۂ آغاز (starting point) مل جاتا ہے۔ ہر صورتِ حال میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی فوری طور پر اپنے عمل کا نقشہ بنائے، تاکہ جو کچھ آج قابلِ حصول نہ تھا، وہ مستقبل میں قابلِ حصول ہوجائے۔

فکرِ مغرب

فکرِ مغرب (western thought) کیا ہے۔ فکرِ مغرب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، سائنسی طرز فکر (scientific thinking) کا نام ہے، اور سائنسی طرزِ فکر پورے معنوں میں ایک درست طرز فکر ہے۔ وہ بجائے خود اسلامی فکر نہیں ہے، لیکن اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک موافقِ اسلام طرز فکر ہے۔ وہ اسلام کے حق میں ایک مؤید علم (supporting knowledge) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل مغربی فکر نہ غیر اسلامی فکر ہے اور نہ وہ کسی بھی اعتبار سے، اسلام دشمن فکر ہے۔

قرآن کی سورہ الاحقاف میں یہ آیت آئی ہے: قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (46:4) یعنی کہو کہ کیا تم نے غور کیا اُن چیزوں پر جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ مجھے دکھاؤ کہ انھوں نے زمین میں کیا بنایا ہے، یا آسمانوں میں ان کی کچھ شرکت ہے۔ میرے پاس اِس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ، یا کوئی علم جو چلا آتا ہو، اگر تم سچے ہو۔

مفسر ابن کثیر (وفات: 774 ہجری) نے درست طور پر لکھا ہے کہ قرآن کی اِس آیت میں دو قسم کے علم کو بطور مستند علم (authentic knowledge) تسلیم کیا گیا ہے — ایک، علمِ نقلی اور دوسرا علمِ عقلی۔ علمِ نقلی سے مراد مبنی بر وحی علم ہے اور علم عقلی سے مراد وہ علم ہے جو عقلِ انسانی پر مبنی ہو۔ تاہم علمِ عقلی سے مراد صرف وہ علم نہیں ہے جو عباسی دور کے معتزلہ اور متکلمین کے درمیان پایا جاتا تھا، بلکہ توسیعی طور پر اُس سے مراد سائنسی دور کا وہ جدید علم بھی ہے جس کو عقلی علم (rational knowledge) کہا جاتا ہے۔

اِس جدید عقلی دور کا آغاز اٹلی کے سائنس داں گلیلیو (Galieo Galilei) سے ہوا۔ گلیلیو کی وفات 78 سال کی عمر میں 1642 میں ہوئی۔ گلیلیو پہلا شخص ہے جس نے دوربین (telescope) کا استعمال کیا۔ گلیلیو کو جدید سائنس کا بانی (founder of modern science) کہا جاتا ہے۔

گلیلیو سے پہلے دنیا میں زمین مرکزی نظریہ (geo-centric theory) کو مانا جاتا تھا، جس کو ٹالمی (Claudius Ptolemy) اور ارسطو (Aristotle) کی حمایت حاصل تھی۔ گلیلیو نے ثابت کیا کہ زمین مرکزی نظریہ غلط ہے اور اس کے مقابلے میں وہ نظریہ درست ہے جس کو آفتاب مرکزی نظریہ (heleo-centric theory) کہا جاتا ہے۔

اِس کے بعد تاریخ میں ایک نیا عقلی دور یا سائنسی دور شروع ہوا۔ اِس دور میں عقلی ثبوت کا یہ معیار قرار پایا کہ قابلِ اعتماد علم صرف وہ ہے جو قابلِ تصدیق علم (verifiable knowledge) ہو۔ دوربینی مشاہدہ نے زمین مرکزی نظریہ کی تصدیق نہیں کی، اِس لیے علمی دنیا میں اُس کو رد کردیا گیا، جب کہ دوربینی مشاہدہ نے آفتاب مرکزی نظریہ کی تصدیق کردی، اِس لیے وہ عقلی طور پر درست قرار پایا۔

سائنس دراصل اِسی قابلِ تصدیق علم (verifiable knowledge) کا اصطلاحی نام ہے۔ اہلِ سائنس نے علمِ وحی (revealed knowledge) کا انکار نہیں کیا، البتہ انھوں نے علم وحی کو اپنے دائرہ تحقیق سے باہر قرار دیا، کیوں کہ وہ ان کے نزدیک قابلِ تصدیق نہ تھا۔

اِس کے بعد علم کی دنیا میں ایک تقسیم (bifurcation) کا طریقہ وجود میں آگیا۔ اب علمِ وحی کا دائرہ الگ ہوگیا اور عقلی علم یا سائنسی علم کا دائرہ الگ۔ یہ تقسیم بجائے خود غلطی نہ تھی۔ اِس کی بنا پر اہلِ سائنس کو یہ موقع ملا کہ وہ آزادانہ طور پر اپنی تحقیق کو جاری رکھ سکیں۔ اِس طرح سائنس کی تحقیق کا دائرہ اُس دنیا سے ہوگیا جس کو فطرت (nature) کہا جاتا ہے۔ اِسی لیے سائنس کو دوسرے الفاظ میں، فطری علم (natural science) یا ماڈّی علم (physical science) کہا جاتا ہے۔

تائیدی علم

سائنسی علم براہِ راست طور پر اسلامی علم نہ تھا، لیکن بالواسطہ طور پر وہ اسلام کے لیے ایک تائیدی علم کی حیثیت رکھتا تھا۔ عقل کی صلاحیت کو لے کر سائنسی دنیا میں جو تحقیقات ہوئیں، اُس سے اسلام کو بہت زیادہ فائدے حاصل ہوئے۔ اِس اعتبار سے، سائنس کا پورا علم، اسلام کے لیے تائیدی علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اُس حدیث رسول کی مصداق ہے جو

پیشین گوئی کی زبان میں اِن الفاظ میں آئی ہے: إن الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر (صحيح البخاري، رقم الحديث: 3062)۔

فطرت میں سائنسی تحقیق کے ذریعے جو دریافتیں وجود میں آئیں، وہ خاص طور پر دو اعتبار سے، اسلام کے لیے غیر معمولی تائید کی حیثیت رکھتی تھیں۔ایک قسم کی تائید وہ تھی جو اُس سائنس کے ذریعے حاصل ہوئی جس کو نظریاتی سائنس (theoretical science) کہا جاتا ہے۔اور اسلام کے لیے دوسری تائید وہ تھی جس کو اصطلاحی طور پر انطباقی سائنس (applied science) کہا جاتا ہے۔

نظریاتی سائنس نے یہ کیا کہ اس نے فطرت (nature) میں چھپے ہوئے وہ قوانین دریافت کیے جو اب تک غیر معلوم تھے۔ اِن قوانین کے بارے میں اشارات قرآن میں موجود تھے، لیکن قرآن میں ان کی تفصیل موجود نہ تھی۔ اہلِ ایمان کو ابھارا گیا کہ وہ زمین وآسمان میں غور کرکے اِن تفصیلات کو دریافت کریں، جو کہ ان کے لیے اضافہ ایمان کا ذریعہ ہیں۔لیکن بعد کے زمانے کے مسلمان یہ کام نہ کرسکے۔آخرکار، اللہ تعالی نے اہلِ سائنس کے ذریعے یہ کام لیا۔ اللہ تعالی کا یہی منصوبہ ہے جس کو قرآن میں مستقبل کی پیشین گوئی کے طور پر اِس طرح بیان کیا گیا ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)

اِس معاملے کی ایک مثال قرآن کی یہ آیت ہے: وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا (50:9) یعنی ہم نے آسمان سے مبارک پانی اتارا۔قرآن کی اِس آیت میں اُس آفاقی تطہیر کا ذکر ہے جس کو موجودہ زمانے میں ازالہ نمک (desalination) کہا جاتا ہے۔ پانی کا ذخیرہ جو سمندروں میں جمع ہے، اُس میں تحفظاتی مادہ (preservative) کے طور پر تین فی صد نمک ملا ہوا ہے۔ یہ نمکین پانی انسان کے لیے نا قابلِ استعمال ہے۔ یہاں فطرت کے قانون کے مطابق، ایک عظیم آفاقی عمل ہوتا ہے جس کے ذریعے سمندر کا پانی نمک سے الگ ہوکر اوپر فضا میں جاتا ہے اور پھر بارش کی صورت میں خالص پانی زمین کی طرف لوٹتا ہے جس کو انسان اپنی ضرورتوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔قرآن میں، مبارک کے لفظ کی صورت میں اُس کا اشارہ موجود تھا،

لیکن اس کی تفصیل ہزار سال بعد جدید سائنس نے معلوم کی ، وغیرہ۔

انطباقی سائنس (applied science) کے ذریعے اسلام کو بہت سے تائیدی ذرائع حاصل ہوئے ۔مثلاً پرنٹنگ پریس اور کمیونکیشن ۔ اِن جدید سائنسی دریافتوں کے ذریعے تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ اسلام کی اشاعت کا کام عالمی سطح پر انجام دیا جا سکے۔ اللہ تعالی کو اول دن سے یہ مطلوب تھا کہ دینِ حق کو دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچایا جائے ،لیکن جدید ذرائع کے وجود میں آنے سے پہلے اِس کا امکان ہی نہ تھا۔ تاریخ میں پہلی بار یہ امکان جدید انطباقی سائنس کے ذریعے پیدا ہوا ہے۔

عالمی دعوت کا امکان

حدیث میں اسلامی دعوت کے ایک امکان کو اِس طرح بیان کیا گیا ہے: لايبقي على ظهر الأرض بيت مدر ولا وبر إلا أدخله الله كلمة الإسلام (مسند احمد، رقم الحديث: 24215) یعنی زمین کی سطح پر کوئی گھر ایسا باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے۔

اِس حدیثِ رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی میں جب کہ اسلام کا ظہور ہوا، اُس وقت سے یہ اسلامی دعوت کا نشانہ تھا کہ اسلام کا کلمہ کرہ ارض پر بسنے والے تمام مردوں اور عورتوں تک پہنچ جائے۔ مگر ایک ہزار سال تک یہ نشانہ عملاً پورا نہ ہو سکا، کیوں کہ اسباب کی اِس دنیا میں اِس نشانے کو پورا کرنے کے لیے عالمی ذرائع درکار تھے، جو کہ پچھلے ادوار میں موجود نہ تھے۔ دورِ جدید میں سائنس نے پہلی بار یہ موافق ذرائع فراہم کیے۔ اِس اعتبار سے دیکھئے تو مذکورہ حدیث کی تشریح اِن الفاظ میں کرنا درست ہوگا کہ — بعد کے زمانے میں ایسا ہوگا کہ اللہ کی توفیق سے ایسے اسباب وجود میں آئیں گے جن کو استعمال کرکے یہ ممکن ہو جائے گا کہ اہلِ ایمان اسلام کے کلمہ کو دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں تک پہنچا دیں۔

منفی رائے کا سبب

مغرب اور فکر مغرب کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان منفی رائے پائی جاتی ہے۔ عام طور پر مسلمان مغرب اور فکر مغرب کو اسلام کا دشمن سمجھتے ہیں۔ اِسی بنا پر موجودہ زمانے کے تمام مسلمان اہلِ مغرب سے نفرت کرتے ہیں اور مغربی علم سیکھنے کو ایک ناپسندیدہ فعل قرار دیتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کی

یہ رائے حقیقت پر مبنی نہیں ہے، وہ تمام تر متعصّبانہ فکر (biased thinking) کا نتیجہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ جس زمانے میں مغربی علم وجود میں آیا، اُسی زمانے میں ایک اور واقعہ وجود میں آیا جس کو مغربی استعمار (western colonisation) کہا جاتا ہے۔ اِسی زمانے میں مغربی قوموں، خاص طور پر برطانیہ اور فرانس، نے ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں میں اپنا سیاسی غلبہ قائم کرلیا۔ یہ ممالک اُس وقت مسلم سلطنت کا حصہ تھے۔ اِس سیاسی واقعے نے مسلمانوں کے اندر اہلِ مغرب کے خلاف شدید نفرت پیدا کردی۔ اِس کے بعد جب 1948 میں برطانی حکومت نے فلسطین کی تقسیم کی اور پھر امریکا، عربوں کے مقابلے میں اسرائیل کا حامی بن گیا، تو اِس کے نتیجے میں اہلِ مغرب کے خلاف مسلمانوں کی نفرت اپنی آخری حد پر پہنچ گئی۔ یہ نفرت ابتداءً قومی سطح پر ہوئی اور پھر اِس کے بعد مسلمان ہر اُس چیز سے نفرت کرنے لگے جو مغرب کی طرف سے آئی ہو۔

دو چیزوں میں فرق نہ کرنا

کہا جاتا ہے کہ — نفرت آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ یہی واقعہ مغرب کے معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا۔ نفرت کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر جو متعصّبانہ ذہن پیدا ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دو چیزوں میں فرق نہ کرسکے — مغربی علم اور اہلِ مغرب کی عملی کمزوریاں — یہ کمزوریاں ہر قوم میں لازماً پیدا ہوتی ہیں، حتی کہ خود مسلمانوں میں بھی۔

اہلِ مغرب کی جدید تاریخ کا ایک حصہ وہ تھا جو سائنسی علم یا عقلی علم (rational knowledge) سے تعلق رکھتا تھا، کیوں کہ اسلام خود پورے معنوں میں ایک عقلی مذہب (rational religion) ہے۔ جدید سائنسی علم کا یہ حصہ پوری طرح اسلام کے موافق تھا۔ اِسی کے ساتھ بشری کمزوری کی بنا پر دو اور ظاہرے وجود میں آئے جو عام طور پر ہر قوم میں وجود میں آتے ہیں — ایک، حقیقتوں کی غلط توجیہہ (misinterpretation) اور دوسرے، آزادی کا غلط استعمال (misuse of freedom)۔ یہ دونوں چیزیں بلاشبہہ قابلِ اعتراض تھیں، مگر وہ اہلِ مغرب کی انسانی کمزوریاں تھیں، وہ خود مغربی سائنس کا حصہ نہ تھیں۔ مگر مسلمان اپنے تعصب کی بنا پر اِس فرق کو سمجھ نہ سکے، وہ غلط توجیہہ یا

آزادی کے غلط استعمال کی طرح خود مغربی سائنس کو بھی منفی نظر سے دیکھنے لگے۔

مثال کے طور پر مغربی دنیا میں برہنگی (nudity) کا کلچر ہے۔ یہ بات بطور واقعہ درست نہیں ہے، مگر اس کا تعلق فکرِ مغرب سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق آزادی کے غلط استعمال سے ہے۔ اللہ تعالی نے امتحان کی مصلحت کی بنا پر انسان کو آزادی دی ہے۔ انسان کو خود اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے یا چاہے تو وہ اس کا درست استعمال کرے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا رہا ہے، اِسی طرح موجودہ زمانے میں بھی۔ البتہ موجودہ زمانے میں ڈگری کے اعتبار سے اس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اِسی طرح مغربی دنیا میں شراب کا رواج بھی آزادی کے غلط استعمال سے تعلق رکھتا ہے۔ خود فکر مغرب سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں، وغیرہ۔

اِس سلسلے میں دوسرا معاملہ غلط توجیہ (misinterpretation) کا ہے۔ موجودہ زمانے میں مغربی دنیا میں کئی نظریات وجود میں آئے۔ مثلاً ڈارون ازم (Darwinism)، فرائڈازم (Freudism) اور مارکس ازم (Marxism)، وغیرہ۔ یہ نظریات بلا شبہہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف تھے، مگر یہ نظریات فکر مغرب کا براہِ راست حصہ نہیں ہیں، بلکہ وہ زندگی کی غلط توجیہہ سے وجود میں آئے ہیں۔ ہم کو یقیناً دلائل کی بنیاد پر اِن نظریات کی تردید کرنا چاہیے، مگر یہ درست نہیں کہ ہم اِن نظریات کے حوالے سے خود فکر مغرب کو غلط سمجھنے لگیں۔

اِس قسم کی برائی ہر معاشرے میں پائی جاتی ہے، حتی کہ خود مسلم معاشرے میں بھی۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں جن لوگوں نے حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی کو شہید کیا، ان کا کیس یہی تھا کہ انھوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا۔ اِس طرح موجودہ زمانے میں آزاد مسلم ملکوں میں خود مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو ہلاک کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے، وہ خود اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ نہیں۔

یہی معاملہ غلط توجیہہ کا ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں خوارج کا جو ظاہرہ پیدا ہوا،

وہ اسلام کی غلط توجیہہ کا نتیجہ تھا۔ اِسی طرح موجودہ زمانے میں اسلام کی سیاسی تعبیر بھی قرآن وحدیث کی غلط توجیہہ کے نتیجے میں وجود میں آئی۔

عصری ذہن

عام طور پر مسلمان عصری ذہن کے بارے میں منفی رائے رکھتے ہیں۔ اس کا سبب وہی ہے جس کو الناس أعداء ما جهلوا کہا جاتا ہے، یعنی بے خبری کی بنا پر کسی کو اپنا دشمن سمجھ لینا۔ عصری ذہن کے بارے میں عادلانہ رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حقیقت پسندانہ ذہن کے تحت اس کا تجزیہ کیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے، عصری ذہن کا کیس کیا ہے۔

عصری ذہن کی اصل مغربی ذہن ہے۔ مغربی ذہن یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد پیدا ہونے والے ذہن کا نام ہے۔ اُس دور میں کچھ ایسے افراد یورپ میں اٹھے جنھوں نے فطرت (nature) کا مطالعہ غیر روایتی انداز میں شروع کیا۔ اِس سلسلے میں پہلا نمایاں نام اٹلی کے سائنس داں گلیلیو (وفات: 1642) کا ہے۔ گلیلیو تاریخ کا پہلا شخص ہے جس نے فلکیات کے مطالعے میں دوربین (telescope) کا استعمال کیا۔ یہ 1609 کا واقعہ ہے۔ اُس زمانے میں روایتی تصور یہ تھا کہ زمین مرکز میں ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ گلیلیو نے اپنے دوربینی مشاہدے میں جن حقیقتوں کو دریافت کیا، اُن سے یہ اخذ ہوتا تھا کہ سورج مرکز میں ہے اور زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔

سترھویں صدی کے آغاز میں عام طور پر روایتی طرز فکر کا غلبہ تھا۔ اُس وقت گلیلیو کا یہ اعلان ایک دھماکہ خیز واقعہ ثابت ہوا۔ اُس وقت مسیحی چرچ یورپ میں روایتی طرز فکر کا نمائندہ تھا۔ مسیحی پوپ کو یورپ کا بے تاج بادشاہ (uncrowned king) سمجھا جاتا تھا۔ چناں چہ مسیحی چرچ اور سائنس دانوں کے درمیان زبردست ٹکراؤ پیش آیا۔ اِس ٹکراؤ میں سائنس دانوں کو فتح ہوئی۔

مسیحی چرچ کے اختیار کا دائرہ دن بدن سمٹنے لگا، یہاں تک کہ 1929 میں حکومتِ اٹلی اور مسیحی پوپ کے درمیان وہ معاہدہ ہوا جس کو لیٹران معاہدہ (Lateran Treaty) کہا جاتا ہے۔ اِس معاہدے کے مطابق، مسیحی چرچ اِس پر راضی ہوگیا کہ اس کا دائرہ اختیار روم کے ایک مختصر علاقہ

ویٹکن (Vatican) تک محدود رہے گا جس کا کُل رقبہ صرف 109 ایکڑ ہے۔

اِس طرح تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جس کو سائنس کا دور کہا جاتا ہے۔ اگر اِس واقعے کو مذہبی اصطلاح میں بیان کیا جائے تو اِس دور کو ایمان بالغیب کے بجائے ایمان بالشہود کا دور کہا جائے گا۔ اِس دور میں فطرت کا مطالعہ مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں کیا جانے لگا۔ اِس کے نتیجے میں فطرت کے اندر چھپے ہوئے بے شمار رموز دریافت ہوئے جو اب تک انسان کے لیے غیر دریافت شدہ بنے ہوئے تھے۔ اِس کے نتیجے میں نئی ٹکنالوجی، نئی صنعتیں، نئے ذرائع و وسائل انسان کی دسترس میں آ گئے۔

یہ نئی مسحور کن دنیا تمام تر آبجیکٹیو مطالعہ (objective study) کے ذریعے انسان کی دسترس میں آئی تھی۔ اِس میں مبنی بر وحی مطالعہ کا بظاہر کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ دور بظاہر سائنس دانوں کی تحقیقات کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اِس دور کا ایک عملی نتیجہ یہ تھا کہ قابلِ پیمائش (measurable) کو ناقابلِ پیمایش (non-measurable) سے الگ کر دیا گیا۔ اِس کے نتیجے میں علمی دنیا میں فکر کا وہ طریقہ رائج ہوا جس کو موضوعی طریقِ مطالعہ (objective method of study) کہا جاتا ہے۔ اِس طریقے کی عملی کامیابی کی بنا پر اس کو موجودہ دور میں رواجِ عام حاصل ہو گیا۔

سائنس دانوں نے کبھی یہ دعوی نہیں کیا کہ اُن کا طریقِ مطالعہ تمام حقائق کو جاننے کے لیے واحد کارآمد طریقہ ہے۔ اِس کے برعکس، انھوں نے کھلے طور پر یہ تسلیم کیا کہ سائنس پورے علم حقیقت کا احاطہ نہیں کرتی، وہ حقیقت کا صرف جزئی علم دیتی ہے:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

سائنسی طریقِ مطالعہ اپنی عملی کامیابی، نہ کہ نظری صداقت کی بنا پر موجودہ زمانے میں بہت زیادہ عام ہو گیا، حتی کہ فلاسفہ اور مفکرین نے بھی اِسی طرزِ فکر کو اختیار کرلیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جس طرح فطرت (nature) کا مطالعہ موضوعی انداز میں کرتے تھے، اسی طرح وہ مذہب کا مطالعہ بھی موضوعی انداز میں کرنے لگے۔ وہ مذہب کو الہامی ظاہرہ (revealed phenomenon)

تسلیم کرنے کے بجائے، اس کو صرف ایک سماجی ظاہرہ (social phenomenon) سمجھنے لگے۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق، پیغمبر اور پیغمبر کے کام کا اُسی طرح تجزیہ کرنے لگے جس طرح وہ مادی چیزوں کا تجزیہ کررہے تھے۔

جدید مفکرین کا یہ طریقہ ازروئے حقیقت درست نہ تھا، لیکن اس کا سبب عناد یا سازش نہ تھی، بلکہ وہ اُن کے اختیار کردہ طریقِ مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ یہ طریقہ مذہب کے خلاف تھا، مگر وہ کسی بدنیتی کا نتیجہ نہ تھا۔ وہ بطور خود اِسی کو درست طریقِ مطالعہ سمجھتے تھے۔ سنجیدگی کے ساتھ ان کا یہ یقین تھا کہ یہ طریقہ جس طرح مظاہر فطرت کے مطالعے میں کامیاب ثابت ہوا ہے، اِسی طرح وہ وحی والہام کے مظاہر کے مطالعے میں بھی کامیاب ہوسکتا ہے۔

سائنس دانوں نے جو کام کیا، وہ تائید (support) کے اعتبار سے، اہلِ اسلام کے لیے انتہائی مفید تھا، لیکن مسلم ذہن اپنی منفی سوچ کی بنا پر اِس فرق کو سمجھ نہ سکا۔ انھوں نے نئے دور میں پیدا ہونے والی مغربی تہذیب کو کلی طور پر اسلام دشمنی کا کیس قرار دے دیا، حالاں کہ اگر وہ اِس معاملے میں غیر جانب دارانہ انداز میں اہلِ مغرب کے کیس کو سمجھتے تو وہ جان لیتے کہ اہلِ مغرب کا کام، خود پیغمبر اسلام کی پیشین گوئی کے مطابق، باعتبار نتیجہ، تائید دین کی حیثیت رکھتا تھا، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے تخریبِ دین کا معاملہ نہ تھا۔

حرفِ آخر

موجودہ زمانے میں اہلِ مغرب کا کنٹری بیوشن (contribution) بہت زیادہ ہے، سیکولر اعتبار سے بھی اور اسلامی اعتبار سے بھی۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اہلِ مغرب کی کوششوں سے ایک نئی دنیا وجود میں آئی ہے، جس کو جدید تہذیب (modern civilization) کہا جاتا ہے۔ جدید تہذیب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، منصوبہ خداوندی کا ایک حصہ ہے۔

اللہ تعالی کو یہ مطلوب تھا کہ فطرت (nature) میں چھپے ہوئے قوانین دریافت کیے جائیں۔ فطرت کے تخلیقی امکانات کو انفولڈ (unfold) کیا جائے۔ مادی دنیا میں چھپے ہوئے

آلاء اللہ (wonders of God) کو علمِ انسانی کا حصہ بنایا جائے، تاکہ خدا کا دین روایتی دور سے نکل کر سائنسی دور تک پہنچے، تاکہ خدا کی معرفت کے اعلیٰ پہلو انسان پر کھلیں، تاکہ قرآن کے مخفی 'عجائب' معلوم واقعہ بن جائیں ۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کو مطلوب تھا اور مغربی تہذیب کے ذریعے اِسی مطلوبِ الٰہی کی تکمیل ہوئی ہے۔

اِس دنیا میں مثبت پہلو (positive aspects) کے ساتھ ہمیشہ کچھ منفی پہلو (negative aspects) شامل رہتے ہیں۔ اِس کے باوجود اِس کی ضرورت ہوتی ہے کہ تاریخ کی مثبت تعبیر تلاش کی جائے۔ مثال کے طور پر اسلام کے عہدِ اول میں اہلِ ایمان کی پہلی جنریشن کے درمیان خوں ریز لڑائی ہوئی، جو کہ بلاشبہہ ایک منفی واقعہ تھا، مگر اِس منفی واقعے کے باوجود اسلام کے مثبت انقلابی رول کا اعتراف کیا جائے گا۔ اِسی طرح، اہلِ مغرب کے ترقیاتی کارناموں کے ساتھ اگر کچھ منفی پہلو شامل ہیں تو اِس بنا پر ہرگز ایسا کرنا درست نہ ہوگا کہ مسلمان اہلِ مغرب کے بارے میں منفی ذہن کا شکار ہوجائیں اور وہ اہلِ مغرب کے مثبت کارناموں کا اعتراف نہ کریں۔

اِس قسم کا منفی رویہ خود مسلمانوں کی اپنی ذات کے لیے شدید نقصان کی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ اِس قسم کا منفی رویہ حقیقتِ واقعہ کا اعتراف نہ کرنا ہے اور حقیقتِ واقعہ کا اعتراف نہ کرنا بلاشبہہ دنیا کے پہلو سے بھی ہلاکت خیز ہے اور آخرت کے پہلو سے بھی۔

اسلام اور دورِ جدید

تاریخ کے بارے میں اللہ کا ایک منصوبہ قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:
وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (8:39)۔

اِس معاملے کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ نے موجودہ کرۂ ارض کو بنایا اور یہ مقدر کردیا کہ اس کی نعمتیں (blessings) یکساں طور پر تمام انسانوں کو حاصل ہوں (55:10)۔ تاریخ انسانی کی ابتدا میں ایک عرصے تک یہ صورتِ حال قائم رہی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے دنیا میں شخصی حکمرانی کا نظام آ گیا۔ یہ سیاسی کلچر طاقت کے زور پر قائم ہوا اور پھر پوری انسانی تاریخ میں پھیل گیا۔

یہ سیاسی اجارہ داری (political monopoly) اللہ کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کے خلاف تھی۔ اِس نظام نے انسانی آزادی کو بہت زیادہ محدود کردیا، جب کہ اللہ کو یہ مطلوب ہے کہ انسان پوری طرح آزاد رہے۔ اِس نظام کے تحت یہ ہوا کہ ایک طبقے کو ہر اعتبار سے مراعاتی طبقہ (priveleged class) کا درجہ مل گیا، جب کہ بیش تر لوگ اُس سے محروم رہے۔ اِس نظام نے اپنے تحفظ کے لیے مختلف قسم کی پابندیاں لوگوں پر عائد کردیں۔ انھیں میں سے ایک چیز وہ بھی تھی جس کو مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا ہے۔

اِس سیاسی نظام کا مطلب یہ تھا کہ اللہ کے پیدا کردہ تمام مواقع پر ایک محدود طبقے کی اجارہ داری قائم ہو اور بیش تر لوگ اِس سے محروم ہو جائیں کہ وہ آزادانہ طور پر وہ کام کرسکیں جو نظامِ تخلیق کے مطابق، اُن سے مطلوب ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا۔ اُس وقت تک سیاسی اجارہ داری کا یہ نظام لوگوں کے اوپر اپنی گرفت (grip) پوری طرح مضبوط کر چکا تھا۔ یہ صورتِ حال اللہ کے تخلیقی منصوبہ کے سراسر خلاف تھی۔ اِس نظام کے تحت یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ انسانی شخصیت کے فطری امکانات (potentials) انفولڈ (unfold) ہوں، زمین کے فطری امکانات دریافت ہوں اور وہ چیز وجود میں آئے جس کو تہذیب (civilization) کہا جاتا ہے۔

اُس وقت رسول اور اصحابِ رسول کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اِس غیر فطری نظام کا خاتمہ کردیں، تاکہ انسان کے اوپر اللہ کی تمام امکانی سعادتوں کے دروازے کھل سکیں۔ اُس وقت عرب کے پڑوس میں دو بڑی سلطنتیں قائم تھیں — ایک، ساسانی ایمپائر (Sassanid Empire) اور دوسری، بازنطینی ایمپائر (Byzantine Empire)۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اِن سلطنتوں کے سربراہوں کے نام خطوط روانہ کیے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پہلے مرحلے میں یہ کوشش کی گئی کہ یہ حکمراں پُرامن فہمائش کے ذریعے اپنی اصلاح کرلیں۔ جب اِن حکمرانوں کے اوپر پُرامن فہمائش کارگر نہیں ہوئی تو اس کے بعد یہ حکم دیا گیا کہ اِن حکمرانوں کے خلاف فوجی کارروائی کی جائے۔ یہ فوجی کارروائی گویا انسانوں کے ذریعے ایک خدائی آپریشن (divine operation) تھا جو اللہ کی خصوصی مدد کے ذریعے کامل طور پر انجام پایا۔ یہ خدائی آپریشن کسی وقتی مقصد کے لیے نہ تھا۔ اُس کا نشانہ یہ تھا کہ ایک تاریخی نظام کا خاتمہ کرکے دنیا میں دوسرے تاریخی نظام کو وجود میں لایا جائے۔ اِس قسم کا منصوبہ صرف ایک لمبے عمل (long-term process) کے ذریعے بروئے کار لایا جاسکتا تھا، چناں چہ ایسا ہی ہوا۔

سب سے پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ ہوا کہ ملکِ عرب میں قبائلی حکمرانی کو ختم کیا گیا۔ اِس کے بعد خلافتِ راشدہ کے زمانے میں ایشیا اور فریقہ کے درمیان قائم شدہ دو بڑی سلطنتوں — ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر — کا خاتمہ کیا گیا۔ یہ دونوں واقعات غیر معمولی قربانیوں کے ذریعے پیش آئے۔ یہ تاریخ بشری کا ایک عظیم سیاسی انقلاب تھا جس کا ذکر بائبل میں اِن الفاظ میں آیا ہے — اُس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہوگئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہوگئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے:

He looked and startled the nations. And the everlasting mountains were scattered. (Habakkuk 3:6)

تاہم اللہ تعالی کو تاریخ میں جو نیا دور لانا تھا، اس کے لیے اتنا ہی کافی نہ تھا۔ اِس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ سیاسی اجارہ داری کے نظام کو عالمی سطح پر ختم کردیا جائے۔ منصوبۂ الٰہی کا یہ دوسرا مرحلہ مسلم مجاہدین کے ذریعے انجام پایا۔ جیسا کہ معلوم ہے، اس کے بعد بنوامیہ کے دور اور بنوعباس کے دور اور دوسری مسلم سلطنتوں کے دور میں یہ ہوا کہ دنیا کے تقریباً پورے آباد حصے میں مسلم مجاہدین نے قدیم طرز کے سیاسی نظام کو

توڑ ڈالا۔ اِس عمل کی تکمیل انیسویں صدی عیسوی میں یورپ میں ہوئی۔ اِس زمانے میں بڑے بڑے سیاسی مفکرین (political thinker) پیدا ہوئے۔ مثلاً روسو، وغیرہ۔ اِن لوگوں نے قدیم زمانے کے جابر حکمرانوں (despotic kings) کے خلاف طاقت ور کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں چھپ کر پورے یورپ میں پھیل گئیں۔ اِس کے بعد عملی انقلاب کے لیے بڑی بڑی سیاسی تحریکیں اٹھیں۔ اِس کی تکمیل 1879 میں ہوئی، جب کہ وہ تاریخی واقعہ پیش آیا جس کو فرنچ انقلاب (French Revolution) کہا جاتا ہے۔ اِس کے بعد قدیم طرز کا بادشاہی نظام عملاً ختم ہوگیا اور دنیا میں بڑے پیمانے پر جمہوری نظام قائم ہوگیا۔

سائنس کا دور

قدیم بادشاہی نظام میں آزادانہ سوچ کا ماحول موجود نہ تھا۔ بادشاہ ہر نئے فکر کو کچل دیتے تھے۔ مثال کے طور پر رومن ایمپائر تقریباً دو ہزار سال تک قائم رہا۔ مگر اِس طویل مدت میں کوئی سائنسی دریافت نہ ہوسکی۔ موجودہ زمانے میں جمہوریت کا دور آیا تو انسان کو مکمل معنوں میں فکری آزادی حاصل ہوگئی۔ اب فطرت (nature) میں آزادانہ تحقیق کا عمل شروع ہوگیا۔ اِس کے نتیجے میں فطرت میں چھپے ہوئے قوانین دریافت ہونے لگے، یہاں تک کہ وہ دور پیدا ہوگیا جس کو جدید سائنسی دور کہا جاتا ہے۔

جدید سائنس کے دو پہلو ہیں — نظری سائنس (theoratical science) اور انطباقی سائنس (applied science)۔ نظری سائنس میں تحقیقات کے ذریعے عالم فطرت کے اُن مخفی قوانین کا ایک حصہ دریافت ہوا جس کو قرآن میں آیات اللہ (sign of God) کہا گیا ہے۔ اِن قوانین کی دریافت کا یہ عظیم فائدہ ہوا کہ دینِ خداوندی کے معتقدات مسلّمہ انسانی علم کی بنیاد پر ثابت شدہ بن گئے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ''مذہب اور جدید چیلنج'')

سیکولرزم کا نظریہ

قدیم سیاسی نظام میں بادشاہ کو مطلق اختیار حاصل ہوتا تھا۔ جدید جمہوریت میں اِس کی گنجائش باقی نہ رہی۔ اس کے بعد حالات کے تحت ایک نیا نظریہ پیدا ہوا جس کو سیکولرزم کہا جاتا ہے۔ سیکولرازم کا مطلب لادینیت نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ملکی انتظام کے سوا

دوسرے امور میں اسٹیٹ کا رویہ عدم مداخلت (non-interference) کا ہوگا۔

یہ ایک دوررس انقلابی واقعہ تھا جو تاریخ میں پہلی بار پیش آیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے تمام غیر سیاسی شعبے مثلاً مذہب، تعلیم، اقتصادیات، وغیرہ حکومت کی گرفت سے آزاد ہوگئے۔ اب لوگوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اِن غیر سیاسی شعبوں میں آزادانہ طور پر اپنے منصوبے کی تکمیل کرسکیں۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے بلاشبہ یہ ایک عظیم واقعہ تھا۔ یہ گویا سنتِ حدیبیہ کا عالمی احیا تھا۔

ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فائدہ اِس طرح حاصل ہوا تھا کہ آپ کو فریقِ ثانی کی تمام شرطوں کو یک طرفہ طور پر ماننا پڑا تھا۔ موجودہ زمانے میں حدیبیہ جیسے فائدے مزید اضافے کے ساتھ غیر مشروط طور پر حاصل ہوگئے ہیں۔ اب اگر کوئی شرط ہے تو وہ صرف یہ کہ اہلِ ایمان کسی کے خلاف تشدد (violence) نہ کریں۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی شرط نہیں، کیوں کہ اہلِ ایمان اپنے عقیدے کے تحت پہلے ہی سے تشدد کو قابلِ ترک قرار دئے ہوئے ہیں۔

جدید ٹکنالوجی

انطباقی سائنس کے ذریعے موجودہ زمانے میں انسان کو ایک عظیم نعمت حاصل ہوئی ہے، یعنی جدید ٹکنالوجی۔ جدید ٹکنالوجی کے بے شمار فائدے ہیں۔ یہ فائدے عملاً تمام انسانوں کے لیے عام ہیں، لیکن اہلِ ایمان کے لیے وہ ہزاروں گنا زیادہ بڑے فائدے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ اہلِ ایمان اِس ٹکنالوجی کی مدد سے اپنی دنیا کی بھی پر امن تعمیر کرسکتے ہیں، اسی کے ساتھ وہ تعلیم دین اور دعوت الی اللہ کے کام میں اِس ٹکنالوجی کو استعمال کرسکتے ہیں اور اس طرح وہ اُس ربانی کام کو انجام دے سکتے ہیں جو اُن کے لیے آخرت کی ابدی سعادتوں کا دروازہ کھولنے والا ہے۔

اقوامِ متحدہ

قدیم زمانے میں انسانی آبادی مختلف الگ الگ حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اُس وقت وہ وسائل موجود نہ تھے جس کے ذریعے یہ ممکن ہو کہ دنیا کے تمام انسانوں کی عالمی تنظیم قائم کی جاسکے۔ موجودہ زمانے میں نئے حالات نے ساری دنیا کو ایک گلوبل ولیج (global village) کی حیثیت دے دی ہے۔

اب زمین کے ایک کونے میں بسنے والا انسان زمین کے دوسرے کونے میں بسنے والے انسان سے کامل طور پر مربوط ہے۔ حالات کے اِس نئے تقاضے کے تحت 1920 میں ایک عالمی تنظیم قائم ہوئی جس کا نام لیگ آف نیشنس (League of Nations) تھا۔ اِس کے بعد 1945 میں زیادہ بڑے پیمانے پر ایک اور عالمی تنظیم قائم ہوئی جس کا نام اقوامِ متحدہ ہے۔ اقوامِ متحدہ اپنے مختلف اداروں کے ساتھ اب ایک مستحکم عالمی تنظیم بن چکی ہے اور اس میں دنیا کے تمام ممالک شامل ہیں جن کی تعداد تقریباً دو سو ہے۔

اقوامِ متحدہ موجودہ زمانے میں ایک بین اقوامی نعمت (international blessing) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے بہت سے اجتماعی فائدے ہیں۔ مثلاً موجودہ زمانے میں اقوامِ متحدہ کے عالمی پلیٹ فارم کی بنا پر تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ دنیا کے تمام ملکوں نے باقاعدہ طور پر اور سرکاری طور پر یہ تسلیم کرلیا کہ ان کے شہریوں کو مکمل معنوں میں مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ آزادی کے اِس حق کے ذریعے موجودہ زمانے میں کام کے ایسے مواقع (opportunities) کے دروازے کھل گئے ہیں جو اِس سے پہلے پوری تاریخ میں انسان کے اوپر یکسر بند پڑے ہوئے تھے۔

اقوامِ متحدہ کے ذریعے حاصل ہونے والے انسانی حقوق بلاشبہہ ایک عظیم نعمت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس نعمت سے بے خبر صرف وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو اپنی قومی خواہشوں میں جیتے ہوں اور اُس کو خود ساختہ طور پر معیار کا درجہ دئے ہوئے ہوں۔

خلاصہ کلام

موجودہ زمانے میں دنیا کے نظام میں جو دور رس تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، وہ رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے لائے جانے والے انقلاب کا منتہا (culmination) ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے عرب اور اطرافِ عرب میں جو انقلاب آیا، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک تاریخی انفجار (historical explosion) کے ہم معنی تھا۔

یہ اللہ کا ایک منصوبہ تھا جس کے ذریعے تاریخ میں ایک نیا عمل (process) شروع ہوا۔ یہ عمل مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے بیسویں صدی عیسوی میں اپنی آخری تکمیل تک پہنچ گیا۔ اِس انقلاب کا

مقصد دنیا میں کوئی معیاری نظام (ideal system) قائم کرنا نہ تھا، بلکہ یہ تھا کہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، انسان کی آزادی کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے دنیا میں ایسا ماحول قائم کیا جائے جس میں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہر چیز ہر انسان کے لیے ہو جائے۔

اِسی کے ساتھ دینی نقطۂ نظر سے یہ مطلوب تھا کہ اہلِ ایمان کے لیے ایک طرف یہ ممکن ہوجائے کہ وہ کھلے طور پر اعلیٰ معرفت کے درجات طے کرسکیں اور اِسی کے ساتھ اُن کو اِس بات کی کامل آزادی حاصل ہو کہ وہ دعوت الی اللہ کے پرامن کام کو آخری حد تک انجام دے سکیں۔

یہ تمام مطلوب فائدے موجودہ زمانے میں کامل طور پر حاصل ہو گئے ہیں۔ اب انسان کے اوپر حصولِ معرفت کے بھی تمام دروازے کھل چکے ہیں اور دعوتی عمل کے تمام مواقع بھی۔ یہ کام اتنے بڑے پیمانے پر ہوا ہے کہ یہ کہنا کسی مبالغے کے بغیر درست ہے کہ —— دورِ جدید اسلام کا دور ہے۔ اکیسویں صدی میں قرآن کی وہ پیشین گوئی آخری حد تک پوری ہو چکی ہے جو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی تھی: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (48:28) یعنی اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ وہ اُس کو تمام دینوں پر غالب کردے، اور اللہ کافی گواہ ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں وقتی اعتبار سے کسی سیاسی واقعے کا ذکر نہیں ہے، اِس میں اللہ کے ایک تاریخی منصوبے کا ذکر ہے جس کو ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہونا تھا اور پھر لمبے عمل کے بعد اپنی تکمیل تک پہنچنا تھا۔ بیسویں صدی عیسوی میں یہ خدائی منصوبہ اپنی آخری تکمیل تک پہنچ گیا۔ اب اہلِ ایمان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اِن عالمی مواقع کو جانیں اور ان کو بھرپور طور پر استعمال (avail) کریں۔

مغربی تہذیب، مغربی کلچر

مغربی تہذیب اور مغربی کلچر دونوں ایک دوسرے سے اُسی طرح الگ ہیں جس طرح اسلام اور مسلمانوں کی قومی تاریخ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ایک شخص اگر ایسا کرے کہ وہ صرف مسلم تاریخ کو پڑھے اور اُسی سے اسلام کے متعلق رائے قائم کرے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کا مذہب نام ہے — باہمی لڑائی، خاندانی حکومت، ملک گیری، فرقہ بندی، عسکریت اور خود کش بم باری جیسی چیزوں کا۔ مگر یہ تاثر سرتا سر غلط ہوگا، کیوں کہ یہ چیزیں بلاشبہہ مسلم تاریخ کا حصہ ہیں، لیکن وہ ہرگز مذہب اسلام کا حصہ نہیں۔ اسلام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو مسلمانوں کی قومی تاریخ سے الگ کرکے دیکھا جائے، ورنہ آدمی اسلام کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔

یہی معاملہ مغربی تہذیب اور مغربی کلچر کا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ مغربی تہذیب اصلاً سائنسی تہذیب، بالفاظِ دیگر، قوانینِ فطرت کی دریافت کا نام ہے۔ اِس دریافت کے نتیجے میں جو نظام وجود میں آیا، اُسی کا نام مغربی تہذیب ہے۔ دوسری چیز مغربی اقوام ہیں۔ مغربی اقوام کو اُسی طرح آزادی ملی ہوئی ہے جس طرح دوسری قوموں کو آزادی ملی ہوئی ہے۔ وہ بھی اُسی طرح خواہشات کا شکار ہوتی ہیں جس طرح دوسری قومیں خواہشات کا شکار ہوتی ہیں۔ ان کے درمیان بھی اُسی طرح ایک قومی سیاست وجود میں آتی ہے جس طرح دوسرے گروہوں کے درمیان ان کی قومی سیاست وجود میں آتی ہے۔ اِن اسباب کی بنا پر مغربی قوموں کے درمیان بھی وہ تمام خرابیاں پیدا ہوئیں جو دوسری قوموں میں پیدا ہوئیں، حتی کہ خود مسلم قوموں کے درمیان بھی۔ عدل کا تقاضا ہے کہ ہم دونوں پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھیں۔ اِس قسم کی عادلانہ تفکیر کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ہم اِس غلطی سے بچ جائیں گے کہ ہم اہلِ مغرب کی قومی خرابیوں کو سائنسی تہذیب کا حصہ سمجھ لیں اور مغربی اقوام اور سائنسی تہذیب دونوں کے بارے میں یکساں طور پر منفی ذہن کا شکار ہو جائیں۔ یہ عین وہی منصفانہ طریقِ مطالعہ ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے ذیل میں کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی قومی خرابیوں کو

الگ کر کے اسلام کو اس کی نظریاتی حیثیت میں دیکھا جاتا ہے۔ اس طریقِ مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والے کے سامنے اسلام کی بھی درست تصویر آتی ہے اور مسلم قوم کی بھی درست تصویر۔

مغربی تہذیب بمعنی سائنسی تہذیب، اسلام کی دشمن نہیں، بلکہ وہ اسلام کے لیے ایک عظیم مددگار کی حیثیت رکھتی ہے۔ مغربی تہذیب بمعنی سائنسی تہذیب کے ذریعے موجودہ زمانے میں بہت سی نئی حقیقتیں سامنے آئی ہیں۔ اِن حقیقتوں کے ذریعے سائنس نے فیصلے کی ایک نئی بنیاد فراہم کی ہے جو عین ہمارے حق میں ہے۔ مثال کے طور پر سائنسی طریقِ مطالعہ کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ کوئی چیز مقدس (holy) نہیں، ہر چیز علمی تنقیح (scientific scrutiny) کے تابع ہے۔ اِس اصول کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی تاریخ میں ایک نیا شعبہ علم وجود میں آیا جس کو تنقید عالیہ (higher criticism) کہا جاتا ہے۔ اِس شعبہ علم کے تحت قدیم مذہبی کتابوں، خصوصاً بائبل کا، تنقیدی مطالعہ کیا جانے لگا، جب کہ یہ کتابیں پہلے تنقید سے بالاتر سمجھی جاتی تھیں۔ اِس مطالعے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالص علمی اعتبار سے، یہ ثابت ہو گیا کہ یہ کتابیں تاریخی اعتباریت (historical credibility) سے خالی ہیں۔ اِس سلسلے میں مغربی زبانوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن میں سے ایک کتاب یہ ہے:

Albert Schweitzer, *The Quest of the Historical Jesus*,
Published 1910, London

اِسی طرح، سائنسی تہذیب نے ایک نیا فکر پیدا کیا جس کو مبنی بر قطعیت فکر (exact thinking) کہا جاتا ہے۔ اِس فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ سبجیکٹیو طرزِ فکر (subjective thinking) غیر معقول قرار پا گیا اور آبجیکٹیو طرزِ فکر (objective thinking) کو درست سمجھا جانے لگا۔ اِس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ وہ کتابیں غیر معتبر قرار پا گئیں جو صلیبی جنگوں کے بعد اسلام اور پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کے لیے غیر علمی انداز میں لکھی گئی تھیں۔ اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل کتاب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

On Heroes, Hero-Worship (1841) by Thomas Carlyle

اِسی طرح، سائنسی تہذیب کے تحت فطرت کا جو مطالعہ شروع کیا گیا، اس کے نتیجے میں فطرت کے بہت سے راز دریافت ہوئے۔ رموزِ فطرت کی یہ دریافت اپنی حقیقت کے اعتبار سے،

آیات اللہ (signs of God) کے انکشاف کے ہم معنی تھی۔ اِن دریافتوں کے نتیجے میں یہ ممکن ہو گیا کہ اسلام کی صداقتوں کو وقت کے مسلّمہ علمی معیار کی سطح پر ثابت شدہ بنایا جا سکے۔ اِس سلسلے میں ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب — مذہب اور جدید چیلنج جو عربی میں 'الإسلام یتحدی' کے نام سے چھپی ہے۔ اِس کتاب کا انگریزی ایڈیشن گاڈ ارائزیز (God Arises) کے نام سے چھپ چکا ہے۔

اِسی طرح مغربی تہذیب کے تحت دنیا میں اور کئی چیزیں وجود میں آئیں جو علمی طور پر مفید ہونے کے علاوہ، خود اسلام کے لیے بے حد مفید تھیں۔ مثلاً فکری آزادی، مذہبی تنگ نظری کا خاتمہ، جمہوریت کا عالمی فروغ، عالمی سیاحت (world tourism)، جس کا مطلب یہ تھا کہ مدعو خود داعی کے پاس بڑی تعداد میں پہنچنے لگا، وغیرہ۔ اِسی طرح مغربی تہذیب کے تحت ایک دور وجود میں آیا جس کو دورِ مواصلات کہا جاتا ہے۔ اِس کے تحت پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا جیسی چیزیں وجود میں آئیں جو اسلام کی دعوت واشاعت کے اعتبار سے، بلاشبہہ ایک عظیم نعمت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مغربی تہذیب کے تحت موجودہ زمانے میں اِس طرح کی بہت سی مفید چیزیں وجود میں آئی ہیں۔ چوں کہ مغربی قومیں اور دوسری قومیں بھی اِن چیزوں کا اپنے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتی ہیں، اس لیے مسلمان اس کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتے ،مگر اِس دنیا میں خود اللہ تعالی نے ہر عورت اور مرد کو آزادی عطا کی ہے۔ اِس دنیا کے جو فطری وسائل (means) ہیں، اُن کو ہر ایک اپنے حق میں استعمال کرتا ہے۔ اِسی طرح تہذیبی وسائل کو بھی ہر گروہ اپنے اپنے حق میں استعمال کرے گا۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اِس معاملے میں خدائی منصوبے کو سمجھیں اور حقیقت پسندانہ روش اختیار کریں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ سورج صرف مسلم بستیوں میں چمکے اور غیر مسلم بستیوں میں اندھیرا چھایا رہے، اِسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ فطرت میں چھپی ہوئی نعمتوں کو مسلمان تو اپنے حق میں استعمال کریں اور غیر مسلم ان کو اپنے حق میں استعمال کرنے سے محروم رہیں۔

مغربی تہذیب کا مسئلہ

امت مسلمہ کی تاریخ میں بہت سے ایسے مسئلے پیش آئے جن کو فتنہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً باطنیت کا فتنہ،

وحدتِ وجود کا فتنہ، انکارِ حدیث کا فتنہ، قادیانیت کا فتنہ، وغیرہ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی ماضی میں اِس قسم کا کوئی فتنہ پیدا ہوا تو بہت سے علما اٹھے جنھوں نے قرآن اور سنت کی روشنی میں اس کا بھرپور رد کیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ بہت سے مسلمان جوان فتنوں سے متاثر ہوئے تھے، انھوں نے ان سے توبہ کی اور وہ امت مسلمہ کی مین اسٹریم (mainstream) میں شامل ہوگئے۔ تاریخ مزید بتاتی ہے کہ اِن موقعوں پر ایسا نہیں ہوا کہ ایک فتنہ دوبارہ ایک نئے فتنے کی شکل اختیار کر لے، یعنی جو لوگ ان فتنوں سے ذہنی طور پر متاثر ہوئے تھے، انھوں نے اپنی اصلاح کر لی اور اربابِ فتنہ سے الگ ہو کر وہ اسلامی زندگی گزارنے لگے۔

موجودہ زمانے میں بھی اِسی قسم کا ایک ''فتنہ'' پیش آیا۔ یہ مغربی تہذیب کا فتنہ تھا۔ یہ فتنہ ابتدائی طور پر یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد شروع ہوا اور بیسویں صدی عیسوی میں اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ اُس وقت بہت سے عرب اور غیر عرب مصلحین پیدا ہوئے جنھوں ے مغربی تہذیب کے خلاف زبان وقلم کے ذریعے جہاد شروع کیا۔ یہ جہاد بظاہر کامیاب رہا۔ بہت سے مسلم نوجوان جو مغربی تہذیب سے متاثر ہوئے تھے، وہ اس سے تائب ہوگئے۔

اِس کامیابی کا عمومی طور پر اعتراف کیا گیا۔ حتی کہ ان مصلحین میں سے کئی افراد ایسے تھے جن کو بڑے بڑے القاب دئے گئے۔ مثلاً مفکرِ اسلام، معمارِ ملت، عہد ساز شخصیت، مجدّدِ دوراں، وغیرہ۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ قدیم فتنوں کے مقابلے میں جدید فتنے کا معاملہ اپنے حقیقی نتیجہ (result) کے لحاظ سے بالکل مختلف ثابت ہوا، یعنی بظاہر نظری سطح پر خاتمہ کے نتیجے کے اعتبار سے وہ دوبارہ مزید اضافے کے ساتھ زندہ ہوگیا۔ اِن مصلحین نے مسلمانوں کی جدید نسلوں کو یہ باور کرایا تھا کہ — مغربی تہذیب زہریلے پھل کا ایک درخت ہے۔ جدید تہذیب ایک مسلم دشمن تہذیب ہے۔ مغربی تہذیب کے تحت پیدا شدہ تعلیمی ادارے قتل گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا تعلق مغربی تہذیب سے بائکاٹ کا ہونا چاہئے، نہ کہ اس سے تعاون کا۔

ابتدائی طور پر مسلم نوجوانوں پر بظاہر ان باتوں کا اثر ہوا۔ مسلم نوجوان مغربی تہذیب کے

علم برداروں سے لڑنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کے تحت قائم شدہ تعلیمی اداروں کو چھوڑ دیا، انھوں نے مغربی اداروں میں جاب لینے سے انکار کر دیا، وغیرہ۔ مگر بعد کو آسمان نے یہ منظر دیکھا کہ انھیں مسلم نوجوانوں نے بڑے پیمانے پر یوٹرن (U turn) لیا۔ انھوں نے اور ان کی اولاد نے مغربی تہذیب کے تحت قائم شدہ اداروں میں ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ مغربی تہذیب کے اداروں کے کارکن بن گئے۔ وہ بہت بڑی تعداد میں مسلم ملکوں سے ہجرت کر کے مغربی ملکوں میں پہنچ گئے اور وہاں سٹل (settle) ہونے پر فخر کرنے لگے۔

قدیم فتنوں اور جدید تہذیب کے فتنہ میں نتیجہ (result) کے اعتبار سے یہ فرق کیوں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قدیم طرز کے فتنے صرف اعتقادی فتنے تھے، مگر مغربی تہذیب کا معاملہ یہ تھا کہ دنیا کی مادی ترقی سے وہ براہِ راست جڑا ہوا تھا۔ مغربی تہذیب کے علم برداروں نے جونئ دنیا بنائی، وہ مادی اعتبار سے ایک نہایت شاندار دنیا تھی۔ اس کے مکانات، اس کے شہر، اس کے دفاتر، اس کی سواریاں، اس کے سامانِ حیات، ہر چیز نہایت اعلیٰ معیار کی تھی۔ اِسی حقیقت کو موجودہ زمانے کے ایک مسلم شاعر نے طنزیہ انداز میں اس طرح بیان کیا تھا:

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے — واں کنسٹر سب بلوری ہیں، یاں ایک پرانا مٹکا ہے

انسان اپنی نفسیات کے اعتبار سے ہمیشہ ترقی کا طالب ہوتا ہے۔ وہ اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے زیادہ ترقی یافتہ مستقبل دیکھنا چاہتا ہے۔ مغربی تہذیب میں یہ پہلو نہایت اعلیٰ درجے میں موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم مفکرین کی خلافِ مغرب مہم ابتداءً نظری طور پر کامیاب ہوکر اپنے نتیجہ کے اعتبار سے مکمل طور پر ناکام ہوگئی۔ مسلم نوجوان ابتدائی طور پر رومانوی جذبات کے تحت جدید تہذیب کے خلاف ہوگئے، مگر بعد کو جب انھوں نے دیکھا کہ ساری ترقیاں مغربی تہذیب اور مغربی علوم سے وابستہ ہیں، تو وہ سب کچھ بھول کر اس کے اوپر ٹوٹ پڑے۔ جن تعلیمی اداروں کو قتل گاہ سمجھ کر انھوں نے وقتی طور پر چھوڑ دیا تھا، وہ دوبارہ اُسی میں داخل ہوئے اور انھوں نے وہاں سے ڈگریاں حاصل کیں۔ جن مغربی قوموں کو انھوں نے مسلم دشمن قرار دیا، انھیں کے اداروں میں جاب لینے کو وہ اپنے لئے قابلِ فخر سمجھنے لگے۔

اُن کے بزرگوں نے جن مغربی ملکوں سے ہجرت کا فتوی دیا تھا، انھیں ملکوں میں واپس جا کر وہ پُرفخر طور پر آباد ہونے لگے، وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے دو حصے تھے — ایک، اس کی سائنس اور دوسرے، اس کا کلچر۔ مغربی سائنس حقائقِ فطرت کے انکشاف پر مبنی تھی۔ اُس کے اندر ذاتی طور پر غلطی کا کوئی پہلو شامل نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی سائنس، قرآن کی اِس آیت کی انفولڈنگ تھی: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (45:13)۔ وہ قرآن کے الفاظ میں: وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوْهُ کا ٹکنالوجکل اظہار تھا۔ وہ آفاق وانفس کی آیات کی وہ تبیین تھی جس کی پیشگی اطلاع قرآن (41:53) میں دے دی گئی تھی۔

مغربی تہذیب کا دوسرا پہلو اس کا کلچر تھا۔ یہ کلچر براہِ راست طور پر سائنس کی پیداوار نہ تھا، بلکہ وہ قومی اور سماجی عوامل کی پیداوار تھا۔ قومی اور سماجی دائرے میں خالق نے ہر انسان کو آزادی دی ہے۔ اِس دائرے میں انسان کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی ملی ہوئی آزادی کا صحیح استعمال کرے یا وہ اس کا غلط استعمال کرے۔ مغربی کلچر کے جن پہلوؤں کو لے کر ہمارے علما نے اُس کے خلاف ہنگامہ آرائی کی، وہ دراصل آزادی کے غلط استعمال (misuse of freedom) کا نتیجہ تھا، نہ کہ حقیقتاً مغربی سائنس کا نتیجہ۔ اِس معاملے میں ہمارے مفکرین کو اصولِ تمیز (principle of differentiation) کو منطبق کرنا تھا، مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امت کے افراد ایک فتنے کے استیصال کے نام پر ایک شدید تر فتنے کا شکار ہو گئے، یعنی دہرا پن۔ اس کا مزید نقصان یہ ہوا کہ وہ مغربی تہذیب کے پیدا کردہ مثبت مواقع کے استعمال سے محروم ہو کر رہ گئے۔

ماڈرن ایج اور اسلام

ماڈرن ایج (modern age) اور اسلام کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ ماڈرن ایج نے نظریہ اور عمل کے سارے ڈھانچے کو بدل دیا ہے، اِس لیے اب ضرورت ہے کہ اسلام پر نظر ثانی کی جائے۔ اِس نقطۂ نظر کا ایک نمونہ اے اے فیضی (وفات: 1981) کی کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اِس کتاب کا ٹائٹل یہ ہے:

A Modern Approach to Islam

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ماڈرن ایج کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ اسلام کو موجودہ زمانے میں سیاسی غلبہ حاصل نہیں ہے، اِس بنا پر سارے مسئلے پیدا ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اسلام کو پھر سے عالمی سطح پر سیاسی غلبے کے مقام تک پہنچایا جائے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب وغیرہ کا نقطۂ نظر یہی تھا۔ اِس نقطۂ نظر کے حامل افراد کا ماننا یہ ہے کہ مسلّح جہاد کے ذریعے اسلام کو دوبارہ غلبہ عطا کیا جائے، اور ساری دنیا میں خلافت کا نظام قائم کیا جائے۔ میرے نزدیک اِس قسم کی تمام باتیں اصل مسئلے کی نسبت سے غیر متعلق (irrelevant) ہیں۔ اِس معاملے میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ماڈرن ایج کو سمجھا جائے اور تجزیاتی مطالعے کے ذریعے اُس کے مقابلے میں اسلام کا موقف متعین کیا جائے۔ اِس کام میں ہمارے لیے رہ نما اصول، حدیث کے مطابق، یہ ہونا چاہیے کہ: **خُذ ما صَفا وَ دَع ما کدر**۔ یعنی جو چیز حق کے مطابق ہو، اُس کو لے لو اور جو چیز حق کے مطابق نہ ہو اُس کو چھوڑ دو۔

میں نے اپنے مطالعے سے یہ سمجھا ہے کہ ماڈرن ایج بنیادی طور پر تین چیزوں کا نام ہے— (1) جدید سائنسی دریافتیں (2) جدید کلچر (3) جدید فلسفیانہ افکار۔ اب میں اِن تینوں کے بارے میں مختصر طور پر اپنا حاصلِ مطالعہ بیان کروں گا۔

1- جدید سائنسی دریافتیں کیا ہیں۔ وہ اصلاً مغربی تہذیب یا سیکولر تہذیب کا حصہ نہیں، وہ فطرت میں چھپے ہوئے قوانین کی دریافت ہیں۔ یہ قوانین خالقِ کائنات کے مقرر کردہ ہیں، یعنی اُسی

خدا کے مقرر کردہ جس نے قرآن کی صورت میں اپنا کلام بھیجا ہے۔ اِن سائنسی دریافتوں کا اسلام سے کوئی ٹکراؤ نہیں، بلکہ وہ قرآن کی اِس آیت کا مصداق ہیں: سنُريهم ءاياتنا في الآفاق وفي أنفسهم حتّٰى يتبين لهم أنه الحق (41:53)

قدیم زمانے میں انسانی افکار پر توہمات کا غلبہ تھا۔ توہماتی عقائد یا قصے کہانیوں کے تحت ہر معاملے میں لوگوں نے بے بنیاد رائیں بنالی تھیں۔ سائنس نے جدید طریقے پر تحقیق کر کے چیزوں کی اصل حقیقت معلوم کی۔ اِن دریافت کردہ حقائق کا اسلام سے کوئی ٹکراؤ نہیں۔

مثال کے طور پر قدیم زمانے میں پانی کو صرف سیّال برف سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں سائنس نے دریافت کیا کہ پانی دو گیسوں کے مجموعے سے بنتا ہے۔ پانی کا فارمولا یہ ہے (H_2O)۔ اِس دریافت کا اسلام سے کوئی ٹکراؤ نہیں۔ وہ اتنا ہی زیادہ اسلامی ہے جتنا کہ وہ سائنسی ہے۔ اِسی طرح شمسی نظام کے بارے میں پہلے زمین مرکزی (geo-centric) نظریہ رائج تھا۔ کوپرنکس کے زمانے میں جدید آلات کی مدد سے جو مطالعہ کیا گیا، اُس سے یہ ثابت ہوا کہ شمسی نظام زمین مرکزی نہیں ہے بلکہ وہ آفتاب مرکزی (heleo-centric) ہے۔ یعنی آفتاب مرکز میں ہے اور زمین اور دوسرے سیّارے اُس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس نظریے کا بھی اسلام سے کوئی ٹکراؤ نہیں۔ یہ نظریہ بھی اتنا ہی اسلامی ہے جتنا کہ وہ سائنسی ہے۔

یہی معاملہ سائنس کی اُن تمام دریافتوں کا ہے جو ثابت شدہ بن چکی ہیں۔ یہ تمام کی تمام دریافتیں خالقِ کائنات کے قانون کی دریافتیں ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ خالقِ کائنات کے تدبیرِ امر کی تفصیل ہیں (13:2)۔ کچھ لوگ اِس معاملے میں إسلامية المعرفة (Islamization of knowledge) کی بات کرتے ہیں، یعنی علم کو اسلامی بنانا۔ مگر جہاں تک قطعی علوم (exact sciences) کی بات ہے، اِس قسم کا نعرہ بالکل غیر متعلق ہے۔ کیوں کہ قطعی علوم میں اسلامائزیشن کا کوئی مطلب نہیں۔

2- دوسرا پہلو وہ ہے جو جدید کلچر سے تعلق رکھتا ہے۔ جدید مغربی کلچر دو قسم کی چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک وہ جو فطرت کے اصول پر مبنی ہے، اِس بنا پر وہ اسلام کے لیے بھی پوری طرح قابلِ قبول ہے۔

اِس کلچر کا دوسرا حصہ وہ ہے جو ذہنی بے راہ روی کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے، اِس بنا پر وہ اسلام کے لیے قابلِ قبول نہیں۔

مثال کے طور پر جدید مغربی کلچر میں انسانی احترام کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ اِس بنا پر اُن کے یہاں نہایت اعلیٰ روایات قائم ہوئی ہیں۔ مثلاً ہر انسان کے لیے اظہار خیال کی کامل آزادی ہونا۔ ہر انسان کو خالص جوہر (merit) کی بنیاد پر مقام ملنا۔ تنقید (dissent) کو انسان کا غیر مشروط حق قرار دینا۔ محروم (disabled) افراد کو ہر اعتبار سے برابر کا درجہ عطا کرنا، وغیرہ۔ یہ قدریں (values) اسلام میں موجود تھیں، لیکن مغربی کلچر کا یہ کارنامہ ہے کہ اُس نے اِن قدروں کو با قاعدہ انسٹی ٹیوشن کا درجہ دے دیا۔ اِس قسم کی چیزیں اسلام میں بھی اتنا ہی اہم ہیں جتنا کہ وہ جدید تہذیب میں اہم سمجھی جاتی ہیں۔

البتہ جدید کلچر میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو اسلام کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوسکتیں۔ مثلاً عورتوں کے لیے عریانیت (nudity)، بے پردگی کا فیشن، با قاعدہ نکاح سے قبل لڑکوں اور لڑکیوں کا آزادانہ اختلاط، شراب کا عمومی رواج، انٹرٹین منٹ کا بے قید کلچر، وغیرہ۔ اس قسم کی تمام چیزیں اسلام کے مزاج کے خلاف ہیں۔ اِس لیے وہ کبھی بھی اسلام کے دائرے میں قبول نہیں کی جاسکتیں۔

3- تیسرا پہلو جدید دور کے فلسفیانہ افکار سے تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ زمانے میں فلسفہ اور افکار کے تحت کچھ نئے نظریات وجود میں آئے ہیں جن کو سائنسی افکار کہا جاتا ہے، مگر حقیقت میں اُن کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں۔ زیادہ صحیح الفاظ میں ان کو سائنس کی غلط توجیہہ وتعبیر کہا جاسکتا ہے۔

مثال کے طور پر موجودہ زمانے میں سائنسی غور وفکر کے ذریعے معلوم ہوا کہ کائنات میں اسباب وعِلل کا نظام ہے۔ اِس کو اہلِ سائنس کے درمیان قانونِ تعلیل (principle of causation) کہا جاتا ہے۔ اِس کو لے کر کچھ سیکولر ذہن کے لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ سائنس کی اِس تحقیق نے خدا کے وجود کی نفی کردی ہے۔ انھوں نے کہا کہ واقعات اگر فطری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہوسکتے:

> If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes.

یہ سائنس کے نام پر صرف ایک فلسفیانہ مغالطہ ہے، کیوں کہ نیچر کی دریافت صرف خدا کے طریقِ کار کی دریافت ہے، وہ کسی بھی اعتبار سے خدا کے وجود کی نفی نہیں۔ اِس فکر کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے اپنی کتاب مذہب اور جدید چیلنج (God Arises) میں لکھا ہے کہ — نیچر کائنات کی توجیہہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لیے ایک توجیہہ کی طالب ہے:

Nature does not explain, she herself is in need of an explanation.

یہی معاملہ عضویاتی ارتقا (organic evolution) کا ہے۔ سیکولر مفکرین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عضویاتی ارتقا کا نظریہ ایک سائنٹفک نظریہ ہے۔ چوں کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں خصوصی تخلیق کا تصور ہے، جب کہ عضویاتی ارتقا کا نظریہ مفروضہ ارتقائی پراسس کو خدا کا درجہ دے رہا ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ارتقا کے نظریے نے خدا کے تصور کی نفی کردی ہے۔

مگر یہ سرتاسر بے بنیاد بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عضویاتی ارتقا کا نظریہ صرف ایک مفروضہ ہے، وہ کوئی حقیقی نظریہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ تحقیقات کے دوران یہ معلوم ہوا کہ زندگی کی بے شمار انواع جو زمین میں پائی جاتی ہیں، اُن کے اندر جسمانی مشابہت ہے۔ اِس مشابہت کو لے کر یہ دعویٰ کردیا گیا کہ ایک زندہ نوع سے دوسری نوع نکلی۔ مثلاً بکری ارتقا کرتے کرتے زرافہ بن گئی، یا بلی نے ارتقا کرتے کرتے شیر کی صورت اختیار کرلی، وغیرہ۔

اس نظریے کی بنیادی کمی یہ ہے کہ اُس نے انواع کے درمیان مشابہت کا ثبوت تو پیش کیا، لیکن وہ اِس کا کوئی بھی ثبوت پیش نہ کرسکا کہ ایک نوع کے بطن سے دوسری نوع برآمد ہوگئی۔ یہ نظریہ اتنا ہی بے بنیاد ہے جتنا بے بنیاد یہ کہنا کہ بیل گاڑی کے اندر سے بگھی نکل آئی، بگھی کے اندر سے موٹر کار برآمد ہوگئی، موٹر کار کے اندر سے ہوائی جہاز نکل آیا اور ہوائی جہاز کے اندر سے راکٹ پیدا ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عضویاتی ارتقا کا نظریہ ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔ وہ نہ کوئی سائنٹفک نظریہ ہے اور نہ اُس کی وجہ سے اسلام کے لیے کوئی مسئلہ پیدا ہوا۔

میرے مطالعے کے مطابق، ماڈرن ایج مکمل طور پر ایک موافقِ اسلام ایج ہے۔ اصل یہ ہے کہ

خدا نے انسان کے لیے اِس دنیا میں دو سپورٹ سسٹم بنائے ہیں۔ ایک نیچرل سپورٹ سسٹم جو یکساں طور پر مسلسل صورت میں انسان کا مددگار بنا ہوا ہے۔ دوسرا، سویلائزیشنل سپورٹ سسٹم جو انسان کے ذریعے ارتقائی سفر طے کرتا ہوا انسان کا مددگار بنا ہوا ہے۔ نیچرل سپورٹ سسٹم براہِ راست طور پر خدا کی طرف سے قائم کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں سویلائزیشن سپورٹ سسٹم انسانی عمل اور انسانی تحقیق کے ذریعے اپنا تہذیبی سفر طے کررہا ہے۔ ماڈرن ایج دراصل اِسی سویلائزیشن سپورٹ کا ایک اگلا مرحلہ ہے۔ وہ اِس لیے ظاہر ہوا ہے کہ انسان کے سفرِ حیات کو زیادہ کامیاب بنائے۔ یہ ماڈرن ایج انسان کے مادّی سفر میں بھی مددگار ہے اور انسان کے مذہبی اور روحانی سفر میں بھی۔

اِس دنیا کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ ہر چیز میں مثبت کے ساتھ کچھ منفی پہلو بھی ملا ہوا ہوتا ہے۔ اِس قانونِ عام کے تحت، ماڈرن ایج میں بھی مثبت پہلو کے ساتھ کچھ منفی پہلو شامل ہے۔ بعض اسباب سے یہ حادثہ پیش آیا کہ موجودہ زمانے کے مسلم رہ نماؤں سے ماڈرن ایج کا مثبت پہلو اوجھل ہوگیا۔ انھوں نے بس اُس کے منفی پہلو کو دیکھا اور وہ اُس کو دیکھ کر بھڑک اٹھے۔ اِس معاملے میں شدید طور پر دوبارہ جائزہ (reassessment) کی ضرورت ہے۔ اگر منصفانہ طور پر جائزہ لیا جائے تو یقیناً لوگ یہ معلوم کرلیں گے کہ ماڈرن ایج ایک اسلام دوست ایج (Islam-friendly age) ہے، نہ کہ اسلام دشمن ایج۔

یہ صحیح ہے کہ ماڈرن ایج کو پیدا کرنے میں تمام تر غیر مسلم قوموں نے کام کیا ہے۔ مگر حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنّ اللہ لَیُؤیّد ہٰذا الدین بالرّجل الفاجر (صحیح البخاری، کتاب الجہاد، جلد 6، صفحہ 208)۔ اِس روایت میں اِس بات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ سویلائزیشنل سپورٹ کو ظہور میں لانے میں ہر آدمی کا کچھ نہ کچھ رول ہوگا۔ اِس میں صالح لوگ بھی اپنا رول ادا کریں گے اور اس کے ساتھ غیر صالح لوگ بھی۔ تاریخ اِس کی تصدیق کرتی ہے۔ مثلاً کمیونکیشن ایج جو دعوت الی اللہ کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے، اُس کو ظہور میں لانے کے لیے ہر طرح کے لوگوں نے لمبی مدت تک مسلسل کام کیا ہے۔ اس کے بعد ہی کمیونکیشن ایج واقعہ بن سکا۔

سائنس ایک موافقِ اسلام انقلاب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ساتویں صدی عیسوی کے رُبع اوّل میں ہوئی۔ آپ سے پہلے جو پیغمبر آئے، ان کو معجزے دیے گئے۔ یہ معجزات پیغمبروں کی اعتباریت (credibility) پر یقین کرنے کے لیے تصدیقِ مزید کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن اُن کے معاصرین نے ان معجزات کو جادو کہہ کر اُنھیں نظر انداز کر دیا۔

اِس کا سبب کیا تھا۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ یہ معجزہ مدعو کو ایک شخص کا ذاتی کرشمہ نظر آیا، وہ مدعو کے دائرہ علم کے مطابق، فریقین کے درمیان ایک متفقہ بنیاد کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اِس اعتبار سے گویا کہ پیغمبر اپنے معاصرین کے نزدیک صرف ایک دعویٰ (claim) کرنے والا انسان تھا، اس کے دعوے کو خود اپنی معلوم بنیاد پر جانچنے کی کوئی صورت اِن معاصرین کے پاس موجود نہ تھی۔

خدا یہ چاہتا تھا کہ مدعو کے لیے اِس قسم کا عذر پیش کرنے کا موقع نہ رہے۔ چناں چہ خدا نے چاہا کہ داعی اور مدعو کے درمیان وہ ایک مسلمہ بنیاد کو وجود میں لائے۔ یہی وہ خدائی منصوبہ تھا جس کو پیشین گوئی کے طور پر قرآن کی سورہ حم السجدہ میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے — مستقبل میں ہم اپنی نشانیاں ان کو دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی، یہاں تک کہ اُن پر کامل طور پر کھل جائے کہ یہ (قرآن) حق ہے (41:53)۔

قرآن کی اِس آیت میں جن نشانیوں کے ظہور کی پیشین گوئی کی گئی تھی، وہ انیسویں صدی عیسوی اور بیسویں صدی عیسوی میں پوری طرح وجود میں آچکی ہیں۔ موجودہ زمانے کے سائنسی انقلاب کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے اِن نشانیوں کو پوری طرح ظاہر کر دیا ہے۔ یہ سائنسی شہادتیں دوبارہ دعوت الی اللہ کے حق میں تصدیقِ مزید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ موجودہ سائنسی انقلاب کے بعد تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان مشترک طور پر ایک مسلّمہ بنیاد (bilaterally accepted ground) وجود میں آچکی ہے، جس کو استعمال کر کے حق کی دعوت کو زیادہ موثر طور پر انجام دیا جاسکے۔

اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ تین ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ مصر میں آئے۔ انھوں نے وقت کے بادشاہ فرعون (Pharoah) کو توحید کا پیغام دیا۔ فرعون نے اُس کا مذاق اڑاتے ہوئے اپنے وزیر اعظم ہامان سے کہا کہ میرے لیے ایک اونچا مینار بناؤ، تاکہ میں اُس پر چڑھ کر دیکھوں کہ موسیٰ کا خدا کہاں ہے (40:36-37)۔ اِسی طرح نکیتا خروشچیف (Nikita Khrushchev) سابق سوویت یونین کے وزیر اعظم تھے۔ سوویت یونین نے 1957 میں پہلی بار اپنا مصنوعی سیارہ (Sputnik) زمین سے اوپر بھیجا۔ اس نے خلا میں پہنچ کر چاند کے گرد چکر لگائے اور چاند کے فوٹو لیے، اور پھر واپس زمین پر اتر آیا۔ اِس کے بعد روسی وزیر اعظم نے مذہب کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا ہمارا سیارہ خلا میں گیا، لیکن اس کو وہاں نہ خدا دکھائی دیا اور نہ خدا کی جنت۔

اِس قسم کی بات کو رد کرنے کے لیے پہلے کوئی سائنٹفک بنیاد موجود نہ تھی، مگر اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ اب ایک داعیِ حق کہہ سکتا ہے کہ کائنات کو دیکھنا انسان کے لیے اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ ممکن ہی نہیں۔ جدید محققین کے مطابق، انتہائی وسیع کائنات میں جو مادّہ ہے، اس کا صرف 4 فی صد حصہ ہمارے لیے قابلِ مشاہدہ (observable) ہے۔ بقیہ 96 فی صد حصہ اپنی موجودہ استعداد کے لحاظ سے ہمارے لیے قابلِ مشاہدہ نہیں، حتی کہ انتہائی طاقت ور دور بینوں کے ذریعہ بھی نہیں۔ اِسی لیے اس کو ڈارک میٹر (dark matter) کہا جاتا ہے، یعنی انسان کی نسبت سے ناقابلِ مشاہدہ میٹر۔

خلا کے بارے میں اِس سائنسی دریافت نے موجودہ زمانے کے داعیِ حق کو ایک نئے استدلال کی بنیاد فراہم کی ہے، وہ یہ کہ انسان اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ خدا اور جنت کے بارے میں صرف بالواسطہ علم تک پہنچ سکتا ہے۔ اِس معاملے میں براہِ راست علم کا حصول انسان جیسی مخلوق کے لیے سرے سے ممکن ہی نہیں۔

قرآن کی سورہ حم السجدہ میں جو پیشین گوئی کی گئی تھی، اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اِن سائنسی دریافتوں نے موجودہ زمانے میں معرفتِ خداوندی کے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔ سائنس کیا ہے۔ سائنس نیچر کے مطالعے کا نام ہے، اور نیچر مصنوعاتِ خداوندی کا نام ہے۔ اِس معاملے میں انسان صانع کو براہِ راست

نہیں دیکھتا، البتہ وہ مصنوعات میں غور وفکر کرکے صانع کا اندازہ کرسکتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی اور بیسویں صدی عیسوی میں سائنسی دریافتوں کے ظہور میں آنے سے پہلے، نیچر کے بارے میں انسان کا علم بہت محدود تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ انسان مصنوعاتِ خداوندی کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ ایسی حالت میں وہ صانع کی عظمت کا تصور بھی نہیں کر پاتا تھا۔ اہلِ سائنس نے تاریخ میں پہلی بار مصنوعاتِ خداوندی کا گہرا مطالعہ کیا۔ انھوں نے دوربین اور خوردبین جیسے بہت سے طریقے ایجاد کیے، جن کے ذریعے وہ مصنوعاتِ خداوندی کا مطالعہ زیادہ گہرائی کے ساتھ کرسکیں۔ یہ مطالعہ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissence) کے بعد کئی سو سال تک جاری رہا۔

اِس طرح سائنسی دریافتوں کے بعد پہلی بار ایک نیا امکان پیدا ہوا، یعنی انسان کا فریم ورک جو پہلے روایتی دور میں محدود تھا، وہ لامحدود حد تک وسیع ہوگیا۔ اِس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ انسان، کائنات کا وسیع تر مطالعہ کرکے زیادہ اعلیٰ درجے کی معرفت حاصل کرسکے۔ آدمی ہمیشہ اپنے فریم ورک کے دائرے میں سوچتا ہے (17: 84)۔ چناں چہ سائنسی فریم ورک نے پہلی بار انسان کے لیے اِس بات کو ممکن بنایا کہ وہ خالقِ کائنات کے بارے میں لامحدود حد تک وسیع سائنسی فریم ورک کے تحت سوچے اور معرفتِ اعلیٰ کے درجے تک پہنچ سکے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی لٹریری تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ عظمتِ محمدی پر مسلم اہلِ قلم نے بہت سی کتابیں لکھیں، مگر عظمتِ خداوندی پر غالباً وہ کوئی ایک کتاب بھی نہ لکھ سکے۔ کیوں کہ عظمتِ محمدی کو جاننے کے لیے اُن کے پاس ایک عظیم تاریخ موجود تھی۔ یہ تاریخ اتنی شاندار تھی کہ غیر مسلم مورخین تک کو یہ ماننا پڑا کہ محمد نے جو عظیم تاریخ پیدا کی، ویسی تاریخ کوئی دوسرا انسان پیدا نہ کرسکا۔

مگر عظمتِ خداوندی کا معاملہ ایک مختلف معاملہ تھا۔ خدا کی ہستی ہمارے لیے ایک ناقابلِ مشاہدہ ہستی تھی۔ اِس لیے براہِ راست خدا کو دیکھ کر اس کی عظمت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ خدا کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک ہی قابلِ عمل صورت تھی، وہ یہ کہ خدا کی عظمت کو اس کی تخلیق میں دیکھا جائے، یعنی ناقابلِ مشاہدہ صانع کی عظمت کا اندازہ اس کی قابلِ مشاہدہ مصنوعات کے ذریعہ کیا جائے

لیکن سائنس سے پہلے انسان کو مصنوعاتِ خداوندی کا تفصیلی علم حاصل نہ تھا۔ اِس محدود فریم ورک کی بنا پر اِس دور میں خدا زیادہ تر ایک پُراسرار عقیدہ (mysterious belief) کا مسئلہ بنا رہا، نہ کہ اتھاہ عظمت وجلال کا مسئلہ، جیسا کہ فی الواقع وہ ہے۔

قبل سائنس دور میں مسلم اہل قلم نے جو کتابیں لکھیں، ان میں غالباً ایک ہی قابلِ ذکر کتاب ہے جس کا ٹائٹل بظاہر خدا کو بنایا گیا ہے۔ یہ شاہ ولی اللہ الدہلوی (وفات: 1762) کی کتاب ہے۔ اِس کتاب کا نام حجۃ اللہ البالغۃ ہے۔ اِس کتاب کے ٹائٹل سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ کتاب خدا کی عظمت پر لکھی گئی ہے، لیکن اِس کتاب کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اِس کتاب کا موضوع حجۃ الفقہ ہے، نہ کہ حجۃ اللہ۔ مصنف کے الفاظ میں یہ کتاب اسرارِ شریعت کے موضوع پر ہے، نہ کہ خدا کی عظمت کے موضوع پر۔ خلاصہ یہ کہ جدید سائنسی انقلاب ایک موافقِ اسلام انقلاب ہے۔ جدید سائنسی مطالعے کے ذریعے فطرت کی جو حقیقتیں دریافت ہوئی ہیں، وہ بیک وقت دو پہلوؤں سے اسلام کے لیے ایک عظیم تائید کی حیثیت رکھتی ہیں:

1- فطرت کے بارے میں سائنسی دریافتوں کے ذریعے معرفت کے اعلیٰ دروازے کھلے ہیں۔ انسان کے لیے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ وہ تخلیق میں خالق کی عظیم نشانیوں کو جانے اور خالق کی ناقابلِ بیان عظمت کو محسوس کر سکے۔

2۔ سائنسی دریافتوں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نے دعوتِ حق کے لیے ایک نیا زیادہ موثر امکان پیدا کر دیا ہے، وہ یہ کہ دعوت الی اللہ کے کام کو خود مدعو کے مسلّمات کی بنیاد پر کیا جا سکے۔ یہ ایک ایسا دعوتی امکان ہے جو تاریخ میں پہلی بار ظاہر ہوا ہے۔

اظہارِ دین

اللہ کا ایک خصوصی منصوبہ قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (48:28) یعنی اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تا کہ وہ اُس کو تمام ادیان پر غالب کردے اور اللہ کافی گواہ ہے۔ یہ آیت قرآن کی تین سورتوں میں آئی ہے۔ ایک سورہ میں مزید یہ الفاظ آئے ہیں: وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (9:32)۔

قرآن کی اِس آیت میں 'ہدیٰ' سے مراد آئڈیالوجی (divine ideology) ہے اور 'دین' سے مراد اِس آئڈیالوجی پر مبنی طریقِ زندگی (way of life) ہے۔ اللہ نے ہر دور میں پیغمبروں کے ذریعے ہدایت اور دین بھیجا، لیکن اس کے بعد انسان اُس میں تبدیلی کرتا رہا، یہاں تک کہ دینِ خداوندی کا اصل ورزن (original version) باقی نہیں رہا، بلکہ دینِ خداوندی کے نام پر ایک خودساختہ انسانی ورزن وجود میں آ گیا۔ اس کے بعد اللہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ابدی طور پر دینِ خداندی کا صحیح ورزن وجود میں آئے اور اس کو تاریخ میں پوری طرح محفوظ کردیا جائے۔

تمام ادیان پر اظہارِ دین کا مطلب کسی قسم کا سیاسی غلبہ نہیں ہے، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ دینِ خداوندی کی تصویر بے آمیز صورت میں انسان کے سامنے آجائے۔ اِسی طرح اتمامِ نور کا مطلب بھی کسی سیاسی نظام کا نفاذ نہیں، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدائی دین کی تصویر کو بگاڑنا چاہتا ہے، مگر اللہ کا یہ حتمی فیصلہ ہے کہ وہ خدائی دین کو اس کی اصل صورت میں محفوظ کردے۔ اللہ نے انسان کو مکمل آزادی عطا کی ہے۔ اللہ نے اپنی سنت کے مطابق، انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے حفاظتِ دین کے اِس منصوبے کو انجام دیا۔

فکری بنیاد کی اہمیت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں ہوا۔ آپ کو یہ موقع

ملا کہ آپ صحابہ کی صورت میں ایک طاقت ور ٹیم بنائیں۔ اِس طرح آپ نے اور آپ کے اصحاب نے غیر معمولی محنت کے ذریعے وہ کام انجام دیا جس کو قرآن کی مذکورہ آیت میں اظہارِ دین کہا گیا ہے، یعنی خدا کے دین کو اس کی اصل صورت میں مبرہن کر دینا۔ مگر یہ کوئی سادہ معاملہ نہ تھا۔ لوگوں کے درمیان اِس کی قبولیت کے لیے ضروری تھا کہ اس کے لیے موافق فکری بنیاد (intellectual base) موجود ہو۔ ہزاروں سال کے مذہبی بگاڑ کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان یہ موافق فکری بنیاد موجود نہ تھی، اِس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے اپنے زمانے میں کامیابی کے ساتھ دینِ خداوندی کو اس کی اصل صورت میں قائم کیا، مگر ایک محدود مدت کے بعد خود امتِ مسلمہ کے درمیان مذہب کا قدیم تصور واپس آ گیا۔ یہ محدود مدت امت کی ابتدائی تین نسلوں تک باقی رہی۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کو ایک حدیث رسول میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إن الناس دخلوا في دين الله أفواجاً وسيخرجون منه أفواجاً (مسند أحمد: 243/3) یعنی لوگ فوج در فوج خدا کے دین میں داخل ہوئے اور عن قریب وہ فوج در فوج خدا کے دین سے نکل جائیں گے۔ اِس حدیث رسول میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے، وہ محدود طور پر صرف مکہ یا عرب کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ وہ پوری تاریخ کے بارے میں ہے۔ اصل یہ ہے کہ اسلام نے دینِ خداوندی کی جو تصویر پیش کی تھی، وہ ایک انقلابی تصویر تھی۔ اُس زمانے میں مذہب کے بارے میں جو عمومی شاکلہ پایا جاتا تھا، وہ اس کے مطابق نہ تھا۔ اس لیے ابتدائی تین نسلوں کے بعد قدیم مذہبی شاکلہ عملاً دوبارہ لوگوں کے درمیان واپس آ گیا۔ دوبارہ ایسا ہوا کہ خدا کا دین اپنی اصل صورت کے بجائے ایک بدلی ہوئی صورت پر قائم ہو گیا۔ اسلام کا نام اور اسلام کی اصطلاحیں ضرور باقی رہیں، لیکن اسلام کی حقیقت تقریباً غیر موجود ہو گئی۔ یہی مطلب ہے اُس حدیث رسول کا جس میں بتایا گیا ہے کہ بعد کے زمانے میں اسلام کا صرف نام باقی رہے گا اور قرآن کا صرف رسم الخط (لا يبقى من الإسلام إلا اسمه، ولا يبقى من القرآن إلا رسمه)۔

چند مثالیں

اسلام سے پہلے خدا کا عقیدہ ایک رسمی قسم کا مبنی بر قلب (heart-based) عقیدہ تھا،

اسلام نے خدا کے عقیدہ کو ایک زندہ شعور کے طور پر مبنی بر ذہن (mind-based) عقیدے کی حیثیت سے زندہ کیا، لیکن وقت کا عمومی شاکلہ اِس کے موافق نہ تھا، اِس لیے بہت جلد ایسا ہوا کہ مسلمانوں کے درمیان خدا کا عقیدہ زندہ عقلی شعور کے طور پر باقی نہ رہا۔ وہ دوبارہ مبنی بر قلب قسم کا رسمی عقیدہ بن کر رہ گیا۔

اسلام سے پہلے ہر مذہب میں عبادت کا تصور موجود تھا، لیکن ان کی عبادت محض ایک مبنی بر فارم عمل بنی ہوئی تھی۔ اسلام نے دوبارہ عبادت کو مبنی بر اسپرٹ (spirit-based) عبادت کی حیثیت سے زندہ کیا، لیکن چند نسلوں کے بعد دوبارہ قدیم مزاج واپس آ گیا اور خدا کی عبادت محض کچھ رسمی اعمال کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔ یہی معاملہ پیغمبر کے عقیدہ (رسالت) کا بھی تھا۔ پچھلی امتوں نے بعد کے زمانے میں اپنے پیغمبروں کو اتنا زیادہ بڑھایا کہ خدا اور پیغمبر میں صرف نام کا فرق باقی رہا۔ یہی وہ برائی ہے جس کو پیغمبر اسلام نے پیشگی طور پر اِن الفاظ میں بیان فرمایا تھا: لا تطروني كما أطرت النصارى عيسى بن مريم (صحيح البخاري، رقم الحديث: 3445)

بعد کے زمانے میں مسلمانوں کے درمیان فضیلت کے نام پر ایسے عقیدے رائج ہوئے جس کے بعد عملاً پیغمبر اسلام کی تصویر بھی وہی بن گئی جو پچھلی امتوں کے یہاں رائج تھی، یعنی خدا اور پیغمبر کے درمیان صرف نام کا فرق باقی رہا۔

اِسی طرح پچھلے مذاہب میں مقدس جنگ (holy war) کا تصور تھا۔ اسلام نے اِس تصور کو ختم کیا۔ اسلام میں قتال اور جہاد کو ایک دوسرے الگ کر دیا گیا۔ قتال صرف دفاعی جنگ کے لیے مخصوص ہو گیا اور جہاد کو پر امن دعوتی جدوجہد (25:52) کے ہم معنی قرار دیا گیا۔ لیکن بعد کے زمانے میں مسلمانوں کے درمیان قتال کو جہاد کا عنوان دے دیا گیا۔ اِس طرح مقدس جنگ کا تصور مسلمانوں کے درمیان دوبارہ لوٹ آیا۔

اِسی طرح اسلام میں اجتماعی نظام کو شوری (42:38) کے تابع کیا گیا تھا، یعنی کسی خارجی معیار کے بجائے لوگوں کی عمومی رائے کی بنیاد پر اجتماعی نظام کا فیصلہ کرنا۔ لیکن بعد کے زمانے میں

قدیم خاندانی حکمرانی (dynasty) کا طریقہ واپس آ گیا۔ شخصی حکمرانی کا یہ ذہن بعد کے زمانے کے مسلمانوں پر اتنا زیادہ غالب ہوا کہ اگر کسی مسلم ملک میں بظاہر جمہوریت کو اختیار کیا گیا تو وہ بھی عملاً آمریت (dictatorship) بن کر رہ گئی۔

اِسی طرح اسلام میں قدیم تصور کے برعکس، مذہبی آزادی کو اختیار کیا گیا، لیکن چند نسلوں کے بعد عملاً اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اِس کے مظاہر آج بھی مسلمانوں کے اندر مختلف صورتوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً فرقہ وارانہ تشدد، تکفیر کے فتوے، مرتد اور شاتمِ رسول کے لیے سزائے قتل، وغیرہ۔ اِس قسم کے تمام مظاہر بلاشبہہ قدیم زمانے کے مذہبی جبر کی نئی صورتیں ہیں۔

متوازی عمل

امتِ مسلمہ کے بعد کے دور میں یہ تمام خرابیاں اِس لیے پیدا ہوئیں کہ اسلام کی انقلابی اصلاحات کے حق میں فکری بنیاد موجود نہ تھی۔ اسلام نے مذہب کو دوبارہ اس کی اصل خدائی صورت میں زندہ کیا، لیکن زمانی عامل (age factor) اِن اصلاحات کے موافق نہ تھا۔ قانونِ فطرت کے مطابق، فکری بنیاد اچانک وجود میں نہیں آتی، بلکہ وہ لمبے تدریجی عمل کے بعد وجود میں آتی ہے۔ یہ نہایت مشکل منصوبہ ہے، کیوں کہ انسانی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے اس کو وجود میں لانا پڑتا ہے۔ اِس لیے اللہ نے اِس منصوبے کو ظہور میں لانے کے لیے تاریخ میں ایک متوازی عمل (parallel process) جاری کیا۔ فکری بنیاد کو ظہور میں لانے کا یہ متوازی عمل تقریباً ہزار سال تک جاری رہا، یہاں تک کہ وہ بیسویں صدی عیسوی میں اپنی تکمیل تک پہنچا۔ اِس عمل کا آغاز پیغمبر اور اُن کے اَتباع (followers) نے کیا اور آخر کار اس کی تکمیل ہزار سال بعد اہلِ مغرب کے ذریعے انجام پائی۔

استبدالِ قوم

قرآن میں فطرت کے جو قوانین بتائے گئے ہیں، اُن میں سے ایک قانون وہ ہے جس کو استبدال (replacement) کہا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی آیت کے الفاظ یہ ہیں: وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (47:38) یعنی اگر تم پھر جاؤ تو اللہ

تمھاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے:

If you turn back, He will bring in your place another people, who will not be like you.

استبدالِ قوم کا یہ قانون فطرت کا ایک عمومی قانون ہے۔ اس کا تعلق مذہبی قوم سے بھی ہے اور غیر مذہبی قوم سے بھی۔ اسلام کی انقلابی اصلاحات کے لیے جس فکری بنیاد کی ضرورت تھی، اس کو مسلمان پورے طور پر وجود میں نہ لا سکے۔ مسلمان بعد کے زمانے میں قدیم مذہبی تصورات کے زیر اثر آ چکے تھے۔ اِس بنا پر وہ اس مقصد کے لیے اہل نہ تھے۔ چناں چہ اللہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ اِس متوازی رول کا ذریعہ وہ ایک ایسی قوم کو بنائے جو اِس عمل کو اس کی تکمیل تک پہنچا سکے۔

اہلِ مغرب کا تائیدی رول

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی کے طور پر یہ بات بتا دی تھی کہ اللہ تعالی ایک سیکولر قوم سے دین کی تائید کا کام لے گا (إن اللہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر)۔ اہل مغرب کی تاریخ کا غیر جانب دارانہ مطالعہ بتاتا ہے کہ اہلِ مغرب نے جو تہذیب برپا کی اور جس کو مغربی تہذیب کہا جاتا ہے، وہ سیکولر مغرب کے ذریعے اِسی تائید دین کی مثال ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کے ذریعے جو نئے علوم اور نئے حالات پیدا ہوئے، وہ اپنے عملی نتیجے کے اعتبار سے، اسلام کے حق میں فکری بنیاد فراہم کرنے والے تھے، تاکہ رسول اور اصحابِ رسول کا جاری کردہ عمل اپنے تکمیلی مرحلے تک پہنچ سکے۔ اس تکمیلی عمل کے چند پہلو یہاں بیان کیے جاتے ہیں:

1۔ جدید تہذیب کے تحت جو میڈیکل سائنس وجود میں آئی، اس نے تاریخ میں پہلی بار اُس نظریے کو ختم کر دیا جس کو سوچنے والا دل (thinking heart) کہا جاتا تھا۔ اب یہ پوری طرح ثابت ہو گیا ہے کہ دل انسانی جسم میں صرف گردشِ خون (circulation of blood) کا ذریعہ ہے۔ اِس معاملے میں جدید میڈیکل سائنس یہاں تک پہنچی ہے کہ اُس نے مصنوعی دل (artificial heart)

تیار کیا۔ ایسے مریض جن کے دل عملاً نان فنکشنل (non-functional) ہونے والے تھے، اُن کے جسم میں ڈاکٹروں نے مصنوعی دل نصب کردیا۔ یہ مصنوعی دل عملاً فطری دل کا بدل بن گیا۔ ایسے مریضوں کا دل عملاً معطل تھا، اُن کے جسم میں دل کی جگہ ایک مادی ڈیوائس (material device) نصب کیا گیا، اس کے باوجود اُن کا دماغ پہلے کی طرح کام کررہا تھا۔ اُن کا حافظہ، اُن کے سوچنے کی صلاحیت، کسی کمی کے بغیر، پہلے کی طرح برقرار تھی۔ اِس طرح تجرباتی طور پر ثابت ہوگیا کہ تفکیر کے عمل (thinking process) کا تعلق انسان کے دل سے نہیں ہے، بلکہ اس کے دماغ سے ہے۔

یہ ایک بہت بڑا واقعہ ہے جس سے قدیم زمانے کا انسان مکمل طور پر بے خبر تھا۔ اسلام میں معرفت کو قدیم تصور کے برعکس، دل کے بجائے دماغ پر مبنی قرار دیا گیا۔ قرآن میں دماغ (mind) کے لیے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً قلب، فواد، عقل، لُب، حجر، نُہی۔ واضح ہو کہ قلب کا لفظ عربی زبان میں عقل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے (لسان العرب: 687/1)۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں اِس سلسلے میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ سب تفکیری عضو (thinking organ) کے معنی میں ہیں، قرآن میں گردشِ خون کے ذریعے کے طور پر کسی عضو کا ذکر نہیں۔ پچھلے ہزار سال کے دوران مسلمانوں میں فکری ارتقا نہ ہوسکا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ مسلمان فکری عمل کا سرچشمہ غلط طور پر دل کو قرار دیے ہوئے تھے۔ جدید دریافت نے یہ راستہ کھول دیا ہے کہ مسلمانوں میں فکری ارتقا کا عمل حقیقی سطح پر جاری ہوسکے۔

قدیم زمانے میں تمام مذاہب میں معرفت حق (realization of truth) کا منبع (source) دل کو سمجھا جاتا تھا۔ اِس لیے قدیم زمانے میں مراقبہ (meditation) کے طریقے رائج ہوئے، مگر اِن طریقوں کے ذریعے قدیم زمانے کے لوگوں کو کبھی حقیقی معنوں میں معرفتِ حق کا تجربہ نہیں ہوا، کیوں کہ دل صرف گردشِ خون کا ذریعہ تھا۔ معرفت صرف تفکیر اور تدبر کے ذریعے حاصل ہوسکتی ہے، جس کا مرکز انسان کا دماغ ہے۔ دل سے اِس کا کوئی تعلق نہیں۔

رسول اور اصحابِ رسول کے مختصر زمانے کے بعد خود امتِ مسلمہ میں یہی دل پر مبنی تصورِ معرفت دوبارہ لوٹ آیا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے ہزار سال کے دوران امتِ مسلمہ حقیقی معرفت سے تقریباً محروم رہی۔

موجودہ زمانے میں جدید میڈیکل سائنس کے ذریعے جو نیا دور آیا، اُس نے پہلی بار یہ کیا کہ دل پر مبنی معرفت کے افسانہ (myth) کو ختم کر دیا۔ اب تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوگیا کہ مبنی بر ذہن (mind-based) معرفت کو ڈیولپ کیا جائے اور معرفت الٰہی کے اعلیٰ درجات تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اِس اعتبار سے، جدید میڈیکل سائنس قدیم نظریے کی تصحیح کی حیثیت رکھتی ہے۔

2۔ قدیم زمانے میں ساری دنیا میں مطلق العنان بادشاہت (despotism) کا طریقہ رائج تھا۔ اِس سیاسی کلچر کے تحت ساری دنیا میں مذہبی جبر کا کلچر عام تھا۔ جدید مغربی تہذیب کے تحت پہلی بار ایسا ہوا کہ دنیا میں جمہوریت کا زمانہ آیا۔ جمہوریت ایک اعتبار سے، سیاسی طاقت کی عدم مرکزیت (decentralization) کا کلچر ہے۔ اِس کلچر کے تحت مذہب کے معاملے کو سیاسی اقتدار سے الگ کر دیا گیا۔ اِس طرح تاریخ میں پہلی بار مذہبی آزادی کو ایک مسلّمہ بین اقوامی اصول (international norm) کے طور پر مان لیا گیا اور اقوامِ متحدہ (UNO) کے تحت تمام قوموں نے اس کی متفقہ تصدیق کر دی۔ اسلام ایک دعوتی مشن ہے اور اسلام کے دعوتی مشن کی عالمی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ دنیا میں مذہبی آزادی کو ایک مسلّمہ بین اقوامی اصول کے طور پر مان لیا گیا ہو۔ یہ واقعہ پہلی بار مغربی تہذیب کے دور میں کامل طور پر انجام پایا ہے۔

3۔ قدیم زمانے میں مذہب کی بنیاد صرف عقیدہ (belief) ہوا کرتا تھا۔ انسان ایک عقلی وجود (rational being) ہے۔ ضرورت تھی کہ انسان کو ایسا مذہب دیا جائے جو اس کے عقلی ذہن کو ایڈریس کرنے والا ہو۔ لیکن اِس مقصد کے لیے عقلی ڈیٹا (rational data) درکار تھا جو کہ قدیم زمانے میں دستیاب نہ تھا۔ مغربی تہذیب کے تحت پیدا ہونے والی سائنس نے فطرت (nature) میں تحقیق کے ذریعے یہ عقلی ڈیٹا فراہم کیا۔ اِس طرح تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ دینِ خداوندی کے عقائد کو عقلی بنیاد (rational ground) پر قابلِ فہم (understandable) بنایا جا سکے۔ اِس حقیقت کا اعلان قرآن مجید میں پیشگی طور پر اِن الفاظ میں کیا گیا تھا: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔

قرآن کی اِس آیت میں ’آفاق اور انفس‘ سے مراد تمام وہ مادی اور غیر مادی تخلیقات ہیں جو وسیع کائنات میں پائی جاتی ہیں۔ اِس پورے مجموعے کو فطرت (nature) کہا جاتا ہے۔ فطرت کی اِس دنیا میں بے شمار ربانی نشانیاں (signs of God) موجود تھیں۔ ضرورت تھی کہ اِن نشانیوں کو دریافت کیا جائے، تاکہ امرِ حق خود انسانی مسلّمات کی بنیاد پر مدلل ہو سکے۔ خدائی نشانیوں کی انفولڈنگ کا یہ کام ہزاروں سال سے نہیں ہوا تھا۔ موجودہ زمانے میں مغربی تہذیب نے پہلی بار سائنسی تحقیقات کے ذریعے اِن نشانیوں کو کھولا اور اُن کو انسان کے لیے ایک معلوم واقعہ بنایا۔ یہ موافق دلائل فطرت (nature) میں آیاتِ الٰہی کے طور پر موجود تھے، وہ مخفی حالت میں تھے۔ مغربی سائنس نے قوانینِ فطرت کے نام سے جن حقائق کو دریافت کیا ہے، وہ دراصل یہی دلائل ہیں۔ اِس کے بعد یہ ممکن ہو گیا کہ اسلام کے علمِ کلام (theology) کو قیاسات کے بجائے برہانیات کی بنیاد پر قائم کی جائے۔

4۔ قرآن ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں اترا۔ اُس وقت قرآن میں یہ کہا گیا تھا کہ: تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (25:1)۔ اِس آیت کے مطابق، یہ مطلوب تھا کہ قرآن کی تعلیمات کو زمین پر بسنے والے تمام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ مگر قدیم زمانے میں عملاً ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ اِس عالمی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پوری دنیا کا جغرافیہ معلوم ہو۔ پرنٹنگ پریس اور کمیونکیشن کا دور دنیا میں آجائے، ساری دنیا میں بہ آسانی سفر کرنا ممکن ہو جائے، لوگوں کے درمیان کھلا پن (openness) کی فضا موجود ہو، ترقی یافتہ زبانیں دنیا میں پائی جاتی ہوں، وغیرہ۔

عالمی دعوت کو ممکن بنانے کے لیے یہ تمام چیزیں لازمی طور پر ضروری ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ اسباب موجود نہ تھے، اِس لیے قدیم زمانے میں اسلام کی عالمی اشاعت کا یہ نشانہ عملاً پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ انیسویں صدی کے بعد کے زمانے میں پہلی بار یہ اسباب حاصل ہوئے ہیں اور اِن اسباب کا حصول براہِ راست مغربی تہذیب کے ذریعے ممکن ہوا ہے۔

5۔ قرآن اصلاً ایک کتابِ دعوت ہے، لیکن دعوت کی نکات کو مدلل کرنے کے لیے قرآن میں

بہت سے حوالے دیئے گئے ہیں جن کا تعلق تاریخ یا عالمِ فطرت سے ہے۔ مگر ساتویں صدی کے ربع اول میں اِن حوالوں کی ضروری تفصیلات معلوم نہ تھیں۔ اِس بنا پر قرآن کے یہ حوالے عملاً صرف عقیدہ کا مسئلہ (matter of belief) بنے ہوئے تھے۔ اِس قسم کی مثالیں قرآن میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مثلاً قرآن میں کائنات کے آغاز کے لیے ایک حوالہ یہ ہے: أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا (21:30)۔ اِسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان جب بطنِ مادر میں ہوتا ہے تو وہ تین پردوں (في ظلمات ثلاث) کے درمیان ہوتا ہے (39:6)۔ اِسی طرح قرآن میں فرعون کے جسم کے بارے میں یہ آیت آئی ہے: فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً (10:92)۔ قرآن میں کثرت سے اِس طرح کے حوالے پائے جاتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ اُن کے متعلق تاریخی اور سائنسی معلومات دریافت کی جائیں، تاکہ قرآن کے یہ بیانات انسان کے لیے پوری طرح قابلِ فہم ہوجائیں۔ یہ کام بھی پہلی بار مغربی علوم کے ذریعے انجام پایا ہے۔

6۔ قدیم زمانے میں مذہبی جبر عام تھا۔ اِس بنا پر دعوتِ حق کا کام معتدل انداز میں نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ صورتِ حال ایک سیاسی سبب کی بنا پر تھی۔ قدیم زمانے کے حکمراں اپنا حقِ حکمرانی (mandate) مذہب کی بنیاد پر حاصل کرتے تھے، اِس لیے وہ اِس کو برداشت نہیں کرتے تھے کہ اُن کے علاقے میں سلطنت کے مذہب کے سوا کوئی اور مذہب پایا جائے۔ مذکورہ آیت میں اظہارِ دین کا ایک پہلو یہ تھا کہ حقِ حکمرانی کے معاملے کو مذہب سے جدا کردیا جائے۔ دورِ اول میں جو اسلامی انقلاب آیا، اُس نے تاریخ میں ایک نیا عمل (process) جاری کیا۔ یورپ کی جمہوریت اِسی عمل کی تکمیل ہے۔ مغربی جمہوریت نے یہ کیا کہ حقِ حکمرانی کے معاملے کو مذہب سے الگ کرکے اس کو عوامی رائے سے وابستہ کردیا۔ اِس کے نتیجے کے طور پر دنیا میں پہلی بار مذہبی امن کا دور آگیا۔ اِس دور کی باقاعدہ تکمیل اقوامِ متحدہ کی صورت میں ہوئی۔ جس کے تحت مذہب کے معاملے میں تشدد کو بطور اصول ممنوع قرار دے دیا گیا۔ یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے گویا دورِ جدید میں حکمتِ حدیبیہ کی عالمی توسیع ہے جو اسلامی دعوت کے حق میں ایک عظیم نعمت کی حیثیت رکھتی ہے۔

7۔ مغربی دنیا کے سیکولر اہلِ علم نے اسلام کا مطالعہ اپنے اصول کے مطابق، خالص موضوعی انداز میں کیا۔ اِس بنا پر وہ اسلام کے کئی ایسے پہلو کو دریافت کر سکے جو مسلم اہلِ علم سے اعتقادی مطالعے کی بنا پر مخفی تھے۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مشن کے سلسلے میں غیر معمولی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اِس مقابلے میں پیغمبر اسلام کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اِس کامیابی کو مسلم اہلِ علم عام طور پر ''فضیلت رسول'' کے خانے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اِس کامیابی کو فضیلتِ رسول کے خانے میں ڈالنے کا نقصان یہ ہے کہ عام مسلمانوں کو اس سے کوئی سبق نہیں ملا۔ اِس طریقِ مطالعہ سے عام مسلمانوں کو صرف فخر کی غذا ملی۔ وہ اپنے پیغمبر کو ''فخرِ موجودات'' کہنے لگے۔

لیکن مغرب کے سیکولر اہلِ علم نے اِن واقعات کا تجزیہ غیر جانب دارانہ ذہن کے ساتھ کیا تو انھوں نے ایک ایسی حقیقت دریافت کی جس میں تمام مسلمانوں، بلکہ تمام انسانوں کے لیے کامیابی کا اعلیٰ اصول موجود تھا۔ مثلاً ایک برٹش رائٹر (E.E. Kellet) نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرے کے تحت لکھا ہے کہ — انھوں نے مشکلات کا مقابلہ اِس عزم کے ساتھ کیا کہ وہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں:

> He faced adversity with the determination to wring success out of failure.

یہ صرف ایک تاریخی تجزیہ نہیں، اِس سے زندگی کا ایک اہم اصول دریافت ہوتا ہے، وہ یہ کہ انسان کو اُن کے خالق نے ایک انوکھی صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور وہ ہے اپنے مائنس کو اپنے پلس میں تبدیل کر لینا۔

انسانی شخصیت کا یہ امکان (potential) فطرت کا ایک عظیم عطیہ ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل کے ذریعے اِس انسانی فطرت کا ایک کامیاب مظاہرہ کیا، مگر مسلمان اپنے عقیدت مندانہ مطالعے کی بنا پر اِس پہلو کو بطور سنتِ رسول اپنی زندگیوں میں شامل نہ کر سکے۔ مغربی سیرت نگاروں نے سیرت نبوی کے اِس پہلو کو دریافت کر کے مسلمانوں کو یہ موقع دیا کہ وہ اس کو اختیار کریں

اور اس کے ذریعے اپنے منصوبوں کو حقائق کی بنیاد پر قائم کرکے اس کو کامیاب بنائیں۔

شہادتِ اعظم

مغربی تہذیب کا دینِ خداوندی کے حق میں سب سے بڑا تائیدی رول یہ ہے کہ اس نے اہلِ اسلام کے لیے وہ ضروری اسباب فراہم کیے جن کو استعمال کرکے وہ دورِ آخر کے اُس اہم ترین رول کو کامیابی کے ساتھ ادا کرسکیں، جس کو حدیث میں شہادتِ اعظم کہا گیا ہے۔ شہادتِ اعظم سے مراد دعوتِ اعظم ہے۔ اِس دعوتِ اعظم کے دو پہلو ہیں — نظری اعتبار سے، اس کا اعلیٰ حجت (superior reason) پر قائم ہونا، اور وسعت کے اعتبار سے، اس کے دائرے کا عالمی (global) ہونا۔

صحیح مسلم میں ایک لمبی روایت آئی ہے۔ اِس روایت میں دورِ آخر کے ایک اہم رول کا ذکر بطور پیشین گوئی کیا گیا ہے۔ اِس کی بابت حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: هذا أعظم الناس شهادة عند رب العالمين (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 5230) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اللہ رب العالمین کے نزدیک سب سے بڑی شہادت ہوگی۔

اِس حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں 'شہادت' سے مراد جسمانی قتل نہیں ہے، بلکہ اُس سے مراد نظریاتی معنوں میں ایک عظیم دعوتی رول ہے جو دورِ آخر میں انجام پائے گا۔ غالباً اِس سے مراد انسانی تاریخ کے آخری زمانے کا ایک فائنل دعوتی رول ہے۔ اِس دعوتی رول کی صراحت اگرچہ حدیث میں موجود نہیں ہے، لیکن قرآن وحدیث میں ایسے اشارات موجود ہیں جن پر غور کرکے اس رول کو متعین کیا جاسکتا ہے۔

1۔ شہادتِ اعظم کے نظری پہلو کو سمجھنے کے لیے قرآن کی اِس آیت سے رہنمائی ملتی ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ قرآن کی اِس آیت میں 'آیات' سے مراد تخلیق میں چھپی ہوئی نشانیاں ہیں۔ ان نشانیوں کو موجودہ زمانے میں مغربی سائنس دانوں نے غیر معمولی تحقیق کے ذریعے دریافت کیا۔ اِس طرح دینِ خداوندی کی تاریخ میں ایک نیا دور آگیا۔ قبل از سائنس دور (pre-scientific ear) میں جو ایمان پیغمبروں کے

بتائے ہوئے عقیدہ (belief) کی حیثیت رکھتا تھا، وہ بعداز سائنس دور (post-scientific ear) میں خود انسان کے اپنے دریافت کردہ علوم کے تحت ایک ثابت شدہ حقیقت بن گیا۔

اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ قدیم زمانے میں کائنات ایک پراسرار ظاہرہ بنی ہوئی تھی۔قدیم زمانے میں نہ عالمِ اکبر (macro world) کو دیکھنے کے لیے دوربین موجود تھی اور نہ عالمِ اصغر (micro world) کو دیکھنے کے لیے خوردبین دستیاب تھی۔موجودہ زمانے میں اعلیٰ سائنسی نوعیت کے مشاہدے اور تجربے کے ذریعے یہ معلوم ہوا کہ کائنات میں نہایت اعلیٰ درجے کی ذہین ڈیزائن موجود ہے۔یہ دریافت اِس مذہبی تصور کو یقینی بنا دیتی ہے کہ یہ کائنات ایک باشعور خالق کی ایک باشعور تخلیق ہے۔ (ملاحظہ ہو: *The Intelligent Universe* by Fred Hyle)

2۔ شہادت کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق عالمی دعوت (global dawah) سے ہے۔ اسلام اول دن سے سارے انسانوں کے لیے ایک دینِ رحمت کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن اسلام کے پیغام کو سارے انسانوں تک پہنچانا قدیم زمانے میں ذرائع کے اعتبار سے عملاً ممکن نہ تھا۔موجودہ زمانے میں مغربی سائنس نے پہلی بار اُن تمام ذرائع کو انسان کی دسترس میں دے دیا جن کو استعمال کرکے اسلام کی عالمی دعوت کو ایک واقعہ بنایا جاسکتا ہے۔

اِس کی ایک مثال موجودہ زمانے میں اُس ذریعے کی ایجاد ہے جس کو الیکٹرانک کمیونکیشن کہا جاتا ہے۔یہ دریافت اب نہایت ترقی یافتہ سائنس بن چکی ہے۔اِس دریافت کا ایک جز موبائل فون ہے۔ اِس دریافت کے تحت موجودہ زمانے میں وہ آلہ تیار ہوگیا ہے جس کو سمارٹ فون (smart phone) کہا جاتا ہے۔یہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ ہر آدمی اس کو اپنی جیب میں رکھ سکتا ہے۔اسمارٹ فون میں بظاہر لامحدود گنجائش (capacity) ہوتی ہے۔

موجودہ زمانے میں تمام بڑے بڑے ادارے اپنے کتابوں کو اپ لوڈ کرکے انٹرنیٹ اور اسمارٹ فون پر ڈال رہے ہیں۔اِس دریافت نے ایک نئے دعوتی امکان کو واقعہ بنا دیا ہے۔اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ قرآن کے ترجمے مختلف زبانوں میں تیار کیے جائے۔یہ ترجمے ایسی زبان میں ہوں جو

قاری کے لیے بہ آسانی قابلِ فہم ہوں۔ پھر قرآن کے اِن ترجموں کو انٹرنیٹ پر ڈال دیا جائے اِس کے بعد زمین پر بسنے والے ہر انسان کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ اپنی جیب سے اسمارٹ فون نکالے اور اس کے ایک سوئچ کو ٹچ کرے اور پورے قرآن کا ترجمہ اس کی اپنی قابلِ فہم زبان میں اس کے سامنے آجائے۔ دعوت کا یہ عالمی ذریعہ آج مغربی سائنس کی بنا پر عملاً ایک واقعہ بن چکا ہے۔

غالباً دورِ آخر کا یہی وہ دعوتی امکان ہے جس کا ذکر بطور پیشین گوئی ایک حدیثِ رسول (لا یبقی علی ظهر الأرض بیت مدر ولا وبر إلا أدخله الله كلمة الإسلام بعز عزيز وذل ذليل) میں کیا گیا ہے۔ اِس حدیث میں 'کلمۂ اسلام' سے مراد قرآن ہے۔ یہ ایک قابلِ غور بات ہے کہ حدیث میں 'إدخال الكلمة في كل القلوب' کا لفظ نہیں آیا ہے، بلکہ حدیث میں 'إدخال الكلمة في كل البيوت' کا لفظ آیا ہے۔ اِس کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا کہ کرۂ ارض پر بسنے والے تمام لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں، بلکہ جو واقعہ ہوگا، وہ یہ کہ ہر چھوٹے بڑے گھر میں جہاں کوئی انسان رہتا ہے، وہاں قرآن داخل ہو جائے گا، خواہ انسان چاہے یا نہ چاہے۔ مذکورہ حدیث کے آخر میں 'عزت' اور 'ذلت' کے الفاظ اپنے لفظی معنی میں نہیں ہیں، بلکہ وہ اِسی معنی میں ہیں کہ آدمی چاہے یا نہ چاہے، ہر حال میں ایسا ہوگا کہ خدا کا کلام اس کے گھر میں داخل ہو جائے گا— انٹرنیٹ اور اسمارٹ فون کی ایجاد کے بعد یہی واقعہ اپنی کامل صورت میں عملاً ظہور میں آگیا ہے۔

حضرت ابراہیم کی امامت

حضرت ابراہیم تقریباً چار ہزار سال پہلے عراق میں پیدا ہوئے۔ وہ تینوں سامی مذاہب — یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے مشترک پیشوا مانے جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کے بارے میں قرآن میں عالمی امامت کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے: **وَإِذِ ابْتَلَىٰٓ إِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا** (2:124) یعنی جب ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو ابراہیم نے اُن کو پورا کر دکھایا۔ اللہ نے کہا میں تم کو تمام انسانوں کا امام بناؤں گا۔

حضرت ابرہیم کا ذکر بائبل (عہد نامہ قدیم) میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ حضرت ابراہیم کی امامت کے بارے میں قرآن کی مذکورہ آیت میں جو بات کہی گئی ہے، وہ بائبل میں بھی ان الفاظ میں آئی ہے — اور زمین کی سب قومیں اس کے وسیلے سے برکت پائیں گی:

All the nations of the earth shall be blessed in him. (Genesis 18:18)

قرآن اور بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو عالمی امامت کا درجہ دیا۔ یہ عالمی امامت کیا تھی، اس کے بارے میں یہودی علما، مسیحی علما اور مسلم علما تقریباً سب کے سب بے خبری میں مبتلا ہیں۔ وہ اِس کو صرف ایک پراسرار (mysterious) مفہوم میں لیے ہوئے ہیں، حالاں کہ یہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔ اس کی عظمت صرف اُس وقت واضح ہوتی ہے جب کہ اس کو تاریخ کی زبان میں بیان کیا جائے۔

منصوبہ تخلیق

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے بعد انسانی نسلوں کی ہدایت کے لیے اولاً پیغمبر بھیجنا شروع کیا۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت ابراہیم تک بڑی تعداد میں پیغمبر آئے، لیکن دنیا میں مطلوب حالت قائم نہ ہوسکی۔ وہ مطلوب حالت یہ تھی کہ ایک طرف، دینِ خداوندی کا مستند متن

محفوظ ہو جائے۔ اور دوسری طرف انسان کو دینِ خداوندی کے معاملے میں کامل آزادی حاصل ہو۔ دین کے معاملے میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ مگر مختلف اسباب کے تحت ایسا ہوا کہ انسانی زندگی میں ایک برعکس حالت قائم ہوگئی۔ اِس کو ایک لفظ میں، استبدادیت (despotism) کہا جا سکتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں دنیا میں ہر جگہ انسانی زندگی میں استبدادی ماڈل (despotic model) رائج ہو گیا۔ اِس ماڈل کے تحت انسانی زندگی کے تمام معاملات مُستَبِد حکمراں (despotic rulers) کے تحت آ گئے۔ یہ مستبد حکمراں اپنے مزاج کے تحت ہر نئی چیز کے دشمن ہوتے تھے۔ وہ ہر نئی تحریک کو پوری طاقت سے کچل دیتے تھے، تاکہ لوگوں کے اوپر ان کی حکمرانی غیر مشروط طور پر قائم رہے۔

اِسی نظام کا ایک ظاہرہ وہ تھا جس کو قرآن میں فتنہ (8:39) کہا گیا ہے۔ اِس ظاہرے کا سیکولر نام مذہبی جبر ہے۔ اِسی مذہبی جبر کی بنا پر قدیم زمانے میں لوگوں کو مذہب توحید اختیار کرنے کی اجازت نہ تھی، کیوں کہ وہ حکمراں کے اختیار کردہ مذہب کے خلاف ہوتا تھا۔ اِسی بنا پر قدیم زمانے میں موحدین کو قتل کر دیا گیا یا آگ میں جلا دیا گیا۔ اِسی بنا پر اصحاب کہف (Seven Sleepers) اپنی بستی کو چھوڑ کر ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے، وغیرہ۔ قدیم زمانے میں اِس قسم کے جو شدید واقعات پیش آئے، اس کا سبب کوئی سیاسی اختلاف نہ تھا، بلکہ اس کا سبب تمام تر صرف مذہبی اختلاف تھا۔

نیا عمل

حضرت ابراہیم کے زمانے میں اللہ نے تاریخ میں ایک نیا عمل (process) جاری کیا۔ یہ عمل انسان کی آزادی کو منسوخ کیے بغیر کیا گیا۔ اِسی کے ساتھ اسباب کے ماحول کو پوری طرح برقرار رکھا گیا۔ اِس صورتِ حال کی بنا پر اِس خدائی عمل کے ساتھ ایک شبہہ کا عنصر (element of doubt) شامل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مذاہب ثلاثہ کے علما خدا کے اِس منصوبے کو سمجھ نہ سکے۔ حضرت ابراہیم کی امامت کا معاملہ علماء مذاہب کے لیے ایک پراسرار معاملہ بنا رہا۔

مذاہبِ ثلاثہ کے علما اِس معاملے میں کنفیوژن کا شکار ہیں۔ وہ اِس واقعے کی کوئی ایسی توجیہہ دریافت نہ کر سکے جو اِس معاملے میں اُن کو یقین پر کھڑا کرنے والی ہو۔ انھوں نے اپنے

ذہنی سانچہ (mind-set) کے اعتبار سے، بعض توجیہات کیں، مگر انھوں نے دیکھا کہ اِن توجیہات کو تاریخ کی تصدیق حاصل نہیں ہورہی ہے، اس لیے وہ اِس معاملے میں کنفیوژن کا شکار ہوکر رہ گئے۔

مثلاً کچھ لوگوں نے کہا کہ حضرت ابراہیم کے ذریعہ دنیا کو توحید کی مستند آئڈیالوجی ملی ۔مگر یہ بات حقیقتِ واقعہ کے خلاف ہے، کیوں کہ دنیا کو توحید کی آئڈیالوجی قرآن کے ذریعے حاصل ہوئی، نہ کہ صُحفِ ابراہیم (87:19) کے ذریعے، جو کہ عملاً اب گم شدہ صحائف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے یہ کہا کہ حضرت ابراہیم کے ذریعے ساری دنیا میں خدائی حکومت قائم ہوئی، مگر تاریخ میں ایسے کسی واقعے کا ذکر نہیں جب کہ ساری دنیا میں خدائی حکومت قائم ہوا اور حضرت ابراہیم اس میں صدر کی حیثیت رکھتے ہوں، وغیرہ۔ اِس قسم کی تمام توجیہات لوگوں کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں، اُن کا خدا کے نقشۂ تخلیق سے کوئی تعلق نہیں۔

اِس معاملے میں خدا کا منصوبہ کیا تھا، اس کو قرآن اور حدیث کے مطالعے سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔قرآن کی سورہ المائدہ میں ایک آیت آئی ہے جس کو اکمالِ دین (5:3) کی آیت کہا جاتا ہے۔ اِس آیت میں اکمالِ دین سے مراد شرعی احکام کی فہرست کا مکمل کرنا نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد اہلِ دین کے لیے خوف کی حالت کا خاتمہ ہے۔یہی وہ بات ہے جس کو آیت میں اِن الفاظ میں کہا گیا ہے: اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ (5:3) یعنی آج منکرین تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہوگئے، پس تم اُن سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں کسی وقتی واقعے کا ذکر نہیں ہے، اِس میں ایک تاریخی حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے۔یہ آیت حجۃ الوداع (10ہجری) کے موقع پر نازل ہوئی۔اِس آیت کا نزول دراصل تاریخ کے ایک دور کے خاتمے اور تاریخ کے دوسرے دور کے آغاز کا اعلان تھا۔یہ اعلان اب پوری طرح واقعہ بن چکا ہے۔اگرچہ اہلِ مذاہب اپنے خودساختہ ذہن کی بنا پر اِس حقیقت سے بے خبر رہے۔

اسباب اور انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے جو خدائی منصوبہ بندی کی گئی، اس کا خاص نشانہ

یہ تھا کہ دنیا میں مذہبی جبر کا مکمل خاتمہ ہو جائے، ہر انسان کو یہ موقع ہو کہ وہ مذہب کے معاملے میں اپنے انتخاب (choice) کے لیے مکمل طور پر آزاد ہو جائے- یہ منصوبہ بندی مکمل طور پر ایک غیر سیاسی منصوبہ بندی تھی- اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا، نہ نظری اعتبار سے اور نہ عملی اعتبار سے-

حضرت ابراہیم کے ذریعے جو منصوبہ بندی کی گئی، اس کے دو پہلو تھے — ایک یہ تھا کہ مطلوب صورتِ حال کا ایک ابتدائی نمونہ (prototype) تیار کرنا- اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ میں ایسا عمل (process) جاری کرنا جو آخر کار ایک نئے دور کو وجود میں لائے، جب کہ مذکورہ ابتدائی اور وقتی نمونہ ایک عالمی انقلاب کی صورت اختیار کر لے اور اِس طرح تمام دنیا کے انسانوں کے لیے عمومی طور پر اور مستقل طور پر یہ امکان کھل جائے کہ وہ کسی بھی جبر کے بغیر ہر قسم کی مذہبی سرگرمیوں کے لیے آزاد ہوں- اپنے ذاتی عقیدے کے معاملے میں بھی اور دوسروں کے درمیان اپنے عقیدے کی اشاعت کے معاملے میں بھی-

وہ چیز جس کو اوپر ابتدائی نمونہ (prototype) کہا گیا ہے، اس کی مثال حضرت یوسف کے ذریعے قائم کی گئی- حضرت یوسف، حضرت ابراہیم کے گریٹ گرینڈ سن (great grandson) تھے- وہ فلسطین اور شام کے درمیان ایک گاؤں (کنعان) میں پیدا ہوئے- اس زمانے میں مصر ایک ترقی یافتہ ملک تھا- یہاں ایک خاندان حکومت کرتا تھا، جس کو ہکساس بادشاہ (Hyksos Kings) کہا جاتا ہے- حضرت یوسف کے زمانے میں یہاں جو بادشاہ حکومت کر رہا تھا، اس کا نام یہ تھا— اپوفس (Apophis)- یہ بادشاہ استثنائی طور پر ایک منفرد مزاج کا آدمی تھا- وہ شخصی طور پر ایسی صفات کا حامل تھا جو مطلوب منصوبے کے لیے ایک موزوں کردار کی حیثیت رکھتی تھیں- یہی وجہ ہے کہ خدائی منصوبے کے تحت حضرت یوسف کو کنعان سے نکال کر قدیم مصر کی راجدھانی ممفس (Memphis) پہنچایا گیا- یہاں ایسے اسباب پیدا ہوئے جن کے تحت حضرت یوسف اُس وقت کے مصری بادشاہ کے دربار میں پہنچے- بادشاہ حضرت یوسف کی صلاحیت سے اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ اُس نے اپنے ایک فیصلے کے تحت، حضرت یوسف کو مصر کے خزائن (وسائل ارض) کا انچارج بنا دیا (12:55)-

حضرت یوسف کا یہ قصہ قرآن اور بائبل دونوں میں یکساں طور پر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں بائبل کا بیان یہ ہے کہ بادشاہ نے کہا— میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب میں بزرگ تر ہوں گا:

Only in regard to the throne, I will be greater than you. (Genesis 41:40)

حضرت یوسف کے ذریعے مصر میں جو مثال قائم ہوئی، وہ دراصل اُس عمومی اور عالمی حالت کا ایک ابتدائی نمونہ تھا جو حضرت ابراہیم کے جاری کردہ تاریخی عمل کے نتیجے میں بعد کو زیادہ بڑے پیمانے پر قائم ہونے والا تھا۔ حضرت یوسف کے ذریعے قدیم مصر میں یہ مثال قائم ہوئی کہ اگر حاکم کے محدود سیاسی اقتدار کو تسلیم کرلیا جائے اور اُس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے تو کس طرح ایک انسان کے لیے ہر قسم کے مذہبی دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہ گویا سیاسی ادارہ (political institution) اور غیر سیاسی اداروں (non-political institutions) کے درمیان علاحدگی کا معاملہ تھا۔ یہ علاحدگی اللہ کے منصوبے کے عین مطابق تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس معاملے کو قرآن میں احسن القصص (12:3) کہا گیا ہے، یعنی بہترین قصہ (best story)۔

قرآن کی اِس آیت میں ''بہترین قصہ'' سے مراد دراصل بہترین ماڈل (best model) ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کی اجتماعی زندگی کا بہترین ماڈل وہی ہے جس کا ایک ابتدائی نمونہ حضرت یوسف کے ذریعے ساڑھے تین ہزار سال پہلے قدیم مصر میں قائم کیا گیا۔ اِس معاملے کو دوسرے الفاظ میں، اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ قدیم مستبدانہ ماڈل (despotic model) کی جگہ جمہوری ماڈل (democratic model) کو دنیا میں رائج کرنا۔ کچھ لوگ جمہوری نظام کو لادینی نظام کہتے ہیں، مگر یہ درست نہیں۔ جدید جمہوری نظام دراصل سیکولرزم کے اصول پر قائم ہے۔ اس کے مطابق، جمہوریت عدم مداخلت کی پالیسی (policy of non-interference) کا دوسرا نام ہے، یعنی سیاسی اقتدار کے ادارے کا اِس پر راضی ہوجانا کہ وہ اپنے حدود کو انتظامیہ (administration) تک محدود رکھے گا۔ انتظامِ ملکی سے باہر جو ادارے ہیں، وہ اپنے دائرے میں

مکمل طور پر آزاد ہوں گے۔ مثلاً تعلیم، صحافت، اشاعتی ادارے، اقتصادی سرگرمیاں، مذہب، دعوت وتبلیغ، وغیرہ۔ اِس میں وہ تمام پُرامن سرگرمیاں شامل ہیں جن کو موجودہ زمانے میں غیر سیاسی سرگرمیاں (non-political activities) یا این جی اوز (NGOs) کی سرگرمیاں کہا جاتا ہے۔

نئی نسل کی تیاری

اِس سلسلے میں دوسری زیادہ بڑی منصوبہ بندی جو حضرت ابراہیم کے ذریعے چار ہزار سال پہلے شروع کی گئی، اس کا مرکز قدیم مکہ تھا۔ حضرت ابراہیم نے اپنی ایک دعا میں یہ الفاظ کہے تھے: رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا (14:35)۔ اِن الفاظ میں دراصل اُس دور کا ذکر تھا جس کو ماقبل ابراہیم دور (pre-Abraham age) کہا جا سکتا ہے۔ اِس قدیم دور میں شرک تمام انسانی آبادیوں میں ایک عمومی کلچر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، حتی کہ تاریخ میں اس کا تسلسل قائم ہو گیا۔ مزید یہ کہ مشرکانہ کلچر کو قدیم زمانے کی حکومتوں کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

اِس حکومتی حمایت کی بنا پر ایک شدید تر صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ وہ تھا — اعتقادی شرک کے ساتھ اس میں حکومتی تشدد کا شامل ہوجانا۔ اعتقادی شرک اور سیاسی اقتدار کے اِس اتحاد کی بنا پر وہ صورتِ حال پیدا ہوئی جس کو مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا ہے۔

اِس نظامِ جبر کو ختم کرکے نظامِ آزادی کو دنیا میں لانا ایک لمبا تاریخی منصوبہ تھا۔ اِس کے لیے صرف آئڈیالوجی کافی نہیں تھی، اِس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک مطلوب ٹیم وجود میں آئے۔ یہ ٹیم ایک آئڈیالوجی کے تحت متحد ہو، تمام ضروری شرطوں کو اختیار کرتے ہوئے یہ ٹیم ایک ہمہ گیر جدوجہد کرے، وہ انسانی تاریخ میں ایک نئے انقلابی عمل (revolutionary process) کا آغاز کرے، انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے وہ اپنا سفر شروع کرے اور پھر اللہ کی خصوصی تدبیر (management) کے ذریعے وہ اپنے منتہا (culmination) تک پہنچ جائے۔ اٹھارھویں صدی میں جو سیاسی انقلاب آگیا اور جس کے نتیجے میں جمہوری ماڈل دنیا میں رائج ہوا، وہ حضرت ابراہیم کے ذریعے جاری کردہ اِسی عمل کی تکمیل کی حیثیت رکھتا تھا۔

رسول اور اصحابِ رسول کی مثال

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات 632 عیسوی میں ہوئی۔ اُس وقت سارا عرب اسلام کے ماتحت آچکا تھا۔ پیغمبر اسلام اِس عرب ریاست کے سربراہ تھے۔ آپ نے ایک با اختیار صدر مملکت کی حیثیت سے یہ اعلان کیا کہ: لا فضل لعربي على عجمي، ولا لعجمي على عربي، ولا لأحمر على أسود، ولا لأسود على أحمر، إلا بالتقوى (مسند أحمد، رقم الحديث: 24204) یعنی کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت ہے۔ کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر کوئی فضیلت نہیں، اور نہ کسی سیاہ فام کو کسی سفید فام پر کوئی فضیلت ہے، سوا تقوی کے۔ یہ تاریخ میں حصولِ جمہوریت کا پہلا باضابطہ اعلان تھا۔ اِس ریاستی اعلان کا مطلب یہ تھا کہ نظریاتی اعتبار سے، اب غیر جمہوری دور کا خاتمہ ہوگیا اور جمہوری دور کا اصولی طور پر آغاز ہوگیا۔ اِس طرح تاریخ میں ایک نیا عمل شروع ہوا جو انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے بتدریج بعد کی تاریخ میں جاری رہا۔

اِسی اعلانِ جمہوریت کا ایک عملی مظاہرہ وہ تھا جو اِس اعلان کے تقریباً 10 سال بعد حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانے میں پیش آیا۔ اُس وقت حضرت عمر کی خلافت کے زمانے میں مصر کا ملک مدینہ کی ریاست میں شامل ہو چکا تھا۔ اُس وقت مصر میں ایک واقعہ ہوا، وہ یہ کہ ایک عرب مسلمان اور ایک مصری مسیحی کے درمیان ایک مسئلے پر نزاع ہوئی۔ عرب مسلمان جو گورنر کا بیٹا تھا، اس نے مسیحی کو کوڑا مار دیا۔ یہ مسیحی مصر سے چل کر مدینہ آیا۔ اُس نے خلیفہ عمر فاروق سے شکایت کی۔ خلیفہ نے گورنر اور اس کے بیٹے دونوں کو مدینہ بلوایا۔ جب وہ لوگ آگئے تو خلیفہ نے مصر کے مسیحی کو ایک کوڑا دیا اور کہا کہ گورنر کے بیٹے کو مارو۔ مسیحی نے کوڑا اپنے ہاتھ میں لیا اور گورنر کے بیٹے کو مارنا شروع کیا۔ جب وہ اچھی طرح مار چکا تو اس کے بعد خلیفہ نے مذکورہ عرب مسلمان کے باپ عمرو بن العاص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: متى استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا (سيرة عمر بن الخطاب، علي محمد الصلابي، 306/1) یعنی اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا، جب کہ ان کی ماؤں نے اُن کو آزاد پیدا کیا تھا۔

جس وقت یہ واقعہ ہوا، اُس وقت خلافت ایک ایمپائر بن چکی تھی جس کے حدودِ مملکت ایشیا سے

افریقہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ایسی حالت میں خلیفہ کے الفاظ محض ایک شخص کے الفاظ نہ تھے، بلکہ وہ وقت کی سب سے بڑی سلطنت کی طرف سے گویا بین اقوامی پالیسی کا اعلان تھا۔یہ پالیسی تاریخ میں سفر کرتی رہی۔انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے وہ تاریخ کو ایک نیا شیپ (shape) دیتی رہی، یہاں تک کہ یہ عمل یورپ تک پہنچ گیا۔فرانس کے مشہور جمہوری مفکر روسو(J. J. Rousseau) کی کتاب سوشل کنٹریکٹ(*Social Contract*) 1762 میں شائع ہوئی۔اِس کتاب میں جمہوریت (democracy) کی آئڈیالوجی کو پیش کیا گیا تھا۔روسو نے اپنی کتاب کا آغاز جس جملے سے کیا، وہ گویا خلیفہ عمر فاروق کے مذکورہ قول کا اعادہ تھا۔روسو کی کتاب کا ابتدائی جملہ یہ تھا— انسان آزاد پیدا ہوا تھا، مگر میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں:

Man was born free, but I see him in chains.

جمہوریت کی یہ تحریک 1789 میں ایک باقاعدہ سیاسی واقعہ بن گئی، جب کہ یورپ میں وہ واقعہ پیش آیا جس کو انقلاب فرانس (French Revolution) کہا جاتا ہے۔انقلاب فرانس نے اصولی طور پر بادشاہت (kingship) کے نظام کا خاتمہ کردیا اور جمہوریت کو ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے بالفعل قائم کردیا۔یہ تاریخی عمل 1948 میں آخری طور پر مکمل ہوگیا، جب کہ اقوامِ متحدہ (UNO) کا باضابطہ قیام عمل میں آیا اور دنیا کی تمام قومیں باضابطہ طور پر اقوامِ متحدہ کی ممبر بن گئیں۔اِس ادارے کے تحت دنیا کی تمام قوموں نے اِس عہد نامے پر دستخط کردئے۔اِس کا مطلب یہ تھا کہ استبدادی ماڈل اب آخری طور پر غیر مطلوب ماڈل قرار پا گیا اور جمہوری ماڈل کو عملاً مسلمہ ماڈل کی حیثیت دے دی گئی۔

جمہوری ماڈل

جمہوریت کی تعریف (definition) عام طور پر اِس طرح کی جاتی ہے — عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام کے لیے:

Government of the people, by the people, for the people

یہ تعریف جمہوریت کے صرف ظاہری ڈھانچے کو بتاتی ہے۔اِس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جمہوریت کے

حقیقی فوائد کیا ہیں اور انسانی زندگی کے حق میں اس کے دوررس نتائج کیا پیدا ہوئے۔ جمہوریت اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، اُس سے بہت زیادہ ہے جیسا کہ وہ مذکورہ تعریف کے مطابق نظر آتی ہے۔

جمہوریت کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس نے اُن تمام رکاوٹوں کو ختم کردیا جو قدیم غیر جمہوری نظام کے تحت انسان پر عائد تھیں۔ جمہوریت نے کامل معنوں میں، انسان کو فکر وخیال کی آزادی دے دی۔ انسان اپنے فطری وجود کے اعتبار سے، امکانات کی ایک کائنات اپنے اندر رکھتا ہے۔ اِن انسانی امکانیات (potentials) کو انفولڈ (unfold) کرنے کے لیے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ ہے کامل آزادی۔ قدیم زمانے میں اِس انسانی آزادی پر پابندی لگی ہوئی تھی، اِس کا یہ نتیجہ تھا کہ قدیم زمانے میں انسان کوئی بڑی ترقی نہ کرسکا، نہ مذہبی اعتبار سے اور نہ سیکولر اعتبار سے۔

موجودہ زمانے میں جمہوریت کا دور آیا تو اسی کے ساتھ کامل آزادی کا دور آ گیا۔ اِس آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی تمام فطری صلاحیتیں انفولڈ ہونے لگیں۔ وہ تمام ترقیاں جن کے مجموعے کو تہذیب (civilization) کہا جاتا ہے، وہ دراصل اِسی انفولڈنگ (unfolding) کا نتیجہ ہیں۔ اِسی کے نتیجے میں یہ ہوا کہ دنیا میں مذہبی آزادی کا دور آیا۔ فطرت کے اندر چھپی ہوئی سائنسی حقیقتوں کی دریافت ہوئی۔ انسان کو پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کی دولت ملی۔ تاریخ میں پہلی بار وہ انقلاب آیا جس کو عالمی کمیونکیشن (global communication) کہا جاتا ہے، وغیرہ۔

جدید تہذیب کی یہ تمام ترقیاں اسلام کے عین موافق تھیں۔ انھوں نے دینِ خداوندی کی اشاعت کے ایسے دروازے کھول دئے جو اِس سے پہلے کبھی نہیں کھلے تھے۔ جدید تہذیب نے اِس کو ممکن بنایا کہ اسلام کی حقیقتوں کو علمِ انسانی کی اعلیٰ سطح پر ثابت شدہ بنایا جاسکے۔ اِن نئی دریافتوں کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ انسان اعلیٰ سطح کی معرفت کا تجربہ کرسکے۔ اِسی کے ذریعے یہ ممکن ہوا کہ اللہ کے پیغام کی اشاعت کا کام کسی رکاوٹ کے بغیر عالمی سطح پر انجام دیا جاسکے۔ اِسی جدید تہذیب کی بنا پر تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ عالمی سطح پر ایک دعوہ ایمپائر (Dawah empire) قائم کیا جاسکے، وغیرہ۔

یہ سب کچھ جو دورِ جدید میں ہوا، وہ اللہ کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کے مطابق ہوا۔

وہ منصوبہ یہ ہے کہ انسان کی آزادی کو ہر حال میں باقی رکھا جائے۔ جو کام بھی کیا جائے، وہ انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے کیا جائے۔ خدا کے اِسی تخلیقی منصوبے کی بنا پر ایسا ہوا کہ تہذیبی ترقیوں کے ساتھ انسان کے لیے یہ موقع باقی رہا کہ وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے، خواہ اس کے نتیجے میں فساد کی صورتیں پیدا ہوجائیں۔ یہ دوطرفہ صورتِ حال موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی بصیرت کا امتحان تھی۔ یہاں ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے رہنما اُس صلاحیت کا ثبوت دیں جس کو خدا کی کتاب میں فرقان (9:29) کہا گیا ہے، یعنی ایک چیز کو دوسری چیز سے الگ کرکے دیکھنا۔

اِس موقع پر مسلم رہنماؤں کو یہ کرنا تھا کہ وہ مغربی تہذیب اور اہلِ مغرب کی قومی سیاست دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھیں۔ مغربی تہذیب، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، مغربی تہذیب نہیں ہے، بلکہ وہ خدائی تہذیب (divine civilization) ہے۔ وہ فطرت میں چھپے ہوئے خدائی قوانین کی دریافت کے ذریعے وجود میں آئی ہے۔ وہ قوانینِ فطرت کا انسانی سطح پر ظہور ہے۔ فطرت کے قوانین جب انسانی ٹکنالوجی میں ڈھل جائیں تو اسی کا نام تہذیب ہوتا ہے۔ جدید تہذیب کو سمجھنے کے لیے اُسی طرح اس کو مغرب کے قومی پہلو سے الگ کرکے دیکھنا چاہئے، جس طرح اسلام کو مسلمانوں کے قومی پہلو سے الگ کرکے دیکھا جاتا ہے۔

دورِ جدید کے مسلم رہنما اگر اِس بصیرت کے حامل ہوتے کہ وہ جدید تہذیب اور مغربی قوم، دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھتے تو یقیناً وہ پالیتے کہ جدید تہذیب اُن کے لیے ایک خدائی نعمت ہے، وہ حضرت یوسف کے 'احسن القصص' کا عالمی اظہار ہے، وہ حضرت ابراہیم کے جاری کردہ عمل (process) کا براہِ راست حصہ ہے، وہ پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کے ذریعے لائے جانے والے انقلاب کا تکمیلی مرحلہ ہے۔ جدید تہذیب کے ذریعے اللہ تعالی نے مسلمانوں کے لیے وہ عالمی مواقع آخری حد تک کھول دئے ہیں، جب کہ پیغمبر اسلام کی ایک پیشین گوئی کو واقعہ بنایا جاسکے۔ آپ کی اِس پیشین گوئی کو مختصر طور پر اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے — ادخال الکلمۃ في کل البیوت۔

اوپر کے صفحات میں تاریخ کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ

خدائی منصوبہ کیا تھا جس کو قرآن میں امامتِ ابراہیم کہا گیا تھا اور جس کے بارے میں بائبل میں یہ الفاظ آئے تھے کہ — زمین کی سب قومیں اس کے وسیلے سے برکت پائیں گی۔

اِس خدائی اعلان کا مطلب یہ تھا کہ انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اللہ تاریخ میں ایک ایسا عمل (process) جاری کرے گا جو آخر کار اِس انجام تک پہنچے گا کہ انسانی زندگی میں سیاسی جبر کا فتنہ کامل طور پر ختم ہو جائے اور جمہوریت کے تحت ایک ایسا سیاسی نظام بنے گا جس میں دوبارہ زیادہ بڑے پیمانے پر اور عالمی سطح پر وہ حالت قائم ہو جائے گی جو حضرت یوسف کے زمانے میں قدیم مصر میں وقتی طور پر اور محدود طور پر قائم ہوئی تھی، یعنی سیاسی حکمراں کا اقتدار ''تخت'' تک محدود رہے گا۔ ''تخت'' کے سوا تمام غیر سیاسی شعبے مکمل طور پر آزاد ہو جائیں گے۔ ہر انسان کو یہ موقع ہوگا کہ وہ کامل معنوں میں مذہبی آزادی کی فضا میں جیے۔ وہ اپنے چوائس (choice) کے مطابق، جس مذہبی عقیدے کو چاہے، اختیار کرے، وہ عبادت کے جس طریقے کو چاہے، اس کے مطابق، عبادت کرے۔ مذہب کی تبلیغ واشاعت پر کسی بھی قسم کی کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، انسان کو مکمل معنوں میں مذہبی آزادی حاصل ہو، اِس واحد شرط کے سوا کوئی اور شرط اس کے لیے موجود نہ ہو کہ وہ دوسرے انسانوں کو کسی بھی قسم کی عملی جراحت (physical injury) نہیں پہنچائے گا۔ انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے یہی واحد ممکن ماڈل تھا جس کو اللہ کے منصوبے کے تحت بروئے کار لایا گیا۔

اِس مذہبی آزادی میں یہ بات بھی اپنے آپ شامل ہے کہ تمام مواقعِ کار جو سیکولر لوگوں کو حاصل ہوں گے، وہ سب کے سب مکمل طور پر اہلِ مذہب کو بھی حاصل ہوں گے۔ مواقع کے استعمال میں مذہبی انسان اور غیر مذہبی انسان کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

ایک مسئلے کی وضاحت

انسانی زندگی کی تشکیل کا جو نقشہ اوپر بیان کیا گیا ہے، بظاہر اس میں حکومت یا سیاسی اقتدار کا معاملہ شامل نہیں ہے، لیکن بالواسطہ طور پر وہ یقیناً اس میں شامل ہے۔ اِس فرق کا سبب یہ ہے کہ اگر حکومت کے معاملے کو مذکورہ نقشہ میں شامل کیا جائے تو پورا خدائی منصوبہ تخلیق عملاً معطّل ہو کر

رہ جائے گا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں شعبوں میں کوئی مثبت کام نہ ہوسکے گا، نہ عبادت اور دعوت کے شعبے میں اور نہ سیاست اور حکومت کے شعبے میں۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ مذکورہ دونوں شعبوں کی حیثیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ عقیدہ اور عبادت اور دعوت کا معاملہ اُس میدان سے تعلق رکھتا ہے جہاں آدمی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ پُرامن طور پر اپنی تمام سرگرمیوں کو کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رکھ سکے۔ اِس کے برعکس، سیاست کا دائرہ ایک ایسا دائرہ ہے جہاں داخل ہوتے ہی فوراً دوسرے فریق سے نزاع پیدا ہوجاتی ہے۔ سیاست کے دائرے میں ہمیشہ کوئی فرد یا گروہ اتھارٹی کی پوزیشن میں ہوتا ہے، اِس لیے سیاست کے دائرے میں داخل ہونا عملاً پولٹکل اتھارٹی سے ٹکراؤ کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ یہ ٹکراؤ اِس ماحول کو ختم کردیتا ہے جب کہ ایک شخص عقیدہ اور عبادت اور دعوت کے میدان میں موجود مواقع کو استعمال (avail) کرسکے۔

خدا کے منصوبہ تخلیق میں اِس مسئلے کا حل یہ مقرر کیا گیا کہ سیاسی اقتدار کے شعبے کو عقیدہ سے وابستہ کرنے کے بجائے اس کو سماجی حالات (social conditions) سے وابستہ کردیا جائے، یعنی کسی وقت سماج کے جو حالات ہوں اور انسانوں کے درمیان جس سیاسی ڈھانچے پر اتفاق ہوسکتا ہے، اس کو اختیار کرلیا جائے۔ یہ صورتِ حال جاری رہے گی، یہاں تک کہ سماج کے حالات بدل جائیں اور سیاسی ڈھانچے کے بارے میں کوئی دوسرا نقشہ لوگوں کے لیے قابل قبول بن جائے۔

اِس حکمت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** (42:38) یعنی ان کا معاملہ اُن کے آپس کے مشورے کے تابع ہے۔ اِس آیت میں 'امر' سے مراد اقتدار کا معاملہ ہے۔ اِس آیت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ سیاسی اقتدار کا معاملہ کسی مخصوص عقیدے کے تابع نہ ہو، بلکہ وہ لوگوں کی آزاد رائے کے تابع ہو۔ آج کل کی زبان میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیاسی ادارے کا معاملہ عوامی الیکشن کے تابع ہے۔ فری اینڈ فیر الیکشن (free and fair election) کے ذریعے جو لوگ منتخب ہوں گے، اُن کو حق ہوگا کہ وہ اُس وقت تک حکومت کا نظام چلائیں جب تک لوگوں کی رائے بدل نہ جائے اور سماجی حالات کا یہ تقاضا ہو کہ اقتدار کی زمام کچھ دوسرے لوگوں کے

حوالے کی جائے۔یہی وہ حقیقت ہے جوایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: كما تكونون ؛ كذلك يؤمر عليكم(البيهقي ، رقم الحديث : 7391) یعنی جیسے تم ہوگے، ویسے تمھارے حکمراں ہوں گے۔دوسرے الفاظ میں یہ کہ حکمراں کا تعین کسی مخصوص عقیدے کی بنیاد پر نہیں ہوگا، بلکہ اس کا تعین لوگوں کی رائے (vote) کے ذریعے کیا جائے گا۔

یہ ایک قسم کے سماجی بندوبست(social settlement) کا معاملہ ہے۔اِس کا فائدہ یہ ہے کہ زندگی کے دونوں شعبوں (سیاسی اور غیر سیاسی) میں امن کا قیام ممکن ہوجاتا ہے۔عقیدہ اور عبادت اور دعوت کے میدان میں لوگوں کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ پُرامن طور پر اپنی تمام سرگرمیوں کو جاری رکھیں، وہ اپنے حق میں مواقع کا بھر پور استعمال کریں۔دوسری طرف، سماج کے ہر گروہ کو یہ موقع حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ سماج کے اندر اپنے افکار کی پر امن اشاعت کرسکے اور پھر اگلے الیکشن کے موقع پر، حسبِ حالات، وہ اپنی پر امن کوششوں کا فائدہ اٹھائے — انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے سماجی بندوبست کا اِس سے بہتر کوئی نظام ممکن نہیں۔

خاتمہ کلام

جیسا کہ عرض کیا گیا، اللہ تعالی کا یہ منصوبہ تھا کہ انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ میں ایک ایسا عمل (process) جاری کیا جائے جس کے نتیجے میں سیاست کے جبری ماڈل (despotic model) کا خاتمہ ہوجائے اور اس کے بجائے سیاست کا جمہوری ماڈل (democratic model) عمومی طور پر رائج ہوجائے۔اِس مطلوب ماڈل کا ایک ابتدائی نمونہ (prototype) حضرت یوسف کے ذریعہ قدیم مصر میں محدود طور پر قائم کیا گیا تھا۔اِسی کے ساتھ حضرت ابراہیم کے ذریعے ایک وسیع تر عمل جاری کیا گیا جو مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اپنے منتہا تک پہنچا۔انیسویں صدی اور بیسویں صدی مذکورہ ابراہیمی عمل کی تکمیل کی صدی ہے۔اب ہم اکیسویں صدی میں ہیں اور یہ عمل اب اِس حد تک مکمل ہوچکا ہے کہ آج تمام مواقع دعوت الی اللہ کے حق میں پوری طرح کھل چکے ہیں۔اب ہر اعتبار سے، وہ وسائل اور مواقع حاصل ہوچکے ہیں، جب کہ کسی رکاوٹ کے بغیر

فکری سطح پر اللہ کے دین کا عالمی اظہار اپنی مطلوب صورت میں کیا جا سکے۔

مگر اسلام کی تاریخ کا شاید یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ اِس دور میں جو بڑے بڑے مسلم ذہن پیدا ہوئے، وہ اِس واقعے سے بالکل بے خبر رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اِس دور میں پیدا شدہ عظیم مواقع کو استعمال بھی نہ کرسکے۔ اِس المیہ کا سبب بنیادی طور پر صرف ایک تھا، اور وہ ایک اتفاقی مطابقت (coincidence) ہے۔ اِس اتفاقی مطابقت کا یہ نتیجہ تھا کہ تاریخ کا عظیم ترین امکان غیر استعمال شدہ امکان (unavailed opportunity) بن کر رہ گیا۔

اِس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مذکورہ ابراہیمی عمل کی تکمیل ہوئی تو یہ اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ تھا۔ عین اُس زمانے میں ایک حادثہ پیش آ گیا۔ وہ حادثہ یہ تھا کہ اِسی زمانے میں مغربی قوموں نے بڑی بڑی مسلم سلطنتوں کو توڑ دیا اور پوری مسلم دنیا میں اپنا سیاسی اور تہذیبی دبدبہ قائم کرلیا۔

یہ حادثہ مسلمانوں کی قومی نفسیات کے لیے ایک ایٹمی دھماکے سے بھی زیادہ بڑے دھماکے کی حیثیت رکھتا تھا۔ چناں چہ اِس دور کے تمام مسلمان، غالباً کسی استثنا کے بغیر، شدید طور پر منفی ردعمل کا شکار ہوگئے۔ وہ مغربی قوموں سے نفرت کرنے لگے۔ انھوں نے مغربی قوموں کے خلاف فکری یا عملی جنگ چھیڑ دی۔ یہ ردعمل اتنا شدید تھا کہ مغربی قوموں کو نقصان پہنچانے کے لیے وہ خودکش بم باری (suicide bombing) کو بھی اپنے لیے جائز سمجھنے لگے۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں پیدا ہونے والا مسلم لٹریچر، تقریباً سب کا سب، اِسی نفرت کی نفسیات سے بھرا ہوا ہے۔ اِس لٹریچر کے مطابق، موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا جو ذہن بنا، وہ یہ تھا گویا کہ ساری مغربی دنیا صرف ایک کام میں مشغول ہے — مسلمانوں کے خلاف سازش اور دشمنی۔ اِس معاملے کی ایک علامتی مثال ایک عرب عالم کی کتاب ہے، جس کا ٹائٹل یہ ہے:

أجنحة المكر الثلاثة وخوافيها: التبشير، الإستشراق، الإستعمار (صفحات: 776)

عبد الرحمن حسن حبنكة الميداني (دار القلم، دمشق: 2000)

اجتماعی توبہ کی ضرورت

یہ صورتِ حال بلاشبہہ توبہ کی متقاضی ہے، یعنی منفی سوچ کو ترک کرکے مثبت سوچ کی طرف واپس جانا۔ اب تمام مسلمانوں کے لیے اُس عمل کا وقت آگیا ہے جس کا حکم قرآن میں اِن الفاظ میں دیا گیا تھا: وَتُوبُوٓا إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (24:31) یعنی اے ایمان والو، تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔

قرآن کی اِس آیت میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد اجتماعی توبہ (collective repentance) ہے۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ مذکورہ قسم کا منفی ذہن تمام مسلمانوں کا قومی ذہن بن گیا ہے۔ مسلمانوں کی تمام قومی پالیسیاں اِسی منفی ذہن کے مطابق بنتی ہیں۔ اِس معاملے میں مسلمان اتنا زیادہ متحد الخیال ہیں جیسے کہ اِس معاملے میں تمام مسلمانوں کا اجماع (consensus) ہوگیا ہو۔ اِس وقت سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اِس عمومی قومی ذہن کو بدلا جائے۔ یہی موجودہ مسلمانوں کی اصلاح کا نقطہ آغاز ہے۔ اِس ذہن کے باقی رہتے ہوئے مسلمانوں کے درمیان کوئی بھی نتیجہ خیز اصلاحی کام نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخ کا ربانی سفر

قرآن کی ایک آیت، معمولی لفظی فرق کے ساتھ، دوسورتوں میں آئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (61:8) یعنی وہ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کی روشنی کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھادیں اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کرکے رہے گا، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

قرآن کی اِس آیت کا خطاب محدود طور پر صرف قدیم مکہ یا قدیم مدینہ کے مخالفین سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق پوری انسانی تاریخ کے ربانی سفر سے ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے پچھلے ہزاروں سال کے دوران مختلف مقامات پر اپنے پیغمبر بھیجے، لیکن مخالفین نے اُن کے مشن کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔ اب اللہ نے تاریخ میں مداخلت کرتے ہوئے اِس مشن کا چارج خود لے لیا ہے۔ یہی مداخلت اِس بات کی ضمانت ہے کہ خدا کا یہ مشن اپنی آخری تکمیل تک پہنچے، کوئی بھی طاقت اس کے سفر کو روکنے میں کامیاب نہ ہو۔

رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے ساتویں صدی عیسوی میں جو انقلاب آیا، وہ اِسی فیصلۂ الٰہی کا نتیجہ تھا۔ اِس انقلاب کا سب سے زیادہ انوکھا پہلو یہ تھا کہ وہ تقریباً 35 سال (644-610) کے اندر مکمل ہوگیا۔ انقلاب کا یہ پہلو بے حد اہم ہے۔ تاریخ میں دوسرے جو انقلابات پیش آئے، وہ سب اپنی نوعیت کے اعتبار سے، سیاسی انقلابات (political revolutions) تھے، مگر اسلامی انقلاب اِس کے برعکس، ایک نظریاتی انقلاب (ideological revolution) تھا۔ اِس بنا پر ضروری تھا کہ وہ پہلی نسل (first generation) کے اندر مکمل ہوجائے۔ سیاسی انقلاب کو کئی نسلوں میں مکمل کیا جاسکتا ہے، لیکن نظریاتی انقلاب کا معاملہ یہ ہے کہ وہ یا تو پہلی نسل میں مکمل ہوگا، یا وہ سرے سے مکمل ہی نہ ہوگا۔

بنیادی طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے دو دور تھے — ایک تھا، فاؤنڈیشن پیریڈ (foundation period) اور دوسرا تھا، توسیعی پیریڈ (expansion period)۔ توسیعی پیریڈ کی

تکمیل بعد کے دور میں بھی ممکن ہے، لیکن فاؤنڈیشن پیریڈ کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلی نسل میں اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔

انسان کی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے پہلی نسل میں فاؤنڈیشن پیریڈ کی تکمیل اِس عالمِ اسباب میں کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔ یہ صرف اللہ کے لیے ممکن تھا اور اللہ نے خصوصی مداخلت کرکے ایسے حالات پیدا کیے کہ رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے یہ ممکن ہوجائے کہ وہ پہلی نسل میں اِس انقلاب کو مکمل کرسکیں۔ یہ ایک ایسا استثنائی واقعہ تھا کہ پوری انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ مورخین، اسلامی انقلاب کے اِس استثنائی پہلو کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن وہ اِس کی توجیہہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ مورخین مادی اسباب کی روشنی میں واقعات کی توجیہ کرتے ہیں، جب کہ یہ واقعہ خدا کی برتر مداخلت کا نتیجہ تھا اور خدا کی برتر مداخلت ایک ایسا عامل (factor) ہے جس سے مورخین شعوری طور پر واقف نہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ کو جو انقلاب لانا مطلوب تھا، اس کو قرآن میں اتمامِ نور (61:8) کہا گیا ہے۔ ضروری تھا کہ یہ واقعہ پہلی نسل کے اندر مکمل ہوجائے۔ کیوں کہ فطرت کے قانون کے تحت ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ بعد کی نسلوں میں زوال شروع ہوجاتا ہے اور زوال یافتہ افراد اتمامِ نور کا کارنامہ انجام نہیں دے سکتے۔ اِس لیے اللہ تعالیٰ نے خصوصی منصوبے کے تحت ایک محدود مدت میں بہت سے انتظامات کیے، تاکہ پہلی نسل میں انقلاب کی تکمیل کو یقینی بنایا جاسکے۔

اِس مقصد کے لیے مختلف تدبیریں کی گئیں۔ مثلاً کعبہ کو تمام عرب قبائل کے بتوں کا مرکز بنا دیا گیا، تاکہ تمام قبائل کے افراد مکہ میں حاصل ہوجائیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے سال (570ء) میں یمن کے حاکم ابرہہ نے ہاتھیوں کی فوج کے ذریعے مکہ پر حملہ کیا تھا، تاکہ کعبہ کو ڈھا دیا جائے۔ اگر ابرہہ کا منصوبہ کامیاب ہوجاتا تو کعبہ کا وجود مٹ جاتا اور پیغمبر اسلام کو یہ موقع حاصل نہ ہوتا کہ وہ مکہ میں تمام عرب قبائل کے افراد کو یکجا طور پر پاسکیں۔ اُس زمانے میں قبیلہ قریش کو پورے عرب کی ذہنی قیادت (intellectual leadership) کا مقام حاصل تھا۔ مکہ میں ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ وہاں کے تمام اعلیٰ ذہن پیغمبر اسلام کے ساتھی بن گئے۔ پھر مدینہ کے دونوں قبائل (اوس وخزرج) کے

درمیان خوں ریز جنگ ہوئی۔ اِس کے نتیجے میں دونوں قبائل بے حد کمزور ہو گئے۔ اس طرح پیغمبر اسلام کو یہ موقع ملا کہ وہ دس سال کے اندر پورے مدینے کو اسلام کے فولڈ میں لا سکیں۔ تمام قبائل کے بتوں کا مرکز بن جانے کی بنا پر عرب کے قبائل کعبہ کو پورے عرب کا مذہبی اور سیاسی مرکز سمجھتے تھے۔ چناں چہ جب مکہ فتح ہوا تو نہایت تیزی سے تمام عرب قبائل نے پیغمبر اسلام کی قیادت کو قبول کر لیا۔

اسی طرح اُس زمانے میں عرب کی سرحدوں پر ایک بڑا واقعہ پیش آیا۔ اِس واقعے کا ذکر قرآن کی سورہ الروم (30) کے آغاز میں موجود ہے۔ وہ یہ کہ اُس زمانے میں عرب کی سرحدوں پر دو بڑے ایمپائر قائم تھے۔ ایک، ساسانی ایمپائر اور دوسرے، بازنطینی ایمپائر۔ عین اُس زمانے میں دونوں کے درمیان فوجی ٹکراؤ ہوا۔ پہلے ساسانی ایمپائر نے رومی ایمپائر کو تباہ کیا۔ اس کے بعد رومی بادشاہ نے اپنی طاقت کو دوبارہ مجتمع کر کے ساسانی ایمپائر پر حملہ کیا اور اس کو تباہ کر دیا۔ چناں چہ دونوں ایمپائر بہت زیادہ کمزور ہو گئے۔ اس طرح اصحابِ رسول کو یہ موقع مل گیا کہ وہ نہایت آسانی سے ایشیا اور افریقہ کے درمیان پھیلے ہوئے اِس پورے علاقے کو اسلامی علاقے میں شامل کر سکیں۔

تاریخِ اسلام: ایک مطالعہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا مشن شروع کیا۔ آپ کی مسلسل جدوجہد سے وہاں ایک ٹیم بنی جس کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ رسول اور اصحابِ رسول کی کوششوں سے ساتویں صدی کے نصف اول میں ایک انقلاب آیا۔ مورخین اعتراف کرتے ہیں کہ یہ تاریخِ انسانی کا سب سے بڑا انقلاب تھا۔ مثلاً حال میں برطانیہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے موضوع پر ایک انگریزی کتاب چھپی ہے۔ اُس کا نام یہ ہے:

The Prophet Muhammad: A Biography by Barnaby Rogerson, Little , Brown, UK 2003, p. 240

برطانی مصنف راجرسن نے اپنی اِس کتاب میں لکھا ہے کہ — پیغمبر اسلام کو جو عظیم کامیابی حاصل ہوئی، اس کے لحاظ سے وہ بلا شبہہ تاریخ کے سپر ہیرو (superhero) تھے۔ تاہم پیغمبر اسلام کی

غیر معمولی کامیابی کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی یہ کامیابی محض اتفاقی (mere accidental) تھی (صفحہ 4)۔

سیکولر مبصرین عام طور پر اِس طرح کے الفاظ بولتے ہیں۔ جس واقعہ کی توجیہ وہ معلوم اسباب کے تحت نہ کرسکیں، اُس کو وہ ''اتفاق'' کا نتیجہ قرار دے دیتے ہیں۔ مگر اتنا بڑا واقعہ جو پوری تاریخ میں واحد استثنا کی حیثیت رکھتا ہو، وہ محض اتفاق کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک خدائی منصوبہ (divine plan) تھا، جو رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے انجام پایا۔ اِس کا ظہور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم کے زمانے میں ہوا اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اس کی تکمیل ہوئی۔

اللہ کا یہ منصوبہ تھا کہ توحید کی بنیاد پر ایک انقلاب برپا کیا جائے۔ اِس مقصد کے لیے قدیم دور میں اللہ نے بہت سے پیغمبر بھیجے۔ مگر اِن پیغمبروں کے ذریعے کوئی ٹیم نہیں بنی۔ اِس لیے قدیم زمانے میں مطلوب انقلاب برپا نہ ہوسکا۔ اس کے بعد اللہ تعالی نے حضرت ابراہیم کے ذریعے ایک نیا منصوبہ بنایا۔ اِس منصوبے کے تحت حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بچے اسماعیل کو عرب کے صحرا میں بسا دیا۔ اِس واقعے کی طرف قرآن میں اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ (14:37)۔

اِس صحرائی ماحول میں لمبی مدت تک توالد وتناسل کے ذریعے ایک جان دار قوم تیار ہوئی۔ اِسی قوم کے اندر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی۔ پھر اِسی قوم کے اندر کام کرکے وہ ٹیم بنی جس کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ یہ پورا معاملہ ایک خدائی منصوبے کے تحت وجود میں آیا۔ مکہ میں مقدس کعبہ کی تعمیر اِسی منصوبے کا ایک حصہ تھی۔ بعد کو سارے عرب میں شرک پھیل گیا۔ یہ قبائلی دور تھا۔ ہر قبیلے کا ایک الگ بت تھا۔ چناں چہ یہاں ایسے اسباب پیش آئے کہ کعبہ 360 بتوں کا مرکز بن گیا۔

یہ قدیم تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ تھا۔ اِس سبب سے یہ ممکن ہوگیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مشن کی اشاعت کے لیے سارے عرب میں سفر نہ کرنا پڑے، بلکہ مکہ ہی میں آپ کو

تمام قبائل کے نمائندے حاصل ہو جائیں۔ کیوں کہ کعبہ میں تمام قبائل کے بتوں کی موجودگی کی بنا پر ایسا ہوتا تھا کہ مکہ میں مسلسل طور پر وہ چیز ہوتی رہتی تھی جس کو آج کل کی زبان میں کُل عرب اجتماع (all Arab assembly) کہا جاسکتا ہے۔

اِس کے بعد بار بار ایسے واقعات پیش آئے جن کی بنا پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ وہ تیز رفتاری کے ساتھ اپنے مشن کی تکمیل کرسکیں۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت پر غور کیجیے۔ غزوۂ بدر کی نسبت سے، قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا۟ أَوْ يَكْبِتَهُمْ (3:127) یعنی تاکہ اللہ اہلِ کفر کے ایک حصے کو کاٹ لے یا وہ اُن کو ذلیل کردے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں ''طَرَف'' کا لفظ حصۂ بہتر (better part) کے معنی میں ہے، یعنی اہلِ کفر کے بہتر حصے کو کاٹ کر جدا کردینا اور 'یکبتھم' کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بقیہ حصہ کو ہلاک کرکے ختم کردینا۔ ٹھیک یہی واقعہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آیا۔ پہلے مکی دور کی تیرہ سالہ دعوتی جدوجہد کے دوران مکہ کے صالح افراد کو ایمان کی توفیق ملی اور وہ اسلام قبول کرکے پیغمبر اسلام کے ساتھی بن گئے۔ 'قطعِ طرف' کا یہی واقعہ ہے جس کا ذکر حضرت خالد بن الولید نے اِن الفاظ میں کیا تھا: دخل الناس في الإسلام، فلم يبق أحد به طَعْم (البيهقي: 4/345) یعنی مکہ کے بہترین افراد اسلام میں داخل ہوگئے۔ اب مکہ میں کوئی باذوق آدمی (man of taste) باقی نہیں رہا۔ 'یکبتھم' کا لفظی مطلب ہے ذلیل کرنا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ مکہ کے مخالفین جو چڑھائی کرکے ایک ہزار کی تعداد میں مدینہ آئے تھے، اُن کے 70 طاقت ور افراد قتل ہوگئے اور اُن کو ذلیل وخوار ہو کر مکہ واپس جانا پڑا۔

عرب کا اسلامائزیشن

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جو کامیابی حاصل ہوئی، اس میں ایک بڑا دخل اُس واقعے کا ہے جس کو اسلامی تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک انوکھی تدبیر تھی جس کو پوری تاریخ میں کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔ یہ مکمل طور پر ایک اجتہادی تدبیر تھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مشن 610 عیسوی میں شروع کیا۔ یہ زمانہ جارحانہ شرک

اور مذہبی عدم رواداری (religious intolerance) کا زمانہ تھا۔ اِس بنا پر وہاں فریقِ ثانی کی طرف سے مسلسل طور پر ٹکراؤ اور جنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اِس طرح کے ماحول میں دعوتِ توحید کا کام پوری طرح نہیں ہوسکتا تھا۔ توحید کی آئڈیالوجی پیغمبر اسلام کے مشن کی سب سے بڑی طاقت تھی، مگر طرفین کے درمیان تشدد کے ماحول کی بنا پر یہ موقع نہ تھا کہ یہ طاقت پوری طرح ظاہر ہو اور لوگوں کو مسخر کرے۔

اُس وقت اللہ کی خصوصی توفیق سے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی تدبیر کی جس کی کوئی نظیر تاریخ میں موجود نہ تھی۔ وہ تدبیر یہ تھی کہ فریقِ ثانی کے تمام مطالبات کو یک طرفہ طور پر مان لیا جائے، تاکہ فریقین کے درمیان معتدل ماحول قائم ہوجائے اور کسی رکاوٹ کے بغیر دعوتِ توحید کا کام انجام پا سکے۔ یہ تدبیر بلاشبہہ ایک عظیم تدبیر تھی، اِسی لیے اُس کو قرآن میں فتحِ مبین (48:1) کہا گیا ہے۔

صلح حدیبیہ کی اِس تدبیر سے دو بڑے فائدے حاصل ہوئے۔ ایک، یہ کہ صلح حدیبیہ سے پہلے فریقین کا مقابلہ میدانِ جنگ میں ہوتا تھا، اور جنگ کا طریقہ صرف مسئلے کو بڑھاتا ہے، وہ مسئلے کو کم نہیں کرتا۔ صلح حدیبیہ کا یہ فائدہ ہوا کہ طرفین کا مقابلہ عقل اور فطرت کے میدان میں ہونے لگا، اور جب عقل اور فطرت کے میدان میں مقابلہ ہو تو توحید کی آئڈیالوجی ہمیشہ غالب رہے گی۔ وہ عقل کو ایڈریس کرے گی اور انسان کی فطرت مسخر ہوتی چلی جائے گی۔ اِسی کا یہ نتیجہ تاریخ نے دیکھا کہ معاہدہ حدیبیہ کے بعد صرف دو سال کے اندر پیغمبر اسلام کے پیروؤں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی کہ صرف تعداد ہی مکہ کی پر امن فتح کے لیے کافی ہوگئی۔

صلح حدیبیہ کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ قریشِ مکہ کی طرف سے جنگ کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ اب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے مشن کو پورے عرب میں پھیلا سکیں۔ اِس سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ پیغمبر اسلام کا دعوتی پیغام تمام عرب قبائل میں پھیل گیا تھا۔ عمومی طور پر لوگوں کے دلوں میں توحید کے لیے نرم گوشہ (soft corner) پیدا ہو چکا تھا، لیکن قریش سے حالتِ جنگ قائم ہونے کی بنا پر پیغمبر اسلام کو یہ موقع نہیں مل رہا تھا کہ آپ کھلے طور پر اِس دعوتی امکان کو استعمال کریں۔ اب آپ نے

یہ کیا کہ مدینہ سے تمام عرب قبائل کی طرف وفود بھیجنے شروع کیے۔وفود کا یہ طریقہ بھی قدیم زمانے میں ایک نیا طریقہ تھا۔یہ طریقہ کامیاب ہوا اور بہت کم مدت میں پورا عرب اسلامائز ہوگیا۔

پیغمبر اسلام کا مشن

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم انسان کی لمبی تاریخ کی ایک درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔آپ سے پہلے کثیر تعداد میں خدا کے پیغمبر آئے۔اِن پیغمبروں کے زمانے میں بلاشبہہ توحید کا فکری اظہار رہا،لیکن توحید کی بنیاد پر عملاً کوئی فکری انقلاب برپا نہ ہوسکا۔اِسی بنا پر پچھلے پیغمبروں کا لایا ہوا دین محفوظ بھی نہ رہا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے اللہ نے ایک نئی منصوبہ بندی کی۔وہ منصوبہ بندی یہ تھی کہ صحرائی ماحول میں ایک نئی نسل پیدا کی جائے جس کے افراد اپنی اصل فطرت پر قائم ہوں۔اِسی نسل میں پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا اور آپ کی دعوتی جدوجہد کے ذریعے اِسی نسل کے اندر سے وہ افراد پیدا ہوئے جن کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔

رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے تاریخ میں جو انقلاب آیا،اُس کے دو پہلو تھے — ایک، یہ کہ اس کے ذریعے خدا کی کتاب محفوظ ہوگئی۔پیغمبر کے ذریعے انسانی زندگی کا ایک مستند ماڈل (authentic model) تیار ہوگیا۔خدا کے دین کی ایک مستند تاریخ بن گئی، جب کہ اِس سے پہلے خدا کے دین کی کوئی مستند تاریخ نہیں بنی تھی، وغیرہ۔

رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے جو عظیم انقلاب آیا، اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اس کے ذریعے تاریخ میں ایک نیا طاقت ور عمل (strong porcess) جاری ہوا جو آخر کار اُن تمام ترقیوں تک پہنچا جن کو عام طور پر اہلِ مغرب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔یہ تمام ترقیاں خدا کے دین کے موافق ترقیاں تھیں۔اِن ترقیوں کے ذریعے انسان کو شکر کا اعلیٰ فریم ورک ملا۔اِن ترقیوں کے ذریعے معرفت کے آفاقی دروازے کھلے۔اِن ترقیوں کے ذریعے حق کی عالمی اشاعت کے ذرائع حاصل ہوئے، وغیرہ۔

غیر خدا پرست انسان کی تائید

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اظہارِ دین اور اتمامِ نور کا جو خدائی منصوبہ تھا، وہ ایک عظیم عالمی منصوبہ تھا۔ وہ اتنا بڑا منصوبہ تھا کہ صرف اہلِ ایمان کی مدد سے وہ انجام نہیں پا سکتا تھا۔ اللہ تعالی نے اِس انقلاب کو یقینی بنانے کے لیے یہ کیا کہ اہلِ ایمان کے علاوہ، دوسرے گروہوں سے تائید (support) کا کام لیا۔ اسلام کی تاریخ میں اِس طرح کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ یہاں وضاحت کے لیے صرف دو مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت 610 عیسوی میں مکہ میں ہوئی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، یہاں تائید کا ایک انوکھا معاملہ پیش آیا۔ مکہ میں قریش کے نام سے ایک قبیلہ تھا جو کعبہ کا متولی تھا۔ اُس نے اپنی سیادت کی توسیع کے لیے یہ کیا کہ عرب کی سرزمین میں موجود تمام قبائل کے بت لاکر کعبہ کی عمارت میں رکھ دیے۔ اِس طرح دھیرے دھیرے کعبہ تمام عرب قبائل کا ایک عبادتی مرکز بن گیا۔ ہر قبیلے کے لوگ اپنے بت کی زیارت اور پرستش کے لیے مکہ آنے لگے۔ اِس طرح مکہ نے تمام عرب قبائل کے لیے مقامِ اجتماع کی حیثیت اختیار کرلی۔ تمام عرب قبائل کے لوگ مسلسل طور پر مکہ آنے لگے۔ اِس طرح پیغمبر اسلام کو یہ موقع مل گیا کہ وہ مکہ میں رہتے ہوئے تمام عرب قبائل میں اپنا مشن پھیلا سکیں — قریش اُس وقت ایک مشرک قبیلے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اِس کے باوجود اللہ تعالی نے اُن سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے موحدانہ مشن کی تائید کا کام لیا۔

اہلِ مغرب کے ذریعے تائید

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن میں غیر اہلِ ایمان کی تائید کا دوسرا بڑا واقعہ وہ ہے جو بعد کے زمانے میں پیش آیا۔ یہ اہلِ مغرب کے ذریعے تائید فراہم کرنے کا واقعہ تھا۔ یہ واقعہ مغرب کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد پیش آیا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ (14:34)۔ اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے انسان کو اس کی ضرورت کی تمام چیزیں دے دی ہیں۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ

قدیم زمانے میں انسان کو یہ اشیاءِ ضرورت صرف محدود طور پر حاصل ہوئی تھیں۔ جو چیزیں دنیا میں فطری طور پر آغازِ تخلیق سے پائی جاتی تھیں، صرف اُن چیزوں تک انسان کی رسائی ہوسکی۔ مثلاً سواری کے لیے گھوڑا، وغیرہ۔ دوسری چیزیں وہ تھیں جن کے حصول کے لیے ٹکنالوجی کی دریافت ضروری تھی۔ قدیم زمانے میں انسان اِس ٹکنالوجی کو دریافت نہ کرسکا، اِس لیے وہ اِس دوسری قسم کی اشیاءِ ضرورت کو حاصل کرنے سے محروم رہا۔

یہ ٹکنالوجی صرف مغربی تہذیب کے ذریعے دریافت ہوئی اور پھر ضرورت کی بے شمار نئی چیزیں انسان کے لیے قابلِ حصول ہوگئیں۔ یہ اشیاءِ ضرورت صرف اشیاءِ ضرورت نہ تھیں، بلکہ وہ شکرِ خداوندی کے نئے اور عظیم تر آئٹم کی حیثیت رکھتی تھیں۔

اِسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر کا مشن سارے اہلِ عالم کے لیے ہے (25:1)۔ لیکن پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کے زمانے میں مشن کا یہ عالمی ابلاغ عملاً ممکن نہ ہوسکا۔ کیوں کہ اس کے لیے عالمی کمیونکیشن کی ضرورت تھی اور قدیم زمانے میں یہ عالمی کمیونکیشن وجود میں نہیں آیا تھا۔ عالمی کمیونکیشن کے ذرائع موجودہ زمانے میں پہلی بار اہلِ مغرب نے دریافت کیے۔ یہ اہلِ مغرب کی طرف سے پیغمبرانہ مشن کی خصوصی تائید کا ایک معاملہ تھا۔

اِسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آفاق اور انفس میں اللہ کی آیات (signs) چھپی ہوئی ہیں۔ یہ آیات ظاہر ہوکر انسان کے لیے تبیینِ حق کا ذریعہ بنیں گی۔ یہ گویا کائناتی سطح پر اعلیٰ معرفت کے ظہور کی پیشگی خبر تھی، مگر قدیم زمانے میں اس کا ظہور نہ ہوسکا۔ اِس کا ظہور پہلی بار موجودہ زمانے میں اہلِ مغرب کی سائنسی دریافتوں کے ذریعے ہوا۔ یہ بھی غیر اہلِ ایمان کی طرف سے پیغمبرِ اسلام کے مشن کی تائید کا ایک اہم معاملہ تھا۔

یہ خارجی تائید اپنے طریقے کے اعتبار سے، عین وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں آؤٹ سورسنگ (outsourcing) کہا جاتا ہے۔ پیغمبرانہ مشن کے لیے یہ خارجی تائید کوئی اتفاقی معاملہ نہ تھا، بلکہ وہ ایک ایسا معاملہ تھا جو اللہ کی طرف سے پیشگی طور پر مقدر کردیا گیا تھا۔ اس حقیقت کو

ایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إن الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر (صحيح البخاري، رقم الحديث: 3062)- اِس حدیث میں موید کے لیے 'فاجر' کا لفظ استعمال ہوا ہے- فاجر کا مطلب ہے — بدکردار (sinner)- اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے پیغمبر کے مشن کی خارجی تائید کا جو کام ہے، وہ صرف مخلصین اور مومنین کے ذریعے نہیں ہوگا، بلکہ وہ ایسے افراد کے ذریعے بھی ہوگا جو اخلاقی اعتبار سے بدکردار اور گناہ گار ہوں گے-

مذکورہ دونوں واقعات پیغمبرانہ مشن کے لیے عظیم تائیدی واقعات تھے، مگر یہ دونوں واقعات اہلِ ایمان کی تائید سے پیش نہیں آئے، بلکہ وہ ایسے لوگوں کے ذریعے پیش آئے جو فقہ اسلامی کی اصطلاح میں "مشرک اور فاجر" تھے- فاجر شخص کے ذریعے تائیدِ دین کے یہ واقعات صرف تائید کے واقعات نہیں ہیں، بلکہ اِسی کے ساتھ وہ دلیلِ نبوت بھی ہیں-

اہلِ مغرب اور مغربی تہذیب

موجودہ زمانے میں مسلم مصنفین نے ہزاروں کی تعداد میں ایسی کتابیں اور مقالات شائع کیے ہیں جن کا موضوع اہلِ مغرب یا مغربی تہذیب ہوتا ہے- اِس قسم کی تحریریں عربی، اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں چھپی ہیں اور اُن کو کسی بھی مسلم کتب خانے میں دیکھا جاسکتا ہے- مثال کے طور پر چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

جاهلية القرن العشرين، محمد قطب،

دار الشروق، القاهرة 1993، عدد الصفحات: 292

عالمِ اسلام دجالی تہذیب کی زد میں، محمد موسی بھٹو، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، صفحات: 188

Islam at the Crossroads, Leopold Muhammad Asad

اِس قسم کی کتابوں میں مغرب اور مغربی تہذیب کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ تمام تر منفی تصویر ہے- اِس قسم کی کتابوں کا مشترک خلاصہ یہ ہے کہ مغرب اخلاقی پستی کی آخری حد تک پہنچ چکا ہے- اِن تحریروں کے مطابق، مغرب نام ہے — مادیت اور اباحیت اور ہوس پرستی اور لادینیت کا- گویا اہلِ مغرب کا کیس

وہی ہے جس کو حدیث میں 'الرجل الفاجر' کہا گیا ہے، یعنی بدکردار اور گناہ گار۔

اب بالفرض اگر یہ درست ہو کہ اہلِ مغرب کا کیس ''فاجر'' انسان کا کیس ہے، تب بھی مسلم مقررین اور محررین اِس معاملے میں کامل طور پر غلط قرار پائیں گے۔ کیوں کہ اِس معاملے کا دوسرا معلوم پہلو یہ ہے کہ یہی اہلِ مغرب ہیں جنھوں نے بے پناہ محنت کے بعد اُن تمام تائیدی چیزوں کو دریافت (discover) کیا جن کا ذکر بطور پیشین گوئی قرآن میں کیا گیا تھا۔ گویا کہ یہی وہ مویّد لوگ ہیں جو حدیث کی مذکورہ پیشین گوئی کا مصداق ہیں۔ ایسی حالت میں مسلم مقررین اور محررین کا فرض تھا کہ وہ کہتے کہ اہلِ مغرب کے ''فاجر'' ہونے کے باوجود ہمیں اُن کے اِس کنٹری بیوشن کا اعتراف کرنا ہے، کیوں کہ یہی لوگ ہیں جنھوں نے تائید دین کے وہ تمام اسباب مہیا کیے ہیں جو آج ہمارے لیے دینِ خداوندی کی نسبت سے بے حد ضروری ہیں۔ یہ اسباب ہمارے لیے شکر اور معرفت کا اعلیٰ آئٹم ہیں اور اِسی کے توسط سے پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ دعوت الی اللہ کے کام کو عالمی سطح پر انجام دیا جا سکے۔

تاریخ کا مثبت تصور

تاریخ کا مطالعہ کرنے والے عام طور پر تاریخ کے بارے میں منفی رائے رکھتے ہیں۔ ان کو پوری تاریخ فساد اور خوں ریزی کا ایک جنگل معلوم ہوتی ہے۔ آدم کی تخلیق کے وقت فرشتوں نے بھی یہ شبہہ ظاہر کیا تھا (2:30)۔

اللہ تعالیٰ نے ایک مظاہرے کے ذریعے فرشتوں کو بتایا کہ تم پورے انسانی مجموعے کے اعتبار سے تاریخ کو دیکھ رہے ہو، اِس لیے تاریخ تم کو فساد اور خوں ریزی کا جنگل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن تم تاریخ کو افراد کے اعتبار سے دیکھو، پھر تم کو نظر آئے گا کہ تاریخ کے ہر دور میں بہترین افراد پیدا ہورہے ہیں۔ یہی استثنائی افراد تاریخ کا حاصل ہیں۔

تاریخ کے مطالعے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مطالعہ کرنے والا یہ کرے کہ وہ انسان کی طرف سے آزادی کے غلط استعمال کو الگ کرکے تاریخ کا مشاہدہ کرے۔ خالق نے چوں کہ انسان کو آزادی دی ہے، اِس لیے آزادی کو غلط استعمال کرنے کے نتیجے میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

یہی وہ چیز ہے جس کو فلاسفہ عمومی حیثیت دے کر، پرابلم آف اول (problem of evil) کہتے ہیں۔مگر انسان کی آزادی مصلحتِ امتحان کی بنا پر ہے، اِس لیے تاریخ کے مطالعے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آزادی کے غلط استعمال کے پہلو کو الگ کر کے تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔یہ حکمت تاریخ کے ہر دور کے لیے ضروری ہے، سیکولر تاریخ کے دور کے لیے بھی اور اسلامی تاریخ کے دور کے لیے بھی۔

تاریخ میں خدائی مداخلت

1۔ ہاجرہ اور اسماعیل کے ذریعے عرب کے صحرا میں ایک نئی نسل بنانا بعد کو اِسی نسل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب پیدا ہوئے۔

2۔ کعبہ کا تمام قبائل کے بتوں کا مرکز بن جانا۔اِس طرح مکہ میں آل عرب اجتماعات (All Arab Assembly) کا وقوع ممکن ہو جانا۔

3۔ یمن کے حاکم ابرہہ کا کعبہ پر حملہ، مگر اس کی ناکامی کی بنا پر کعبہ کی اجتماعی حیثیت کا محفوظ رہنا۔

4۔ مکہ میں تیرہ سالہ دعوتی جدوجہد کے ذریعے تمام صالح افراد کا اسلام میں داخل ہو جانا۔ اِنھیں منتخب افراد کو قرآن میں خیر امت (3:110) کہا گیا ہے۔

5۔ ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ بدر کا پیش آنا اور اِس غزوہ میں فرشتوں کی مدد کے ذریعہ تمام سرکش افراد کا قتل کیا جانا۔

6۔ ہجرت سے پانچ سال پہلے جنگِ بُعاث میں دو قبیلوں کے درمیان جنگ ہونا، اِس جنگ میں قبائلی سرداروں کا زور ٹوٹ جانا۔

7۔ حدیبیہ (6 ہجری) کی یک طرفہ صلح کے بعد سارے عرب میں امن قائم ہونا اور سارے عرب میں اسلام کی اشاعت۔

8۔ فتح مکہ کے بعد عرب قبائل میں اسلام کے لیے نرم گوشہ پیدا ہونا، اس کے بعد عام الوفود کے ذریعے تمام قبائل کو تیزی سے اسلام میں داخل کر لینا۔

9۔ بازنطینی ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کے درمیان جنگی ٹکراؤ ہونا اور اِس دو طرفہ جنگ میں

دونوں کا آخری حد تک کمزور ہو جانا۔

10۔ صلیبی جنگوں کے بعد مخصوص اسباب کے تحت، اہلِ مغرب کا سائنسی مطالعے کی طرف راغب ہونا اور اسلام کے موافق، فطرت کے حقائق کا انکشاف۔

اوپر دس ایسے عوامل (factors) کو دکھایا گیا ہے جنھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن میں سپورٹنگ فیکٹرس (supporting factors) کا رول انجام دیا۔ یہ تمام اسباب غیر عادی (unusual) قسم کے تھے جو بلاشبہہ پیغمبر کے اپنے اختیار سے باہر تھے، حتی کہ بظاہر پیغمبر اسلام نے ان کی بابت سوچا بھی نہ تھا۔ اِن عوامل کی مدد کے بغیر یہ ممکن نہ تھا کہ پیغمبر اسلام اپنے مشن میں ایسی غیر معمولی کامیابی حاصل کر سکیں۔ یہ ناقابلِ توجیہہ واقعہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ پیغمبر اسلام کو اپنے مشن میں اللہ کی خصوصی مدد حاصل تھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے تین مرحلے تھے — پہلا مرحلہ مردانِ کار یا ٹیم کی تیاری کا مرحلہ تھا۔ یہ پہلا مرحلہ آپ کی پیدائش سے پہلے لمبی مدت میں بنو اسماعیل کی صورت میں تشکیل پایا۔ دوسرا مرحلہ مختصر مرحلہ ہے جو پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کی زندگی میں پورا ہوا۔ تیسرا مرحلہ دوبارہ لمبی مدت کا مرحلہ تھا جو کہ مغربی تہذیب کی صورت میں اپنی تکمیل تک پہنچا۔

نورِ ہدایت کا اتمام

پیغمبرانہ مشن کے سلسلے میں ایک منصوبۂ الٰہی کو اظہارِ دین کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اظہارِ دین اور اتمامِ نور کی آیت قرآن کی تین سورتوں میں آئی ہے۔ سورہ الصّف کے الفاظ یہ ہیں:

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ

(61:8-9) یعنی وہ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں، حالاں کہ اللہ اپنے نور کا اتمام کر کے رہے گا، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اللہ ہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ، تا کہ وہ اُس کو سب دینوں پر غالب کر دے، خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

قرآن کی اِس آیت میں اظہارِ دین سے کچھ لوگ سیاسی غلبہ مراد لیتے ہیں، مگر آیت کے الفاظ سے اِس مفہوم کا کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کی آیت میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہ لیظهره علی الدین کلّه ہے، نہ کہ لیظهره علی الأرض کلّها۔ یعنی اِس آیت میں جس غلبہ کا ذکر ہے، وہ زمین پر ہونے والا غلبہ نہیں ہے، بلکہ وہ دین یا اَدیان پر ہونے والا غلبہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اِس سے مراد فکری اور نظریاتی غلبہ ہے، نہ کہ سیاسی اور حکومتی غلبہ۔ دوسرے لفظوں میں، اِس سے مراد غلبہ بہ مقابلہ آئڈیالوجی ہے، نہ کہ غلبہ بہ مقابلہ سیاسی اقتدار۔ اِسی طرح قرآن کی مذکورہ آیت میں 'متمّ نوره' کا لفظ آیا ہے۔ قرآن میں 'متم حُکمه' کا لفظ نہیں آیا ہے، یعنی اِس سے مراد نور کا اتمام ہے، نہ کہ حکومت کا اتمام۔ اِس اتمام کا مطلب یہ نہیں کہ ابھی مسلمانوں کی حکومت مکہ مدینہ میں قائم ہوئی ہے، آئندہ ان کی حکومت سارے عالم میں قائم ہو جائے گی۔

پیغمبر کا مشن اصلاً ایک غیر سیاسی مشن (non-political mission) ہوتا ہے۔ پیغمبر کے مشن کو بتانے کے لیے قرآن میں جو الفاظ آئے ہیں، اُن میں سے کوئی بھی لفظ سیاسی لفظ نہیں۔ مثلاً انذار، تبشیر، ابلاغ، دعوت، شہادت، وغیرہ۔ ایسی حالت میں پیغمبر کے مشن کے اظہار یا اتمام کو بتانے کے لیے وہی تعبیر درست ہوسکتی ہے جو پیغمبرانہ مشن کی روح کے مطابق ہو، اور وہ بلاشبہہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے عالمی سطح پر خدا کے پیغام کی توسیع واشاعت۔

پیغمبر کے مشن کی سیاسی تعبیر کرنا یا اس کو حکومت کی اصطلاحات میں بیان کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کی تردید کے ہم معنی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان اور دوسرے انسانوں کے درمیان جو مساوات (equation) ہے، وہ حاکم اور محکوم کی مساوات ہے، جب کہ صحیح تصور کے مطابق، اہلِ ایمان اور دوسرے انسانوں کے درمیان جو مساوات ہے، وہ داعی اور مدعو کی مساوات ہے، نہ کہ حاکم اور محکوم کی مساوات۔ اِس تصور کے مطابق، پیغمبر کے مشن کا اظہار اور اتمام بہ اعتبارِ ''نور'' متعین کیا جائے گا، نہ کہ بہ اعتبارِ حکومت، اور وہ یہ ہے کہ پیغمبر کے مشن کے ساتھ ایسے اسباب ووسائل جمع ہوں جو پیغمبر کے مشن کی عمومی اشاعت میں تائید کا کام دیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبرانہ مشن کی اشاعت کے لیے صرف

روایتی وسائل موجود تھے۔ اِس لیے ایسا ہوا کہ اگر چہ پیغمبر کا مشن ایک عالمی مشن تھا، لیکن وہ وسائل کی محدودیت کی بنا پر اپنے ابتدائی دور میں پورے عالم تک پہنچ نہ سکا۔

قرآن کی مذکورہ آیت (61:8) ایک اعتبار سے پیشین گوئی ہے۔ اِس آیت میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ مستقبل میں ایسے حالات پیدا کرے گا، جب کہ تبلیغِ قرآن کا عالمی نشانہ پورا کیا جاسکے۔ رسول اور اصحابِ رسول کے زمانے میں جو انقلاب آیا، اس کے ذریعے دراصل تاریخ میں ایک نیا پراسس جاری کرنا تھا۔ یہ پراسس نہایت طاقت ورصورت میں جاری ہوا، یہاں تک کہ بیسویں صدی میں وہ اپنے نقطۂ انتہا (culmination) تک پہنچ گیا۔

موجودہ زمانے کو ایج آف کمیونکیشن (age of communication) کہا جاتا ہے۔ یہ ایج آف کمیونکیشن کیا ہے۔ یہ دراصل دعوت بذریعہ روایتی ذرائع کو دعوت بذریعہ ٹکنالوجی کے دور میں پہنچانا ہے۔ موجودہ زمانے میں کمیونکیشن کے جو ذرائع پیدا ہوئے ہیں، انھوں نے دعوت بذریعہ روایتی ذرائع کو دعوت بذریعہ کمیونکیشن کے دور میں پہنچا دیا ہے۔ اب یہ پوری طرح ممکن ہوگیا ہے کہ پیغمبرانہ دعوت کی اشاعت عالمی سطح پر انجام دی جائے۔ جدید ٹکنالوجی اور دوسرے معاون حالات کے نتیجے میں آج یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کسی سیاسی اقتدار یا کسی پولٹکل ایمپائر کے بغیر غیر سیاسی دائرے میں اسلامی دعوت کا ایک عالمی ایمپائر قائم کیا جاسکے۔ اِس ایمپائر کو غیر سیاسی دعوہ ایمپائر (non-political dawah empire) کہا جاسکتا ہے۔ جدید کمیونکیشن اور پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کو استعمال کرکے عالمی دعوت کی اُس پیشین گوئی کو واقعہ بنایا جاسکے جس کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (25:1)۔

ربانی تہذیب کا ظہور

رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے تاریخ میں جو انقلاب آیا، وہ محدود طور پر صرف ایک سیاسی واقعہ نہ تھا۔ اُس کا تعلق پوری تاریخ بشری سے تھا۔ جس چیز کو قرآن میں ''اتمامِ نور'' کہا گیا ہے، وہ دوسرے لفظوں میں تہذیبِ ربانی (divine civilization) کو قائم کرنے کا معاملہ تھا۔ اللہ کو یہ

مطلوب تھا کہ اس کی کتاب (قرآن) محفوظ ہوجائے۔ تاریخ میں ایسے انقلابات ظہور میں آئیں جن کے نتیجے میں دنیا میں پرنٹنگ پریس کا دور آئے۔ فطرت میں چھپے ہوئے راز منکشف ہوں، تاکہ انسان کو علمی سطح پر خالق کی معرفت حاصل ہو۔ کمیونکیشن کے ذرائع دریافت ہوکر انسان کے استعمال میں آسکیں۔ اِسی طرح یہ ہو کہ دنیا میں مذہبی آزادی کا دور آئے۔ دینِ حق کی عالمی اشاعت ممکن ہوجائے۔ معرفت کے تمام چھپے ہوئے خزانوں پر انسان کو دسترس حاصل ہوجائے، وغیرہ۔

اِس پورے معاملے کو تہذیب ربانی کے ظہور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے یہی انقلابی واقعہ پیش آیا اور فطرت کے قانون کے مطابق، مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اکیسویں صدی تک پہنچا جو اس کی تکمیل کا مرحلہ ہے۔ تاہم تکمیل کا یہ مرحلہ بہ اعتبار امکان ہے، نہ کہ بہ اعتبار واقعہ۔ ربانی تہذیب کیا ہے، وہ خدا کا قائم کردہ ایک بامعنی تسلسل ہے جو کسی انقطاع کے بغیر تاریخِ انسانی میں مسلسل طور پر جاری ہے۔

اب اہلِ اسلام کا یہ فرض ہے کہ وہ تاریخ کے اشارے کو سمجھیں، وہ پیدا شدہ مواقع کو استعمال کرکے دینِ توحید کو پرامن انداز میں تمام عالم تک پہنچا دیں۔ یہی پیغمبرانہ مشن کی وہ تکمیل ہے جس کی پیشین گوئی حدیثِ رسول میں کی گئی تھی۔ اِس عالمی رول کو ادا کرنے کی صرف ایک ہی شرط ہے، وہ یہ کہ اہلِ اسلام قوموں کے خلاف، نفرت اور تشدد کے کلچر کو یک طرفہ طور پر ختم کردیں اور کسی شرط کے بغیر پرامن دعوتی کلچر کو اختیار کرلیں۔

اسلام کی دریافت

قرآن کی سورہ المائدہ میں ایک آیت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دورِ آخر میں نازل ہوئی۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے: اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۚ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (5:3) یعنی آج منکر تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہوگئے، پس تم ان سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔

قرآن کی اِس آیت میں اکمالِ دین یا تکمیلِ دین (completion of religion) سے مراد فہرستِ احکام کی تکمیل نہیں ہے اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اسلام حکومتی معنوں میں غالب ہوگیا ہے۔ اِس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام کی راہ کے موانع (obstacles) ختم ہوگئے۔ خود آیت کے الفاظ سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ کیوں کہ آیت میں اکمالِ دین کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ اب خشیتِ انسانی (human fear) کا دور ختم ہوگیا۔ اب خدا کے دین کے حق میں ایسے اسباب جمع ہوگئے ہیں جو اُس کو اِس سے محفوظ کر دیتے ہیں کہ وہ ماضی کی طرح انسانی رکاوٹوں اور مذہبی جبر کا شکار بنے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں ہزاروں سال کے درمیان مسلسل پیغمبر آتے رہے (23:44)۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، کسی بھی پیغمبر کی تعلیمات محفوظ نہ رہ سکیں، حتی کہ اِن پیغمبروں کا مدوّن تاریخ (recorded history) میں کوئی ریفرنس بھی موجود نہیں۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ پیغمبروں کے مشن کو محفوظ رکھنے کے لیے جو تائیدی عناصر (supporting elements) درکار تھے، وہ ان کو حاصل نہ ہو سکے۔ پیغمبر آخر الزماں محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب کے ساتھ اللہ تعالی نے اِن تائیدات کو جمع کر دیا۔ اِس طرح یہ ممکن ہوا کہ آپ کی تعلیمات ابدی طور پر محفوظ ہو جائیں۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں

اِسی معاملے کو اِن الفاظ میں بیان فرمایا کہ اب خدا کا دین خشیتِ انسانی کے دور سے باہر آ گیا ہے۔

پچھلے پیغمبروں کی تعلیمات کے محفوظ نہ ہونے کا سبب کیا تھا، اس کا سبب یہ تھا کہ حفاظت کا یہ کام اسباب کے ذریعے ہو سکتا تھا۔ مگر پچھلے پیغمبروں کے ساتھ یہ اسباب جمع نہیں ہوئے۔ مثلاً کسی پیغمبر کا کام یا تو شخصی اعلان تک محدود رہا، یا یہ ہوا کہ صرف چند افراد اُن کا ساتھ دینے والے بنے، اور صرف چند افراد حفاظتِ دین کے لیے کافی نہیں۔ اللہ تعالی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے ساتھ ایک خصوصی معاملہ یہ کیا کہ پیشگی طور پر ایک موافق نسل تیار کی۔ نسل سازی کا یہ کام حضرت ابراہیم اور حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کے ذریعے عرب کے صحرا میں کیا گیا۔

عرب کے صحرا میں نسل سازی کا یہ مشن تقریباً ڈھائی ہزار سال تک چلتا رہا، اس کے بعد ایک نئی نسل تیار ہوئی جس کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ اِسی نسل میں 570 عیسوی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ اِس نسل کے درمیان آپ نے پیغمبر کی حیثیت سے تقریباً 23 سال تک کام کیا۔ ان میں سے عورتوں اور مردوں کی ایک بڑی تعداد آپ کے دین میں داخل ہوگئی۔ اِس طرح وہ گروہ بنا جس کو اصحاب کہا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق، اصحابِ رسول (عورت اور مرد) کی تعداد تقریباً 2 لاکھ تھی۔ اصحابِ رسول کی اِسی جماعت کے ذریعے وہ موافق اسباب فراہم ہوئے جن کو ہم نے تائیدی عناصر (supporting elements) کا نام دیا ہے۔

اصحابِ رسول کا رول

اصحابِ رسول کی یہی جماعت ہے جس نے پہلی بار اِس کو ممکن بنایا کہ خدا کے دین کا ایک محفوظ ایڈیشن تیار ہو گیا۔ اِس سلسلے میں اصحابِ رسول کے رول کے مختلف پہلو ہیں۔ اِس کا ایک پہلو یہ ہے کہ پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ایک تاریخی شخصیت بن جائے۔ قدیم دور میں جو پیغمبر آئے، اُن کی تعداد روایات میں تقریباً ایک لاکھ 24 ہزار بتائی گئی ہے، لیکن معروف تاریخی معیار کے مطابق، اِن میں سے کسی بھی پیغمبر کی حیثیت ''تاریخی پیغمبر'' کی نہیں ہے، حتی کہ حضرت مسیح جو پیغمبر اسلام سے قریب تر زمانے میں آئے، ان کے بارے میں بھی برٹرینڈ رسل (وفات: 1970) نے

لکھا ہے کہ — تاریخی طور پر یہ امر سخت مشتبہ ہے کہ مسیح کا کبھی وجود بھی تھا:

Historically, it is quite doubtful whether Christ ever existed at all. (*Why I Am Not A Christian,* 1967, Touchstone, UK, p. 266)

تاریخ میں پیغمبروں کا اندراج نہ ہونے کا سبب کیا تھا۔ اِس کا سبب تاریخ نگاری کا قدیم ذوق تھا۔ ابن خلدون (وفات: 1406) سے پہلے، تاریخ کو بادشاہوں کی تاریخ کے ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ قدیم پیغمبروں کے ساتھ چوں کہ حکومت اور سیاست کے واقعات جمع نہیں ہوئے، اِس لیے ان کو تاریخی طور پر ناقابلِ ذکر سمجھ لیا گیا۔

اِس صورتِ حال کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے گویا مورخین (historians) کی ایک نئی نسل (generation) تیار کی۔ یہ صحابہ اور تابعین تھے جنھوں نے اِس معاملے میں عملاً وہ رول انجام دیا جس کو اِس سے پہلے پروفیشنل مورخین انجام دیتے تھے۔ صحابہ اور تابعین نے پیغمبر اسلام اور آپ کی تعلیمات سے متعلق تمام واقعات کا مستند ریکارڈ تیار کیا، پہلے حافظے کی صورت میں اور پھر تحریر کی صورت میں۔ یہی وہ محفوظ ریکارڈ ہے جس کو آج قرآن اور حدیث اور سیرت کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہ ریکارڈ پہلے صحابہ کے ذریعے تیار ہوا، پھر تابعین اور تبع تابعین کے ذریعے اس کا تسلسل جاری رہا۔ اِسی طرح امت کی بعد کی نسلوں نے اِس کام کی تدوین میں مزید کارنامے انجام دیے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں پریس کا دور آ گیا۔ اب پیغمبر اسلام اور آپ کے متعلق تمام معلومات کا تاریخی ریکارڈ مطبوعہ کتابوں کی صورت میں محفوظ ہو گیا۔ اِس طرح ایسا ہوا کہ پیغمبر اسلام کو استثنائی طور پر ایک مستند تاریخی پیغمبر کا درجہ حاصل ہو گیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس حیثیت کا اعتراف خود سیکولر مورخین نے کھلے طور پر کیا ہے۔ مثال کے طور پر فرانسیسی مستشرق ارنسٹ ریناں (Joseph Ernest Renan) جس کی وفات 1892 میں ہوئی، اس نے 1851 میں ایک مقالہ شائع کیا۔ اس کا عنوان یہ تھا:

Muhammad and the Origins of Islam.

اِس مقالے میں ارنسٹ رینان نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ — بڑے مذاہب کے دوسرے بانیوں کے برعکس، پیغمبر محمد واحد شخص ہیں جو کہ تاریخ کی کامل روشنی میں پیدا ہوئے:

Unlike the other founders of major religions, the Prophet Muhammad was born in the full light of history.

پیغمبر اسلام کا مشن

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی مشن کیا تھا، اس کو قرآن کی دو آیتوں میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ، هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (61:8-9) یعنی وہ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے نور کو اپنی پھونک سے بجھا دیں، حالاں کہ اللہ اپنے نور کو ضرور مکمل کرے گا، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اللہ ہی نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ، تاکہ وہ اس کو تمام دین پر غالب کردے، خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

قرآن کی اِن آیتوں میں دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں: ہدیٰ اور دین۔ اِسی کے ساتھ اِن میں دو اور لفظ استعمال کیے گئے ہیں: اتمام اور اظہار۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اتمام کا تعلق ہدیٰ سے ہے اور اظہار کا تعلق دین سے۔ اِس میں دراصل اللہ کے دو مطلوب کا ذکر ہے۔ ایک ہے، نورِ ہدایت کا اتمام، اور دوسرا ہے، دین خداوندی کا اظہار و غلبہ۔

نورِ ہدایت کیا ہے، وہ اصلاً دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ دو چیزیں قرآن اور سنتِ رسول ہیں۔ قرآن، اللہ کے دین کا نظریاتی متن (ideological text) ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب تھا کہ قرآن کا مستند ہدایت نامہ اپنی کامل صورت میں محفوظ ہوجائے، تاکہ قیامت تک کے انسانوں کے لیے وہ خدائی ہدایت کو جاننے کا مستند ذریعہ ہو۔ اِس مطلوب الٰہی کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) یعنی قرآن کو ہم نے

اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

قرآن کی حفاظت مکمل طور پر ایک پر امن کام تھا۔ اللہ تعالی نے ایسے اسباب پیدا کیے کہ قرآن کامل طور پر ایک محفوظ کتاب بن جائے، تا کہ وہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کے لیے خدا کی ہدایت کو معلوم کرنے کا مستند ماخذ بن سکے۔ یہ کام مکمل طور پر انجام پا گیا۔ اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج پریس کے دور میں قرآن کے چھپے ہوئے نسخے تمام دنیا میں اس طرح موجود ہیں کہ ہر عورت اور مرد جب چاہے، اس کو حاصل کر سکے۔

حفاظتِ قرآن کے اِس واقعے کا اعتراف سیکولر محققین نے بھی کھلے طور پر کیا ہے۔ مثال کے طور پر اسکاٹش مستشرق سر ولیم میور (Sir W. Muir) جس کی وفات 1905 میں ہوئی، اس نے قرآن کی بابت لکھا ہے کہ — غالباً دنیا میں کوئی دوسری کتاب ایسی موجود نہیں جو کہ 12 صدیوں تک اپنی کامل حفاظت کو برقرار رکھے:

There is probably, in the world, no book which has remained for 12 centuries with so pure a text.

(*The Life of Muhammad from Original Sources,* p. xxiii)

قرآن کے بعد، خدا کے نورِ ہدایت کا دوسرا جزء وہ ہے جس کو قرآن میں پیغمبر خدا کا اسوہ حسنہ (33:21) کہا گیا ہے، یعنی عملی اعتبار سے خدا پرستانہ زندگی گزارنے کا مستند نمونہ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک پُراز واقعات زندگی (eventful life) تھی۔ آپ کی زندگی میں ہر طرح کے حالات پیش آئے۔ آپ نے ہر صورت حال میں خدا پرستانہ زندگی کا عملی نمونہ قائم کیا۔ آپ کے اِس اعلی نمونے کو قرآن میں خلقِ عظیم (68:4) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی کے یہ نمونے حدیث اور سیرت کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

اسلام کا یہ پہلو اتنا زیادہ واضح ہے کہ سیکولر مورخین نے بھی کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔ اس کی ایک مثال برٹش اسکالر ڈیوڈ جارج ہاگرتھ (David George Hogarth) ہے، جس کی وفات 1927 میں ہوئی۔ اس نے اپنی ایک کتاب میں پیغمبر اسلام کے بارے میں لکھا ہے کہ —

پیغمبر اسلام کا روزمرہ کا سلوک خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس نے ایسی حیثیت اختیار کر لی جس کی اب تک لاکھوں لوگ اہتمام کے ساتھ پیروی کر رہے ہیں۔ انسانی نسل کے کسی طبقے کا کوئی آدمی یہ درجہ حاصل نہ کرسکا کہ ایک معیاری انسان کی حیثیت سے اِس طرح اس کا کامل اتباع کیا جائے:

> Serious or trivial, his daily behaviour has instituted a course which millions observe at this day with conscious mimicry. No one regarded by any section of the human race as perfect man has been imitated so minutely. (*Arabia,* p. 52)

ہُدیٰ سے مراد نظریاتی ماڈل ہے۔ خدا کی ہدایت کا یہ نظریاتی ماڈل قرآن اور سنتِ رسول کی شکل میں مستند طور پر محفوظ ہوگیا ہے۔ یہ نظریاتی ماڈل اب ہمیشہ کے لیے پیغمبر کا بدل ہے۔

اظہارِ دین

قرآن کی مذکورہ آیتوں میں دو چیزوں کا ذکر ہے — ہدیٰ اور دین۔ دونوں کی حیثیت ایسے مطلوب کی ہے جن کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے ذریعے حاصل کرنا مقدر تھا۔ لیکن آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا معاملہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہدیٰ سے مراد ایک نظریاتی مطلوب ہے، اور دین سے مراد ایک عملی مطلوب۔ جب قرآن کا متن محفوظ ہوگیا اور پیغمبر اسلام کا ماڈل حدیث اور سیرت کی کتابوں کے ذریعے مستند طور پر مدوّن ہوگیا تو اس کے بعد وہ مطلوب آخری طور پر حاصل ہوگیا جس کو آیت میں ہدیٰ کے لفظ میں بیان کیا گیا تھا۔ اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے سے اپنی ہدایت کا مستند ماخذ تیار کر دیا۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اِس خدائی ماخذ سے اپنے لیے ہدایت حاصل کرتا ہے یا ہدایت حاصل نہیں کرتا۔

اظہارِ دین کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ اِس معاملے میں اظہار، یعنی غلبہ مطلوب ہے، نہ کہ صرف نظریاتی معیار کا وجود میں آنا۔ اِس لیے اظہارِ دین سے ایک ایسا مطلوب مراد لیا جائے گا جو بالفعل وقوع میں آیا۔ بالفعل وقوع میں آنے سے کم درجے کی کوئی چیز اس کی تفسیر نہیں بن سکتی۔ اِس آیت میں اظہارِ دین سے حکومتی نظام یا قانونی نظام مراد نہیں لیا جاسکتا۔ اِس لیے کہ تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ

پیغمبر اسلام کے زمانے میں یا آپ کے بعد کامل معنوں میں ایسا کوئی نظام نہیں بنا اور نہ بن سکتا ہے، اِس لیے کہ اِس دنیا کو اللہ تعالی نے انسانی آزادی کے اصول پر بنایا ہے (18:29)۔ ایسی حالت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ یہاں معیاری معنوں میں کوئی کامل نظام بنایا جاسکے۔ امتحان کی مصلحت کے تحت دی ہوئی انسانی آزادی اِس طرح کے معیاری نظام کو قائم کرنے میں حتمی طور پر مانع ہے۔ اِس دنیا میں جب آئڈیل کا حصول ممکن نہیں تو آئڈیل کے حصول کو نشانہ بنانا بھی درست نہیں ہوسکتا۔

ایسی حالت میں، اظہارِ دین کی آیت میں دین کے اظہار کی ایسی تفسیر کرنی پڑے گی جو عملی طور پر وقوع میں آئی ہو۔ اِس اعتبار سے غور کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اِس آیت میں دین سے مراد شرعی دین نہیں ہے، بلکہ فطری دین ہے، اور اظہارِ دین کا مطلب ہے انسانی زندگی میں خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، حالتِ فطری کا قائم ہوجانا۔ دین کا یہ مفہوم قرآن کی ایک اور آیت میں موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (3:83)۔ اِس آیت میں دین سے مراد دینِ شرعی نہیں ہے، بلکہ دینِ فطری ہے، یعنی وہ دین جس پر تمام کائنات بالفعل قائم ہے۔ یہ دین فطری کیا ہے، وہ قرآن کی اِس آیت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے: الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ (67:2)۔

اصل یہ ہے کہ اللہ نے اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسان کو پیدا کرکے سیارہ ارض پر بسایا۔ انسان کو زمین پر بسانا بطور امتحان (test) تھا، تاکہ امتحانی حالات سے گزار کر احسن العمل افراد کا انتخاب کیا جائے، یعنی ایسے عورت اور مرد کا انتخاب جنھوں نے کامل آزادی کے باوجود اپنے آپ کو پوری طرح حدودِ الٰہی کا پابند بنایا، جنھوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال (misuse) نہیں کیا۔ یہی منتخب افراد وہ لوگ ہیں جن کو پوری تاریخ سے لے کر ابدی جنتوں میں بسایا جائے گا۔ زمین پر یہ آزادانہ ماحول اللہ کو لازمی طور پر مطلوب ہے۔ آزادی کے اِس نظام کو کوئی بھی شخص یا گروہ اگر منسوخ (abolish) کرے تو اللہ ہرگز اس کو قبول نہیں کرے گا، وہ ایسے افراد یا گروہ کا لازماً خاتمہ کردے گا۔

بادشاہت کے نظام کا خاتمہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت 610 عیسوی میں ہوئی۔ اُس وقت یہ حال تھا کہ ساری دنیا میں کچھ انسانوں نے بادشاہت کا نظام قائم کر دیا تھا۔ یہ شاہی نظام عملاً جبریت (despotism) کے ہم معنی تھا۔ اِس نظام نے انسانوں سے اُس آزادی کو چھین لیا تھا جو اللہ نے ان کو عطا کی تھی۔ یہ صورتِ حال اللہ کو مطلوب نہیں تھی، کیوں کہ وہ اللہ کے تخلیقی منصوبہ (creation plan of God) کی منسوخی کے ہم معنی تھا۔ اللہ تعالی نے پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ اِس جابرانہ نظام سے ٹکرا کر اس کو ختم کر دیں، تاکہ دنیا میں دوبارہ اللہ کی مطلوب حالتِ فطری قائم ہو جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اُس زمانے میں ایک طرف عرب میں ملکی سطح پر قبائلی نظام تھا۔ اِس قبائلی نظام نے بھی عملاً انسانی آزادی کو ختم کر رکھا تھا۔ اِس صورتِ حال کا اشارہ قرآن کی مختلف آیتوں میں کیا گیا ہے۔ مثلاً: أَرَءَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ (96:9) یعنی کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو منع کرتا ہے، ایک بندے کو جب کہ وہ نماز پڑھتا ہو۔

پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کا پہلا ٹکراؤ اس قبائلی نظام سے ہوا۔ اِس کے نتیجے میں محدود نوعیت کی کچھ جنگیں (limited wars) پیش آئیں۔ آخر کار 8 ہجری میں مکہ فتح ہوا، جو عرب کے قبائلی نظام کا مرکز تھا۔ فتح مکہ کے بعد سارے عرب میں قبائل کا زور ٹوٹ گیا اور آزادی کی حالت قائم ہوگئی۔ فتح مکہ کے بعد اصحاب رسول کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ اِس غلبہ کا مرکز مدینہ تھا۔ یہ غلبہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے حکومت قائم ہونے کے ہم معنی نہ تھا، بلکہ وہ صرف یہ تھا کہ انتظامیہ (administration) قبائلی سرداروں کے ہاتھ سے نکل کر اصحابِ رسول کے ہاتھ میں آ گیا۔

اِس اعتبار سے دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ عرب کے باہر اُس وقت دو بڑی شہنشاہتیں قائم تھیں۔ ایک، ساسانی ایمپائر (Sassanid empire) اور دوسرے، بازنتینی ایمپائر (Byzantine empire)۔ ساسانی ایمپائر کا دارالسلطنت عراق کا قدیم شہر ساسانیان (Ctesiphon) تھا اور بازنتینی ایمپائر کا دارالسلطنت ترکی کا شہر قسطنطنیہ (Constantinople) تھا۔

ساسانی ایمپائر دراصل اُس وقت کے رومن ایمپائر کا مشرقی بازو تھا۔ یہ دونوں ایمپائر عرب کے قریب واقع تھے اور وہ اُس وقت کی دنیا میں بادشاہت پر مبنی جبری نظام کے نمائندے بنے ہوئے تھے۔ اِن دونوں ایمپائر نے اللہ کی دی ہوئی آزادی کو عملاً منسوخ کررکھا تھا، جو کہ اللہ کو کسی حال میں مطلوب نہ تھا۔ بازنطینی سلطنت کا اقتدار 15 ملکوں پر تھا۔ اس کا خاتمہ 678 عیسوی میں ہوا۔ اور ساسانی سلطنت کا اقتدار 13 ملکوں پر تھا۔ اس کا خاتمہ 651 عیسوی میں ہوا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن حکمرانوں کو اپنے نمائندوں کے ذریعے خطوط بھیجے۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ حکمراں پر امن طور پر اپنے جابرانہ نظام کو ختم کرنے کے لیے تیار ہوجائیں، مگر ایسا نہ ہوسکا۔ ساسانی حکمراں نے آپ کے مکتوب کو اتنا حقیر سمجھا کہ اس نے اس کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کے بعد پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کا دونوں سے ٹکراؤ پیش آیا۔ اِس ٹکراؤ میں اللہ کی مدد پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کے ساتھ تھی، چناں چہ وہ پوری طرح کامیاب ہوئے۔

یہ ایک عظیم تاریخی واقعہ تھا، جس نے انسانی تاریخ کے دھارے کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ چناں چہ اللہ نے ایک اسرائیلی پیغمبر حبقّوق کے ذریعے اس کی پیشگی خبر دے دی تھی جو موجودہ بائبل میں بدستور موجود ہے۔ اِس پیشگی خبر کے الفاظ یہ ہیں — وہ کھڑا ہوا اور زمین تھرا گئی۔ اس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہوگئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہوگئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے۔ اس کی راہیں ازلی ہیں:

> He stood and measured the earth; He looked and startled the nations. And the everlasting mountains were scattered, the perpetual hills bowed. His ways are everlasting (Habakkuk 3:6)

مذکورہ بیان میں ''وہ'' سے مراد پیغمبر اسلام ہیں، اور ''پہاڑیوں'' سے مراد سیاسی پہاڑیاں ہیں، یعنی ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر۔ ''اس کی راہیں ازلی ہیں'' سے مراد ہے خدا کے دین کا ابدی طور پر محفوظ ہوجانا۔ بائبل کی یہ پیشین گوئی پیغمبر اسلام کے ذریعے کامل طور پر پوری ہوئی۔

نئے دور کا آغاز

جبر پر مبنی مذکورہ دونوں سیاسی ایمپائر کا خاتمہ ساتویں صدی عیسوی میں ہوا۔ یہ دونوں ایمپائر

آزادانہ ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ جب یہ دونوں ایمپائر ختم ہوئے تو دنیا میں آزادی کا ایک نیا دور آیا۔ اِس نئے دور کے حالات نہ صرف مسلم مورخین کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ سیکولر مورخین نے بھی کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔

اِنھیں سیکولر مورخین میں سے ایک فرانسیسی مورخ ہنری پرین (Henri Pirenne) ہے، جس کی وفات 1935 میں ہوئی۔ ہنری پرین نے اپنے مطالعے کے نتیجے میں کھلے طور پر اِس تاریخی حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ ہنری پرین نے لکھا ہے کہ ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر نے دنیا میں مطلق شہنشاہیت (monarchical absolutism) کا نظام قائم کر رکھا تھا۔ اصحابِ رسول نے اپنی غیر معمولی قربانی کے ذریعے اِس نظام کو توڑ دیا۔ اِس واقعے کے نتیجے میں تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ ہنری پرین کے الفاظ میں — اسلام نے زمین کے نقشے کو بدل دیا۔ تاریخ کے روایتی نظام کا خاتمہ ہوگیا:

Islam changed the face of the globe. The traditional order of history was overthrown. (*History of Western Europe*, p. 46)

ساتویں صدی عیسوی میں جب سیاسی جبر کے نظام کا خاتمہ کیا گیا تو اس کے بعد دنیا میں ایک نیا انقلاب آیا۔ یہ انقلاب فوری نتیجے کے معنی میں نہ تھا، بلکہ وہ ایک پراسس (process) کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِس کے بعد انسانی زندگی میں پہلی بار ایک نیا تاریخی عمل (historical process) شروع ہوا۔ یہ تاریخی پراسس برابر چلتا رہا، یہاں تک کہ وہ اپنے آخری نقطہ انتہا (culmination) تک پہنچ گیا۔ یہ آخری نقطہ انتہا وہی ہے جس کو عام طور پر مغربی تہذیب (western civilization) کہا جاتا ہے۔ اِس تاریخی عمل کے دو بڑے دھارے تھے — ایک، وہ جس کو جدید اصطلاح میں، جمہوریت (democracy) کہا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا، وہ جس کو جدید ٹکنالوجی پر مبنی صنعت کہنا درست ہوگا۔

عام طور پر مسلم علما مغربی تہذیب کے بعض ناپسندیدہ پہلو کو دیکھ کر اس کے بارے میں منفی ہوگئے ہیں، مگر یہ ناپسندیدہ پہلو دراصل مغربی تہذیب کا کلچرل پہلو ہے، وہی اصل مغربی تہذیب نہیں ہے۔ اصل مغربی تہذیب اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہی چیز ہے جس کو ہم نے خدا کے دین کے حق میں تائیدی عنصر کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔

جمہوریت کا دور

اہلِ علم کے درمیان عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ موجودہ زمانے میں سماجی اور سیاسی نظام (socio-political system) کے اعتبار سے جو ترقیاں ہوئی ہیں، اُن سب کی بنیاد جمہوریت ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ دراصل انقلاب فرانس (1789) تھا جس کے بعد دنیا میں جمہوریت کا دور آیا، مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ انقلاب فرانس (French Revolution) ایک تاریخی عمل کا نقطہ انتہا تھا۔ یہ تاریخی عمل انقلاب فرانس سے بہت پہلے عرب میں اسلامی انقلاب کے بعد شروع ہوا۔

قرآن میں اِس معاملے میں یہ اصولی حکم اِن الفاظ میں دیا گیا تھا: أَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) یعنی وہ اپنا کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں:

Their affairs are decided by mutual consultation.

وہ چیز جس کو موجودہ زمانے میں نظام جمہوریت کہا جاتا ہے، اُسی کو قرآن میں نظامِ شوری کہا گیا ہے۔ شوری کا یہ تصور اسلام کے اجتماعی نظام کی بنیاد ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کا جو اجتماعی نظام بنا، اس کو عام طور پر خلافت کہا جاتا ہے۔ اِس خلافت کا اگر دوسرا نام تجویز کرنا ہو تو یقیناً وہ جمہوری خلافت ہوگا۔ اِس معاملے کی ایک مثال خلیفہ ثانی عمر فاروق (وفات: 644ء) کا ایک واقعہ ہے۔ اِس واقعے کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''خلیفہ دوم عمر فاروق کے زمانے میں عمرو بن العاص مصر کے گورنر تھے۔ انھوں نے ایک بار گھوڑوں کی دوڑ کرائی۔ اِس دور میں گورنر کے بیٹے کا گھوڑا بھی شریک تھا، مگر جب دوڑ ہوئی تو ایک مصری (غیر مسلم) کا گھوڑا آگے بڑھ گیا۔ مصری نے فتح کے جوش میں کوئی ایسا جملہ کہا جو گورنر کے صاحب زادے (محمد بن عمرو بن العاص) کو برا معلوم ہوا اور انھوں نے مذکورہ مصری کو کوڑے سے مار دیا۔ مارتے ہوئے ان کی زبان سے نکلا: خذها وأنا ابن الأكرمين (یہ لو، اور میں شریفوں کی اولاد ہوں)۔ حضرت انس بن مالک اِس قصے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مذکورہ مصری اِس کے بعد مصر سے چل کر مدینہ پہنچا اور خلیفہ عمر

فاروق سے شکایت کی کہ گورنر کے لڑکے نے اس طرح اس کو کوڑے سے مارا ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرو، اور فوراً اپنے ایک خاص آدمی کو مصر بھیجا کہ عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے محمد بن عمرو جس حال میں ہوں، اسی حال میں ان کو لے کر مدینہ آؤ۔ چناں چہ وہ لوگ مدینہ لائے گئے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو خلیفہ عمر نے فرمایا: أين المصري، دونك الدرة فاضرب بها ابنَ الأكرمين (مصری کہاں ہے۔ یہ کوڑا لو اور اس سے شریف زادہ کو مارو)۔ اس کے بعد مصری نے کوڑا لیا اور گورنر مصر کے سامنے ان کے صاحب زادہ کو مارنا شروع کیا۔ وہ مارتا رہا، یہاں تک کہ ان کو زخمی کر دیا۔ خلیفہ عمر درمیان میں کہتے جاتے تھے کہ شریف زادہ کو مارو۔ جب وہ خوب مار چکا تو خلیفہ عمر فاروق نے کہا کہ ان کے والد عمرو بن العاص کے سر پر بھی ایک کوڑا مارو، کیوں کہ خدا کی قسم، ان کے بیٹے نے صرف اپنے باپ کی بڑائی کے زور پر تم کو مارا (فو الله ما ضربك ابنه إلا بفضل سلطانه)۔ مصری نے کہا کہ اے امیر المومنین، جس نے مجھ کو مارا تھا، اس کو میں نے مار لیا۔ اِس سے زیادہ کی مجھے حاجت نہیں۔ خلیفہ عمر نے کہا: خدا کی قسم، اگر تم ان کو بھی مارتے تو ہم تمھارے اور ان کے درمیان حائل نہ ہوتے، یہاں تک کہ تم خود ہی ان کو چھوڑ دو۔ پھر آپ نے عمرو بن العاص سے مخاطب ہو کر فرمایا: یا عمرو، متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحراراً (اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا، حالاں کہ اُن کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا)''۔

سیرۃ عمر بن الخطاب، علي محمد الصلاّبي (1/306)

ساتویں صدی عیسوی میں اسلامی انقلاب کے تحت پیدا ہونے والا یہ جمہوری پراسس (democratic process) تاریخ میں سفر کرتا رہا۔ آخری کار وہ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے مغربی یورپ پہنچا۔ خلیفہ عمر فاروق کے مذکورہ واقعے کے تقریباً 11 سو سال بعد فرانس کے جمہوری مفکر روسو (Jean Jacques Rosseau) نے اپنی مشہور کتاب سوشل کنٹریکٹ (*Contract Social*) 1762 میں شائع کی۔ اِس کتاب کا پہلا جملہ خلیفہ عمر فاروق کے قول کی بازگشت تھا۔ کتاب کا وہ پہلا

جملہ یہ تھا — انسان آزاد پیدا ہوا تھا، لیکن میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں:

Man was born free, but I see him in chains.

پیغمبر اسلام کی وفات کے تقریباً 30 سال بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ شورائی خلافت اپنے ڈھانچے کے اعتبار سے، ایک خاندانی خلافت بن گئی، لیکن اسلامی انقلاب کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ اِس ظاہری تبدیلی کے باوجود خلافت کا جمہوری مزاج بدستور باقی رہا۔ اِس معاملے کی بہت سی مثالیں تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ بطور مثال یہاں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

ہارون رشید کا ایک واقعہ

ہارون رشید عباسی دور کا پانچواں خلیفہ ہے۔ وہ 766 میں پیدا ہوا اور 809 میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک واقعہ اِن الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: وذُكر أن يهودياً كانت له حاجة عندهارون الرشيد، فاختلف إلى بابه سنةً، فلم يقض حاجته، فوقف يوماً على الباب- فلما خرج هارون سعى حتى وقف بين يديه وقال: اتق الله يا أمير المؤمنين، فنزل هارون عن دابته وخرّ ساجداً- فلما رفع راسه أمر بحاجته فقضيت- فلما رجع قيل له: يا أمير المؤمنين، نزلت عن دابتك لقول يهوديّ- قال: لا، ولكن تذكرتُ قولَ الله تعالى: وإذا قيل له اتق الله أخذته العزة بالإثم، فحسبه جهنم، ولبئس المهاد- (تفسير القرطبي، 19/3) یعنی کہا جاتا ہے کہ ایک یہودی تھا جس کو ہارون رشید سے ایک کام تھا۔ وہ شخص اِس کام کے لیے خلیفہ کے دروازے پر ایک سال تک جاتا رہا، مگر خلیفہ نے اس کی ضرورت پوری نہ کی، پھر ایک دن وہ یہودی، خلیفہ کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ جب ہارون رشید باہر نکلا تو وہ شخص تیزی سے آ کر خلیفہ کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور کہا — اے امیر المومنین، اللہ سے ڈریئے۔ یہ سن کر ہارون رشید اپنی سواری سے اترا اور سجدے میں گر پڑا۔ پھر ہارون رشید نے سجدے سے سر اٹھایا اور اس نے حکم دیا اور یہودی کی ضرورت پوری کر دی گئی۔ پھر جب ہارون رشید لوٹا تو اس سے کہا گیا کہ اے امیر المومنین، کیا آپ ایک یہودی کے قول پر اپنی سواری سے اتر گئے۔ ہارون رشید نے کہا کہ نہیں، بلکہ مجھے اللہ تعالی کا یہ قول یاد آیا: وإذا قيل له اتق الله أخذته

العزۃ بالإثم فحسبہ جھنم، و لبئس المھاد (2:206)

ساتویں صدی عیسوی میں اسلامی انقلاب آیا، اس کے بعد تاریخ میں جو پراسس جاری ہوا، اس کا دوسرا پہلو وہ تھا جس کو ہم نے جدید ٹکنالوجی پر مبنی صنعت کہا ہے۔ یہ دوسرا پراسس خاص طور پر عباسی عہد (750-1258) میں بغداد میں شروع ہوا، پھر وہ مختلف مراحل سے گزرتا ہوا اسپین پہنچا۔ اسپین میں اس نے غیر معمولی ترقی حاصل کی۔ اسپین کی مسلم خلافت 711 میں شروع ہوئی اور 1492 میں ختم ہوئی۔ اِس مدت میں جو سائنسی ترقیاں ہوئیں، وہی مغرب کے صنعتی انقلاب کی بنیاد بنیں۔ مسلم خلافت کے زمانے میں سائنس میں جو ترقی ہوئی، اس کے بغیر مغرب میں سائنس کی ترقی ممکن نہ ہوتی۔ مورخین نے اس واقعے کا کھلے طور پر اعتراف کیا ہے۔ اس کی ایک مثال رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) کی ہے۔ وہ فرانس میں پیدا ہوا اور لندن میں اس کی وفات ہوئی۔ بریفالٹ نے مغرب کی نشاۃِ ثانیہ سے پہلے عربوں کے سائنسی رول کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ — یہ بہت زیادہ قابلِ قیاس بات ہے کہ عربوں کے رول کے بغیر یورپ کی جدید صنعتی تہذیب ہرگز کبھی وجود میں نہ آتی:

'It is highly probable that but for the Arabs modern European civilization would never have arisen at all'. Robert Briffault (1876-1948)

(*The Making of Humanity,* p.190, published in 1919; publisher: G. Allen & Unwin Ltd, UK, pp. 371)

اس طرح کی رائیں کئی اور مغربی اسکالروں نے دی ہیں۔ مثلاً برٹرنڈ رسل، فیلڈنگ گیرسن (Fielding Garrison) برناڈ لوئی (Bernard Lewis)، وِل ڈیورنٹ (Will Durant)، وغیرہ۔ یہاں وِل ڈیورنٹ کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

Muslim scientists helped in laying the foundations for an experimental science with their contributions to the scientific method and their empirical, experimental and quantitative approach to scientific study. (*The Age of Faith,* by Will Durant (1980), 4/162

یعنی مسلم سائنس دانوں نے سائنٹفک طریقِ عمل میں اپنے کنٹری بیوشن اور اپنے تجرباتی اور کمیاتی منہج کے ذریعے سائنسی مطالعے کی بنیاد رکھنے میں مدد دی۔

اسلامی تحریک اکیسویں صدی میں

قرآن کی مذکورہ آیات (61:8-9) سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کو رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے جو انقلاب مطلوب تھا، اُس انقلاب کے دو حصے تھے — ایک، اتمامِ نور، اور دوسرے، اظہارِ دین۔ اب اکیسویں صدی میں یہ دونوں مطلوب چیزیں پوری طرح واقعہ بن چکی ہیں۔ اِس طرح اب اسلامی تحریک اپنے فائنل دور میں پہنچ چکی ہے۔ اب فائنل رول اہلِ ایمان کو ادا کرنا ہے۔ اب اہلِ ایمان کا کام ہے کہ وہ اِس تاریخی انقلاب کو سمجھیں اور اس کے ذریعے پیدا ہونے والے امکانات (opportunities) کو بھرپور طور پر استعمال کریں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اِس مطلوب خداوندی کا ایک پہلو وہ تھا جس کو قرآن میں، اتمامِ نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اتمامِ نور سے مراد ایک ایسا واقعہ ہے جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے، پوری طرح ایک پرامن اور غیر سیاسی واقعہ ہے، اور وہ ہے خدا کے دین کے مستند ایڈیشن کا پوری طرح محفوظ ہوجانا۔ یہ واقعہ اِس طرح انجام پاچکا ہے کہ خدا کی کتاب (قرآن) کا متن (text) کامل طور پر محفوظ ہو چکا ہے۔ اِسی کے ساتھ پرنٹنگ پریس کا دور دنیا میں آ گیا ہے۔ اِس طرح یہ ممکن ہوگیا ہے کہ قرآن کا متن اور اس کے ترجمے تیار کرکے ہر زبان میں شائع کیے جائیں اور اس کو تمام اقوامِ عالم تک پہنچادیا جائے۔

اِس سلسلے میں دوسرا مطلوب وہ ہے جس کو قرآن میں اظہارِ دین کہا گیا ہے، یعنی دین کو غلبہ کی حیثیت مل جانا۔ یہ دوسرا مطلوب بھی اکیسویں صدی میں پوری طرح حاصل ہوگیا ہے۔ اب اہلِ ایمان کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اظہارِ دین کے ذریعے حاصل ہونے والے مواقع کو بھرپور استعمال کریں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اظہارِ دین سے مقصود یہ تھا کہ دنیا میں وہ حالتِ فطری قائم ہوجائے۔ یہ واقعہ بھی پوری طرح انجام پاچکا ہے۔ اب دنیا میں پوری طرح مذہبی آزادی آ چکی ہے۔ کسی بھی رکاوٹ کے بغیر دنیا کے کسی ملک میں دعوتی مشن کو جاری کرنا ممکن ہوگیا ہے۔ اِس انقلاب کے بعد تاریخ میں پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ انسانی تاریخ میں تلوار کا

دور ختم ہوگیا۔ اب صرف پُرامن عمل کا دور ہے۔ تاریخ کا یہ دور عین دعوتی مشن کے حق میں ہے۔

اظہارِ دین، یعنی دنیا میں حالتِ فطری کے قائم ہونے کی بنا پر بہت سے موافق حالات وجود میں آئے ہیں۔ اِن میں سے دو بے حد اہم ہیں۔ ایک ہے، کائنات میں چھپی ہوئی اللہ کی نشانیوں کا دریافت ہوجانا۔ اور دوسرا ہے، جدید مواصلات (modern communication) جس نے تاریخ میں پہلی بار اُس عالمی مشن کو مکمل کرنے کا موقع فراہم کیا جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (25:1)

آیاتِ الٰہی کا ظہور

آیات اللہ یا آیاتِ معرفت کا ظہور پیشگی طور پر مقدر تھا۔ قرآن میں اِس کی پیشین گوئی اِن الفاظ میں کی گئی تھی: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ قرآن کی اِس آیت میں جس چیز کو آفاق وانفس میں نشانیوں کا ظہور بتایا گیا ہے، وہ دراصل دورِ جدید میں نظریاتی سائنس کے ذریعے دریافت ہونے والے حقائقِ فطرت ہیں۔ اِن حقائق نے دورِ جدید میں معرفتِ خداوندی کے نئے دروازے کھول دئے ہیں۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اللہ کا کوئی بندہ تخلیقاتِ الٰہیہ میں کمالاتِ الٰہیہ کو دیکھے اور معرفتِ خداوندی کا اعلیٰ درجہ حاصل کرے۔ نیز اِسی کے ذریعے یہ بھی ممکن ہوگیا ہے کہ اِن حقائقِ فطرت کو دعوت الی اللہ کے عمل میں جدید دلائل کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اِس طرح دعوت کے عمل کو خود انسان کے علمی مسلّمہ کے مطابق، ثابت شدہ بنادیا جائے۔

اِس سائنسی انقلاب کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو موجودہ زمانے میں دورِ مواصلات (age of communication) کہا جاتا ہے۔ اِس دورِ مواصلات نے تاریخ میں پہلی بار اِس بات کو ممکن بنادیا ہے کہ دعوت الی اللہ کے اُس عالمی نشانے کو پورا کیا جاسکے جس کی پیشین گوئی ایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں کی گئی تھی: لا یبقی علی ظهر الأرض بیت مدر ولا وبر إلا أدخله الله كلمة الإسلام، بعزّ عزيز وذلّ ذليل (زمین کی پشت پر کوئی چھوٹا یا بڑا گھر باقی نہیں رہے گا، جہاں اللہ اسلام کا کلمہ نہ پہنچا دے، عزت والے کو عزت کے ساتھ اور ذلت والے کو

ذلت کے ساتھ، یعنی چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے (willingly or unwillingly)۔

دنیا میں حالتِ فطری کے قائم ہونے سے موجودہ زمانے میں جو نئے مواقع کھلے ہیں، وہ سارے انسانوں کے لیے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اِن مواقع پر کسی ایک گروہ کی اجارہ داری (monopoly) قائم ہوجائے۔ خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، آزادی (freedom) ہر انسان کا فطری حق ہے، مومن کا بھی اور غیر مومن کا بھی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ آزادی صرف اہلِ ایمان کو حاصل ہو اور دوسرے لوگوں کے لیے وہ منسوخ قرار پائے۔ دوسرے لوگ بھی اپنی آزادی کو کھلے طور پر استعمال کریں گے۔ اگر کسی کے استعمالِ آزادی سے اہلِ ایمان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں تو یہ اہلِ ایمان کا اپنا مسئلہ ہے، وہ دوسروں کا مسئلہ نہیں۔ دوسروں پر صرف یہ پابندی لگائی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی آزادی کو اِس طرح استعمال نہ کریں کہ وہ دوسروں کے لیے جسمانی جراحت (physical injury) کا سبب بن جائے۔ اِس ایک پابندی کے سوا، کوئی اور پابندی نہ مطلوب ہے اور نہ ممکن۔

خلاصہ کلام

ایک اسلامی اسکالر کا مقالہ نظر سے گزرا۔ اِس مقالے میں انھوں نے لکھا تھا کہ اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ بنیادی طور پر دو ہے— توحید اور عدل۔ توحید (Monotheism) سے مراد ان کے نزدیک انفرادی عقیدہ تھا، اور عدل (justice) سے مراد عدل پر مبنی اجتماعی نظام۔ انھیں دو تصورات کے تحت انھوں نے پورے اسلام کی تشریح کی تھی۔

مگر میرے مطالعہ کے مطابق، اسلام کا یہ تصور درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ توحید اور عدل دونوں ہی انفرادی نوعیت کے احکام ہیں۔ توحید سے مراد ہے ایک انسان کا انفرادی عقیدہ، اور عدل سے مراد ہے، ایک انسان کا انفرادی سلوک۔ قرآن کے مطابق، اللہ تعالی نے انسان کو معرفت کے لیے پیدا کیا ہے (51:56)۔ انسان کو اللہ تعالی نے عقل دی۔ اب انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ عقل کو استعمال کرکے اپنے خالق کو دریافت کرے۔ یہی دریافت، خدا پرستانہ زندگی کا آغاز ہے۔ اِس دریافت کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ جب کسی شخص کو حقیقی معنوں میں یہ دریافت ہوتی ہے تو

اس کے بعد فطری طور پر اس کی پوری زندگی میں ایک انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔ اس کی پوری شخصیت ایک نئی شخصیت بن جاتی ہے، وہ پورے معنوں میں ایک ربانی انسان بن جاتا ہے۔

اسی قسم کا ربانی انسان تخلیق کا اصل مقصود ہے۔ اِسی قسم کے ربانی افراد، نہ کہ ربانی معاشرہ، خدا کے تخلیقی منصوبے کا اصل مقصود ہیں۔ موجودہ دنیا میں ایسے افراد پوری انسانی تاریخ سے منتخب کیے جائیں گے اور پھر اِن منتخب افراد کی بنیاد پر آخرت کی دنیا میں ایک اعلیٰ ربانی معاشرہ وجود میں آئے گا۔ یہی وہ افراد ہیں جو خدا کی ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے۔

خالق نے اِس دنیا میں انسان کو کامل آزادی دی ہے۔ یہ آزادی برائے امتحان ہے، نہ کہ برائے استحقاق۔ انسان کو یہ آزادی بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے۔ یہ آزادی قیامت سے پہلے منسوخ ہونے والی نہیں۔ اِس آزادی کی بنا پر ایسا ہے کہ اِس دنیا میں اعلیٰ افراد تو بنتے ہیں، لیکن اعلیٰ معاشرہ یا اعلیٰ نوعیت کا اجتماعی نظام کبھی نہیں بنتا۔ انسانی زندگی کی یہ نوعیت قیامت تک بدستور باقی رہے گی۔ قیامت کے بعد ایک نئی کامل دنیا بنے گی۔ وہاں پوری تاریخ کے منتخب افراد بسائے جائیں گے اور جو لوگ اپنی آزادی کا صحیح استعمال نہ کرسکے، اُن کو جمع کرکے کائناتی کوڑے خانے میں ڈال دیا جائے گا— خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، انسانی زندگی کی حقیقت یہی ہے۔ انسانی زندگی کی بامعنیٰ تعبیر صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ اِس خدائی منصوبے کو ذہن میں رکھ کر اس کی تعبیر کی جائے، انسانی تاریخ کو بامعنیٰ تعبیر دینے کا دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔

ہدایت اور اظہارِ دین

قرآن کی سورہ الفتح کی ایک آیت کے الفاظ یہ ہیں: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا :

God is One Who has sent His Messenger with guidance and the true religion, so that God may have it prevail over all religions, God suffices as a witness. (48:28)

1۔ آیت کا اسلوب بتاتا ہے کہ اِس آیت میں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ کوئی انسانی واقعہ نہیں، بلکہ وہ ایک حتمی فیصلہ ہے، یعنی اللہ نے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ لازماً ایسا ہو۔ مزید یہ کہ قرآن کی یہ آیت اُس فیصلہ خداوندی کے بارے میں ہے جس کا تعلق خاتم النبیین سے ہے اور چوں کہ خاتم النبیین کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے، اِس لیے اِس فیصلے کا انطباق بھی لازماً قیامت تک جاری رہے گا۔ اِس آیت میں پیغمبر یا امتِ مسلمہ کے مشن کو نہیں بتایا گیا ہے، بلکہ اس میں اللہ کے ایک فیصلے کو بتایا گیا ہے، جو پوری انسانی تاریخ میں لازماً ایک واقعہ بنے گا۔

2۔ دوسری چیز ہدایت ہے۔ ہدایت سے مراد اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی الہامی ہدایت ہے۔ اِس الہامی ہدایت کے بارے میں اللہ کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ ہر اعتبار سے محفوظ رہے، اس کا عربی متن، اس کی زبان، اس کا لہجہ، حتی کہ اس کا طرزِ کتابت، وغیرہ۔ قرآن ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں اترا۔ اب تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ کتاب (قرآن) ہر اعتبار سے محفوظ ہے۔ پرنٹنگ پریس اور ریکارڈنگ کا دور بتاتا ہے کہ اب قرآن کی یہ حفاظت مزید اضافے کے ساتھ یقینی بن چکی ہے۔

3۔ اظہارِ دین سے مراد خود دین کا اظہار ہے، نہ کہ دین کے سوا کسی اور چیز کا اظہار۔ اِس آیت میں اظہارِ دین سے مراد سیاسی اقتدار یا اجتماعی نظام نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا دین بحیثیت دینِ حق اپنے نظریاتی غلبہ کو ہمیشہ برقرار رکھے گا۔ یہ غلبہ بہ اعتبار رجحت (دلیل) ہوگا، نہ کہ بہ اعتبار نظام۔ دینِ حق کے نظریاتی غلبہ کو ہمیشہ برقرار رکھنا تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ ہے، کیوں کہ

اِس مقصد کو اِس طرح حاصل کرنا ہے کہ انسان کی آزادی پوری طرح برقرار رہے اور اِس کے ساتھ دین کا نظریاتی غلبہ بھی مسلسل طور پر قائم رہے۔ اِس نوعیت کا پیچیدہ منصوبہ کسی بھی انسان کے بس میں نہیں۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے انسانی تاریخ کو اِس طرح مینیج (manage) کرنا ہے کہ تاریخ کا آزادانہ سفر بھی جاری رہے اور یہ مقصد بھی حسب منشا حاصل ہوجائے۔

اِس مقصد کے لیے اللہ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب بھی کچھ لوگ بطور خود دینِ حق کا کوئی غلط ایڈیشن (false edition) تیار کریں تو اس کے بعد خود تاریخ میں ایسے اسباب پیدا ہوں جو اِس ایڈیشن کا خاتمہ کردیں اور اِس طرح دینِ حق کی صداقت بدستور برقرار رہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت سے اب تک ایسے 3 بڑے واقعات پیش آئے ہیں، جب کہ انسان نے خود ساختہ طور پر دین کا ایک غلط ایڈیشن تیار کیا، لیکن اس کے بعد تاریخی عمل کے تحت ایسے حالات پیدا ہوئے جنھوں نے مذہب کے اِس غلط متبادل (wrong alternative) کو حجت (دلیل) کی سطح پر ختم کردیا۔ اِس طرح دین حق کی نظریاتی صداقت بدستور تاریخ میں قائم رہی۔

تاریخ میں اِس نوعیت کی پہلی مثال مظاہر فطرت کی پرستش (nature worship) ہے جس کو مذہب کی زبان میں شرک کہا جاتا ہے۔ فطرت کی پرستش کا مطلب یہ ہے کہ فطرت کے مظاہر، سورج، چاند ستارے، وغیرہ میں خدائی صفات (divine attributes) کو فرض کرکے ان کی پرستش کرنا۔ مظاہر فطرت کی یہ پرستش قدیم زمانے میں ہزاروں سال تک قائم رہی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اللہ تعالی نے تاریخ میں ایسا انقلابی عمل جاری کیا جس کے نتیجے میں آخر کار وہ دور آیا جس کو سائنسی دور کہا جاتا ہے۔ جدید سائنس کے ذریعے مظاہر فطرت کی موضوعی تحقیق (objective exploration) کی گئی۔ اِس کے نتیجے میں علمی طور پر یہ ثابت ہوگیا کہ فطرت میں کوئی اُلوہیت (divinity) نہیں ہے۔ اِس طرح انسان کے خود اپنی عقلی مسلّمہ پر یہ ثابت ہوگیا کہ فطرت صرف مخلوق ہے، اس کے اندر کوئی بھی الوہی صفت (divine attribute) نہیں۔ اِس طرح، خدا کے دین کا دینِ حق ہونا بدستور ثابت شدہ بنا رہا۔

قدیم تاریخ میں دین حق کا دوسرا غلط متبادل (false alternative) شخصیت پرستی (personality cult) کی صورت میں پیدا ہوا۔ شخصیت پرستی کا سیاسی اظہار بادشاہت کے ادارہ کی صورت میں ہوا۔ بادشاہ کے متعلق مان لیا گیا کہ وہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں، پراسرار فوقیت رکھتا ہے۔ اِس طرح بادشاہ کو عملاً وہ درجہ دے دیا گیا جو معبود کا درجہ ہونا چاہیے۔ یہ بادشاہت یا سیاسی شخصیت پرستی انسانی تاریخ میں کئی ہزار سال تک جاری رہی۔ بادشاہت کے دور میں انسانی سوچ کا مرکز ومحور بادشاہ بن گیا۔ اعلیٰ انسانی جذبات بادشاہ کے ساتھ وابستہ کردئے گئے۔ عام طور پر یہ مان لیا گیا کہ — جو بادشاہ کا مذہب، وہی سب کا مذہب (الناس علی دین ملوکھم)

بادشاہت کے زمانے میں ساری دنیا میں زراعت کا دور قائم تھا۔ اُس زمانے میں زراعت (agriculture) اقتصادیات کا واحد ذریعہ تھی — زمین کا مالک ہونے کی بنا پر بادشاہ اقتصادیات کا واحد مالک بنا ہوا تھا۔ بادشاہ کو یہ حیثیت تھی کہ بادشاہ دینے والا ہے اور بادشاہ چھیننے والا۔ اُس زمانے میں بادشاہ کو عملاً وہ درجہ ملا ہوا تھا، جو درجہ خدا کا ہونا چاہیے۔ اِن حالات میں یہ تصور پیدا ہوا کہ بادشاہ حاکم (ruler) ہے اور دوسرے تمام لوگ محکوم (ruled) کی حیثیت رکھتے تھے۔ قدیم زمانے کی اِس نفسیات کو ایک فارسی شاعر نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا:

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

اِس طرح بادشاہ گویا خدا کا ایک سیاسی متبادل (political alternative) بن گیا تھا۔ گویا دین باطل نے دین حق کی جگہ لے رکھی تھی۔ اللہ تعالیٰ کو یہ صورتِ حال مطلوب نہ تھی، چناں چہ تاریخ میں ایک نیا عمل (process) جاری ہوا۔ یہ عمل ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا، جب کہ عرب میں قبائلی سرداری کا نظام رائج تھا اور عرب کے اطراف میں دو بڑے ایمپائر قائم تھے — ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر۔ بائبل کے الفاظ میں، یہ گویا سیاسی چٹانیں تھیں۔ رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے اِن سیاسی چٹانوں کو توڑ کر تاریخ میں ایک نیا سیاسی عمل جاری ہوا۔ یہ عمل سفر کرتے ہوئے آخر کار یورپ پہنچا۔ اِس سیاسی عمل کا نقطہ انتہا 1789 میں پیش آنے والا فرانسیسی انقلاب تھا۔

اِس انقلاب کے بعد دنیا میں ایک نیا دور آیا جس کو جمہوریت کہا جاتا ہے۔ جمہوریت نے شخصی بادشاہت کے تصور کا خاتمہ کر دیا اور دنیا میں عوامی حکومت کا دور آیا، جس کا فارمولا یہ تھا:

Government of the people, by the people, for the people.

اِس جمہوری انقلاب نے قدیم طرز کی شخصی بادشاہت (monarchy) کا خاتمہ کر دیا، پہلے یورپ میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں۔ اِس طرح دنیا میں بادشاہی مذہب کا خاتمہ ہوگیا اور نظری طور پر دینِ حق دوبارہ دنیا میں قائم ہوگیا۔ دینِ حق کا یہ قیام سیاسی اقتدار یا حکومتی نظام کے معنی میں نہ تھا، بلکہ وہ حجت کی سطح پر دینِ حق کا فکری اظہار تھا۔ یہ واقعہ اتفاقاً پیش نہیں آیا، بلکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ تاریخ میں ایک عظیم خدائی آپریشن کا نتیجہ تھا۔ جمہوریت صرف ایک سیاسی نظریہ نہ تھا، اس کا ایک اور اہم تر پہلو یہ تھا کہ اس نے اُس سیاسی الوہیت (political divinity) کے تصور کا خاتمہ کر دیا جس کو بنیاد بنا کر قدیم زمانے کے بادشاہ اپنی عظمت قائم کیے ہوئے تھے۔ جمہوری انقلاب کے بعد سیاسی اقتدار صرف ایک انتظامیہ (administration) بن کر رہ گیا، ایک مقدس ادارے کی حیثیت سے اس کا خاتمہ ہوگیا۔

اِس سلسلے کی تیسری مثال وہ ہے جس کو ہیومن ازم (Humanism) کہا جاتا ہے۔ ہیومن ازم ایک جدید فلسفہ ہے جس کو دوسرے الفاظ میں، انسان پرستی کہا جا سکتا ہے۔ یہ دینِ حق کا آخری غلط متبادل ہے جو بیسویں صدی کے نصف آخر میں زیادہ طاقت کے ساتھ پیدا ہوا۔ یہی معاملہ وجودیت (Existentialism) کا ہے، جس کا بانی فرانسیسی فلسفی سارترے (Jean Paul Sartre) ہے جس کی وفات 1946 میں ہوئی۔ وجودیت بھی دراصل ہیومن ازم کا فلسفیانہ ایڈیشن ہے۔

ہیومن ازم کیا ہے، ہیومن ازم ایک غیر خدا پرستانہ فلسفہ ہے۔ ہیومن ازم ایک فکری نظام ہے جس کا مقصد ساری اہمیت انسان کو دینا ہے، نہ کہ خدا یا کسی فوق الفطری طاقت کو:

Humanism: An outlook or system of thought attaching prime importance to human, rather than divine or supernatural matters.

دورِ جدید کے بہت سے فلسفی ہیومن ازم کے نقطہ نظر کے حامی بن گئے۔ مثلاً جرمن فلسفی

لدوگ فیور باخ (Ludwig Feverbach) جس کی وفات 1872 میں ہوئی، اس نے لکھا ہے کہ — انسان ہی خدا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں:

God is nothing other than man himself.

امریکی فلسفی ولیم جیمس (William James) جس کی وفات 1910 میں ہوئی، وہ بھی ہیومن ازم کا حامی تھا، انگلش فلسفی جولین ہکسلے (Julian Huxley) جس کی وفات 1975 میں ہوئی، اس نے ہیومن ازم کی حمایت میں ایک کتاب لکھی۔ اس کا ٹائٹل یہ ہے:

Religion Without Revelation

اِس کتاب میں ہیومن ازم کی تعریف اِس طرح کی گئی ہے — سیٹ کا خدا سے انسان کی طرف منتقل ہوجانا (.Transfer of seat from God to Man)۔

ہیومن ازم کے موضوع پر عام قاری کے لیے ایک قابلِ مطالعہ کتاب یہ ہے:

Humanism: A Very Short Introduction, by Stephen Law, 2011

بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہیومن ازم کے فلسفے کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ لوگوں نے یہ فرض کرلیا کہ انھیں دینِ خداوندی کا ایک بدل مل گیا ہے۔ غیر خدا پرست طبقے میں یہ سمجھا جانے لگا کہ — انسان ہی ہر اعتبار سے سب کچھ ہے (.Man is the measure of all things)

مگر عین اِسی زمانے میں ایک نیا طاقت ور ظاہرہ پیدا ہوا جس نے ہیومن ازم کے تصور کو عملاً باطل ثابت کردیا۔ یہ طاقت ور ظاہرہ وہ تھا جس کو عام طور پر گلوبل وارمنگ کہا جاتا ہے، یعنی عالمی سطح پر حرارت کا غیر متناسب طور پر بڑھ جانا جس کے نتیجے میں زمین پر زندگی کا نظام درہم برہم ہوجائے۔

موجودہ زمانے میں جدید ٹکنالوجی کے ظہور کے بعد انڈسٹری کو بہت ترقی ہوئی۔ مختلف ملکوں میں کثیر تعداد میں بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے۔ اِن کارخانوں کو چلانے کے لیے جو ایندھن (fuel) استعمال ہوتا تھا، اُس سے مسلسل طور پر بڑی مقدار میں کاربن خارج ہونے لگا۔ اِس اخراج کو کاربن ایمیشن (carbon emission) کہا جاتا ہے۔ اِس کاربن ایمیشن نے زمین کے اوپر قائم شدہ فضا کو خطرناک حد تک آلودہ بنا دیا۔

اِس فضائی آلودگی یا فضائی حرارت کے نتیجے میں کئی نا قابلِ حل مسائل پیدا ہو گئے۔اِس کے نتیجے میں برف کے بڑے بڑے ذخائر، پہاڑوں کے گلیشیر، نارتھ پول اور ساؤتھ پول کی آئس کیپ (ice cap)، سمندروں میں تیرتے ہوئے برفانی پہاڑ (iceberg) تیزی سے پگھلنے لگے۔اِس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ سمندروں کی سطح بڑھنے لگی۔نازک حیوانات (fragile animals) مرنے لگے۔اِس طرح کے واقعات کے نتیجے میں یہ ہوا کہ زمین پر قائم شدہ لائف سپورٹ سسٹم تباہ ہونے لگا،حتی کہ اب سائنس داں یہ خبر دے رہے ہیں کہ زمین بہت جلد انسان کے لیے نا قابلِ رہائش بن جائے گی۔

اِس صورتِ حال کا پیدا ہونا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔یہ دراصل ہیومن ازم کے فلسفے کی موت کا اعلان ہے۔ ہیومن ازم کے فلسفے میں یہ مان لیا گیا تھا کہ انسان کائنات میں مرکزی مقام (central position) رکھتا ہے۔انسان کی اِس حیثیت کو ماننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ مانا جائے کہ انسان کو ہر طرح کی قدرت حاصل ہے، انسان اپنے مستقبل کا مالک ہے۔اگر انسان واقعۃً اِس طرح کی طاقت رکھتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ موجودہ زمانے میں زمین پر واقع ہونے والی اُس انسان کُش تباہی کو روکے جو گلوبل وارمنگ کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔گلوبل وارمنگ کو روکنے میں انسان کی ناکامی نے ہیومن ازم کے فلسفے کا آخری طور پر خاتمہ کر دیا ہے۔

جب گلوبل وارمنگ کا ظاہرہ سامنے آیا تو تمام دنیا کی حکومتیں اور تمام دنیا کے سائنس داں بڑے پیمانے پر متحرک ہوگئے۔کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں اِس موضوع پر ہونے والی کانفرنس (دسمبر 2009) میں دنیا کے تمام ملکوں کے سائنس داں بڑی تعداد میں اکھٹا ہوئے۔اِس طرح کی کوششیں حکومتوں کی طرف سے بھی کی جارہی ہیں اور سائنس دانوں کی طرف سے بھی۔اِس موضوع پر تحقیقات اور تجربات کا سلسلہ ساری دنیا میں مسلسل طور پر جاری ہے، مگر نتیجے کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر نا کام ثابت ہوا۔گلوبل وارمنگ کا خطرہ مسلسل طور پر بڑھ رہا ہے۔اب وہ خطرناک سطح تک پہنچ چکا ہے،مگر اُس کو روکنے کے لیے انسان کی ہر کوشش پوری طرح بے نتیجہ ثابت ہو رہی ہے۔

گلوبل وارمنگ کا یہ تجربہ کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ وہ ہیومن ازم کے نظریے کے کامل اِبطال

(total negation) کے ہم معنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گلوبل وارمنگ کے ظاہرے نے اُسی طرح ہیومن ازم کے فکر کا خاتمہ کر دیا ہے جس طرح اس سے پہلے فطرت پرستی کو سائنس نے ختم کیا تھا اور جمہوریت کے ذریعے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔

موجودہ گلوبل وارمنگ بھی پچھلے خدائی آپریشن کی طرح ایک خدائی آپریشن ہے جس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دینِ حق کے لیے ہیومن ازم کا متبادل ایک بے بنیاد متبادل (false alternative) تھا۔ اِس طرح خدائی فیصلے کے مطابق، دین حق نے دوبارہ تاریخ میں فکری اظہار کا وہ درجہ حاصل کرلیا جو خدا نے اس کے لیے ابدی طور پر مقدر کیا تھا۔

خلاصہ کلام

اوپر جو کچھ کہا گیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے ساتویں صدی کے ربع اول میں یہ اعلان کیا تھا کہ خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت ہی مستند ہدایت (authentic guidance) ہے اور خدا کا دین ہی دینِ حق ہے۔ خدا نے یہ مقدر کر دیا تھا کہ خدا کی نازل کردہ ہدایت (قرآن) ابدی طور پر پوری طرح محفوظ رہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہدایت کے بارے میں خدا کا فیصلہ کامل طور پر پورا ہوا۔

اِس سلسلے میں دوسری چیز خدا کا نازل کردہ دین ہے۔ خدا کی نظر میں یہی دین ہمیشہ کے لیے دین حق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس دین کے بارے میں خدا کا یہ فیصلہ تھا کہ جب بھی انسان بطور خود اس کا کوئی غلط متبادل تیار کرے تو خود تاریخ میں ایسے اسباب پیدا ہوں جو مسلّمہ دلائل کی سطح پر اس کو غیر معتبر ثابت کر دیں۔ خدا کے اِس فیصلے کا اظہار بھی تاریخ میں بار بار ہوتا رہا اور اب اکیسویں صدی میں جو صورتِ حال ہے، وہ یہ ہے کہ ہدایت اور دینِ حق دونوں کے معاملے میں انسان کے پاس کوئی دوسرا انتخاب باقی نہیں۔ اب حقیقت کے اعتبار سے، انسان کے لیے ایک ہی ممکن انتخاب ہے اور وہ وہی ہے جو خدا نے خاتم النبیین کی بعثت کے وقت اس کے لیے مقدر کر دیا تھا۔

دعوہ ایکٹوزم

From Political Activism to Dawah Activism

مشہور محدث امام مالک بن انس (وفات: 179 ہجری) کا ایک قول اِن الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: لا یصلح آخر ھذہ الأمة، إلا بما صلح بہ أولھا (مسند الموطأ، رقم الحدیث: 783) یعنی اِس امت کے دورِ آخر کے لوگوں کی اصلاح بھی اُسی طرح ہوگی، جس طرح اِس امت کے دورِ اول کے لوگوں کی اصلاح ہوئی تھی۔

امت کے لیے یہ طریقہ اصلاح کیا ہے، اس کا اندازہ رسول اور اصحابِ رسول کے دور کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ رسول اور اصحابِ رسول کے دور کو اسلام کا دورِ اول کہا جاسکتا ہے۔ اِس دور میں جو کچھ پیش آیا، اس کی تفصیل حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ اِس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنے مشن کا آغاز کیا۔ 13 سال تک آپ پُرامن انداز میں اپنے مشن کو چلاتے رہے۔ اِس مدت میں مکہ کے کچھ افراد نے اسلام قبول کیا، لیکن وہاں کی بڑی اکثریت آپ کی مخالف بن گئی۔ انھوں نے ہر صورت سے آپ کو ستانا شروع کردیا، یہاں تک کہ ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ رسول اور اصحابِ رسول یا تو مکہ سے ہجرت کرجائیں یا اہلِ مکہ کی طرف سے جارحانہ کارروائی کا سامنا کریں۔

اُس وقت حضرت عمر فاروق اور دوسرے اصحاب نے کہا کہ اگر ہم سے جنگ کی جاتی ہے تو ہم جنگ کریں گے۔ پیغمبر اسلام نے حضرت عمر فاروق کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: یا عمر، إنا قلیل (سیرت ابن کثیر: 1/441) یعنی اے عمر، ہم تھوڑے ہیں۔ پیغمبر اسلام کا یہ جواب کوئی سادہ جواب نہ تھا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی فریقِ ثانی کے ساتھ ٹکراؤ کا وقت نہیں آیا۔ اللہ کے منصوبے کے مطابق، یہ ایک قبل از وقت بات ہوگی کہ ہم فریقِ ثانی سے لڑ جائیں۔ ابھی ہمیں صبر کرتے ہوئے حالات کو اُس نوبت تک پہنچانا ہے جہاں اللہ اُس کو پہنچانا چاہتا ہے۔

دعوت اور نصرت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اِس معاملے میں جو ماڈل (model) قائم ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ پیغمبرانہ مشن کے دو بڑے حصے ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان دعوت ہے، اور دوسرے حصے کا عنوان نصرت، یعنی اہلِ ایمان کو یہ کرنا ہے کہ پہلے وہ احساسِ ذمے داری کے تحت، دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں۔ وہ آخری حد تک پر امن رہتے ہوئے اپنے دعوتی مشن کو جاری رکھیں۔ وہ کسی حال میں ردعمل یا ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ اِس کے بعد اہلِ ایمان کے ساتھ جو کچھ ہوگا، وہ تمام تر اللہ کی نصرت کے تحت ہوگا۔ اللہ کی نصرت کے تحت اہلِ ایمان کے لیے مزید مواقع کھلتے چلے جائیں گے۔ اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ اِن مواقع کو پہچانیں اور دانش مندانہ طور پر ان کو استعمال کریں، یہاں تک کہ ان کا سفرِ دعوت اپنی آخری منزل تک پہنچ جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو نمونہ قائم ہوا، اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس معاملے میں نصرتِ الٰہی کے ظہور کے تین مرحلے ہیں۔ وہ مرحلے حسب ذیل ہیں:

1۔ نصرت باعتبارِ حفاظت (*Nusrat* in terms of security)

2۔ نصرت باعتبارِ پراسس (*Nusrat* in terms of process)

3۔ نصرت باعتبارِ فتح (*Nusrat* in terms of victory)

4۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں اپنا دعوتی مشن شروع کیا تو اللہ تعالی کی طرف سے آپ کو یہ ہدایت دی گئی: یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ۝ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ ۝ وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ (74:1-7)۔ یہ قرآن کی سورہ المدثر کی ابتدائی آیتیں ہیں۔ یہ سورہ اگرچہ بالکل ابتدا میں نازل ہوئی، لیکن تلاوت کی ترتیب کے اعتبار سے وہ مصحف کے آخری حصے میں شامل ہے۔ اِن آیات میں پیغمبر اسلام کو جو ہدایت دی گئی، اس کا مطلب یہ تھا کہ تم پُر امن انداز میں دعوت الی اللہ کا کام کرتے رہو۔ مشن کے بقیہ مراحل کا تعلق تمام تر اللہ کی نصرت سے ہے۔ تم انتظار کی پالیسی پر قائم رہو اور جب اللہ کی نصرت ظاہر ہو تو تم اس کے مطابق، اُس کو استعمال کرو۔

نصرت باعتبارِ حفاظت

جیسا کہ عرض کیا گیا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا دعوتی مشن شروع کیا۔ آپ نے یک طرفہ طور پر امن کی روش اختیار کرتے ہوئے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ اُس وقت مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ انھوں نے آپ کے ساتھ مخالفت کا طریقہ اختیار کیا۔ جب حالات بہت زیادہ شدید ہوگئے، اُس وقت بھی آپ نے ٹکراؤ سے مکمل اعراض کیا۔ یہاں تک کہ نبوت کے 13 سال بعد آپ مکہ چھوڑ کر مدینہ آگئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آپ نے اور آپ کے اصحاب نے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہیں کیا، بلکہ اپنے مقامِ عمل (work place) کو بدل دیا۔

واقعات بتاتے ہیں کہ ہجرت کے بعد بھی مکہ کے مشرک سردار خاموش نہیں ہوئے، بلکہ انھوں نے یک طرفہ طور پر مسلّح جارحیت کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے باقاعدہ جنگی تیاری کر کے مدینہ پر حملہ کردیا۔ یہ واقعہ پیغمبر اسلام کی ہجرت کے 16 ماہ بعد پیش آیا۔ مدینہ سے تقریباً 80 میل دور بدر کے مقام پر دونوں فریقوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اِس جنگ کو تاریخ میں غزوہ بدر کہا جاتا ہے۔ یہ صرف یک روزہ جنگ تھی جو 17 رمضان 2 ہجری کو پیش آئی۔ اِس جنگ میں فریقِ مخالف کی طرف سے ایک ہزار مسلّح افراد تھے جو پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ دوسری طرف 313 کی تعداد میں اصحابِ رسول تھے، جو کم تر جنگی تیاری کے باوجود اپنے دفاع کے لیے بدر کے مقام پر پہنچے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم خود بنفسہ عملاً اِس جنگ میں شریک نہ تھے۔ البتہ آپ کے لیے میدانِ جنگ سے باہر وقتی طور پر ایک عریش (hut) بنایا گیا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ جب دونوں گروہوں کے درمیان مسلّح ٹکراؤ کا وقت آیا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گر پڑے۔ اُس وقت آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے: اللهم إنك إن تهلك هذه العصابة من أهل الإسلام فلا تعبد في الأرض أبدا (مسند أحمد: 1/ 112) یعنی اے اللہ، اگر تو اِس گروہ کو ہلاک کردے تو اِس کے بعد زمین پر کبھی تیری عبادت نہ ہوگی۔

اللہ تعالی نے پیغمبر اسلام کی دعا قبول فرمائی اور قرآن (3:124-125) کے بیان کے مطابق،

میدانِ جنگ میں کئی ہزار کی تعداد میں فرشتے بھیجے۔اِس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، اُس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ (3:123)

یہ معاملہ جو غزوہ بدر کے وقت پیش آیا، وہ کوئی سادہ معاملہ نہ تھا۔ یہ وہی چیز تھی جس کو ہم نے نصرت باعتبارِ حفاظت سے تعبیر کیا ہے، یعنی منصوبۂ الٰہی کی تکمیل سے پہلے مخالفین نے یک طرفہ حملہ کرکے یہ کوشش کی کہ اصحابِ رسول کا خاتمہ کر دیا جائے، مگر یہ قبل از وقت تھا۔ ابھی وہ وقت آنے والا تھا جب کہ اصحابِ رسول کی جماعت اپنا آخری دعوتی رول ادا کرے۔اِس کے لیے ضروری تھا کہ اِس جماعت کو مخالفین کے حملے سے بچا کر محفوظ رکھا جائے۔

اصل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے جب مکہ میں اپنا دعوتی مشن شروع کیا، اُسی وقت سے اللہ تعالیٰ کا ایک منصوبہ زیرِ عمل آگیا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ ایک مدت تک مختلف واقعات کے دوران پیغمبر اسلام اور آپ کی دعوتِ توحید کا خوب چرچا ہو، تاکہ مکہ اور اطرافِ مکہ کے لوگ اُس سے باخبر ہوجائیں۔لوگوں کے اندر بڑے پیمانے پر اِس بارے میں تجسس (curiosity) پیدا ہوجائے اور پھر اُن کے اِس تجسس کو استعمال کرکے یہ موقع فراہم کیا جائے کہ لوگ بڑے پیمانے پر آپ کے مشن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

نصرت باعتبارِ پراسس

پراسس کے اِس معاملے کو قرآن میں رفعِ ذکر (94:4) کہا گیا ہے، یعنی لوگوں کے درمیان توحید کے مشن کا چرچا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں اپنی دعوتی مشن کا آغاز کیا تو ہر دن نئے واقعات پیش آتے رہے — کبھی آپ، لوگوں کے مجمع میں جا کر اُن کو قرآن سنا رہے ہیں، کبھی مکہ کے کسی آدمی کے قبولِ اسلام پر مخالفین کی طرف سے اس پر تشدد کیا جارہا ہے، کبھی کسی مسلمان کو حرمِ مکہ میں نماز پڑھنے سے روکا جارہا ہے، کبھی باہر سے مکہ آنے والا کوئی شخص پیغمبر اسلام سے اِس معاملے میں سوال وجواب کررہا ہے، کبھی حج کا موسم ہے اور مختلف قبائل کے لوگ مکہ آرہے ہیں اور آپ وہاں جا کر اُن کے سامنے اپنے مشن کا تعارف پیش کررہے ہیں، کبھی آپ کا اور آپ کے خاندان کا بائکاٹ کیا جارہا ہے، کبھی مکہ کے سرداروں کی ایذا رسانی سے مجبور ہو کر اصحابِ رسول کا ایک قافلہ مکہ سے ہجرت کرکے حبش جارہا ہے، کبھی آپ

اپنے مشن کے تحت طائف اور دوسرے مقامات پر جاتے ہیں، کبھی دار الندوہ میں پیغمبر اسلام کے خلاف مشورہ ہورہا ہے اور آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جارہا ہے، وغیرہ۔

پھر جب مکہ میں 13 سال قیام کے بعد آپ مکہ سے 300 میل کی دوری پر واقع شہر مدینہ چلے جاتے ہیں تو اِس تذکرے میں بہت زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ اب غزوات اور سرایا اور جھڑپوں (skirmishes) جیسے واقعات کے نتیجے میں آپ کا اور آپ کے مشن کا چرچا تمام عرب میں، حتی کہ اطرافِ عرب میں پھیل جاتا ہے۔ آپ کے مخالفین کی مخالفانہ کارروائیوں کے نتیجے میں بظاہر بہت سے واقعات ہورہے تھے جو مسلسل لوگوں کے علم میں آرہے تھے۔ اسی کے ساتھ ایک بلا اعلان عمل جاری تھا۔ یہ عمل اِن واقعات کے درمیان ایک انڈر کرنٹ یا زیرِ سطح عمل (under the surface process) کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ لوگوں کے اندر نہایت تیزی سے تجسس کی نفسیات پیدا کررہا تھا۔ لوگ فطری طور پر جاننا چاہتے تھے کہ یہ مشن کیا ہے اور اِس مشن سے وابستہ افراد کا معاملہ کیا ہے۔ تجسس کی یہ زیریں رو اللہ کے منصوبے کے مطابق، عین مطلوب تھی، کیوں کہ اُس سے پیغمبر اسلام کے مشن کے دعوتی مواقع مسلسل طور پر بڑھ رہے تھے۔ یہی وہ عمل ہے جس کو ہم نے نصرت باعتبار پراسس کا نام دیا ہے۔

نصرت باعتبارِ فتح

ہجرت کے دوسرے سال اِس انڈر کرنٹ عمل پر تقریباً 20 سال گزر چکے تھے۔ نصرت باعتبار پراسس کا عمل اپنی تکمیل کے مرحلے تک پہنچ گیا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ اِس پیدا شدہ امکان کو بھرپور طور پر دعوت کے لیے استعمال (avail) کیا جائے۔ مگر مخالف فریق نے جنگ اور ٹکراؤ کا جو ماحول بنا رکھا تھا، اس کی موجودگی کی بنا پر اِس پیدا شدہ موقع کو استعمال کرنا عملاً ناممکن ہوگیا تھا۔ اِس لیے اب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت حکمت کے ساتھ ایک نیا منصوبہ بنایا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت مدینہ میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خواب دکھایا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ جارہے ہیں۔ آپ نے یہ خواب اپنے اصحاب کو بتایا۔ اِس کو سن کر لوگ بہت خوش ہوئے۔ وہ عمرہ کے لیے مکہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اِس کے مطابق،

آپ یکم ذی القعدہ 6 ہجری کو عمرہ کے ارادے سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اُس وقت تقریباً 15 سو مہاجرین اور انصار آپ کے ساتھ تھے۔ اہلِ مکہ کو پیغمبر اسلام کے اِس سفر کی اطلاع ہوگئی۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ کسی قیمت پر پیغمبر اسلام کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ چناں چہ انھوں نے آگے بڑھ کر حدیبیہ کے مقام پر آپ کے قافلے کو روک دیا جو کہ مکہ سے 9 میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے حدیبیہ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اِس کے بعد اہلِ مکہ کے نمائندے وہاں آنے لگے اور تقریباً دو ہفتے تک دونوں فریق کے درمیان گفت وشنید جاری رہی۔ اِس گفتگو کے دوران پیغمبر اسلام کو یہ موقع ملا کہ آپ اہلِ مکہ سے یہ کہیں کہ ہمارے اور تمھارے درمیان ٹکراؤ اور جنگ کی جو صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے، وہ ایک غیر مطلوب چیز ہے۔ اور ضروری ہے کہ اس کو ختم کردیا جائے۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ فریقین کے درمیان صلح کا معاہدہ (peace treaty) ہوجائے۔

صلح کا یہ معاہدہ جب کاغذ پر لکھا جانے لگا تو اہلِ مکہ کے نمائندہ سردار نے شدید انداز میں حمیتِ جاہلیہ (48:26) کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے ضد اور سرکشی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ان کی یک طرفہ شرطوں کی بنیاد پر معاہدہ کیا جائے، حتی کہ انھوں نے اصرار کیا کہ ''رسول اللہ'' کے لفظ کو معاہدے کی تحریر سے مٹا دیا جائے۔ پیغمبر اسلام نے اہلِ مکہ کی تمام شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا، صرف اِس لیے کہ اِس معاہدے کے ذریعے دونوں فریق کے درمیان امن کا ماحول قائم ہورہا تھا۔

حدیبیہ کا معاہدۂ صلح اہلِ مکہ کی یک طرفہ شرطوں کی بنیاد پر ہوا تھا۔ چناں چہ صحابہ کے اندر اس کے خلاف شدید ردعمل پیدا ہوا۔ عمر فاروق نے کہا: لما نعطي الدنية من ديننا (صحيح البخاري، رقم الحديث: 2731) یعنی ہم اپنے دین کے معاملے میں اِس ذلت آمیز معاہدے کو کیوں قبول کریں۔ ایک صحابی نے رسول اللہ سے کہا کہ آپ نے مدینہ میں اپنے ایک خواب کے حوالے سے ہم کو بتایا تھا کہ ہم عمرہ کرنے مکہ جارہے ہیں، پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ عمرہ کے بغیر درمیان سے لوٹ رہے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ کیا میں نے یہ کہا تھا کہ ہم اِسی سال مکہ جا کر عمرہ کریں گے (أفأخبرتك أنا نأتيه العام؟)۔ اِن تمام مخالفتوں کے باوجود آپ نے اہلِ مکہ سے

امن کا معاہدہ کرلیا اور حدیبیہ سے مدینہ کے لیے واپسی کا فیصلہ فرمالیا۔

معاہدہ حدیبیہ کی تکمیل کے فوراً بعد وہ سورہ اتری جو قرآن میں الفتح کے نام سے شامل ہے۔ اِس سورہ کا آغاز اِن الفاظ سے ہوتا ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (48:1) یعنی ہم نے تم کو کھلی فتح دے دی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سورہ اپنے اصحاب کو پڑھ کر سنائی تو ابتداءً صحابہ کو یہ بیان بہت عجیب معلوم ہوا۔ عمر فاروق نے کہا: أو فتح هو يا رسول الله- قال: نعم، والذي نفسي بيده إنه لفتح (القرطبي 16/261) یعنی اے خدا کے رسول، کیا یہ کوئی فتح ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ ہاں، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یقیناً وہ فتح ہے۔ اِسی طرح ایک اور صحابی نے کہا: ما هذا بفتح- فقال: بل هو أعظم الفتوح- (القرطبي 16/260) یعنی یہ تو کوئی فتح نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں وہ فتح ہے، بلکہ سب سے بڑی فتح ہے۔

معاہدہ حدیبیہ دراصل ایک تدبیر تھی۔ اُس نے عمل کے میدان کو بدل دیا۔ اِس سے پہلے اہلِ ایمان مجبور تھے کہ وہ ٹکراؤ اور جنگ کے میدان میں فریقِ ثانی سے مقابلہ کریں، لیکن اب اُن کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ وہ اپنی پوری قوت کو یکسوئی کے ساتھ دعوت کے میدان میں استعمال کریں۔ میدانِ عمل کی یہ تبدیلی بے حد اہم تھی۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ صرف دو سال کے محدود عرصے میں اسلام پورے جزیرہ عرب میں پھیل گیا۔

اِس نتیجے کو دیکھتے ہوئے مشہور تابعی ابن شہاب الزہری (وفات: 124 ہجری) نے کہا تھا کہ: لقد كان الحديبية أعظم الفتوح (القرطبي، 16/261) یعنی حدیبیہ اسلام میں سب سے بڑی فتح تھی۔ مگر یہ سادہ طور پر صرف نتیجے کی بات نہیں، بلکہ وہ منصوبہ (planning) کی بات تھی۔ یہ کوئی اتفاقی نتیجہ نہ تھا، بلکہ وہ ایک گہری منصوبہ بندی کے ذریعے پیش آنے والا منصوبہ تھا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے نصرت باعتبارِ فتح کا عنوان دیا ہے۔

یہ معاملہ دراصل نصرت بذریعہ پراسس کا معاملہ تھا۔ حدیبیہ سے پہلے تقریباً 20 سال تک بظاہر ٹکراؤ اور مخالفت کے جو واقعات پیش آرہے تھے، اُن کے ساتھ فطری طور پر ایک زیرِ سطح پراسس

جاری تھا۔ اِس پراسس کو ایک لفظ میں، منفی تعارف کہا جاسکتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہر ایک کے لیے اسلام ایک ایسی حقیقت بن گیا جو یہ تقاضا کررہا تھا کہ اُس کو براہِ راست جاننے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں، اِس صورتِ حال نے بڑے پیمانے پر اسلام کے لیے دعوت کے مواقع پیدا کردئے، جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔

معاہدہ حدیبیہ کا معاملہ بلاشبہہ ایک حکیمانہ منصوبہ بندی کا معاملہ تھا۔ یہ حکیمانہ منصوبہ بندی تمام تر فطرت کے قوانین پر مبنی ہے، اِس لیے ہر زمانے میں دوبارہ اس کا کامیاب تجربہ کیا جاسکتا ہے، جس طرح دورِ اول میں اس کا کامیاب تجربہ کیا گیا تھا ''نصرت باعتبار فتح'' کا معاملہ خصائص نبوی کا معاملہ نہیں، بلکہ وہ اسوہ نبوی کا معاملہ ہے۔ اس کو ہر زمانے میں اُسی طرح دہرایا جاسکتا ہے جس طرح پیغمبر کے دوسرے نمونوں کو دہرایا جاسکتا ہے۔

حدیبیہ اور اسوہ رسول

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21) یعنی اللہ کے رسول میں تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ اِس آیت میں 'اسوہ' کسی محدود معنی میں نہیں ہے، وہ پیغمبر کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ پیغمبر اپنی پوری زندگی کے اعتبار سے، اہلِ ایمان کے لیے ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس عموم میں استثنا صرف کسی ایسی چیز کا ہوسکتا ہے جس کو صراحتاً پیغمبر کے ساتھ خاص کیا گیا ہو۔ مثلاً ازدواج کے معاملے میں بعض پہلوؤں سے آپ کے ساتھ استثنا کا معاملہ، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (33:50)۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کا ہر قول اور ہر فعل امت کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہوگا، الا یہ کہ رسول کے کسی فعل کو صراحتاً رسول کی ذات کے ساتھ خاص کیا گیا ہو۔ اِس اصول کی روشنی میں معاہدۂ حدیبیہ کا معاملہ بلاشبہہ ایک قابلِ تقلید اسوہ رسول کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب بھی اور جہاں بھی وہ حالات پیدا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ 6 ہجری میں پیدا ہوئے تھے، تو اُس وقت اسوہ حدیبیہ اُسی طرح امت کے لیے قابلِ اتباع بن جائے گا، جس طرح وہ دورِ اول کے اہلِ ایمان کے لیے قابلِ اتباع بنا تھا۔

معاہدہ حدیبیہ ایک فتح کا معاملہ تھا۔ فتح کا معاملہ صرف پیغمبر کے لیے خاص نہیں، وہ تمام امت کے لیے یکساں طور پر مطلوب ہے۔ قرآن میں بار بار فتح کو اہلِ ایمان کے لیے ایک عمومی مطلوب کی حیثیت سے بتایا گیا ہے۔ مثلاً: وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ (61:13)۔ جب فتح پوری امت کے لیے ایک مطلوب شے ہے تو فتح کی تدبیر بھی یقینی طور پر پوری امت کے لیے ایک مطلوب شے ہوگی۔ فتح اور تدبیرِ فتح کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں تدبیرِ فتح سے مراد سیاسی فتح (political victory) نہیں ہے، بلکہ نظریاتی فتح (ideological victory) ہے۔ موجودہ زمانے میں اِس نظریاتی فتح کا امکان پوری طرح پیدا ہو چکا ہے۔ مگر اِس نظریاتی فتح کو واقعہ بنانا صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ حکمتِ حدیبیہ کو سمجھا جائے اور آج کے حالات کے لحاظ سے اس کا استعمال کیا جائے۔

حکمتِ حدیبیہ

حدیبیہ کے واقعے کو سیرت کی کتابوں میں غزوۃ الحدیبیہ کے عنوان کے تحت درج کیا جاتا ہے۔ اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حدیبیہ کا واقعہ دوسرے بہت سے غزوات میں سے ایک غزوہ تھا۔ حالاں کہ حدیبیہ کا واقعہ نہ غزوۃ تھا اور نہ دوسرے واقعاتِ نبوی کی طرح صرف ایک واقعہ۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیبیہ کا واقعہ ایک اعلیٰ درجے کا منصوبہ تھا۔ حدیبیہ کے واقعے کو، معروف معنیٰ میں، غزوہ کہنا بلاشبہہ اس کا کم تر اندازہ (underestimation) کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔

حکمتِ حدیبیہ دراصل ایک فطری قانون ہے۔ اِس قانون کا ذکر قرآن کی سورہ الفتح میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا (48:27) یعنی اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہ جانی۔ یہ قرآن کا ایک اسلوب ہے۔ اِس سے مراد اللہ کا علم غیب نہیں ہے، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اُس وقت ایک صورتِ حال موجود تھی، لیکن اس کو جاننے کے لیے ربانی عقل درکار تھی، عام آدمی اُس کو سمجھ نہیں سکتا۔ عام آدمی ہمیشہ چیزوں کو فیس ویلو (face value) پر لیتا ہے، عام آدمی صرف اُس بات کو جان پاتا ہے جو سطح پر ہوتی ہے۔ لیکن ربانی عقل رکھنے والا انسان

اپنی بصیرت کے تحت اُس حقیقت کو جان لیتا ہے جو وہاں زیرِ سطح موجود ہوتی ہے۔

6 ہجری میں عرب کے اندر یہ صورتِ حال تھی کہ بظاہر لوگ پیغمبر کے مخالف بنے ہوئے تھے، لیکن داخلی نفسیات کے اعتبار سے، ہر ایک کے اندر سکنڈ تھاٹ (second thought) آچکا تھا، یعنی شعوری یا غیر شعوری طور پر مذہبِ توحید کے بارے میں دلوں کے اندر نرم گوشہ (soft corner) کا پیدا ہونا۔ اِس کی ایک علامتی مثال خالد بن الولید (وفات: 21 ہجری) کا واقعہ ہے۔ وہ فتحِ مکہ سے کچھ پہلے ایمان لائے۔ وہ اپنے اُس وقت کے احساس کو اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں: قد شهدت هذا المواطن كلّها على محمد صلى الله عليه وسلم، فليس في مواطن أشهده إلا أنصرف وأنا أرى في نفسي أني موضع في غير شيء (حیاۃ الصحابۃ، جلد 1، صفحہ 160)

خالد بن الولید کے اِن الفاظ کو اگر جنرلائز کیا جائے تو اُس وقت کے عربوں کی اکثریت کا احساس یہی ہو چکا تھا۔ اگر چہ خارجی سطح پر ٹکراؤ اور مخالفت کا ماحول نظر آتا تھا، لیکن داخلی نفسیات کے اعتبار سے بیش تر لوگ فقد صغت قلوبکما (66:4) کا نمونہ بن چکے تھے۔

یہ صورتِ حال تھی جس کو استعمال (avail) کرنے کے لیے ایک عملِ اعتدال (process of normalization) درکار تھا، کیوں کہ معتدل ماحول کے بغیر اِس امکان کو استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یک طرفہ بنیاد پر معاہدہ حدیبیہ کرکے یہی معتدل ماحول بنایا گیا۔ اور اس کے بعد فطری طور پر وہ نتیجہ برآمد ہوا جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا (110:1-2)

ظاہرِ دنیا، باطنِ دنیا

صلح حدیبیہ 6 ہجری میں ہوئی۔ اِس واقعے کو قرآن میں فتح مبین (48:1) کہا گیا ہے۔ جس حکمت (wisdom) کے تحت حدیبیہ کا معاہدہ کیا گیا، اُس کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: فَعَلِمَ مَا لَمۡ تَعۡلَمُوۡا فَجَعَلَ مِنۡ دُوۡنِ ذٰلِكَ فَتۡحًا قَرِيۡبًا (48:27) یعنی اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہ جانی، پس اللہ نے اس سے پہلے ایک فتحِ قریب ٹھہرا دی۔

قرآن کی اِس آیت میں بظاہر دنیا کا اور آخرت کا ذکر ہے، مگر اِس آیت کا ایک توسیعی مفہوم (extended sense) بھی ہے، جس کا اشارہ آیت کے اِس لفظ میں ملتا ہے: یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (30:7)۔ گویا دنیا کا ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے۔ مگر ظاہر بیں لوگ صرف اس کے ظاہر کو جانتے ہیں، وہ اس کے باطن سے بے خبر رہتے ہیں، یعنی اکثر لوگ چیزوں کو ان کے فیس ویلو (face-value) پر لیتے ہیں، حالات کے گہرے پہلوؤں تک ان کی نظر نہیں پہنچتی۔

یہ آیت قرآن میں صلح حدیبیہ کے سیاق میں اتری۔ اِس پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے آیت پر غور کیجئے تو اس سے ایک اہم حقیقت معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سطح (surface) پر جو کچھ نظر آتا ہے، وہ صرف حالات کا ظاہری پہلو ہوتا ہے، اِس کے سوا ایک اور چیز ہوتی ہے جو انڈر کرنٹ (undercurrent) ہوتی ہے۔ جس آدمی کے اندر ربانی بصیرت ہو، وہ سطح سے گزر کر انڈر کرنٹ امکانات کو دیکھ لے گا۔ وہ سطح کی باتوں کو نظر انداز کرے گا اور جو چیز انڈر کرنٹ ہے، اس کو دریافت کرکے اس کے مطابق، اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے گا۔

یہ ایک حکمتِ حیات ہے، یعنی سطح کی باتوں کو نظر انداز کرکے انڈر کرنٹ جو حالات ہیں، ان کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کرنا۔ معاہدۂ حدیبیہ اسی حکمت کی ایک پیغمبرانہ مثال ہے۔ یہ مثال پیروانِ رسول کے لیے ایک ابدی ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے۔ پیروانِ رسول کو چاہیے کہ وہ رسول اللہ کے اِس نمونے کو اپنے حالات پر منطبق کریں اور اُس عظیم کامیابی کے حصے دار بنیں جو اِس حکمت پر اللہ نے مقدر کی ہے۔

اکیسویں صدی میں حدیبیہ منصوبہ

اکیسویں صدی میں دوبارہ وہی حالات زیادہ بڑے پیمانے پر پیدا ہو گئے ہیں جو کہ پہلی صدی ہجری میں معاہدہ حدیبیہ کے وقت عرب میں پیدا ہوئے تھے۔ اکیسویں صدی میں دوبارہ پوری طرح وہ امکان پیدا ہو گیا ہے جب کہ معاہدہ حدیبیہ کی تاریخ کو عالمی سطح پر دہرایا جائے۔ اِس امکان کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کی شرط دوبارہ وہی ہے جو دورِ اوّل میں پیش آئی، اور وہ ہے صابرانہ دانش مندی یا دانش مندانہ صبر۔

موجودہ زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ مغربی قومیں نئے ذرائع سے مسلح ہو کر پوری دنیا میں

پھیل گئیں۔ انھوں نے ہر جگہ اپنا دبدبہ قائم کر دیا۔ یہ واقعہ زیادہ بڑے پیمانے پر اٹھارھویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ اُس وقت کی دنیا میں مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم تھیں — برصغیر ہند میں مغل ایمپائر، ایشیا اور افریقہ کے بڑے رقبے میں ترک ایمپائر، وغیرہ۔ مغربی قوموں نے مسلمانوں کی اِن سلطنتوں کو مغلوب کرلیا اور ہر جگہ اپنا دبدبہ قائم کرلیا۔ اِس عمل کا نقطۂ آغاز متعین کرنا ہو تو وہ 1799 قرار پائے گا۔ اسی سال دو بڑے فیصلہ کُن واقعے ہوئے۔ ایک طرف، اِسی سال بحرِ متوسط (Mediterranean Sea) میں مغربی طاقتوں نے ترکوں کے عظیم بحری بیڑہ (naval fleet) پر حملہ کر کے اس کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ اور دوسری طرف، اِسی سال برٹش فوج نے سلطان ٹیپو کی فوج کو کامل شکست دے دی۔ اِس کے بعد برٹش جنرل نے فاتحانہ جذبے کے ساتھ کہا تھا کہ — آج انڈیا ہمارا ہے (Today, India is ours!)۔

اِس کے بعد انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں مسلسل اِس طرح کے واقعات ہوتے رہے۔ مثلاً 1857 میں انڈیا میں مغل سلطنت کا خاتمہ، 1924 میں خلافتِ عثمانی کا خاتمہ، 1948 میں اسرائیل کا قیام، اور پھر دوسری عالمی جنگ (1939-1945) کے بعد نام نہاد امریکی امپیریل ازم (American Imperialism) کا ظہور، وغیرہ۔

اِس طرح کے واقعات نے پوری مسلم دنیا میں شدید ردعمل پیدا کیا۔ ہر جگہ نفرت اور تشدد اور جہاد ایکٹوزم شروع ہوگیا۔ ہر جگہ کے مسلمانوں میں وہی جارحانہ کلچر وجود میں آگیا جس کی ترجمانی عرب شاعر خیرالدین الزرکلی (وفات: 1976) کے اِن الفاظ سے ہوتی ہے:

هاتِ صلاحَ الدين ثانيةً فينا   جدّدي حِطّين أو شبه حطينا

(صلاح الدین کو دوبارہ ہمارے درمیان لے آؤ۔ حطین یا حطین جیسا معرکہ دوبارہ گرم کرو)

واقعات بتاتے ہیں کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی دوسوسالہ مدت تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ’’جہاد ایکٹوزم‘‘ کی صدی تھی۔ تمام مسلم دنیا اِس جہاد ایکٹوزم میں شامل تھی، اِس فرق کے ساتھ کہ کچھ لوگ تقریر اور تحریر کی زبان میں نفرت اور تشدد کی بولی بول رہے تھے، اور بقیہ لوگ

باقاعدہ ہتھیاروں کے ذریعے اپنے مفروضہ دشمن کے ساتھ باقاعدہ لڑائی چھیڑے ہوئے تھے، لیکن یہ دوسوسالہ مقابلہ آرائی یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی مغلوبیت پر ختم ہوئی۔

آج ساری دنیا کے مسلمان ایک ہی بولی بول رہے ہیں— ہم مخالفین کی سازشوں سے گھرے ہوئے ہیں، ہم دشمنوں کی معاندانہ کارروائیوں کا شکار ہیں، وغیرہ۔ اِس موضوع پر آج کا مسلم پریس، عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کا خلاصہ ایک جملے میں یہ ہے کہ — ہم محاصرہ کی حالت میں ہیں (We are under siege)۔

زیرِسطح امکانات

سطح پر بظاہر وہ حالات تھے جن کو عام طور پر اینٹی مسلم حالات کہا جاتا ہے، لیکن عین اِسی مدت میں زیرِسطح کچھ دوسری سرگرمیاں بڑے پیمانے پر جاری تھیں۔ یہ سرگرمیاں وہ تھیں جو سماجی اور سیاسی اور علمی سطح پر جاری تھیں۔ اِن سرگرمیوں کے چیمپین بھی مغربی قوموں کے لوگ تھے۔ اِن سرگرمیوں کے نتیجے میں اِس مدت میں دنیا میں مذہبی آزادی آئی۔ جمہوریت کا دور آیا، امن (peace) کو خیر اعلیٰ (summum bonum) کا درجہ دے دیا گیا، رواداری (tolerance) کو ایک عالمی مسلّمہ قرار دے دیا گیا، جدید تقاضوں کے تحت ساری دنیا میں ایک نیا ذہن پیدا ہوا جس کو انسان دوست ذہن (human-friendly mind) کہا جاسکتا ہے۔ پھر اِسی کے ساتھ اِس مدت میں ٹکنالوجی کو غیر معمولی ترقی ہوئی، پرنٹنگ پریس ایجاد ہوا، الیکٹرانک کلچر وجود میں آیا۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے ایک نیا دور پیدا کیا جس کو دورِ مواصلات کہا جاتا ہے۔

اِسی کے ساتھ ایک اور ترقی بہت بڑے پیمانے پر وجود میں آئی جس کو علم یا سائنس کی ترقی کہا جاتا ہے۔ اِس ترقی نے فطرت کے اندر چھپے ہوئے حقائق انسان کے سامنے کھول دئے۔ علم کے تمام شعبوں میں انقلابی تبدیلیاں ظہور میں آئیں۔ یہ تبدیلیاں جو موجودہ زمانے میں پیدا ہوئیں، وہ عین اسلام کے حق میں تھیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، یہ اُس موافق دور کا ظہور تھا جس کی خبر پیشگی طور پر قرآن (41:53) میں دی گئی تھی۔

موافقِ اسلام دور

موجودہ زمانے میں جو تبدیلیاں ظہور میں آئی ہیں، وہ اتنی زیادہ ہیں کہ کوئی انسائکلو پیڈیا بھی ان کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ ان کے بیان کے لیے ایک پوری لائبریری کی ضرورت ہے۔ تاہم مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِن تبدیلیوں کی بنا پر تاریخ انسانی میں پہلی بار ایک نیا دور پیدا ہوا، ایک ایسا دور جس کا تصور قدیم انسان نہیں کرسکتا تھا۔ یہ دور اپنی حقیقت کے اعتبار سے، مکمل طور پر ایک موافقِ اسلام دور ہے۔

مزید یہ کہ دورِ جدید کے یہ عظیم امکانات تمام تر امن کے تصور پر مبنی ہیں۔ اِن امکانات کو استعمال کرنے کے لیے نہ جنگ کی ضرورت ہے اور نہ کوئی سیاسی ایمپائر قائم کرنے کی۔ اِن جدید مواقع کا یہ ایک حیرت انگیز پہلو ہے کہ ان کو مکمل طور پر پُر امن ذرائع کے تحت استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اِن جدید مواقع کو استعمال کرنے کے لیے کسی بھی مرحلے میں نہ جنگ کی ضرورت ہے اور نہ پولٹکل پاور کی۔

سیکولر مثال

اِن صفحات میں جو بات کہی جارہی ہے، وہ صرف ایک مذہبی بات نہیں ہے، یہ دراصل ایک اصولِ فطرت (law of nature) ہے۔ خالق نے جن اصولوں کے تحت اِس دنیا کو بنایا ہے، اُن میں سے ایک اصول یہ بھی ہے۔ اِس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ چیزیں سطح (on the surface) پر ہوتی ہیں جن کو ہر آدمی دیکھ سکتا ہے، اور کچھ زیادہ بڑی چیزیں ہوتی ہیں، مگر وہ ہمیشہ زیرِ سطح (under the surface) ہوتی ہیں۔ اِن دوسری چیزوں کو ہمیشہ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو بصیرت (wisdom) رکھنے والے ہیں۔ اِس دنیا میں زیادہ بڑی کامیابی صرف اُن لوگوں کے لیے مقدر ہے جو انڈر کرنٹ چیزوں کو دیکھ سکیں اور اس کے مطابق، اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔

اِس کی ایک مثال جاپان ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان محوری گروپ (Axis powers) کے ساتھ تھا۔ اُس زمانے میں جاپان ایک تشدد پسند قوم کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن جنگ کے دوران امریکا نے جاپان پر ایٹمی حملہ کیا۔ اس نے جاپان کے دوشہر ہیروشیما (Hiroshima) اور ناگاساکی (Nagasaki) پر اگست 1945 میں دو ایٹم بم گرائے۔ یہ جاپان کے لیے ایک ہلاکت خیز تجربہ تھا۔ اِس کے بعد جاپان بظاہر

پوری طرح ایک تباہ شدہ ملک بن گیا۔ اُس وقت جاپان کا سیاسی لیڈر ہیروہٹو (Hirohito) تھا۔ ہیروہٹو ایک مدبر آدمی تھا۔ اس نے اپنی بصیرت سے یہ جانا کہ سرفیس پر جو حالات ہیں، وہ بظاہر جاپان کے لیے ناموافق ہیں، لیکن انڈر کرنٹ جو صورتِ حال ہے، وہ جاپان کے لیے ایک موافق امکان کی حیثیت رکھتی ہے۔

اُس وقت کی دنیا میں دو بڑی طاقتیں تھیں — روس اور امریکا۔ دونوں ملک بھاری مصنوعات (hardware) میں مشغول تھے اور ہلکی مصنوعات (software) کا میدان تقریباً خالی تھا۔ جاپان نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس حقیقت کو جانا اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ اِس مخفی امکان کو استعمال کرے۔

اِس کے بعد جاپان نے دو کام کیے۔ ایک طرف، جاپان نے یہ کیا کہ اس نے امریکا سے ٹکراؤ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیا، اور اپنی ساری توجہ تعلیم اور صنعت کے میدان کی طرف موڑ دیا۔ اِس کے بعد جو ہوا، وہ یہ کہ تقریباً 30 سال کے اندر جاپان کی ایک نئی تاریخ وجود میں آ گئی۔ جاپان نے نہ صرف جنگ کے نقصانات کی تلافی کر دی، بلکہ اس نے اتنی ترقی کی وہ جدید دور میں اقتصادی سپر پاور (economic superpower) بن گیا۔ یہ معجزہ اِس طرح پیش آیا کہ جاپان نے سرفیس کے حالات کو نظر انداز کیا اور انڈر کرنٹ جو امکانات چھپے ہوئے تھے، ان کو استعمال کیا۔

اِس معاملے کی دوسری مثال وہ ہے جو انڈیا میں پیش آئی۔ انڈیا میں تقریباً 200 سال تک برٹش حکومت قائم رہی۔ 1857 میں انڈیا میں آزادی کی لڑائی شروع ہوئی۔ یہ لڑائی ہتھیاروں کے بل پر شروع کی گئی تھی۔ اِس جنگ میں کچھ مسلم لیڈر اور کچھ ہندو لیڈر شریک تھے۔ آزادی کی یہ جنگ تقریباً 60 سال تک جاری رہی، مگر اس کا نتیجہ تباہی کے سوا کسی اور صورت میں نہیں نکلا۔ آخر کار 1919 میں مہاتما گاندھی سیاست کے میدان میں آئے اور انھوں نے جنگ آزادی کی قیادت سنبھالی۔ اُس وقت انڈیا بظاہر ایک تباہ شدہ ملک بنا ہوا تھا، لیکن مہاتما گاندھی نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس حقیقت کو جانا کہ یہاں انڈر کرنٹ ایک اور صورتِ حال موجود ہے جو انڈیا کے لیے ایک موافق امکان کی حیثیت رکھتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ تشدد کا طریقہ چھوڑ کر امن کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

یہ انڈر کرنٹ امکان کیا تھا، وہ یہ تھا کہ جس زمانے میں برطانیہ انڈیا پر حکومت کر رہا تھا، اُسی

زمانے میں یورپ کے ملکوں میں شاہی خاندان راج کر رہے تھے — اِن یورپی ملکوں میں اِن حکومتوں کے خلاف بہت بڑے پیمانے پر تحریکیں اٹھیں۔ بڑے بڑے یورپی دماغوں نے یہ نظریہ پھیلایا کہ کسی خاندان کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی ملک پر حکومت کرے۔ اِس سیاسی تحریک کے نتیجے میں ایک سیاسی اصول پورے یورپ میں ایک مسلّم اصول بن گیا۔ اِس اصول کو عام طور پر حکومتِ خود اختیاری (self-determination) کا اصول کہا جاتا ہے:

The right of a people to decide upon its own form of government without coercion or outside influence.

یہ سیاسی انقلاب یورپ میں پہلے فکری سطح پر آیا۔ اس کے بعد اس نے عملی صورت اختیار کی۔ اِس سیاسی انقلاب کا پہلا عملی اظہار فرانس میں ہوا۔ یہ فرنچ ریولوشن (French Revolution) تھا جو 1789 میں پیش آیا۔ اِس انقلاب کے بعد فرانس میں شخصی بادشاہت ختم ہوگئی اور جمہوری حکومت قائم ہوگئی۔ دھیرے دھیرے یہ انقلاب پورے یورپ میں پھیل گیا۔

مہاتما گاندھی نے اِس سیاسی مسلّمہ کو استعمال کیا۔ انھوں نے کہا کہ خود یورپ کے حالات بتاتے ہیں کہ اب بادشاہت کا دور ختم ہو چکا ہے اور ہر ملک کو حق ہے کہ وہ اپنے یہاں قومی حکومت قائم کرے۔ مہاتما گاندھی نے اِس اصول کو لے کر انڈیا کی تحریک آزادی کو نیا رخ دے دیا۔ انھوں نے تشدد کا طریقہ چھوڑ کر پورے معنوں میں پرامن طریقہ اختیار کیا، جس کو وہ اہنسا (non-violence) کہتے تھے۔ مہاتما گاندھی کی یہ پرامن جدوجہد جہد آزادی برٹش حکومت کے لیے نیا مسئلہ بن گئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ پہلے، جدوجہد آزادی کو دبانا آسان تھا۔ کیوں کہ وہ لوگ برٹش حکومت کے خلاف ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ اِس طرح برٹش حکومت کو موقع ملتا تھا کہ وہ ان کے خلاف ہتھیار استعمال کر کے انھیں کچل دے۔ اِس تبدیلی نے برٹش حکمرانوں سے ہتھیار کے استعمال کا جواز چھین لیا۔ اِس صورت حال کا اندازہ ایک واقعے سے ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں ایک برٹش کلکٹر نے اپنے سیکریٹریٹ کو یہ تار بھیجا — براہِ کرم، بذریعہ ٹیلی گرام یہ بتائیے کہ ''شیر'' کو ہتھیار کے استعمال کے بغیر کیسے ہلاک کیا جائے:

Kindly wire instructions how to kill a tiger non-violently.

یہ ایک سیکولر مثال ہے کہ کس طرح ایک لیڈر نے اپنے زمانے کے انڈر کرنٹ حالات کو سمجھا اور کامیابی کے ساتھ اس کو استعمال کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ اصول فطرت کا ایک اصول ہے۔ یہ ایک فطری امکان ہے جو ہمیشہ اور ہر صورتِ حال میں موجود رہتا ہے۔ اِس امکان کو ہر بڑے مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ سیکولر مقصد ہو یا مذہبی مقصد۔ یہی امکان موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے لیے پوری طرح موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو سمجھا جائے اور حقیقت پسندانہ انداز میں اپنے عمل کی منصوبہ بندی کر کے حکیمانہ انداز میں اس کو استعمال کیا جائے۔

فضلِ عظیم کا معاملہ

قرآن کی سورہ النساء میں ایک آیت اِن الفاظ میں آئی ہے: وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (4:113) یعنی اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو اُن میں سے ایک گروہ نے یہ ٹھان لیا تھا کہ وہ تم کو بہکا کر رہے گا، حالاں کہ وہ اپنے آپ کو بہکا رہے ہیں، وہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تم کو وہ چیز سکھائی ہے جس کو تم نہیں جانتے تھے، اور اللہ کا فضل ہے تم پر بہت بڑا۔

قرآن کی اِس آیت میں 'فضل' کا لفظ کسی پُراسرار معنی میں نہیں ہے۔ فضل کے لفظی معنی ہیں: زیادہ یا شئ مزید (additional thing)۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے علاوہ ایک مزید چیز دی گئی جو کہ ختم نبوت کا رول ادا کرنے کی نسبت سے آپ کے لیے ضروری تھی، یعنی وہ اسباب یا مواقع جن کو استعمال کر کے آپ خاتم النبیین کی حیثیت سے اپنا فریضہ انجام دے سکیں۔ مثلاً ہاجرہ اور اسماعیل کے ذریعے سے ایک نئی نسل کی تیاری جس کا ذکر قرآن کی سورہ ابراہیم (14) کی آیت نمبر 37 میں کیا گیا ہے، یا ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر دونوں کو کمزور کر دینا، جس کا اشارہ قرآن کی سورہ الروم کی آیت نمبر 2 میں کیا گیا ہے۔ مذکورہ آیت (4:113) میں اِسی قسم کی

نصرت مراد ہے، نہ کہ پُراسرار قسم کی کوئی شخصی فضیلت۔ نصرت کا یہ خصوصی معاملہ پیغمبر کے مشن کی نسبت سے تھا، نہ کہ پیغمبر کی ذات کی نسبت سے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں علم کی تعلیم (وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ) سے مرادِ علمِ وحی نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد مذکورہ قسم کے موافق امکانات سے پیغمبر کو باخبر کرنا ہے۔ یہی اسلوب سورہ الفتح (48) میں اختیار کیا گیا ہے جہاں 'علم ما لم تعلموا' کا لفظ آیا ہے۔ سورہ الفتح کی اِس آیت میں علم سے مراد وہ موافق امکانات ہیں جو معاہدہ حدیبیہ کے اندر باعتبار نتیجہ چھپے ہوئے تھے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے پچھلے زمانوں میں ہزاروں سال کے دوران بہت سے پیغمبر بھیجے (23:44)۔ اِن پیغمبروں نے نبوت کا فریضہ پوری طرح انجام دیا، لیکن ان کا مشن صرف اعلانِ توحید تک پہنچا۔ اُن میں سے کسی کے زمانے میں نہ مطلوب قسم کی امت بنی اور نہ دینِ خداوندی کا متن محفوظ ہوسکا اور نہ توحید پر مبنی عمومی انقلاب آیا، جو کہ اللہ تعالی کو مقصود تھا۔

یہی وجہ تھی جس کی بنا پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے لیے اللہ تعالی نے خصوصی اسباب فراہم کیے۔ اِن اسباب کو استعمال کر کے یہ ممکن ہوا کہ دنیا میں توحید پر مبنی انقلاب آئے اور دینِ خداوندی کی نئی تاریخ بنے۔ پیغمبر اسلام کے لیے وحی کے علاوہ، جو مزید موافق اسباب فراہم کیے گئے، اِنھیں کو قرآن میں فضل کہا گیا ہے، یعنی اضافی اسباب یا مزید نصرت۔ اللہ تعالی نے ایک لمبی مدت کے اندر یہ اضافی اسباب فراہم کیے، یہاں تک کہ رسول اور اصحابِ رسول کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ اِن اسباب کو استعمال کر کے وہ اللہ تعالی کے منصوبے کی تکمیل کریں۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں 'وعلّمك ما لم تكن تعلم' اُس وحی کے لیے نہیں ہے جو قرآن کی صورت میں آپ پر نازل ہوئی، بلکہ اِس سے مراد وہ علم ہے جس کا تعلق مذکورہ موافق امکانات سے ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالی نے خصوصی طور پر اِن موافق امکانات کی خبر دی، تاکہ آپ شعوری طور پر اِن امکانات سے واقف ہوں اور ان کو اپنے مشن کے حق میں استعمال کرسکیں۔

6 ہجری میں پیغمبر اسلام اور قریش کے درمیان حدیبیہ کے مقام پر جو معاہدہ ہوا تھا،

وہ اس معاملے کی ایک واضح مثال ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، حضرت عمر فاروق کو اِس معاہدے پر سخت اختلاف ہوگیا تھا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس کا ایک حصہ کتابوں میں اِس طرح نقل ہوا ہے: قال عمر: فأتيتُ أبابكر، فقلتُ يا أبابكر، أليس هذا نبي الله حقاً؟ قال: بلى- قلت: ألسنا على الحق وعدونا على الباطل؟ قال: بلى، قلتُ: فلم نعطي الدنية في ديننا إذاً؟ قال: أيها الرجل، إنه رسول الله وليس يعصي ربه، وهو ناصره، فاستمسك بغرزه، فوالله إنه على الحق - (تفسير ابن كثير 4 / 199) یعنی عمر فاروق کہتے ہیں کہ پھر میں ابوبکر کے پاس گیا۔ میں نے کہا کہ اے ابوبکر، کیا رسول اللہ نبی برحق نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ضرور آپ نبی برحق ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم حق پر ہیں اور ہمارا دشمن باطل پر ہے۔ انھوں نے کہا کیوں نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر کیوں ہم اپنے دین کے معاملے میں ذلت کو اختیار کریں۔ ابوبکر نے کہا کہ اے شخص، وہ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ کبھی اپنے رب کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ اللہ ضرور ان کی مدد کرے گا۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو لازم پکڑو۔ خدا کی قسم، وہ حق پر ہیں۔

دورِ جدید کی مثال

قرآن کی مذکورہ آیت میں اللہ کے جس 'فضل عظیم' کا ذکر ہے، اس کا ظہور صرف ایک بار نہیں ہوا، بلکہ خدا کی دوسری رحمتوں کی طرح وہ بھی تاریخ میں بار بار دہرایا جارہا ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ فضل یا اضافی نصرت بہت بڑے پیمانے پر ظاہر ہوچکی ہے۔ اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ اس کو پہچانیں اور اس کو خدائی مشن کے حق میں بھرپور طور پر استعمال کریں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اِس لیے بھیجا، تاکہ وہ سارے عالم کو امرِ حق سے آگاہ کردے (25:1)۔ اِس آیت میں جس عالمی نشانے کا ذکر ہے، وہ اول دن سے مطلوب تھا، مگر اللہ کے تخلیقی نقشے کے مطابق، اِس دنیا میں کسی نشانے کی تکمیل کراماتی طور پر نہیں ہوتی، بلکہ وہ اسباب کے ذریعے ہوتی ہے۔

اِس عالمی دعوتی نشانے کو انجام دینے کے لیے قدیم زمانے میں عالمی مواصلات کا نظام عملاً موجود نہ تھا، اِس بنا پر مطلوب نشانہ بھی قدیم زمانے میں پورا نہ ہو سکا۔

اِس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں ایک نیا پراسس جاری کیا۔ اِس پراسس کی تکمیل باقاعدہ طور پر انیسویں صدی میں ہوئی۔ انیسویں صدی اور اس کے بعد کی صدی میں وہ تمام اسباب وجود میں آ گئے جو دینِ حق کی عالمی پیغام رسانی کے لیے ضروری تھے۔ آج جس چیز کو دورِ مواصلات کہا جاتا ہے، وہ دراصل اِسی خدائی منصوبے کے تحت وجود میں آیا ہے۔

یہ دورِ مواصلات اور اِس نوعیت کے دوسرے تائیدی ذرائع گویا کہ دورِ جدید کے 'فضل عظیم' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر اسلام کو اُس زمانے کے اعتبار سے فضلِ عظیم یا موافق اسباب دیے گئے تھے، موجودہ زمانے میں پیغمبر کی امت کو دوبارہ جدید تقاضوں کے مطابق، فضلِ عظیم یا موافق اسباب عطا کیے گئے ہیں۔ اب امت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے زمانے کے فضلِ عظیم کو پہچانے اور اس کو استعمال کر کے اپنے آپ کو اللہ کی عظیم سعادتوں کا مستحق بنائے۔

حدیبیہ انقلاب

قدیم ترین زمانے سے انسان کا یہ ذہن رہا ہے کہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کا سب سے زیادہ طاقت ور ذریعہ جنگ ہے۔ عربی زبان کی ایک قدیم مثل ہے: الحرب أنفى للحرب (جنگ کی کاٹ جنگ ہے)۔ انگریزی زبان میں کہا جاتا ہے — وار فار پیس (war for peace)، یعنی پُرامن مقصد حاصل کرنا ہے تو جنگ کرو۔ فارسی کے ایک قدیم شاعر نے کہا تھا کہ جو شخص تلوار چلاتا ہے، اُسی کے نام کا سکہ چلتا ہے:

ہر کہ شمشیر زند سکّہ بہ نامش خوانند

مگر تاریخ کا تجربہ برعکس طور پر یہ بتاتا ہے کہ جنگ سے کبھی کسی نے کوئی مثبت فائدہ حاصل نہیں کیا۔ ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ جنگ میں جو فریق ہارتا ہے، وہ اپنی ہار کو تسلیم نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہارنے والے فریق کے اندر انتقام (revenge) کی نفسیات جاگ اٹھتی ہے۔ وہ دوبارہ اپنی قوتوں کو مجتمع کرتا ہے اور فاتح فریق کے خلاف انتقامی جنگ چھیڑ دیتا ہے۔ یہی واقعہ بار بار ہوتا رہتا ہے۔ اِس طرح عملاً یہ ہوتا ہے کہ جنگ سے ہمیشہ ایک دورِ برائی (vicious circle) قائم ہو جاتا ہے:

war-defeat-revenge, war-defeat-revenge

مسلم تاریخ بھی اِس معاملے میں استثنا (exception) کی مثال نہیں۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ بتاتی ہے کہ 2 ہجری میں بدر کی لڑائی پیش آئی۔ اِس جنگ میں اہلِ ایمان کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔ انھوں نے فریقِ ثانی کے 70 افراد کو قتل کر دیا، لیکن مسئلہ ختم نہیں ہوا۔ عملاً یہ ہوا کہ شکست خوردہ فریق انتقامی نفسیات میں مبتلا ہو گیا۔ مکہ لوٹ کر اس نے نئی جنگ کی تیاری شروع کر دی اور پھر 3 ہجری میں اس نے انتقامی جذبے کے تحت مدینہ پر حملہ کر دیا۔

اس کے نتیجے میں وہ جنگ پیش آئی جس کو جنگ احد کہا جاتا ہے۔ جنگ احد میں اہلِ ایمان کو شکست ہوئی اور فریقِ مخالف نے اِس جنگ میں اہلِ ایمان کے 70 افراد کو قتل کر دیا۔ جنگ کے خاتمے پر

فریقِ مخالف کے سردار ابوسفیان نے ایک پہاڑی کے اوپر کھڑے ہوکر بلند آواز سے کہا: یوم بیوم بدر (آج ہم نے بدر کا بدلہ لے لیا)۔

تجربہ بتاتا ہے کہ پوری تاریخ میں اربابِ کار اِس حقیقت سے بے خبر رہے کہ انسان کی انتقامی نفسیات اِس میں رکاوٹ ہے کہ جنگ کے ذریعے کوئی مثبت مقصد حاصل کیا جاسکے۔ ایسی حالت میں قابلِ عمل طریقہ صرف یہ ہے کہ جنگ کے بجائے صلح کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ صلح کا فائدہ یہ ہے کہ فریقین کے درمیان پُرامن ماحول قائم ہوجاتا ہے۔ اِس طرح یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ حالات کے اندر چھپے ہوئے مواقع (opportunities) کو دریافت کرکے انھیں استعمال (avail) کیا جائے۔ اِس مصالحانہ پالیسی کے تحت کامیابی کا حصول پوری طرح ممکن ہوجاتا ہے، کیوں کہ مواقع کے استعمال ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

خدائی منصوبہ بندی

اِس معاملے میں انسان کو صحیح رہنمائی دینے کے لیے اللہ نے تاریخ میں مداخلت کا فیصلہ کیا۔ یہ واقعہ ساتویں صدی عیسوی کے نصف اول میں پیش آیا۔ اللہ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس کا ذریعہ بنایا۔ اِس کا آغاز ایک خواب سے ہوا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت مدینہ میں تھے۔ یہاں آپ نے ایک خواب دیکھا۔ اِس خواب کے مطابق، آپ ذوالقعدہ 6 ہجری میں اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اِس کے بعد مختلف واقعات پیش آئے۔ آخر کار طویل گفت وشنید (negotiation) کے بعد فریقین کے درمیان وہ معاہدہ طے پایا جس کو تاریخ میں معاہدہ حدیبیہ (Hudaibia Agreement) کہا جاتا ہے۔

یہ معاہدہ اپنی تفصیلات کے اعتبار سے، کئی شرطوں پر مشتمل تھا، لیکن اس کی بنیادی شرط صرف ایک تھی، وہ یہ کہ دس سال تک دونوں فریقوں کے درمیان کوئی جنگ نہ ہوگی۔ اِس شرط کے الفاظ یہ تھے: هذا ما صالح عليه محمد بن عبد الله سهيل بن عمرو اصطلحا على وضع الحرب عن الناس عشر سنين، يأمن فيهن الناس ويكف بعضهم عن بعض (سیرۃ ابن کثیر: 3/321) یعنی

یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبد اللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے ہوا۔ دونوں اِس پر رضا مند ہوئے کہ دونوں کے درمیان دس سال تک جنگ نہیں ہوگی۔

معاہدہ حدیبیہ دراصل دس سال کے لیے ایک ناجنگ معاہدہ (no-war packt) تھا۔ مگر دونوں فریقوں کے درمیان اُس وقت دشمنی کا جو ماحول تھا، اُس کے اعتبار سے اِس قسم کا معاہدہ ایک ایسا معاہدہ تھا جو عملاً ناممکن نظر آتا تھا۔ چناں چہ بظاہر یہ ناممکن چیز صرف اُس وقت ممکن ہوئی، جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فریقِ ثانی کی کڑی شرطوں کو یک طرفہ طور پر منظور کرلیا۔

مثلاً ایک شرط یہ تھی کہ مکہ کا کوئی شخص اگر اسلام قبول کر کے مدینہ آئے تو اس کو دوبارہ مکہ والوں کی طرف لوٹانا ہوگا۔ اِس کے برعکس، مدینے کا کوئی شخص اگر مکہ چلا جائے تو اہلِ مکہ کو حق ہوگا کہ وہ اس کو مکہ میں روک لیں اور دوبارہ اس کو مدینہ واپس نہ کریں۔ اِسی طرح اِس معاہدے کی ایک شرط یہ تھی کہ تمام اہلِ ایمان اِس سال حدیبیہ سے مدینہ واپس چلے جائیں، وہ عمرہ کے لیے مکہ میں داخل نہ ہوں۔

معاہدہ حدیبیہ ایک کاغذ پر لکھا گیا تھا۔ حضرت علی بن ابی طالب اس کی کتابت کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق، انھوں نے پہلا جملہ یہ لکھا: ھذا ما صالح علیہ محمد رسول اللہ۔ فریقِ ثانی کے نمائندہ سہیل بن عمرو نے اِس پر اعتراض کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے، اِس لیے آپ صرف ''محمد بن عبد اللہ'' لکھیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے کہا کہ تم کاغذ پر ''رسول اللہ'' کا لفظ مٹا دو اور صرف ''محمد بن عبد اللہ'' لکھو۔ حضرت علی کاغذ سے ''رسول اللہ'' کا لفظ مٹانے پر راضی نہ ہوئے۔ اِس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کو اپنے ہاتھ سے کاغذ سے مٹا دیا۔

اِس معاہدے کی تکمیل کے بعد رسول اور اصحاب رسول مدینہ واپس آ گئے۔ اِس معاہدے سے پہلے دونوں فریقوں کے درمیان مسلسل طور پر ایک حالتِ جنگ (state of war) قائم تھی۔ اِس بنا پر اسلام کا دعوتی مشن عملاً تقریباً متروک ہو کر رہ گیا تھا۔ معاہدہ حدیبیہ کے بعد یہ ہوا کہ دونوں فریقوں کے درمیان مکمل امن قائم ہو گیا۔ اب پیغمبر اور آپ کے اصحاب نے دعوت کا نیا منصوبہ بنایا۔ انھوں نے

منظم انداز میں مدینہ کے اطراف میں مسلسل طور پر دعوتی کام شروع کردیا۔عرب کے مختلف علاقوں میں آبادقبائل کے درمیان وفود بھیج کر دعوتی کام کیا جانے لگا، حتی کہ عرب کے باہر جو حکومتیں قائم تھیں، اُن کے یہاں دعوتی وفود بھیجے جانے لگے۔خود مکہ میں رشتے داروں کے ذریعے آمدورفت جاری ہوگئی۔اِس طرح خود مکہ میں توحید کی آواز پہنچنے لگی۔

پرامن ماحول میں اِس طرح دعوتی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ کثرت سے اسلام کے حلقے میں داخل ہونے لگے، یہاں تک کہ صرف دو سال کے اندر اہلِ ایمان کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ یہ ممکن ہوگیا کہ جنگ کے بغیر خود اہلِ ایمان کی تعداد اسلام کی فتح کے لیے کافی ہوجائے۔چناں چہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموش منصوبہ بندی کے تحت دس ہزار اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف مارچ کیا۔اِس طرح کسی جنگ کے بغیر مکہ پر اہلِ ایمان کا غلبہ قائم ہوگیا۔توحید کی آواز انسانی فطرت کی آواز ہے۔اگر معتدل ماحول میں دعوتی کام ہوتو پرامن دعوت ہی لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنے کے لیے کافی ہوجائے۔روایات میں آیا ہے کہ جب اچانک ایک صبح کو اہلِ مکہ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ مکہ میں داخل ہوگئے ہیں تو مکہ کے سردار ابو سفیان نے یہ اعلان کردیا: یامعشر قریش، هذا محمد قد جاءکم فیما لا قِبل لکم به، فمن دخل دار أبي سفيان فهو آمن (سیرۃ بن هشام: 4/23) یعنی اے قریش کے لوگو، یہ محمد ہیں جو اِس طرح مکہ میں داخل ہوگئے ہیں کہ تمھارے اندر اُن کے مقابلے کی طاقت نہیں۔

معاہدۂ حدیبیہ کے نتیجے میں جو تاریخی واقعہ پیش آیا، اس کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:1-2) یعنی جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح، اور تم لوگوں کو دیکھو کہ وہ فوج در فوج خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔

قرآن کی اِس آیت میں 'نصر اللہ' سے مراد وہی چیز ہے جس کو دوسرے مقام پر نصرِ عزیز (48:1-2) کہا گیا ہے۔'یَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا' کے الفاظ میں اُس واقعے کا ذکر ہے جو

معاہدہ حدیبیہ کے بعد پیش آیا۔لوگ اتنی بڑی تعداد میں اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے کہ ان کی کثرتِ تعداد ہی فتح کا سبب بن گئی۔

حکمتِ حدیبیہ

نزاع (conflict) کے معاملے میں انسان قدیم زمانے سے صرف یہ جانتا تھا کہ ایسے معاملے میں صرف دو میں سے ایک کا انتخاب (choice) ہوتا ہے — جنگ یا پسپائی۔مگر انسان کی یہ سوچ ثنائی طرزِ فکر (dichotmous thinking) پر مبنی تھی۔قانونِ فطرت کے مطابق، یہاں ایک اور انتخاب ممکن تھا جس سے پوری تاریخ میں انسان بے خبر رہا۔

وہ انتخاب یہ تھا کہ یک طرفہ صلح کے ذریعے امن قائم کیا جائے اور پھر حکیمانہ منصوبہ بندی کے ذریعے موجود مواقع (opportunities) کو بھرپور طور پر استعمال (avail) کیا جائے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ نہ فریقِ ثانی سے ٹکراؤ کیا جائے اور نہ پسپائی کا طریقہ اختیار کیا جائے، بلکہ خاموش منصوبہ بندی کے ذریعے امن کی طاقت (power of peace) کو استعمال کیا جائے۔حدیبیہ کے تاریخی واقعے کے تحت اللہ تعالی نے رسول اور اصحاب رسول کے ذریعے اِس حکمت کا عملی مظاہرہ (practical demonstration) کروایا۔

مگر یہ تاریخ کا عجیب سانحہ ہے کہ حکمتِ حدیبیہ کے کامیاب مظاہرے کے باوجود مسلم اور غیر مسلم دونوں اِس عظیم حقیقت سے بے خبر رہے۔تاریخ میں حکمت حدیبیہ کو صرف ایک بار استعمال کیا گیا، نہ اُس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔انسان ہمیشہ امن کے بارے میں سوچتا رہا ہے، حتی کہ امن باقاعدہ مطالعے کا ایک مستقل موضوع بن گیا ہے جس کو پیسیفزم (pacifism) کہا جاتا ہے۔اِس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔اِس موضوع پر ایک انسائکلو پیڈیا بھی تیار کی گئی ہے جس کا نام انسائکلو پیڈیا آف پیسیفزم (*Encyclopaedia of Pacifism*) ہے، مگر اب تک کوئی قابل عمل نظریۂ امن (ideology of peace) دریافت نہ ہو سکا۔

روسی مصنف لیو ٹالسٹائے (وفات: 1910) کی امن کے موضوع پر ایک مشہور کتاب ہے۔

ورلڈ لٹریچر میں وہ ٹاپ کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ امن کا قیام صرف عالمی محبت (universal love) کے تصور پر قائم ہوسکتا ہے۔ اُس کی اِس روسی کتاب کا ترجمہ مختلف عالمی زبانوں میں ہوا ہے۔ انگریزی ترجمے کا ٹائٹل یہ ہے:

War and Peace, by LeoTolstoy—1865

مگر جیسا کہ معلوم ہے، ٹالسٹائے کی کتاب صرف ایک ناول ہے، یعنی وہ فکشن کے پیرایے میں لکھی گئی ہے، اور کوئی فکشن حقیقی زندگی (real life) کے لیے گائڈ بک نہیں بن سکتا۔

قرآن کا بیان

معاہدہ حدیبیہ ذوالقعدہ 6 ہجری میں طے پایا۔ اس کے فوراً بعد قرآن کی سورہ الفتح نازل ہوئی۔ اِس سورہ کی ابتدائی تین آیتیں یہ تھیں: إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ○ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ○ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا (48:1-3) یعنی بے شک ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح دے دی تا کہ اللہ تمھاری اگلی اور پچھلی خطائیں معاف کردے اور تمھارے اوپر اپنی نعمت کی تکمیل کردے اور تم کو سیدھا راستہ دکھائے اور تم کو زبردست مدد عطا کرے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ الفتح دورانِ سفر اُس وقت اتری جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاہدہ حدیبیہ کی تکمیل کے بعد حدیبیہ سے مدینہ جارہے تھے۔ اُس وقت جو واقعہ ہوا تھا، وہ صرف معاہدۂ امن تھا۔ جہاں تک فتح کی بات ہے، وہ ابھی مستقبل کی چیز بنی ہوئی تھی۔ پھر کیوں ایسا ہوا کہ ماضی کے صیغے میں ارشاد ہوا کہ ہم نے تم کو فتح دے دی، کھلی ہوئی فتح۔ یہ اسلوب دراصل امن کی اہمیت بتانے کے لیے تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب حقیقی معنوں میں پر امن طریقہ (peaceful method) اختیار کیا جائے، تو اُس کے بعد موافق نتیجے کا نکلنا یقینی ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ 'لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ' اِس آیت میں 'ذنب' کا لفظ ہے۔ 'ذنب' کے لفظی معنی گناہ (sin) کے ہوتے ہیں۔ مگر یہاں 'ذنب' کا لفظ اپنے معروف معنی کے اعتبار سے

نہیں ہے، بلکہ وہ شدتِ اظہار کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالی نے ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر یک طرفہ امن کی طرف رہنمائی کی تو تمھارے اندر اِس کے درست ہونے پر شک کیوں پیدا ہوا۔ جیسا کہ روایات میں آیا ہے، صحابہ نے اِس معاہدے پر برہمی کا اظہار کیا تھا۔ حضرت عمر فاروق نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ: لم نعطي الدنية في ديننا (ہم اپنے دین کے بارے میں ذلت کا طریقہ کیوں اختیار کریں)۔ اِسی طرح یہاں 'مغفرت' سے مراد معروف معنی میں بخشش (salvation) نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ تحریک توحید کے دوران اہلِ ایمان سے تدبیر کے اعتبار سے جو خطائیں ہوئیں، اُن کو موثر نہ ہونے دینا، اِن تدبیری خطاؤں کے باوجود آخری کامیابی کو یقینی بنانا۔

آیت میں واحد کا صیغہ (ليغفر لك) استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، مگر یہ خطاب نمائندہ ہونے کے اعتبار سے ہے، یعنی اُس وقت رسول کی حیثیت جماعتِ مسلمین کے نمائندہ کی تھی۔ گویا اِس آیت میں رسول کو خطاب کرتے ہوئے پوری جماعتِ مسلمین کو مخاطب بنایا گیا ہے۔ بہ اعتبار حقیقت، اس سے مراد اُس وقت کے اہلِ ایمان کی پوری جماعت ہے۔ اِس تفسیر کا ایک قرینہ یہ ہے کہ قرآن میں اِس معاملے کو 'إنا فتحنا لك' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، حالاں کہ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ یہ فتح پیغمبر اسلام کی شخصی فتح نہ تھی، وہ اس وقت کی تمام جماعتِ مومنین کی اجتماعی فتح تھی۔ اِس کا دوسرا قرینہ یہ ہے کہ آگے اِس سورہ کی آیت نمبر 5 میں جمع کے الفاظ آئے ہیں۔ (48:8)

اِس آیت میں اتمامِ نعمت سے مراد وہ چیز نہیں ہے جس کو دوسرے مقام پر اکمالِ دین (6:3) کہا گیا ہے۔ سورہ الفتح میں اتمامِ نعمت سے مراد وہ حکیمانہ تدبیر ہے جس کی تلقین حدیبیہ کے معاملے میں اللہ کی طرف سے کی گئی تھی۔ آگے فرمایا کہ 'ويهديك صراطا مستقيما'۔ اِس آیت میں صراطِ مستقیم کا لفظ ایک مختلف معنی میں آیا ہے۔ سورہ الفاتحہ میں صراطِ مستقیم سے مراد انفرادی صراطِ مستقیم ہے اور سورہ الفتح میں صراطِ مستقیم سے مراد اجتماعی صراطِ مستقیم۔

آخر میں فرمایا کہ: وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا۔ اِس آیت میں نصرِ عزیز سے مراد عام فتح

نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ فتح ہے جو مکمل طور پر پُرامن تدبیر کے ذریعے حاصل ہو، جیسا کہ معاہدۂ حدیبیہ کے بعد پیش آیا۔ نصرِ عزیز کا یہ مفہوم قرآن کی سورہ النصر (110) سے مزید واضح ہوتا ہے۔ اِس سورہ میں 'نصر اللہ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ 'نصر اللہ' (خدائی فتح) کس طرح حاصل ہوئی۔ واضح طور پر وہ اُس پرامن تدبیرِ حکمت کے ذریعے حاصل ہوئی جو معاہدہ حدیبیہ کے وقت اختیار کی گئی تھی۔

حدیبیہ کلچر

معاہدہ حدیبیہ سادہ طور پر صرف ایک معاہدہ نہ تھا۔ معاہدہ حدیبیہ کے ذریعے انسان کے اوپر ایک عظیم حکمت (wisdom) کو کھولا گیا، یعنی یہ حکمت کہ اجتماعی زندگی میں کامیابی کا طریقہ کیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں 2 ہجری میں بدر کی لڑائی پیش آئی۔ اِس لڑائی میں اہلِ ایمان کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی، لیکن اِس کے صرف ایک سال بعد احد کی لڑائی پیش آئی۔ اِس لڑائی میں فریقِ ثانی نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے لڑائی کے میدان میں اہلِ ایمان کے 70 آدمیوں کو ہلاک کردیا۔ ایسا انتقامی نفسیات کی بنا پر ہوا۔ بدر کی لڑائی اہلِ ایمان کے لیے فتح تھی، لیکن فریقِ ثانی کے لیے وہ انتقام کے ہم معنی بن گئی:

Battle of Badr was victory for Muslims and revenge for the other party.

اِس تجربے سے معلوم ہوا کہ جنگ مسئلے کا حل نہیں۔ جنگ میں کامیابی صرف اُس وقت مسئلے کا حل بن سکتی ہے جب کہ فریقِ ثانی اپنی شکست (defeat) کو تسلیم کرے۔ مگر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ہارا ہوا فریق اپنی ہار کو نہیں مانتا، بلکہ اس کے اندر انتقام کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ اِس بنا پر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ جنگ کبھی مسئلے کو ختم کرنے والی ثابت نہیں ہوتی۔

اِس بنا پر اللہ کی رہنمائی کے تحت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلے کے حل کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ اِس طریقے کو حکمتِ حدیبیہ کہہ سکتے ہیں۔ حدیبیہ کا معاہدہ ایک ناجنگ معاہدہ (no-war pact) تھا، جو فریقِ ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان کر انجام پایا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم معاہدے کو مکمل کرنے کے بعد حدیبیہ سے مدینہ کی طرف واپس لوٹے۔ سفر کے دوران آپ پر سورہ الفتح نازل ہوئی۔ معاہدہ حدیبیہ پر آپ کے اصحاب خوش نہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سورہ الفتح اپنے اصحاب کو سنائی تو صحابہ کو اِس کے بارے میں تردد ہوا۔ حضرت عمر فاروق نے تعجب کے ساتھ کہا: أو فتح ھو یا رسول اللہ؟ قال: نعم، والذي نفسي بیدہ إنہ لفتح۔ (اے خدا کے رسول، کیا یہ فتح ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، بے شک وہ فتح ہے)۔ ایک اور شخص نے کہا کہ: ما ھذا بفتح (یہ تو کوئی فتح نہیں)۔ اِس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بل ھو أعظم الفتوح (وہ فتح ہے، بلکہ وہ تمام فتحوں سے زیادہ بڑی فتح ہے) تفسیر القرطبي: 16/260

معاہدہ حدیبیہ جیسے ایک معاہدے کو قرآن میں فتح مبین کیوں کہا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں فرمایا کہ یہ ایک عظیم فتح ہے، حالاں کہ آیت کے نزول کے وقت عملی طور پر 'فتح' کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تبصرہ سیاسی فتح کے معنی میں نہ تھا، بلکہ وہ اِس معنی میں تھا کہ اِس معاہدے کے نتیجے میں اہلِ ایمان کو اپنے حریف کے اوپر بالا دستی حاصل ہوگئی، یعنی اہلِ ایمان اپنے حریف کے مقابلے میں ایڈوانٹج کی پوزیشن میں آگئے۔

معاہدہ حدیبیہ کے وقت فریقِ ثانی کے پاس صرف تلوار کی طاقت تھی۔ اِس معاہدے نے فریقِ ثانی کو پابند کردیا کہ وہ اپنی تلوار کو اہلِ ایمان کے خلاف استعمال نہ کرے۔ اِس طرح گویا اہلِ ایمان کے مقابلے میں، فریقِ ثانی خود تو بے طاقت ہوکر رہ گیا۔ لیکن اہلِ ایمان کے پاس تلوار کے سوا ایک اور چیز تھی جو فریقِ ثانی کے پاس نہ تھی اور وہ ہے نظریہ توحید (ideology of Tauhid)۔ یہ نظریاتی طاقت پوری طرح قابلِ استعمال تھی۔ معاہدہ حدیبیہ کے بعد یہ ہوا کہ فریقِ ثانی عملی طور پر کچھ کرنے کے قابل نہ رہا۔ اِس کے برعکس، امن کے قیام کی بنا پر اہلِ ایمان کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنی پوری طاقت کو استعمال کرتے ہوئے اپنی آئڈیالوجی کی بھرپور تبلیغ کریں۔

چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ ایک طرف فریقِ ثانی اِس پر مجبور ہوگیا کہ وہ اہلِ ایمان کے خلاف

اپنی تلوار نہ استعمال کرے اور دوسری طرف اہلِ ایمان کامل آزادی کے ماحول میں نظریہ توحید کی تبلیغ واشاعت میں ہمہ تن مشغول ہوگئے۔ انھوں نے عرب کے تمام شہروں اور قبیلوں میں توحید کا پیغام پہنچانا شروع کردیا، حتی کہ عرب کے باہر جو ممالک تھے، اُن کے باشندوں تک بھی وہ اسلام کا پیغام پہنچانے لگے۔ اِسی حکمتِ حدیبیہ کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف دو سال میں پورا عرب اسلام میں داخل ہوگیا۔

حدیبیہ پالیسی کا فائدہ صرف یہ نہ تھا کہ ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے ملک میں اسلام کو یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ مختصر مدت میں وہاں ایک غیر خونی انقلاب (bloodless revolution) آگیا۔ اس کا دوسرا عظیم فائدہ یہ ہوا کہ حدیبیہ پالیسی کے ذریعے عرب میں جو انقلاب آیا، اُس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ایک نیا عمل (process) جاری کردیا۔ یہ عمل مختلف مراحل سے گزرتا ہوا موجودہ دور تک پہنچا۔ اِس اعتبار سے، موجودہ دور کو حدیبیہ پراسس کا نقطۂ انتہا کہا جاسکتا ہے۔

حدیبیہ حکمت کیا تھی۔ حدیبیہ حکمت مختصر طور پر یہ تھی کہ جنگی ٹکراؤ کو بند کرکے امن کا ماحول قائم کرنا اور پھر پُرامن کوشش کے ذریعے اسلام کے فطری پیغام (natural message) کو لوگوں تک پہنچانا۔ موجودہ زمانے میں انسانی تعلقات کے درمیان جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، اس کے بعد یہی حدیبیہ کلچر تمام قوموں کے اتفاق کے ساتھ ساری دنیا میں رائج ہوگیا ہے۔ اِس اعتبار سے، موجودہ دور کو دورِ حدیبیہ (age of *Hudaibia*) کہا جاسکتا ہے۔ پچھلے دور میں حدیبیہ کلچر صرف مقامی طور پر آیا تھا۔ موجودہ زمانے میں حدیبیہ کلچر کسی قربانی کے بغیر عالمی سطح پر قائم ہوگیا ہے۔

اقوامِ متحدہ کا قیام

اقوامِ متحدہ (UNO) 1945 میں قائم ہوئی۔ اِس ادارے کا خاص مقصد عالمی امن کا قیام تھا۔ دنیا کے تمام ممالک باقاعدہ طور پر اس کے ممبر بنے۔ اِس بین اقوامی ادارے کا ہیڈ کوارٹر نیویارک (امریکا) میں قائم ہے۔ اِس عالمی ادارے کے تحت تمام ملکوں کے اتفاق سے ایک چارٹر (charter) تیار کیا گیا، جس کو اقوامِ متحدہ کا منشور (Charter of the United Nations) کہا جاتا ہے۔ اِس چارٹر کے تحت تمام قوموں کے اتفاق سے ایک قرارداد طے پائی جو دفعہ 2 (4) کے طور پر اِس چارٹر میں

شامل ہے۔اقوامِ متحدہ کے اِس چارٹر کی دفعہ کے تحت تمام قوموں کے اتفاق سے یہ طے پایا کہ — تمام ممبر ممالک بین اقوامی تعلقاتی میں اِس کے پابند ہیں کہ وہ کسی ریاست کو اس کے استحکام یا اس کی سیاسی آزادی کے معاملے میں دھمکی نہیں دیں گے اور نہ اس کے خلاف طاقت کا استعمال کریں گے:

All Members shall refrain in their international relations from the threat or use of force against the territorial integrity or political independence of any state.

اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی یہ دفعہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے، عین وہی ہے جو معاہدہ حدیبیہ کے وقت طے پائی تھی۔مزید یہ کہ ساتویں صدی میں معاہدہ حدیبیہ کے وقت فریقِ ثانی کی جن شرطوں کو یک طرفہ طور پر ماننا پڑا تھا، بیسویں صدی میں تمام قوموں نے اِن شرطوں کو بطور خود حذف کر دیا۔ موجودہ زمانے میں اہلِ ایمان کو اِس چارٹر کے مطابق، خود حالات کے تحت، عالمی امن حاصل ہوگیا ہے۔اِسی کے ساتھ موجودہ زمانے میں مزید اضافے کے ساتھ وہ تمام امکانات اور مواقع پوری طرح کھل گئے ہیں جو دعوت الی اللہ کے عالمی مشن کے لیے ضروری ہیں۔مثلاً مذہبی آزادی، کھلا پن (openness)، عالمی کمیونیکیشن، آزادانہ آمدورفت، پرنٹنگ پریس، وغیرہ۔

سورہ الفتح جو معاہدہ حدیبیہ کے بعد اتری تھی، اُس کا خاتمہ اِس آیت پر ہوا ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۖ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (48:29)

ترجمہ: ”محمد، اللہ کے رسول اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں، وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔تم اُن کو رکوع میں اور سجدے میں دیکھو گے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا مندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔اُن کی نشانی ان کے چہروں پر ہے، سجدے کے اثر سے۔ان کی یہ مثال

تورات میں ہے۔ اور انجیل میں اُن کی مثال یہ ہے کہ جیسے کھیتی۔ اس نے اپنا انکھوا نکالا، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر وہ اور موٹا ہوا، پھر وہ اپنے تنے پر کھڑا ہو گیا۔ وہ کسانوں کو بھلا لگتا ہے، تاکہ اللہ اُن سے منکرین کو غصہ دلائے۔ اُن میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، اللہ نے اُن سے معافی اور بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے‘‘۔

قرآن کی سورہ الفتح کے خاتمے کے یہ الفاظ تمثیل کی زبان میں ایک اہم تاریخی حقیقت کو بتا رہے ہیں، وہ یہ کہ معاہدۂ حدیبیہ جو ذوالقعدہ 6 ہجری میں پیش آیا، وہ کوئی وقتی اور محلّی چیز نہ تھا، بلکہ وہ ایک عظیم عمل (process) کا آغاز تھا، جس کے تکمیلی مرحلے پر ایک عالمی انقلاب آنے والا تھا۔ یہ انقلاب تدریجی طور پر آیا اور بیسویں صدی عیسوی میں اس کی تکمیل ہوئی۔

اِس عالمی انقلاب سے مراد وہی چیز ہے جس کو ہم نے دورِ حدیبیہ (age of *Hudaibia*) کہا ہے۔ معاہدہ حدیبیہ کا خلاصہ یہ تھا کہ فریقِ ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان کر امن قائم کرنا اور پھر تمام موجود مواقع کو دعوت الی اللہ کے لیے استعمال کرنا۔ یہ موافق حالات جو قدیم زمانے میں رسول اور اصحابِ رسول کی قربانیوں کے ذریعے ظہور میں آئے تھے، وہ اب عالمی تبدیلیوں کے نتیجے میں خود زمانی تقاضے کے تحت مزید اضافے کے ساتھ حاصل ہو گئے ہیں۔

یہ جدید موافق حالات جن اسباب کے ذریعے ظہور میں آئے، وہ وہی ہیں جن کو مغربی تہذیب، جمہوری افکار، اقوامِ متحدہ، وغیرہ کہا جاتا ہے۔ یہ بظاہر سیکولر انقلابات تھے، لیکن اللہ نے اِن بظاہر سیکولر انقلابات کو دین کی تائید کا ذریعہ بنا دیا۔

خلاصہ کلام

ساتویں صدی عیسوی میں حدیبیہ معاہدے کا جو موافق نتیجہ ظاہر ہوا تھا، اس کو قرآن میں ’فتحِ مبین‘ کہا گیا ہے۔ حدیبیہ معاہدہ کوئی پر اسرار چیز نہ تھی، وہ ایک معلوم حکیمانہ تدبیر تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں اِس تدبیر کو صرف محدود طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ وہ بھی اِس طرح کہ رسول اور اصحابِ رسول کو یہ قربانی دینی پڑی تھی کہ وہ فریق ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیں، حتی کہ

لفظ ''رسول اللہ'' کو وہ معاہدے کی دستاویز سے مٹادیں۔مگر بعد کو اللہ کی مدد سے جو حالات پیدا ہوئے، اُس کے بعد ایسا ہوا کہ حدیبیہ انقلاب وسیع تر معنی میں ایک عالمی انقلاب بن گیا۔

حدیبیہ معاہدے کے ذریعے جو امکانات صرف دس سال کے لیے حاصل کیے گئے تھے، موجودہ زمانے میں انھوں نے مستقل طور پر عالمی اصول (universal norm) کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ اب نہ دوسروں کی شرطوں کو ماننے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دستاویز سے ''رسول اللہ'' کے لفظ کو مٹانے کی ضرورت۔

حدیبیہ معاہدے کے بعد اہلِ ایمان کو کام کے جو مواقع ملے تھے، وہ اب مزید اضافے کے ساتھ اُن کو حاصل ہو چکے ہیں۔ضرورت صرف یہ ہے کہ اِن مواقع کو دریافت کیا جائے اور دانش مندی کے ساتھ اس کو استعمال کیا جائے۔

ایک تاریخی قانون

قرآن کی سورہ البقرہ میں ایک تاریخی قانون کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (2:250-251)۔ یعنی جب جالوت اور اس کی فوجوں سے اُن (بنی اسرائیل) کا سامنا ہوا تو انھوں نے کہا: اے ہمارے رب، ہمارے اوپر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو جما دے اور منکروں کے مقابلے میں تو ہماری مدد کر۔ پھر انھوں نے اللہ کے اذن سے اُن (فلسطینیوں) کو شکست دی۔ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ اور اللہ نے داؤد کو ملک اور حکمت عطا کیا اور جن چیزوں کا چاہا، اس کا علم بخشا۔ اور اگر اللہ بعض کو بعض لوگوں سے دفع نہ کرتا رہے تو زمین فساد سے بھر جائے۔ مگر اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

Had it not been for God's repelling some people by means of others, the earth would have been filled with corruption. But God is bountiful to mankind.

قرآن کی اِن آیات میں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ واقعہ قبل مسیح دور سے تعلق رکھتا ہے۔ فلسطین کے جنوبی حصہ (southern coastal area) میں ایک واقعہ ہوا۔ بارہویں صدی قبل مسیح میں یہاں ایک قوم آ کر آباد ہوئی جس کو تاریخ میں، فلسطی یا فلسطینی (Philistines) کہا جاتا ہے۔ اِن لوگوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ بعد کو اُن کے درمیان بگاڑ آیا۔ اُس زمانے میں فلسطین کے شمالی حصے میں بنی اسرائیل آباد تھے۔ فلسطینی، بنی اسرائیل کے خلاف سرکشی کرنے لگے، یہاں تک کہ 1010 قبل مسیح میں فلسطینیوں کا بنی اسرائیل سے مسلّح ٹکراؤ ہوا۔ اِس ٹکراؤ میں ایک اسرائیلی نوجوان داؤد کی بہادری سے فلسطینیوں کو شکست ہوئی۔ اِس کے بعد رفتہ رفتہ 732 قبل مسیح میں فلسطینیوں کا اِس علاقے سے خاتمہ ہو گیا۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں 'دفع' (repel) کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی ہٹانا۔ لسان العرب میں 'دفع' کی تشریح 'الإزالة بقوۃ' (8/87) سے کی گئی ہے۔ یہ 'دفع' دراصل تاریخ کے بارے میں اللہ کا ایک قانون ہے۔ مذکورہ واقعے میں اللہ تعالیٰ نے اسرائیلی گروہ کے ذریعے فلسطینی گروہ کو اقتدار سے ہٹایا تھا۔ اللہ انسانی تاریخ کی مسلسل نگرانی کر رہا ہے، وہ انسان کی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے انسانی تاریخ کو مینیج (manage) کر رہا ہے، وہ بار بار ایسے حالات پیدا کرتا ہے جب کہ ایک قوم دوسری قوم کو مقامِ اقتدار سے ہٹائے۔ اگر ایک قوم مسلسل طور پر مقامِ اقتدار پر قابض رہے تو اُس کے اندر جمود (stagnation) پیدا ہوجائے گا۔ یہ جمود مختلف صورتوں میں فساد (corruption) کا سبب بنے گا۔

دفع کے اِس قانون کا تعلق سیکولر قوموں سے بھی ہے اور مذہبی قوموں سے بھی۔ اِس معاملے کی ایک مثال ہندستان ہے۔ ہندستان میں پہلے راجاؤں کی حکومت تھی۔ راجاؤں کے بعد یہاں مغل دور آیا، پھر مغل دور ختم ہوا اور برٹش دور آیا۔ اس کے بعد 1947 میں برٹش دور کا خاتمہ ہوا اور قومی حکومت (national government) کا دور آیا۔ یہ تمام تبدیلیاں دفع کے قانون کے تحت ہوئیں۔ ہر بار جب ایک گروہ کے اندر ''فساد'' آ گیا تو اس کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم لائی گئی۔ گویا پرانے خون (old blood) کی جگہ نئے خون (new blood) کو کام کرنے کا موقع دیا گیا۔ اِس عمل کو ریڈیکل آپریشن (radical operation) کہا جاسکتا ہے۔

اوپر کی آیت میں یہ الفاظ آئے ہیں: وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ آیت کے اِس ٹکڑے میں اللہ تعالیٰ کے جس 'فضل' کا ذکر ہے، اُس سے مراد یہی قانونِ دفع ہے جو مسلسل طور پر سیاسی اقتدار کی تنظیم کر رہا ہے۔ یہ تنظیم انسان کی اعلیٰ بہبود کے لیے ہے۔ اگر قانونِ دفع کی صورت میں انسانی اقتدار کی تنظیم نہ کی جائے تو دنیا میں سیاسی اجارہ داری (political monopoly) آجائے اور پھر انسانی تاریخ اپنی مطلوب منزل پر نہ پہنچ سکے گی۔

یہود کی تاریخ

دفع کے اِس قانون کا نفاذ بعد کے زمانے میں خود یہود (بنی اسرائیل) پر کیا گیا۔ بنی اسرائیل کو

اللہ تعالیٰ نے عروج اور غلبہ عطا کیا، لیکن ایک مدت کے بعد یہود میں بھی وہی ''فساد'' پیدا ہوا جو کہ ہر قوم میں پیدا ہوتا ہے۔ جب ایسا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے کسی اور قوم کے ذریعے یہود کے ساتھ دفع کا وہی معاملہ کیا جس کو ہم نے ریڈیکل آپریشن (radical operation) کا نام دیا ہے۔

اِس سلسلے میں قرآن میں دو متعین آپریشن کا حوالہ دیا گیا (17:4-8)۔ پہلا واقعہ بابِل (عراق) کے بادشاہ نبوکدنضر (Nebuchadnezzar) کا ہے۔ اس نے 586 قبل مسیح میں فلسطین پر حملہ کیا، جو اُس وقت بنی اسرائیل کے زیر قبضہ تھا۔ نبوکدنضر نے بنی اسرائیل کی سیاسی طاقت کو توڑ دیا اور یروشلم میں ان کے عبادت خانہ (ہیکل سلیمانی) کو مکمل طور پر ڈھا دیا۔ اِس کے بعد دوسرا واقعہ وہ ہے جو رومی بادشاہ ٹائٹس (Titus) کے ذریعے پیش آیا۔ ٹائٹس نے 70 عیسوی میں یروشلم پر حملہ کر کے اس کو پوری طرح تباہ کر دیا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تذکیر القرآن، صفحہ 762-760)۔

بنی اسرائیل کے خلاف یہ آپریشن بطور سزا (punishment) نہ تھا، بلکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ بطور انتباہ (warning) تھا۔ وہ اس لیے تھا کہ بنی اسرائیل متنبہ ہوں، اُن کا جمود ٹوٹے اور وہ اپنی اصلاح کر کے دوبارہ اللہ کی رحمت کے مستحق بن جائیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (17:8)۔ لیکن بنی اسرائیل دوبارہ اصلاح قبول نہ کر سکے۔ وہ بدستور اپنی حالت پر قائم رہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حاملِ کتاب الٰہی ہونے کی حیثیت سے معزول کر دیا اور بنو اسماعیل کو حاملِ کتاب الٰہی کی حیثیت دے دی۔ تبدیلی کے اِس واقعے کا ذکر قرآن کی ایک آیت میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے:

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (4:54)۔

مسلم تاریخ کی مثال

مسلم ملت دفع کے اِس تاریخی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ چناں چہ پچھلے چودہ سو سال میں یہ معاملہ بار بار پیش آیا ہے، یعنی ایک گروہ کو مقامِ اقتدار سے ہٹا کر اس کی جگہ دوسرے گروہ کو

مقامِ اقتدار پر لانا، ایک گروہ کو معزول کر کے دوسرے گروہ کو کام کا موقع دینا۔ پچھلے چودہ سو سال میں جن مسلم گروہوں کو اقتدار ملا، اُن کی بنیادی تقسیم یہ ہے:

1۔ خلافتِ راشدہ (Rashidun Caliphate) 632-661ء

2۔ خلافتِ امیہ (Umayyad Caliphate) 661-750ء

3۔ خلافتِ اندلس (Moorish Empire) 711-1492ء

4۔ خلافتِ بنو عباس (Abbasid Empire) 750-1258ء

5۔ مغل سلطنت (Mughal Empire) 1226-1857ء

6۔ عثمانی خلافت (Ottoman Empire) 1299-1922ء

مذکورہ سیاسی واقعات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مسلم گروہ کو اقتدار حاصل ہوتا ہے اور پھر ایک مدت کے بعد اُس کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرے گروہ کو لایا جاتا ہے۔ مسلم ملت کے درمیان یہ سلسلہ تقریباً انیسویں صدی کے آخر تک جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کا غلبہ ختم ہوجاتا ہے اور مغربی قوموں کو غلبہ حاصل ہوجاتا ہے، خواہ براہِ راست طور پر یا بالواسطہ طور پر۔ یہ تمام واقعات اتفاقاً نہیں ہورہے ہیں، بلکہ وہ اللہ رب العالمین کے قائم کردہ تاریخی قانون کے تحت ہورہے ہیں۔

خلافتِ راشدہ کی اصطلاح ایک سیاسی ادارہ کی حیثیت سے بعد کے دور میں وضع ہوئی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کا جو سیاسی ادارہ قائم ہوا، وہ تقریباً 30 سال تک باقی رہا۔ اس کے بعد اس کا خاتمہ ہوگیا۔ ایسا اتفاقاً نہیں ہوا۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ بعد کے زمانے میں خلافت کا یہ ادارہ اپنی اخلاقی خوبیوں کے باوجود سیاسی استحکام (political stability) کو باقی رکھنے کے قابل نہ رہا، اِس لیے اس کو ہٹا کر بنو امیہ کا دور لایا گیا۔ بنو امیہ کا خاص کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے عربی زبان اور عرب کلچر (المروءۃ، وغیرہ) کے فروغ کا شدت سے اہتمام کیا جو کہ اُس وقت قرآن کی کامل حفاظت کے لیے ضروری تھا۔

بنو امیہ کی حکومت تقریباً 90 سال تک جاری رہی۔ ان کے دورِ حکومت کے آخری زمانے میں یہ بات واضح ہوگئی کہ عربیت کے تحفظ میں انھوں نے عالمی تقاضے کو فراموش کردیا۔ چناں چہ اس کے بعد

بنوامیہ کو اقتدار کے مقام سے ہٹا کران کی جگہ بنوعباس کو لایا گیا۔ بنوعباس کے دور میں کئی بڑے بڑے کام انجام پائے — احادیث کو جمع کرنا، علومِ اسلامی کی تدوین، اسلام کی اشاعت، وغیرہ۔ اِس کے علاوہ انھوں نے اُس وقت کے سیکولر علوم کو حاصل کیا اوران کو فروغ دیا۔

اِس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر عالمی فکر پیدا ہوا۔ بنوعباس کے دبدبے کے تحت حفاظتِ دین کا کام کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ واضح ہو کہ دورِ قدیم میں حفاظتِ دین کے لیے سیاسی دبدبہ ضروری تھا، مگر اب پرنٹنگ پریس اور دوسرے موافق اسباب کے ظہور کے بعد سیاسی دبدبے کے بغیر خدا کا دین کامل طور پر محفوظ ہے۔

بنوعباس کی سلطنت تقریباً 500 سال تک جاری رہی۔ اس کے بعد فطری طور پر بنوعباس میں جمود کا دور آ گیا۔ وہ ترقی کے سفر کو مزید جاری رکھنے کے قابل نہ رہے۔ چناں چہ تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کے ذریعے ایک آپریشن کیا گیا اور اِس طرح عباسی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

اِس کے بعد تاریخی قانون کے مطابق، دوسری قوموں کو موقع دیا گیا۔ عباسی دور ہی میں ایک مسلم گروہ اٹھا جس نے اندلس (اسپین) میں اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ اِس حکومت کو سیکولر مورخین مورش سلطنت (Moorish Empire) کا نام دیتے ہیں۔ مورش سلطنت کو موافق حالات ملے، چناں چہ انھوں نے علم کی ترقی میں مزید بہت زیادہ اضافہ کیا۔ اُس دور کے ترقیاتی نمونوں کو استنبول (ترکی) کے میوزیم (The Istanbul Museum of the History of Science and Technology in Islam) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مگر بعد کے دور میں اندلس کی مسلم سلطنت میں بگاڑ آ گیا۔ اس کے حکمراں عیش وعشرت میں پڑ گئے۔ آخرکار 700 سال سے زیادہ مدت کے بعد اُن پر دفع کا قانون نافذ ہوا اور اسپین کے مسیحی حکمراں نے لڑ کر اُن کا خاتمہ کر دیا۔

اِسی دور میں مغل حکمراں ہندستان میں داخل ہوئے اور یہاں ایک طاقت ور مسلم سلطنت قائم کردی۔ مغل سلطنت کے زیر سایہ ہندستان میں کئی کام انجام پائے۔ مغل حکمرانوں کو دعوت وتبلیغ سے

کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن اُن کے دبدبے کے تحت صوفیوں کو یہ موقع ملا کہ وہ اِس ملک میں اسلام کی اشاعت بڑے پیمانے پر کرسکیں۔ لیکن بعد کے دور میں مغل حکمرانوں میں بھی وہی بگاڑ آیا جو ہر قوم میں آتا ہے۔ چناں چہ 600 سال کے بعد ہندستان میں برٹش قوم ابھری اور اس نے 1857 میں مغل سلطنت کا خاتمہ کردیا۔

اِس سلسلے میں آخری نام عثمانی خلافت کا ہے۔ اس نے یورپ اور ایشیا اور افریقہ کے بڑے رقبے میں اپنی سلطنت قائم کی۔ اس نے لمبے عرصے تک اسلام کا دبدبہ قائم رکھا۔ اِس طرح یہ ہوا کہ پرنٹنگ پریس اور دوسرے موافق اسباب کے ظہور سے پہلے کے دور میں وہ دینِ اسلام کی محافظ بنی رہی۔ آخر کار عثمانی خلافت میں بھی بڑے پیمانے پر جمود پیدا ہوا، وہ مسلسل کمزور ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ 600 سال کے بعد مغربی قوموں کا ظہور ہوا اور اِس طرح عثمانی خلافت کا دور ختم ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ کمال اتاترک (وفات: 1938) نے عثمانی خلافت کا خاتمہ کردیا، مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ کمال اتاترک نے 1924 میں ترک خلافت کے خاتمے کا صرف اعلان کیا تھا، اُس کا خاتمہ اِس سے بہت پہلے ہوچکا تھا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ماہ نامہ الرسالہ، نومبر 2012)۔

جمہوریت کا رول

دفع کا قانون پچھلے زمانے میں انقلابی عمل (ریڈیکل آپریشن) کے ذریعے انجام پاتا تھا، مگر موجودہ زمانے میں اِس طریقے کو بدل دیا گیا۔ اِسی بدلے ہوئے طریقے کو موجودہ زمانے میں جمہوریت کہا جاتا ہے۔ جمہوریت دراصل دفع کے قانون کا باقاعدہ انسٹی ٹیوشنلائزیشن (institutionalization) ہے۔ فرانسیسی انقلاب (French Revolution) جمہوری دور کا آغاز ہے جس نے 1792 میں بادشاہی نظام کا خاتمہ کیا۔ اس کے بعد عالمی سیاست میں ایک نیا دور آیا، جس کے نتیجے میں یہ ممکن ہوگیا کہ الیکشن کے ذریعے پُرامن طور پر حکومت کی تبدیلی ممکن ہوگئی۔ اِس طرح تاریخ میں ریڈیکل تبدیلی کے بجائے، پرامن تبدیلی (peaceful change) کا دور آگیا۔

موجودہ زمانے کے مسلمان اِس الٰہی منصوبے کو سمجھ نہ سکے۔ وہ خودساختہ ذہن کے تحت

یہ کررہے ہیں کہ کہیں وہ ناکام طور پر دوسری قوموں سے لڑ رہے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ منفی روش قانونِ الٰہی کے خلاف ہے، اِس لیے اس کا کوئی مفید نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ اِسی طرح کہیں ایسا ہے کہ مسلمان پچھلے سیاسی ماڈل کی گرفت سے آزاد نہ ہونے کی بنا پر خاندانی لیڈرشپ قائم کئے ہوئے ہیں۔ کہیں اگر ان کو کچھ سیاسی اقتدار مل گیا ہے تو وہاں وہ آپس میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ اِن میں سے کوئی بھی صورت خدا کے منصوبے کے مطابق نہیں، اِس لیے وہ نتیجہ خیز بننے والی بھی نہیں۔

رول کی تبدیلی

اللہ نے انسان کی ہدایت کے لیے جو دین بھیجا، اُس کے دو تقاضے تھے — ایک تھا، اس کی حفاظت (preservation)، اور دوسرا تھا اس کا اظہار۔ دین کی حفاظت کا کام پہلے، بنی اسرائیل کو سونپا گیا، مگر وہ اس میں ناکام ہوگئے۔ اِس واقعہ کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

اَلَّذِیۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰىةَ ثُمَّ لَمۡ یَحۡمِلُوۡهَا (62:5)

بنی اسرائیل کی ناکامی کے بعد بنو اسماعیل (امتِ محمدی) کو دینِ خداوندی کے حامل ہونے کی یہ ذمے داری سپرد کی گئی۔ امت محمدی نے اپنے آغاز کے بعد ہزار سال کی مدت میں دین کی حفاظت کا کام پوری طرح انجام دے دیا۔ اب خدا کا دین کامل طور پر محفوظ ہے۔ امت محمدی کو اس کے آغاز کے بعد لمبی مدت تک مددگار قوت کے طور پر سیاسی دبدبہ عطا کیا گیا۔ اس دبدبے کا خاص مقصد یہی تھا کہ دین کا متن (text) اور اس کی تاریخ مستند طور پر محفوظ ہوجائے۔

اِس کے بعد دوسرا کام جو مطلوب تھا، اس کو ایک لفظ میں اظہار کہا جا سکتا ہے۔ امت مسلمہ اِس دوسرے کام کو انجام نہ دے سکی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو غیر معمولی مواقع دئے گئے — تعداد، دولت اور سیاسی طاقت، وغیرہ۔

مگر امت مسلمہ اِس دوسرے مطلوب کام کو انجام دینے میں ناکام رہی۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں یہ واضح ہوگیا کہ امت مسلمہ اب اُسی طرح ایک بے جان قوم بن چکی ہے، جیسا کہ اِس سے پہلے بنی اسرائیل اپنے دورِ زوال میں ایک بے جان قوم بن چکے تھے۔

بے جان ہونے کا مفہوم

کسی امت کے بے جان ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دینِ خداوندی کو چھوڑ دے اور اعلان کے ساتھ کوئی دوسرا دین اختیار کرلے۔ اِس قسم کی تبدیلی نہ پہلے کبھی ہوئی اور نہ آج ہوگی۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ 14 صدیاں گزرنے کے بعد امتِ مسلمہ پر وہ وقت آ گیا جو پچھلی امتوں پر آیا تھا، یعنی مسلمان عملاً ایک بے جان قوم بن گئے۔ اب کوئی بھی اصلاحی جدو جہد ان کو مجموعی طور پر دوبارہ زندہ کرنے والی نہیں۔ اب جو چیز ہونے والی ہے، وہ صرف یہ کہ امت کے کچھ افراد کو شخصی طور پر زندگی ملتی رہے گی، نہ کہ پورے مجموعے کو۔

اِس صورتِ حال کا سبب کیا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ دھیرے دھیرے امت کی بعد کی نسلوں میں یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ لوگ اسلام کے نام پر ایک خود ساختہ اسلام (self-styled version of Islam) بنا لیتے ہیں۔

اِس خود ساختہ اسلام میں اسپرٹ حذف ہوجاتی ہے اور صرف کچھ ظاہری شکلیں باقی رہتی ہیں۔ پھر لمبی مدت تک اُس پر قائم رہتے ہوئے وہ اُس پر پختہ (conditioned) ہوجاتے ہیں۔ اِس پختگی (conditioning) کے ساتھ ہمیشہ ایک فرضی یقین (false conviction) جمع ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے وضع کردہ اسلام پر اِس طرح جینے لگتے ہیں، جیسے کہ وہ خدا اور رسول کے دین پر قائم ہیں۔ اِسی فرضی یقین کا نام بے جان ہونا یا زندگی سے محرومی ہے۔ جو لوگ اِس حالت پر پہنچ جائیں، وہ اِس صلاحیت سے محروم ہوجاتے ہیں کہ وہ دوبارہ اپنی روش پر نظرِ ثانی کرسکیں۔

کنڈیشننگ کی حالت

یہی وہ حالت ہے جس کا ذکر یہود کے حوالے سے قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: **وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ** (2:88) یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں کے اوپر غلاف ہے۔ نہیں، بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کردی ہے، اِس لیے وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

قرآن کی اِس آیت میں 'غُلف' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ عبداللہ بن عباس نے اس کی تشریح اِن الفاظ میں کی ہے: أي قلوبنا ممتلئة علما، لا تحتاج إلى علم محمد ولا غیرہ (القرطبی 2/25) یعنی ہمارے دل علم سے بھرے ہوئے ہیں، وہ محمد یا کسی اور کے علم کے محتاج نہیں۔ لعنت کوئی پراسرار چیز نہیں، لعنت سے مراد شدید قسم کی کنڈیشننگ ہے جس کی ڈی کنڈیشننگ عام طور پر ممکن نہیں ہوتی۔ یہاں ''علم'' سے مراد معروف معنوں میں علم نہیں، بلکہ خود ساختہ تصورِ دین ہے۔

یہود کا یہ خود ساختہ دین اپنی حقیقت کے اعتبار سے، علم پر مبنی نہیں تھا، بلکہ وہ امانی (2:78) پر مبنی تھا۔ ٹھیک یہی حال موجودہ زمانے میں مسلم ملت کا ہوا ہے۔ وہ دین کے خود ساختہ ماڈل پر قائم ہیں۔ زمانہ گزرنے کے بعد وہ اپنے اِس خود ساختہ ماڈل پر اتنے پختہ ہو چکے ہیں کہ اب وہ اُس پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

پچھلی امتوں کے بارے میں قرآن میں یہ آیت آئی ہے: الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32) یعنی انھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اور وہ بہت سے گروہ ہو گئے۔ ہر گروہ اپنے خود ساختہ طریقے پر نازاں ہے۔

یہی حال موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا ہوا ہے۔ وہ خود ساختہ تعبیرات کے مطابق، مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ یہ تمام گروہ خود ساختہ تصورِ دین پر قائم ہیں۔ لیکن لمبی مدت گزرنے کے بعد اب ہر گروہ کا ذہن اپنے ماڈل کے حق میں اتنا زیادہ پختہ ہو چکا ہے کہ اب وہ اِس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ وہ اُس پر نظر ثانی کرے۔

امت مسلمہ اور اس کے بعد

امتِ مسلمہ کے حال اور مستقبل کو سمجھنے کے لیے قرآن کے سورہ الانبیاء کی اِن آیات کا مطالعہ کیجیے: وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ○ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ (21:95-96) یعنی جس بستی والوں کے لیے ہم نے ہلاکت مقرر کر دی ہے، اُن کے لیے حرام ہے کہ وہ رجوع کریں، یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دئے

جائیں گے اور وہ نہایت تیزی کے ساتھ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے۔

یہ قرآن کی دو آیتیں ہیں۔ دوسری آیت میں واضح طور پر مستقبل میں پیش آنے والے ایک واقعے کا ذکر ہے، یعنی یاجوج اور ماجوج کا ظہور۔ پہلی آیت میں اگرچہ استقبال کا صیغہ استعمال نہیں ہوا ہے، لیکن اِس سے مراد بھی مستقبل میں پیش آنے والا واقعہ ہے، یعنی یاجوج اور ماجوج کے ظہور سے فوراً پہلے کا واقعہ۔

اصل یہ ہے کہ پہلی آیت میں قرآن کے مخصوص اسلوب میں، امتِ مسلمہ کے مستقبل کا ذکر ہے۔ اِس آیت میں دفع کا وہی قانون بیان کیا گیا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ یہاں حرام سے مراد امت کا 'غلف' کی حالت تک پہنچ جانا ہے، یعنی دورِ زوال کی حالت۔ اور اہلاک سے مراد یہ ہے کہ جب امت پر یہ حالت آئے گی تو اُس کو خدائی رول کے لیے رد کردیا جائے گا۔

یہ فطرت کا ایک عام قانون ہے جو امتِ مسلمہ پر بھی لازماً آئے گا (لتتبعن سنن من کان قبلکم)، لیکن ایک فرق کے ساتھ، وہ یہ کہ امت یہود کو نظری اور عملی دونوں اعتبار سے رد کیا گیا تھا، لیکن امتِ مسلمہ کا رد کیا جانا صرف نظری اعتبار سے ہوگا، اِس کے بعد بھی عملی طور پر موجودہ دنیا میں اُن کی حیثیت باقی رہے گی، کیوں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی اور نبی آنے والا نہیں جو دونوں اعتبار سے امتِ مسلمہ کے رد کیے جانے کا اعلان کرسکے۔

قرآن کی مذکورہ آیات میں صرف پہلی آیت امتِ مسلمہ کے بعد کے دور کے بارے میں ہے۔ جب کہ قانونِ فطرت کے مطابق، امت اپنے زوال کی آخری حد پر پہنچ چکی ہوگی۔ اِس آیت میں ہلاکت سے مراد معروف ہلاکت نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد وہی چیز ہے جس کو ذہنی جمود (intellectual stagnation) کہا جاتا ہے۔ آیت میں حرام سے مراد بھی معروف حرام نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد جمود کی وہ حالت ہے، جب کہ لوگوں کے اندر بے حسی کا وہ درجہ آجائے جس کو قرآن میں قساوت کہا گیا ہے، یعنی قبولیت (receptivity) کے مادے کا ختم ہوجانا۔

اِس معاملے کی مثال فطرت میں پتھر اور زرخیز زمین (soil) کی صورت میں رکھ دی گئی ہے۔

پتھر پر پانی ڈالا جائے تو پتھر اس کو قبول نہیں کرے گا۔ پانی اس کے اوپر سے بہہ جائے گا۔ اس کے برعکس، زرخیز مٹی میں پانی ڈالا جائے تو وہ اس کو بھرپور طور پر قبول کر لیتی ہے۔ اِسی طرح جب کوئی قوم زندہ ہو تو اس کے اندر قبولیت کی صلاحیت بھرپور طور پر موجود ہوتی ہے۔ اِس کے برعکس، جب قوم میں جمود آجائے تو وہ قبولیت کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔

کسی امت کی یہ حالت کیوں ہوتی ہے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ ہے فرضی یقین (false conviction)۔ دورِ زوال میں یہ ہوتا ہے کہ امت حقیقتاً بے روح (spiritless) ہو جاتی ہے، لیکن ظاہری طور پر وہ ایک خود ساختہ دین (self-styled version of religion) پر قائم رہتی ہے۔ دھیرے دھیرے وہ اپنے اسی خود ساختہ دین پر اتنی پختہ ہو جاتی ہے کہ اس کے خلاف سوچنا اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ حقیقی دین اس کے لیے اجنبی (غریب) بن جاتا ہے، خواہ اس کو کتنا ہی دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی امت کے اندر کوئی نیا فکری انقلاب (intellectual revolution) لانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اِس مرحلے پر پہنچ کر وہ تخلیقی فکر (creative thinking) سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو مذکورہ آیت میں 'أنھم لا یرجعون' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

اہلِ مغرب کا رول

صحیح البخاری میں ایک روایت اِن الفاظ میں آئی ہے: إن اللہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر (رقم الحدیث: 3062) یعنی اللہ ضرور اس دین کی تائید فاجر شخص کے ذریعے کرے گا۔

اِس حدیث میں 'فاجر' کا لفظ غیر مومن کے معنی میں آیا ہے۔ آج کل کی زبان میں اس کو سیکولر انسان کہہ سکتے ہیں۔ اِس روایت میں پیشین گوئی کی زبان میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ بعد کے زمانے میں ایسے سیکولر لوگوں کو اٹھائے گا جو خدا کے دین کے معاملے میں تائیدی کردار (supporting role) ادا کریں گے۔

تاریخی اعتبار سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تائیدی رول بالفعل عمل میں آچکا ہے۔ اب

ضرورت صرف یہ ہے کہ اس کی معرفت حاصل کی جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

دو مطلوب رول

اصل یہ ہے کہ دین اسلام کے حاملین سے دو رول مطلوب تھا — ایک رول وہ ہے جس کو قرآن میں حفاظتِ دین (15:9) کہا گیا ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جس کے لیے قرآن میں اظہارِ دین (48:28) کے الفاظ آئے ہیں۔

حفاظتِ دین سے مراد ہے دین کا قلمی یا کتابی تحفظ — قرآن کے اصل متن کا مکتوب حالت میں محفوظ ہو جانا، حدیث کا مدوّن مجموعہ تیار ہو جانا، سیرتِ رسول اور سیرتِ صحابہ کا لکھی ہوئی حالت میں ریکارڈ ہو جانا، اسلام کا وہ دور جس کو قرون مشہود لہا بالخیر کہا گیا ہے، اس کو مستند تاریخ کی حیثیت دے دینا، اسلام کی بنیاد پر ایسے ادارے (مسجد، مدرسہ، حج کا نظام، وغیرہ) قائم ہو جانا جن کے ذریعے ابدی طور پر اسلام کو ایک اجتماعی بنیاد حاصل ہو جائے۔

یہ تمام کام ایک لفظ میں، تحفظِ دین کے کام ہیں۔ امتِ مسلمہ نے اپنے ابتدائی تقریباً ہزار سال کے دوران اِس کام کو کامل طور پر اور مستند طور پر انجام دے دیا۔ یہاں تک کہ اب یہ حال ہے کہ اسلام کا مستند ماخذ نہ صرف لائبریریوں میں موجود ہے، بلکہ پورا ذخیرہ انٹرنیٹ پر اِس طرح محفوظ ہو گیا ہے کہ ایک شخص فنگر ٹپ (fingertip) کے استعمال سے ایک لمحے میں اِس پورے ذخیرے تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

تائیدِ دین کے چار اہم کام

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث اِن الفاظ میں آئی ہے: مثل أمتي مثل المطر، لا يُدرى أوّله خير، أم آخره (سنن الترمذي، رقم الحديث: 2869) یعنی میری امت کی مثال بارش جیسی ہے، نہیں معلوم کہ اس کا اول زیادہ بہتر ہے یا اس کا آخر زیادہ بہتر ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، بارش کا اول اور آخر دونوں اپنے اپنے لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ اِس حدیث میں امت کے دو دور کا ذکر ہے — ابتدائی دور اور آخری دور، ایک پہلو سے امت کا ابتدائی دور

بہتر ہے اور دوسرے پہلو سے اس کا آخری دور بہتر ہے۔

اِس حدیثِ رسول میں دراصل امت کے بارے میں ایک پیشین گوئی کی گئی ہے جو کہ اب واقعہ بن چکی ہے۔ امت کے پہلے دور میں ایک طرف، دین کو محفوظ دین کی حیثیت دی گئی ہے اور دوسری طرف، اِس دور میں ایک ایسا انقلاب برپا ہوا جس نے انسانی تاریخ میں ایک نیا پراسس جاری کردیا۔ اِس تاریخی پراسس کا آغاز امتِ مسلمہ نے کیا تھا، لیکن بعد کے زمانے میں یہ رول مشرق سے مغرب کی طرف منتقل ہوگیا۔ اِس عمل (process) کے تکمیلی مرحلے میں جو چیزیں مطلوب تھیں، وہ زیادہ تر اہلِ مغرب کے ذریعے انجام پائیں۔

اِس تاریخی عمل کا آغاز ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں امت مسلمہ کے ذریعے ہوا۔ اِس کے بعد اہلِ مغرب نے اِس معاملے میں تائیدی رول (supporting role) انجام دیا، جس کی تکمیل انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں ہوئی۔

چار پہلو

1۔ اِس معاملے میں اہلِ مغرب کے ذریعے جو کام انجام پایا، اس کے چار خاص پہلو ہیں اور اِن چاروں پہلوؤں کا اشارہ قرآن میں موجود ہے۔ اِن میں سے ایک کام وہ ہے جس کا ذکر بطور پیشین گوئی قرآن کی اِس آیت میں کیا گیا ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) یعنی عنقریب ہم اُن کو آفاق میں اور انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے، یہاں تک کہ اُن پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن حق ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں جس پیشین گوئی کا ذکر ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ اِس دنیا میں معرفت اور ایمانی رزق کے بے شمار آئٹم ہیں، جن کو قرآن میں آیات اور آلاء اللہ اور کلمات اللہ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس قسم کی چیزوں کا ذکر قرآن اور حدیث میں ابتدائی طور پر موجود ہے، لیکن ان کی تفصیلات کو جاننا سائنٹفک مطالعے پر موقوف تھا جس کو قرآن میں زمین وآسمان پر تفکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سائنسی مطالعے کے اِس کام کا آغاز امتِ مسلمہ کے افراد نے کیا تھا، لیکن اس کی تکمیل

تمام تر اہلِ مغرب کے ذریعے انجام پائی۔ یہی وہ کام ہے جس کو موجودہ زمانے میں، ماڈرن سائنس (modern science) کہا جاتا ہے۔ ماڈرن سائنس کا نظریاتی حصہ پورا کا پورا قرآن کی اِس آیت کی تفصیل ہے۔ قدیم زمانے میں آیات اللہ کا علم صرف عینی مشاہدے کے ذریعے ممکن ہوتا تھا، اہلِ مغرب نے اس کو وسیع کرکے دور بینی مشاہدہ اور خورد بینی مشاہدے تک پہنچا دیا۔

موجودہ زمانے کی نظریاتی سائنس نے فطرت (nature) کے بارے میں جو حقیقتیں دریافت کی ہیں، اُن کے ذریعے سے پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ انسان تخلیق میں خالق کو دریافت کرسکے، وہ معرفتِ حق کے اُن اعلیٰ درجات تک پہنچ سکے جو قدیم روایتی دور میں انسان کے لیے ممکن نہ تھا۔

2۔ اِس معاملے میں اہلِ مغرب کی دوسری دین یہ ہے کہ انھوں نے شکر خداوندی کے نئے بے شمار آئٹم دریافت کیے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ انعامات کو شعوری طور پر جانے اور اُن کے لیے منعم کا اعتراف کرے۔ اِسی اعتراف کا مذہبی نام شکر ہے۔ شکر کی حیثیت دین کے اہم ترین مطلوب کی ہے، لیکن اعلیٰ شکر، انعامات کی اعلیٰ معرفت ہی سے ہوسکتا ہے، اور یہ وہ کام ہے جو تاریخ میں پہلی بار اہلِ مغرب کے ذریعے انجام پایا۔

اِس سلسلے میں قرآن کی ایک متعلق آیت یہ ہے: وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (14: 34) یعنی خدا نے تم کو وہ سب کچھ دے دیا جو تم نے اُس سے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم گن نہیں سکتے۔ یقیناً انسان بہت ظالم اور بہت ناشکر گزار ہے۔

خالق نے انسان کو اس کی ضرورت کی تمام چیزیں بطور عطیہ دے دی ہیں۔ یہ عطیات سب کے سب خدائی انعامات ہیں۔ اِن عطیات کی واقفیت سے اللہ کے لیے بے پناہ شکر پیدا ہوتا ہے۔ یہ عطیات یا نعمتیں بے شمار ہیں، مگر قدیم زمانے میں انسان اِن میں سے بہت کم عطیات کو جانتا تھا۔ ایسی حالت میں وہ بڑا شکر نہیں کرسکتا تھا۔ جدید مغربی سائنس نے فطرت میں چھپے ہوئے بے شمار نئے عطیات کو دریافت کیا اور جدید صنعت اور ٹکنالوجی کے ذریعے اس کو عام انسان کے لیے

قابلِ حصول بنا دیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو اہلِ مغرب کے ذریعے پہلی بار انجام پایا۔ اِس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ انسان اپنے رب کے لیے زیادہ بڑا شکر ادا کرسکے — اہلِ مغرب کا یہ عطیہ بلاشبہہ تائیدِ دین کی ایک اعلیٰ مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

3۔ اِس سلسلے میں اہلِ مغرب کی تیسری دین وہ ہے جس کو عالمی مواصلات کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب تھا کہ اس نے اپنا پیغام جو پیغمبروں کے ذریعے بھیجا ہے، وہ تمام اہلِ عالم تک پہنچے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا (25:1) یعنی بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل کیا، تاکہ وہ تمام عالم کے لیے آگاہ کرنے والا ہو۔

یہی بات حدیث میں پیشین گوئی کی زبان میں اِس طرح آئی ہے: لایبقی علی ظهر الأرض بیت مدر ولا وبر إلا أدخله الله كلمة الإسلام (مسند أحمد، رقم الحديث: 24215) یعنی زمین کی سطح پر کوئی گھر یا خیمہ نہیں بچے گا، مگر اللہ اس میں اسلام کا کلمہ داخل کردے گا۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو یہ مطلوب تھا کہ اُس نے پیغمبروں کے ذریعے جو ہدایت نامہ بھیجا ہے، وہ دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں تک پہنچے۔ مگر قدیم زمانے میں یہ عالمی پیغام رسانی ممکن نہ تھی۔ قدیم زمانے میں دعوت الی اللہ کا کام عملاً صرف مقامی طور پر ہوا، وہ عالمی طور پر انجام نہ پاسکا۔ موجودہ زمانے میں پہلی بار وہ ذرائع اور وسائل وجود میں آئے ہیں جن کو استعمال کرکے کرہ ارض کے ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں اللہ کا پیغام پہنچ جائے، زمین پر بسنے والا کوئی بھی انسان اُس سے بے خبر نہ رہے۔

یہ ذرائع اور وسائل خالق نے فطرت (nature) کے اندر بڑے پیمانے پر رکھ دئے تھے، مگر قدیم زمانے میں اِن ذرائع اور وسائل کو دریافت کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ اہلِ مغرب نے پہلی بار ان کو دریافت کیا اور ان کو صنعتی مصنوعات (industrial products) کی صورت دے کر داعیوں اور مبلغوں کے لیے قابلِ حصول بنا دیا۔

4۔ قدیم زمانے میں اقوام کی تنظیم (international organisation) کا تصور نہ تھا۔

قدیم زمانے میں صرف سیاسی تنظیم (political organisation) کا تصور تھا، جو کسی بڑی سلطنت کے تحت بذریعہ طاقت قائم ہوتا تھا۔ اِس تصور کے تحت قدیم زمانے میں وہ نظریہ وضع ہوا جس کو جنگ برائے امن (war for peace) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ اقتدار کے باہر اصول کی بنیاد پر قوموں کی تنظیم قائم کی جائے جو بین اقوامی معاملات میں اقتدار کے استعمال کے بغیر پرامن طور پر فیصلہ کن رول ادا کر سکے۔

قدیم زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ امن صرف سیاسی اقتدار کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ اِس تصور کا نتیجہ یہ تھا کہ قدیم زمانے میں ہزاروں سال تک ساری دنیا میں جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ طریقہ خدا کے تخلیقی منصوبے کے خلاف تھا۔ خدا کے تخلیقی منصوبے کا تقاضا ہے کہ قوموں کے درمیان پرامن تعلقات ہوں، تاکہ دعوت اور تعلیم جیسا تعمیری کام کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہے۔ اِس لیے اسلام میں یہ مطلوب تھا کہ بین اقوامی امن کو سیاسی اقتدار سے الگ کردیا جائے۔ بین اقوامی امن کو معاہدات کی بنیاد پر قائم کیا جائے، نہ کہ سیاسی اقتدار کی بنیاد پر۔

پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے زمانے میں جو انقلاب آیا، اُس کا ایک پہلو یہ بھی تھا۔ اُس زمانے میں پہلی بار ایسا ہوا کہ معاہدات کی بنیاد پر بین الاقوامی امن کا قیام عمل میں آیا۔ یہ معاہدہ حدیبیہ تھا جو 628 عیسوی میں تشکیل پایا۔ اِس معاہدہ امن میں براہِ راست طور پر اہلِ مدینہ اور اہلِ مکہ شامل تھے، لیکن بالواسطہ طور پر یہود بھی اس میں شامل تھے جو کہ اُس وقت مدینہ کی آبادی کا تقریباً نصف حصہ تھے۔ تاریخ کا یہ پہلا بین الاقوامی معاہدہ امن تھا جو اِس لیے کیا گیا کہ قومی تعلقات کو جنگ کے بجائے امن کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔

معاہدہ حدیبیہ صرف ایک واحد واقعہ نہ تھا، وہ تاریخ میں ایک نئے دورِ امن کا آغاز تھا۔ اس کے بعد تاریخ میں ایک نیا عمل شروع ہوا، جو سفر کرتے ہوئے یورپ تک پہنچا۔ چناں چہ 1920 میں جنیوا (سوئزرلینڈ) میں ایک بین اقوامی ادارہ قائم کیا گیا جس کا نام جمعیتِ اقوام (League of Nations) تھا۔ اِس جمعیت میں کُل 63 قومیں شامل تھیں، البتہ امریکا اس میں شامل نہ تھا۔ یہ تنظیم مستقل ثابت نہ

ہوسکی، یہاں تک کہ 1946 میں باقاعدہ طور پر اس کے خاتمے کا اعلان کردیا گیا۔

اِس کے بعد اِس مقصد کے لیے 1945 میں نئی اور زیادہ بڑی تنظیم قائم ہوئی۔ اس کا نام تنظیم اقوامِ متحدہ (United Nations Organisation) تھا۔ اِس دوسری تنظیم میں 193 ممالک شامل ہیں۔ اس کا صدر دفتر نیو یارک (امریکا) میں ہے۔ یہ ایک غیر سیاسی تنظیم ہے۔ وہ امن کے میدان میں زیادہ موثر رول ادا کر رہی ہے۔

یہ واقعہ بھی انھیں واقعات میں سے ہے جس کا ذکر ''تائید دین'' کے طور پر کیا گیا ہے، اِس واقعے کو دوسرے الفاظ میں، دورِ شمشیر کو ختم کر کے عملاً دورِ امن کو لانا کہا جاسکتا ہے۔ بین اقوامی تعلقات میں یہ تبدیلی عین اسلام کے حق میں ہے۔ یہ واقعہ اُس تاریخی عمل (historical process) کا نقطہ انتہا ہے جس کا آغاز ساتویں صدی کے ربع اول میں معاہدہ حدیبیہ کے ذریعے کیا گیا تھا۔

قدیم زمانے میں جنگ اور امن کا کوئی متفقہ اصول نہ تھا۔ جو لوگ سیاسی اقتدار پر قابض ہوتے تھے، وہی جنگ اور امن کا فیصلہ کرتے تھے۔ قوموں کے درمیان معاہداتی تنظیم کے مذکورہ طریقے نے اِس صورتِ حال کو ختم کردیا۔ اب یہ ممکن ہوگیا کہ باہمی مسائل کا فیصلہ بین اقوامی گفت وشنید (international negotiation) کے ذریعے طے کیا جائے اور باہمی اختلافات کے باوجود عالمی امن کو برقرار رکھا جائے ۔ اِس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ ہر حال میں تعمیری سرگرمیاں کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہیں ۔

جو لوگ چیزوں کو معیار کے پیمانہ (ideal yardstick) سے ناپتے ہیں، وہ ان اداروں پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ پہلے وہ جمعیت اقوام کے ناقد تھے، اب وہ اقوامِ متحدہ کے ناقد بنے ہوئے ہیں، مگر یہ صرف بے دانشی کی بات ہے۔ یہ لوگ معیاری امن (ideal peace) کی باتیں کرتے ہیں، مگر اِس دنیا میں معیاری امن کا حصول سرے سے ممکن ہی نہیں۔

اِس دنیا میں کوئی چیز صرف خدا کے تخلیقی منصوبے کے تحت ہی حاصل کی جاسکتی ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کے تخلیقی منصوبے کے تحت اِس دنیا میں صرف قابلِ عمل امن (workable peace)

کا حصول ممکن ہے، اور بلاشبہہ اقوام متحدہ نے قابلِ عمل امن کے حصول کو ممکن بنا دیا ہے۔

خدا کے منصوبے کے مطابق، اِس دنیا میں انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے۔ اِس آزادی کو منسوخ کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِس دنیا میں کوئی چیز معیاری درجے میں نہیں، بلکہ صرف قابلِ عمل (workable) درجے میں حاصل ہوتی ہے، خواہ وہ امن اور عدل ہو یا اور کوئی چیز۔

قرآن کی سورہ الانفال میں رسول اور اصحابِ رسول کو ایک حکم اِن الفاظ میں دیا گیا تھا: وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (8:39) یعنی تم اُن سے قتال کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب کا سب، اللہ کے لیے ہو جائے۔

اِس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، وہ قرآن کے مخصوص اسلوب میں یہی بات ہے۔ دوسرے الفاظ میں، اِس حکم کا مطلب یہ ہے کہ — اپنی ساری طاقت استعمال کرکے تاریخ میں ایک نیا پراسس جاری کرو جس کے نتیجے میں ایسا ہو کہ دنیا میں جنگ کی حالت نہ رہے اور امن کی حالت قائم ہو جائے۔ قرآن کی یہ آیت ایک دور کو ختم کرنے اور دوسرے دور کا آغاز کرنے کے معنی میں ہے، نہ کہ کسی وقتی کارروائی کے معنی میں۔

استبدالِ قوم کا قانون

قرآن میں ایک خدائی قانون کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (47:38) یعنی اگر تم پھر جاؤ تو اللہ تمھاری جگہ دوسری قوم کو لے کر آئے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

قرآن کی اِس آیت میں جس استبدال (replacement) کا ذکر ہے، اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو سے اس کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر عمومی طور پر زوال اور فساد آجائے تو اللہ تعالی کو یہ مطلوب ہوگا کہ یہ صورتِ حال بدلے اور ایسے اہلِ ایمان پیدا ہوں جو صحیح معنوں میں دینِ خداوندی پر قائم ہوں۔ لیکن اِس استبدال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بگڑی ہوئی امت اگر ایک بلین کی تعداد میں ہے تو اس کی جگہ ایک بلین ہی کی تعداد میں دوسری صالح امت پیدا کر دی جائے۔

یہ استبدال ہمیشہ افراد کے اعتبار سے ہوتا ہے، نہ کہ مجموعی طور پر ایک پوری امت کے اعتبار سے۔

اِس استبدال کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا، یعنی اظہارِ دین کے اجزا کو دریافت کرنے میں اگر امتِ مسلمہ ناکام ہو جائے تو اللہ تعالی سیکولر طبقے میں سے ایسے مؤیدین کو اٹھائے گا جو اس کام کو انجام دیں اور معرفت اور شکر اور دعوت کے اعلی درجات تک پہنچنے کو ممکن بنا دیں۔

خلاصہ کلام

انسان کے بارے میں اللہ کا تخلیقی منصوبہ (creation plan) یہ ہے کہ انسان کو آزادی دے کر اس کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ خود دریافت کردہ معرفت (self-discovered realisation) پر کھڑا ہو اور کامل اختیار رکھتے ہوئے اللہ کے تخلیقی منصوبے کے تحت زندگی گزارے۔ جو لوگ اِس امتحان میں کامیاب ہوں، وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کی ابدی جنتوں میں داخل کیے جائیں گے۔ اللہ نے نبیوں کو اِسی لیے بھیجا کہ وہ انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی رہنمائی کریں۔ اِس رہنمائی کے مختلف مراحل ہیں، جو کہ قرآن وحدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیم کا زمانہ تقریباً چار ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ حضرت ابراہیم کے زمانے تک جو پیغمبر آئے، وہ انفرادی سطح پر انسان کو رہنمائی دیتے رہے۔ حضرت ابراہیم کے بعد ایک نئی منصوبہ بندی کی گئی، یعنی ایک قوم وجود میں لانا اور تاریخ میں ایک انقلابی عمل (revolutionary process) جاری کرنا، جو بالآخر اللہ کے دین کے کامل اظہار تک پہنچ جائے۔

یہ نیا منصوبہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل سے شروع ہوا۔ اس کے بعد رسول اور اصحاب رسول کے ذریعے اس کو طاقت ور تحریک (boost) ملی۔ اِس کے بعد امتِ مسلمہ کی حکومتوں کا دور آیا۔ اِس دورِ اقتدار میں خدا کا دین اصولی اور نظریاتی طور پر پوری طرح محفوظ ہو گیا۔ اِسی کے ساتھ تاریخ میں ایک نیا عمل جاری ہوا۔

اِس آخری دور میں اہلِ مغرب نے بالواسطہ طور پر تائید کا رول ادا کیا۔ انھوں نے فطرت کے قوانین کو دریافت کرکے اِس بات کو ممکن بنا دیا کہ خدا کے دین کو انسان کے مسلّمہ علمی معیار پر مدلل کیا جاسکے۔

عطیاتِ الٰہی کے چھپے ہوئے اجزا کو دریافت کرکے انھوں نے اِس بات کو ممکن بنایا کہ انسان اعلیٰ عطیاتِ الٰہی کا تجربہ کرے اور اپنے رب کے لیے اعلیٰ شکر کا رسپانس دے سکے۔ اِس طرح اہلِ مغرب نے یہ کیا کہ انھوں نے فطرت کے اندر چھپے ہوئے امکانات کو دریافت کرکے جدید مواصلات تک دست رس حاصل کی۔ اِس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ اللہ کے پیغام کو عالمی سطح پر ہر عورت اور مرد تک پہنچایا جاسکے۔ اِسی طرح اہلِ مغرب نے انسانی تاریخ کو دورِ سیاست سے نکال کر دورِ تنظیم (age of organization) تک پہنچایا۔ اِس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ سیاسی طاقت کے بغیر آزادانہ طور پر تمام دینی تقاضے انجام دئے جاسکیں۔

جہاں تک حفاظتِ دین کا تعلق ہے، اس کو تمام تر امتِ مسلمہ نے انجام دیا۔ اظہارِ دین کے کام کا آغاز بھی امتِ مسلمہ کے ذریعے ہوا، لیکن کامل اظہار کے لیے جو وسائل درکار تھے، وہ قدیم زمانے میں موجود نہ تھے۔ اِس میدان میں بھی امتِ مسلمہ نے ابتدائی کام کیا، لیکن اس کو اتمام تک پہنچانا باقی تھا۔ اظہارِ دین کا یہ تکمیلی مرحلہ اہلِ مغرب کی جدید دریافتوں کے ذریعے انجام پایا۔ تاہم اس معاملے میں اہلِ مغرب کا حصہ تائید باعتبارِ وسائل ہے، تاہم تائید کا یہ واقعہ اتفاقاً پیش نہیں آیا، بلکہ وہ اُس تاریخی عمل (historical process) کا نقطہ انتہا (culmination) تھا جو امتِ مسلمہ کے ذریعے ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا۔

قرآن کا تصورِ تاریخ—ایک جائزہ

انسائکلو پیڈیا برٹینکا میں حسب ذیل عنوان کے تحت ایک مقالہ چھپا ہے: (Historiography and Historical Methodology) اِس مقالے میں ایک ذیلی عنوان (Muslim Historiography) قائم کیا گیا ہے۔ اِس کے تحت مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ — محمد نے اسلام کو ایک ایسے مذہب کی حیثیت سے پیش کیا جس میں تاریخ کا طاقت ور تصور موجود تھا۔ اسلام کی مقدس کتاب قرآن انتباہات سے بھرا ہوا ہے جو کہ تاریخ کے اسباق سے ماخوذ ہے:

> Muhammad made Islam a religion with a strong sense of history. The Quran, Islam's holy book, is full of warnings derived from the lessons of history. (EB. 8/959, 1974)

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس سے قرآن کا تصورِ تاریخ معلوم ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں شاہی خاندان (dynasty) کو یونٹ بنا کر تاریخ لکھی جاتی تھی۔ عبدالرحمن ابن خلدون (وفات: 1406) کے بعد ایک نیا دور آیا، جب کہ نیشن (nation) کو یونٹ بنا کر تاریخ لکھی جانے لگی۔ اس کے بعد آرنلڈ ٹائن بی (وفات: 1975) نے بارہ جلدوں میں ایک کتاب (*A Study of History*) لکھی۔ اِس میں تہذیب (civilization) کو یونٹ بنا کر پوری انسانی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

قرآن کا تصورِ تاریخ اِن سب سے مختلف ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کا تصورِ تاریخ خدائی منصوبہ (divine plan) پر مبنی ہے، یعنی خدا کے تخلیقی پلان کی روشنی میں انسانی تاریخ کا جائزہ لینا۔ زیر نظر مقالے میں اِس قرآنی تصور کے مطابق، تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اِس جائزے کے لیے بنیادی طور پر 9 ذیلی عنوانات مقرر کئے گئے ہیں— خلافتِ آدم، اعلان واِسرار، ذبحِ عظیم، احسن القصص، مقامِ محمود، آیتِ اسرا، اظہارِ دین، لوحِ محفوظ، ادخالِ کلمہ۔

جنتی افراد، جنتی معاشرہ

قرآن کی ایک آیت یہ ہے: **وما خلقتُ الجن والإنس إلا ليعبدون** (51: 56) یعنی

میں نے جن اور انس کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ صحابی مفسر عبداللہ بن عباس نے اِس آیت میں 'لیعبدون' کی تشریح 'لیعرفون' سے کی ہے، یعنی جنات اور انسان کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کی معرفت (realization) حاصل کریں۔

معرفت کا تعلق فرد سے ہے۔ کیوں کہ یہ ایک فرد ہی کا ذہن ہے جو اِس موضوع پر غور وفکر کرتا ہے اور پھر اس کا ذہن اُس فکری واقعے کا تجربہ کرتا ہے جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خالق کے منصوبے کے مطابق، تخلیق کا نشانہ یہ ہے کہ ایسے افراد پیدا ہوں جو عارف باللہ کا درجہ رکھتے ہوں۔ اِس کے مطابق، تخلیق کا نشانہ افراد ہیں، نہ کہ کوئی مجموعہ یا نظام۔

تخلیق کا نشانہ وہی چیز ہوسکتی ہے جو فی الواقع قابلِ حصول ہو۔ اِس پہلو سے انسانی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر دور میں بلا شبہہ ایسے افراد پیدا ہوئے جو عارف باللہ (realized person) کی حیثیت رکھتے تھے۔ اِس کے برعکس، اگر مقصدِ تخلیق کو اجتماعی معنوں میں لیا جائے، مثلاً صالح معاشرہ بنانا، عادلانہ نظام کی تشکیل، عالمی سطح پر حکومتِ الٰہیہ کا قیام، زندگی کے تمام شعبوں میں شرعی قوانین کا نفاذ، وغیرہ۔ اِس طرح کے اجتماعی انقلاب کو برپا کرنا اگر تخلیق کا نشانہ ہو، تو وہ پوری تاریخ بشری میں کبھی معیاری معنوں میں وقوع میں نہیں آیا، نہ انبیا کے زمانے میں اور نہ انبیا کے زمانے کے بعد۔

آدم کی تخلیق سے لے کر اب تک انسانی تاریخ پر بہت لمبا عرصہ گزر چکا ہے۔ اِس پوری مدت میں، انبیا یا پیروانِ انبیا کے ذریعے مسلسل طور پر یہ کام ہوتا رہا کہ تخلیق کا منصوبہ پورا ہو۔ یہ لوگ اللہ کے نمائندے تھے اور اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے نمائندوں کی ضرور مدد کرتا ہے، نہ صرف آخرت میں بلکہ موجودہ دنیا میں بھی (40: 51)۔ اِس طرح کی قرآنی آیات کی روشنی میں ہم کو یہ ماننا ہوگا کہ انبیا اور اُن کے پیرووں کا مشن یقینی طور پر کامیاب ہوا۔

یہ ایک مسلّمہ واقعہ ہے کہ اِن حضرات کی کوششیں پورے انسانی مجموعہ یا نظام کی سطح پر کبھی معیاری معنوں میں کامیاب نہیں ہوئیں، البتہ افراد کی سطح پر وہ ہمیشہ کامیاب ہوئیں۔ ہر زمانے میں اور

ہر کوشش کے ذریعے ایسے افراد وجود میں آئے جو پورے معنوں میں عارف باللہ تھے، جنھوں نے اپنی ذات کے اعتبار سے اللہ کو اپنا کنسرن بنایا، جو اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے تھے اور جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے بھی۔

اِس تاریخی تجربے کا تقاضا ہے کہ خالق کے منصوبۂ تخلیق کی کامیابی کا معیار پورے مجموعۂ انسانیت (mankind) کو قرار نہ دیا جائے، بلکہ اس کی کامیابی کا معیار افراد کو قرار دیا جائے۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو خالق کا منصوبہ تخلیق آخری حد تک کامیاب نظر آئے گا۔ آدم سے قبل جنات پیدا کئے گئے تھے (15: 27)۔ جنات کی بڑی اکثریت اگرچہ سرکش بن گئی، لیکن قرآن کے مطابق، اُن میں شخصی اعتبار سے اعلیٰ درجے کے صالح افراد بھی پیدا ہوئے (72: 11)۔ اِس طرح انبیا کے زمانے میں اگر چہ یہ ہوا کہ انبیا کے مخاطبین کی بڑی اکثریت منکر بنی رہی، لیکن انھیں کے درمیان یہ واقعہ بھی ہوا کہ شخصی اعتبار سے اعلیٰ درجے کے صالح افراد پیدا ہوتے رہے۔ اِسی طرح ختم نبوت کے بعد دُعاۃ (داعیوں) کی کوششوں کے ذریعے بھی یہ واقعہ پیش آیا کہ اگرچہ نظام یا مجموعہ انسانیت کی سطح پر کبھی کامل معنوں میں صالح انقلاب نہیں آیا، لیکن شخصی سطح پر ہر دور میں بلاشبہہ ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جو عارف باللہ کا درجہ رکھتے تھے۔

اسلام کے مطابق، انسانی زندگی کے دو دور ہیں، قیامت سے پہلے اور قیامت کے بعد۔ قیامت سے پہلے کا دور برائے امتحان ہے اور قیامت کے بعد کا دور برائے انجام۔ یہ دونوں دور خالقِ کائنات کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ دونوں دور یکساں طور پر پوری طرح کامیاب دور ہوں۔ یہ خالق کے منصوبۂ تخلیق کا کمتر اندازہ (underestimation) ہوگا کہ کامیابی کے اعتبار سے دونوں دوروں میں فرق کیا جائے۔ اس اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں دوروں کی بہترین توجیہہ یہ ہے کہ پہلے دور کو انتخابِ افراد کا دور (period of individual selection) قرار دیا جائے اور دوسرے دور کو اقامتِ سماج (establishment of society) کا دور کہا جائے، یعنی پہلے دور میں اس اعلیٰ سماج کے لئے مستحق افراد (deserving individuals) کا انتخاب اور

دوسرے دور میں پوری تاریخ کے ان مشترک افراد کو یکجا کرکے ان کی بنیاد پر ایک اعلیٰ معاشرہ (high society) بنانا۔ انسانی حیات کا یہی وہ دوسرا دور ہے جس کو قرآن میں جنت کہا گیا ہے۔

خلافتِ آدم

قرآن کے مطابق، انسانیت کا آغاز آدم اور حوا کی تخلیق سے ہوا۔ آدم پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی۔ قرآن کے بیان کے مطابق، انسان کی پیدائش سے پہلے سیارۂ ارض پر ایک ناری مخلوق جنات کو بسایا گیا تھا (15: 27)۔ یہ غالباً اُس وقت کی بات ہے جب کہ زمین ابھی گرم حالت میں تھی۔ اِس کے بعد جب زمین ٹھنڈی ہوئی اور یہاں کے سمندروں میں پانی بھر گیا تو اس کے بعد اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے لیے خلافتِ ارضی کا فیصلہ کیا۔ اِس لحاظ سے انسان، خلیفۃ الجن ہے۔ روایات کے مطابق، جنات نے زمین پر فساد بر پا کیا، اِس لیے زمین کا چارج جنات سے چھین لیا گیا اور اس کو انسان کے حوالے کیا گیا۔ اِسی معاملے کو قرآن میں ''خلافت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

موجودہ زمین پر انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے بسایا گیا ہے، لیکن یہ آزادی ایک مشروط آزادی ہے۔ اِس کے مطابق، موجودہ زمین انسان کے لیے ایک امتحان گاہ ہے، وہ انسان کے لیے عیش گاہ نہیں۔ اِس معاملے کی ایک عملی مثال ابلیس اور ملائکہ کی صورت میں قائم کردی گئی ہے۔ جو لوگ ملائکہ کی مانند خدا کے حکم کے آگے سرینڈر کردیں، وہ قیامت کی عدالت میں کامیاب قرار پائیں گے، اور جو لوگ ابلیس کی مانند خدا کے حکم کے آگے سرینڈر نہ کریں، وہ قیامت کی عدالت میں ناکام قرار دئے جائیں گے۔ انسان کا یہ امتحان خود انسان کی سطح پر ہے، جیسا کہ ابلیس اور ملائکہ کے معاملے میں پیش آیا۔ اِس معاملے سے انسان کو ہر زمانے اور ہر نسل میں باخبر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے۔ یہ پیغمبر لوگوں کی اپنی زبان میں صراطِ مستقیم کی وضاحت کرتے رہے۔ یہ پیغمبر جو کچھ کہتے تھے، وہ اللہ کی وحی سے کہتے تھے۔ تمام پیغمبروں کا ایک ہی مشترک اصول تھا — نصح وخیر خواہی، یعنی اپنے مدعو کی یک طرفہ طور پر خیر خواہی، مدعو کی طرف سے پیش آنے والی کسی بھی زیادتی پر ردعمل کا طریقہ اختیار کئے بغیر مثبت انداز میں اپنا پیغام دیتے رہنا۔

خدا اور فرشتوں کا مکالمہ

آدم کی تخلیق کے وقت خدا اور فرشتوں کے درمیان ایک مکالمہ ہوا۔ اِس سلسلے میں قرآن کی آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اُس میں فساد برپا کریں اور خون بہائیں، اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا: میں جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھائے آدمی کو سارے نام، پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے اُن لوگوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہم کو بتایا۔ بے شک، تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے''۔ (2: 30-32)

یہاں یہ سوال ہے کہ وہ کیا بات تھی جس پر فرشتوں کو اشکال پیدا ہوا، اور بعد کو کیا چیز اُن کے علم میں آئی جس کے بعد اُن کا اشکال دور ہو گیا۔ اصل یہ ہے کہ ابتدا میں فرشتوں نے آدمی کی نسل کو اس کے پورے مجموعۂ انسانیت کے اعتبار سے لیا۔ اُن کو نظر آیا کہ جس طرح اختیار پا کر جنات کا گروہ سرکش بن گیا، اس طرح اختیار پانے کے بعد انسانی نسل بھی مجموعی طور پر سرکش بن جائے گی۔

مگر اللہ تعالیٰ نے ایک مظاہرے کے ذریعے انسانی نسل کے منتخب افراد کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور آدم نے اِن منتخب افراد کا تعارف کرایا۔ اُس وقت فرشتوں کو اندازہ ہوا کہ اگر چہ مجموعہ کے اعتبار سے انسانی نسل میں فساد آجائے گا، لیکن عمومی فساد کے باوجود ہر زمانے میں ایسے افراد پیدا ہوں گے جو فساد سے خالی ہوں اور اصلاح کے راستے پر چلنے والے ہوں۔ نسلِ انسانی کے اِنھیں منتخب افراد کو قرآن میں انبیا اور صدیقین اور شہدا اور صالحین (4: 69) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

اِس مظاہرے کے بعد فرشتوں کو اللہ کے تخلیقی منصوبے کا علم ہوا۔ فرشتوں نے جانا کہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کا تعلق پورے مجموعۂ انسانیت کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ وہ اِس مجموعے کے استثنائی افراد سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جنت کی معیاری دنیا میں آباد کرنے کے لیے ایسے افراد درکار تھے جو مکمل آزادی کے باوجود اپنے آپ کو سرکشی سے بچائیں اور خدا کی زمین پر خدا کے مطیع بن کر رہیں۔

ایسے افراد صرف کھلی آزادی کے ماحول میں بن سکتے تھے، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے اس کو کامل آزادی کے ماحول میں بسایا اور پھر فرشتوں کو مقرر کیا کہ وہ اُن استثنائی افراد کا ریکارڈ تیار کریں جو دباؤ کے بغیر خدا کی معرفت حاصل کریں اور پھر اپنے آزادانہ فیصلے کے تحت اپنے آپ کو اللہ کی مرضی کا پابند بنائیں۔ یہی استثنائی افراد اللہ کے مطلوب افراد ہیں۔ انھیں مطلوب افراد کا انتخاب کر کے اُن کو جنت کی معیاری دنیا میں بسایا جائے گا۔

اعلان واِسرار

حضرت آدم کے بعد ان کی نسل جس علاقے میں پھیلی، وہ غالباً وہی علاقہ تھا جس کو میسوپوٹامیا (Mesopotamia) کہا جاتا ہے، یعنی دجلہ اور فرات کے درمیان کا زرخیز علاقہ۔ حضرت آدم کے بعد کئی نسلوں تک وہ درست حالت پر قائم رہے۔ پھر ان کے درمیان بگاڑ آیا۔ ان میں شرک پھیل گیا، یعنی خالق کے بجائے مخلوق کی پرستش کرنا۔ اِس کے بعد ان کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ حضرت نوح نے وحی کے ذریعے ان کو خدا اور آخرت کا پیغام دیا۔ ان کی کوشش سے ان کی قوم کی ایک محدود تعداد اُن پر ایمان لائی، لیکن قوم کی بڑی اکثریت سرکشی پر قائم رہی۔ حضرت نوح نے اپنی دعا میں کہا تھا کہ — خدایا، میں نے اعلان کے ساتھ بھی کام کیا اور اسرار کے ساتھ بھی (71: 9)۔

اِس آیت میں اعلان سے مراد قوم سے اجتماعی خطاب ہے، اور اِسرار سے مراد انفرادی سطح پر اُن کو نصیحت کرنا ہے۔ حضرت نوح نے لمبی مدت تک دونوں طریقے سے اپنا دعوتی مشن جاری رکھا، مگر قوم کی سرکشی ختم نہ ہوسکی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بڑا طوفان بھیجا جس میں چند لوگ زندہ بچے جو حضرت نوح کی کشتی پر سوار تھے، بقیہ پوری قوم طوفان میں غرق ہو کر ہلاک ہوگئی۔

کہا جاتا ہے کہ اِس طوفان کے بعد حضرت نوح کے تین بیٹے زندہ بچے جن کا نام حام، سام، یافث تھا۔ اِنھیں تین بیٹوں سے بعد کی انسانی نسل چلی اور پھر وہ دھیرے دھیرے پوری سطح ارض پر پھیل گئی۔ جب انسانی نسل زمین کے مختلف حصوں میں آباد ہوئی تو ہر جگہ اللہ تعالیٰ نے انھیں میں سے کسی فرد کو

پیغمبر بنایا جس نے اپنی قوم کو خدائی صداقت کا پیغام دیا۔ مگر جو انجام ہوا، وہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ لوگوں نے اپنے پیغمبروں کا مذاق اڑایا اور ان کو ماننے سے انکار کر دیا (36: 30)۔

اِس عام گمراہی کا سبب لوگوں کی ظاہر پرستی تھی۔ لوگ مخلوقات کو دیکھتے تھے، مگر خالق ان کو نظر نہ آتا تھا۔ اِس بنا پر ایسا ہوا کہ مخلوقات میں سے جو چیز بظاہر بڑی دکھائی دی، اُسی کو انھوں نے اپنا معبود سمجھ لیا اور اس کو پوجنے لگے۔ مثلاً سورج اور چاند، وغیرہ۔ اِس عام گمراہی کی بنا پر ایسا ہوا کہ پیغمبروں کی یا پیغمبروں کے مشن کی کوئی تاریخ ریکارڈ نہ ہوسکی۔ انسان نے جب لکھنا پڑھنا سیکھا تو اس نے اپنی تاریخ بھی لکھی، مگر اِن تاریخوں میں بادشاہوں اور جنرلوں کے واقعات لکھے گئے، مگر پیغمبروں کو یا ان کے مشن کو نا قابلِ ذکر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک کسی بھی پیغمبر کا حوالہ مدوّن تاریخ (recorded history) میں موجود نہیں۔

تاہم موجودہ زمانے میں زمین کی کھدائی سے پیغمبروں کے دور کے کچھ آثار برآمد ہوئے ہیں جن کی بنیاد پر کچھ پیغمبروں کے حالات مورخین نے تحریر کئے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم انیسویں صدی عیسوی تک تاریخی شخصیت نہیں سمجھے جاتے تھے۔ بیسویں صدی کے نصف اول (1943-1922) میں کھدائی (excavation) کے ذریعے عراق کا قدیم شہر اُر (Ur) دریافت ہوا جو کہ حضرت ابراہیم کا مقامِ عمل تھا۔ اِس کے بعد پیغمبر ابراہیم کو ایک تاریخی شخصیت کی حیثیت سے مان لیا گیا۔

ذبحِ عظیم

ہزاروں سال تک پیغمبروں کو نظر انداز کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ضرورت تھی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے خدائی مشن کی ایک تاریخ بنے۔ وہ انفرادی واقعات سے بڑھ کر ایک تہذیب (civilization) کی صورت اختیار کر لے۔ اِس مقصد کے لیے ضرورت تھی کہ بڑی تعداد میں ساتھی ملیں، جن سے ایک مضبوط ٹیم تیار ہو۔ یہ ٹیم جدوجہد کر کے صورتِ حال کو بدلے۔ وہ تاریخ میں ایک نیا دور لائے، جب کہ خدائی مشن ایک تہذیب کی صورت اختیار کر لے۔ اِس قسم کی مطلوب ٹیم بنانے کے لیے وہ واقعہ ہوا جس کو قرآن میں ذبحِ عظیم (37: 107) کہا گیا ہے۔

ہزاروں سال تک ایسا ہوا کہ پیغمبر آتے رہے، مگر بڑی تعداد میں قبولِ ایمان نہ کرنے کی وجہ سے کسی پیغمبر کے ساتھ کوئی ٹیم نہیں بنی۔ اِس کا سبب وہی چیز تھی جس کو ماحول کی کنڈیشننگ کہا جاتا ہے۔ اِس کنڈیشننگ کا ذکر حدیث میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: كل مولود يولد على الفطرة، فأبواه يهودانه، أويمجسانه، أوينصرانه (صحيح البخاري، رقم الحديث: 1385)۔

اِس صورتِ حال کی بنا پر آبائی مذہب ایک سماجی رواج بن گیا تھا۔ اِس تسلسل کو توڑنے کے بعد ہی یہ ممکن تھا کہ ایک ایسی نئی نسل بنائی جائے جو اپنی فطری حالت پر قائم ہو اور پھر پیغمبر کی دعوت کو قبول کرکے وہ خدا پرست انسانوں کی ٹیم کا حصہ بن سکے۔

اِس مخصوص منصوبے کے تحت، حضرت ابراہیم نے یہ کیا کہ وہ اُس دور کے متمدن ملک عراق کو چھوڑ کر عرب کے صحرا میں آئے اور یہاں خالص صحرائی ماحول میں اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو آباد کیا۔ صحرائی ماحول میں آباد کرنے کا مقصد یہ تھا کہ متمدن دنیا سے منقطع ہو کر ایک نسل بنے جو متمدن ماحول کی کنڈیشننگ (conditioning) سے پاک ہو۔

یہی وہ خصوصی منصوبہ تھا جس کے تحت حضرت ابراہیم کو یہ خواب دکھایا گیا کہ آپ اپنے بیٹے اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں (37: 102)۔ حضرت ابراہیم نے اِس معاملے کو اپنے بیٹے کے جسمانی ذبح کے ہم معنی سمجھا اور بیٹے کو لٹا کر اس کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ عین اُس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اسماعیل کے جسمانی ذبیحہ سے روک دیا۔ اُس وقت فرشتے نے کہا کہ آپ بیٹے کے بجائے ایک دنبہ ذبح کر دیں اور بیٹے کو لے جا کر صحرا میں اُس مقام پر بسا دیں، جہاں آج مکہ آباد ہے۔

اِس واقعے کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: وَفَدَيْنَٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (37: 107) یعنی ہم نے چھڑا لیا اسماعیل کو ایک بڑے ذبیحہ کے بدلے۔ یہاں بڑے ذبیحہ سے مراد صحرا کے غیر متمدن اور بے آب وگیاہ ماحول میں آباد ہونا تھا، جو کہ جسمانی ذبیحہ سے بلاشبہہ بہت زیادہ سخت تھا۔ اِس آیت میں ذبحِ عظیم (عظیم قربانی) کا لفظ اسماعیل کے لیے آیا ہے، نہ کہ دنبہ کے لیے۔ دنبہ کو حضرت ابراہیم نے بطور فدیہ ذبح کیا اور اسماعیل کو ایک عظیم تر قربانی کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ یہ عظیم تر قربانی کیا تھی، وہ یہ تھی کہ

اس کے بعد اسماعیل کو اپنی ماں ہاجرہ کے ساتھ مکہ کے صحرا میں آباد کر دیا گیا، تا کہ اُن کے ذریعے سے ایک نئی نسل تیار ہو۔ اُس وقت یہ علاقہ صرف ایک بے آب وگیاہ صحرا کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہاں اسباب حیات میں سے کوئی چیز موجود نہ تھی، اِس لیے اس معاملے کو قرآن میں ذبحِ عظیم کا درجہ دیا گیا۔

احسن القصص

قرآن کی سورہ یوسف میں پیغمبر یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اِس واقعے کو قرآن کا احسن القصص (12: 3) بتایا گیا ہے۔ احسن القصص کا لفظی مطلب ہے — بہترین قصہ (best story) مگر قرآن میں یہ بات قصہ برائے قصہ کے طور پر نہیں آئی ہے، بلکہ وہ ایک اہم سبق (lesson) کے طور پر آئی ہے۔ ہر پیغمبر کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ حق کا داعی ہوتا ہے۔ اِسی کے ساتھ وہ دعوت کا عملی نمونہ ہوتا ہے۔ مختلف پیغمبر مختلف حالات میں آئے۔ اِس لحاظ سے یہ ہوا کہ مختلف پیغمبروں کے ذریعے مختلف قسم کی عملی مثالیں قائم ہوئیں۔ اُنھیں میں سے ایک مثال یا ماڈل وہ ہے جو حضرت یوسف کے ذریعے قائم ہوا۔

حضرت یوسف کنعان (فلسطین) کے علاقے میں ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو مصر جیسے متمدن ملک کے دار السلطنت میں پہنچا دیا، جہاں ایک بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ ایسا غالباً اِس لیے ہوا کہ حضرت یوسف کے ذریعے دعوت کی جو مثال قائم کرنا مطلوب تھا، وہ مصر جیسے ملک ہی میں ممکن تھی۔ حضرت یوسف کے اِس واقعے کی تفصیل قرآن میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ اُس وقت کے مصری بادشاہ نے حضرت یوسف کی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر انھیں ایک اعلیٰ عہدے کی پیش کش کی۔ اِس پیش کش کو حضرت یوسف نے قبول کرلیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، یہ بادشاہ اپنے مذہبی عقیدے کے اعتبار سے مشرک تھا۔ مزید یہ کہ سیاسی تخت بھی بدستور اُس کے قبضے میں تھا۔ اِس کے باوجود حضرت یوسف نے بادشاہ کے تحت ملنے والے اِس عہدے کو قبول کرلیا۔

قرآن کے مطابق، اِس کا سبب یہ تھا کہ خزائن ارض پوری طرح حضرت یوسف کو حاصل ہورہے تھے۔ قدیم زمانے کے لحاظ سے، خزائن ارض کا مطلب تھا — سرزمین مصر کا زراعتی انتظام۔

اِس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک مطلوب پیغمبرانہ ماڈل ہے کہ داعی اگر ایسے ملک میں ہو، جہاں سیاسی اقتدار (political power) کسی اور کے ہاتھ میں ہو، لیکن یہ امکان ہو کہ اگر داعیٔ حق دوسرے کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کرلے تو اس کو کام کے مواقع بلا روک ٹوک حاصل ہوجائیں گے، تو اُس وقت حکمت کا تقاضا یہ ہوگا کہ ایسی پیش کش کو کھلے دل سے قبول کرلیا جائے۔

حضرت یوسف کے ساتھ یہ معاملہ اُس دور میں پیش آیا، جب کہ دنیا میں ہر جگہ زراعت کا دور (agricultural age) پایا جاتا تھا۔ کام کے مواقع تمام تر زراعت کے ساتھ وابستہ تھے۔ اُس وقت خزائنِ ارض کا مطلب تھا— خزائنِ زراعت۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب ہم جمہوریت کے دور میں ہیں۔ اب سیاست کا ڈی سنٹرلائزیشن (de-centralization) ہوچکا ہے۔ اب انتظام (administration) کے سوا تمام شعبے ہر ایک کے لیے آزادانہ طور پر کھلے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں حضرت یوسف کا ماڈل موجودہ حالات میں مکمل طور پر قابلِ انطباق (applicable) ہے۔ آج اگر داعیٔ حق، سیاسی حکمرانوں سے ٹکراؤ نہ کرے تو کسی باضابطہ اعلان یا معاہدہ کے بغیر ہی تمام خزائن ارض، بہ الفاظ دیگر، تمام مواقع کار آزادانہ طور پر داعی کے زیر تصرف آجائیں گے۔ حضرت یوسف کے اِس ماڈل کو دوسرے الفاظ میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ حق کے داعی کو چاہئے کہ وہ سیاسی اقتدار کے معاملے میں غیر نزاعی طریقِ کار (non-confrontational approach) اختیار کرے۔ اِس حکمت کا یہ نتیجہ ہوگا کہ خزائنِ ارض پوری طرح اس کے استعمال میں آجائیں گے اور وہ پُرامن رہنے کی شرط پر دعوت کا کام اعلیٰ ترین معیار پر انجام دے سکے گا۔

حضرت یوسف کے واقعے کو قرآن میں احسن القصص کہا گیا ہے۔ یہ محض ایک قصے کی بات نہیں ہے، بلکہ وہ ایک بہترین ماڈل ہے جس کو ایک پیغمبر کے ذریعے قائم کیا گیا ہے۔ حضرت یوسف کا قصہ قرآن کے علاوہ، بائبل میں بھی تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ بائبل میں بتایا گیا ہے کہ بادشاہِ مصر نے جب حضرت یوسف کو مصر کے خزائن پر مقرر کیا تو اس نے کہا:

Only in regard to the throne, I will be greater than you.
(Genesis 37: 50)

حضرت یوسف کی مثال کی روشنی میں اگر یہ متعین کیا جائے کہ اس کے مطابق، کام کا بہترین ماڈل کیا ہے، تو وہ ماڈل یہ ہوگا کہ بادشاہِ وقت سے سیاسی ٹکراؤ نہ کرو۔ اِس کا فائدہ یہ ہوگا کہ آپ کے لیے یہ ممکن ہوجائے گا کہ آپ غیر سیاسی دائرے میں موجود تمام مواقع کو آزادانہ طور پر حق کے مشن کے لیے استعمال کرسکیں گے۔ اِس ماڈل کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے — سیاسی اقتدار کے معاملے میں موجودہ صورت حال کو تسلیم کرنا، اور سیاسی اقتدار کے باہر کے دائرے میں اپنے عمل کی تنظیم کرنا:

Political statusquoism, non-political activism.

مقامِ محمود

قرآن کی سورہ الاسرا میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا ہے: عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (17: 79) یعنی امید ہے کہ تمھارا رب تم کو مقامِ محمود پر کھڑا کرے۔ قرآن کی اِس آیت میں جس مقامِ محمود کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے۔ اِس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو آخرت سے پہلے موجودہ دنیا میں پیش آنا ہے۔ مقامِ محمود کے اِس دوسرے پہلو کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو استثنائی طور پر خود انسانی تاریخ کے مطابق، ایک مسلّم نبوت (acknowledged prophethood) کا درجہ حاصل ہوجائے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو پیغمبر دنیا میں آئے، ہمارے عقیدے کے اعتبار سے، وہ بلاشبہہ خدا کے پیغمبر تھے۔ مگر قدیم زمانے میں موافق اسباب نہ ہونے کی وجہ سے پچھلے پیغمبر قدیم تاریخی ریکارڈ میں درج نہ ہوسکے۔ پیغمبر اسلام کے زمانے میں پہلی بار وہ اسباب پیدا ہوئے جب کہ آپ کو آزاد تاریخی ریکارڈ میں ایک معلوم اور مسلّم شخصیت کے اعتبار سے درج کیا گیا۔ اِس تاریخی حقیقت کو ایک مستشرق نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے — محمد تاریخ کی کامل روشنی میں پیدا ہوئے:

Muhammad was born within the full light of history.

محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب 570 میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ بنو اسماعیل کے ایک فرد تھے۔ پچھلے تقریباً ڈھائی ہزار سال کے دوران عرب کے ماحول میں بنو اسماعیل کے نام سے ایک پوری نسل

تیار ہو چکی تھی۔ جس کے افراد کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنیاد پر ایک مستشرق نے اس کو ہیروؤں کی نسل (a nation of heroes) کہا تھا۔ یہی وہ گروہ ہے جس میں دعوت و تربیت کا کام کر کے وہ جماعت تیار ہوئی جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔ رسول اور اصحاب رسول نے غیر معمولی جدوجہد کے ذریعے یہ کیا کہ انھوں نے ایک نیا دور پیدا کر دیا۔ اُن سے پہلے توحید کا عقیدہ صرف ایک نظریے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اصحاب رسول کی غیر معمولی کوششوں سے وہ انقلاب کے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ شرک کا دور ختم ہو گیا اور توحید کا دور پوری طاقت کے ساتھ شروع ہو گیا۔

اِسی انقلاب کا نتیجہ تھا کہ تاریخ میں ایک نیا پراسس (process) شروع ہو گیا۔ اِس پراسس کا آغاز ساتویں صدی کے نصف اول میں عرب سے ہوا، اس کا اختتام (culmination) ایک ہزار سال کے بعد یورپ میں ہوا۔ اس انقلاب کے بہت سے پہلو تھے۔ مثلاً اِس انقلاب نے اسلام کے عقیدے کو سائنسی حقیقت (scientific reality) کے درجے تک پہنچا دیا۔ اس نے مذہبی آزادی کا دروازہ کھولا۔ اس کے بعد دعوت و تبلیغ کے راستے کی تمام رکاوٹیں ختم ہو گئیں۔ اس کے نتیجے میں جدید کمیونکیشن وجود میں آیا، جس کے بعد یہ ممکن ہو گیا کہ اسلام کے پیغام کو عالمی سطح پر پہنچایا جا سکے۔ آفاق وانفس میں سائنس کی دریافتوں سے یہ ممکن ہو گیا کہ اعلیٰ ترین علمی معیار پر حق کی تبیین کی جا سکے (4: 53)۔

آیتِ اسرا

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور، یعنی ہجرت (622ء) سے ایک سال پہلے ایک واقعہ پیش آیا، جس کو قرآن میں اسرا کہا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کے الفاظ یہ ہیں: سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (17: 1)۔ اِس آیت میں اسرا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسرا کا لفظی مطلب ہے — رات کا سفر (night journey)۔ اللہ تعالیٰ کے خصوصی انتظام کے تحت، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ رات کے ایک لمحے میں آپ نے مکہ سے یروشلم کا سفر کیا، اور پھر آپ اسی رات کو یروشلم (فلسطین) سے مکہ واپس آئے۔ اِس سفر کی مجموعی مسافت تقریباً 25 سو کلو میٹر تھی۔

اِس سفر کا مقصد قرآن میں اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: لنریه من اٰیاتنا یعنی اللہ تعالیٰ کی نشانیاں پیغمبر کو دکھانا۔ یہ نشانیاں (آیات اللہ) کیا تھیں، وہ یروشلم کی عمارتیں یا وہاں کے درخت اور چشمے نہ تھے۔ وہ نشانی دراصل فطرت میں چھپا ہوا وہ امکان تھا جس کو تیز رفتار سفر اور تیز رفتار پیغام رسانی کہا جاتا ہے، یعنی آنے والا دورِ مواصلات (age of communication)۔ اِس تجربے کے ذریعے پیغمبر اسلام کو بتایا گیا کہ انسان کو وہ ذرائع حاصل ہوجائیں گے جن کی مدد سے عالمی سطح پر خدا کے آخری دین کی اشاعت ممکن ہوجائے، یعنی وہی واقعہ جس کو حدیث میں 'ادخال الکلمة في کل البیوت' (ہر گھر میں کلمۂ اسلام کا داخلہ) کہا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اسرا کے واقعے کی صورت میں جو تجربہ کرایا گیا، وہ مستقبل کے بارے میں ایک بشارت تھی۔ اِس بشارت کا ذکر احادیث میں مختلف الفاظ میں آیا ہے۔ مثلاً ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام نے فرمایا: و لیتمنّ اللّٰہُ ہٰذا الأمر حتی یسیر الراکب من صنعاء إلی حضرموت، ما یخاف إلا اللّٰہ (صحیح البخاري، رقم الحدیث: 3852) یعنی اللہ ضرور اِس امر (دین) کو تکمیل تک پہنچائے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعا سے حضرت موت تک جائے گا اور اس کو اللہ کے سوا کسی اور کا خوف نہ ہوگا۔ اِس سلسلے میں ایک اور روایت ان الفاظ میں آئی ہے: لیبلغن ھٰذا الأمرُ ما بلغ اللیلُ و النہار (مسند احمد، رقم الحدیث: 17082) یعنی خدا کی قسم، یہ امر (دین) ضرور وہاں تک پہنچے گا، جہاں تک رات اور دن پہنچتے ہیں۔ اِسی طرح ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں: لا یبقی علیٰ ظہر الأرض بیت مدر ولا وبر إلا أدخله الله کلمةَ الإسلام (مسند احمد، رقم الحدیث: 24215) یعنی زمین کی پشت پر کوئی چھوٹا یا بڑا گھر نہیں بچے گا، جہاں اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمہ کو داخل نہ کردے۔

قرآن کی سورہ الاسرا میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو تیز رفتار کمیونکیشن کا تجربہ کرایا گیا تھا۔ مذکورہ احادیث میں پیشین گوئی کے انداز میں بتایا گیا ہے کہ یہ امکان ضرور مستقبل میں واقعہ بنے گا اور خدا کا دین جو عرب میں شروع ہوا، وہ گلوبل کمیونکیشن کے ذریعے سارے عالم میں پہنچ جائے گا، یہاں تک کہ کوئی بھی انسان اُس سے بے خبر نہ رہے۔

اظہارِ دین

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد 'اظہارِ دین' تھا۔ اظہارِ دین کی آیت قرآن میں تین بار آئی ہے (9 :61 ;28 :48 ;33 :9)۔ اِس سلسلے میں قرآن کی سورہ التوبہ کے الفاظ یہ ہیں: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9:33) یعنی اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ، تاکہ وہ اس کو سارے دین پر غالب کردے۔ اِس آیت کی تفسیر کے تحت مفسر القرطبی نے لکھا ہے کہ — اظہارِ دین کا مطلب ہے حجت اور دلائل کے ذریعے دین کو غالب کرنا (أي بالحجة والبراہین، 8/121)۔

اظہارِ دین کے جس واقعے کا قرآن میں ذکر ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خود زمانۂ رسول میں وہ پوری طرح واقع ہوجائے گا۔ اِس آیت میں ایک تاریخی تبدیلی کا ذکر ہے، اور تاریخ میں کوئی بڑی تبدیلی اچانک یا محدود مدت میں نہیں آتی، ایسی تبدیلی ہمیشہ لمبی مدت کے پراسس (process) کے بعد آتی ہے۔ قرآن کی اِس آیت میں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اور اصحابِ رسول کی جدوجہد سے ساتویں صدی کے نصف اول میں ایک انقلابی عمل شروع ہوا۔ یہ عمل مختلف حالتوں سے گزرتا ہوا تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا اور پھر اس کے نقطۂ انتہا (culmination) کے طور پر وہ واقعہ اپنی کامل صورت میں پیش آیا جس کو قرآن میں '**لیظھرہ علی الدین کلّہ**' کے الفاظ میں بیان کیا گیا تھا۔

حجت یا برہان کیا ہے۔ یہ ایک دوطرفہ عمل ہے، یعنی ایک طرف حجت کو پیش کرنے والا ہوتا ہے اور دوسری طرف حجت کو سننے والا۔ اِس لیے حجت کو مخاطب کے ذہنی تقاضے کے مطابق ہونا چاہئے۔ علمی استدلال دراصل اِس بات کا نام ہے کہ مخاطب کے علمی مسلّمہ پر اپنی بات کو ثابت کیا جائے۔ ساتویں صدی کے نصف اول میں جب کہ قرآن اترا، اُس وقت دنیا روایتی دور سے گزر رہی تھی۔ اُس وقت صرف روایتی استدلال ہی ممکن تھا۔ مگر قرآن ایک ابدی کتاب کی حیثیت سے اتارا گیا ہے، اس لیے قرآن کے مذکورہ الفاظ میں یہ بات شامل ہے کہ نہ صرف روایتی دور میں، بلکہ بعد کو ظہور میں آنے والے

سائنسی معیار کے مطابق بھی قرآن مسلّمہ طور پر اپنی ایک ثابت شدہ کلام کی حیثیت کو برقرار رکھے گا۔

اِس مصلحت کا تقاضا تھا کہ انسانی علم کا ارتقا ایسے نہج پر ہو جو قرآن کی صداقت کو بعد کے دور میں بھی یکساں طور پر برقرار رکھے۔ یہی وہ مطلوب ہے جو بعد کے سائنسی دور میں حاصل ہوا۔ سائنس کی دریافتوں نے صرف یہ کیا کہ قرآن کے نظریات کو دوبارہ سائنس کے معیار پر ایک مسلّمہ معیار کی حیثیت دے دی۔ مستقبل میں پیش آنے والا یہی موافقِ قرآن واقعہ ہے جس کی پیشگی خبر ان الفاظ میں دی گئی تھی:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41: 53)۔

قرآن کی اِس آیت میں آفاق وانفس کی جن نشانیوں کا ذکر ہے، اُس سے مراد وہی چیز ہے جس کو جدید سائنس کی دریافتیں (scientific discoveries) کہا جاتا ہے۔ یہ دریافت دراصل فطرت میں قائم شدہ خدائی قانون کی دریافتیں ہیں۔ چوں کہ قرآن کو نازل کرنے والا جو خدا ہے، اُسی نے فطرت کے اِن قوانین کو بھی قائم کیا ہے، اِس لیے دونوں کے درمیان کامل مطابقت پائی جاتی ہے۔ اِس مطابقت نے حاملینِ قرآن کو موجودہ زمانے میں ایک یہ موقع دیا ہے کہ وہ قرآن کی صداقتوں کو سائنس کے مسلّمات کی روشنی میں ثابت شدہ بنا سکیں۔

قرآن میں اظہارِ دین کے جس واقعے کا ذکر ہے، اُس سے مراد یہ نہیں ہے کہ خود زمانۂ نزول میں یہ واقعہ عملاً پیش آجائے گا، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اور اصحاب رسول کے ذریعے جو انقلاب آئے گا، وہ انسانی تاریخ میں ایک نئے پراسس کو شروع کرے گا۔ یہ پراسس عرب میں شروع ہوا اور بتدریج ارتقا کرتا رہا، یہاں تک کہ بیسویں صدی عیسوی میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اِس تکمیل کے ذریعے نہ صرف واقعاتِ فطرت ظہور میں آئے جنھوں نے اسلامی عقائد کے اثبات کے لیے سائنسی بنیاد فراہم کی، بلکہ اِس کے ذریعے دوسرے وہ اجتماعی واقعات ظہور میں آئے جو اسلامی دعوت کے عین موافق تھے۔ مثلاً آزادی، جمہوریت اور مذہب کے اعتبار سے کھلا پن (openness)، وغیرہ۔

قرآن کی اِس آیت میں اظہار سے مراد سیاسی غلبہ نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد فکری غلبہ اور ایسے حالات کا پیدا ہونا ہے جس کے بعد قرآن کے مشن کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، ہر قسم کے مواقع

اس کے لیے قابلِ استعمال ہوجائیں — اکیسویں صدی عیسوی میں، قرآن کی یہ پیشین گوئی عملاً پوری طرح وقوع میں آچکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکیسویں صدی عیسوی اظہارِ دین کی صدی ہے۔ اسلامی انقلاب کے ذریعے جو تاریخی عمل ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا، وہ اکیسویں صدی میں اپنے آخری نقطۂ انتہا (culmination) تک پہنچ گیا ہے۔ اب اہلِ اسلام کا واحد فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام دوسری چیزوں کو ثانوی (secondary) بنائیں۔ وہ دعوت الی اللہ، بہ الفاظ دیگر دورِ جدید کی نسبت سے قرآنی تعلیمات کی اشاعتِ عام کریں، یہاں تک کہ ہر عورت اور ہر مرد اس سے باخبر ہوجائے۔

لوحِ محفوظ

قرآن کی سورہ البروج میں یہ آیت آئی ہے: بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ○ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (85:21-22) یعنی وہ ایک باعظمت قرآن ہے، لوح محفوظ میں۔ اِس آیت میں لوحِ محفوظ (well-guarded tablet) کا مطلب کیا ہے۔ اِس سلسلے میں کوئی مستند حدیث موجود نہیں۔ تاہم عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ملاءِ اعلیٰ میں ایک محفوظ لوح ہے اور اس لوح پر قرآن کا متن لکھا ہوا ہے۔ یہ بات اصولاً درست ہے، لیکن لوح سے مراد معروف لوح نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد ربانی لوح ہے۔

اصل یہ ہے کہ پورا عالمِ موجودات مکمل طور پر اللہ کے امر کے تحت ہے۔ شمس وقمر اور دوسرے ستاروں اور سیاروں کے بارے میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اُن کا ایک مقرر کورس ہے، اور وہ ادنیٰ انحراف کے بغیر اِس مقرر کورس پر چلتے ہیں (36: 38)۔ اِسی معاملے کو علمی طور پر اِس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ عالمِ مادی، فطرت کے قانون کی پابند ہے، اور عالمِ حیوانات اپنی جبلت (instinct) کی پابند۔

انسان کا معاملہ بظاہر مختلف ہے، کیوں کہ انسان کو اپنے قول وعمل کی آزادی دی گئی ہے۔ مگر اِس آزادی کے باوجود انسانی تاریخ پر اللہ نے اپنا کنٹرول قائم کر رکھا ہے۔ تاریخ پر اِسی کنٹرول کی ایک صورت وہ ہے جس کو قرآن کے حوالے سے اِس طرح بتایا گیا ہے کہ قرآن ایک لوح محفوظ میں ہے۔ لوحِ محفوظ کا معاملہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں ہے، مطالعہ کے ذریعے اس کو سمجھا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن سے پہلے اپنے نبیوں کے ذریعے بہت سی کتابیں بھیجیں جو انسان کے لیے

معتبر ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ مگر پچھلی کتابیں محفوظ نہ رہ سکیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب اللہ کا فیصلہ یہ ہوا کہ اب آخری پیغمبر بھیج دیا جائے تو اِس فیصلے کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ آخری پیغمبر کے ذریعے آئی ہوئی کتاب (قرآن) کی مستقل حفاظت کا انتظام کر دیا جائے — لوح محفوظ کے الفاظ میں قرآن کے اِسی مخصوص حفاظتی انتظام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اِس کی تدبیر یہ کی گئی کہ اولاً قرآن کا معیاری متن (standard version) علمِ الٰہی یا بہ الفاظِ دیگر، ملاءِ اعلیٰ میں محفوظ کر دیا گیا اور پھر تاریخ کے لیے مقدر کر دیا گیا کہ وہ اِس معاملے میں اِسی رخ پر سفر کرے۔ چناں چہ عملاً یہی ہوا۔ اولاً یہ ہوا کہ ساتویں صدی کے نصف اول میں قرآن کو حافظے سے کتابت کی صورت میں محفوظ کیا گیا۔ ہزاروں لوگوں نے نسل در نسل یہ کیا کہ قرآن کو نہ صرف یاد کر کے اپنے حافظے میں ریکارڈ کر لیا، بلکہ اِسی کے ساتھ وہ قرآن کے کتابت شدہ نسخے برابر تیار کرتے رہے۔ اِس طرح وہ ایک نسل سے دوسری نسل تک مکتوب قرآن کو پہنچاتے رہے۔ یہی وہ معاملہ ہے جس کی طرف قرآن میں اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: علّم بالقلم۔ تعلیم بالقلم کا یہ عمل اِس طرح مسلسل تقریباً ہزار سال تک جاری رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ انسانوں کو یہ توفیق دی کہ وہ طباعت کے آلات ایجاد کریں۔ اِس فن کے ارتقا میں بہت سے انسانوں نے کام کیا۔ آخر کار جرمن گولڈ سمتھ جوہانس گوٹن برگ (وفات: 1468) اِس میں کامیاب ہو گیا کہ وہ ایک قابلِ عمل طباعتی آلہ دریافت کرے۔ اِس دریافت کے بعد تاریخ میں ایک پرنٹنگ انقلاب (printing revolution) آیا جو تیزی سے ترقی کرتے ہوئے موجودہ اعلیٰ طباعتی مشین (printing press) تک پہنچا۔

لوح محفوظ کے الفاظ میں اِسی تاریخ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن کا نزول 610 عیسوی میں شروع ہوا۔ اس کی تکمیل تقریباً 23 سال میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق سے استثنائی طور پر یہ واقعہ پیش آیا کہ خدا کے نزدیک، قرآن کا جو معیاری متن (standard version) تھا، وہ ادنیٰ تغیر کے بغیر پہلے انسانی حافظے میں ریکارڈ ہوا، پھر ادنیٰ تغیر کے بغیر کتابت کے ذریعے اس کی جلدیں بنائی گئیں، پھر تاریخ میں ایک پراسس جاری ہوا جس کے نتیجے میں پرنٹنگ پریس کا دور آ گیا۔

پرنٹنگ پریس کے زمانے میں یہ ممکن ہو گیا کہ قرآن کا ایک نسخہ نہایت درست طور پر تیار کیا جائے اور پھر اس کی بلین اور بلین کاپیاں تیار کر لی جائیں۔ آج ہر گھر میں اور ہر مسجد میں اور ہر مدرسہ اور ہر لائبریری میں قرآن کے نہایت صحیح مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔ اِس طرح خدا کی تقدیر اِس بات کی ضامن بن گئی کہ قرآن کسی بھی قسم کے تغیر اور تبدل کے بغیر ہر انسان کے لیے قابلِ دستیاب ہو جائے۔

ادخالِ کلمہ

سیکولر مبصرین عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا سفر اس کے پیغمبر کے جلد ہی بعد ٹوٹ گیا، بعد کی تاریخ میں اسلام کا تسلسل باقی نہ رہا۔ مگر یہ رائے صرف سرسری مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اسلام خدا کا دین ہے۔ اسلام کی تاریخ خدائی منصوبے کے تحت مسلسل سفر کر رہی ہے۔ غلط فہمی صرف اس لیے ہوتی ہے کہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ تاریخ کا ہر سفر ناموافق حالات میں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا سفر انسانی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے جاری ہے، نہ کہ انسانی آزادی کو منسوخ کر کے۔ انسانی تاریخ میں اسلام کے سفر کے تین مرحلے ہیں:

Land expansion — consolidation — overseas expansion

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں اپنے مشن کا آغاز 610 عیسوی میں کیا۔ اِس کے بعد دینِ توحید کی ایک نئی تاریخ بنی۔ اِس تاریخ کا خلاصہ یہ تھا کہ — انسانی آزادی کو منسوخ کئے بغیر دینِ توحید کی تاریخ بنانا اور اس کو اس کی آخری تکمیل تک پہنچانا۔ اس تاریخ پر اب تقریباً ڈیڑھ ہزار سال گزر چکے ہیں۔ یہ تاریخ مسلسل طور پر اپنی منزل کی طرف سفر کر رہی ہے۔ اِس مدت کے دوران بظاہر جو اتار چڑھاؤ کے واقعات نظر آتے ہیں، وہ انسانی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے تاریخ کو مینیج کرنے کی مثالیں ہیں۔

قرآن کی سورہ الانعام میں بتایا گیا ہے کہ — یہ قرآن اِس لیے اتارا گیا ہے کہ تم اے پیغمبر، آگاہ کر دو اہلِ مکہ کو اور مکہ کے اطراف کے لوگوں کو (6: 92)۔ قرآن کی اِس آیت میں، مکہ اور اطرافِ مکہ سے مراد برّی حصہٴ ارض ہے، جہاں تک اُس زمانے کے درمیان حق کا پہنچنا بہ آسانی ممکن تھا۔

زمین کے نقشہ پر نظر ڈالیں تو عرب کے ایک طرف بحرِ متوسط (Mediterranean Sea) ہوگا، جس کے دوسری طرف یورپ کا براعظم واقع ہے۔ اِسی طرح اگر آپ عرب سے افریقہ کی طرف چلیں تو

اس کی آخری سرحد پر اٹلانٹک سمندر (Atlantic Ocean) ہوگا، جس کے دوسری طرف امریکا کا براعظم واقع ہے۔ اسی طرح اگر آپ عرب سے بحرِ ہند (Indian Ocean) کی طرف چلیں تو اس کے دوسری طرف آسٹریلیا کا براعظم دکھائی دے گا۔

عقبہ بن نافع (وفات: 683ء) ایک تابعی تھے۔ وہ عرب سے ایک دستہ لے کر نکلے اور افریقہ میں اسلام کی اشاعت کرتے ہوئے اس کے مغربی ساحل تک پہنچ گئے۔ یہاں تاحدِ نظر اٹلانٹک سمندر (Atlantic Ocean) پھیلا ہوا تھا۔ وہ اُس وقت گھوڑے پر سوار تھے۔ انھوں نے اپنا گھوڑا سمندر کے کنارے کھڑا کیا اور کہا: اللهم إني لو أعلم وراء هٰذا البحر بلداً لخضته إليه، حتى لا يُعبد أحد دونك (خدایا، اگر میں جانتا کہ اِس سمندر کے اُس پار بھی کوئی ملک ہے تو میں سمندر میں گھس کر وہاں جاتا، یہاں تک کہ تیرے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے)۔

عقبہ بن نافع کا یہ واقعہ علامتی طور پر یہ بتاتا ہے کہ دورِ اول میں اسلام کی دعوتی توسیع زمین کے برّی حصے میں برابر ہوتی رہی، لیکن وہ سمندر پار کے ملکوں تک نہ پہنچ سکی، کیوں کہ سمندری سفر کے لیے اُس زمانے میں قابلِ اعتماد اسباب موجود نہ تھے۔ اِس کے بعد تاریخ میں ایک نیا عمل شروع ہوا۔ اِس کا ایک پہلو استحکام (consolidation) تھا۔ استحکام کے بغیر دعوتی توسیع عملاً غیر موثر ہوجاتی، حتی کہ قرآن کی حفاظت بھی ممکن نہ ہوتی۔ اِس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے عالمی حالات پیدا کئے کہ ایشیا اور افریقہ میں مسلمانوں کا سیاسی ایمپائر قائم ہوگیا۔ یہ مسلم ایمپائر اِس بات کا ضامن تھا کہ خدا کا آخری دین پوری طرح محفوظ ہوجائے اور اس کی اشاعت مسلسل جاری رہے۔

مذکورہ استحکام کے دور میں اس کے زیر اثر ایک اور تاریخی پراسس (historical process) شروع ہوا۔ اِس کا مقصد تھا فطرت (nature) میں چھپے ہوئے امکانات کو وقوع میں لانا۔ یہ عمل تدریج کے ساتھ تاریخ میں جاری رہا۔ اِس عمل کا آغاز ابتداءً مسلمانوں نے کیا۔ اس کے بعد یورپ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار وہ چیز وجود میں آگئی جس کو کمیونکیشن کا دور کہا جاتا ہے۔ اِس مواصلاتی انقلاب کے بعد یہ ممکن ہوگیا کہ اسلام کی توسیع زمین کے برّی حصے تک محدود نہ رہے، بلکہ وہ

سمندر پار کے ملکوں تک بہ آسانی پہنچ جائے۔

اسلامی دعوت کی عالمی توسیع اول دن سے اسلام کا نشانہ تھی (25: 1)۔ مگر اسلام کی یہ عالمی توسیع، اسباب کی اِس دنیا میں ضروری وسائل کے بغیر ممکن نہ تھی۔ جدید مواصلاتی انقلاب نے اِس کو پوری طرح ممکن بنادیا۔ مستقبل میں پیش آنے والا یہی واقعہ تھا جس کی خبر پیشگی طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن الفاظ میں دے دی تھی: لا یبقی علی ظهر الأرض بیت مدر ولا وبر إلا أدخله اللّٰه کلمة الإسلام (مسند احمد، رقم الحدیث: 24215) یعنی زمین کی پشت پر کوئی گھر یا خیمہ ایسا نہیں بچے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہوجائے۔

اسلام ایک دعوتی مشن ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام انسان جو اِس زمین پر پیدا ہوئے، اُن کو موت سے پہلے یہ بتادیا جائے کہ خدا کا تخلیقی منصوبہ (creation plan of God) ان کے بارے میں کیا ہے۔ انسان کی پوری تاریخ میں اس کو مسلسل طور پر جاری رہنا ہے۔ آغاز کے پہلے مرحلے میں اس کی توسیع زمین کے بری حصہ (ایشیا اور افریقہ) میں ہوتی رہی۔ اس کے بعد استحکام کے ساتھ ایسے مادی اسباب پیدا ہوئے جس کے تحت مواصلاتی ذرائع میں ایسا انقلاب آیا جس کے تحت یہ ممکن ہوگیا کہ اسلامی دعوت کی عالمی اشاعت کا کام کیا جاسکے۔ موجودہ زمانے میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا اور دوسرے ذرائع کی بنا پر اسلامی دعوت کے اِس عالمی نشانے کو پورا کرنا آخری حد تک ممکن ہوگیا ہے۔ اسی کے ساتھ موجودہ زمانے میں مذہبی آزادی (religious freedom) بھی مکمل طور پر حاصل ہوچکی ہے۔ اب امتِ محمدی سے وابستہ افراد کی یہ لازمی ذمے داری ہے کہ وہ اسلام کے دعوتی مشن کو اس کی آخری تکمیل تک پہنچائیں، یہاں تک کہ کرۂ ارض پر بسنے والا کوئی مرد یا عورت خدا کے اِس پیغام سے بے خبر نہ رہے۔

انسانی تاریخ کی تعبیر

(Interpretation of Human History)

تاریخ کیا ہے، تاریخ گزرے ہوئے ماضی کی سرگزشت کا دوسرا نام ہے۔ تاریخ کے موضوع پر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں، وہ عام طور پر گزرے ہوئے واقعات کا ریکارڈ ہوتی ہیں۔ لیکن تاریخ کا ایک ضمنی موضوع وہ ہے جس کو فلسفہ تاریخ (philosophy of history) یا تعبیر تاریخ (interpretation of history) کہا جاتا ہے۔ اِس موضوع کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ انسانی کے واقعات کی ایک ایسی توجیہہ تلاش کی جائے جس میں مختلف واقعات کے درمیان ایک قابلِ فہم ربط دریافت کیا جاسکے۔ تاریخ کے پہلے موضوع (تاریخ نگاری) پر بڑی تعداد میں کتابیں موجود ہیں، لیکن جہاں تک تعبیر تاریخ کے موضوع کا تعلق ہے، اس موضوع پر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں جس کو تاریخ کی قابلِ فہم توجیہہ قرار دیا جاسکے۔

اِس کا سبب ڈاکٹر الکسس کیرل نے اپنی کتاب ''انسان نامعلوم'' (*Man the Unknown*) میں درست طور پر یہ بتایا ہے کہ تعبیر تاریخ کا موضوع براہِ راست طور پر انسان کی آزادی سے تعلق رکھتا ہے۔ انسان قابلِ پیشین گوئی نہیں، اس لیے اس کے عمل کی کوئی جامع توجیہہ بھی ممکن نہیں۔ ہر انسان آزاد ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے، اِس لیے انسانی تاریخ کی مجموعی تعبیر سخت مشکل کام ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کی تاریخ دو متضاد تقاضوں کے درمیان سفر کرتی ہے۔ اِن دونوں تقاضوں کو آزادی اور جبر (freedom and determinism) کہا جاسکتا ہے۔ میرے علم کے مطابق، کوئی مورخ اِن دو متضاد تقاضوں کے درمیان ربط قائم کرنے کا کوئی اصول دریافت نہ کرسکا، اِس لیے وہ انسانی تاریخ کی کوئی کامیاب تعبیر بھی پیش نہ کرسکا۔

راقم الحروف نے اِس موضوع پر کافی غور وفکر کیا اور تعبیر تاریخ کا اصول دریافت کرنے کی کوشش کی۔ آخر کار مجھے قرآن کی ایک آیت میں یہ اصول دریافت ہوا۔ وہ آیت یہ ہے: وَعَلَى اللّٰهِ

قَصۡدُ السَّبِيۡلِ وَمِنۡهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰىكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ (16: 9) یعنی اللہ کے اوپر ہے (انسانیت کو) صراطِ مستقیم پر قائم رکھنا، اور کچھ راستے منحرف راستے ہیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے منصوبۂ تخلیق (creation plan) کے مطابق، انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ کو مینج (manage) کر رہا ہے۔ خدا، انسان کو آزادی بھی دئے ہوئے ہے اور اِسی کے ساتھ وہ اِس کی نگرانی بھی کر رہا ہے کہ انسانی قافلہ بھٹک کر صراطِ مستقیم سے بہت دور نہ چلا جائے۔ تاریخ کے بارے میں اِس خدائی اصول کو ایک لفظ میں اِس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ — انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ کی تنظیم کرنا:

It is to manage history while maintaining human freedom.

تاریخ اور تعبیر تاریخ

تاریخ سادہ طور پر واقعہ نگاری (narration of events) کا نام ہے۔ تعبیر تاریخ (interpretation of history) کا تعلق فلسفۂ تاریخ سے ہے، یعنی اُن قوانین کو دریافت کرنا جو تاریخ کے عمل میں کام کر رہے ہیں۔ اِس سلسلے میں مختلف نظریات پیش کئے گئے ہیں، مگر یہ تمام نظریات محض انسانی قیاس پر مبنی ہیں۔ تاریخ کی صحیح تعبیر وہ ہے جو انسان کے بارے میں خالق کے نقشۂ تخلیق (creation plan) کے مطابق ہو۔

قدیم زمانے میں بادشاہ کو تاریخ کا مرکزی کردار سمجھا جاتا تھا۔ اِس لیے تاریخ عملاً بادشاہوں کی تاریخ بن گئی۔ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد دنیا میں جمہوریت کا دور آیا۔ اب تاریخ کا مرکزی کردار فرد کے بجائے سوسائٹی کو سمجھا جانے لگا۔ اب سماجی افکار کی روشنی میں تاریخ لکھی جانے لگی۔ اِس میں ایک نمایاں نام جرمن مفکر کارل مارکس (وفات: 1883) کا ہے۔ مارکس نے تاریخ کا ایک نیا تصور پیش کیا جس کو تاریخی مادیت کہا جاتا ہے۔ یہ تصورِ تاریخ بنیادی طور پر یہ تھا کہ انسان کا شعور تاریخ کی صورت گری نہیں کرتا، بلکہ مادی حالات تاریخ کی صورت گری کرتے ہیں:

The mode of production in material life determines the general character of the social, political, and spiritual process of human life.

تاریخ کا ایک تصور وہ ہے جو نیشن (nation) پر مبنی ہے۔ کسی نیشن کی مختلف سرگرمیوں کے ریکارڈ کو اس کی تاریخ سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً انڈین نیشن کی تاریخ، جرمن نیشن کی تاریخ، وغیرہ۔

ایک اور تاریخی نظریہ وہ ہے جس کو برٹش مورخ آرنلڈ ٹائن بی (وفات: 1975) نے پیش کیا۔ اُس نے اِس موضوع پر ایک مکمل کتاب 12 جلدوں میں لکھی جس کا نام یہ ہے:

A Study of History

ٹائن بی نے تاریخ کا یہ تصور پیش کیا کہ تاریخ، تہذیب کے ارتقائی مراحل کے ساتھ سفر کرتی ہے۔ تہذیبوں کے معمار ہی تاریخ کے معمار ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک زمانے میں رومی تہذیب نے تاریخ سازی کا رول ادا کیا۔ اِس کے بعد مسلم تہذیب، تاریخ ساز تہذیب کی حیثیت سے ابھری۔ اس کے بعد برٹش تہذیب کو تاریخ سازی کا یہ مقام ملا، وغیرہ۔

دوسرا تصورِ تاریخ وہ ہے جس کو مذہبی تاریخ کہا جاتا ہے۔ مذہبی تصور تاریخ کو علمی اعتبار سے، کوئی مستند درجہ نہیں ملا، حتی کہ موجودہ زمانے میں اس کو بالکل ناقابلِ حوالہ سمجھ لیا گیا۔ انسائکلو پیڈیا برٹینکا کے مقالہ نگار (Patrick Lancaster Gardinar) نے اپنے مقالہ فلسفۂ تاریخ (Philosophy of History) کے تحت لکھا ہے کہ — مذہبی اور مابعد الطبیعی قیاسات کی روشنی میں، انسانی تقدیر کے معاملات کی تعبیر کا دور، جدید مورخین کے نزدیک، اب ختم ہو چکا ہے:

> The age of religious and metaphysical conjectures concerning the destiny of human affairs had, in their opinion, come to a close (EB. 8/962, 1974)

یہ بات بلاشبہہ بے بنیاد ہے۔ یہ بات اُسی طرح غیر علمی ہے جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کا دور ختم ہو گیا (God is dead)، یا یہ کہ پیغمبر کی وحی صرف ایک شاعرانہ تجربہ (poetic experience) تھی، یا یہ کہ مذہب کی کوئی بنیاد نہیں، وہ صرف ایک سماجی ظاہرہ (social phenomenon) ہے، وغیرہ۔

خدا کا منصوبۂ تخلیق

اللہ نے ایک معیاری دنیا بنائی۔ یہ دنیا ہر اعتبار سے ایک پرفکٹ دنیا تھی۔ اللہ نے یہ مقدر کیا کہ اس معیاری دنیا میں ایسے افراد بسائے جائیں جو ہر اعتبار سے معیاری انسان ہوں۔ اِس مقصد کے لیے اللہ نے انسان کو پیدا کر کے اس کو سیارہ ارض پر آباد کیا۔ اس نے انسان کو مکمل آزادی عطا کی۔ موجودہ دنیا اِس منصوبے کے لیے ایک سلیکشن گراؤنڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون شخص اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور کون شخص اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ تاریخ کے خاتمے پر یہ ہوگا کہ آزادی کا غلط استعمال کرنے والے افراد رد کردئے جائیں گے اور جن افراد نے اپنی آزادی کا صحیح استعمال کیا، اُن کو منتخب کر کے اُنھیں جنت میں آباد کردیا جائے گا۔ جنت کے تصور کو ملحد مفکرین انسانی تمناؤں کی خوب صورت نظریہ سازی (beautiful idealization of human wishes) کا نام دیتے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح یہ ہے کہ جنت کے تصور کو انسانی تاریخ کی خوب صورت تعبیر (beautiful interpretation of human history) کہا جائے۔

یہ ایک پیچیدہ منصوبہ ہے۔ اِس کا ایک جُز یہ ہے کہ انسان کی آزادی پوری طرح برقرار رہے۔ اِس کا دوسرا جز یہ ہے کہ اللہ اس منصوبے کی تکمیل تک اپنے علم کے مطابق، اس کی تنظیم کرتا رہے۔ اِس طرح یہ دوطرفہ تقاضے کو مینیج کرنے کا ایک معاملہ ہے۔ تاریخ کی کوئی قابلِ فہم تعبیر صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ تاریخ کو اِس دوطرفہ تقاضے کی روشنی میں دیکھا جائے۔ تعبیر تاریخ کا یہی درست اصول ہے۔ اِس اصول کو نظر انداز کرنے کے بعد تاریخ کی تعبیر کسی بھی شخص کے لیے ممکن نہیں۔

انسانی تاریخ کی تعبیر کا کام انسان کرتا ہے، مگر انسان کا خالق خود انسان نہیں، انسان کا خالق اللہ ہے۔ اِس لیے تاریخ کی تعبیر کا رہنما اصول (guiding principle) صرف یہ ہوسکتا ہے کہ مورخ سب سے پہلے خالق کے منصوبۂ تخلیق (creation plan of the Creator) کو معلوم کرے۔ یہی اِس معاملے میں ماسٹر پرنسپل (master principle) ہے۔ اِس ماسٹر پرنسپل کو ذہن

میں رکھے بغیر کوئی شخص تاریخ کی درست تعبیر نہیں کرسکتا— زیرِنظر مقالے میں اِسی اصول کی روشنی میں تاریخ کی ایک قابلِ فہم تعبیر تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مطلوب افراد کا انتخاب

خدا کے اِس تخلیقی منصوبہ کا ذکر قرآن کی سورہ البقرہ میں آیا ہے۔ اِن آیات کا ترجمہ یہ ہے:

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اُس میں فساد برپا کریں اور خون بہائیں، اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا: میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھا دئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے اِن لوگوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہم کو بتایا۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے''۔ (2: 30-32)

فرشتوں کو یہ معلوم تھا کہ تمام موجودات مکمل طور پر خدا کے تابع فرمان ہیں، مگر انسان کو آزادی دے کر زمین پر بسایا جارہا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ہوگا کہ لوگ آزادی کا غلط استعمال کریں گے اور وہ زمین میں فساد اور خوں ریزی برپا کریں گے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے ایک مظاہرہ کے ذریعے فرشتوں کو بتایا کہ اگرچہ انسانوں کی بڑی تعداد آزادی کا غلط استعمال کرکے مفسد بن جائے گی، لیکن انھیں میں سے ایسے افراد بھی نکلیں گے جو صالح افراد ہوں گے۔ آدم نے فرشتوں کے سامنے انھیں صالح افراد کا تعارف کرایا اور پھر فرشتے مطمئن ہوگئے۔

اصل یہ ہے کہ فرشتے پورے انسانی مجموعے کو دیکھ کر اپنی رائے بنا رہے تھے۔ اللہ نے ایک مظاہرہ کے ذریعے واضح کیا کہ خدائی تخلیق کا نشانہ مجموعہ نہیں ہے، بلکہ افراد ہیں۔ مجموعے کی سطح پر اگرچہ بگاڑ آئے گا، لیکن افراد کی سطح پر ہمیشہ اچھے افراد وجود میں آتے رہیں گے۔ خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، موجودہ دنیا ایک سلیکشن گراؤنڈ (selection ground) ہے، یعنی پورے مجموعے میں سے مطلوب افراد کا انتخاب کرنا۔ تخلیق کا نشانہ یہ نہیں ہے کہ انسان اِسی سیارۂ ارض پر معیاری نظام بنائے،

بلکہ تخلیق کا نشانہ یہ ہے کہ ہر دور اور ہر نسل میں سے اُن افراد کو منتخب کیا جائے جو کامل آزادی کے باوجود اپنے آپ کو بطور خود ضابطۂ خداوندی کا پابند بنالیں۔

تاریخ کے چند اوراق

خالق کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، انسانی تاریخ کے سفر کو چند بڑے ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ ادوار یا یہ تاریخی مراحل حسب ذیل ہیں:

1- پہلا دور نبیوں کے ذریعے اعلان کا دور ہے۔ یہ دور حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد تک پھیلا ہوا ہے۔ اِس دور میں بہت سے پیغمبر آئے، لیکن اُن کا مشن اعلان کے مرحلے تک محدود رہا، وہ انقلاب کے مرحلے تک نہیں پہنچا۔

2- دوسرا مرحلہ وہ ہے جو حضرت اسماعیل بن ابراہیم سے شروع ہوتا ہے۔ اِس مرحلے میں ایک ایسی امت تیار ہوئی جو خدا کی کتاب کی حامل امت بن سکے۔

3- حاملِ کتاب امت کے وجود میں آنے کے بعد جو اہم واقعہ ہوا، وہ یہ کہ قرآن خدا کی ہدایت کے مستند متن (authentic text) کی حیثیت سے محفوظ ہوگیا۔

4- اصحاب رسول کے ذریعے تاریخ میں جو نیا دور آیا، اُس کا ایک اہم جُز آزادیٔ رائے (freedom of thought) تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں اِس کا آغاز ایک پراسس (process) کی شکل میں ہوا۔ ہزاروں سال بعد مغربی تہذیب کی صورت میں وہ اپنے کمال کو پہنچا۔

5- اس تاریخی عمل میں مغربی تہذیب کا ایک سپورٹنگ رول ہے۔ مغربی تہذیب کی حیثیت اِس تاریخی سفر میں ایک سیکولر مؤید (secular supporter) کی ہے۔

6 - دورِ جدید میں سائنس کی حیثیت اِس تاریخی سفر میں ایک مؤید عنصر (supportive element) کی ہے۔ جدید سائنس نے نیچر کی انفولڈنگ کرکے اُن خدائی نشانیوں کو کھولا جن کو قرآن میں آیات (signs) کہا گیا ہے (41: 53)۔

7- جدید دور کو ایج آف کمیونکیشن کہا جاتا ہے۔ یہ ایج دراصل موافقِ دعوت ایج ہے۔ گلوبل کمیونکیشن نے پہلی بار گلوبل دعوہ کو ممکن بنادیا ہے۔

8- پچھلی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی بار دعوت الی اللہ کا ایک نیا امکان پیدا ہوا ہے۔ اس امکان کو جو لوگ استعمال کریں گے، اُن کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے (صحیح مسلم)۔ اخوانِ رسول کا لفظ فضیلت کو نہیں، بلکہ رول کو بتاتا ہے۔ اصحابِ رسول وہ لوگ تھے جنھوں نے ساتویں صدی میں اُس وقت کے امکانات کو استعمال کیا۔ اخوانِ رسول وہ لوگ ہوں گے جو اکیسویں صدی کے امکانات کو دعوت الی اللہ کے لیے استعمال کریں۔

مقصدِ تخلیق

فلاسفہ اور مفکرین کے یہاں زیر بحث سوالات میں سے ایک اہم سوال یہ ہے کہ تخلیق کی غایتِ اصلی (*raison d'être*) کیا ہے۔ سیکولر مفکرین نے اس کا جواب مختلف انداز سے دینے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ کہ تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے خالق خود اپنی تکمیل چاہتا ہے۔ قرآن میں اِس سوال کا جواب ایک آیت میں اِس طرح دیا گیا ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51:56) یعنی میں نے جن اور انس کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

صحابی مفسر عبد اللہ بن عباس نے اِس آیت کی تشریح اِس طرح کی ہے کہ اِس آیت میں 'لیعبدون' سے مراد 'لیعرفون' ہے، یعنی خدا کی عبادت کرنے سے مراد ہے خدا کی معرفت حاصل کرنا۔

خالق کی معرفت کوئی سادہ بات نہیں۔ انسان اپنے خالق کو براہِ راست نہیں دیکھ سکتا، لیکن تخلیق کا مطالعہ اور صاحبِ تخلیق کی کتاب (قرآن) کا مطالعہ کرکے آدمی یقینی طور پر خالق کی عظمتوں کو دریافت کرسکتا ہے۔ تخلیق کی اعلیٰ معنویت خالق کا اعلیٰ تعارف ہے۔ تخلیق کے مطالعے سے آدمی خالق کا جو علم حاصل کرتا ہے، اُسی کا نام معرفت ہے۔

کسی آدمی کو جب خالق کی یہ معرفت حاصل ہوتی ہے تو یہ اُس کے لیے سپر تھرل (super thrill) کا ایک تجربہ ہوتا ہے۔ یہ تجربہ آدمی کی شخصیت میں ایک عظیم انقلاب پیدا کردیتا ہے۔ اِس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی سوچ خدا رخی سوچ بن جاتی ہے، آدمی کا کلام خدا رخی کلام بن جاتا ہے، آدمی کا سلوک خدا رخی سلوک بن جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، آدمی کی

پوری زندگی خدا کے رنگ میں رنگ جاتی ہے (2: 138) ۔

یہی معرفت مزید وسعت پا کر دعوت الی اللہ بن جاتی ہے۔ دعوت الی اللہ کیا ہے۔ وہ آدمی کی معرفتِ خدا کی توسیع یا اس کا خارجی ظہور ہے۔ جو آدمی گہرائی کے ساتھ خدا کی معرفت حاصل کرے، اس کے اندر شدید طور پر یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اِس معرفت میں دوسروں کو حصے دار بنائے۔ اِسی واقعے کا دوسرا نام دعوت الی اللہ ہے۔

خدا کی معرفت ایک فرد کے اندر متحقق ہوتی ہے، نہ کہ کسی مجموعے کے اندر۔ جب ایک بڑی تعداد خدا کے عارفوں پر مشتمل ہو جائے تو اُس وقت پورے مجموعے یا اس کی بڑی تعداد معرفت کی حامل بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام اصلاً فرد پر مبنی کام ہے، نہ کہ مجموعے پر مبنی کام۔ دعوت الی اللہ کا نشانہ اصلاً کسی سسٹم یا کسی اجتماعی نظام کے وجود میں لانا نہیں ہے، بلکہ فرد فرد کو معرفتِ خداوندی کا حامل بنانا ہے۔ اِس کے بعد جو واقعات پیش آتے ہیں، وہ اصل نشانے کے بالواسطہ نتائج ہیں، نہ کہ اصل نشانہ۔

تاریخ کی بامعنی تعبیر

ایک بڑی انڈسٹری قائم کی جائے تو بظاہر اُس میں بہت سے اجزا اور بہت سی سرگرمیاں دکھائی دیں گی، لیکن انڈسٹری کا مقصودِ اصلی صرف ایک ہوگا، اور وہ ہے — کوئی خاص پروڈکٹ (product) نکالنا، یہی پروڈکٹ انڈسٹری کا حقیقی جُز ہوگا اور بقیہ تمام چیزیں انڈسٹری کے اضافی اجزا قرار پائیں گے۔ یہی وہ واحد اصول ہے جس پر انڈسٹری کی صحتِ کارکردگی کو جانچا جائے گا۔

یہی معاملہ انسانی تاریخ کا ہے۔ انسانی تاریخ کے بظاہر بہت سے اجزا ہیں۔ اس میں بظاہر بہت سی سرگرمیاں کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، لیکن تاریخ کی توجیہہ کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ تاریخ کے معاملے میں خالق کا منصوبہ کیا ہے اور خالق کے منصوبے کے مطابق، اِس عظیم کارخانۂ تاریخ سے کون سا پروڈکٹ نکالنا مقصود ہے۔ اِس کے سوا، کوئی دوسرا نقطۂ نظر تاریخ کی درست توجیہہ میں کارآمد نہیں ہوسکتا۔

قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی مختلف سرگرمیوں کے دوران خالق کو جو پروڈکٹ وجود میں لانا مقصود ہے، وہ صرف ایک ہے۔ اِس پروڈکٹ کو قرآن میں ربانی انسان (3: 79) کہا گیا ہے، یعنی ایک فرد کے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر۔ یہی ربانی افراد خدا کے منصوبۂ تخلیق کی اصل غایت (raison d'être) ہیں۔ جب تک یہ ربانی افراد بنتے رہیں گے، اُس وقت تک تاریخ کے ہنگامے جاری رہیں گے، اور جب اِس قسم کے افراد پیدا ہونا بند ہوجائیں تو اِس کے بعد وہ وقت آجائے گا، جب کہ تاریخ کے موجودہ دور کو ختم کرکے اس کے دوسرے دور کا آغاز کردیا جائے۔

خالق کے منصوبے کے مطابق، انسانی تاریخ کو عادلانہ اجتماعی نظام (just social system) کی اصطلاح میں جانچنا درست نہیں۔ خالق کا منصوبہ یہ نہیں ہے کہ موجودہ دنیا میں عادلانہ نظام قائم ہو، بلکہ خالق کا منصوبہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا کی تجربہ گاہ میں عادل افراد پیدا ہوں اور پھر اِن عادل افراد کو منتخب کرکے اُنھیں یہ موقع دیا جائے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں ابدی طور پر رہ سکیں۔ تاریخ کی بامعنی تعبیر (meaningful interpretation of history) صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ مذکورہ اصول کی روشنی میں تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ کوئی دوسرا اصول، تاریخ کی معنویت (meaning) کو واضح کرنے کے لیے کارآمد نہیں۔

افراد، نہ کہ مجموعہ

تاریخ کی صحیح تعبیر صرف وہ ہے جو خالق کے تخلیقی پلان کی روشنی میں کی جائے۔ تعبیر تاریخ کے اِس موضوع پر، قرآن کو ایک مستند ماخذ کا درجہ حاصل ہے۔ قرآن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ خدا کے منصوبۂ تخلیق کے مطابق، تاریخ کی تعبیر کیا ہونا چاہئے۔ پچھلے ادوار میں ہزاروں مورخین پیدا ہوئے، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اِن تمام مورخین کی تیار کردہ کتابیں صرف تاریخی واقعات کا دفتر (chronicles) ہیں، وہ انسانی تاریخ کی معنویت کو واضح نہیں کرتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ کتبِ تاریخ کی روشنی میں تاریخ صرف بے معنی واقعات کا ایک جنگل نظر آتی ہے۔ اِسی حقیقت کو انگریز مورخ ایڈورڈ گبن (وفات: 1794) نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے— انسانیت کی تاریخ، جرائم، حماقت اور

بدقسمتی کے رجسٹر سے کچھ ہی زیادہ ہے:

History, which is, indeed, little more than the register of crimes, follies and misfortunes of mankind.

تعبیر تاریخ کے اعتبار سے، سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تمام مورخین تاریخ کو مجموعہ کے اعتبار سے دیکھتے ہیں اور وہ مجموعہ کے اعتبار سے، اس کے حسن وقبح کا فیصلہ کرتے ہیں۔ مگر خدائی تخلیق کے مطابق، تعبیر تاریخ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مجموعۂ انسانیت کو دیکھ کر تاریخ کی تعبیر نہ کی جائے، بلکہ افرادِ انسانی کو دیکھ کر اس کی تعبیر کی جائے۔ مجموعہ کے اعتبار سے دیکھنے کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ تاریخ کا کوئی عہد عہد زریں (golden age) نظر نہیں آتا۔ لیکن اگر افراد کے اعتبار سے، تاریخ کو دیکھا جائے تو ہر عہد، زریں افراد (golden individuals) کا عہد نظر آئے گا۔

معیاری افراد کا انتخاب

اصل یہ ہے کہ خالق نے موجودہ دنیا کو اِس لیے نہیں بنایا کہ یہاں مجموعہ کی سطح پر معیاری نظام (ideal system) قائم کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہاں ہر انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے، وہ چاہے مصلح بن کر رہے یا مفسد بن کر رہے۔ اِس لیے یہاں مجموعہ کی سطح پر کبھی معیاری نظام نہیں بن سکتا۔ معیاری نظام کا مقام صرف جنت ہے اور وہ جنت ہی میں بنے گا۔

موجودہ دنیا دراصل معیاری افراد کا انتخابی میدان (selection ground) ہے۔ یہاں ہر نسل سے معیاری افراد کا انتخاب کیا جا رہا ہے۔ مثلاً آدم کی پہلی نسل میں قابیل، قابلِ رد تھا اور ہابیل، قابلِ قبول۔ یہی معاملہ پوری تاریخ میں جاری ہے۔ ہر دور میں اور ہر نسل میں خدا معیاری افراد کو منتخب کر رہا ہے اور غیر معیاری افراد کو رد کر رہا ہے۔ رد وقبول کے اِسی معاملے کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ○ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ (56: 39-40) یعنی اگلوں میں سے ایک بڑا گروہ اور پچھلوں میں سے بھی ایک بڑا گروہ۔

قابلِ قبول اور قابلِ رد انسانوں کی یہ مطلوب فہرست جب مکمل ہو جائے گی تو اس کے بعد

خالق کائنات موجودہ دنیا کو ختم کرکے ایک اور دنیا بنائے گا، جہاں وہ معیاری دنیا ہوگی جس کو جنت کہا جاتا ہے۔ قابلِ قبول افراد اِس جنت میں بسا دئے جائیں گے، جہاں وہ ابد تک خوف وحزن سے پاک زندگی گزاریں گے۔ اور نا قابلِ قبول افراد کورد کرکے کائناتی کوڑے خانے میں ڈال دیا جائے گا، جہاں وہ ابد تک حسرت کی زندگی گزاریں گے۔

معیارِ تاریخ

یہی تاریخ کو دیکھنے کا صحیح معیار ہے۔ اِس معیار سے تاریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فساد کے جنگل میں ہمیشہ اعلیٰ درجے کے صالح افراد پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اِسی جنگل میں آدم کے بیٹے ہابیل بھی تھے جنھوں نے اپنے قاتل سے کہا: لَئِنْ بَسَطْتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِيَ إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ (5: 28) یعنی اگر تم مجھ کو قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں تم کو قتل کرنے کے لیے تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو سارے جہان کا رب ہے۔ ہابیل کا یہ قول امن کا قول تھا۔ ہابیل نے اپنی اِس روش سے امن پسندی کی وہ اعلیٰ ترین مثال قائم کی جس کے آگے امن پسندی کا کوئی اور درجہ نہیں۔

اِسی طرح، تاریخ کے اِس جنگل میں ہاجرہ اُمِّ اسماعیل جیسی خاتون پیدا ہوئیں۔ انھوں نے ڈھائی ہزار سال پہلے، خدا کے منصوبے کے مطابق، ایک نئی نسل برپا کرنے کے لیے یہ قربانی دی کہ وہ اپنے چھوٹے بچے (اسماعیل) کو لے کر عرب کے صحرا میں آباد ہوگئیں۔ اُس وقت اُن کی زبان سے یہ تاریخی کلمہ نکلا کہ جب خدا کا یہی منصوبہ ہے تو خدا ہم کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا (إذن لا یضیّعنا اللہ)۔ ہاجرہ کی اِسی قربانی کے نتیجے میں بنو اسماعیل کی وہ نسل پیدا ہوئی جو اعلیٰ انسانی اوصاف کی حامل تھی۔ ایک مغربی اسکالر پروفیسر ڈی ایس مارگولیتھ (وفات: 1940) نے اِس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے بنو اسماعیل کی اِس نسل کو ہیروؤں کی ایک قوم (a nation of heroes) قرار دیا تھا۔

اِسی طرح، تاریخ کے اِس جنگل میں ابوبکر اور عمر جیسے افراد پیدا ہوئے جن کو اقتدار ملا، لیکن انھوں نے اپنے آپ کو بگاڑ سے کامل طور پر بچایا۔ مہاتما گاندھی نے ابوبکر اور عمر کا اعتراف کرتے ہوئے

لکھا تھا کہ — اگرچہ وہ بہت بڑی سلطنت کے حاکم تھے، مگر انھوں نے فقیروں جیسی زندگی گزاری:

Though, they were masters of vast empire, yet they lived the life of paupers. (*Harijan,* July 27, 1937)

انسان کو پیدا کرنے والا خدا ہے۔ خدا نے انسان کی فطرت میں جنت کا تصور ودیعت کر دیا ہے۔ اِسی لیے ہر عورت اور مرد جو پیدا ہوتے ہیں، وہ تمناؤں اور خواہشوں (desires) کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر فطری طور پر ایک تصوراتی دنیا بسی ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے، انسان ایک طالبِ جنت مخلوق (paradise-seeking animal) ہے۔

اِسی فطرت کی بنا پر ایسا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا انسان اپنے لیے ایک معیاری دنیا کی تعمیر میں لگ جاتا ہے۔ ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی طاقت اور اپنے تمام وسائل کو ایک ایسی دنیا کے حصول میں لگا دیتا ہے، جو اس کے لیے خوشی اور سکون کی دنیا ہو، جہاں اس کو پورے معنوں میں فل فل مینٹ (fulfilment) مل سکے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر آدمی جو اِس دنیا میں آیا، وہ اپنی مطلوب دنیا کی تعمیر میں ناکام رہا، اور مایوسی کی نفسیات میں مرکر اس دنیا سے چلا گیا۔ اِس عموم میں کسی بھی شخص کا کوئی استثنا نہیں۔ راقم الحروف نے ایک بار انٹرنیٹ کے ذریعے ایسے تقریباً 400 ممتاز افراد کے بارے میں یہ معلوم کیا کہ ان کے آخری ایام کیا تھے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ بلا استثنا اُن میں سے ہر شخص سخت مایوسی (despair) کی حالت میں مرا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں جو معیاری دنیا بسی ہوئی ہے، وہ جنت ہے۔ مگر جنت کو پانے کا مقام آخرت ہے، نہ کہ موجودہ دنیا۔ خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، انسان کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جنت میں بسائے جانے کے قابل بنائے۔ مگر ساری تاریخ میں انسان نے یہ کیا کہ ہر ایک موجودہ دنیا ہی میں اپنی جنت کی تعمیر کرنے لگا۔ ایسا کرنا خدا کے تخلیقی منصوبے کے خلاف تھا۔ اِس لیے ہر انسان صرف ناکامی کی ایک مثال بن کر رہ گیا۔ مفکرین اور مصلحین نے عام طور پر اپنا نشانہ یہ بنایا کہ وہ اِس دنیا میں انصاف اور انسانی اقدار (human values) کے اعتبار سے ایک معیاری دنیا بنائیں۔

مگر اُن کا نشانہ خدا کے تخلیقی منصوبے کے خلاف تھا، اِس لیے وہ کبھی واقعہ نہ بن سکا۔ خدا کا تخلیقی نشانہ یہ نہیں ہے کہ موجودہ دنیا میں معیاری نظام (ideal system) وجود میں لایا جائے، بلکہ خدا کا تخلیقی نشانہ یہ ہے کہ معیاری افراد وجود میں آئیں۔ اِس قسم کے معیاری افراد تاریخ میں بکھرے ہوئے ہیں۔ آخرت میں یہ ہوگا کہ اِن افراد کو منتخب کرکے اُنھیں جنت کی معیاری دنیا میں بسا دیا جائے گا۔

تعبیر تاریخ کی مثالیں

تاریخ کی تعبیر (interpretation of history) ایک مستقل سبجکٹ ہے، مگر اِس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ سب کی سب کنفیوژن کا کیس ہیں۔ میرے علم کے مطابق، کوئی بھی شخص اِس موضوع پر اب تک ایسی کتاب نہ لکھ سکا جس میں انسانی تاریخ کی قابلِ فہم تعبیر پیش کی گئی ہو۔

اِس موضوع پر سب سے زیادہ نمایاں نام غالباً کارل مارکس (وفات: 1883) کا ہے۔ اس نے بطور خود تاریخ کی ایک متعین تعبیر دینے کی کوشش کی۔ مارکس کی اِس تعبیر تاریخ کو مادی تعبیر تاریخ (material interpretation of history) یا تاریخی مادیت (historical materialism) کہا جاتا ہے۔ کارل مارکس نے یہ کیا کہ اس نے نیوٹن کے دریافت کردہ قانون فطرت (law of nature) کو انسانی تاریخ پر منطبق کردیا، مگر مارکس کی یہ تعبیر تاریخ پہلی ہی نسل میں اہل علم کے درمیان قابلِ رد قرار پا گئی۔ انسان ایک صاحب اختیار مخلوق ہے۔ اِس کے برعکس، مادہ کوئی ذاتی اختیار نہیں رکھتا۔ ایسی حالت میں ایک کے قانون کو دوسرے کے اوپر چسپاں کرنا قیاس مع الفارق ہے، جو کہ عملاً ممکن نہیں۔

پہلی عالمی جنگ (1914-1918) کا واقعہ اس مارکسی نظریے کی عملی آزمائش تھا۔ یہ نظریہ اِس پہلی ہی آزمائش میں مکمل طور پر رد ہوگیا۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ مشہور کمیونسٹ لیڈر ولا دمیر لینن (وفات: 1924) نے 1919 میں کمیونسٹ انٹرنیشنل (comintern) قائم کی۔ اُس کا نظریہ تھا کہ ساری دنیا کے مزدور ایک طرف ہیں اور تمام دنیا کے سرمایہ دار ایک طرف۔ اس کے بعد 1939 میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی۔ یہ جنگ جن ملکوں کے درمیان ہوئی، اُن ملکوں کے سربراہ مارکسی تصور کے مطابق، سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مارکسی تصور کے مطابق، یہ فرض کرلیا گیا کہ اِن ملکوں کے

مزدور اپنے ملکوں کی سرمایہ دار حکومتوں کا ساتھ نہیں دیں گے، بلکہ وہ عالمی مزدور طبقہ (class) کا ساتھ دیں گے، مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔ ہر ملک کے مزدوروں نے خود اپنے ملک کی حکومتوں کا ساتھ دیا۔ اِس طرح تاریخی مادیت یا جدلیاتی مادیت کا نظریہ اپنے پہلے ہی تجربے میں ختم ہو گیا۔

اِسی طرح کچھ اور اہل علم نے انسانی تاریخ کو ایک تعبیر دینے کی کوشش کی۔ مگر عملاً وہ بھی کنفیوژن کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اِس کی ایک مثال کیمبرج کے پروفیسر ایچ بٹر فیلڈ (H. Butterfield) کی ہے۔ انھوں نے اِس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جو 146 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب 1931 میں لندن سے چھپی ہے۔ اِس کتاب کا نام یہ ہے:

The Whig Interpretation of History

اِس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ کسی یونی ورسل مارل کوڈ (universal moral code) کی روشنی میں پوری تاریخ کو ایک اخلاقی تعبیر دی جائے، مگر خود مصنف نے یہ اعتراف کیا ہے کہ تاریخ کی عملی تصویر کے مطابق، اِس قسم کی تعبیر ممکن نہیں۔

اِسی طرح ایک مثال مشہور برطانی رائٹر جارج برنارڈ شا (وفات: 1950) کی ہے۔ اِس سلسلے میں اس کی ایک کتاب ''مین اینڈ سپر مین'' *(Man and Superman)* ہے۔ اِس کتاب میں اُس نے مفروضہ ارتقائی اصول کی روشنی میں تاریخ کی ایک تعبیر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان لازمی ارتقائی قانون کے مطابق، بشر (man) سے فوق البشر (superman) کی طرف سفر کر رہا ہے۔ مگر اس کا یہ نظریہ صرف ایک خیالی کہانی ہے۔ خالص علمی اعتبار سے اس کا کوئی وزن نہیں۔

منفی تصورِ تاریخ

انسانی تاریخ کے بارے میں عام طور پر اہلِ علم کا نقطۂ نظر منفی ہوتا ہے۔ مثلاً مشہور انگریز مورخ ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) نے لکھا ہے کہ — انسانیت کی تاریخ جرائم، حماقت اور بدقسمتی کے رجسٹر سے کچھ ہی زیادہ ہے:

> History, which is, indeed, little more than the register of crimes, follies and misfortunes of mankind.

مختلف زبانوں میں جو بڑے بڑے ناول لکھے گئے ہیں، وہ سب کے سب المیہ (tragedy) ہیں، نہ کہ طربیہ (comedy)۔ انسانی تاریخ کے بارے میں اِس قسم کا منفی تصور کیوں ہے۔ اِس کا سبب دراصل تاریخ کا غیر فطری طریق مطالعہ ہے۔ تاریخ کا فطری طریقِ مطالعہ یہ ہے کہ سب سے پہلے تاریخ کے بارے میں خالق کے نقشہ (model) کو دریافت کیا جائے، اور اس کے بعد اِس خدائی نقشے کی روشنی میں تاریخ کا جائزہ لیا جائے۔

جو لوگ تاریخ کے بارے میں منفی نقطۂ نظر رکھتے ہیں، اُن سب کی مشترک غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے مفروضہ نقشے کی روشنی میں تاریخ کو سمجھنا چاہتے ہیں، اور جب تاریخ ان کے مفروضہ نقشے کے مطابق، بامعنی نظر نہیں آتی تو وہ تاریخ کے بارے میں منفی سوچ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تاریخ کے بارے میں اِسی منفی نقطۂ نظر کے تحت ایک مغربی مفکر نے کہا کہ اِس دنیا میں ہر چیز حسین ہے، صرف ایک چیز حسین نہیں، اور وہ انسان ہے:

In this world everything is beautiful except man.

یہ تبصرہ غلط معیار کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے سوا بقیہ دنیا جتنی حسین ہے، اُس سے بھی زیادہ انسانی دنیا حسین ہے۔ انسان مقصدِ کائنات ہے، پھر وہ غیر حسین کیسے ہوسکتا ہے۔ انسانی تاریخ

یہ تبصرہ دراصل ایک غلط معیار کا نتیجہ ہے۔ مذکورہ مبصر نے مادی دنیا کو دیکھا۔ اس کو نظر آیا کہ مادی دنیا میں پورے مجموعے کی سطح پر حسن پایا جاتا ہے۔ اس نے چاہا کہ یہی مجموعی حسن اس کو انسانی دنیا میں بھی نظر آئے۔ جب اُس نے پایا کہ انسانی دنیا میں اِس قسم کا مجموعی حسن نہیں ہے، تو اُس نے مذکورہ قسم کا ریمارک (remark) دے دیا۔

خالق کے منصوبے کے مطابق، انسانی دنیا اور بقیہ مادی دنیا کے درمیان ایک فرق پایا جاتا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ انسان کے سوا بقیہ کائنات میں مجموعی نظم (collective discipline) درکار ہے، کیوں کہ بقیہ دنیا امتحان (test) کے لیے نہیں پیدا کی گئی ہے، بلکہ وہ انسان کے لیے ایک معاون ذریعے کے طور پر پیدا کی گئی ہے، مجموعی نظم کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔

اِس کے برعکس، انسان کا معاملہ فرد فرد کا معاملہ ہے۔ یہاں مجموعی حسن مطلوب نہیں، بلکہ یہاں انفرادی حسن مطلوب ہے۔ انسانی دنیا میں ہر فرد کو الگ الگ جانچا جارہا ہے۔ ہر فرد کو الگ الگ یہ موقع دیا جارہا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرکے اپنے آپ کو جنت کے معاشرے کا ایک کامیاب ممبر بنا سکے۔ اِسی منصوبۂ تخلیق کی بنا پر دونوں کی جانچ کا الگ الگ معیار ہوگا۔ انسان کو فرد کی سطح پر جانچنا چاہئے اور بقیہ کائنات کو مجموعے کی سطح پر۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیق کی دونوں مثالیں شاہ کار ہیں، انسان بھی اور بقیہ کائنات بھی، مگر دونوں کو جانچنے کا معیار ایک دوسرے سے الگ ہے۔

تاریخ کے مطالعے کے بارے میں جو لوگ منفی نقطہ نظر رکھتے ہیں، ان کی مشترک غلطی یہ ہے کہ وہ پورے انسانی معاشرے یا پورے انسانی مجموعے کو دیکھ کر اپنی رائے بناتے ہیں۔ چوں کہ مجموعے کی سطح پر اُنھیں مطلوب معیاری سماج نظر نہیں آتا، اِس لیے وہ کہہ دیتے ہیں کہ انسانی دنیا میں برائی (evil) کے سوا کچھ اور نہیں، حالاں کہ اُنھیں یہ کہنا چاہیے کہ انسانی دنیا میں اگر چہ مجموعہ کی سطح پر برائی ہے، لیکن افراد کی سطح پر خیر موجود ہے۔ مذکورہ منفی سوچ کے تحت 'پرابلم آف اِول' (problem of evil) جیسا نظریہ وجود میں آیا ہے، جو کہ موجودہ زمانے میں عام طور پر اہلِ علم کے ذہن پر چھایا ہوا ہے۔

انسانی دنیا کو مجموعی سطح پر معیاری بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انسانی آزادی کو منسوخ کردیا جائے، کیوں کہ انسانی سماج میں تمام برائیوں کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ انسان کی طرف سے آزادی کا غلط استعمال (misuse of freedom) ہے۔ مگر انسان کی آزادی کو منسوخ کرنا خود خالق کے منصوبے کو منسوخ کرنے کے ہم معنی ہے۔ اِس لیے خالق نے اپنے منصوبے کی اِس طرح تشکیل کی کہ اس نے انسان کے معاملے کو مبنی بر مجموعہ (collective-based) نہیں بنایا، بلکہ اس کو مبنی بر فرد (individual-based) بنایا۔ اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، خدا کا کنسرن (concern) یہ نہیں ہے کہ پورے مجموعۂ انسانی میں لازماً معیاری نظام قائم ہو۔ ایسا صرف اُس وقت ہوسکتا تھا جب کہ انسان کی آزادی کو کلی طور پر منسوخ کردیا جاتا، اور خالق کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، ایسا ہونا ممکن نہیں۔

اِس منصوبۂ تخلیق کے مطابق، پورے اجتماع یا پورے مجموعے کی سطح پر معیار (ideal) کا

حصول ممکن نہیں، لیکن یہ عین ممکن ہے کہ انسانوں کی بھیڑ میں ایسے معیاری افراد وجود میں آتے رہیں جو اپنی ذات کی سطح پر سچائی کو دریافت کریں اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیں، یہی استثنائی افراد خالق کو مطلوب ہیں — یہی مطلب ہے انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے مطلوب کے مطابق، تاریخ کو مینج (manage) کرنے کا۔

خالقِ کائنات کی یہ اسکیم قرآن کے مطالعے سے واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی سورہ النساء کی دو آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا، وہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے، یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور صالح۔ کیسی اچھی ہے ان کی رفاقت۔ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے، اور اللہ کا علم کافی ہے'' (4: 69-70)۔

قرآن کے اِس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون سے منتخب افراد ہوں گے جن کے مجموعے سے جنت کا معاشرہ وجود میں آئے گا۔ اِن افراد کو بتانے کے لیے یہاں چار الفاظ استعمال کئے گئے ہیں — نبی، صدیق، شاہد، صالح۔ نبی سے مراد صاحب وحی انسان (revealed person) ہے۔ صدیق سے مراد وہ انسان ہے جو حق کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا زیادہ وابستہ کرے کہ اس کو پیغمبر کے ساتھ مزاجی مناسبت حاصل ہوجائے۔ شہید یا شاہد سے مراد وہ انسان ہے جس کی زندگی میں حق اتنا زیادہ متشکّل ہوجائے کہ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ لوگوں کے درمیان حق کا گواہ بن جائے۔ صالح سے مراد وہ انسان ہے جس کی زندگی میں فکر وعمل کی مطابقت کامل درجے میں پائی جائے۔

بنیادی طور پر یہی چار قسم کے افراد ہیں جن کے مجموعے سے وہ معیاری معاشرہ تشکیل پائے گا جس کو جنت کہا جاتا ہے۔ اِن افراد کا تعلق کسی ایک زمانے یا کسی ایک معاشرے سے نہیں ہوگا، بلکہ وہ مختلف غیر معیاری معاشروں کے منتخب کئے ہوئے افراد ہوں گے۔ خالق کی اِس اسکیم کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اِس دنیا میں صرف انفرادی کامیابی (individual achievement) ممکن ہے۔ جہاں تک اجتماعی کامیابی (social achievement) کا تعلق ہے، وہ امتحان کی اس دنیا میں سرے سے ممکن ہی نہیں۔

موجودہ دنیا میں درست روش پر قائم ہونے کے لئے مثبت ذہن ضروری ہے۔ مگر مثبت ذہن کے ساتھ جینا کوئی سادہ بات نہیں۔ مثبت ذہن کے ساتھ جینے کے لئے آدمی کو ایک لازمی امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ ہے دو متضاد رجحانات کو مینج (manage) کرتے ہوئے زندگی گزارنا۔

اصل یہ ہے کہ آدمی پیدائشی طور پر ایک معیار پسند مخلوق ہے، مگر عملاً اس کو ایک غیر معیاری دنیا میں رہنا پڑتا ہے۔ اس حقیقت سے شعوری طور پر باخبر ہونا بہت ضروری ہے۔ ورنہ یہ ہوگا کہ اس کا معیار پسند ذہن دنیا کے غیر معیاری تجربات کی بنا پر ردعمل کا شکار ہوتا رہے گا اور نتیجۃً وہ مثبت ذہن سے محروم ہوجائے گا، اور مثبت ذہن سے محروم ہونا ہر چیز سے محروم ہونے کے ہم معنی ہے۔

آدمی کو شعوری طور پر یہ جاننا چاہیے کہ اس کا معیار پسند ذہن اس لئے ہے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا کا طالب بنے، نہ یہ کہ وہ اسی موجودہ دنیا میں جنتی زندگی یا جنتی معاشرہ کو حاصل کرنے لگے۔ موجودہ دنیا جنتی انسان بنانے کے لئے ہے، نہ کہ جنتی معاشرہ بنانے کے لئے۔ جو آدمی شعوری طور پر اس راز کو جان لے کہ موجودہ دنیا میں اس کو اپنے اندر جنتی شخصیت کی تعمیر کرنا ہے وہ کامیاب ہوا۔ اور جو آدمی موجودہ دنیا ہی کو جنتی دنیا بنانے کی کوشش میں لگ جائے، وہ ناکام ونامراد رہا۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں جنتی شخصیت بننا تو ممکن ہے، مگر جنتی نظام بننا ممکن نہیں۔

تاریخ کی خدائی تنظیم

قرآن میں تاریخ کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، اس کے مطابق، انسانی تاریخ آدم سے شروع ہوتی ہے، جو کہ پہلے انسان (first man) تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اور ان کی بیوی حوا کو پیدا کر کے اُنھیں جنت میں آباد کیا۔ خدا کی طرف سے اُن کو صرف ایک ہدایت دی گئی تھی، وہ یہ کہ: اے آدم، تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس سے کھاؤ آسودگی کے ساتھ، جہاں سے چاہو۔ اور اس درخت کے قریب مت جانا، ورنہ تم ظالموں میں سے ہوجاؤ گے'' (2: 35)۔

آدم کے ساتھ ان کی بیوی کو پیدا کرنے میں اِس بات کا اشارہ تھا کہ انسان کی پیدائش سے اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب ہے، وہ صرف ایک انسانی فرد نہیں، بلکہ ایک انسانی نسل ہے۔

انسان کے لیے جنت کا مستحق ہونے کی شرط صرف ایک تھی، یہ کہ وہ خود انضباطی کردار (self-disciplined character) کا پابند رہے، وہ آزادی کا غلط استعمال نہ کرے۔ مگر آدم اور حوا اِس شرط پر پورے نہیں اترے۔ اِس لیے انھیں جنت سے نکال کر سیارۂ ارض پر آباد کر دیا گیا۔

اِس کا مطلب یہ تھا کہ پہلے انسان کو یہ موقع دیا گیا تھا کہ انسان عمومی بنیاد (general basis) پر جنت میں رہے، یعنی ہر پیدا ہونے والے عورت اور مرد کو جنت کی زندگی حاصل ہو۔ لیکن جب انسان اِس اعتماد پر پورا نہیں اترا تو اس کے بعد اللہ نے یہ فیصلہ کیا کہ انسان کی آزادی تو برقرار رہے گی، لیکن اب عمومی بنیاد پر نہیں، بلکہ انتخابی بنیاد پر صرف مستحق افراد کو جنت میں داخلہ دیا جائے گا۔ یہ انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ کو خدا کی طرف سے مینج کرنے کا پہلا واقعہ تھا۔

موجودہ زمین اِس تخلیقی مقصد کے لیے سلیکشن گراؤنڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب یہ ہوگا کہ قیامت کے بعد فرشتوں کے ریکارڈ کے مطابق، صرف منتخب عورتوں اور مردوں، قرآن کے الفاظ میں احسن العمل (67:2) افراد کو، یہ خوش نصیبی حاصل ہوگی کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں آباد ہوسکیں۔

زمین پر لائف سپورٹ سسٹم کا انتظام تو خدا کی طرف سے کیا گیا تھا، مگر انسان کو اپنے قول وعمل کی مکمل آزادی حاصل تھی، لیکن دوبارہ انسان نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا۔ دھیرے دھیرے یہ ہوا کہ عمومی طور پر انسانی نسل شرک یا فطرت پرستی میں مبتلا ہوگئی۔ گویا کہ پہلے انسان نے ''درخت'' کا صرف پھل کھایا تھا، اب انسان نے ''درخت'' کو معبود قرار دے کر اس کی پرستش شروع کر دی۔

تاہم منصوبۂ تخلیق (creation plan) کے مطابق، یہ ممکن نہیں تھا کہ انسان کی آزادی کو منسوخ کر دیا جائے، اِس لیے اللہ نے انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کو مینج (manage) کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ اللہ نے یہ کیا کہ انسانوں میں سے کسی فرد کو منتخب کر کے اُس کو اپنا پیغمبر بنایا۔ اُس کو وحی (revelation) کے ذریعے اپنی رہنمائی بھیجی۔ اِن پیغمبروں نے انسانوں کو بتایا کہ عبادت کے قابل صرف ایک اللہ ہے۔ تم ایک اللہ کی عبادت کرو اور خود ساختہ معبودوں کی عبادت چھوڑ دو۔

مگر انسانوں کی بڑی تعداد ایسا نہ کرسکی۔ اللہ کی عبادت کا معاملہ ناقابلِ مشاہدہ

(unobservable) ہستی کو معبود بنانے کا معاملہ تھا۔ انسان نے اپنی ظاہر پرستی کی بنا پر نیچر کو اپنا معبود بنالیا، جو کہ اس کے لیے ایک قابلِ مشاہدہ (observable) معبود کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِسی نیچر ورشپ کا دوسرا نام شرک ہے۔

پیغمبروں کی آمد کے باوجود انسان کے لیے آزادیٔ اختیار (freedom of choice) کا موقع بدستور باقی تھا۔ اِس لیے انسان پیغمبروں کا انکار کرتا رہا۔ یہ معاملہ نسل در نسل جاری رہا، یہاں تک کہ شرک انسان کے لیے غالب کلچر بن گیا، تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہوگیا۔

مشرکانہ کلچر کے عمومی غلبہ کا مزید نتیجہ یہ ہوا کہ وقت کی حکومتوں نے شرک کو اسٹیٹ کے مذہب کے طور پر اختیار کرلیا۔ اِس طرح شرک کو ہر جگہ سیاسی طاقت کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ پہلے اگر شرک سادہ معنوں میں ایک اعتقادی برائی تھی تو اب وہ ایک طاقت ور برائی بن گئی۔ مشرکانہ اقتدار کا کلچر بڑھتا رہا، یہاں تک کہ وہ برائی پیدا ہوئی جس کو فرانسیسی مورخ ہنری پرین نے مطلق شہنشاہیت (absolute imperialism) کا نام دیا ہے۔

شرک کی اِسی سیاسی سرپرستی کے نتیجے میں وہ جارحانہ مذہبیت پیدا ہوئی جس کو تاریخ میں، مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا ہے۔ سیاسی حاکموں نے ایسا ماحول قائم کیا جس کے نتیجے میں لوگوں کے لیے صرف ایک ہی آپشن باقی رہا، اور وہ مشرکانہ مذہب تھا۔ توحید کا مذہب اختیار کرنے والوں کے لیے یہ انجام مقدر ہوگیا کہ وہ یا تو ریاست کے مذہب کو اختیار کرلیں، یا وہ قتل کردئے جائیں۔ دورِ قدیم کی یہی وہ صورتِ حال ہے جس کی طرف قرآن کی سورہ البروج کی آیات (85: 4-8) میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اِس صورت حال سے یہ واضح ہوگیا کہ اب مذہبِ حق کا صرف اعلان کافی نہیں ہے۔ اب پہلی ضرورت یہ ہے کہ مذہب کو سیاسی اقتدار سے جدا کردیا جائے، تاکہ انسان کے لیے آزادی کے ساتھ اپنے عقیدے کا فیصلہ کرنا ممکن ہوجائے۔

تخلیقِ آدم

اللہ تعالیٰ نے پہلے لمبے تدریجی عمل (gradual process) کے ذریعے مادی کائنات بنائی۔

آخر میں اُس نے سیارہ ارض پر انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے آباد کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جب انسانِ اوّل (آدم) کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو اُس وقت اللہ اور فرشتوں کے درمیان ایک مکالمہ ہوا۔ یہ واقعہ قرآن کی سورہ البقرہ میں آیا ہے۔ یہاں متعلق آیات کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اُس میں فساد کریں اور خون بہائیں۔ اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھائے آدم کو سارے نام، پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے اُن لوگوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہم کو بتایا۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔ اللہ نے کہا: اے آدم، ان کو بتاؤ اُن لوگوں کے نام، تو جب آدم نے بتائے اُن کو اُن لوگوں کے نام تو اللہ نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں، اور مجھ کو معلوم ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو'' (2: 30-33)۔

یہاں یہ سوال ہے کہ فرشتوں نے آدم کے بارے میں جس شک کا اظہار کیا تھا، وہ کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ کے وضاحتی جواب کے بعد فرشتے جس چیز پر مطمئن ہوئے، وہ چیز کیا تھی۔ یہ بات قرآن میں بطور اشارہ موجود ہے۔ اِس اشارے کی تفصیل جاننے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا منصوبہ کیا تھا اور وہ کس طرح اپنی تکمیل تک پہنچا۔

یہ اشارہ قرآن کی ایک اور سورہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کی سورہ التین میں ارشاد ہوا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (95: 4-6) یعنی ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اُس کو سب سے نیچے پھینک دیا۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے تو اُن کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ ایک عظیم احسان کا معاملہ کیا جس کو

قرآن میں تکریم (17: 70) کہا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اعلیٰ صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا، اُس کو کامل آزادی دی، اس کو یہ موقع دیا کہ وہ خود اپنے آزادانہ انتخاب (choice) سے اپنی زندگی کے لیے درست روش کو اختیار کرے اور پھر اللہ تعالیٰ یہ کہہ کر اس کے لیے جنت کا فیصلہ کرے کہ یہ تیرے اپنے عمل کی جزا ہے جو تو نے دنیا میں کیا۔ مگر انسانوں کی اکثریت نے اِس منصوبۂ الٰہی کو نہیں سمجھا۔ انھوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا اور اِس طرح انھوں نے جنت کا استحقاق کھو دیا۔ البتہ اِس عموم میں کچھ مستثنیٰ افراد پیدا ہوئے جنھوں نے اِس منصوبۂ الٰہی کو سمجھا اور اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرکے انھوں نے اپنے آپ کو جنت کا مستحق بنالیا۔

اِس قرآنی بیان کی روشنی میں غور کیجئے تو سورہ البقرہ کے مذکورہ بیان کا مطلب یہ ہے کہ فرشتوں نے پوری انسانی نسل (total human race) کو لے کر سوچا تو وہ اِس رائے پر پہنچے کہ کامل آزادی انسان کے اندر بگاڑ پیدا کرے گی۔ وہ ظلم اور فساد جیسے کاموں میں ملوث ہوجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مظاہرہ کی صورت میں اس کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ انسانوں کی مجموعی تعداد کے اعتبار سے بلاشبہہ اُن کے اندر بگاڑ آئے گا، لیکن اِس مجموعے میں ایسے مستثنیٰ افراد بھی پیدا ہوتے رہیں گے جو اپنی آزادی کا صحیح استعمال کریں گے، اور اِس طرح وہ ابدی رحمتِ خداوندی کے مستحق قرار پائیں گے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے ایک مظاہرہ کے ذریعے انسانی تاریخ کے اِن مستثنیٰ افراد کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔ یہ دیکھ کر فرشتے مطمئن ہوگئے۔ یہ دیکھ کر فرشتوں نے جانا کہ اُن کا اشکال انسانوں کے پورے مجموعے کی نسبت سے تھا، جب کہ اللہ کا یہ منصوبہ نہیں۔ اللہ کا منصوبہ مبنی بر افراد (individual-based) ہے، وہ مبنی بر مجموعہ (totality-based) نہیں۔

اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم تھا کہ کامل آزادی دینے کی بنا پر انسانی دنیا ظلم وفساد کا جنگل بن جائے گی، مگر اِس عموم میں استثنا بھی ہوگا۔ انسانوں کے پھیلے ہوئے جنگل میں ایسے استثنائی افراد بھی پیدا ہوں گے جو ظلم وفساد کے جنگل میں ربانی پھول کے مانند ہوں گے۔ اللہ کی نظر اِنھیں ربانی پھولوں پر تھی۔ اللہ کو یہ کرنا تھا کہ وہ فرشتوں کے ذریعے پوری انسانی تاریخ کا ریکارڈ تیار کرے، پھر ان ربانی افراد کو منتخب کرکے

اُنھیں انسانوں کی عمومی بھیڑ سے الگ کیا جائے اور پھر ان کو جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائے۔

جنت سادہ معنوں میں کوئی عیش کدہ نہیں۔ جنت وہ اعلیٰ مقام ہے جہاں تاریخ انسانی کے منتخب افراد کا معاشرہ بنایا جائے۔ وہاں اُن کو ہر قسم کا بہترین انفراسٹرکچر (infrastructure) حاصل ہو۔ تاریخ انسانیت کے یہ منتخب افراد یہاں فرشتوں کے تعاون سے ایک برتر تہذیب (super civilization) وجود میں لائیں۔ موجودہ دنیا میں جو تہذیب بنی، وہ قوانین فطرت (laws of nature) کی جزئی دریافت سے بنائی گئی۔ آخرت میں جو مافوق تہذیب بنے گی، وہ کلمات اللہ کی کلّی انفولڈنگ کے ذریعے تشکیل پائے گی۔

اِس معاملے کی مزید وضاحت قرآن کی دوسری آیتوں سے ہوتی ہے۔ اِس سلسلے کی ایک آیت یہ ہے: وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (31: 27) یعنی اگر زمین میں جو درخت ہیں، وہ قلم بن جائیں اور سمندر سات مزید سمندروں کے ساتھ روشنائی بن جائیں، تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ بے شک اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

قرآن کی یہ آیت بظاہر خبر کے اسلوب میں ہے، مگر حقیقت میں وہ انشا ہے، یعنی اِس میں کلمات اللہ کے بارے میں صرف ایک موجود امکان کو نہیں بتایا گیا ہے، بلکہ اُس میں مخصوص قرآنی اسلوب کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ ایک وقت آنے والا ہے جب کہ اِن لامحدود کلمات اللہ کی انفولڈنگ کی جائے۔ یہ کام جنت کے ابدی ماحول میں انجام پائے گا۔ وہاں پوری تاریخ بشری کے منتخب افراد اکھٹا ہوں گے اور وہ اعلیٰ ترین مواقع کے درمیان کلمات اللہ کی انفولڈنگ کا کام انجام دیں گے۔ یہ ایک لامحدود کام ہوگا جو ابد تک جاری رہے گا۔ اِس عمل کو قرآن میں شغلِ فاکہ (35: 55) یعنی پُرمسرت سرگرمی (joyful activity) کا نام دیا گیا ہے۔

فردِ انسانی، مجموعۂ انسانی

تاریخ میں جتنے مفکر اور مصلح گزرے ہیں، وہ سب کے سب آئڈیلسٹ (idealist) تھے۔

اُن میں سے ہر ایک پوری انسانیت کی سطح پر معیاری نظام (ideal system) قائم کرنا چاہتا تھا۔قدیم یونان کے فلسفی افلاطون اور ارسطو کا خواب یہ تھا کہ دنیا میں آئڈیل سوسائٹی بنے۔ برٹش فلسفی برٹرینڈرسل چاہتا تھا کہ ایک پرامن دنیا وجود میں آئے۔ انڈیا کے لیڈر مہاتما گاندھی کا نشانہ یہ تھا کہ آزادی کے بعد انڈیا میں مبنی برخدمت سماج (سیوا سماج) تشکیل پائے، وغیرہ۔ یہ سب انسانی زندگی کے معیاری تصورات تھے۔مگر واقعات بتاتے ہیں کہ عملاً تمام کے تمام مفکرین اور مصلحین معیاری دنیا(ideal world) کو وجود میں لانے میں ناکام رہے۔

اِس کا سبب یہ تھا کہ ہر مفکر اور ہر مصلح نے اپنے دماغ سے سوچا۔کسی نے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ اِس معاملے میں خالق کی اسکیم (scheme of things) کیا ہے۔مفکرین اور مصلحین کا منصوبہ خالق کے منصوبے سے مطابقت نہ رکھتا تھا،اِس لیے وہ مکمل طور پر ناکام رہا۔

خالق نے ہر انسان کو آزادیٔ اختیار (freedom of choice) دی ہے۔ یہ آزادیٔ اختیار قیامت سے پہلے، ہرگز منسوخ ہونے والی نہیں۔یہی وجہ ہے کہ اِس دنیا میں مجموعۂ انسانی کی سطح پر کسی معیاری نظام کا بننا ممکن نہیں۔ یہاں معیاری فرد تو وجود میں آسکتا ہے،لیکن مجموعے کی سطح پر کوئی معیاری نظام کبھی وجود میں نہیں آسکتا۔ معیاری افراد کا وجود میں آنا تو ممکن ہے،مگر معیاری سماجی نظام کا وجود میں آنا ممکن نہیں۔

واقعات بتاتے ہیں کہ اِس دنیا میں مجموعۂ انسانیت کی سطح پر کوئی معیاری نظام تو کبھی وجود میں نہ آسکا،لیکن عین اسی وقت ہر زمانے میں فرد (individual) کی سطح پر معیاری انسان وجود میں آتے رہے۔ خالق کے نقشے کے مطابق، یہ ممکن نہیں کہ موجودہ دنیا میں پورے سماج کی سطح پر کوئی معیاری نظام تشکیل پائے۔لیکن عین اِسی وقت پوری تاریخ میں ایک واقعہ مسلسل پیش آرہا ہے، وہ یہ کہ ہر دور میں معیاری افراد بن رہے ہیں۔ خالق کی اسکیم کے مطابق، جو ہونے والا ہے، وہ یہ کہ مختلف زمانوں میں پیدا ہونے والے اِن معیاری افراد کو چن کر الگ کرلیا جائے اور پھر مختلف زمانوں میں پیدا ہونے والے اِن معیاری افراد کے اجتماع سے ایک آئڈیل سوسائٹی بنائی جائے۔ اِسی معیاری سماج کا نام

مذہبی اصطلاح میں جنت (paradise) ہے۔

حضرت نوح کا رول

آدم پہلے انسان تھے اور پہلے نبی بھی۔ اُن کو اوران کی بیوی حوا کو غالباً عراق کے اُس مقام پر بسایا گیا جس کو قدیم زبان میں میسو پوٹامیا (Mesopotamia) کہا جاتا تھا۔ آدم اور حوا کی نسل سے جو لوگ پیدا ہوئے، وہ کئی نسل تک شریعتِ آدم پر قائم رہے، پھر دھیرے دھیرے اُن کے اندر بگاڑ پیدا ہوا اور تقریباً تمام نسل شرک میں مبتلا ہوگئی۔ انھوں نے اپنے بڑوں (وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق، نسر) کو اپنا معبود بنالیا۔ پھر اسی علاقہ (میسو پوٹامیا) میں حضرت نوح پیدا ہوئے۔ انھوں نے لمبی مدت تک نسلِ آدم کو توحید کا پیغام دیا۔ مگر ان کی قوم کے بہت کم لوگ اُن پر ایمان لائے (11: 40)۔ بعض روایات کے مطابق، ایمان لانے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد 80 تھی۔ اُن کی قوم کے بقیہ تمام افراد اصرار کے ساتھ شرک پر قائم رہے۔

حضرت نوح نے اِسرار واعلان (71: 9) کی تمام صورتیں اختیار کیں۔ لیکن آخر کار اُن پر یہ واضح ہوا کہ معاشرے کی کنڈیشننگ (conditioning) اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ اب قوم کے اندر جو بچہ پیدا ہوگا، وہ آخر کار قوم ہی کے مذہب کو اختیار کرے گا۔ جب بگاڑ اِس حد تک پہنچ چکا تو اللہ نے یہ فیصلہ کیا کہ مومنینِ نوح کو بچا کر بقیہ قوم کو ہلاک کر دیا جائے۔

اُس وقت حضرت نوح نے اللہ کے حکم سے ایک بڑی کشتی بنائی۔ اِس کشتی میں ایمان لانے والے 80 مردوں اور عورتوں کو سوار کیا گیا۔ اِس کے بعد اُس علاقے میں ایک سیلاب آیا۔ یہ سیلاب اتنا بڑا تھا کہ اُس علاقے کی پہاڑیاں بھی پانی کے اندر ڈوب گئیں۔ حضرت نوح کی کشتی تیرتی ہوئی جودی پہاڑ پر رُکی (11: 44)۔ یہ واقعہ تقریباً 5 ہزار سال پہلے پیش آیا۔ اِس پہاڑ کا موجودہ نام ارارات (Mount Ararat) ہے۔ جدید دریافت کے مطابق، وہ مشرقی ترکی میں واقع ہے۔

کسی قوم کو عذاب دینے کا واقعہ تاریخ میں کئی بار پیش آیا ہے، لیکن ایک عظیم سیلاب کے ذریعے عذاب دینے کا واقعہ صرف ایک بار پیش آیا۔ یہ واقعہ بھی خدا کی طرف سے تاریخ کی تنظیم سے

تعلق رکھتا ہے۔ اِس بنا پر یہ ممکن ہوا کہ کشتی میں سوار اہلِ ایمان دور کے علاقے میں پہنچ جائیں۔ چناں چہ یہی بچے ہوئے اہلِ ایمان تھے جن کی وجہ سے دنیا کے مختلف حصوں میں انسان کی آبادیاں قائم ہوئیں۔ حضرت نوح کے زمانے تک انسان کی نسل صرف میسوپوٹامیا (عراق) کے محدود علاقے میں پائی جاتی تھی، لیکن طوفانِ نوح کے بعد انسان کی نسل زمین کے مختلف حصوں میں پھیل گئی۔

تاریخ کے دو دھارے

قرآن کے بیان کے مطابق، انسانی تاریخ کے آغاز ہی سے انسانی زندگی کے دو دھارے بن گئے— ایک، اتباعِ ابلیس کا دھارا، اور دوسرا، اتباعِ ملائکہ کا دھارا۔ زندگی میں ہمیشہ مثبت اور منفی دونوں قسم کے پہلو موجود ہوتے ہیں۔ اتباعِ ابلیس یہ ہے کہ آدمی مثبت پہلو کو نظر انداز کرکے منفی پہلو کو اختیار کرے۔ اس کے برعکس، اتباعِ ملائکہ یہ ہے کہ آدمی منفی پہلو کو نظر انداز کرکے مثبت پہلو پر فوکس کرے۔ پوری انسانی تاریخ اِسی دو قسم کے اتباع کی کہانی ہے۔ ایک روش کو اتباع ابلیس کا کلچر کہہ سکتے ہیں اور دوسری روش کو اتباعِ ملائکہ کا کلچر۔

خالق نے انسان کو مکمل آزادی دے دی ہے، خواہ اِس آزادی کی بنا پر بگاڑ کی وہ صورت پیدا ہوجائے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (30: 41)، مگر خالق نے انسان کی آزادی منسوخ نہیں کی، البتہ خالق نے اِس کا اہتمام کیا کہ اصل مقصدِ تخلیق میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ خالق نے انسان کو آزادی بھی دے دی ہے اور اِسی کے ساتھ وہ تاریخ کو اِس طرح مینج (manage) کررہا ہے کہ مجموعے کی سطح پر بگاڑ کے باوجود مطلوب افراد کی پیدائش کا سلسلہ برابر جاری رہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو تاریخ کی معنویت کو واضح کرتا ہے۔

تاریخ میں ایسے انسانوں کی مثالیں کم ہیں جنھوں نے اپنی آزادی کا صحیح استعمال کیا۔ زیادہ مثالیں وہ ہیں، جب کہ انسان نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا۔ بظاہر یہ تاریخ کی ایک منفی تصویر ہے، مگر اِس منفی تصویر کا بھی ایک مثبت پہلو ہے، وہ یہ کہ اِسی ماحول کے دوران وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جب کہ انسانوں کا امتحان لے کر مطلوب افراد کا انتخاب کیا جاسکے۔ مزید یہ کہ یہ نظام مطلق معنوں میں

شر نہیں ہے، بلکہ اس میں خیر کا بھی ایک پہلو پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ آزادی کی بنا پر جب ایسا ہوتا ہے کہ ہر آدمی اپنی اپنی سرگرمیاں جاری کرتا ہے تو اِس سے لوگوں کو طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگوں کو طرح طرح کے نقصانات پیش آتے ہیں۔ یہ سب گویا ایک طرح کا شاک ٹریٹمنٹ (shock treatment) ہوتا ہے۔ اِس طرح کے ناخوش گوار تجربات کی بنا پر افراد کے اندر وہ ذہنی سرگرمیاں جاری ہوتی ہیں جس کو نفسیات کی اصطلاح میں برین اسٹارمنگ (brain storming) کہا جاتا ہے— نفسیاتی مطالعے کے مطابق، یہی برین اسٹارمنگ ہر قسم کی ذہنی ترقیوں کا ذریعہ ہے۔

معتدل حالات میں آدمی بڑے بڑے کام نہیں کرتا۔ بڑے بڑے کام صرف اُس وقت کئے جاتے ہیں، جب کہ غیر معتدل حالات پیدا ہوں۔ غیر معتدل حالات کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر شدید قوتِ عمل جاگتی ہے۔ اس کے اندر شدید محرک (strong incentive) پیدا ہوتا ہے۔ یہی شدید محرک تمام بڑے بڑے واقعات کو رونما کرنے کا سبب ہے۔

مثلاً صلیبی جنگوں کے ذریعے وہ حالات پیدا ہوئے جن کے ذریعے اہلِ یورپ میں نیچر کی طاقتوں کی دریافت کا شدید جذبہ پیدا ہوا۔ پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں اِسی طرح کا شدید جذبہ پیدا ہوا، جس کے نتیجے میں ہوابازی (aviation) کو ترقی ہوئی۔ اِسی طرح دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں وہ شدید محرک پیدا ہوا جس کی بنا پر کمیونکیشن کو ترقی ہوئی، وغیرہ۔

نئی منصوبہ بندی

منصوبۂ تخلیق کے مطابق، یہ ممکن نہیں تھا کہ انسان کی آزادی کو منسوخ کیا جائے۔ اِس لیے اب اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں بالواسطہ طور پر ایک دخل دیا۔ اللہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک ایسا گروہ پیدا کیا جائے جو مذہب اور سیاسی اقتدار کو ایک دوسرے سے الگ کردے، تاکہ انسانی تاریخ اپنے صحیح رخ پر سفر کرسکے، بغیر اس کے کہ انسانی آزادی کو منسوخ کیا گیا ہو۔ اِس نئے منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کا مجموعہ خواہ آزادی کا صحیح استعمال نہ کرنے کی بنا پر غلط رخ پر چلتا رہے، لیکن پھر بھی افراد کو یہ موقع حاصل رہے کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق، صحیح مذہب کو اختیار کرسکیں۔

اِس نئے منصوبے کا آغاز چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم کے ذریعے ہوا۔ حضرت ابراہیم کا مقامِ عمل قدیم عراق تھا۔ یہاں اُس وقت مشرکانہ کلچر کا غلبہ تھا۔ حضرت ابراہیم نے لمبی مدت تک اُنھیں توحید کی دعوت دی، مگر وہ لوگ اپنی کنڈیشننگ کی بنا پر توحید کی فکر کو قبول نہ کرسکے، یہاں تک کہ انھوں نے حضرت ابراہیم کو قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اِس صورتِ حال کا تقاضا ہوا کہ حضرت ابراہیم اپنے مقامِ عمل کو بدل دیں۔ چناں چہ وہ اپنی اہلیہ ہاجرہ اور اپنے فرزند اسماعیل کو لے کر مکہ کے قریب آگئے جو اُس وقت صرف ایک ویران صحرا کی حیثیت رکھتا تھا۔

اِس صحرائی ماحول میں توالد وتناسل کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں وہ گروہ وجود میں آیا جس کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ صحرائی ڈی کنڈیشننگ کے ماحول میں ایک نئی قوم بنانے کا یہ عمل تقریباً ڈھائی ہزار سال تک جاری رہا۔ پھر بنو اسماعیل کے اِسی گروہ میں پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب پیدا ہوئے۔ پیغمبر اسلام کی 23 سالہ جدوجہد کے نتیجے میں یہ ہوا کہ بنو اسماعیل کے صالح افراد بڑی تعداد میں آپ کے گرد جمع ہوگئے، یہاں تک کہ وہ گروہ بنا جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

اصحابِ رسول کا زمانۂ عمل ساتویں صدی عیسوی ہے۔ اُن کے ذریعے منصوبہ خداوندی کے مختلف کام انجام پائے۔ مثلاً کتاب الٰہی (قرآن) کا محفوظ ہوجانا۔ دینِ خداوندی کا ایک عملی ماڈل قائم ہوجانا۔ دین خداوندی جو پچھلے انبیا کے زمانے میں زیادہ تر فکری مرحلے تک محدود تھا، وہ اب انقلابی مرحلے میں پہنچ گیا۔ اِن تبدیلیوں کی بنا پر یہ ممکن ہوگیا کہ پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ ختم کردیا جائے۔ تاریخ میں انفرادی پیغمبر کا دور ختم ہوجائے اور اجتماعی امت کا دور شروع ہوجائے، وغیرہ۔

اللہ کی خصوصی نصرت سے، اصحاب رسول کے ذریعے جو انقلابی کام انجام پایا، اُس کا ایک خاص پہلو وہ تھا جس کا ذکر قرآن کی اِس آیت میں کیا گیا ہے: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (8:39)۔ اِس آیت میں ’فتنہ‘ سے مراد وہ جارحانہ نظام ہے جو قدیم طرز کی شہنشاہیت (imperialism) کی سرپرستی میں قائم تھا۔ اِس شہنشاہی نظام نے ایک ایسا نظام قائم کررکھا تھا جو خدا کے تخلیقی منصوبے کی تنسیخ کے ہم معنی تھا، یعنی آزادیٔ فکر کا خاتمہ۔

اِس لیے خدا کو یہ مطلوب تھا کہ اِس جبری شہنشاہی نظام کو توڑ دیا جائے، تاکہ انسانی قافلے کے سفر میں کوئی مصنوعی رکاوٹ حائل نہ رہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں اِس جبری شہنشاہیت کے دو بڑے نمائندے تھے — ایک ساسانی ایمپائر (Sassanid Empire) اور دوسرے، رومن ایمپائر یا بازنطینی ایمپائر (Byzantine Empire)۔ یہ دونوں ایمپائر اتنا زیادہ طاقت ور تھے کہ اصحابِ رسول کے ذریعے ان کو مغلوب کرنا عملاً ناممکن تھا۔ عین اُس زمانے میں ایک معاون واقعہ پیش آیا، یعنی دونوں سیاسی چٹانوں کے درمیان باہمی ٹکراؤ۔ چناں چہ دونوں ایمپائر ایک دوسرے سے لڑ گئے۔ پہلے ساسانی ایمپائر نے رومن ایمپائر کو تباہ کیا، اس کے بعد رومن ایمپائر نے ساسانی ایمپائر کا زور توڑ دیا۔ اِس کے بعد یہ ممکن ہوگیا کہ خدائی منصوبے کے مطابق، اصحابِ رسول اُن کو مغلوب کرسکیں۔ یہ تاریخی واقعہ پیشگی طور پر منصوبۂ الٰہی میں مقدر کردیا گیا تھا۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کی طرف بائبل میں پیشین گوئی کے طور پر ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا تھا — اُس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہوگئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہوگئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے (*Habakkuk*, 3: 6)۔

یہ ساتویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔ اِس کے بعد یہ ہوا کہ اہلِ اسلام کو وہ سیاسی غلبہ حاصل ہوگیا جو اس سے پہلے صرف اُن سیاسی نظاموں کو حاصل تھا جو مشرکانہ کلچر کی سرپرستی کرتے تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی غلبہ کے تحت تاریخ میں ایک نیا عمل (process) شروع ہوا۔ اِس عمل کا نشانہ تھا — فطرت (nature) کو موضوعِ تحقیق (object of investigation) بنانا، جو اَب تک انسان کے لیے صرف موضوعِ پرستش (object of worship) بنی ہوئی تھی۔ انسان کو مکمل آزادی عطا کرکے اس کے لیے ذہنی ارتقا کا راستہ کھولنا، فطرت میں چھپے ہوئے اُن وسائل کو وقوع میں لانا جو عالمی دعوت کو ممکن بنانے والے ہوں، وغیرہ۔

انسانی آزادی کی بنا پر اِس دنیا میں تمام واقعات اسباب کے ماحول میں پیش آتے ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان علمی تحقیق کا کام خاص طور پر عباسی دور میں شروع ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ ایشیا اور افریقہ کے بڑے رقبے میں مسلمانوں کی عظیم سلطنت قائم ہوچکی تھی۔ اِس بنا پر علمی تحقیق کی طرف

مسلمان صرف جزئی طور پر متوجہ ہو سکے۔ مسلمانوں کی توانائی کا بڑا حصہ سیاسی سرگرمیوں میں لگا ہوا تھا۔ ان کی توانائی کا صرف محدود حصہ علمی تحقیق کے میدان میں صرف ہو رہا تھا۔ یہ تناسب ناکافی تھا۔ علمی تحقیق کا یہ کام بہت بڑا کام تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مسلمان اپنی طاقت کو پوری یکسوئی کے ساتھ علمی تحقیق کے میدان میں وقف کردیں۔ مگر سیاسی اقتدار اِس قسم کی علمی یکسوئی میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

اِس کے برعکس، صلیبی جنگوں کے بعد علمی تحقیق کا کام جب یورپ کی مسیحی قوموں میں شروع ہوا تو سیاسی اقتدار اُن کے لیے رکاوٹ نہ بن سکا، کیوں کہ عملاً وہ اُن کے پاس موجود ہی نہ تھا۔ چناں چہ مسیحی قوموں کے اعلیٰ ذہن بڑی تعداد میں علمی تحقیق کے میدان میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے پوری یکسوئی کے ساتھ علمی تحقیق کا کام شروع کردیا۔

یہ بھی انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ کو مینج (manage) کرنے کا معاملہ تھا۔ جب خالق نے دیکھا کہ مسلم دنیا کے حالات علمی تحقیق کو زیادہ بڑے پیمانے پر انجام دینے میں رکاوٹ بن رہے ہیں، تو اُس نے علمی تحقیق کے کام کو مسلم دنیا سے نکال کر مسیحی دنیا کی طرف منتقل کردیا، جہاں اِس قسم کی رکاوٹ والے اسباب موجود نہیں تھے۔

مشرق سے مغرب کی طرف

اسلام کا آغاز 610 عیسوی میں ہوا۔ حالات کی موافقت کی بنا پر اس کی توسیع اتنی تیز رفتاری کے ساتھ ہوئی کہ 50 سال کے اندر اہلِ اسلام کا ایک ایمپائر قائم ہوگیا۔ اب یہ مطلوب تھا کہ امتِ محمدی تسخیرِ فطرت اور سماجی انقلاب کے وہ مطلوب کام انجام دے جس کے لیے اُس کو سیاسی غلبہ عطا کیا گیا تھا۔ مگر مسلمان بہت جلد آپس کے سیاسی ٹکراؤ میں مشغول ہو گئے اور مطلوب کام کی طرف وہ زیادہ پیش قدمی نہ کرسکے۔

اب خدائی منصوبے کے مطابق، تاریخ میں وہ واقعہ پیش آیا۔ جس کو قرآن کی سورہ محمد میں استبدالِ قوم (47: 38) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ استبدال (replacement) کا مطلب یہ تھا کہ مذکورہ منصوبے کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کے بجائے ایک اور قوم کو کھڑا کرنا۔ صلیبی جنگوں (Crusades)

کے ذریعے استبدال کا یہی معاملہ پیش آیا۔

خلیفہ ثانی عمر فاروق کے زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ مسلمانوں نے فلسطین کو مسیحیوں سے چھین لیا اور اُس پر اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ فلسطین مسیحی قوموں کے لیے ایک مقدس سرزمین (holy land) کی حیثیت رکھتا تھا۔ چناں چہ مسیحی قومیں اِس قبضے کو کبھی قبول نہ کرسکیں۔ یہ نزاع باقی رہی، یہاں تک کہ یورپ کی مسیحی سلطنتوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ فوجی کارروائی کے ذریعے وہ شام اور فلسطین کے علاقے کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیں۔

صلیبی جنگوں کا یہ سلسلہ 1095 ء میں شروع ہوا۔ تقریباً 200 سال کے اندر دونوں قوموں کے درمیان وقفے وقفے سے 9 بارخوں ریز لڑائیاں ہوئیں، مگر یورپ کی مسیحی سلطنتوں کی متحدہ کوشش کے باوجود اُن کو زبردست ناکامی ہوئی۔ اِس کے بعد وہ اِس نتیجے پر پہنچے کہ مسلّح جنگ کے ذریعے مسلمانوں کو شکست دینا اُن کے لیے ممکن نہیں۔ چناں چہ مسیحی قوموں میں ایک نیا ذہن شروع ہوا۔ اس نئی جدوجہد کا نام اسپریچول کروسیڈ (spiritual crusades) تھا۔ اسپریچول کروسیڈ سے مراد دراصل انٹلکچول کروسیڈ (intellectual crusades) تھا۔ چناں چہ مسیحی قوموں نے اب اپنی کوششوں کو علمی ترقی کی طرف موڑ دیا۔ یونانی فلسفیوں اور مسلم فلسفیوں کی کتابوں کے ترجمے وسیع پیمانے پر لاتینی زبان میں کئے جانے لگے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ یورپ میں تعلیم اور علمی رسرچ کی سرگرمیاں بڑے پیمانے پر جاری ہوئیں۔ چناں چہ اِس کی دو مثالیں یہ ہیں کہ ''اسپریچول کروسیڈ'' کے سینٹر کے طور پر 1096 میں برطانیہ میں آکسفورڈ یونی ورسٹی قائم ہوئی اور 1209 میں کیمبرج یونی ورسٹی قائم کی گئی، وغیرہ۔

اس کے بعد چودھویں صدی اور سولھویں صدی عیسوی کے درمیان یورپ میں وہ انقلاب آیا جس کو نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔ اب اسپریچول کروسیڈس نے مزید ترقی کر کے نیچرل کروسیڈس (natural crusades) کی حیثیت اختیار کرلی۔

مغرب میں اسپریچول کروسیڈ اور نیچرل کروسیڈ ابتداءً منفی ذہن کے تحت پیدا ہوئی۔ مغربی قوموں کو

جس چیز نے ابتداءً متحرک کیا تھا، وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے خلاف ہتھیار کے میدان میں ہاری ہوئی جنگ کو دوبارہ علم کے میدان میں کامیاب بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ مغرب کی اس منفی نفسیات کو محرک (incentive) کے طور پر استعمال کیا۔ اللہ نے اہلِ مغرب کو اِس کا ذریعہ بنایا کہ وہ نیچر میں چھپے ہوئے اسرار کو دریافت کریں اور ایک ایسی دنیا وجود میں لائیں جو اسلامی مشن کے لیے تائید کا ذریعہ ثابت ہو۔

اہلِ مغرب کے ذریعے یہ تائیدی واقعہ جو اپنی پوری صورت میں بیسویں صدی میں ظہور میں آیا، اس کی پیشگی خبر قرآن کی ایک آیت میں دی گئی تھی: سَنُرِیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ (41: 53) یعنی مستقبل میں ہم اُن کو اپنی آیات دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی۔ یہاں تک کہ اُن کے اوپر یہ آشکارا ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے۔

اہلِ مغرب کے اِس رول کا تذکرہ حدیث میں بھی بطور پیشین گوئی موجود ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: إن اللہ لیؤیّد هذا الدین بالرجل الفاجر (صحیح البخاري، رقم الحدیث: 3062) یعنی اللہ اِس دین کی تائید فاجر انسان کے ذریعے بھی کرے گا۔

اِس حدیث میں 'فاجر' کا لفظ سیکولر کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِن سیکولر مؤیدین سے مراد مغربی دنیا کے وہ لوگ ہیں جن کی کوششوں سے جدید تہذیب (modern civilization) وجود میں آئی اور اس کے ذریعے آفاق وانفس کی آیات دریافت ہوئیں۔ اہلِ مغرب کے اندر انتقام کی جو نفسیات پیدا ہوئی، وہ فطری طور پر نہایت شدید تھی۔ اِس شدید محرک کو اللہ نے رموزِ فطرت کی دریافت کے لیے استعمال کیا۔

رموزِ فطرت کی دریافت کا یہ کام ایک بے حد مشکل کام تھا۔ اُس میں اپنے آپ کو ڈیڈی کیٹ (dedicate) کرنے کے لیے نہایت شدید محرک (strong incentive) درکار تھا۔ صلیبی جنگوں میں اہلِ مغرب کی توہین آمیز شکست (humiliating defeat) نے اُن کے اندر یہی شدید محرک پیدا کیا۔ اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں برطانیہ کی ایک سائنٹفک ٹیم نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ انٹارکٹکا (Antarctica) کی دریافت کریں۔ یہ ایک نہایت جان جوکھم کا کام تھا۔

ٹیم کے سربراہ سر ارنسٹ شیکلٹن (Sir Ernest Shackleton) نے 1900ء میں لندن کے اخبار ٹائمس (*The Times*) میں ایک اشتہار چھپوایا۔ اس کے الفاظ یہ تھے:

"Men wanted for hazardous journey. Small wages, bitter cold, long months of complete darkness, constant dangers, safe return doubtful. Honour and recognition in case of success."

یعنی ایک پرخطر سفر کے لیے آدمی درکار ہیں۔ بہت کم معاوضہ، شدید ٹھنڈک، لگاتار تاریکی کے لمبے مہینے، مسلسل خطرہ، محفوظ واپسی مشتبہ، کامیابی کی صورت میں عزت اور اعتراف۔

یہ اشتہار جب ٹائمس میں چھپا تو اس میں شرکت کے لیے اتنے زیادہ افراد کی درخواستیں آئیں کہ سلیکشن (selection) کی بنیاد پر اُن میں سے صرف منتخب افراد کو لیا گیا— یہی وہ مجنونانہ اسپرٹ تھی جس نے اہلِ مغرب کو یہ موقع دیا کہ وہ جدید دور کو وجود میں لاسکیں۔

فطرت کا ایک قانون

اہلِ مغرب، اصلاً خدائی دین کے مؤید کے طور پر ابھرے تھے، لیکن ردعمل کی نفسیات کی بنا پر موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے اِس خدائی منصوبے کو نہیں سمجھا۔ انھوں نے غیر ضروری طور پر اہلِ مغرب کو اپنا دشمن سمجھ لیا اور اُن سے لڑنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی دوسو سالہ تاریخ اِس غیر ضروری لڑائی میں ضائع ہوگئی۔ تاریخ کے اِس ارتقائی سفر کو جاری رکھنے کے لیے ہمیشہ ایک قائد درکار ہوتا ہے۔ اہلِ مغرب اِسی قسم کے ایک قائد تھے۔ اِس سے پہلے اہلِ اسلام کو قیادت کا یہ موقع ملا تھا۔ موجودہ زمانے میں منصوبۂ الٰہی کے تحت یہ موقع اہلِ مغرب کے حصے میں آیا۔

ساتویں صدی عیسوی میں اصحاب رسول جب ایران میں داخل ہوئے تو اہلِ ایران اُن سے خائف ہوگئے۔ انھوں نے اصحابِ رسول کے طاقت ور داخلے کو دیکھ کر کہا: دیواں آمدند، دیواں آمدند (دیو آگئے، دیو آگئے)۔ اہلِ ایران نے اصحابِ رسول کے داخلے کو منفی معنوں میں لیا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ ایک نئی تہذیب کے نقیب (harbinger) تھے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار ایک صحابی رسول ربعی بن عامر نے ایران کے سپہ سالار رستم سے گفتگو

کرتے ہوئے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا: اللّٰہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد إلی عبادۃ اللّٰہ (البدایۃ والنہایۃ، 7/46) یعنی اللہ نے ہم کو بھیجا ہے، تاکہ وہ جس کو چاہے، ہم اُس کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی عبادت کی طرف لے آئیں۔

ساتویں صدی میں اٹھنے والے اصحاب رسول کی اصل حیثیت یہی تھی کہ وہ اُس زمانے میں ایک نئے دور کے نقیب تھے۔ یہ فطرت کا اصول ہے کہ جو گروہ نئے دور کا نقیب بن کر ابھرتا ہے، اس کو دوسروں کے اوپر قیادت (leadership) کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے۔ یہ قیادت کسی سازش یا دشمنی کے سبب وجود میں نہیں آتی، بلکہ وہ فطرت کے لازمی تقاضے کے طور پر وجود میں آتی ہے۔

یہی معاملہ موجودہ زمانے میں اہلِ مغرب کے ساتھ پیش آیا۔ اہلِ مغرب اصلاً ایک نئی تہذیب کے نقیب (harbinger) تھے۔ لیکن فطری تقاضے کے طور پر مزید یہ ہوا کہ اُن کو اپنی ہم عصر قوموں کے اوپر قیادت حاصل ہوگئی۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ وہ اہلِ مغرب کی اس قیادت کو ایک فطری واقعہ سمجھ کر قبول کرلیں، جیسا کہ اِس سے پہلے دنیا کی قوموں نے مسلم قیادت کو قبول کرلیا تھا۔ مگر موجودہ زمانے کے مسلمان اِس راز کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کو دشمنی اور سازش کا کیس قرار دے دیا۔ وہ اُن سے نفرت کرنے لگے، یہاں تک کہ ہر جگہ وہ اُن سے لڑنے لگے۔ یہ لڑائی جو جہاد کے نام پر کی گئی تھی، وہ قانونِ فطرت کے خلاف تھی، اِس لیے وہ غیر معمولی قربانیوں کے باوجود مکمل طور پر ناکام ثابت ہوئی۔

اِس ناکامی کی ذمے داری مکمل طور پر خود مسلمانوں کے اوپر ہے۔ مسلمانوں نے اہلِ مغرب کے خلاف جو جنگ چھیڑی، وہ اُن کے خیال کے مطابق، اہلِ مغرب کے خلاف جنگ تھی، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ منصوبۂ الٰہی کے خلاف جنگ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جنگ مکمل طور پر ناکام ہوئی، اُس کا انجام اِس کے سوا کچھ اور نہیں نکلا کہ مسلمانوں کی تباہی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

خلافتِ آدم

قرآن کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے جب آدم (انسانِ اول) کو پیدا کیا، اُس وقت آدم کے علاوہ

دو اور مخلوقات تھیں — جن اور ملائکہ۔ اللہ تعالیٰ نے جن اور ملائکہ سے کہا کہ تم آدم کے آگے جھک جاؤ۔ اُس وقت فرشتے آدم کے سامنے جھک گئے، لیکن جنات کا سردار ابلیس نہیں جھکا۔ ابلیس نے کہا کہ میں آدم سے برتر ہوں، کیوں کہ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے۔

ایسا کیوں ہوا۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین بنائی تو پہلے اس کو جنات کے چارج میں دے دیا۔ مگر جنات نے سرکشی کی اور باہم لڑکر فساد برپا کیا۔ اِس طرح جنات زمین کا انچارج بننے کے لیے نااہل ہو گئے۔ اِس کے بعد اللہ نے جنات کو معزول کر دیا اور ان کی جگہ انسان کو پیدا کر کے زمین کو انسان کے چارج میں دے دیا۔ اِس تبدیلی کو جنات نے قبول نہیں کیا، اس لیے جنات کے سردار ابلیس نے آدم کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان سے پہلے جنات کو پیدا کیا تھا (15:27)۔ اِس لحاظ سے انسان زمین پر جنات کا جانشین، یعنی خلیفۃ الجن ہے۔ کچھ لوگ خلافت کی آیت (إني جاعل فی الأرض خلیفة) سے یہ نظریہ اخذ کرتے ہیں کہ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ (خلیفۃ اللہ) ہے۔ یہ نظریہ بلاشبہہ ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔ قرآن اور حدیث میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں۔

انسان کو زمین میں خلیفہ بنانے کا مطلب کیا ہے، اِس کو قرآن کی دوسری آیتوں کے مطالعے سے سمجھا جاتا ہے۔ یہاں اِس قسم کی دو آیتوں کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

1- ’’کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی نشانیوں کو لکھنے کے لیے روشنائی ہو جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا، اِس سے پہلے کہ میرے رب کہ باتیں ختم ہوں، اگر چہ ہم اس کے ساتھ اِسی کے مانند اور سمندر ملا دیں‘‘ (15: 109)

2- ’’اور اگر زمین میں جو درخت ہیں، وہ قلم بن جائیں اور سمندر سات مزید سمندروں کے ساتھ روشنائی بن جائیں، تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں۔ بے شک اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے‘‘۔ 31:27

قرآن کی اِن آیتوں میں جن لامحدود کلماتِ الٰہی کا بیان ہے، وہ صرف بطور خبر نہیں ہے، بلکہ وہ

بطورانشاء ہے۔ اِن آیتوں میں اشارۃً یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ کو یہ مطلوب ہے کہ کائنات میں چھپے ہوئے اِن کلمات کو دریافت کیا جائے اوران کو ''قلم'' سے لکھا جائے، تاکہ انسان اللہ کی عظمتوں سے واقف ہواوراعلیٰ درجۂ معرفت کے ساتھ الحمدللہ کہہ سکے۔

اللہ کے منصوبے کے مطابق، کلمات اللہ کی دریافت (discovery) اوران کو قلم بند کرنے کا پراسس (process) موجودہ دنیا میں شروع ہوتا ہے اورآخرت میں دوبارہ جاری رہ کروہ تکمیل کے منازل طے کرتا ہے۔ موجودہ دنیا میں اِس عمل کے ذریعے ظہور میں آنے والے واقعے کا نام انسانی تہذیب (human civilization) ہے۔ جدید انسانی تہذیب اپنی نوعیت کے اعتبار سے، دراصل، فطرت (nature) میں چھپے ہوئے کلماتِ الٰہی کو دریافت کرنے ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ عمل ابتدائی طور پر اِسی دنیا میں انجام پاچکا ہے اور اِسی کا نام جدید تہذیب ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن کی اِس آیت میں پیشگی طور پر کیا گیا ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41: 53)۔

کلمات اللہ کے اِس دنیوی اظہار کا کام زیادہ تر سیکولر اہلِ علم نے کیا ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کا ذکر ایک حدیث رسول میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: إن اللہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 3062)۔ اِس حدیث میں، ''رجل فاجر'' سے مراد موجودہ زمانے کے سیکولر اہلِ علم ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے غیر معمولی محنت کے ذریعے جدید تہذیب کو وجود دیا ہے جو کہ ''کلمات اللہ'' کی جزئی انفولڈنگ (unfolding) کے ہم معنی ہے۔

کلمات اللہ لامحدود ہیں اور موجودہ دنیا کے امکانات محدود۔ اِس لیے موجودہ دنیا میں کلمات اللہ کی انفولڈنگ صرف محدود طور پر ہی ہوسکتی ہے۔ کلمات اللہ کی کامل انفولڈنگ کے لیے ایک اور وسیع تر دنیا درکار ہے۔ اِسی وسیع تر دنیا کا نام آخرت ہے۔ آخرت میں یہ ہوگا کہ پوری انسانی تاریخ سے، لائق افراد منتخب کیے جائیں گے اور اِن منتخب افراد کو آخرت کی ابدی دنیا میں بسایا جائے گا۔ وہاں یہ منتخب افراد کلمات اللہ کی مزید انفولڈنگ کا کام انجام دیں گے۔

یہ انفولڈنگ ابد تک جاری رہے گی، وہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ آخرت میں کلمات اللہ کی انفولڈنگ کے ذریعے ایک برتر تہذیب وجود میں آئے گی۔ اِس کو خدائی تہذیب (divine civilization) کہا جاسکتا ہے۔ کلمات اللہ کی اِس لامحدود انفولڈنگ کو قرآن میں: **وأشرقت الأرض بنور ربها** (39: 69) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

قرآن کی پہلی سورہ کی پہلی آیت یہ ہے: **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** ۔ یہ حمد خداوندی کا ابتدائی درجہ ہے جو موجودہ دنیا میں کلمات اللہ کی جزئی انفولڈنگ کے دوران ادا ہوگا۔ ٹھیک یہی کلمہ (**اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ**) قرآن کی سورہ الزمر میں آیا ہے (39: 75)۔ سورہ الفاتحہ میں حمد خداوندی کے اُس درجے کا بیان تھا جو کہ دنیا میں کلمات اللہ کی ابتدائی انفولڈنگ کے وقت ادا ہوا۔ اور سورہ الزمر میں اُس حمد خداوندی کا ذکر ہے جو کہ آخرت میں کلمات اللہ کی انتہائی انفولڈنگ کے وقت اہلِ جنت کی زبان سے ادا ہوگا۔

موجودہ دنیا وہ جگہ تھی جہاں انسان کو تمام چیزیں بقدر ضرورت دی گئی تھیں (14: 34)۔ آخرت کی جنت وہ جگہ ہوگی جہاں اس کے باشندوں کو تمام اعلیٰ نعمتیں درجۂ اشتہا (41:31) میں حاصل ہوں گی۔ آخرت کی جنت میں یہ تمام نعمتیں اس کے باشندوں کو خدائی میزبانی (divine hospitality) کے طور پر حاصل ہوں گی۔

آخرت میں اہلِ جنت کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ یہ ہوگا کہ وہ لامحدود کلمات اللہ کی بقیہ انفولڈنگ کریں اور ایک برتر تہذیب (super civilization) کو وجود میں لائیں۔ کلمات اللہ کی انفولڈنگ کا یہ کام ابد تک جاری رہے گا۔ اس لیے اہلِ جنت کا دورِ مسرت بھی ابد تک جاری رہے گا، وہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

اسلام کی تاریخ

خدا نے انسان کو مکمل آزادی دی ہے۔ اِسی کے ساتھ خدا عام تاریخ کو نیز اسلامی تاریخ کو مینج (manage) کررہا ہے، تاکہ تخلیق کا خدائی مقصد یقینی طور پر حاصل ہوتا رہے۔ خدائی سنت

کے مطابق، اس مینج مینٹ کی تکمیل ہمیشہ کچھ افراد کے ذریعے ہوتی ہے۔ اِس خدائی مینج مینٹ کی چار بڑی صورتیں ہیں:

1- ادارتی رول (institutional role)

2- انقلابی رول (revolutionary role)

3- علمی رول (academic role)

4- انفرادی رول (individual role)

ادارتی رول کی ایک معلوم تاریخی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ انھوں نے تقریباً چار ہزار سال پہلے مکہ میں کعبہ (بیت اللہ) کی تعمیر کی۔ یہ کعبہ گویا کہ مذہبِ توحید کا ایک ادارتی مرکز (institutional centre) ہے۔ کعبہ سارے عالم کے موحدین کا مرکز ہے اور قیامت تک وہ موحدین کا مرکز بنا رہے گا۔

خدا کے دین کی لمبی تاریخ میں پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم (وفات: 632ء) کا رول ایک انقلابی رول ہے۔ آپ نے تاریخ انسانی کو ایک نئے دور میں داخل کیا۔ اِس انقلابی عمل میں صحابہ اور تابعین کا رول مددگار رول (supporting role) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس انقلاب کے اثرات تاریخ میں آج تک جاری ہیں اور قیامت تک جاری رہیں گے۔

علمی رول یا اکیڈمک رول کی حیثیت سے محدثین کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ محدثین نے یہ کیا کہ انھوں نے دینِ خداوندی کے دوسرے مستند ماخذ حدیثِ رسول کو اِس طرح مدوّن کردیا کہ وہ بعد کی تمام نسلوں کے لیے خدا کے رسول کی رہنمائی کو جاننے کا قابلِ اعتبار ماخذ بنا۔ ابتدائی دور کے ان محدثین کا زمانہ نویں صدی عیسوی ہے۔

انفرادی رول کی حیثیت سے نمایاں نام اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیز (وفات: 720ء) کا ہے۔ وہ 717 عیسوی میں بنوامیہ کے خلیفہ منتخب ہوئے جن کا دار السلطنت دمشق تھا۔ ان کی خلافت کی مدت صرف ڈھائی سال ہے۔ انھوں نے اِس مختصر مدت میں ایک بہت بڑا تجدیدی کام کیا، مگر اُن کا

یہ رول ایک انفرادی رول تھا جو اُن کی زندگی تک باقی رہا اور ان کی وفات پر عملاً ختم ہوگیا۔

مذکورہ چار تاریخی ماڈل میں ابتدائی تین ماڈل صرف ایک بار کے لیے تھے۔ بعد کی نسلوں کے لیے یہ رہنمائی حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، لیکن اب ان کا اعادہ ممکن نہیں۔ البتہ چوتھا رول (انفرادی رول) بدستور جاری ہے۔ بعد کی نسلوں میں بھی یہ ممکن ہے کہ اُن کے درمیان کوئی فرد اٹھے اور اپنے حالات کی نسبت سے کوئی مطلوب انفرادی رول ادا کرے۔ مگر اصلاً یہ ایک شخص کا رول ہوگا جو عملاً اس کی شخصی زندگی تک جاری رہے گا اور اس کے بعد ختم ہوجائے گا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی پہلو سے اس کا اثر حسب حالات بعد کے زمانے میں بھی باقی رہے۔

واضح ہو کہ اگر اس قسم کا کوئی فرد اپنے زمانے میں ایک تنظیم بنائے اور وہ تنظیم اس کی وفات کے بعد باقی رہے تو یہ تنظیم اس فرد کے رول کے استمرار (continuation) کے ہم معنی ہوگی، بلکہ وہ ایک ایسے ڈھانچہ کے استمرار کے ہم معنی ہوگا جو متوفیٰؒ کے نام پر اس کے بعد بھی جاری رہے گا۔ ایسی کوئی تنظیم بعد کو اگر باقی رہتی ہے تو وہ کسی مادی بنیاد پر باقی رہتی ہے، نہ کہ مشن کی اصل اسپرٹ کی بنیاد پر۔

اخوانِ رسول کا رول

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت حدیث کی کتابوں میں اِس طرح آئی ہے: وددتُ أنا قد رأینا إخواننا، قالوا: أولسنا إخوانك یا رسول اللہ، قال: أنتم أصحابي، وإخواننا الذین لم یأتوا بعد (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 249) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ ہم اپنے اخوان (بھائیوں) کو دیکھیں۔ صحابہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا ہم آپ کے اخوان نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم میرے اصحاب ہو، ہمارے اخوان وہ ہیں جو ابھی نہیں آئے۔

مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں دو اہم رول مقدر تھے — ایک، اصحابِ رسول کا رول، اور دوسرے، اخوانِ رسول کا رول۔ اصحابِ رسول کا رول یہ تھا کہ وہ انسانی تاریخ میں ایک نئے عمل (process) کا آغاز کریں، ایک ایسا عمل جب کہ قدیم دور ختم ہو اور ایک نیا دور نئے مواقع

اور نئے امکانات کے ساتھ ظہور میں آئے۔ اِس بات کو سمجھنے کے لیے اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ پہلے دور سے مراد روایتی دور ہے، اور دوسرے دور سے مراد سائنٹفک دور۔

اصحاب رسول اور اخوانِ رسول دونوں ہی کا نشانہ ایک ہوگا اور وہ ہے دعوت الی اللہ۔ اِس دعوت الی اللہ کے دو بڑے دور ہیں — ایک ہے عالمی کمیونکیشن سے پہلے کا دور۔ دوسرا ہے، عالمی کمیونکیشن کے بعد کا دور۔ اصولی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عالمی کمیونکیشن کے ظہور سے پہلے جو مواقع تھے، اصحابِ رسول نے اُن کا بھرپور استعمال کیا۔ بعد کو عالمی کمیونکیشن کے زمانے میں جو مواقعِ دعوت پیدا ہوں گے، اُن کو جو لوگ بھرپور طور پر استعمال کریں، وہی وہ لوگ ہیں جن کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔ اخوانِ رسول کسی پراسرار گروہ کا نام نہیں۔

جنت کی دنیا

انسانی تاریخ ایک عورت اور ایک مرد سے شروع ہوئی، پھر لوگ پیدا ہوتے رہے اور مرتے رہے۔ اِس طرح یہ سلسلہ نسل درنسل ہزاروں سال سے قائم ہے۔ اکیسویں صدی کے رُبع اوّل میں پورے کرۂ ارض پر انسانوں کی تعداد سات بلین سے زیادہ ہوچکی ہے۔ اس سے پہلے جو لوگ مر گئے، وہ بھی معدوم نہیں ہوئے، بلکہ وہ آخرت کی دنیا میں بدستور زندہ موجود ہیں۔

جس طرح انسانی تاریخ کا ایک آغاز ہے، اُسی طرح اس کا ایک اختتام بھی ہے۔ انسانی تاریخ کے خاتمے کے بعد ایک اور دنیا بنے گی۔ یہ دنیا کامل معنوں میں ایک معیاری دنیا ہوگی۔ اِس معیاری دنیا میں پوری تاریخ کے منتخب افراد آباد کئے جائیں گے۔ قرآن میں اِس حقیقت کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (21: 105) یعنی زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

یہ حقیقت پچھلی آسمانی کتابوں میں بھی بیان ہوئی ہے۔ موجودہ بائبل میں اِس سلسلے میں یہ الفاظ آئے ہیں — بدی کو چھوڑ دے اور نیکی کر اور ہمیشہ تک آباد رہ، کیوں کہ خداوند انصاف کو پسند کرتا ہے اور وہ اپنے مقدسوں کو ترک نہیں کرتا، وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں، پر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔

صادق زمین کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ آباد رہیں گے:

Depart from evil, and do good; And dwell forevermore. For the Lord loves justice, And does not forsake His saints; They are preserved forever, But the descendants of the wicked shall be cut off. The righteous shall inherit the land, and dwell in it forever. (Psalm 37: 27-29)

قرآن کی بہت سی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں کیسا معیاری ماحول ہوگا اور وہاں ہر قسم کے اعلیٰ سامان وافر مقدار میں موجود ہوں گے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا (76:20) یعنی تم جہاں دیکھو گے، وہیں عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے:

Wherever you look, you will see bliss and a great kingdom.

جنت میں اہلِ جنت کے لیے جو اعلیٰ انتظامات ہوں گے، اُن کا خلاصہ قرآن کے اِن الفاظ میں بیان کردیا گیا ہے نعیم، اور ملکِ کبیر۔ نعیم سے مراد ہر قسم کی نعمتیں (blessings) ہیں۔ انسان جو کچھ چاہے گا، وہ سب وہاں اُس کے لیے کامل صورت میں موجود ہوگا (41: 32)۔ ملکِ کبیر سے مراد مکمل آزادی ہے، یعنی کسی بھی قسم کی پابندی کے بغیر زندگی گزارنے کا موقع حاصل ہونا۔ اِس مکمل آزادی کی نعمت اُن خوش قسمت افراد کو حاصل ہوگی جنھوں نے موجودہ دنیا میں یہ ثبوت دیا تھا کہ وہ آزادی کے باوجود اپنی آزادی کا صرف صحیح استعمال کرنے والے ہیں۔

جنت کی وسعتوں کو بتاتے ہوئے قرآن میں یہ بات آئی ہے: وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (3: 133) یعنی دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اُس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی طرح ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک اور آیت کے الفاظ یہ ہیں: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (39: 74) یعنی اہلِ جنت کہیں گے کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنادیا،

ہم جنت میں جہاں چاہیں، مقام کریں۔ پس کیا خوب بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔

جنت کی یہ وسعت موجودہ زمانے میں ایک قابلِ فہم واقعہ بن چکی ہے۔ جدید دوربینوں کے مشاہدے سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ کائنات کی وسعتوں میں ایسے قابلِ آباد کاری سیارے (habitable planets) بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ صرف ہماری کہکشاں (Milky Way) کے اندر کئی بلین کی تعداد میں اِس طرح کے سیارے موجود ہیں۔

اِس نئی دریافت کو لے کر غور کیا جائے تو جنت کے بارے میں عجیب قسم کا پُر اہتزاز تصور (thrilling concept) معلوم ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالباً جنت بے شمار ہرے بھرے سیاروں کا ایک کائناتی مجمع الجزائر (universal archipelago) ہے۔ تمام جزیرے اپنی اپنی جگہ پر مکمل دنیائیں ہیں۔ اِسی کے ساتھ وہ انتہائی اعلیٰ قسم کے کمیونکیشن کے ذریعے باہم جڑے ہوئے ہیں۔ آخرت کے دور میں شاید ایسا ہوگا کہ ہر جنتی کو زندگی گزارنے کے لیے مستقل دنیائیں حاصل ہوں گی۔ اِسی کے ساتھ وہ دوسرے جنتی باشندوں سے معیاری کمیونکیشن کے ذریعے ہر لمحہ مربوط ہوگا۔ جنت میں ہر قسم کی نعمتیں بھی ہوں گی اور کامل آزادی بھی۔ اِسی کے ساتھ جنت گویا اعلیٰ انسانوں پر مبنی ایک کائناتی سماج ہوگا، جہاں ہر انسان کو کامل معنوں میں فل فل مینٹ (fulfilment) حاصل ہوگا۔

ابدی جنت کی یہ ناقابلِ بیان حد تک اعلیٰ نعمتیں اہلِ جنت کو تمام تر اور یک طرفہ طور پر اللہ کی رحمت کے ذریعے حاصل ہوں گی، لیکن اہلِ جنت کے اعزاز کے لیے اللہ کی طرف سے یہ اعلان کیا جائے گا کہ: وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيٓ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (43: 72) یعنی یہ وہ جنت ہے جس کے تم مالک بنادئے گئے ہو، اُس عمل کی وجہ سے جو تم کرتے تھے۔

قرآن کا تصورِ تاریخ

قرآن کے بارے میں ایک لمبی حدیث کتابوں میں آئی ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے: كتاب الله، فيه نبأ ما قبلكم، وخبر ما بعدكم (الترمذي، رقم الحديث: 2906) یعنی قرآن اللہ کی

کتاب ہے۔ اس میں تم سے پہلے کے لوگوں کی باتیں ہیں اور اس میں تمھارے بعد کے لوگوں کی خبریں ہیں۔ ایک صحابیِ رسول عبد اللہ بن مسعود نے قرآن کے بارے میں فرمایا: فيه علم الأوّلين والآخرين (البيهقي، شعب الإيمان، رقم الحديث: 1808) یعنی قرآن میں پچھلے لوگوں کا بھی علم ہے اور بعد کے لوگوں کا بھی علم ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن جامع معنوں میں انسانی نسلوں کی کوئی تفصیلی تاریخ ہے۔ اِس کا مطلب صرف یہ ہے کہ قرآن میں تاریخِ بشری کے نمائندہ واقعات موجود ہیں، یعنی ایسے تاریخی حوالے جن پر غور کرکے پورے دورِ تاریخ کی ایک جامع تصویر بنائی جاسکتی ہے۔

تاریخ کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ گزرے ہوئے واقعات کا سلسلہ وار بیان (chronicle) ہو۔ یہ تاریخ کا معروف مؤرخانہ تصور ہے۔ تاریخ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ تاریخی واقعات کو اِس اعتبار سے بیان کیا جائے کہ وہ خالق کے نقشۂ تخلیق کو بتانے والا ہو۔ تاریخ کے پہلے تصور میں تمام واقعات کا احاطہ مقصود ہوتا ہے۔ تاریخ کے دوسرے تصور میں تاریخ کے صرف منتخب اور نمائندہ اجزا بیان کئے جاتے ہیں۔

یہی دوسرا طریقہ قرآن کے تصورِ تاریخ کے مطابق ہے۔ مگر یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ تاریخ کے نمائندہ واقعات بھی قرآن میں مروّجہ تاریخی اسلوب میں نہیں ہوتے، وہ صرف حوالہ (reference) کے اسلوب میں ہوتے ہیں۔ اِس معاملے میں قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں جن تاریخی حوالوں کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ اشارے کی زبان میں ہوتے ہیں۔ یہ قاری کے اوپر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ایسا کرے کہ قرآن کے باہر جو تاریخی ریکارڈ موجود ہے، اُس سے ضروری اجزا لے کر وہ قرآن کے اشارات کی تفصیل کرے۔ وہ بظاہر غیر متعین زبان میں کہی ہوئی بات کو متعین اسلوب میں مدوّن کرے۔

اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت آدم کے بعد ان کی نسل میسوپوٹامیا (Mesopotamia) کے علاقے میں آباد ہوئی۔ یہ نسل شریعتِ آدم پر قائم تھی۔ بعد کے زمانے میں جب اُن کے اندر بگاڑ آیا تو تقریباً پانچ ہزار سال پہلے پیغمبر نوح پیدا ہوئے۔ انھوں نے لمبی مدت تک لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔ کچھ افراد نے آپ کی دعوت کو مانا، لیکن بیش تر افراد نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اِس کے بعد اس علاقے میں ایک بڑا طوفان آیا۔

اِس موقع پر ایمان لانے والے افراد ایک کشتی کے ذریعے بچا لئے گئے اور بقیہ تمام افراد ہلاک کر دئے گئے۔

اِس کشتی کے بارہ میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: فَأَنْجَيْنٰهُ وَأَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (29:15) یعنی پھر ہم نے نوح کو اور کشتی والوں کو بچا لیا۔ اور ہم نے اس کو دنیا والوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔ قرآن کی ایک اور آیت میں اس واقعے کا ذکر اِن الفاظ میں آیا ہے: وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (54:15) اِس آیت کا ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی نے اِن الفاظ میں کیا ہے— اور اس کو ہم نے رہنے دیا نشان کے لیے (We have left it as a sign)

حضرت نوح کا واقعہ ایک پورے دورِ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے جو حضرت آدم کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا ایک نمائندہ جُز کشتیٔ نوح (Noah's Ark) ہے۔ کشتیٔ نوح کے بارہ میں قرآن نے بتایا کہ اُس کو اللہ نے عبرت کے طور پر باقی رکھا ہے۔ ساتویں صدی کے ربع اول میں بوقتِ نزولِ قرآن کسی کو اِس کشتی کا علم نہ تھا۔ موجودہ زمانے میں گلوبل وارمنگ کے نتیجے میں پہاڑوں کے اوپر جمی ہوئی برف بڑے پیمانے پر پگھلنے لگی۔ اس کے بعد ہوائی سروے کے ذریعے یہ معلوم ہوا کہ ترکی کے مشرقی علاقے میں کوہِ ارارات (Mount Ararat) کے اوپر وہ کشتی برف کی موٹی تہ کے نیچے دبی ہوئی موجود تھی جو اکیسویں صدی میں سامنے آ گئی۔

قرآن میں کشتی نوح کا ذکر مختصر طور پر موجود تھا۔ اب بعد کو دریافت کردہ معلومات کی روشنی میں یہ ممکن ہو گیا کہ تاریخ بشری کے اس باب کو زیادہ تفصیل کے ساتھ مرتب کیا جائے اور اس کو قرآن کی تاریخی تفہیم کے لیے استعمال کیا جائے۔

اِس قسم کا ایک اور تاریخی حوالہ وہ ہے جو پیغمبر موسیٰ کے دورِ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ تقریباً تین ہزار سال پہلے مصر میں یہ واقعہ ہوا کہ پیغمبر موسیٰ کے معاصر بادشاہ فرعون کو خدا نے بحرِ قلزم (Red Sea) میں غرق کر دیا۔ اس کے بارے میں قرآن میں یہ آیت آئی ہے کہ بوقتِ غرق اللہ نے فرمایا: فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً (10:92) یعنی آج ہم تیرے بدن کو بچائیں گے، تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی بنے۔

فرعون کا یہ واقعہ بھی ایک پورے دورِتاریخ کی علامت ہے۔مگر ساتویں صدی عیسوی میں جب کہ قرآن نازل ہوا، یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی کہ فرعون کی لاش کہاں محفوظ ہے۔انیسویں صدی کے آخر میں یورپ کے کچھ مستشرقین نے دریافت کیا کہ مذکورہ فرعون کی لاش محفوظ حالت میں اہرامِ مصر میں موجود ہے۔ اب یہ لاش اہرامِ مصر سے نکال کر قاہرہ کے میوزیم میں رکھ دی گئی ہے۔ اِس واقعے کی تفصیل ڈاکٹر موریس بکائی کی کتاب (*The Bible, The Quran and Science*) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

قرآن نے انسانی تاریخ کا جو تصور دیا ہے، اس کے مطابق، ایسے علامتی واقعات قرآن میں موجود ہیں جن کو مزید معلوم تاریخ کے اضافے سے از اول تا آخر مدون کیا جاسکتا ہے۔قرآن میں پچھلی تاریخ کے بارے میں علامتی واقعات ملتے ہیں اور بعد کی تاریخ کے بارے میں ایسی پیشین گوئیاں موجود ہیں جو قیامت تک کی پوری تاریخِ انسانی کا احاطہ کررہی ہیں۔قرآن میں موجود اِن تاریخی حوالوں کی حیثیت صرف عنوانات کی ہے۔اِن عنوانات کی روشنی میں اگر دیگر حاصل شدہ معلومات کو شامل کیا جائے، تو اس کے ذریعے قرآن کے تصورِتاریخ کے مطابق، انسانی تاریخ کی پوری تصویر بنائی جاسکتی ہے۔

خلاصۂ کلام

مورخین کے یہاں مختلف قسم کے تاریخی تصورات پائے جاتے ہیں۔مثلاً خاندانی بادشاہت کے اعتبار سے تاریخ کی تدوین، قوموں کے عروج وزوال کے اعتبار سے تاریخ کی تدوین، مختلف تہذیبوں (civilizations) کے اعتبار سے تاریخ کی تدوین، وغیرہ۔ مگر خدائی تصورِ تاریخ (divine concept of history) اِس سے مختلف ہے۔خدائی تصورِتاریخ کیا ہے، اس کو قرآن کے مطالعے سے سمجھا جاسکتا ہے۔

خدائی تصورِتاریخ کے مطابق، اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔اس کے بعد انسان کو یہ موقع دیا کہ وہ توالد وتناسل کے ذریعے اپنی تعداد بڑھائے۔اس کی نسلیں کرۂ ارض (planet earth) کے مختلف حصوں میں آباد ہوں۔اللہ نے انسان کو مکمل آزادی عطا کی۔اللہ نے انسان کو یہ موقع دیا کہ خواہ وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرے یا وہ اس کا غلط استعمال کرے، وہ زمین میں اصلاح کرے یا وہ زمین میں

فساد برپا کرے، وہ اپنی زندگی کو عدل پر قائم کرے یا بے انصافی پر قائم کرے، حتی کہ انسان کو یہ بھی آزادی حاصل ہے کہ چاہے تو وہ اللہ کا اقرار کرے اور چاہے تو وہ اللہ کا انکار کر کے سرکش بن جائے۔ اللہ کے منصوبے کے مطابق، آزادی کی یہ صورتِ حال قیامت تک جاری رہے گی۔

اِس پورے تاریخی عمل کے دوران اللہ کا مطلوب صرف ایک ہے، اور وہ ہے صالح افراد کا انتخاب۔ یہ افراد وہ ہیں جو ہر قسم کے ہنگاموں کے باوجود اپنے آپ کو آزادی کے صحیح استعمال پر قائم رکھیں، جو اپنی ذہنی قوتوں کو استعمال کرتے ہوئے اور نبیوں کی ہدایت سے استفادہ کرتے ہوئے اللہ کو دریافت کریں اور اپنی زندگی کو ہدایتِ الٰہی کے مطابق بنائیں۔ اِسی قسم کے صالح افراد اللہ کو مطلوب ہیں۔ اللہ اپنے خصوصی انتظام کے تحت پوری تاریخ میں مسلسل طور پر ایسے ہی صالح افراد کا انتخاب کر رہا ہے۔

آدم سے لے کر قیامت تک کے پورے تاریخی عمل کے دوران اللہ کی سنت یہ ہے کہ انسان کی آزادی کو منسوخ نہ کیا جائے، البتہ انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ کو اِس طرح مینج (manage) کیا جائے کہ اللہ کا اصل مطلوب (صالح افراد کی پیداوار) کا عمل برابر جاری رہے۔

دوسرے مورخین تاریخ کو مجموعے کی صورت میں دیکھتے ہیں، جب کہ خدائی تصور کے مطابق، صحیح یہ ہے کہ تاریخ کو افراد کے اعتبار سے دیکھا جائے۔ انسانی مجموعے کو لے کر تاریخی رائے قائم کرنا مورخین کا طریقہ ہے، جب کہ خدائی تصور کے مطابق، صحیح طریقہ یہ ہے کہ انسانی افراد کو لے کر تاریخ کے بارے میں رائے قائم کی جائے۔

باب سوم

اسلام اکیسویں صدی میں

اکیسویں صدی غالباً تہذیبی ارتقا کا نقطۂ انتہا (culmination) ہے۔ انسانی تہذیب مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اب غالباً اپنے آخری مرحلے میں پہنچ چکی ہے۔ بظاہر حالات اب تہذیب کے سفر کا کوئی مزید مرحلہ باقی نہیں۔

پیغمبرانہ مشن میں ارتقا (evolution) کا کوئی تصور نہیں۔ پیغمبرانہ مشن اپنی آئڈیالوجی کے اعتبار سے، ہمیشہ ایک ہی تھا اور آخر تک ایک ہی رہے گا، البتہ دعوتی طریقِ کار کے اعتبار سے، وہ ایک ارتقا پذیر واقعہ ہے۔ نئے حالات ہمیشہ نئے مواقع پیدا کرتے ہیں اور داعی کا کام یہ ہے کہ وہ اِن نئے مواقع کو دریافت کرے اور اُن کو بھرپور طور پر دعوت الی اللہ کے کام میں استعمال کرے۔

اسلام کی تکمیل کے دو پہلو

اسلام کی تکمیل کے دو پہلو ہیں — ایک، وہ جس کو قرآن میں دین کی تکمیل (5:3) کہا گیا ہے۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں ''تکمیل'' سے مراد احکامِ دین کی فہرست کی تکمیل نہیں ہے اور نہ اُس سے یہ مراد ہے کہ کوئی ارتقائی ترتیب ہے اور 10 ہجری میں یہ ارتقائی ترتیب مکمل ہوگئی۔ اِس سے مراد صرف آیاتِ قرآنی کے نزول کی تکمیل ہے۔ اِس سے مراد عملاً وہی چیز ہے جس کو قرآن کی دوسری سورہ میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9)۔

تکمیل کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق دین کی تکمیل سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق دعوت کی اشاعت اور توسیع سے ہے۔ اِس دوسرے پہلو کا ذکر قرآن میں اشارۃً آیا ہے۔ یہ اشارہ قرآن کی اِس آیت میں موجود ہے: قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ڐ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۣ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (6:19) یعنی پوچھو کہ سب سے بڑا گواہ کون ہے۔ کہو، اللہ۔ وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ ہے۔ اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے، تاکہ میں تم کو اس سے خبردار کردوں اور وہ بھی جن کو یہ (قرآن) پہنچے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اِس قرآن کے ذریعے سے اپنے معاصرین کو آگاہ کرے اور بعد کے زمانے میں پیغمبر کے ماننے والے اگلی نسلوں کو ہر دور میں اُس سے آگاہ کرتے رہیں۔ دعوت کا یہ عمل مسلسل طور پر قیامت تک جاری رہے گا۔ دعوت الی اللہ کی اِس عالمی تکمیل کا ذکر ایک حدیثِ رسول (لا يبقى على ظهر الأرض بيت مدر ولا وبر إلا أدخله الله كلمة الإسلام) میں زیادہ واضح طور پر آیا ہے۔۔دعوت الی اللہ کی عالمی اشاعت کے لیے عالمی ذرائع مواصلات درکار تھے، جو کہ ساتویں صدی عیسوی میں قابلِ حصول نہ تھے۔ اِس لیے دعوت الی اللہ کی تکمیل کو مستقبل میں پیش آنے والے واقعے کی حیثیت سے بطور پیشین گوئی (prediction) بیان کیا گیا ہے۔

دورِ آخر کے دُعاۃ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث اِن الفاظ میں آئی ہے: عباد ليسوا بأنبياء ولا شهداء يغبطهم النبيون والشهداء لمقعدهم وقربهم من الله يوم القيامة (مسند احمد: 5/341) یعنی اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں جو نہ پیغمبر ہوں گے اور نہ شہید، مگر قیامت کے دن انبیا اور شہدا بھی اُن پر رشک کریں گے، اللہ سے اُن کے قرب کی بنا پر۔

اِس حدیثِ رسول میں غبطۃ (envy) کا لفظ اپنے لفظی معنی میں نہیں ہے، یعنی اس کا مقصد مذکورہ افراد کی پراسرار فضیلت بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ دراصل تحیر خیز پسندیدگی (wondrous appreciation) کے معنی میں ہے، یعنی وہ لوگ اگرچہ پیغمبر کے امتی ہوں گے، لیکن پیغمبر کی ہدایت کا اتباع کرتے ہوئے اُن کے ذریعے کچھ ایسے کام انجام پائیں گے جو پچھلی پوری تاریخِ نبوت میں انجام نہیں پایا تھا۔

یہ معاملہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں، غور کرکے اس کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ دینِ خداوندی میں جو چیز مطلوب ہیں، وہ بہ تمام وکمال وجود میں آچکی ہیں — وحی الٰہی کے ذریعے آئی ہوئی ہدایت کا پوری طرح محفوظ ہوجانا، پیغمبر کی صورت میں انسان کی زندگی کا ایک رول ماڈل (role model) تیار ہوجانا، دینِ خداوندی کی تاریخ کا ایک مستند ریکارڈ وجود میں آجانا، مذہبی جبر کا ہمیشہ کے لیے ختم

ہو جانا، دورِ بادشاہت میں ہر چیز پر جو شخصی کنٹرول قائم تھا، اس کا ختم ہو کر دورِ جمہوریت آ جانا، جب کہ انسانی سرگرمیوں کے تمام مواقع پوری طرح کھل گیے، وغیرہ۔ پیغمبرانہ مشن کے تحت یہ تمام چیزیں مطلوب تھیں جو کہ مکمل طور پر حاصل ہو گئیں۔

مگر ایک مطلوب ایسا تھا جو پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کی تاریخ کے دوران پوری طرح حاصل نہیں ہوا تھا، اور وہ ہے دعوتِ خداوندی کی عالمی اشاعت۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے یہ کتاب اِس لیے بھیجی ہے، تاکہ وہ تمام اہلِ عالم تک پہنچے اور تمام لوگوں کے لیے آگاہی کا ذریعہ بنے (25:1)۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبرانہ تاریخ کے دور میں یہ عالمی مطلوب پوری طرح واقعہ نہ بن سکا۔ اِس کا فطری سبب یہ تھا کہ دین کی عالمی اشاعت کے لیے عالمی مواصلات کی ضرورت ہے، اور عالمی مواصلات کے یہ ذرائع پچھلے زمانے میں موجود ہی نہ تھے۔

اِس پہلو سے غور کرنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مذکورہ حدیثِ رسول میں جن خوش قسمت لوگوں کا ذکر ہے، وہ سچے اہلِ ایمان کی وہ جماعت ہے جو دورِ مواصلات میں دینِ خداوندی کے اِس دعوتی نشانے کو اس کی آخری تکمیل تک پہنچائے گی کہ اُس سے روئے زمین پر بسنے والے تمام مرد اور عورت باخبر ہو جائیں۔ قیامت میں کوئی فرد یا گروہ ایسا نہ رہے کہ جو جائز طور پر یہ کہہ سکے کہ: إنا کنا عن ھذا غافلین (7:172)۔ تاریخ انسانی کے دورِ آخر میں اللہ کی توفیق سے جو اہلِ ایمان اِس دعوتی نشانے کو پورا کریں گے، وہی غالباً وہ لوگ ہیں جن کا ذکر مذکورہ حدیثِ رسول میں کیا گیا ہے۔

ٹیم اسپرٹ

وہ گروہ جس کو آخرت میں قربِ خداوندی کی نسبت سے اتنا بڑا درجہ ملے گا کہ انبیا اور شہدا بھی اُن پر رشک کریں گے، ان کی وہ صفتِ خاص کیا ہوگی جو اُن کو قربت کے اِس مقام تک پہنچائے گی۔ اِس صفت کا ذکر مذکورہ حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں آیا ہے: المتحابون في (اللہ کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنے والے)۔ اِس حدیث رسول میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس میں یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کی ذات سے محبت کرنے والے، بلکہ یہ فرمایا کہ اللہ کے لیے آپس میں محبت کرنے والے۔

گویا اِس کا مطلب یہ ہے کہ خالص اللہ کے کاز (cause) کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے۔ اس معاملے کو مزید واضح کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِس سے مراد وہ لوگ ہیں جو —— اللہ کے مشن کی خاطر صرف اللہ کے لیے باہم مجتمع ہوجائیں، جن کی ٹیم اسپرٹ اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ ٹیم کا ہر فرد اُن کے لیے ایک محبوب ساتھی بن جائے۔

دعوت کا عالمی نشانہ صرف ٹیم ورک کے ذریعے پورا کیا جاسکتا ہے اور کسی مادی انٹرسٹ کے بغیر ٹیم ورک ایک بے حد مشکل کام ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ ٹیم ورک کا مطلب اجتماعی ورک ہے اور اجتماعی زندگی میں لازماً شکایت اور اختلاف کی صورتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ایسی حالت میں صرف اعلی درجے کی محبت الٰہی یا تعلق باللہ ہی آدمی کو مشن سے وابستہ رکھ سکتا ہے۔

اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ خلیفہ ثانی عمر فاروق کے زمانے میں ایک جنگ پیش آئی جس کو تاریخ میں جنگ یرموک (13 ہجری) کہا جاتا ہے۔ اِس جنگ میں اہلِ ایمان کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اِس جنگ میں خالد بن الولید سپہ سالار تھے۔ جنگ کے آخری مرحلے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ خلیفہ ثانی عمر فاروق نے کسی وجہ سے خالد بن الولید کو سپہ سالاری کے منصب سے ہٹادیا اور ان کو عام سپاہی کا درجہ دے دیا۔ فوج کے کچھ لوگ خالد بن الولید سے ملے اور اِس واقعے پر اپنی عدم رضامندی کا اظہار کیا۔ خالد بن الولید نے ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: إني لا أقاتل في سبيل عمر، ولكن أقاتل في سبيل رب عمر (یعنی میں عمر کی راہ میں جنگ نہیں کرتا، بلکہ میں عمر کے رب کی راہ میں جنگ کرتا ہوں)۔

عالمی دعوتی مشن بہت بڑا دعوتی مشن ہے۔ اِس قسم کا مشن صرف ایسے لوگوں کے ذریعے کامیابی کے ساتھ انجام پاسکتا ہے جو پورے معنی میں ٹیم اسپرٹ کے ساتھ اکٹھا ہوئے ہوں۔ دعوتی مشن ایک ایسا مشن ہے جس میں کسی بھی قسم کا مادی یا ذاتی انٹرسٹ شامل نہیں۔ دعوتی ٹیم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد کے اندر مادی انٹرسٹ کا کوئی اعلی بدل موجود ہو۔ یہ بدل صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ کے ساتھ غیر متزلزل محبت۔ اللہ سے یہی گہرا تعلق اس بات کا

ضامن ہے کہ ٹیم کے افراد بنیانِ مرصوص (61:4) کی طرح باہم جڑے رہیں۔ کوئی بھی شکایت اُن کی ٹیم اسپرٹ میں خلل ڈالنے والی نہ ہو۔

اِس معاملے کی ایک مثبت مثال وہ ہے جو خالد بن الولید کے حوالے سے اوپر بیان کی گئی ہے۔ اِس کی مزید وضاحت کے لیے ایک متقابل مثال یہاں درج کی جاتی ہے۔ یہ مثال سعد بن عبادہ الانصاری کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ سعد بن عبادہ انصاری کو اِس پر اختلاف ہوا۔ وہ مدینے کے بڑے سرداروں میں سے تھے۔ ان کی شکایت ایک سیاسی شکایت تھی۔ یہ شکایت اتنی بڑھی کہ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت پر بیعت نہیں کی۔ انھوں نے کبھی اپنی رائے سے رجوع نہیں کیا، یہاں تک کہ وہ اصحابِ رسول کی جماعت سے الگ ہو کر شام چلے گئے اور وہیں 14 ہجری میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ٹیم ورک کے اندر لازمی طور پر آپس میں شکایت اور اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ٹیم ورک کی کامیابی کی شرط صرف یہ ہے کہ ٹیم کے افراد کے اندر یہ ناقابلِ شکست عزم پایا جاتا ہو کہ وہ کسی بھی عذر کو عذر نہیں بنائیں گے، وہ اللہ کی خاطر ہر حال میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے ساتھ جڑے رہیں گے۔ اللہ کے کاز کے لیے آپس میں محبت کرنے والے شکایت کا کوئی منفی اثر نہیں لیں گے۔ اِس کے برعکس، جن لوگوں کے اندر یہ صفت نہ ہو، وہ شکایت سے بددل ہو کر ٹیم سے دور ہو جائیں گے۔

دینِ خداوندی کے دو تقاضے

اسلام کا اصل خارجی نشانہ دعوت الی اللہ ہے۔ اہلِ اسلام کا یہی ابدی مشن ہے کہ وہ پُرامن طور پر اللہ کے دین کا پیغام ہر دور کے انسانوں تک پہنچاتے رہیں۔ اِس دعوتی مشن کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے — تائیدی انفراسٹرکچر (supporting infrastructure) اور توجیہی لٹریچر (explanatory literature)۔

تائیدی انفراسٹرکچر

قدیم زمانہ بادشاہت کا زمانہ تھا۔ قدیم زمانے میں صرف ایک چیز تھی جس سے

تائیدی انفراسٹرکچر کا فائدہ حاصل ہوتا تھا، اور وہ تھا پولٹکل انفراسٹرکچر، یعنی سیاسی اقتدار کی سرپرستی حاصل ہونا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیا آئے، اُن کو سیاسی اقتدار کی سرپرستی حاصل نہ تھی، اس لیے اُن کے زمانے میں دعوتِ خداوندی کو استحکام کا درجہ بھی نہ مل سکا۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے ذریعے اللہ تعالی نے تاریخ میں پہلی بار ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس کے نتیجے میں خود اہلِ اسلام کا سیاسی اقتدار قائم ہوگیا اور اِس طرح دعوت الی اللہ کے کام کے لیے سیاسی اقتدار کی سطح پر وہ تائیدی انفراسٹرکچر قائم ہوا جو کہ دعوتی مشن کے لیے مطلوب تھا۔

لیکن اللہ کے تخلیقی نقشے کے مطابق، سیاسی اقتدار کسی ایک گروہ کی اجارہ داری (monopoly) نہیں ہوسکتا، اِس لیے فطری طور پر ایسا ہونا تھا کہ یہ سیاسی سرپرستی ابدی طور پر قائم نہ رہے۔ اِس لیے تقریباً ایک ہزار سال کے بعد تاریخ میں ایک نیا انقلاب آیا۔ اِس انقلاب کو جمہوری انقلاب (democratic revolution) کہا جاتا ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق، جمہوری انقلاب ایک تاریخی عمل کے تحت وجود میں آیا۔ اِس عمل کا نقطہ انتہا انقلاب فرانس ہے۔

جمہوری انقلاب محدود معنوں میں صرف ایک سیاسی ڈھانچے کی تبدیلی کے ہم معنی نہ تھا، بلکہ اپنے اثرات کے اعتبار سے، وہ ایک مکمل انقلاب (total revolution) تھا۔ اِس کے نتیجے میں آخر کار تاریخ میں ایک نیا دور وجود میں آیا۔ اِس دور میں تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ زندگی کے تمام مواقع ہر انسان کے لیے یکساں طور پر کھل گئے۔ فرد کی آزادی کو خیر اعلی کا درجہ حاصل ہوگیا، ہر انسان کا یہ غیر مشروط حق تسلیم کرلیا گیا کہ وہ پر امن رہتے ہوئے جو چاہے کرے۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں جمہوریت (democracy) ایک مسلمہ عالمی اصول (universal norm) بن گئی۔ دعوت الی اللہ کے مشن کے لیے دورِ جمہوریت بہت زیادہ بامعنی تھا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ دعوتی مشن کے لیے جو تائیدی انفراسٹرکچر درکار ہے، اس کے لیے اب مسلم اقتدار کی ضرورت نہیں۔ اب خود عالمی نظام زیادہ بہتر طور پر وہ تائیدی انفراسٹرکچر فراہم کر رہا ہے جو دعوت الی اللہ کے عالمی مشن کے لیے مطلوب ہے۔

توجیہی لٹریچر

دعوت الی اللہ کے مشن کی اصل نظریاتی بنیاد صرف قرآن اور سنت ہے۔قرآن اور سنت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اس مشن کی نظریاتی بنیاد بن سکے۔لیکن اِس کے ساتھ ایک اور چیز ہے جو علمی اعتبار سے اس کی لازمی ضرورت ہے۔یہ قرآن اور سنت کی بنیاد پر تیار کیا جانے والا توجیہی لٹریچر ہے۔

عباسی دور میں مسلم علمانے جو لٹریچر تیار کیا، وہ اِس معاملے کی پہلی مثال ہے۔یہ لٹریچر اُس دور کے فقہا اور علمانے تیار کیا تھا۔جلد ہی اِس لٹریچر کو مستند پیٹرن (authentic pattern) کی حیثیت حاصل ہوگئی۔بعد کے زمانے میں جو اسلامی کتابیں لکھی گئیں، وہ اِس پیٹرن پر لکھی گئیں۔یہ لٹریچر اُس زمانے میں تیار کیا گیا جب کہ زمین کے بڑے حصے میں مسلمانوں کی سلطنتیں قائم تھیں۔اِس ماحول میں ایسا ہوا کہ یہ لٹریچر براہِ راست یا بالواسطہ طور پر سیاسی پیٹرن میں ڈھل گیا۔

مثال کے طور پر اِسی دور میں وہ کتابیں لکھی گئیں جن میں یہ کہا گیا تھا کہ شتمِ رسول کی سزا قتل ہے۔تمام فقہا نے یہ قانون وضع کر دیا کہ شاتم کو بطور حد قتل کیا جائے گا (یُقتل حدا)۔اِسی طرح ارتداد (apostasy) کی سزا قتل قرار پائی۔اِن قوانین کا ماخذ قرآن وسنت میں موجود نہ تھا، وہ صرف دورِ سلطنت کے سیاسی ماحول کی پیداوار تھے۔اِسی طرح اِس دور میں بہت سے مسائل اور قوانین وضع کیے گئے جو صرف وقت کے سیاسی ماحول کی پیداوار تھے۔مثلاً دار الاسلام اور دار الکفر کی اصطلاحیں، ذمی اور غیر ذمی کے قوانین، وغیرہ۔

اسلامی دعوت کی نظریاتی بنیاد (قرآن وسنت) ہمیشہ ایک ہی رہے گی، لیکن اس کا توجیہی لٹریچر ہمیشہ ایک نہیں رہ سکتا۔کیوں کہ توجیہی لٹریچر کا تعلق ابدی حقائق سے نہیں ہے، بلکہ حالاتِ زمانہ سے ہے۔قدیم زمانے میں جو توجیہی لٹریچر تیار ہوا تھا، وہ قدیم سیاسی حالات کے اعتبار سے تھا۔اب اس کی حیثیت کلاسکل لٹریچر (classical literature) کی ہو چکی ہے۔آج کے حالات کے اعتبار سے اس کا ریلونس (relevance) تقریباً ختم ہو چکا ہے۔اب نئے حالات کے اعتبار سے نیا توجیہی لٹریچر درکار ہے جو جدید ذہن کو ایڈریس کر سکے۔

آج اسلام کے دعوتی مشن کے لیے ایسا لٹریچر درکار ہے جو روحِ عصر (spirit of the age) کے مطابق ہو۔ صرف ایسا لٹریچر ہی جدید ذہن کو ایڈریس کرسکتا ہے اور لوگوں کو یہ یقین عطا کرسکتا ہے کہ اسلام میں آج کے انسان کے لیے بھی اُسی طرح قابلِ اعتماد رہنمائی موجود ہے جس طرح قدیم انسان نے اس میں اپنے لیے قابلِ اعتماد رہنمائی پائی تھی۔

موجودہ زمانے میں اسلام کے لیے جو نیا توجیہی لٹریچر درکار ہے، اس کی چند خصوصیات ہیں۔ اول یہ کہ وہ اپنے دلائل کے اعتبار سے مبنی بر عقل (reason based) ہو۔ قدیم روایتی طریقہ آج کے لیے کار آمد نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کا اپروچ یونی ورسل اپروچ (universal approach) ہو۔ قدیم انداز کا گروہی اپروچ (sectarian approach) آج کے انسان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ تیسری بات یہ کہ اِس لٹریچر کو مکمل طور پر پیس فل (peaceful) لٹریچر ہونا چاہئے۔ کوئی ایسا لٹریچر جس کے اندر براہِ راست یا بالواسطہ طور پر تشدد (violence) کا فکر موجود ہو، وہ آج کے انسان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوسکتا — آخرت میں قابلِ رشک درجہ اُس گروہ کو ملے گا جو اِن تقاضوں کے مطابق، اکیسویں صدی میں دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دے۔

احیاءِ امت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ طولِ امد کے نتیجے میں امتوں کے اندر قساوت (57:16) پیدا ہو جاتی ہے، یعنی ہر امت کی بعد کی نسلوں میں زوال آتا ہے۔ امت میں زوال کے بعد احیا (57:17) کے لیے کیا کرنا چاہیے، قرآن میں اس کا ایک ماڈل حضرت موسی کی مثال کی صورت میں بتایا گیا ہے۔ قرآن کے مطابق، جس طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک مستند ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے، اِسی طرح حضرت موسی اور دوسرے پیغمبروں کی زندگی بھی اہلِ ایمان کے لیے ایک قابلِ تقلید ماڈل ہے (6:90)۔

حضرت موسی ایک اسرائیلی پیغمبر تھے۔ وہ قدیم مصر میں پیدا ہوئے۔ اُن کا زمانہ تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ ان کے حالات تفصیل کے ساتھ قرآن، اور بائبل میں موجود ہیں۔ اِس کے مطالعے سے جہاں دوسری باتیں معلوم ہوتی ہیں، وہیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایک زوال یافتہ امت کو زوال کی حالت سے نکالنے کے لیے عملی طور پر کیا کرنا چاہئے۔

اللہ کی طرف سے حضرت موسی کو دو کام سپرد ہوا تھا — ایک طرف، فرعون کے سامنے اللہ کا پیغام پہنچانا اور دوسری طرف، بنی اسرائیل کو زوال کی حالت سے نکالنے کی تدبیر کرنا۔ انھوں نے یہ دونوں کام پوری طرح انجام دیا۔ انھوں نے ایک طرف، فرعون اور اس کی قوم کے سامنے اللہ کی حجت تمام کی اور دوسری طرف، بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں لے گئے۔ اِس کا مقصد زوال یافتہ قوم کی اصلاح کرنا تھا۔

فرعون اور اس کے درباریوں نے حضرت موسی کے پیغام کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اتمامِ حجت کے بعد اللہ نے اُن کے ساتھ اُسی انجام کا فیصلہ کیا جو اِس طرح کی دوسری قوموں کے ساتھ اللہ کی طرف سے کیا جاتا رہا ہے، یعنی اُن کی کامل ہلاکت۔ چناں چہ فرعون، اس کی فوجی طاقت، اس کے درباری سب کے سب بیک وقت سمندر میں غرق کر دئے گئے۔

ایک تخمینے کے مطابق، اُس وقت مصر کی کُل آبادی تین ملین سے کچھ زیادہ تھی۔ اِس آبادی میں بنی اسرائیل کی تعداد تقریباً ایک چوتھائی حصے پر مشتمل تھی۔ اگر حضرت موسی کے نزدیک بنی اسرائیل کے احیاءِ نو کا طریقہ یہ ہوتا کہ اُن کو حکومت دلائی جائے یا ملک میں اُن کے سیاسی ادارے قائم کیے جائیں، تو فرعون کی غرقابی کے بعد اِس منصوبے کو عمل میں لانے کا وقت اس کے لیے بہترین وقت تھا۔ غرقابی کا واقعہ پیش آنے کے بعد فرعون کی سیاسی اور فوجی طاقت ختم ہوچکی تھی۔ جادوگروں کا طبقہ حضرت موسی کے دین کو اختیار کر چکا تھا۔

اِس طرح کے واقعات کے نتیجے میں پورے مصر میں حضرت موسی اور ان کی قوم کا دبدبہ قائم ہو چکا تھا۔ اِس طرح حالات پوری طرح تیار ہو چکے تھے کہ حضرت موسی مصر کی حکومت پر قبضہ کرلیں اور سیاسی اقتدار کے ذریعے بنی اسرائیل کے احیاءِ نو کا کام کریں۔

مگر حضرت موسی نے ایسا نہیں کیا۔ اِس کے برعکس، حضرت موسی نے جو کچھ کیا، وہ یہ تھا کہ انھوں نے مصر کو چھوڑ دیا اور بنی اسرائیل کی پوری جمعیت کو لے کر صحرائے سینا میں چلے گئے، جہاں مشقت کی زندگی کے سوا بنی اسرائیل کے لیے کچھ اور نہ تھا۔ اِس واقعے کا حوالہ قرآن کی سورہ المائدہ کی آیت نمبر 26 میں دیا گیا ہے۔ اِس صحرائی ماحول میں بنی اسرائیل چالیس سال (1440-1400 قبل مسیح) تک سخت مشقت کی زندگی گزارتے رہے، یہاں تک کہ ایسا ہوا کہ اُن میں جو زیادہ عمر کے لوگ تھے، وہ سب مر گئے اور جو نوجوان تھے، وہ صحرا کے پُرمشقت ماحول میں تربیت پاکر ایک نئی زندہ قوم کی صورت میں ابھرے۔ بنی اسرائیل کی یہی تربیت یافتہ نسل تھی جس نے بعد کے دور میں تاریخی کارنامے انجام دئے۔

بنی اسرائیل کے ساتھ جو طریقہ اختیار کیا گیا، اُس کو صحرائی طریقِ علاج (desert therapy) کہا جاسکتا ہے۔ صحرائی علاج کا یہ طریقہ اِس سے پہلے بنو اسماعیل کے ساتھ اختیار کیا گیا تھا۔ وہ عرب کے صحرا میں تربیت پاکر تیار ہوئے اور پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر ایک طاقت ور ٹیم کی صورت میں انھوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دئے۔

امت مسلمہ کا کیس

قانونِ فطرت کے مطابق، امت مسلمہ کی بعد کی نسلوں میں وہی زوال آنا مقدر تھا جو اِس سے پہلے بنی اسرائیل پر آیا۔ زوال کی یہ حالت اپنی آخری صورت میں انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں کھل کر سامنے آ گئی۔

اب امت کے رہنماؤں کو وہی کرنا تھا جو اِس سے پہلے حضرت موسی نے اپنی قوم کے ساتھ کیا تھا، یعنی زمانے کے اعتبار سے امت کو ایک تربیتی کورس سے گزارنا، تا کہ اُن پر قرآن کی یہ آیت صادق آ جائے: لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (8:42)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ امت کے جو نا قابلِ اصلاح افراد ہیں، وہ ختم ہو جائیں اور جو قابلِ اصلاح افراد ہیں، وہ بیدار ہو کر مطلوب رول ادا کرنے کے قابل ہو سکیں۔

غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ موجودہ زمانے میں اِس طریقِ علاج کا بہترین میدان وہ تھا جس کو سیکولر تعلیم کا نظام کہا جاتا ہے۔ یہی تعلیمی نظام مکمل طور پر مسابقت (competition) کے اصول پر قائم تھا۔ یہاں دوسری قوموں کی طرف سے چیلنج کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا تھا۔ یہاں کا فارمولا یہ تھا کہ — مقابلہ کر کے زندہ رہو یا مر جاؤ:

Compete or perish

اِس اعتبار سے، موجودہ زمانے کا سیکولر تعلیمی نظام گویا تعلیمی طریقِ علاج (educational therapy) کا میدان بن گیا تھا۔ ضرورت تھی کہ قوم کے تمام نوجوانوں کو اِس طریقِ علاج کے پراسس سے گزارا جائے۔ لیکن مسلمانوں کے علما اور رہنماؤں نے اِس حکمت کو نہیں سمجھا۔ انھوں نے اِس معاملے کی حکمت سے بے خبر رہتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ یہ تعلیمی نظام تمام تر اینٹی مسلم نظام ہے۔ چناں چہ کسی نے اِس نظام کو 'قتل گاہ' قرار دیا۔ اور کسی نے اس کو 'ذہنی ارتداد' کا کارخانہ قرار دیا، وغیرہ۔

موجودہ سیکولر تعلیمی نظام میں چیلنج اور مسابقت کا مطلوب ماحول پوری طرح موجود تھا۔ لیکن اس میں ایک چیز مفقود تھی، وہ تھی مسلم نوجوانوں کی دینی تعلیم و تربیت۔ اِس مسئلے کا حل قرآن میں،

بنی اسرائیل کے حوالے سے اِن الفاظ میں موجود تھا: وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً (10:86) یعنی اپنے گھروں کو مذہبی تعلیم وتربیت کا مرکز بنا دو۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو یہی کرنا تھا۔ وہ یہ کہ مدرسے کی تعلیم کے علاوہ، مسلم نوجوانوں کی باقاعدہ تعلیم (formal education) وہ سیکولر تعلیم گاہوں میں دلوائیں اور اسی کے ساتھ وہ اپنے گھروں کو انفارمل ایجوکیشن (informal education) کا مرکز بنا دیں۔ تاکہ دونوں تقاضے بحسن وخوبی پورے ہوسکیں۔

مگر مسلم رہنماؤں نے اِس کے برعکس، یہ کیا کہ انھوں نے قومی بنیاد پر مسلمانوں کے الگ تعلیمی ادارے قائم کیے۔ یہ تعلیمی ادارے، جہاں صرف مسلمانوں کے لیے تعلیم کا انتظام تھا، وہ فطری طور پر مسابقت اور چیلنج سے خالی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد یہ ادارے مسلم گھیٹو (Muslim ghetto) بن کر رہ گئے۔

موجودہ زمانے کے مسلمان اپنے زوال کی بنا پر اِس قابل نہیں رہے تھے کہ وہ خود اپنے الگ قومی ادارے چلائیں۔ اِس طرح کے ادارے قائم کرنے کا مطلب یہ تھا کہ زوال یافتہ افراد کو حقیقی لیاقت کے بغیر، بڑی بڑی پوزیشن دے دی جائے۔ چناں چہ اِن اداروں میں اسلام تو نہیں آیا، البتہ ایک زوال یافتہ قوم کا قومی کلچر فروغ پانے لگا۔ یہی حال اُن ملکوں کا ہوا جو اسلام کے نام پر بنائے گئے تھے۔ اِن ملکوں میں زوال یافتہ افراد کو اچانک بڑے بڑے عہدے مل گئے اور انھوں نے پورے ملک کو زوال یافتہ کلچر کا جنگل بنا دیا۔

زوال کی آخری مثال

دورِ زوال کے بارے میں حدیث میں بہت سے انتباہات آئے ہیں۔ اُن میں سے ایک انتباہ وہ ہے جو اِس حدیثِ رسول میں ملتا ہے: لا ترجعوا بعدي كفاراً، يضرب بعضكم رقاب بعض (صحيح البخاري، رقم الحديث: 1739) یعنی میرے بعد تم کافر نہ ہوجانا کہ ایک شخص دوسرے شخص کی گردنیں مارنے لگے۔ اِس حدیث میں ''کفار'' کا لفظ فقہی معنی میں نہیں ہے، یہ دراصل

تہدیدی زبان (language of hammering) ہے۔

یہ شدت کے انداز میں بتایا گیا ہے کہ زوال جب اپنی آخری حد تک پہنچتا ہے تو امت کا حال کیا ہوتا ہے۔ اُس وقت لوگوں کے اندر خوفِ خدا کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اِسی بے خوف نفسیات کی بنا پر وہ ایسا فعل کرنے کے لیے جری ہوجاتے ہیں جو قرآن کی صراحت کے مطابق، مبینہ طور پر ایک جہنمی فعل (4:93) ہے، یعنی ایک مومن کا دوسرے مومن کو ناحق قتل کرنا۔

جدید تعلیم کی اہمیت

جدید تعلیمی نظام کو سیکولر نظامِ تعلیم کہا جاتا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ جدید تعلیم نئے دور کا نظامِ تعلیم تھا۔ وہ نئے دور کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ اس کا سیکولر پہلو اس کا اضافی (relative) پہلو ہے، نہ کہ حقیقی (real) پہلو۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو نئی دریافتیں ہوئیں، اُس نے زندگی کے ہر شعبے میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کردیں۔ اِن تبدیلیوں کا تعلق براہِ راست طور پر انسان کی عملی زندگی سے تھا۔ دورِ جدید میں زندگی کے تمام شعبے مکمل طور پر بدل گئے۔ اِن شعبوں کو چلانے کے لیے نئے ماہرین اور نئے تربیت یافتہ افراد درکار تھے۔ جدید تعلیمی نظام گویا اِنھیں جدید قسم کے افراد کو تیار کرنے کا کارخانہ تھا۔ کسی قوم کے لیے اِس تعلیمی نظام سے علاحدگی کا مطلب یہ تھا کہ اُس قوم کے پاس موجودہ دور کے اِس جدید نقشۂ حیات کو چلانے کے لیے افرادِ کار موجود نہ ہوں۔

موجودہ زمانے میں امتِ مسلمہ کا کیس یہی ہے۔ اپنے قائدین کی رہنمائی میں امت نے یہ غلطی کی کہ وہ جدید تعلیمی اداروں کی عصری اہمیت کو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے اپنے نوجوانوں کو اِس تعلیمی نظام سے دور رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوری امت دورِ جدید میں بے جگہ (displaced) ہو کر رہ گئی— موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی مبینہ پس ماندگی کا اصل سبب یہی ہے۔

افراد، نہ کہ مجموعہ

موجودہ زمانے میں مسلم علما اور رہنماؤں نے بہت سی تحریکیں چلائیں، لیکن ہر تحریک اپنے مطلوب

نشانے کو حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اِس ناکامی کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ہر ایک نے غلط مفروضے سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ انھوں نے موجودہ مسلمانوں کو ''خیرِ امت'' فرض کرلیا اور اسی مفروضے پر وہ اپنی منصوبہ بندی کرنے لگے، حالاں کہ موجودہ مسلمان صرف ایک زوال یافتہ گروہ بن چکے تھے۔

یہ ایک مشترک غلطی تھی جس میں یہ تمام حضرات مبتلا رہے۔ اِس بنا پر اُن کا حال اُس معمار جیسا ہوگیا جو کچی اینٹوں کو پختہ اینٹ سمجھ کر قلعے کی تعمیر شروع کردے۔ ایسے معمار کا یقینی انجام صرف یہ ہے کہ اس کا قلعہ کبھی تعمیر نہ ہوسکے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ کوئی زوال یافتہ قوم دوبارہ اس طرح اصلاح قبول نہیں کرتی کہ پوری قوم بطور مجموعہ اصلاح یافتہ ہوجائے (21:95)۔ ایسا نہ ماضی میں کبھی ہوا اور آئندہ کبھی ہوسکتا ہے۔ اِس بنا پر اصلاح کے کام میں خواہ پورے مجموعے کو خطاب کیا گیا ہو، لیکن ہمیشہ کچھ افراد ہی اُس سے اصلاح قبول کرتے ہیں۔ اِس لیے تحریک کی کامیابی کا معیار ہمیشہ افرادِ قوم ہوتے ہیں، نہ کہ مجموعۂ قوم۔

انگریزی تعلیم

ٹی بی میکالے (Thomas Babington Macaulay) ایک انگریز مورخ اور سیاست داں تھا۔ وہ 1800 میں پیدا ہوا، اور 1859 میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ 1835 میں انڈیا آیا۔ اُس وقت کی برٹش حکومت میں اس کو ایک بڑا عہدے دار بنایا گیا۔ اس نے ایک تعلیمی نظریہ وضع کیا جس کو میکال ازم (Macaulayism) کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد تھا ملک میں اینگلی سائزڈ انڈین (anglicised Indians) کا ایک نیا طبقہ پیدا کرنا۔

لارڈ میکالے سے پہلے انڈیا کی آفیشیل زبان فارسی تھی۔ لارڈ میکالے کی کوششوں سے ایسا ہوا کہ 1938 میں انگریزی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ اِس کے بعد ملک کے اسکولوں میں انگریزی زبان ذریعہ تعلیم قرار پائی۔

لارڈ میکالے کا کہنا تھا کہ — اس سے ایک نئی نسل پیدا ہوگی جو کہ پیدائش کے اعتبار سے

ہندستانی اوراپنے ذہن کے اعتبار سے انگریز ہو گی:

So that a generation may arise which is Indian in birth and English in thought.

لارڈ میکالے نے جب یہ کہا تو اس کے خلاف سخت ہنگامہ کیا گیا، خاص طور پر مسلم رہنما انگریزی تعلیم کے شدید مخالف ہو گئے، حتی کہ انھوں نے کہا کہ انگریزی تعلیم گاہیں مسلمانوں کے لیے قتل گاہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر یہ سب غیر ضروری اندیشے تھے۔ عملاً جو کچھ ہونے والا تھا، وہ صرف یہ کہ اِن درس گاہوں میں تعلیم پانے کی وجہ سے کٹر پن ختم ہو جائے اور لوگوں کے اندر کھلا پن آ جائے۔ اپنے نتیجے کے اعتبار سے دیکھئے تو لارڈ میکالے کا قول ایک لفظی تبدیلی کے ساتھ دراصل یہ تھا:

So that a generation may arise which is Indian in birth and liberal in thought.

چناں چہ تجربہ بتاتا ہے کہ اِن انگریزی اداروں میں تعلیم پائے ہوئے مسلم نوجوانوں میں سے بہت سے ایسے تھے جو بعد کو بہترین مسلمان بنے۔ مسلم جماعتوں اور تنظیموں کو انھیں انگریزی اداروں سے بہترین افراد حاصل ہوئے، وغیرہ۔ اِس معاملے میں اصل قابلِ لحاظ بات یہ نہیں ہے کہ لارڈ میکالے یا برٹش حکمرانوں نے بطور خود کس نظریے کے تحت انگریزی تعلیم گاہیں بنائیں، بلکہ اصل قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ باعتبار نتیجہ ان کا انجام کیا ہوا، اور یہ کہ یہاں سے کس قسم کے لوگ تعلیم پا کر نکلے۔

انگریزی تعلیم حقیقتاً برٹش تعلیم نہ تھی، بلکہ وہ جدید علم (modern learning) کے حصول کا ذریعہ تھی۔ ماڈرن ایجوکیشن اپنی حیثیت کے اعتبار سے نہ پرو برٹش (pro-British) تھی اور نہ اینٹی مسلم، وہ صرف جدید علوم تک پہنچنے کا ایک ذریعہ تھی۔ ''انگریزی تعلیم'' کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے اندر ذہنی جمود ٹوٹا، ان کے اندر کھلا پن آیا، ان کے اندر متعصّبانہ طرز فکر (biased thinking) کا خاتمہ ہوا، وہ چیزوں کو موضوعی انداز (objective way) میں دیکھنے لگے، ان کے اندر کٹر پن ختم ہو گیا، ان کے اندر چیزوں کو عقل (reason) کے معیار پر جانچنے کا مزاج پیدا ہو گیا، وغیرہ۔

یہ تمام چیزیں عین دینِ حق کے موافق تھیں، کیوں کہ دینِ حق انسانی فطرت کے عین مطابق ہے،

وہ عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ دینِ حق کے راستے میں اگر کوئی چیز رکاوٹ ہے تو وہ صرف متعصّبانہ طرزِ فکر ہے۔ کسی بھی طریقے سے اگر متعصّبانہ طرزِ فکر کو ختم کردیا جائے تو دینِ حق اور انسان کے درمیان حائل فکری دیوار اپنے آپ منہدم ہوجائے گی۔ اس کے بعد انسان اِس قابل ہوجائے گا کہ وہ حقیقت کو اس کی بے آمیز صورت میں دیکھ سکے۔

انگریزی تعلیم یا سیکولر تعلیم کے ذریعے یہی واقعہ پیش آیا۔ اِس تعلیم کے ذریعے بہت سے نوجوان اِس قابل ہوگئے کہ وہ حقیقت کو دریافت کرکے اس کو قبول کرلیں۔ موجودہ زمانے میں اِس طرح کی مثالیں ہر مقام پر دیکھی جاسکتی ہیں — قدیم زمانہ قیاسی استدلال کا زمانہ تھا۔ موجودہ زمانہ سائنسی استدلال کا زمانہ ہے۔ آج کے انسان کے مائنڈ کو ایڈریس کرنے کے لیے سائنسی استدلال کی ضرورت ہے۔ انگریزی تعلیم نے اِسی دروازے کو کھولا تھا۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی نئی صورتِ حال پیش آئے تو اگرچہ وہ بظاہر عُسر دکھائی دیتی ہو تب بھی آپ اس کے اندر یُسر تلاش کریں۔ ہر نئی صورتِ حال ہمیشہ نئے مواقع کو لاتی ہے۔ ایسی حالت میں اصل کام صرف یہ ہے کہ مواقع کو دریافت کرکے ان کو اپنے حق میں استعمال کیا جائے۔

اسلام اور مسلمان

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا مشن شروع کیا۔ ابتدائی مشکلات کے بعد آپ کا مشن نہایت تیزی کے ساتھ پھیلا، یہاں تک کہ تقریباً 50 سال کے عرصے میں آپ کے ماننے والوں نے ایشیا اور افریقہ اور یورپ میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرلیں۔ مسلمانوں کا یہ دبدبہ تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ اِس کے بعد وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (3:140) کے فطری قانون کے تحت حالات بدلے۔ یورپ میں نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کا دور آیا۔ یورپی قومیں نئی طاقتوں سے مسلح ہوکر دنیا کے بیش تر حصے میں پھیل گئیں۔ یہ وہی دور تھا جس کو مسلم ایمپائر کا دور کہا جاتا ہے۔ فطری طور پر یورپی قوموں کا مقابلہ براہِ راست مسلم سلطنتوں سے ہوا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کا آخری زمانہ اِس معاملے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ ایک طرف، عثمانی سلطنت کو یورپی طاقت کے مقابلے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ 1770 میں ترکوں کے مضبوط بحری بیڑے کو ایک لڑائی میں میڈی ٹیرینین سمندر میں تباہ کردیا گیا:

The Ottoman naval establishment was wiped out at the Battle of Çeşme (1770) by a Russian fleet. (EB. 13/784)

اِس سلسلے میں دوسرا واقعہ ہندستان میں پیش آیا۔ اُسی زمانے میں برٹش فوجیں ہندستان میں داخل ہوئیں اور تیزی سے پیش قدمی کرنے لگیں۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں اُن کا مقابلہ میسور کے سلطان ٹیپو سے پیش آیا۔ برٹش فوجیں کامیاب ہوئیں اور 1799 میں انھوں نے سری رنگا پٹنم میں سلطان ٹیپو کو ہلاک کرکے میسور کی سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ اُس وقت سلطان ٹیپو کی لاش کے پاس کھڑے ہوکر جنرل ہیرس (George Harris) نے فاتحانہ انداز میں کہا تھا کہ — آج ہندستان ہمارا ہے:

Today, India is ours!

نئی سوچ کی ضرورت

اِس کے بعد مغربی قوموں کے خلاف مسلمانوں کا ٹکراؤ شروع ہوا۔ یہ ٹکراؤ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے درمیان دو صدیوں تک مسلسل جاری رہا۔ اِس طویل جنگ میں مسلمانوں کو ساری دنیا میں یک طرفہ طور پر تباہی سے دوچار ہونا پڑا۔ اب اِس تباہ کن لڑائی کی تاریخ اکیسویں صدی میں پہنچ چکی ہے۔ اب حالات اُس سنگین حد تک پہنچ چکے ہیں، جب کہ اِس تباہ کن لڑائی کو مزید جاری رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے کہ مسلمانوں کے علما اور دانش ور یہ فیصلہ کریں کہ اب ہمیں پورے معاملے کا ازسرِ نو جائزہ لینا ہے۔ اب ہمیں ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے احیاءِ ملت کی نئی منصوبہ بندی کرنا ہے۔ دو سو سال کا ناکام تجربہ یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ ماضی کی پالیسی کو بدستور جاری رکھنا، اب صرف دیوانگی ہے، نہ کہ کوئی دانش مندی۔

اسلام کے عملی اصول میں سے ایک اصول وہ ہے جس کو نظر ثانی (reassessment) کا اصول کہا جا سکتا ہے۔ فطرت کے نظام کے مطابق، یہ ممکن ہے کہ آدمی نظریہ (ideology) کی سطح پر ہمیشہ ایک ہی آئڈیل اصول پر قائم رہے، لیکن عمل کی دنیا میں آنے کے بعد ہمیشہ پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی عملی تقاضے کی نسبت سے اپنے منصوبے پر نظر ثانی کرنا، بدلے ہوئے حالات کے مطابق، ازسرِ نو اپنے عمل کا نقشہ بنانا۔ یہ اسلام کا تقاضا بھی ہے اور عقل کا تقاضا بھی۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں پر اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے کہ وہ اِس عملی اصول کے تحت اپنی سرگرمیوں کا ازسرِ نو جائزہ لیں اور حقائق (realities) کی بنیاد پر اپنے عمل کا نیا نقشہ بنائیں، جو حالات کے مطابق، قابلِ عمل بھی ہو اور نتیجہ خیز بھی۔

اسلامی لٹریچر کا معاملہ

اسلام استثنائی طور پر ایک ایسا مذہب ہے جس کا اصل متن (original text) آج بھی محفوظ طور پر موجود ہے۔ یہی متن (قرآن اور سنت) اسلام کی تعلیمات کو جاننے کا واحد ماخذ ہے۔ اسلام کا یہ تاریخی پہلو اسلام کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی بھی دوسرے مذہب کو حاصل نہیں۔ مگر اسلام کی بعد کی

صدیوں میں یہ ہوا کہ اسلام کے متن کی تشریح وتفصیل کے طور پر ہزاروں کتابیں عربی زبان میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے یہ ہوا کہ بعد کو لکھی جانے والی یہ کتابیں شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام کا اصل ماخذ قرار پاگئیں۔ اب یہی کتابیں مدرسوں اور اداروں اور لائبریریوں میں استعمال ہوتی ہیں، ہر جگہ اُنھیں کا چرچا ہوتا ہے، حتی کہ عملاً اب قرآن اور سنت کی حیثیت ثانوی ہوگئی ہے اور بعد کو پیدا ہونے والے لٹریچر کو بلا اعلان اسلام کے اولین لٹریچر کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

اب موجودہ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ فکری حیثیت سے وہ دینِ منزّل پر کھڑے ہوئے نہیں ہیں، اب عملاً وہ اُس دین پر کھڑے ہوئے ہیں جو بعد کی صدیوں میں مسلم علما نے اصل دین کی تشریح وتفصیل کی حیثیت سے بطور خود مدوّن کیا۔ مسلمانوں کی یہ صورتِ حال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس پیشین گوئی کی تصدیق ہے جو حدیث کی کتابوں میں اِن الفاظ میں آئی ہے: من اقتراب الساعة أن يرفع الأشرار، ويوضع الأخيار، ويوضع في القوم المثْناة، ليس أحد يغيرها، قيل: وما المثناة- قال: كتاب كتب سوى كتاب الله عز وجل (المستدرك على الصحيحين، رقم الحديث: 8782) یعنی قرب قیامت کی ایک علامت یہ ہے کہ برے لوگوں کو بلندی حاصل ہوجائے گی، اور اچھے لوگوں کو ذلیل کیا جائے گا، اور لوگوں کے درمیان 'مِثناۃ' کا رواج عام ہوجائے گا، کوئی نہ ہوگا جو اس کی تغییر کرے۔ پوچھا گیا کہ مثناۃ کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ کی کتاب کے سوا لکھی جانے والی کتابیں۔

اِس حدیث میں دراصل امتِ مسلمہ کے زوال کی حالت کو بتایا گیا ہے۔ جب ملت پر زوال کا دور آتا ہے تو اس کی حالت بھی وہی ہوجاتی ہے جو دوسری ملتوں کی ہوئی، یعنی لوگ ظاہر پسند بن جاتے ہیں۔ اُن کو معنوی حقائق دکھائی نہیں دیتے، البتہ ظاہری چیزیں خوب نظر آتی ہیں۔ لوگوں کے اِس بگڑے ہوئے ذوق کی بنا پر اُن کے درمیان دنیا پرست قسم کے لوگ ابھرتے ہیں اور آخرت پسند قسم کے لوگ غیر نمایاں بن جاتے ہیں۔ جو لوگ بگڑے ہوئے عوامی ذوق کو غذا فراہم کریں، وہ مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں اور جو لوگ اپنی سنجیدگی کی بنا پر عوامی ذوق کی رعایت نہ کرسکیں، وہ اُن کے درمیان

غیر مقبول بن جاتے ہیں۔ اُس وقت ایسے لوگ ابھرتے ہیں جو اگر چہ روحانی اعتبار سے خالی ہوتے ہیں، لیکن اپنے شان دار مذہبی لباس کے ذریعے وہ لوگوں کے درمیان اپنے کو نمایاں بنا لیتے ہیں۔ ان کے خوش نما الفاظ، ان کا بناوٹی انداز، ان کی بڑی بڑی باتیں عوام کو اپیل کرتی ہیں۔ ایسے لوگ حقیقت کے اعتبار سے، اگر چہ ''اشرار'' ہوتے ہیں، لیکن عوام کے بگڑے ہوئے ذوق کی بنا پر وہ اُن کے درمیان ''اَخیار'' کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی تقریر اور تحریر کو حدیث میں 'مثناۃ' کہا گیا ہے۔

مذکورہ حدیث میں اللہ کی کتاب کے سوا جن کتابوں کا ذکر ہے، اُن سے مراد عام کتابیں نہیں ہیں، بلکہ ان سے مراد وہ کتابیں ہیں جو امت کے بعد کے زمانے میں دینِ خداوندی کی تفسیر اور تشریح کے طور پر لکھی جائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اِن قابلِ ترک کتابوں سے مراد وہ کتابیں ہیں جو اُس زمانے میں لکھی جائیں جو 'قُرون مشہود لہا بالخیر' کے بعد کا زمانہ ہے۔ اِس قسم کی کتابیں پچھلی امتوں کے زمانۂ مابعد میں لکھی گئی تھیں، اِسی طرح وہ یقینی طور پر خود امتِ مسلمہ کے زمانۂ مابعد میں بھی لکھی جائیں گی۔ اِس معاملے میں کسی حاملِ کتاب امت کا کوئی استثنا (exception) نہیں۔

بعد کے زمانے میں لکھی جانے والی کتابیں دو قسم کی ہو سکتی ہیں — ایک وہ جو کتاب اللہ کے گہرے مطالعے کے بعد اس کی حقیقی وضاحت کے طور پر لکھی جائیں۔ اور دوسری کتابیں وہ ہیں جو دورِ زوال میں لوگوں کے بگڑے ہوئے ذوق کی رعایت کے طور پر لکھی جائیں۔ مذکورہ حدیث میں 'مثناۃ' کے نام سے جن کتابوں کا ذکر ہے، وہ یہی دوسرے قسم کی کتابیں ہیں۔ امتِ مسلمہ کے بعد کے دور میں جو کتابیں لکھی گئیں، وہ اُس وقت لکھی گئیں، جب کہ مسلمان ایک نظریاتی گروہ کی حیثیت سے باقی نہیں رہے تھے، بلکہ وہ عام قوموں کی طرح ایک قوم بن چکے تھے، چناں چہ اِن کتابوں میں ایک مشترک خامی یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے قومی ذہن کی عکاسی کرتی ہیں، نہ کہ اسلام کے اصولی موقف کی۔

بعد کے دور میں مسلمان دوسری قوموں کو مدعو کے بجائے محکوم کی نظر سے دیکھنے لگے، اِس لیے ایسا ہوا کہ بعد کے دور میں پیدا ہونے والے لٹریچر میں دعوت الی اللہ کا باب حذف ہو گیا۔ بعد کے دور میں

جب کہ مسلمانوں کا پولٹکل ایمپائر قائم ہوا، اُس وقت مسلمانوں میں عام طور پر سیاسی طرز فکر پیدا ہوگیا۔ اِس سیاسی ذہن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کے مسلمانوں میں جہاد کے نام پر قتال (جنگ) کا تصور غالب آ گیا، حتی کہ قتال اُن کے لیے مذہبی عقیدے کا جز بن گیا، جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قتال کو صرف ضرورتِ شدیدہ (law of necessity) کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔

بعد کے دور میں مسلمانوں کو جو دبدبہ حاصل ہوا، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر عام طور پر فخر (pride) کا ذہن پیدا ہوگیا۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں، اپنے آپ کو برتر سمجھنے لگے۔ اِسی ذہن کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے زیرِ قبضہ علاقوں کو 'دارالاسلام' اور دوسروں کے زیر قبضہ علاقوں کو 'دارالکفر' کہنا شروع کردیا، حالاں کہ قرآن کے مطابق، تمام دنیا یکساں طور پر دارالانسان کی حیثیت رکھتی تھی۔ دارالکفر اور دارالاسلام کی اصطلاحیں سرتاسر مبتدعانہ اصطلاحیں ہیں جو بعد کے دور میں وضع کی گئیں۔ اِسی صورت حال کا یہ نتیجہ تھا کہ بعد کے زمانے میں اسلام کو صرف احکام اور قوانین کا ایک مجموعہ سمجھ لیا گیا، اِسی ذہن کا نتیجہ تھا کہ علما کے درمیان علم فقہ کو غلبہ حاصل ہوگیا اور قرآن اور حدیث عملاً فقہ کے تابع قرار پا گئے۔ دورِ زوال کا یہ بھی ایک ظاہرہ ہے کہ دین میں اسپرٹ (spirit) کی اہمیت گم ہوجاتی ہے اور ساری اہمیت فارم (form) کو حاصل ہوجاتی ہے۔ اِس فرق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین میں ساری بحثیں فنی اور قانونی پہلوؤں پر مرتکز ہوجاتی ہیں۔ اِس کے نتیجے میں ایک شدید تر خرابی پیدا ہوجاتی ہے، یعنی بہت سے فرقوں کا وجود میں آنا۔ یہاں پہنچ کر ملتِ واحدہ، ملتِ متفرقہ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

واقعات بتاتے ہیں کہ بعد کے دور میں ملتِ مسلمہ کے درمیان یہ تمام خرابیاں کامل طور پر پیش آئیں۔ اِن تمام خرابیوں کا سبب وہی چیز ہے جس کو مذکورہ حدیث میں 'مشاۃ' کہا گیا ہے، یعنی ملت کے دورِ زوال میں پیدا ہونے والا لٹریچر۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے تمام فکری مسائل براہِ راست طور پر اِسی صورتِ حال کا نتیجہ ہیں۔ اب اِس صورتِ حال کا حل صرف ایک ہے، وہ یہ کہ قرون مشہودلہا بالخیر کے بعد مسلمانوں نے عربی زبان میں بطور خود جو لٹریچر تیار کیا، اُن کتابوں کو اب مسلمانوں کے کلاسکل لٹریچر (classical literature) کا درجہ دے دیا جائے۔ اب دوبارہ

کھلے ذہن کے تحت قرآن اور سنت کا مطالعہ کیا جائے اور پھر ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو جدید ذہن کو ایڈریس کرنے والا ہو۔ بعد کے پیدا شدہ لٹریچر کی تاریخی حیثیت ہمیشہ باقی رہے گی، لیکن جہاں تک ماخذ کی بات ہے، اسلام میں مستند ماخذ کی حیثیت ہمیشہ قرآن اور سنت کو حاصل رہے گی۔

ایک ''روشن خیال'' مسلمان نے ایک بار لکھا تھا کہ — آج قرآن کو دوبارہ نازل ہونا چاہئے:

Quran has to be re-revealed today.

یہ ایک صحیح بات ہے جس کو غلط الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ آج ہم کو نئے قرآن کی ضرورت نہیں، ضرورت صرف یہ ہے کہ اسلوبِ عصر میں قرآن کی تبیین کی جائے۔ چناں چہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ:

Quran has to be re-defined today.

قرآن کی تمام تعلیمات ابدی ہیں تاہم اسلوب کلام کا تعلق مخاطب گروہ سے ہے، اِس لیے اسلوب کلام ہر دور میں بدلتا رہتا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ قرآن کی ابدی تعلیمات کو اسلوبِ عصر میں اِس طرح بیان کیا جائے کہ وہ آج کے لوگوں کے لیے قابل فہم بن سکیں۔

ملتِ مسلمہ کا کیس

ہجری کیلنڈر کے لحاظ سے آج محرم 1434 کی پہلی تاریخ ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت کی تھی، اُس پر اب 1433 سال گزر چکے ہیں۔ آپ کے زمانے میں جس ملتِ مسلمہ کی تشکیل ہوئی تھی، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ اب ختم ہو چکی ہے۔ آج جس کو ہم ملتِ مسلمہ کہتے ہیں، وہ ملت کی بعد کی نسلیں ہیں جو مختلف حالات سے گزرتے ہوئے اکیسویں صدی عیسوی میں داخل ہوئی ہیں۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ ہر امت اپنے بعد کے دور میں زوال کا شکار ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمان دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ مسلمان، قرآن کی زبان میں، خیرِ امت (3:110) نہیں ہیں، وہ بعد کے دور میں وجود میں آنے والے ایک زوال یافتہ گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کا کیس وہی ہے جس کو قرآن میں 'طولِ امد' کے ذریعے پیدا ہونے والی قساوت (57:16) کا کیس کہا گیا ہے۔

تحریکوں کی ناکامی کا سبب

پچھلے دوسو سال کے اندر مسلم علما اور مسلم رہنماؤں نے ملت کے احیا کے لیے بہت سی بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں اور بہت سی بڑی بڑی جماعتیں بنائیں۔ اِن تحریکوں اور جماعتوں کے تحت جو پُرجوش سرگرمیاں جاری ہیں، ایک فارسی شاعر کے الفاظ میں، اُن کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ:

زمیں شش شد و آسماں ہشت شد

مگر یہ تحریکیں اپنے اعلان کردہ مقصد کے اعتبار سے مکمل طور پر ناکام رہیں۔ اِس کا سبب صرف ایک تھا، وہ یہ کہ اِن رہنماؤں نے موجودہ مسلمانوں کو ''خیرِ امت'' فرض کرکے اپنا کام شروع کیا، جب کہ اصل واقعہ یہ تھا کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا یہ انبوہ ایک زوال یافتہ گروہ کے درجے میں پہنچ چکا تھا۔

اصلاح کا آغاز افراد سے

دورِ زوال کی نفسیات یہ ہے کہ زوال اگرچہ عمومی سطح پر ہوتا ہے، لیکن اصلاح کا آغاز افراد کی سطح سے کیا جاتا ہے۔ دورِ زوال میں مجموعی اصلاح کا طریقہ سراسر بے معنی ہے۔ قرآن کے مطابق، صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں کام کا آغاز اصلاحِ افراد سے کیا جائے، یعنی بھیڑ کو ایڈریس کرنے کے بجائے افراد کو ایڈریس کرنا۔ اصلاح کی اِس حکمت کو قرآن کی دو آیتوں میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے:

1۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (8:53) یعنی یہ اِس وجہ سے ہوا کہ اللہ اُس انعام کو جو وہ کسی قوم پر کرتا ہے، اُس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ اس کو نہ بدل دیں جو اُن کے نفسوں میں ہے۔ اور بے شک، اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

2۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11) یعنی بے شک، اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا، جب تک وہ اُس کو نہ بدل ڈالیں جو اُن کے نفسوں میں ہے۔

قرآن کی اِن دونوں آیتوں کا مطلب ایک ہے، وہ یہ کہ جب کوئی قوم عروج کے بعد زوال کا شکار ہوجائے اور اس کو دوبارہ عروج کی طرف لوٹانا ہو تو اصلاح کے کام کا آغاز مجموعی قوم کی سطح سے

شروع نہیں کیا جائے گا، بلکہ افراد کی سطح سے شروع کیا جائے گا۔ ایسا نہیں کیا جائے گا کہ یہ فرض کرلیا جائے کہ قوم تو موجود ہے، اب اُس کو صرف اجتماعی اقدام کی طرف متحرک کرنا ہے، بلکہ یہ تسلیم کیا جائے گا کہ قوم موجود نہیں ہے اور افراد کی اصلاح کرکے دوبارہ قوم کو وجود میں لانا ہے۔ یہی اللہ کا قانون ہے، اور اللہ کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (33:62)۔

اِس معاملے کی ایک واضح عملی مثال موجودہ زمانے میں پائی جاتی ہے، اور یہ فلسطین اور پاکستان کی مثال ہے۔ دونوں کا کیس بالکل ایک ہے۔ فلسطین کا تعلق عرب دنیا سے ہے، اور پاکستان کا تعلق بقیہ مسلم دنیا سے۔ فلسطین اور پاکستان کا معاملہ گویا موجودہ زمانے میں اِس قانونِ الٰہی کو سمجھنے کے لیے عملی مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ فلسطین اور پاکستان دونوں کے کیس میں ایسا ہوا کہ قوم کی سطح پر ایک مسلم ملک وجود میں لانے کی کوشش کی گئی، مگر دونوں جگہ مکمل طور پر ناکامی ہوئی۔ فلسطین کا مسئلہ 1948 میں شروع ہوا۔ فلسطینی جدوجہد پر اب 60 سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ اِس جدوجہد میں جان ومال کی جو قربانی دی گئی ہے، وہ شاید پوری مسلم تاریخ کی تمام قربانیوں سے بھی زیادہ ہے، مگر انجام کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ پوری جدوجہد معکوس نتیجہ (counter productive) کی بدترین مثال ثابت ہوئی ہے۔

اِس معاملے میں دوسری مثال پاکستان کی ہے۔ پاکستان 1947 میں بنا۔ اِس سے پہلے برصغیر ہند کا پورا علاقہ ایک واحد ملک کی حیثیت رکھتا تھا جس میں مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ آباد تھے۔ اُس وقت مسلمانوں کے کچھ رہنماؤں نے متحدہ ہندستان میں دو قومی نظریہ (two nation theory) چلایا۔ اُن کا کہنا تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ اُن کو اپنے مذہب کے مطابق، زندہ رہنے کے لیے ایک الگ ملک چاہیے۔ یہ تحریک اِس مفروضے پر قائم تھی کہ مسلم قوم کے نام سے ایک امت آل ریڈی موجود ہے، اب صرف اُس کو ایک علاحدہ خطۂ ارض کی ضرورت ہے۔ اُس زمانے میں ایک مسلم شاعر کا یہ شعر بہت مقبول ہوا:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

جان ومال کی بے پناہ قربانی کے بعد 1947 میں جغرافی معنوں میں پاکستان وجود میں آ گیا، مگر معنوی اعتبار سے، پاکستان کا اب تک کوئی وجود نہیں۔ پاکستان میں نہ اسلام آیا اور نہ وہاں کے

مسلمانوں کو امن اور تحفظ حاصل ہوا۔حقیقت یہ ہے کہ آج انڈیا کے مسلمان، اسلام اور امن وتحفظ دونوں اعتبار سے، پاکستان کے مسلمانوں سے بہت زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ 1971 سے پہلے انڈیا کے مسلمان، پاکستان جانے کے لیے بے تاب رہتے تھے،مگر آج انڈیا کا کوئی مسلمان، پاکستان جانے کے لیے تیار نہیں، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ انڈیا میں وہ پاکستانی مسلمانوں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے زیادہ بہتر حالت میں ہے۔

پاکستان بننے کے اول دن ہی سے وہاں باہمی ٹکراؤ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں کو گولی ماردی گئی۔پاکستان کے مسلمانوں میں جو باہمی لڑائی شروع ہوئی، اس میں اب تک تقریباً 40 ہزار آدمی ہلاک ہوچکے ہیں۔امریکا میں ایک آزاد تنظیم ہے۔ اس کا نام — فنڈ فار پیس (Fund for Peace) ہے۔اِس تنظیم کا ایک کام یہ ہے کہ وہ ملکوں کے حالات کا سالانہ انڈیکس تیار کرتی ہے۔اِس تنظیم نے 2011 میں ملکوں کا جو انڈیکس شائع کیا ہے، اس کے مطابق، پاکستان ایک ناکام ریاست (failed state) کی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔

اِس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ پاکستان کے مسلم رہنماؤں نے یہ فرض کرلیا کہ امتِ مسلمہ عملاً موجود ہے، اب صرف یہ ضرورت ہے کہ اس کو اقتدار حاصل ہوجائے، جب کہ اصل صورتِ حال یہ تھی کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، امتِ مسلمہ کا وجود ہی نہ تھا۔ جو چیز موجود تھی، وہ امت کے نام پر صرف ایک انبوہ تھا۔ایسی حالت میں کام کا آغاز افراد کی اصلاح کرکے دوبارہ امت کو وجود میں لانا تھا۔ پاکستان کے مسلم رہنماؤں نے جو کچھ کیا، وہ گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا (putting the cart before the horse) تھا۔اِس قسم کا غیر فطری منصوبہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا، اور پاکستان کے معاملے میں ایسا ہی ہوا۔

فلسطین کی تحریک میں تمام عرب دنیا براہِ راست طور پر اور بقیہ مسلم دنیا بالواسطہ طور پر شریک ہے، مگر بے پناہ قربانیوں کے باوجود ابھی تک ایسا نہیں ہوا کہ فلسطین میں عربوں کی مطلوب حکومت قائم ہوجائے۔لیکن جہاں تک سبق کا تعلق ہے، وہ فلسطین کی مثال میں بھی پوری طرح موجود ہے۔

فلسطین میں اگر بالفرض عربوں کی حکومت قائم ہوجائے تو عملاً وہ بھی ایک ناکام ریاست ہی ثابت ہوگی، کیوں کہ فلسطینی عرب بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح صرف ایک انبوہ ہیں، نہ کہ تیار شدہ افراد۔ ایسی حالت میں بالفرض اگر فلسطین میں عربوں کی حکومت قائم ہوجائے تو فلسطین میں عملاً وہی ہوگا جو دوسرے عرب ملکوں میں ہورہا ہے، یعنی یا تو سخت قسم کی ڈکٹیٹرشپ (dictatorship)، یا اگر بالفرض آزادی کا ماحول ہو تو خود فلسطینی مسلمانوں کے درمیان سخت قسم کی باہمی جنگ۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں صرف ایک ہی محفوظ طریقہ باقی ہے، اور وہ ہے— اسٹیٹس کوازم کا طریقہ، یعنی حالتِ موجودہ کو یک طرفہ طور پر تسلیم کرلینا۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر نفرت اور تشدد کا طریقہ ختم کردیں۔ وہ اقدام کی نوعیت کی تمام سرگرمیوں کو مکمل طور پر بند کردیں۔ وہ یوٹرن (U turn) لیتے ہوئے اپنے عمل کے میدان کو بدل دیں۔ وہ دوسروں سے ٹکراؤ کے بجائے خود اپنے افراد کی تعلیم وتربیت کی طرف لوٹ آئیں۔ وہ اپنی تمام طاقت کو ''اقدام'' کے بجائے ''تیاری'' پر مرتکز کردیں۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے لیے زندگی کا یہی واحد راستہ ہے۔ اِس کے سوا جو کچھ ہے، وہ صرف ہلاکت ہے، نہ کہ زندگی۔

خدا اور پیغمبر

پاکستان کے قدرت اللہ شہاب (وفات: 1986) نے اپنی ضخیم کتاب ''شہاب نامہ'' میں اپنے زمانہ طالب علمی کا ایک تجربہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''آبادی سے دور ایک مخبوط الحواس، مجنون صفت، مجذوب نما شخص ویرانے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اور ہمہ وقت اِلّا اللہ، اِلّا اللہ کی ضربیں لگاتا رہتا تھا۔ میں اور میرا ایک ہم عمر ہندو دوست اکثر اس کے پاس جا کر اس کا منھ چڑایا کرتے اور اس کے ذکر کی نقلیں اتارا کرتے تھے۔ میرا ہندو دوست اِلّا اللہ کے وزن پر مہمل، مضحکہ خیز اور کبھی کبھی فحش قافیے جوڑ کر مذاق بھی اڑایا کرتا تھا۔ مجذوب نے ہمیں بار بار ڈانٹا کہ ہم اللہ کے نام کی بے حرمتی نہ کریں، لیکن ہم باز نہ آئے۔ ایک روز ہم دونوں اِسی مشغلے میں مصروف تھے کہ ایک شخص اُدھر سے چند نعتیہ اشعار الاپتا ہوا گزرا، جس کا ایک مصرعہ یہ تھا:

محمدؐ نہ ہوتے، تو دنیا نہ ہوتی

یہ مصرع سن کر میرا ہندو دوست زور زور سے ہنسنے لگا۔ اور اس نے اسمِ محمدؐ کی شان میں کچھ گستاخیاں بھی کیں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، لپک کر ایک پتھر اٹھایا، اور اسے گھما کر ہندو لڑکے کے منہ پر ایسے زور سے دے مارا کہ اس کا سامنے کا آدھا دانت ٹوٹ گیا۔

لاشعور کی وہ کون سی لہر تھی جو اللہ کے ساتھ مذاق پر تو خاموش رہتی تھی، لیکن رسول اللہ کے ساتھ گستاخی پر آناً فاناً جوش میں آگئی تھی؟ کوئی شخص رسول خدا کے متعلق بدزبانی کرے تو اکثر لوگ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ تو مرنے مارنے کی بازی تک لگا بیٹھتے ہیں۔ اس میں اچھے، نیم اچھے یا برے مسلمان کی بالکل کوئی تخصیص نہیں، بلکہ تجربہ تو یہی شاہد ہے کہ جن لوگوں نے ناموسِ رسول پر اپنی جانِ عزیز کو قربان کر دیا، ظاہری طور پر نہ تو وہ علم وفضل میں نمایاں تھے اور نہ زہد وتقوی میں ممتاز تھے۔ ایک عامی مسلمان کا شعور اور لاشعور جس شدت

اور دیوانگی کے ساتھ شانِ رسالت کے حق میں مضطرب ہوتا ہے، اس کی بنیاد عقیدے سے زیادہ عقیدت پر مبنی ہے۔خواص میں یہ عقیدت ایک جذبہ اور عوام میں ایک جنون کی صورت میں نمودار ہوتی ہے''۔(شہاب نامہ، لاہور، 1988، صفحہ 17۔16)

قدرت اللہ شہاب نے جو بات کہی ہے، وہ بلاشبہ ایک واقعہ ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام مسلمان، غالباً کسی استثنا کے بغیر، اِسی نفسیات کا شکار ہیں۔خدا کی بے حرمتی ہو تو مسلمانوں کے جذبات نہیں بھڑکتے، لیکن رسول کی بے حرمتی ہو تو تمام مسلمان شدید طور پر بھڑک اٹھتے ہیں۔فتوے اور بیانات سے لے کر عوامی مظاہرے تک وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔اِس معاملے میں ان کی جذباتیت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ تشدد اور توڑ پھوڑ تک کو اپنے لیے جائز سمجھ لیتے ہیں۔اِس معاملے کی مثالیں بار بار میڈیا میں آتی رہتی ہیں۔اِس کی ایک مثال وہ ہے جو ماہ نامہ الرسالہ (دسمبر 2012، صفحہ 25) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

خدا اور رسول کے درمیان اِس فرق کا سبب کیا ہے۔اِس کے سبب کی تحقیق کیجئے تو اِس کے پیچھے مسلمانوں کی ایک ایسی کمزوری کی دریافت ہوتی ہے جو صرف ایک کمزوری نہیں، بلکہ وہ یقینی طور پر ایک سنگین جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔

خدا کا عقیدہ

خدا کے خلاف لکھنے اور بولنے والے پہلے بھی دنیا میں پائے جاتے تھے، لیکن موجودہ زمانے میں ایسے لوگوں کی تعداد ہزاروں گنا زیادہ بڑھ گئی ہے۔فریڈرک نٹشے (Friedrich Nietzsche) مشہور جرمن فلسفی ہے۔56 سال کی عمر میں 1900 میں اس کی وفات ہوئی۔جدید فلسفے میں اس کا بہت بڑا درجہ مانا جاتا ہے۔نٹشے نے کھلے طور پر کہا تھا کہ — خدا مر چکا ہے:

God is dead. (EB. 13/79)

البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein) دورِ جدید کا مشہور ترین جرمن سائنس داں ہے۔76 سال کی عمر میں 1955 میں اس کی وفات ہوئی۔خدا کے بارے میں آئن سٹائن کے خیالات کیا تھے،

اس کا اظہار آئن سٹائن کے ایک مطبوعہ خط سے ہوتا ہے۔ یہ خط اس نے 3 جنوری 1954 کو اپنی ہینڈ رائٹنگ میں جرمن زبان میں ایک یہودی فلاسفر ایرک بی گٹ کائنڈ (Eric B. Gutkind) کے نام لکھا تھا۔ اِس خط میں اس نے لکھا تھا کہ — خدا کا لفظ میرے نزدیک اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ وہ صرف انسانی کمزوریوں کا ایک اظہار ہے:

> The word God is for me nothing more than the expression of human weaknesses.

موجودہ زمانے میں خدا کے عقیدے کے خلاف جو کتابیں لکھی گئی ہیں اور جو مقالات شائع ہوئے ہیں، ان کی تعداد ہزاروں سے بھی زیادہ ہے۔ اِس نوعیت کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

God: The Failed Hypothesis, by Victor Stenger, 2007

Society without God, by Phil Zuckerman, 2008

God is not Great, by Christopher Hitchens, 2009

انٹرنیٹ پر اِس نوعیت کی کئی مستقل ویب سائٹس ہیں۔ مثلاً:

God is Imaginary, God Does not Exist

اِس سے بڑھ کر یہ کہ موجودہ زمانے کا سب سے بڑا علمی موضوع سائنس ہے۔ سائنس کو موجودہ زمانے کا سب سے زیادہ طاقت ور علمی موضوع سمجھا جاتا ہے۔ مگر حال یہ ہے کہ سائنس کے تمام شعبوں سے خدا کو مکمل طور پر خارج کر دیا گیا ہے۔ سائنس بظاہر تخلیق (creation) کے مطالعے کا نام ہے، مگر سائنس کی تمام شاخوں میں خالق (Creator) کو پوری طرح حذف کر دیا گیا ہے۔ اِس کی آخری حد یہ ہے کہ خود سائنس کے مطالعے سے موجودہ زمانے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ کائنات میں واضح طور پر ایک ذہین ڈیزائنر (intelligent designer) پایا جاتا ہے۔

یہ دریافت اپنے آپ میں ثابت کرتی ہے کہ یقینی طور پر کائنات کے پیچھے ایک ذہین ڈیزائنر موجود ہے۔ اِس کے باوجود سائنٹفک کمیونٹی (scientific community) خدا کے وجود کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

خدا اور مسلمان

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ علم اور کلچر دونوں اعتبار سے، ایک خدا ناشناس زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ طبقے کا کیس صرف یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کے وجود پر یقین نہیں رکھتا، بلکہ وہ کھلے طور پر خدا کے عقیدے کا استہزا کرتا ہے۔ وہ کھلے طور پر اُس مذموم روش میں مبتلا ہے جس کو بیان کرنے کے لیے ''خدا کی شان میں گستاخی'' کا لفظ بھی ہلکا ہے۔ اس کو بیان کرنے کے لیے کوئی شدید تر لفظ وضع کرنا پڑے گا۔ یہ سب کچھ کسی ایک مقام پر نہیں، بلکہ ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔

موجودہ زمانے کی لائبریریوں میں ایسی کتابیں کثرت سے موجود ہیں جو خدا کے بارے میں اُس سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہیں جس کی مثال سلمان رشدی کی کتاب سیٹنک ورسیس (*The Satanic Verses*) میں پائی جاتی ہے۔ اِس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ اِس سے کم تر درجے کے کیس میں مسلمانوں کی حمیتِ رسول آخری حد تک بھڑک اٹھتی ہے، جب کہ خدا کے معاملے میں ان کی حمیت نہیں بھڑکتی۔

مثال کے طور پر ستمبر۔ نومبر 2012 میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر امریکی فلم (*Innocence of Muslims*) کے خلاف احتجاج (protest) کیا۔ یہ احتجاج مصر سے لے کر آسٹریلیا تک، بہت سے شہروں میں کیا گیا۔ اِس میں ہر جگہ مسلمانوں کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔ کئی جگہ اِس احتجاج نے تشدد اور توڑ پھوڑ کی صورت اختیار کر لی۔ میڈیا کی رپورٹ کے مطابق، اِس احتجاج میں تقریباً 80 لوگ مارے گئے اور ایک سو سے زیادہ لوگ زخمی ہوئے۔ اِس درمیان پراپرٹی کا جو نقصان ہوا، وہ اس کے علاوہ ہے۔

نفسیاتی تجزیہ

یہ کوئی سادہ معاملہ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اِس کے پیچھے مسلمانوں کی ایک مجرمانہ نفسیات پائی جاتی ہے۔ یہ وہی نفسیات ہے جو مشرکین کے بارے میں قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا

لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمۡ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلٰى شُرَكَآئِهِمۡ ۗ سَآءَ مَا يَحۡكُمُوۡنَ (6:136) یعنی خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے ہیں، اُس میں سے اُنھوں نے خدا کا کچھ حصہ مقرر کیا ہے۔ پس، اپنے گمان کے مطابق، وہ کہتے ہیں کہ یہ حصہ اللہ کا ہے اور یہ حصہ ہمارے شریکوں کا۔ پھر جو حصہ اُن کے شریکوں کا ہوتا ہے، وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا اور جو حصہ اللہ کے لیے ہے، وہ اُن کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔ کیسا برا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

لوگ اللہ اور اپنے شرکا کے درمیان جو تفریق کرتے تھے، وہ کوئی سادہ بات نہ تھی۔ اِس کا سبب دراصل اُن کے غلط مفروضات تھے۔ انھوں نے بطور خود یہ عقیدہ بنا رکھا تھا کہ اُن کو دنیا میں جو کچھ ملتا ہے، وہ ان کے شرکا کی برکت سے ملتا ہے۔ اِس خود ساختہ عقیدے کی بنا پر وہ سمجھتے تھے کہ اصل مسئلہ شرکا کو خوش رکھنے کا ہے۔ اگر شرکا خوش رہیں گے تو ان کے سارے معاملات درست رہیں گے۔ اِس عقیدے کی بنا پر وہ شرکا کے حصے کو تو پورا کر دیتے تھے اور خدا کا حصہ کم کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔

ٹھیک یہی معاملہ مسلمانوں کا ایک اور اعتبار سے ہے۔ صحابہ اور تابعین کے بعد مسلمانوں میں جو ذہن بنا، اُس ذہن کے تحت مسلمانوں نے خود ساختہ طور پر یہ کیا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کو سب سے بڑا درجہ دے دیا۔ انھوں نے اپنے پیغمبر کا درجہ اتنا بڑھایا کہ خدا اُن کے لیے عملاً صرف ایک رسمی عقیدہ بن کر رہ گیا۔

اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ دورِ تصنیف میں مسلمانوں کے لکھنے والوں نے پیغمبر کی عظمت پر ہزاروں کتابیں لکھیں، لیکن وہ اللہ کی عظمت پر کوئی قابلِ ذکر کتاب نہ لکھ سکے۔

بعد کے زمانے میں یہ ہوا کہ مسلمانوں کے پاس جتنے بڑے بڑے القاب تھے، وہ سب انھوں نے اپنے پیغمبر کو دے دیے۔ مثلاً سرورِ عالم، شہنشاہِ کونین، تاج دارِ دو عالم، سید الکونین، وغیرہ۔ اِس قسم کے بڑے بڑے القاب جب پیغمبر کو دے دئے جائیں تو اس کے بعد انسانی الفاظ میں، اللہ کو دینے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اِس بنا پر ایسا ہوا کہ اللہ کا تصور ایک باعظمت تصور کی حیثیت سے شعوری طور پر مسلمانوں کے ذہن میں باقی نہیں رہا۔ یہی وہ ذہن ہے جس کی نمائندگی

ایک مسلم شاعر نے اِن الفاظ میں کی ہے:

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے　　　جو کچھ ہمیں لینا ہے، لے لیں گے محمد سے

اسلام کی تاریخ

اپنے پیغمبر کے بارے میں بعد کے زمانے میں مسلمانوں کے اندر جو ذہن بنا، اس کا ایک سیاسی پس منظر تھا۔ اصل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ استثنائی طور پر یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک عظیم تاریخ آپ کے نام کے ساتھ وابستہ ہوگئی۔ آپ کے زمانے میں اور آپ کے اصحاب کے زمانے میں ایک بڑا سیاسی انقلاب پیش آیا۔ اِس سے پہلے کسی پیغمبر کے زمانے میں اِس قسم کا سیاسی انقلاب پیش نہیں آیا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا موحدانہ مشن شروع کیا، جب کہ اُس وقت آپ ایک فردِ واحد کی حیثیت رکھتے تھے، مگر 23 سال کے بعد جب 632 عیسوی میں آپ کی وفات ہوئی تو پورا عرب آپ کے دین کا پیرو بن چکا تھا۔ اُس کے بعد آپ کے اصحاب نے آپ کے مشن کو جاری رکھا، یہاں تک کہ اگلے 25 سال کے دوران عرب کے اطراف کے بیش تر ممالک میں آپ کے پیروؤں کا اقتدار قائم ہوگیا۔ ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر کا خاتمہ ہوگیا۔ آپ کی بعثت کے 100 سال کے اندر یہ ہوا کہ آپ کے ماننے والوں نے ایک عظیم مسلم ایمپائر قائم کرلیا، جس کا دبدبہ کم وبیش ہزار سال تک باقی رہا۔

یہ سیاسی انقلاب اتنا زیادہ واضح تھا کہ سیکولر مورخین نے بھی کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک امریکی مصنف جان ڈرنک واٹر (وفات: 1937) نے اپنی ایک کتاب میں پیغمبر اسلام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ — وہ عالمی تاریخ میں ایک انتہائی ممتاز انسان کی حیثیت رکھتے ہیں:

One of the most remarkable men in history of the world.
(*The Outline of Literature* by John Drinkwater, 1923)

انڈیا کے ایک مشہور اسکالر ایم این رائے (وفات: 1954) نے پیغمبر اسلام اور آپ کے بعد بننے والی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ — محمد کا اِس حیثیت سے اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ تمام پیغمبروں میں سب سے بڑے پیغمبر تھے۔ اسلام کی توسیع تمام معجزات میں سب سے بڑا معجزہ ہے:

Muhammad must be recognised as by far the greatest of all prophets. The expansion of Islam is the most miraculous of all miracles. (*The Historical Role of Islam,* by M. N. Roy, 1939, p. 4)

امریکی مصنف ڈاکٹر مائکل ہارٹ نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس میں انھوں نے انسانی تاریخ کے ایک سو ایسے افراد کا ذکر کیا ہے جنھوں نے تاریخ میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اِس فہرست میں انھوں نے پیغمبر اسلام کو نمبر ایک پر رکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ — آپ تاریخ کے تنہا شخص ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے۔ مذہبی سطح پر بھی اور سیکولر سطح پر بھی:

Mohammad was the only man in history who was supremely successful on the religious and secular levels. (Dr. Michael H. Hart, *The 100,* 1978)

اِسی طرح، ایک امریکی اسکالر چارلس اساوی (وفات: 2000) نے اپنی ایک کتاب میں پیغمبر اسلام کا اعتراف اِن الفاظ میں کیا ہے — یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اگر کوئی ایک شخص ایسا ہے جس نے تاریخ کے دھارے کو بدل دیا، تو وہ شخص محمد تھے:

It does not seem too much to say that if any one man changed the course of history, that man was Muhammad. (*Muhammad's Historical Role,* by Charles Issawi, 1950, p. 95)

اِس طرح کے بہت سے سیکولر مصنفین اور غیر مسلم محققین ہیں جنھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ نہایت شان دار الفاظ میں کیا ہے۔ پیغمبر اسلام کے مشن کے ذریعے تاریخ میں جو انقلابی دور آیا، وہ اتنا عظیم تھا کہ تمام اہلِ علم نے اس کا اعتراف کیا، خواہ وہ سیکولر اہلِ علم ہوں یا

مذہبی اہلِ علم ۔ انھوں نے کثرت سے اِس موضوع پر کتابیں لکھیں اور مقالات شائع کیے۔ مذکورہ چند اقتباسات اِس معاملے کی وضاحت کے لیے کافی ہیں۔

خدا کا حصہ پیغمبر کو دینا

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے تحت جو عظیم تاریخ بنی، وہ تمام تر منصوبہ الٰہی کے تحت بنی۔ پیغمبر اسلام سے پہلے ہزاروں سال کے درمیان خدا کی طرف سے بہت سے پیغمبر آئے۔ اِن پیغمبروں کے زمانے میں توحید کا اعلان تو ہوا، لیکن توحید کی بنیاد پر کوئی اجتماعی انقلاب نہ آسکا، جب کہ اللہ تعالی کو مطلوب تھا کہ پیغمبر کے ذریعے ایک ایسا موحدانہ انقلاب برپا ہو جو شرک کے دور کو ختم کرے اور توحید کا دور دنیا میں لے کر آئے۔ آخرکار اللہ تعالی کی یہ منشا ہوئی کہ وہ تاریخ میں مداخلت کرے اور خصوصی نصرت کے ذریعے وہ انقلاب برپا کرے جو کہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کے تحت ضروری تھا۔ اللہ تعالی کے عام منصوبے کے مطابق، اِس منصوبے کی تکمیل اسباب کی صورت میں کی گئی۔ خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِس انقلاب کی بنیادی کڑی تھے۔

اللہ تعالی کے اِس خصوصی منصوبے کا آغاز چار ہزار سال پہلے حضرت ہاجرہ، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے ذریعے عرب کے صحرا میں ہوا۔ اِس منصوبے کے تحت لمبی مدت کے دوران ایک خصوصی نسل تیار کی گئی جس کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ اِس نسل کی اعلیٰ خصوصیات کی بنا پر ایک مستشرق نے اس کو ہیروؤں کی ایک قوم (a nation of heroes) کا لقب دیا ہے۔ اِسی خصوصی نسل میں پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب پیدا ہوئے۔ اِس کے بعد اللہ کی برتر تدبیر کے تحت بہت سے موافق حالات ظہور میں آئے۔ یہ اپنے آغاز سے انجام تک، ایک انتہائی اعلیٰ نوعیت کا خدائی منصوبہ تھا۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے ذریعے جو عظیم اسلامی تاریخ بنی، وہ دراصل اِسی منصوبہ الٰہی کا نتیجہ تھی۔

قرآن میں اِس حقیقت کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کے زمانے میں جو تاریخی انقلاب آیا، وہ کسی فرد کا شخصی کارنامہ نہ تھا، بلکہ وہ براہِ راست طور پر اللہ کے ایک برتر منصوبے کا نتیجہ تھا۔ اِس سلسلے میں قرآن کی دو آیتیں یہ ہیں: يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ

بِاَفۡوَاهِهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوۡرِهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ - هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ (61:8-9) یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھادیں، حالاں کہ اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا، خواہ یہ منکروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تا کہ اللہ اس کو سب دینوں پر غالب کر دے، خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اِس حقیقت کو بار بار نہایت واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ کے مشن کے آغاز کے تقریباً 20 سال بعد مکہ فتح ہوا، جو کہ اُس وقت پورے عرب میں ہر اعتبار سے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ فتح مکہ کے وقت جب آپ فاتحانہ حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تو احساسِ تواضع کے باعث آپ کی گردن جھکی ہوئی تھی، حتی کہ لوگوں نے دیکھا کہ آپ کی داڑھی کجاوے کی لکڑی کو چھو رہی ہے۔ اُس وقت کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر آپ نے جو خطبہ دیا، اُس میں یہ الفاظ تھے: لا إله إلا الله وحده، صدق وعده، ونصر عبده، وهزم الأحزاب وحده (سنن أبي داؤد، رقم الحديث: 4547) یعنی ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اللہ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔ اللہ نے اپنے بندے (محمد) کی نصرت کی اور اللہ نے دشمن کی جماعتوں کو تنہا شکست دے دی۔

حبِ شدید کا تعلق

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کو حبِ شدید (2:165) کا تعلق صرف اللہ سے ہوتا ہے، کسی اور سے نہیں۔ حُبّ کا مطلب ہے: اسٹرانگ افکشن (strong affection)، یعنی شدید قلبی تعلق۔ بعد کے دور کے مسلمانوں کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا کہ جذباتی طور پر اُن کے لیے حبِ شدید کا مرکز اللہ کے بجائے پیغمبر بن گیا۔ اِس طرح اُن کے جذبات کا مرجع بدل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ کی اہانت پر مشتعل نہیں ہوتے، لیکن وہ اپنے پیغمبر کی اہانت پر سخت مشتعل ہو جاتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر، انھوں نے مشرکین کے طریقے کو اختیار کرتے ہوئے یہ کیا کہ اللہ کے کارنامے کو اپنے پیغمبر کا کارنامہ

سمجھ لیا، جو کچھ اللہ کے لیے تھا، اس کو انھوں نے اپنے پیغمبر کے حصے میں ڈال دیا۔

سیرت اور تاریخ کی کتابیں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیرت اور تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ فخر کی نفسیات کے تحت لکھی گئیں۔ سیرتِ رسول کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا عنوان غزواتِ رسول (مغازی) بن گیا، اور تاریخ اسلام پر لکھی جانے والی کتابوں کا عنوان شاہ نامہ اسلام اور فتوح البلدان قرار پایا۔ اِس بنا پر ایسا ہوا کہ سیرتِ رسول اور تاریخ اسلام کی کتابوں میں خدا کا عامل (divine factor) حذف ہوگیا۔ اسلام کی تاریخ عام طرز کی انسانی تاریخ بن گئی، وہ خدائی تاریخ نہ بن سکی۔ جب کہ اصل حقیقت کے اعتبار سے، سیرتِ رسول اور اسلامی تاریخ دونوں میں اللہ کا خصوصی منصوبہ کارفرما تھا۔

سیرت نگاری اور تاریخ نگاری کا یہی غیر واقعی طریقہ بعد کے زمانے کے مسلمانوں میں رائج ہوگیا۔ اُس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر جو ذہن بنا، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ تھا کہ انھوں نے تاریخ کی تمام عظمتوں کو اپنے پیغمبر کے خانے میں ڈال دیا، جو چیز اصلاً خدا کا حصہ تھی، وہ پیغمبر کا حصہ قرار پائی۔ اِس کے بعد مسلمانوں کے اندر جو نفسیات بنی، وہ فطری طور پر یہ تھی کہ اُن کو تمام بڑائی اپنے پیغمبر کی طرف دکھائی دینے لگی، مسلمانوں کے اپنے ذہن کے مطابق، اللہ کے حصے میں کچھ بھی باقی نہ رہا۔

منصوبۂ خداوندی

بارش کے موسم میں بارش ہوتو یہ اِس بات کا ایک خاموش اعلان ہوتا ہے کہ کسان اٹھیں اور اپنے کھیتوں میں کام کرکے اُن میں بیج ڈالیں، تاکہ کھیتوں سے سرسبز وشاداب فصل اگے۔ لیکن کسان اگر ایسا کرے کہ وہ اپنے گھر سے نکل کر پہاڑ کی طرف جائے اور وہاں وہ کوہ پیمائی (mountaineering) کرنے لگے۔ کوئی انسان اگر ایسا کرے تو کوششوں اور قربانیوں کے باوجود وہ کوئی نتیجہ حاصل نہ کرسکے گا، کیوں کہ وہ خالق کی مرضی کے خلاف چل رہا ہے۔

یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین کے معاملہ میں بھی یہی ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے امکانات کھولے جاتے ہیں۔ اہلِ ایمان کا کام ہوتا ہے کہ وہ اِن امکانات کو پہچانیں اور اُن کو بھرپور طور پر استعمال (avail) کریں۔ اگر اہلِ ایمان ایسا کریں کہ اللہ نے امکانات تو کہیں اور کھولے ہوں، لیکن اہلِ ایمان کسی دوسرے محاذ پر کوشش شروع کردیں۔ اہلِ ایمان اگر ایسی غلطی کریں تو خواہ وہ کتنی ہی قربانیاں دیں، مگر اس کا کوئی نتیجہ ہرگز برآمد نہیں ہوگا۔ ایسے لوگ قرآن کے الفاظ میں، **حبطت أعمالهم في الدنيا والآخرة** کا مصداق قرار پائیں گے۔

اِس دنیا میں کوئی بھی عمل صرف انسان کی کوشش سے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اِس دنیا میں کسی عمل کی کامیابی کی لازمی شرط یہ ہے کہ اس کو خدا کی تائید حاصل ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کی عقل کا امتحان ہورہا ہے۔ خدا کی طرف سے جب بھی کوئی امکان کھولا جاتا ہے تو وہ ہمیشہ ایک خاموش امکان کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ کبھی آسمان سے آواز نہیں آتی، حتی کہ جب اِس دنیا میں خدا کا کوئی پیغمبر آتا ہے تو بلاشبہہ وہ خدا کا ایک خصوصی منصوبہ ہوتا ہے، لیکن اُس وقت بھی آسمان سے یہ آواز نہیں آتی کہ — اے لوگو، یہ خدا کا رسول ہے۔ اس کو سنو اور اس کا اتباع کرو۔ یہ ایک دریافت کا معاملہ ہے جو انسان کو اپنی عقل کے استعمال کے ذریعے خود کرنا پڑتا ہے۔

موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ اِس معاملے میں

مکمل طور پر ناکام رہے۔ موجودہ زمانے میں خدا نے انتہائی اعلیٰ قسم کے دینی مواقع کھول دیے ہیں، لیکن مسلم رہنما، خواہ وہ عرب رہنما ہوں یا غیر عرب رہنما، سب کے سب اِس معاملے میں بے خبر رہے۔ وہ خدا کی اسکیم کے خلاف کسی اور میدان میں زور آزمائی کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 200 سال سے بھی زیادہ مدت تک جان و مال کی قربانیاں دینے کے باوجود اُنھیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔

خدا کا مقصود کیا ہے

خدا کے نزدیک کرنے کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انسان کو خدا کے منصوبۂ تخلیق سے باخبر کیا جائے۔ اِسی مقصد کے لیے خدا نے اپنے تمام رسول بھیجے، اور اِسی مقصد کے لیے آخر میں قرآن بھیجا اور اس کے متن (text) کو مکمل طور پر محفوظ کردیا۔ قرآن اِس تخلیقی منصوبے کا ایک مستند بیان (authentic statement) ہے۔ اب ضرورت ہے کہ یہ خدائی بیان ہر دور کے انسانوں تک پہنچتا رہے۔ اِسی عمل کا نام دعوت الی اللہ ہے۔

مقامی دعوت سے عالمی دعوت تک

پچھلے زمانوں میں جن داعیوں نے دعوت الی اللہ کا کام کیا، ان کا کام مقامی دائرے تک محدود رہا۔ دعوت کا کام ہمیشہ وسائل کی مدد سے ہوتا ہے اور پچھلے زمانے میں عالمی وسائل نہ ہونے کی بنا پر زیادہ وسیع دائرہ میں کام نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انسانی آبادی پورے کرہ ارض پر پھیلی ہوئی تھی، لیکن پچھلے زمانے کے داعیوں کا دعوتی کام وسائل کے فقدان کی وجہ سے عملاً مقامی دائرے تک محدود رہا۔

تائید کا انتظام

اللہ تعالیٰ نے عالمِ فطرت (nature) کے اندر بالقوہ (potential) طور پر ایسے امکانات رکھے تھے جن کو دریافت کرکے اہلِ ایمان عالمی دائرے میں اپنے دعوتی عمل کو انجام دے سکیں۔ یہ امکان بنیادی طور پر وہ تھا جس کو کمیونکیشن (communication) کہا جاتا ہے۔ وہ تمام چیزیں جن کو موجودہ زمانے میں ماڈرن کمیونکیشن (modern communication) کہا جاتا ہے، وہ فطرت کے امکانات کو دریافت کرکے ہی وجود میں آئے ہیں — پرنٹنگ پریس، تیز رفتار سواریاں اور

ملٹی میڈیا، سب کا سب، عالم فطرت کے امکانات کو دریافت کر کے تیار کیا گیا ہے۔ یہ تمام مواصلاتی ذرائع اِسی لیے وجود میں آئے ہیں کہ اہلِ ایمان اُن کو بھرپور طور پر استعمال کریں اور اللہ کے پیغام کو پرامن طور پر تمام انسانوں تک پہنچا دیں۔

موجودہ مسلمانوں کی ناکامی

اسلام کے ظہور کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سیاسی اقتدار عطا کیا۔ یہ سیاسی اقتدار ساتویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارھویں صدی تک کسی نہ کسی طور پر جاری رہا۔ اِس اقتدار کا مقصد حکومت یا عیش وعشرت نہیں تھا۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمان بے خوف ہو کر فطرت (nature) کی تحقیق کریں اور فطرت میں چھپے ہوئے امکانات کو دریافت کر کے وہ مواصلاتی وسائل تیار کریں جن کے ذریعے سے دعوت الی اللہ کے کام کو عالمی طور پر انجام دیا جا سکے۔

اِس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے ایسے اشارے کر دئے تھے جو مسلمانوں کے لیے اپنے رول کو سمجھنے کے لیے کافی ہو سکتے تھے، مگر مسلمان اشارے کی زبان کو سمجھ نہ سکے۔ مثلاً قرآن میں کثرت سے ایسی آیتیں ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ زمین اور آسمان کی تمام چیزیں تمھارے لیے مسخر کر دی گئی ہیں۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ کائنات کی تخلیق اِس طرح ہوئی ہے کہ انسان اُس میں غور وفکر کر کے اس کے اندر چھپے ہوئے موافق امکانات کو دریافت کرے اور اُن کو اپنے حق میں استعمال کرے۔ وہ چیز جس کو آج مواصلاتی ٹکنالوجی کہا جاتا ہے، وہ سب اِس کے اندر شامل ہے۔

دوسرا اہم اشارہ وہ ہے جو اسراء کے واقعے کی صورت میں پیش آیا۔ مکی دور کے آخر میں یہ واقعہ ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی انتظام کے تحت ایک رات کے اندر مسجد حرام (مکہ) سے مسجد اقصیٰ (یروشلم) لے جایا گیا اور پھر واپس اپنے مقام پر پہنچا دیا گیا۔ اِس واقعے کا ذکر قرآن کی سورہ الاسراء (17) میں کیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ مکہ اور یروشلم کے درمیان تقریباً 1250 کلومیٹر کا فاصلہ ہے، یعنی رٹرن جرنی (return journey) کے اعتبار سے 2500 کلومیٹر کا فاصلہ۔

قرآن کی جس سورہ میں اِس واقعے کا ذکر ہے، اس میں مقصدِ سفر کو اِن الفاظ میں

بیان کیا گیا ہے: لنریہ من آیاتنا (17:1) یعنی تا کہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں:

So that We might show him some of Our signs.

اِس آیت میں جس نشانی کا ذکر ہے، اس سے مراد خود سفر ہے، نہ کہ یروشلم میں واقع کوئی چیز۔ اللہ تعالی نے اپنے آخری پیغمبر کے ذریعے جو کتاب ہدایت (قرآن) بھیجی، وہ اِس لیے تھی تا کہ وہ کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں تک پہنچے۔ یہ عالمی پیغام رسانی کیوں کر ممکن ہوگی، اس کے بارے میں اشاراتی طور پر بتایا گیا کہ عالمِ فطرت (nature) میں اللہ نے بالقوہ طور پر تیز رفتار ترسیل (rapid communication) کے امکانات رکھ دئے ہیں جن کو دریافت کر کے واقعہ بناؤ اور اُن کو تمام اہلِ عالم تک پیغام خداوندی (قرآن) کو پہنچانے کے لیے استعمال کرو۔

استبدالِ قوم کا اصول

امتِ مسلمہ کو اللہ تعالی نے لمبی مدت تک یہ موقع دیا کہ وہ فطرت کے اِس امکان کو واقعہ بنائے اور قرآن کے سلسلے میں اپنی عالمی ذمے داری کو پورا کرے، لیکن امتِ مسلمہ کے رہنما اور قائدین اِس راز کو نہ سمجھ سکے۔ وہ دوسرے میدانوں میں سرگرم رہے، لیکن دعوت الی اللہ کے عالمی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جو عمل مطلوب تھا، اُس عمل کو انجام دینے میں وہ پوری طرح ناکام رہے۔

اِس کے بعد اللہ تعالی کی وہ سنت ظاہر ہوئی جس کو قرآن میں استبدالِ قوم (47:38) کہا گیا ہے، یعنی ایک خدائی مطلوب کو انجام دینے میں اگر ایک گروہ ناکام ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرے گروہ کو لے آنا— موجودہ زمانے میں جن مغربی قوموں نے دورِ مواصلات (age of communication) پیدا کیا ہے، وہ اِسی استبدالِ قوم کی توسیعی صورت ہے۔

تائید بذریعہ سیکولر اقوام

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی پیشین گوئیاں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ اُن میں سے ایک پیشین گوئی کے الفاظ یہ ہیں: إن الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر (صحيح البخاري، رقم الحديث: 3062) یعنی اللہ یقیناً اِس دین کی تائید فاجر انسان کے ذریعے کرے گا۔

اِس حدیث میں 'فاجر' سے مراد سیکولر ہے۔ اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب امتِ مسلمہ دعوتِ دین کے عالمی ذرائع کو دریافت کرنے میں ناکام ہوجائے گی تو اُس وقت اللہ تعالیٰ سیکولر لوگوں کو کھڑا کرے گا جو اِس کام کو انجام دیں، یعنی جب دینی محرک (religious incentive) اِس کام کو انجام دینے میں ناکام ہوجائے گا تو اللہ کچھ لوگوں کو دنیوی محرک (secular incentive) کے ذریعہ اٹھائے گا۔ وہ فطرت میں تحقیق و جستجو کے ذریعے فطرت میں چھپے ہوئے امکانات کو واقعہ بنائیں گے۔ یہ اُن لوگوں کی طرف سے امتِ مسلمہ کے لیے ایک سپورٹنگ رول ہوگا۔

موجودہ زمانے میں، خاص طور پر انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں، اہلِ مغرب نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں جو دریافتیں کی ہیں، وہ سب اِسی نوعیت کی ہیں۔ اِن دریافتوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے دعوتی مشن کو انجام دینے کے لیے ایک خارجی سپورٹ کا انتظام کیا ہے۔

ملی رہنماؤں کی ناکامی

اہلِ مغرب نے تائید کا جو کام انجام دیا، اُس کے پیچھے کوئی دینی جذبہ نہیں تھا۔ یہ کام انھوں نے اپنے مادی اور قومی جذبے کے تحت کیا۔ یہ بالکل فطری تھا۔ اِس قسم کے ذاتی محرک کے بغیر وہ خارجی سپورٹ فراہم کرنے کا کام انجام نہیں دے سکتے تھے۔ مزید یہ کہ جب انھوں نے اتنا بڑا تاریخی کام انجام دیا تو یہ بھی فطری تھا کہ اُن کو عالمی دبدبہ حاصل ہوجائے۔ کسی بڑے رول کے ساتھ دبدبہ اِس طرح جڑا ہوا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اِس کے ذریعے اُن کو نہ صرف مادی فائدے حاصل ہوئے، بلکہ اُن کو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر سیاسی غلبہ بھی حاصل ہوگیا۔ یہ اُن کے سپورٹنگ رول کی قیمت تھی۔ اِس قیمت کے بغیر وہ اپنا سپورٹنگ رول انجام نہیں دے سکتے تھے۔

موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے اِس راز کو نہیں سمجھا۔ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کرنے میں عاجز رہے۔ وہ اِس حکمت (wisdom) کا ثبوت نہ دے سکے جس کو اِن الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ — متعلق حصے کو لینا اور غیر متعلق حصے کو چھوڑ دینا۔

مغربی قومیں جب جدید طاقتوں کے ساتھ ایشیا اور افریقہ میں داخل ہوئیں تو اِس داخلے کے

دو پہلو تھے — ایک، یہ کہ اِن مغربی قوموں نے فطری طور پر اُس وقت کی مسلم دنیا میں سیاسی غلبہ حاصل کرلیا۔ اِس واقعے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ یہ قومیں اُس عظیم نعمت کو لے کر آئی تھیں جو خود اسلام کا عین مطلوب تھا، جس کا ہزار سال سے تاریخ کو انتظار تھا، یعنی جدید مواصلات (modern communication)۔ مگر موجودہ زمانے کے مسلم رہنما بروقت اُس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے جو اُس وقت اُن سے مطلوب تھی، یعنی سیاسی مسئلے کو عملی طور پر نظر انداز کرنا اور کمیونکیشن کے جدید ذرائع کو بھرپور طور پر دعوت کے لیے استعمال کرنا۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے تمام مسائل اِسی دانش مندی کے فقدان کا نتیجہ ہیں۔

ایک عرب شیخ عبدالرحمن حبنکہ المیدانی نے اپنی ایک کتاب میں بتایا ہے کہ اِس وقت امتِ مسلمہ کے تمام مسائل کا اصل سبب تین اژدہے ہیں۔ مصنف کے نزدیک، یہ تین اژدہے یا یہ تین بڑے سانپ یہ ہیں — استعمار (colonialism)، استشراق (orientalism)، مسیحی مبلغین (Christian missionaries)۔ یہ کسی ایک مصنف کی بات نہیں، یہی موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلم رہنماؤں کی سوچ ہے۔ اسی غلط سوچ کا یہ نتیجہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان پچھلے 200 سال سے اِن مفروضہ ''افاعی'' سے لڑنے اور ان کو ختم کرنے میں مشغول ہیں، لیکن عملی نتیجہ مکمل طور پر برعکس صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں ''افاعی'' اپنی حقیقت کے اعتبار سے افاعی نہ تھے، بلکہ مذکورہ حدیثِ رسول کے مطابق، وہ موییدینِ اسلام (supporters of Islam) کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوششوں سے موجودہ زمانے میں وہ چیز وجود میں آئی جس کو جدید مواصلات کہا جاتا ہے۔ جدید مواصلات کو انھوں نے اپنے مقصد کے لیے ڈیولپ کیا تھا، لیکن جدید مواصلات، عالمی مواصلات ہیں، اُن پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ اگر مسلم علما اور رہنما صرف یہ کرتے کہ وہ اِن مفروضہ افاعی کے خلاف ٹکراؤ کا محاذ نہ کھولتے اور پُرامن طریقِ کار اختیار کرتے تو بلاشبہہ وہ جدید مواصلات کو کامل طور پر اپنے حق میں استعمال کرسکتے تھے اور اسلام کی عالمی دعوت کے اُس منصوبے کو پورا کرسکتے تھے،

جس کا تاریخ کو ہزار سال سے انتظار ہے۔

ایک تاریخی حوالہ

پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ (Thomas Walker Arnold) ایک ممتاز برٹش مستشرق (orientalist) تھے۔ وہ 1864 میں لندن میں پیدا ہوئے اور 1930 میں اُن کی وفات ہوئی۔ انھوں نے اپنے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر اسلامی دعوت کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب 508 صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ پہلی بار 1896 میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب کا نام یہ ہے:

The Preaching of Islam

اِس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے لے کر بعد کے ہزار سال تک مختلف ملکوں میں اسلام کی دعوت کس طرح پھیلی۔ مثال کے طور پر افریقہ کے بارے میں انھوں نے ایک رپورٹ کے حوالے سے اپنی اِس کتاب میں لکھا ہے کہ — اِس وقت جس رفتار سے افریقہ میں اسلام پھیل رہا ہے، اس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نائجر دریا کے دونوں کناروں پر 1910 تک مشکل ہی سے کوئی گاؤں بچے گا جو اسلام کے حلقے میں نہ آ گیا ہو:

> A Christian missionary reports: "When I came out in 1898, there were few Muhammadans to be seen below Iddah. Now they are everywhere, excepting below Abo, and at the present rate of progress there will scarcely be a heathen village on the river (Niger) banks by 1910." (p. 329)

پروفیسر آرنلڈ نے یہ بات مغربی افریقہ کے نائجر دریا کے دونوں طرف واقع بستیوں کے بارے میں لکھی ہے۔ واضح ہو کہ نائجر دریا تقریباً چار ہزار دو سو کلو میٹر (4, 180) لمبا ہے۔ وہ افریقہ کے پانچ ملکوں کے درمیان بہتا ہے، یعنی — گائنا (Guinea)، مالی (Mali)، نائجر (Niger) بینن (Benin)، نائجیریا (Nigeria)۔ اِسی مثال پر دوسرے ملکوں کے بارے میں قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کی دعوتی توسیع کا یہ عمل انیسویں صدی میں عین اُس وقت رک گیا، جب کہ پرنٹنگ پریس

اور جدید مواصلات کی آمد نے اسلامی دعوت کی عالمی توسیع کا امکان بڑے پیمانے پر کھول دیا تھا— اِس کا سبب یہ تھا کہ انیسویں صدی میں جب یہ نئے امکانات کھلے تو عین اُسی زمانے میں ایک ''مسئلہ'' بھی پیدا ہوگیا، وہ یہ کہ مغربی تہذیب اور مغربی استعمار (Western Colonialism) نے نئے طریقوں کو استعمال کرتے ہوئے مسلم ملکوں میں اپنا دبدبہ قائم کرلیا۔

اُس وقت یہ ہوا کہ تمام دنیا کے مسلمان منفی ردعمل (negative reaction) میں مبتلا ہوگئے۔ انھوں نے مغربی تہذیب اور مغربی استعمار کے خلاف لڑائی کا محاذ کھول دیا۔ کچھ لوگ تقریر اور تحریر کے ذریعے اِس قومی مہم میں شریک ہوگئے، اور کچھ لوگوں نے بطور خود اس کو جہاد قرار دے کر اس کے خلاف مسلح جنگ چھیڑ دی۔

یہ صورتِ حال عملاً آج بھی باقی ہے۔ دعوت کے مواقع برباد ہورہے ہیں اور مسلمان انتہائی ناکام طور پر قومی اور سیاسی لڑائی میں مشغول ہیں۔ اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے جب کہ ساری دنیا کے مسلمان ان تباہ کن سرگرمیوں کو مکمل طور پر ختم کردیں اور پوری یکسوئی کے ساتھ دعوت الی اللہ کے کام میں مشغول ہوجائیں۔

ربوبیت: کائنات میں ربانی تنظیم

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ سارے عالم کا رب ہے (1:1)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کائنات کو پیدا کر کے اس کو چھوڑ نہیں دیا، بلکہ وہ ہر لمحہ کائنات کو مینج کر رہا ہے، مادی کائنات کو بھی اور انسانی تاریخ کو بھی۔ مادی کائنات میں اللہ کا مینج مینٹ (management) کلی معنوں میں ہے، لیکن انسان کو چوں کہ انتخاب کی آزادی (freedom of choice) ملی ہوئی ہے، اِس لیے انسانی زندگی میں اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انسان کی آزادی کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے، اس کو مینج کر رہا ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر انسان اپنا امتحان دے رہا ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر انسان کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو اِس طرح تعمیر کرے کہ وہ آخرت میں جنت میں داخلے کا مستحق قرار پائے جو کہ انسان کی اصل منزل ہے۔ اِس مصلحت کے تحت اللہ موجودہ دنیا کی مسلسل نگرانی کرتا ہے۔ وہ انسانی تاریخ کو اِس طرح مینج کر رہا ہے کہ موجودہ زمین اپنے دار الامتحان (testing ground) ہونے کی حیثیت کو کسی خلل کے بغیر مسلسل طور پر برقرار رکھے۔ اِس کا مقصد زمین پر اجتماعی معنوں میں کوئی صالح نظام قائم کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص اپنی انفرادی تعمیر کرنا چاہے، وہ کسی خلل کے بغیر اپنی شخصی تعمیر کرتا رہے۔

اللہ کی اِس سنت کو قرآن میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (2:251) یعنی اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض لوگوں سے دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جائے، مگر اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے:

> And if God did not check one set of people by means of another, the earth would indeed be full of mischief. But God is full of bounty to all worlds.

انسانی تاریخ کے بارے میں اللہ کا یہ منصوبہ بظاہر کسی اعلان کے بغیر اپنا کام کر رہا ہے۔ قرآن کی سورہ الکہف (18:60-82) میں موسیٰ اور خضر کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، وہ اِسی مینج مینٹ کی ایک جزئی مثال ہیں۔ اِس میں جس کردار کو خضر کہا جاتا ہے، وہ دراصل ایک فرشتہ تھا، نہ کہ کوئی انسان۔

دوطرفہ انتظام

اللہ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد ایک طرف یہ کیا کہ پیغمبروں کو بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا جو ساتویں صدی عیسوی میں خاتم النبیین کے ظہور تک جاری رہا۔ یہ پیغمبر اس لیے آئے تاکہ انسان کو لفظی طور پر یہ بتادیا جائے کہ انسان کے بارے میں اللہ کا تخلیقی منصوبہ کیا ہے، تاکہ جو انسان اِس تخلیقی منصوبے کے مطابق، زندگی گزارنا چاہے، وہ اس کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کر سکے۔ خاتم النبیین کے ذریعے اللہ کا جو کلام قرآن کی شکل میں آیا، وہ پوری طرح محفوظ ہوگیا، اور پرنٹنگ پریس کے دور میں ہر انسان تک اس کا مستند نسخہ پہنچ گیا۔ اِس لیے اب کسی پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہیں۔

اِس خدائی انتظام کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو تاریخ کا ربانی مینج مینٹ (divine-management of history) کہا جاسکتا ہے۔ اِس مینج مینٹ کا خاص حصہ یہ ہے کہ زمین پر کوئی فتنے کی حالت قائم نہ ہونے پائے۔ چناں چہ جب بھی زمین پر فتنے کی کوئی حالت قائم ہوتی ہے تو اللہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے جو اس کو ختم کردینے والے ہوں۔ موجودہ زمانے میں اِس قانونِ دفع کی ایک مثال یہ ہے کہ 1917 میں کمیونسٹ ایمپائر قائم ہوا۔ اس نے ایک بڑے رقبے میں خلافِ مذہب قانون بنا کر انسان سے چوائس (choice) کا حق چھین لیا۔ اُس وقت اللہ تعالی نے امریکا کو استعمال کیا اور تقریباً 75 سال کے بعد 1991 میں کمیونسٹ ایمپائر کے تحت قائم شدہ جبری نظام کا خاتمہ ہوگیا۔

امت مسلمہ کا رول

اِس خدائی منصوبے میں امتِ مسلمہ کا رول کیا ہونا چاہئے، اس کو قرآن میں اشارات کی زبان میں بتا دیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی سورہ الصّف کی ایک آیت یہ ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَ کَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ (61:14) یعنی اے ایمان والو، تم اللہ کے مددگار بنو، جیسا کہ عیسی بن مریم نے حواریوں سے کہا: کون اللہ کے واسطے میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے

کہا: ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگوں نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی، اُن کے دشمنوں کے مقابلے میں، مدد کی، پس وہ غالب ہو گئے۔

قرآن کی اِس آیت میں ایک بہت اہم بات کہی گئی ہے۔ اِس آیت کا خطاب امتِ مسلمہ سے ہے، لیکن اِس میں امتِ مسیح کے ایک نمونے کو بطور ماڈل پیش کیا گیا ہے اور امتِ مسلمہ سے یہ کہا گیا ہے کہ تم بھی اُسی ماڈل کے مطابق کام کرو جس کے مطابق، امتِ مسیح نے کام کیا یا مستقبل میں کام کریں گے۔ یہ ماڈل آئڈیالوجی یا عقیدہ کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ وہ صرف طریقِ کار (method) کے اعتبار سے ہے۔ اِس اعتبار سے، امتِ مسیح (Christian community) کے یہاں جو ماڈل ملتا ہے، اس کی دو تاریخی مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ بعد کے زمانے میں مسیحی گروہ، تعداد کے اعتبار سے، سب سے بڑا مذہبی گروہ بن جائے گا (صحیح مسلم، کتاب الفتن)۔ ایسا کیوں کر ہوگا، اس کا جواب بھی اِسی مثال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

اِس معاملے کی پہلی مثال وہ ہے جو خود حضرت مسیح کے زمانے میں پیش آئی۔ حضرت مسیح کا مقامِ عمل قدیم فلسطین تھا۔ فلسطین میں حضرت مسیح کے ابتدائی پیروؤں پر سخت ظلم کیا گیا، مگر حضرت مسیح کی تعلیم کے مطابق، اُن کے پیروؤں نے اپنے دشمنوں سے کوئی نفرت نہیں کی۔ انھوں نے دشمنوں کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہیں کی، حتی کہ ان کے خلاف کوئی پروپیگنڈہ بھی نہیں کیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ فلسطین سے باہر چلے گئے اور حضرت مسیح کی تعلیم: دشمن سے محبت کرو (love your enemy) کے اصول پر عمل کرتے ہوئے پر امن دعوت (peaceful missionary work) میں مشغول ہو گئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سینٹ پال کے زیر اثر مسیحی گروہ کے اندر کچھ نظریاتی انحرافات پیدا ہوئے، لیکن جہاں تک پر امن طریقِ کار کا معاملہ ہے، اُس پر وہ بدستور پوری طرح قائم رہے۔ پر امن مشنری سرگرمیوں کے ذریعے مسیحیت مختلف ملکوں میں پھیلتی رہی، یہاں تک کہ رومی شہنشاہ کانسٹینٹین اول (Constantine I) نے 337 میں مسیحی مذہب قبول کرلیا۔ یہ الناس علی دین ملوکھم کا دور تھا۔ چناں چہ جلد ہی ایسا ہوا کہ یورپ کے تقریباً تمام باشندوں نے مسیحی مذہب کو اختیار کرلیا، مسیحی گروہ کو

یہ غیر معمولی کامیابی تمام تر پر امن دعوت کے ذریعے حاصل ہوئی۔

مسیحی گروہ کے ذریعے تاریخ میں اِس سلسلے میں دوسرا ماڈل ساتویں صدی عیسوی میں قائم ہوا۔ ساتویں صدی میں مسلمانوں کو جب عروج ہوا تو انھوں نے رومن ایمپائر کو توڑ دیا اور اِس مسیحی سلطنت کے پورے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ اِس علاقے میں مسیحی عقیدے کے مطابق، مقدس مقامات، شام اور فلسطین، بھی شامل تھے۔ بعد کے زمانے میں یورپ کے مسیحی بادشاہوں کے اندر یہ جذبہ پیدا ہوا کہ وہ اپنے مقدس مقامات کو مسلمانوں سے واپس لے لیں۔ اِس مقصد کے لیے انھوں نے وہ جنگ چھیڑی جو تاریخ میں، صلیبی جنگ (Crusades) کے نام سے مشہور ہے۔ صلیبی جنگ وقفے وقفے سے تقریباً دوسو سال (1095-1291) تک جاری رہی۔ مورخ گبن کے الفاظ میں، اِس جنگ میں یورپ کی مسیحی قوموں کو ذلت آمیز شکست (humiliating defeat) ہوئی۔ مگر تاریخ کا یہ انوکھا معجزہ ہے کہ اِس شکست کے بعد مسیحی قوموں میں منفی ردّعمل (negative reaction) کا جذبہ پیدا نہیں ہوا، بلکہ انھوں نے یہ کیا کہ اپنے جذبے کو پُرامن عمل کی طرف ڈائورٹ (divert) کردیا، یعنی مسلمانوں سے مسلح مقابلہ ختم کرکے علم وتحقیق کے میدان میں اپنی کوششوں کو صرف کرنا۔

ڈائورژن (diversion) کے اِس عمل کو ابتدائی زمانے میں، اسپر چول کروسیڈ (spiritual crusades) کہا گیا تھا۔ بعد کو وہ رفتہ رفتہ سائنٹفک کروسیڈ (scientific crusades) میں تبدیل ہوگیا۔ اِس عمل میں اُس وقت چرچ رکاوٹ بن گیا تو انھوں نے سخت جدوجہد کے بعد چرچ کے اختیارات پر حد بندی قائم کردی، پھر 1929 میں چرچ کو ویٹکن (روم) کے محدود رقبے میں گویا ہاؤس اریسٹ (house arrest) کردیا جس کا کُل رقبہ صرف 109 مربع ایکڑ ہے۔

اِس دور میں یورپ کے جن لوگوں نے سائنٹفک کروسیڈ (scientific crusades) یا سائنسی ریسرچ کے میدان میں کام کیا، وہ تقریباً سب کے سب مسیحی افراد تھے۔ اِس سائنسی عمل میں بریک تھرو (breakthrough) اُس وقت آیا، جب کہ 1609 میں اٹلی کے فلکیاتی عالم گلیلیو (Galileo Galilei) نے ابتدائی دوربین تیار کی اور اس کے ذریعے خلا کا مشاہدہ کیا۔

اس مشاہدے نے سائنس دانوں کے سامنے عمل کا ایک ایسا میدان کھول دیا جو ناقابل قیاس حد تک وسیع تھا۔ اُس وقت یورپی ذہن نے یہ جانا کہ ہم عالمِ صغیر میں جی رہے تھے، جب کہ یہاں عالمِ کبیر ہمارا استقبال کرنے کے لیے موجود ہے۔ اس کے بعد یورپ کے مسیحی اہلِ علم پوری طرح سائنسی تحقیق کے میدان میں سرگرم ہوگئے، یہاں تک کہ انھوں نے تاریخ میں پہلی بار ایک نیا دور پیدا کردیا جس کو عام طور پر جدید تہذیب (modern civilization) کہا جاتا ہے۔

قابلِ تقلید ماڈل

قرآن کی سورہ الصّف میں پیروانِ مسیح کے اِس ماڈل کو اہلِ ایمان کے لیے قابلِ تقلید ماڈل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اِس سے مراد خاص طور پر پیروانِ مسیح کی تاریخ کے یہی دو واقعات ہیں۔ پہلا واقعہ وہ ہے جو حضرت مسیح کے بعد کی ابتدائی صدیوں میں پیش آیا، اُس وقت پیروانِ مسیح کو سخت طور پر ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا تھا، لیکن انھوں نے اس کے مقابلے میں ردعمل کا طریقہ اختیار نہیں کیا، بلکہ وہ طریقہ اختیار کیا جو حضرت مسیح نے اُن کو اِن الفاظ میں بتایا تھا — اپنے دشمن سے محبت کرو۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ دوسروں کی طرف سے اگر تم کو دشمنی کا تجربہ ہو تب بھی تم اپنے آپ کو منفی نفسیات سے بچاؤ اور یک طرفہ طور پر پرامن طریقہ اختیار کرتے ہوئے دوسروں تک اپنا پیغام پہنچاؤ۔

پیروانِ مسیح کے ماڈل میں دوسرا نمونہ وہ ہے جو صلیبی جنگوں کے بعد سامنے آیا، یعنی عسکری میدان میں ناکامی کے بعد اپنے میدانِ عمل کو بدل دینا، جیسا کہ پیروانِ مسیح نے کیا۔ انھوں نے مسلح کروسیڈ کے میدان میں اپنی کوششوں کو بے نتیجہ پایا تو انھوں نے ڈائورژن کا طریقہ اختیار کیا، اِس طرح کہ عسکری میدان کو چھوڑ کر پرامن سائنسی میدان میں اپنے آپ کو سرگرمِ عمل کرلیا۔

امت مسلمہ کی کوتاہی

عجیب بات ہے کہ سورہ الصّف میں مسلمانوں کو جو عملی نصیحت کی گئی تھی، اس کو وہ اختیار نہ کرسکے۔ مسلمانوں سے یہ مطلوب تھا کہ وہ پیروانِ مسیح کے اُس ماڈل کو اپنائیں جس کو قرآن میں پیشگی طور پر بتا دیا گیا تھا۔ یہی وہ پرامن ماڈل ہے جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے

موقع پر اختیار فرمایا تھا۔مگر مسلمان بحیثیت قوم اِس سے بے خبر رہے، وہ اِس ماڈل کو اپنانے میں ناکام رہے۔مسلمانوں کی تاریخ میں اِس کی دو بڑی مثالیں موجود ہیں۔

پہلی مثال وہ ہے جو نوآبادیاتی طاقتوں کے ظہور کے بعد پیش آئی۔اِس دور میں یورپ کی نوآبادیاتی طاقتوں نے مسلمانوں کی سلطنتوں کو توڑ دیا اور ان کے سیاسی دبدبے کو ختم کر دیا۔اس کے بعد مسلمان منفی ردعمل کی نفسیات کا شکار ہوگئے۔وہ نفرت اور انتقام اور تشدد میں مبتلا ہوکر رہ گئے، حالاں کہ قرآن میں بیان کردہ پیروانِ مسیح کے ماڈل کے مطابق، انھیں یہ کرنا تھا کہ وہ پُرامن طریقِ کار اختیار کرتے، یعنی وہ میدانِ جنگ کو چھوڑ کر میدانِ دعوت میں آجاتے، جن لوگوں کو وہ اپنا حریف سمجھ کر اُن سے متشددانہ ٹکراؤ کر رہے تھے، اُن کو مدعو کا درجہ دے کر وہ ان کے اوپر پرامن دعوہ ورک شروع کر دیتے۔اگر مسلمان ایسا کرتے تو یقیناً اُن کے اوپر قرآن کے وہ الفاظ صادق آتے جو اِس سے پہلے پیروانِ مسیح کے اوپر صادق آچکے تھے، یعنی: فأیدنا الذین آمنوا علی عدوّھم فأصبحوا ظاھرین (61:14)

پیروانِ مسیح کے ماڈل میں دوسرا نمونہ وہ تھا جو صلیبی جنگوں کے بعد ظہور میں آیا۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا کے اوپر پہلی بار فطرت کے قوانین (laws of nature) منکشف ہوئے اور جدید تہذیب وجود میں آئی جس کے نتیجے میں پوری انسانیت کو بے شمار فائدے حاصل ہوئے۔

اِس دوسرے معاملے میں بھی مسلمان پوری طرح ناکام ہوگئے۔قرآن میں بیان کردہ پیروانِ مسیح کے ماڈل میں ان کے لیے یہ پیغام تھا کہ مغربی قوموں سے مقابلہ آرائی میں جب باعتبار نتیجہ وہ ناکام ہوجائیں تو وہ اپنی پالیسی پر نظر ثانی (revision) کریں۔اِسی نظر ثانی کو قرآن میں اجتماعی توبہ (24:31) کہا گیا ہے۔نظر ثانی کا وہ عمل یہ تھا کہ مسلمان اپنی کوششوں کو ٹکراؤ کے میدان سے ہٹائیں اور وہ اپنے آپ کو پوری طرح تعمیری کام میں لگا دیں، مگر مسلمان نفرتِ مغرب میں اتنی شدت سے مبتلا ہوئے کہ ان کے اندر یہ تعمیری سوچ پیدا نہ ہوسکی۔

اگر مسلمان اپنی منفی نفسیات سے باہر آکر مثبت انداز میں سوچتے تو اُن کو معلوم ہوتا کہ مغرب کی مسیحی قوموں نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ عین اُن کی اپنی موافقت میں ہے۔اِس کے نتیجے میں جو

جدید تہذیب وجود میں آئی ہے، اس نے مسلمانوں کے لیے خدمتِ دین اور اشاعتِ اسلام کے نئے وسیع تر دروازے کھول دئے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگی طور پر فرمایا تھا کہ بعد کے دور میں اللہ تعالی کچھ سیکولر لوگوں کو کھڑا کرے گا جو دین کے حق میں تائیدی رول (supporting role) انجام دیں گے۔ مغرب کی مسیحی قوموں کا کارنامہ اسی قسم کا تائیدی کارنامہ تھا۔ اس موقع پر مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ وہ مغربی قوموں کے خلاف نفرت اور تشدد کی پالیسی کو مکمل طور پر ختم کر دیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کے اندر ایک نیا مثبت ذہن ابھرتا۔ اس کے بعد وہ جان لیتے کہ مغربی قوموں نے ان کے لیے کتنا بڑا تائیدی کام انجام دیا ہے۔

اِس تائیدی کام کا ایک پہلو وہ ہے جس کو قرآن میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے — عن قریب ہم اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی، یہاں تک کہ ان کے اوپر یہ آشکارا ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے (40:53)۔ قرآن کی اِس آیت میں جن چیزوں کو آیات (signs) کہا گیا ہے، اُن سے مراد وہی سائنسی حقیقتیں ہیں جو پہلی بار مغربی قوموں کے ذریعے انسان کے علم میں آئیں۔ یہ سائنسی دریافتیں بے شمار پہلوؤں سے اسلام اور دعوتِ اسلام کے لیے مفید اور معاون ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ساتویں صدی میں جو اسلامی انقلاب آیا تھا، وہ ایک پہلو سے تاریخ میں ایک نئے عمل (process) کا آغاز تھا۔ یہ عمل تدریجی طور پر اپنا کام کرتا رہا۔ نشاۃِ ثانیہ کے بعد یورپ میں جو انقلابات آئے، وہ سب اِسی تاریخی عمل کی تکمیل تھے۔ مثلاً افکار کے معاملے میں کھلا پن (intellectual openness)، مذہبی آزادی، تشدد کے طریقے کا بحیثیت اصول ختم ہو جانا، بادشاہت کے بجائے جمہوریت کا نظام، پرنٹنگ پریس کا دور، وغیرہ۔

اِس قسم کی تمام تبدیلیاں جو مغربی تہذیب کے بعد دنیا میں آئیں، وہ سب خود اسلام کا مطلوب تھیں۔ اِن تبدیلیوں کے ذریعے یہ ممکن ہو گیا کہ اسلام کی صداقت کو خالص علمی اعتبار سے مدلّل کیا جائے۔ جدید ٹکنالوجی اور کمیونکیشن نے اِس بات کو ممکن بنا دیا کہ اسلام کی اشاعت کو عالمی سطح پر انجام دیا جا سکے۔ اِس طرح کی بے شمار جدید چیزیں ہیں جو عین اسلام کے حق میں ہیں اور وہ عملاً سب کی سب مغربی تہذیب کے نتیجے میں انسان کو حاصل ہوئی ہیں۔

خاتمہ کلام

امتِ مسلمہ کی تاریخ اب اکیسویں صدی عیسوی میں پہنچ چکی ہے۔ اب آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے، جب کہ امت کے اندر وہ سوچ پیدا ہو جس کو قرآن کے اندر اجتماعی توبہ کہا گیا ہے، یعنی قومی پالیسی کو بدلنا۔ یہی امت مسلمہ کے مسائل کا واحد حل ہے۔ اِس کے سوا کوئی اور حل نہ ممکن ہے اور نہ مطلوب۔ پچھلی صدیوں میں جو حالات پیدا ہوئے، اس کے نتیجے میں، ساری دنیا کے مسلمانوں کے اندر منفی نفسیات کا ذہن پیدا ہوا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اپنی اصل حیثیت کو بھول گئے، یعنی یہ کہ وہ اللہ کے دین کے داعی ہیں اور دوسری قومیں ان کے لیے مدعو کا درجہ رکھتی ہیں۔

اصل حقیقت کے اعتبار سے، مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کے درمیان داعی اور مدعو کی نسبت ہے، لیکن مسلمانوں کی منفی نفسیات کی بنا پر یہ ہوا کہ مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کے درمیان حریف اور رقیب کی نسبت قائم ہوگئی۔ موجودہ زمانے میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کے درمیان اِس نسبت کو درست کیا جائے۔ مسلمانوں کے اندر عمومی طور پر یہ سوچ پیدا کی جائے کہ وہ داعی ہیں اور دوسری قومیں ان کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِسی میں مسلمانوں کی دنیا کی کامیابی بھی ہے اور اِسی میں ان کی آخرت کی کامیابی بھی۔

فکری مستویٰ کے مطابق خطاب

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بُعثنا معاشر الأنبياء نخاطب الناس، على قدر عقولهم (المقاصد الحسنة للسخاوي، رقم الحديث: 120) یعنی تمام پیغمبروں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اُن کے عقلی معیار کے مطابق، خطاب کریں۔

اِس حدیث میں 'قدرِ عقل' سے مراد فکری مستوی (intellectual level) ہے، یعنی لوگوں سے ایسی زبان میں خطاب کرنا جو اُن کے لیے قابلِ فہم ہو اور ان کے ذہن کو ایڈریس کرے۔ جس دعوتی خطاب میں مدعو کی یہ رعایت شامل نہ ہو، وہ مطلوب دعوتی خطاب نہیں۔ اِس حدیثِ رسول کا ایک تقاضا یہ ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان اگر ذہنی بُعد (intellectual gap) پیدا ہو جائے تو داعی کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اِس طرح تیار کرے کہ مدعو کے ذہن کے اعتبار سے، اس کا کلام ایک موثر کلام بن جائے۔

موجودہ زمانے کی نسبت سے ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلم علما اپنی تعلیم کے اعتبار سے، صرف روایتی ذہن کو خطاب کرنا جانتے ہیں۔ اِس بنا پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ، علما کی پہنچ سے باہر ہو گیا ہے۔ علما کا روایتی طرزِ خطاب جدید ذہن کو اپیل نہیں کرتا۔ ایسی حالت میں علما کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اِس طرح تیار کریں کہ وہ جدید ذہن کو خطاب کرنے کے قابل ہو سکیں۔

جدید فکری مستوی کوئی پراسرار چیز نہیں، وہ دراصل عقلی مستوی (rational level) کا دوسرا نام ہے۔ آج کا انسان صرف اُس کلام سے متاثر ہو سکتا ہے جو جدید عقلی معیار پر پورا اترتا ہو، جو دورِ جدید کے مسلّمات سے مطابقت رکھنے والا ہو، جو دینی حقائق کو عقل کے معروف اصولوں پر ثابت شدہ بناتا ہو۔ قدیم اسلوب کو اگر روایتی اسلوب کہا جائے تو جدید اسلوب کو سائنسی اسلوب کہا جائے گا۔

جو بات مذکورہ حدیثِ رسول میں کہی گئی ہے، اس کی اصل خود قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کی سورہ ابراہیم میں یہ آیت آئی ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ

لِیُبَیِّنَ لَهُمْ (14:4) یعنی ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجا، اس کی قوم کی زبان میں بھیجا، تا کہ وہ اُن سے اچھی طرح بیان کردے:

And We have not sent any Messenger except with the language of his people in order that he might make the message clear to them.

قرآن کی یہ آیت پیغمبر کے حوالے سے ہر دور کے تمام داعیوں کے لیے ہے۔ بعد کے زمانے میں اپنے ہم عصر مخاطبین کی نسبت سے داعیوں کی بھی وہی ذمے داری ہے جو قدیم زمانے میں اپنے ہم عصر مخاطبین کی نسبت سے پیغمبروں کی ذمے داری تھی۔ قرآن کی اِس آیت کے مطابق، دعوت الی اللہ کے سلسلے میں داعی کی ذمے داری صرف یہ نہیں ہے کہ وہ مدعو کی زبان میں بول کر اس کو دعوت کا پیغام دے دے۔ اِسی کے ساتھ لازمی طور پر وہ چیز بھی ضروری ہے جس کو قرآن کی مذکورہ آیت میں ''تبیین'' کہا گیا ہے۔ تبیین کا مطلب ہے واضح کرنا، بات کو پوری طرح قابلِ فہم بنا دینا۔

اِس سے معلوم ہوا کہ داعی کے لیے صرف مدعو کی زبان کا جاننا کافی نہیں، اِسی کے ساتھ ضروری ہے کہ وہ مدعو کے مزاج کو سمجھے، وہ مدعو کی ذہنی ساخت کے مطابق، اُس سے خطاب کرے، تا کہ اس کا ذہن ایڈریس ہو سکے۔ اِس اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمانے میں داعی کی ذمے داری بہت بڑھ گئی ہے۔ قدیم زمانہ اگر روایتی اسلوب کا زمانہ تھا تو موجودہ زمانہ سائنٹفک اسلوب کا زمانہ ہے۔ آج کا مدعو کسی بات کو صرف اُس وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ اُس بات کو عقلی اسلوب میں مدعو کے سامنے پیش کیا جائے۔ اِس شرط کا تقاضا ہے کہ داعی نہ صرف آج کی زبان سیکھے، بلکہ وہ آج کے ذہن کو پوری طرح سمجھے اور جدید ذہن کو سمجھنے کا یہ کام صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ انتہائی بے تعصّبانہ انداز میں جدید افکار کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ کام صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ داعی کے دل میں مدعو کے لیے کامل خیر خواہی موجود ہو۔ اگر کامل خیر خواہی موجود نہ ہو تو نہ زبان کا جاننا کافی ہو سکتا ہے اور نہ جدید علوم کا مطالعہ۔

اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے تمام علما مستشرقین (orientalists) کے بارے میں منفی رائے رکھتے ہیں۔ وہ مستشرقین کو اسلام کا دشمن اور اسلام کے خلاف سازش کرنے والا

قرار دیتے ہیں، حتی کی ایک عرب عالم نے مستشرقین کو دورِ جدید کے تین اژدہوں میں سے ایک اژدہا قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: أجنحة المکر الثلاثة، تالیف: عبد الرحمن حبنکه المیداني)

مستشرقین کے بارے میں یہ رائے یقینی طور پر درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مسلم علما، مغربی مستشرقین کو غیر متعصّبانہ ذہن کے ساتھ نہ پڑھ سکے، اِس لیے وہ اُن کے کیس کو بھی سمجھنے سے قاصر رہے۔ مستشرقین کے کیس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس فرق کو سمجھا جائے جو مسلم علما اور مستشرقین کے درمیان پایا جاتا ہے۔ مسلم علما دین اسلام کو وحی (revelation) کے ظاہرہ کے تحت دیکھتے ہیں۔ اِس کے برعکس، مستشرقین اپنے طریقِ مطالعہ کے تحت دینِ اسلام کو صرف ایک سماجی ظاہرہ (social phenomenon) یا تاریخی ظاہرہ (historical phenomenon) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ طریقِ مطالعہ کے اِس فرق کی بنا پر فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کی رائے میں کچھ فرق واقع ہوجاتا ہے۔ یہ فرق یقینی طور پر کسی سازشی ذہن یا بدنیتی کی بنا پر نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف طریقِ مطالعہ (method of study) میں فرق کی بنا پر ہوتا ہے۔

استشراق کی حقیقت

استشراق (orientalism) کیا ہے، استشراق اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، صرف ایک چیز کا نام ہے، وہ یہ ہے کہ نشاةِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد مختلف اسباب سے یورپ میں ایک ذہن ابھرا جس کو روحِ تجسس (spirit of inquiry) کہا جاتا ہے۔ اِس روحِ تجسس نے مزید ترقی پا کر موضوعی طریقِ مطالعہ (objective method of study) کا عنوان اختیار کیا۔ نشاةِ ثانیہ کے بعد یورپ میں پیدا ہونے والے تمام علوم، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیکولر، وہ اصلاً اِسی طریقِ مطالعہ کی پیداوار ہیں۔ اِس طریقِ مطالعہ کا استعمال بنیادی طور پر دو بڑے میدانوں میں ہوا — ایک، علمِ فطرت (natural sciences) اور دوسرا، علمِ انسانیات (humanities)۔ اِس طریقِ مطالعہ سے بہت زیادہ فائدے حاصل ہوئے۔ ہر شعبے میں نئی نئی حقیقتیں سامنے آئیں، تحقیق کے نئے نئے دروازے کھلے، سوالات کے نئے نئے جوابات ملے، زندگی کے لیے نئی نئی رہنمائیاں حاصل ہوئیں۔

تاہم علم کے دونوں شعبوں میں ایک بنیادی فرق تھا۔علمِ فطرت کا میدان فطرت کے اٹل قوانین تھے۔اس میں یہ ممکن تھا کہ علمِ ریاضی (mathematics) کے قطعی فارمولے کو استعمال کرتے ہوئے قطعی نتیجے تک پہنچا جائے اور اگر بالفرض کوئی انسان اپنے اندازے میں غلطی کر جائے تو دوسرا انسان مزید تجزیہ کے ذریعے اس کی تصحیح کر سکے۔اِسی لیے اِن علوم کو قطعی علوم (exact sciences) کہا جاتا ہے۔

لیکن علم انسانیات، بہ شمول مذہب، میں اِس کے استعمال کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔اِس شعبے میں حتمی نوعیت کا کوئی ریاضیاتی طریقہ قابلِ حصول نہ تھا، اِس لیے یہاں لازمی طور پر یہ ہونا تھا کہ انسانیات کے شعبے میں مطالعہ کرنے والوں کی رائے میں اختلاف پیدا ہو، وہ کسی معاملے میں غلط استنباط (wrong inference) کا شکار ہو جائیں۔اِس بنا پر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ انسانیات کے دائرے میں مطالعہ کرنے والا انسان کوئی ایسا اصول وضع کر سکے جس میں سرے سے کوئی غلطی نہ پائی جاتی ہو۔انسانیات کے مطالعے میں جو غلطیاں پائی جاتی ہیں، وہ اختلافِ رائے کی بنا پر ہیں، نہ کہ سازش یا بدنیتی کی بنا پر۔یہی استشراق کا معاملہ ہے۔استشراق کا کیس ایک طریقِ مطالعہ کا کیس ہے، نہ کہ سازش یا بدنیتی کا کیس۔

اِس معاملے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ مستشرقین کے اِس ذہن کو مدعو کے ذہن کے طور پر لیا جائے، نہ کہ کسی دشمن کے سازشی ذہن کے طور پر۔ ہر مدعو کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔اِس طرح مستشرقین کا کیس بھی مدعو کا کیس ہے اور ان کی بھی اپنی ایک سوچ ہے۔ اگر ہم مستشرقین کے کیس کو مدعو کے کیس کے طور پر لیں تو ہمارے دل میں اُن کے بارے میں وہی خیر خواہی پیدا ہو جائے گی جو ہر مدعو کے لیے ایک داعی کے دل میں ہوتی ہے۔اِس طرح یہ ممکن ہو جائے گا کہ ہم مستشرقین کے ذہن کو غیر جانب دارانہ انداز میں سمجھیں اور اُن سے داعیانہ ذہن کے تحت ڈسکشن کریں اور اُن کو اسلام کا فطری پیغام پہنچائیں۔مستشرقین بھی انسان ہیں۔ اُن کے اندر بھی وہی فطرت موجود ہے جو دوسرے انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ اگر اُن کی فطرت ایڈریس ہو جائے تو اُن کے ساتھ وہی واقعہ پیش آ سکتا ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (41:34)

تاریخ بتاتی ہے کہ مستشرقین کے معاملے میں اِس طرح کے واقعات بار بار پیش آئے ہیں۔ بہت سے ایسے مستشرق ہیں جنھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ وہ اسلام کی صداقت سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اسلام کے بارے میں بہت سی اعلیٰ کتابیں لکھیں۔ مثلاً ٹامس کارلائل (وفات: 1881)، ٹی ڈبلو آرنلڈ (وفات: 1930)، فلپ کے ہٹی (وفات: 1978)، وغیرہ۔ کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اسلام کے تفصیلی مطالعے کے بعد باقاعدہ اسلام قبول کرلیا۔ مثلاً ہنگری کے عبدالکریم جُرمانوس (وفات: 1979)، وغیرہ۔

مستشرق عام طور پر اُس کو کہا جاتا ہے جو کسی مغربی ملک میں پیدا ہوا اور پھر وہ مشرقی مذاہب کا مطالعہ کرے۔ لیکن توسیعی طور پر اِس فہرست میں ایسے افراد بھی شامل کیے جاسکتے ہیں جو کسی دوسرے مذہب میں پیدا ہوئے ہوں اور پھر وہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کریں اور مطالعہ کے بعد اسلام قبول کرلیں۔ اِس دوسری قسم میں بھی بہت سے افراد پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے، وغیرہ۔ ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

Chattopadhyay, Nishikanta(1852–1910) research scholar and the first Bengali to obtain a PhD degree(1882) from a European university, was born in July 1852 in the village of Pashchimpara in Vikrampur, Dhaka. Nishikanta passed the FA from Presidency College. He then went to Germany to study German, Sanskrit, linguistics, history and philosophy at Leipgiz University. But he was expelled from there for being an atheist. He proceeded to Switzerland and completed his doctoral studies at the University of Zurich. He returned to India in 1883and subsequently taught at different colleges in Hyderabad, Mysore and Muzaffarpur. Towards the end of his life, he embraced Islam.

(http //:www.banglapedia.org)

ضمیر کی آزادی

خدا کی تخلیقی اسکیم میں انسانی آزادی کے تصور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ انسان کو اِس دنیا میں امتحان کے لیے رکھا گیا ہے، اور آزادی کے بغیر امتحان ممکن نہیں۔ انسان کا مستقبل تمام تر اِس پر منحصر ہے کہ وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے، یا وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اگر انسان کی آزاد فکری پر روک لگا دی جائے تو اس کے بعد امتحان کا تصور بے معنی ہو جاتا ہے۔

قرآن میں واضح لفظوں میں ارشاد ہوا ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ڐ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (2:256) یعنی دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت، گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔ پس جو شخص شیطان کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اِسی طرح قرآن میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: فَذَكِّرْ ڕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ○ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ○ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ○ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ○ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (88:21-26) یعنی (اے پیغمبر) تم بس یاددہانی کرو، تم بس یاددہانی کرنے والے ہو۔ تم اُن پر داروغہ نہیں۔ مگر جس شخص نے روگردانی کی اور انکار کیا، تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ ہماری ہی طرف ہے ان کی واپسی، پھر ہمارے ہی ذمے ہے اُن کا حساب لینا۔

اِس طرح کی قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسان کو اِس بات کی کامل آزادی دی گئی ہے کہ وہ جس طرح چاہے، سوچے اور جس طرح چاہے، بولے اور لکھے۔ یہ آزادی انسان کو اُس وقت تک حاصل رہتی ہے جب تک کہ وہ دوسرے انسانوں کو نقصان نہ پہنچائے۔ اسلام میں سماجی جرم (social crime) کا تصور ہے، مگر اسلام میں فکری جرم (thought crime) کا کوئی تصور نہیں۔

لندن سے 406 صفحات پر مشتمل ایک کتاب چھپی ہے۔ کتاب کا نام اور مصنف کا نام یہ ہے:

Richard Dawkins, *The God Delusion* (2006)

کتاب کے مصنف نے افغانستان کے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے، جب کہ ایک افغانی شخص (عبدالرحمن) نے اپنا مذہب بدل دیا۔ اُس نے اسلام کو چھوڑ کر مسیحی مذہب اختیار کرلیا۔ اِس پر افغانستان کی عدالت میں اس کے لیے موت کی سزا سنائی گئی۔ اِس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:

It is still an article of constitution of 'liberated' Afghanistan that the penalty for apostasy is death. Apostasy, remember, doesn't mean actual harm to persons or property. It is pure thought crime, to use George Orwell's 1984 terminology, and the official punishment for it under Islamic law is death. (p. 287)

یعنی اب بھی آزاد افغانستان کے قانون کا ایک حصہ یہ ہے کہ ارتداد کی سزا قتل ہے۔ یاد رکھئے کہ ارتداد کا مطلب کسی انسان کو یا کسی کی پراپرٹی کو حقیقی نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ 1984 میں انگلش آتھر جارج آرویل کی وضع کردہ اصطلاح کو لیتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک خالص 'فکری جرم' ہے، اور اسلام کے قانون کے مطابق، اِس جرم کی مسلّمہ سزا قتل ہے۔

یہ صرف غلط فہمی کا ایک معاملہ ہے۔ مصنف نے افغانستان میں ہونے والے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے اور اُس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اِس قانون کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں۔ یہ بعد کے کچھ فقہا کا مسلک ہے، نہ کہ قرآن اور سنت کا مسلک۔ اسلام کے قانون کا مستند ماخذ صرف قرآن وسنت ہے، کوئی بھی دوسری چیز اسلام میں قانون کا ماخذ نہیں۔

جدید مغربی فکر میں آزادی کو خیر اعلیٰ (summum bonum) سمجھا جاتا ہے۔ مغربی مفکرین کا خیال ہے کہ آزادیٔ فکر کے بغیر کوئی ترقی نہیں ہوسکتی۔ اِس کے برعکس، وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں صرف محدود آزادی کا تصور ہے، اِس لیے اسلام دورِ جدید کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہ بات صرف غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں آزادی کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ مغربی تہذیب میں۔ اور یہ بالکل فطری بات ہے، کیوں کہ اسلام کے مطابق، انسان کو موجودہ دنیا میں امتحان (test) کے لیے رکھا

گیا ہے۔ امتحان کے لیے آزادی لازمی طور پر ضروری ہے۔ آزادی کے بغیر امتحان ممکن نہیں، اِس لیے آزادی خودخدا کے تخلیقی پلان (creation plan) کا ایک لازمی حصہ ہے۔

اسلام میں آزادی ہر انسان کا مطلق حق ہے، لیکن وہ ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ یہ شرط وہی ہے جو خود مغربی تہذیب کا مسلّمہ ہے، یعنی انسان کو آزادی صرف اپنے ذاتی دائرے میں حاصل ہے۔ آدمی کی آزادی اُس وقت ختم ہوجاتی ہے، جب کہ وہ دوسرے کے لیے ضرر رساں (harmful) بن جائے۔

اِس کے علاوہ، اسلام میں آزادی ایک اور لحاظ سے بھی ہے۔ خالق نے اِس دنیا میں ہر چیز کو امکان (potential) کے طور پر پیدا کیا۔ اِس امکان کو واقعہ بنانے کا کام انسان کو خود کرنا ہے۔ مثلاً خالق نے خام لوہا (ore) بنایا۔ خام لوہے کو مشین کی صورت دینا، یہ انسان کا اپنا کام ہے۔ یہ تمام ترترقیاں صرف اُس وقت حاصل ہوسکتی ہیں جب کہ انسان کے اندر آزادانہ طور پر ذہنی سرگرمیاں جاری ہوں۔ اِس مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان کو اِس دنیا میں کامل آزادی حاصل ہو۔

تاہم اسلام میں جرم کی دو قسمیں ہیں — جرم بہ مقابلہ انسان (crime vis-à-vis man) اور جرم بہ مقابلہ خدا (crime vis-à-vis God)۔ دونوں کا معاملہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ جہاں تک انسان کا معاملہ ہے، ہر انسان کو دوسرے انسان کے مقابلے میں مکمل طور پر فکری آزادی حاصل ہے۔ اُس کا معاملہ صرف اُس وقت قابلِ مواخذہ یا قابلِ سزا (punishable) بنے گا، جب کہ وہ دوسرے انسان کے لیے عملی طور پر جارح بن جائے۔

مگر خدا کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ کوئی شخص خدا کو عملی جراحت نہیں پہنچا سکتا۔ خدا کے معاملے میں جرم یہ ہے کہ وہ خدا کے تخلیقی منصوبے کے خلاف رویہ اختیار کرے، وہ خدا کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم کا اتباع نہ کرے۔ اِس میں یہ بھی شامل ہے کہ انسان خدا کے معاملے میں غلط عقیدہ بنائے۔ مثلاً خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانا، انسان کو خدا کا بیٹا قرار دینا، خدا کے پیغمبر کا انکار کرنا، وغیرہ۔ یہ سب چیزیں اگرچہ تھاٹ کرائم (thought crime) کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن وہ خدا کے نزدیک، قابلِ سزا کرائم (punishable crime) ہیں۔ ایسے لوگ اگر اِسی حال میں مریں تو بلاشبہہ وہ

خدا کی سزا کے مستحق قرار پائیں گے۔ لیکن جرم بہ مقابلۂ خدا کے معاملے میں، سزا کا اختیار صرف خدا کو ہے، جو کہ آخرت میں کسی انسان کو دی جائے گی۔ جرم بہ مقابلہ انسان کے بارے میں فیصلہ کرنا، انسانی عدالت کا کام ہے۔ لیکن جرم بہ مقابلہ خدا کا تعلق انسانی عدالت سے نہیں۔ ایسے معاملے میں انسان کو صرف پر امن دعوت وتبلیغ کا حق ہے، نہ کہ عملی سزا کا حق۔

اسلام میں آزادیٔ ضمیر (freedom of conscience) کی اہمیت اتنی ہی زیادہ ہے جتنی کہ کسی دوسرے نظامِ فکر میں۔ البتہ اسلامی نظامِ فکر اور سیکولر نظامِ فکر میں اِس اعتبار سے ایک فرق پایا جاتا ہے۔ سیکولر نظامِ فکر میں آزادیٔ ضمیر کو مطلق (absolute) حیثیت حاصل ہے، یعنی سیکولر نظامِ فکر کے مطابق، ایک شخص کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کو مطلق معنوں میں صداقت سمجھے، مگر اسلامی نظامِ فکر میں ایسا نہیں۔ اسلامی نظامِ فکر کے مطابق، صداقت کا معیار کسی کے ضمیر کی آواز نہیں ہے، بلکہ اس کا معیار وحی الٰہی ہے۔ جو تصور وحی الٰہی کے مطابق ہو، وہی درست تصور ہے۔ اور جو تصور وحی الٰہی سے مطابقت نہ رکھتا ہو، وہ انسان کا ذاتی واہمہ (obsession) یا کنڈیشننگ کا نتیجہ ہے، نہ کہ مطلق معنوں میں صداقت۔

آزادیٔ ضمیر سے وابستہ یہ سوال بھی ہے کہ اظہارِ خیال کی آزادی کا حکم کیا ہے۔ اِس معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ انسان کو اظہارِ خیال کی آزادی کا کلی حق حاصل ہے۔ آدمی جب تک دوسرے انسان کے لیے جارح نہ بنے، اس کو کامل معنوں میں اظہار خیال کی آزادی حاصل رہے گی۔ مگر اسلام کے مطابق، انسانی زندگی کے دو مرحلے ہیں — موت سے پہلے، اور موت کے بعد۔ اظہارِ خیال کی کامل آزادی کا حق صرف موت سے قبل کی دنیا کے لیے ہے۔ موت کے بعد کی دنیا میں خدا یہ فیصلہ کرے گا کہ کس نے اپنی آزادی کا صحیح استعمال کیا اور کس نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا۔ پھر اس کے بعد ہر ایک کے لیے اس کے دنیوی ریکارڈ کے مطابق، انعام یا سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔

عصری تقاضے —— چند قابلِ غور پہلو

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **إنّ اللہ یبعث لهذه الأمّة علیٰ رأس کلّ مائة سَنة، مَن یجدّد لها دینها (سنن أبی داؤد، کتاب الملاحم، باب ما یُذکر في قرن المائة)** یعنی اللہ اِس امت کے لیے ہر سو سال کے سرے پر ایک شخص کو اٹھائے گا جو اُس کے لیے اُس کے دین کی تجدید کرے گا۔

یہ کوئی پُراسرار بات نہیں۔ یہ فطری قانون کے تحت پیش آنے والا ایک معاملہ ہے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کی عمر بہت محدود ہے۔ وہ سو سال سے پہلے ہی مرجاتا ہے۔ اِس طرح ہمیشہ ایک کے بعد دوسری نسل آتی رہتی ہے۔ ایک تیار شدہ نسل ختم ہوجاتی ہے، اس کے بعد ایک غیر تیار شدہ نسل پیدا ہوکر اس کی جگہ لے لیتی ہے اور ضرورت ہوتی ہے کہ جس طرح پہلی نسل کو تیار کیا گیا تھا، اُسی طرح دوبارہ اگلی نسلوں کو تیار کیا جائے۔ زوال کا مذکورہ عمل ایک مسلسل عمل ہے، اور اِسی کو انحطاط (degeneration) کہا جاتا ہے۔ تجدید اِسی صورتِ حال کی اصلاح کا نام ہے۔

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس فطری پراسس کے معاملے میں امتِ محمدی کا کوئی استثنا نہیں۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت پر جب زوال کا دور آیا، تو بار بار مجددینِ اسلام پیدا ہوتے رہے۔ مثلاً عمر بن عبد العزیز اُموی (وفات: 720ء)، ابن تیمیہ الحرانی (وفات: 1328ء)، شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات: 1762ء)، وغیرہ۔ یہ لوگ مسلّمہ طور پر مجدد تھے، اور انھوں نے اپنے زمانے کے لحاظ سے تجدید کا کام کیا۔

دو دور

امتِ مسلمہ کے ثابت شدہ طور پر دو دور ہیں —— روایتی دور (traditional period)، اور سائنسی دور (scientific period)۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلی صدیوں میں جو مجددینِ اسلام پیدا ہوئے، وہ سب روایتی دور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے روایتی ڈھانچے میں دین کو

از سرِ نو منقح کر کے پیش کیا۔اب امتِ مسلمہ سائنسی دور میں پہنچ چکی ہے۔اِس دور کے حالات مکمل طور پر پچھلے دور سے مختلف ہیں۔اِس فرق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک مسلم اسکالر نے کہا تھا کہ:

Quran has to be re-revealed today.

مگر اصل یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ — ضرورت ہے کہ آج قرآن کی دوبارہ توضیح کی جائے:

Quran has to be re-defined today.

تجدید دین دراصل اِسی توضیح ثانی (re-defination) کا نام ہے۔مجدد وہ ہے جو بدلے ہوئے حالات کو سمجھے اور نئے حالات میں دین کو دوبارہ واضح کرے۔یہ کام اپنی حقیقت کے اعتبار سے تجدید (revival) کا کام ہے۔یہ اصلِ دین کا دوبارہ احیا ہے۔اس کا کوئی تعلق اُس عمل سے نہیں جس کو موجودہ زمانے میں اصلاح (reformation) یا نظر ثانی (revision) کہا جاتا ہے۔

موجودہ سائنسی دور میں تجدید کا یہ کام پوری شدت کے ساتھ مطلوب ہو چکا ہے۔اب جب کہ سائنسی تحقیقات کے مطابق،سائنس داں یہ اعلان کر رہے ہیں کہ انسانی تاریخ اپنے خاتمہ (end) پر پہنچنے والی ہے۔جس زِلزالِ شدید (99:1) کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے،اس کے آثار عملاً شروع ہو چکے ہیں۔یہاں تک کہ اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ — قیامت اب زیادہ دور نہیں:

Doomsday is not far.

ایسی حالت میں اب آخری وقت آ گیا ہے کہ اس کو متعین کیا جائے کہ جدید دورِ سائنس کی نسبت سے تجدید و احیا کا جو کام مطلوب ہے،وہ کیا ہے۔اور وہ کام کیا ہے جس کو جدید حالات کی نسبت سے تجدید و احیا کا کام کہا جائے گا۔قرآن اور حدیث کے حوالے سے اِس کام کی نوعیت کو پوری طرح معلوم کیا جا سکتا ہے۔

آفاق اور انفس میں ظاہر ہونے والی نشانیاں

قرآن میں واضح طور پر یہ پیشین گوئی موجود ہے کہ بعد کے دور میں فطرت کی چھپی ہوئی

نشانیاں (signs) ظاہر ہوں گی، اور یہ ضرورت ہوگی کہ اِن نشانیوں کی روشنی میں دینِ خداوندی کو از سرِ نو مدلّل کیا جائے۔ یہ ضرورت قرآن کی ایک آیت سے معلوم ہوتی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

''عن قریب مستقبل میں ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھلائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی۔ یہاں تک کہ اُن پر یہ پوری طرح کھُل جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے'' (41: 53)۔

آفاق اور انفس میں جن نشانیوں کے ظہور کی پیشین گوئی کی گئی تھی، وہ واضح طور پر موجودہ زمانے میں سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں سامنے آچکی ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں بتایا گیا تھا کہ حضرت موسیٰ کے معاصر فرعون کا جسم خدا نے محفوظ کر دیا ہے، اور وہ بعد کے زمانے میں ظاہر ہوگا (10: 92)۔ اِس آیت کے نزول کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک یہ واقعہ لوگوں کے لیے غیر معلوم رہا۔ انیسویں صدی کے آخر میں پہلی بار سائنسی ذرائع سے یہ ممکن ہوا کہ فرعون کے اِس جسم کو دریافت کیا جا سکے اور اس کی معاصر تاریخ کا تعین کیا جا سکے۔ اِس طرح کے بہت سے نئے حقائق ہیں، جو قرآن کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ دورِ جدید کے تجدیدی کام کا ایک حصہ ہے، یعنی اِن نئی دریافتوں کو قرآن کی صداقت کی حیثیت سے پیش کرنا۔

لسانِ قوم میں دعوت

قرآن کی سورہ ابراہیم میں پیغمبروں کے بارے میں بتایا گیا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمْ (14: 4) یعنی خدا کی طرف سے جو پیغمبر بھی آیا، وہ اپنی مخاطب قوم کی زبان میں کلام کرتا تھا۔

قرآن کی اِس آیت میں 'لسان' سے مراد صرف زبان (language) نہیں ہے، بلکہ اُس میں کلام کا اسلوب (idiom) بھی شامل ہے۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی زبان میں کلام کیا۔ یہ آپ کے لیے قوم کی زبان (لسانِ قوم) میں بولنا تھا۔ حضرت ابراہیم نے زمین اور آسمان کے ملکوت (6: 76) سے استدلال کرتے ہوئے مدعو کے سامنے اپنی بات پیش کی۔ اور حضرت مسیح نے تمثیل (metaphor) کے انداز میں اپنی بات کہی۔ یہ دونوں اسلوب کی

مثالیں ہیں، جو اپنے زمانے کے لحاظ سے استعمال کی گئیں۔

موجودہ زمانے میں دعوتی کلام وہ ہے جو وقت کی زبان میں ہو۔ وقت کی زبان کا ایک مطلب داعی کے اپنے علاقے کی زبان ہے۔ پھر یہ کہ موجودہ زمانہ گلوبلائزیشن کا زمانہ ہے۔ اِس لحاظ سے ضروری ہے کہ داعی آج کی انٹرنیشنل زبان میں کلام کرے۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، آج کی انٹرنیشنل زبان صرف ایک ہے، اور وہ انگریزی زبان ہے۔

''لسان'' کے مسئلے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ معاصر مخاطبین کے اسلوب میں ہو۔ آج کا اسٹینڈرڈ اسلوب وہ ہے جس کو سائنٹفک اسلوب کہا جاتا ہے۔ اگر آج کے انسان کو مخاطب کرنا ہے تو ضروری ہے کہ داعی کا کلام وقت کے اسلوب میں ہو، ورنہ یہ حال ہوگا کہ داعی بظاہر بولے گا، لیکن مدعو کا مائنڈ اس سے ایڈریس نہیں ہوگا۔ ایسے کلام کو دعوتی کلام نہیں کہا جا سکتا۔

سائنٹفک اسلوب کیا ہے اور قدیم روایتی اسلوب کیا تھا۔ قدیم روایتی اسلوب وہ تھا جس میں شعر، ادب، خطابت، رومانیت، تمثیل اور مبالغہ آرائی کی زبان میں کسی بات کے کہنے کو بھی کہنا سمجھا جاتا تھا۔ جذباتی طور پر پُرکشش الفاظ بولنے والے لوگ بھی داد کے مستحق قرار پاتے تھے۔ موجودہ زمانے میں اِس قسم کا اسلوب پوری طرح متروک ہو چکا ہے۔

موجودہ زمانے کا اسٹینڈرڈ اسلوب سائنٹفک اسلوب ہے۔ سائنٹفک اسلوب وہ ہے جو مبنی بر حقیقت اسلوب ہو۔ جس کے الفاظ اور معنی میں کامل مطابقت پائی جائے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ سائنٹفک اسلوب وہ ہے جو پورے معنوں میں علمی اور منطقی (rational) اسلوب ہو۔ موجودہ زمانے میں وہی لٹریچر دعوتی لٹریچر ہے جو اِس سائنٹفک اسلوب میں لکھا گیا ہو — یہی سائنٹفک اسلوب قرآن کا اسلوب ہے۔

تعلقاتِ انسانی کا اصول

انسانوں کے درمیان تعلقات قائم کرنے کے لیے ہمیشہ ایک جامع اصول درکار ہوتا ہے۔ ایک ایسا اصول جو اپنے اور غیر کے درمیان مساوات (equation) کے قیام کی بنیاد بن سکے۔ یہ ایک

ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر انسانی سماج کو منظّم کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

اسلام کی تاریخ میں ابتدائی اور معیاری زمانہ وہ ہے جس کو عہدِ رسالت کہا جاتا ہے۔ اِس زمانے میں انسانی تعلقات کی بنیاد جس اصول پر قائم کی گئی تھی، وہ شاہد اور مشہود (85: 3) کی بنیاد تھی۔ یہ دونوں لفظ شہادت (گواہی) سے اخذ کئے گئے ہیں۔ شاہد کا مطلب ہے گواہ (witness)، اور مشہود کا مطلب ہے وہ جس پر گواہی دی جائے (witnessed)۔ شہادت سے مراد دعوت ہے اور شاہد اور مشہود سے مراد وہی چیز ہے جس کے لیے داعی اور مدعو کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

مسلمان اور دوسری قوموں کے درمیان شاہد اور مشہود کی یہ مساوات (equation) عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں قائم رہی۔ اِس کے بعد عباسی سلطنت کا زمانہ آیا، جب کہ دنیا کے بڑے حصے میں ایک مسلم ایمپائر قائم ہوگیا۔ اب شاہد اور مشہود کی یہ سابق مساوات ٹوٹ گئی اور نئی مساوات، حاکم اور محکوم کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب کہ مسلم فقہاء نے دارالکفر اور دارالاسلام کی اصطلاحیں وضع کیں۔ اِس مساوات کے تحت، دنیا کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ مسلم اکثریت کے علاقے دارالسلام بن گئے۔ اور اس کے مقابلے میں غیر مسلم علاقے دارالکفر قرار پائے۔

انیسویں صدی عیسوی میں یورپ کی نوآبادیاتی طاقتوں (colonial powers) کے ظہور کے بعد یہ مساوات (equation) دوبارہ ٹوٹ گئی۔ اب مغربی تہذیب کے غلبہ کے تحت، دنیا میں جمہوریت (democracy) کا زمانہ آیا۔ سیاست کے جمہوری تصور کے تحت، حاکم اور محکوم کی مساوات بے معنیٰ قرار پائی۔ اُس نے اپنے حق میں فکری اساس کھودی۔

مسلمانوں اور مغربی قوموں کے درمیان بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں صلیبی جنگیں (crusades) پیش آئیں۔ اِن جنگوں میں مغربی قوموں کو شکست ہوئی، لیکن اِس شکست نے مغربی قوموں کے اندر ایک مثبت نتیجہ پیدا کیا۔ یہ لوگ علم کے میدان میں سرگرم ہوگئے، یہاں تک کہ مغربی یورپ میں پندرھویں اور سولھویں صدی میں وہ واقعہ پیش آیا جس کو یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔

اِس کے بعد مغربی دنیا میں ایک نیا انقلاب آیا۔ مغربی قوموں نے تجارت اور صنعت کے نئے طریقے دریافت کیے، یہاں تک کہ عمومی پیمانے پر ایک نئی مساوات (equation) قائم ہوگئی۔ یہ تاجر اور خریدار (trader and customer) کی مساوات تھی۔ اِس مساوات کا ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے ایک نیا کلچر وجود میں آیا جو خریدار دوست کلچر (customer-friendly culture) کے اصول پر مبنی تھا۔ یہی کلچر آج کی دنیا میں ابھی تک باقی ہے۔

اِس نازک وقت میں مسلمانوں کے ساتھ ایک المیہ (tragedy) پیش آیا۔ مسلمان حاکم اور محکوم کی سابقہ سوچ سے باہر نہ آسکے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جدید اقتصادیات کی مین اسٹریم میں شامل نہ ہوسکے۔ اِس پچھڑے پن کی قیمت مسلمانوں کو یہ دینی پڑی کہ وہ موجودہ زمانے میں دہرا نقصان کا شکار ہو گئے۔

جدید حالات سے ہم آہنگ نہ ہونے کی بنا پر ایک طرف یہ ہوا کہ وہ اقتصادیات میں دوسری قوموں سے پیچھے ہوگئے۔ دوسرا اِس سے بھی بڑا نقصان یہ تھا کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈبل اسٹینڈرڈ (double standard) کا کیس بن گئے۔ ذہنی طور پر وہ دوسری قوموں کے بارے میں منفی خیالات رکھتے تھے، لیکن ان کا یہ منفی فکر قابلِ عمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اپنی مادّی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے اُن کو اِنھیں قوموں سے مل کر کام کرنا تھا۔ داخلی طور پر وہ اِن قوموں کے بارے میں منفی ذہن رکھتے ہوئے، خارجی زندگی میں اُنھیں ان قوموں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑا۔

اِس طرح مسلم تاریخ میں پہلی بار ایک سنگین بُرائی پیدا ہوئی، یعنی داخلی طور پر منفی رائے رکھتے ہوئے، خارجی معاملات میں دوسروں کے ساتھ سمجھوتہ کرکے اپنی مادّی زندگی کی تعمیر کرنا۔ یہ دوعملی یا ڈبل اسٹینڈرڈ کی عمومی حالت تھی۔ اِس قسم کی عمومی دوعملی مسلمانوں کی تاریخ میں اِس سے پہلے کبھی پیش نہیں آئی۔

اِس برائی سے بچنے کا واحد طریقہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے دورِ اوّل کی طرف فکری واپسی، یعنی دورِ اول کی طرح دوبارہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کی مساوات (equation)

قائم کرنا۔ داعی اور مدعو کی مساوات ہی اسلام کے مطابق، صحیح مساوات ہے۔ اِس مساوات کو دوبارہ قائم کرکے مسلمان موجودہ دوعملی کی بُرائی سے بچ سکتے ہیں اور اِسی کے ساتھ امتِ مسلمہ ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی عمومی ذمے داری کوادا رسکتے ہیں، یعنی دعوت الی اللہ کی ذمے داری۔

آئڈیالوجی آف دعوہ

حدیثِ رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت عملاً زندہ نہ رہے اور پھر کوئی شخص اس کو اپنی کوششوں سے زندہ کرے، تو اِس عمل پر اس کے لیے بہت بڑا اجر ہے: من أحيا سنة من سنتي قد أميتت بعدي فإن له من الأجر مثل من عمل بها۔ (الترمذي، رقم الحديث: 2677)

اِس حدیث کوسامنے رکھا جائے اور غور کیا جائے کہ موجودہ زمانے میں وہ کون سی سنت رسول ہے جو آج زندہ نہیں ہے تو بلا شبہہ وہ صرف ایک سنت ہوگی، اور وہ دعوت الی اللہ کی سنت ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو دیکھئے تو ان کے درمیان نماز اور روزہ اور حج اور زکاۃ جیسے دینی اعمال بہت بڑے پیمانے پر انجام دیے جارہے ہیں، لیکن صرف ایک ہی بڑی سنت ہے جو آج عملاً زندہ نہیں، اور وہ دعوت الی اللہ کی سنت ہے۔ اِس معاملے میں مسلمانوں کی بے شعوری کا یہ حال ہے کہ وہ ملّی خدمت یا اصلاح المسلمین کا کام کریں گے اور وہ اس کو دعوت الی اللہ کا نام دے دیں گے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کے رشتے کو زندہ کرنا، اِس معاملے میں سنتِ رسول کو زندہ کرنا ہے۔ لیکن یہ کوئی سادہ کام نہیں۔ یہ بلاشبہہ ایک عظیم ترین کام ہے۔ دعوت کی اِسی اہمیت کی بنا پر قرآن میں اُس کو جہادِ کبیر (25: 52) کہا گیا ہے۔

مسلمانوں کے درمیان دعوت الی اللہ کی سنت کو حقیقی معنوں میں زندہ کرنے کے لیے ایک مکمل دعوہ آئڈیالوجی (ideology of dawah) درکار ہے، ایک ایسی آئڈیالوجی جو دعوت کی اہمیت کو جدید علمی اصول پر مدلّل کرے، جو اُن سوالات کا تشفی بخش جواب دے جو دعوت کے راستے میں ذہنی رکاوٹ (intellectual obstacle) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دعوت کا کام ایک ایسے ماحول کا طالب ہے، جہاں داعی اور مدعو کے درمیان نفرت اور تشدد کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا ہو۔ واضح رہے کہ یہ خاتمہ فریقِ ثانی کی طرف سے کبھی نہیں کیا جائے گا۔ یہ خاتمہ جب بھی ہوگا، وہ داعی گروہ کی طرف سے یک طرفہ طور پر کیا جائے گا، اِسی لیے قرآن میں دعوت کا حکم دیتے ہوئے پیغمبر اسلام سے فرمایا گیا: وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (74:7) یعنی مدعو کی طرف سے تمام زیادتیوں پر یک طرفہ صبر کرو اور پوری طرح مثبت انداز میں دعوت الی اللہ کا کام جاری رکھو۔

جدید نظریات

موجودہ زمانے میں بہت سے ایسے نظریات سامنے آئے ہیں جو بظاہر اسلام کے روایتی موقف سے ٹکراتے ہیں۔ اِس ظاہری ٹکراؤ نے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو اِن جدید نظریات کے بارے میں منفی ذہن میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ اِن نظریات کی ایسی توضیح کی جائے جو اس معاملے میں مسلمانوں کے منفی ذہن کا خاتمہ کر سکے۔ بصورتِ دیگر، داعی اور مدعو کے درمیان وہ نارمل تعلقات قائم نہیں ہوں گے جو دعوت کے مثبت عمل کے لیے ضروری ہیں۔

مثلاً موجودہ زمانے میں شتمِ رسول کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے ایک حساس مسئلہ بن گیا ہے۔ مسلمان جب بھی کوئی ایسی تحریر پڑھتے ہیں یا تقریر سنتے ہیں، جو اُن کے نزدیک شتمِ رسول کے ہم معنیٰ ہو، تو وہ فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں اور تشدد کا عمل شروع کر دیتے ہیں۔ یہ صورتِ حال نہایت سنگین طور پر دعوتی عمل کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ جدید تہذیب کے زیر اثر آج تمام غیر مسلم قوموں میں یہ مان لیا گیا ہے کہ اظہارِ رائے کی آزادی مطلق معنوں میں انسان کا ایک حق ہے، کسی بھی عذر کی بنا پر اس کو ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ماحول میں مسلمان جب بطورِ خود شتم کے واقعے کو لے کر ہنگامہ شروع کرتے ہیں اور وہ میڈیا کے ذریعے فوراً لوگوں کے علم میں آجاتا ہے، تو لوگ یہ تصور قائم کر لیتے ہیں کہ اسلام آزادیٔ رائے کے خلاف ہے۔ اِس بنا پر اسلام اِس قابل نہیں کہ وہ جدید انسان کا مذہب بن سکے۔

میں ذاتی طور پر شتمِ رسول کو ایک ایسا معاملہ سمجھتا ہوں جس پر مسلمان صرف دو قسم کے رویّے کا

حق رکھتے ہیں۔ یا تو وہ اس سے اعراض کرتے ہوئے خاموش رہیں، یا دلیل کی زبان میں پُرامن طور پر وہ اس کا جواب دیں۔ اِس موضوع پر میں نے ''شتمِ رسول'' کا مسئلہ کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جو 191 صفحات پر مشتمل ہے اور 1997 میں نئی دہلی سے شائع ہوچکی ہے۔

تاہم بالفرض اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہو کہ شتمِ رسول ایک قابلِ گردن زدنی معاملہ ہے، اور شتم کا کیس **یُقتل حدًّا** کا کیس ہے، تب بھی اس کو اِس معاملے میں اجتہاد کرنا چاہیے۔ دعوت الی اللہ کی مصلحت کا تقاضا ہے کہ ایسا شخص اِس معاملے کو **الضّرورات تبیح المحظورات** کے خانے میں ڈالے، اور قانونِ ضرورت (law of necessity) کے تحت، اس کو موجودہ زمانے میں ساقط قرار دے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں مسلمانوں کا منفی ذہن بدستور باقی رہے گا اور وہ دعوت جیسے مثبت عمل کے لیے نااہل (incompetent) قرار پائیں گے۔

اوپر جن مسائل کا بیان ہوا، وہ براہِ راست طور پر دعوت الی اللہ کی تجدید سے تعلق رکھتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں جو نئے حالات پیدا ہوئے ہیں، ان کے ریفرنس میں دعوت کی اہمیت کو دوبارہ دریافت کرنا ہے۔ نئے حالات میں جو نئے موانع (obstacles) پیدا ہوئے ہیں، ان کا اِس طرح جواب دینا ہے جو دعوت کے راستے کو دوبارہ کھولنے والا ہو۔ موجودہ زمانے میں دعوت الی اللہ کی بات کرنا دراصل اِنھیں سوالات کو ایڈریس کرنے کا نام ہے۔ اِس سے کم تر درجے کا کوئی عمل موجودہ زمانے میں دعوت الی اللہ کے راستے کو ہموار کرنے والا نہیں۔

اِن مسائل سے صرفِ نظر کرکے اگر کوئی کام کیا جائے اور بطور خود اس کو دعوت الی اللہ کا نام دیا جائے، تو یہ قرآن کے الفاظ میں **وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا** (3: 188) کا مصداق ہوگا، یعنی ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا جس کو آدمی نے سرے سے انجام ہی نہیں دیا۔

آئڈیالوجی یا نظام

اسلام کا نشانہ انسان کو اسلامی بنانا (Islamization of man) ہے، اسلام کا نشانہ اجتماعی نظام کو اسلامی بنانا (Islamization of system) نہیں۔ فرد اور اجتماع کے درمیان یہ فرق عقیدہ کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ وہ پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کی بنیاد پر ہے۔ اللہ کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کے مطابق، یہی چیز ممکن ہے، اِس کے سوا کوئی اور چیز عملاً ممکن ہی نہیں۔

قرآن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قرآن میں فرد کا دین پوری طرح موجود ہے، فکری اعتبار سے بھی اور عملی اعتبار سے بھی۔ لیکن قرآن میں اجتماعی یا سیاسی زندگی کے لیے کوئی مکمل نظام موجود نہیں۔ مکمل نظام کے لیے ضروری ہے کہ اس کے لیے ایک ویل اسٹرکچرڈ ماڈل (well-structured model) موجود ہو، مگر ایسا ماڈل نہ قرآن میں بیان ہوا ہے اور نہ حدیث میں۔

فرد کے احکام اور اجتماع کے احکام کے بارے میں یہ فرق کسی اتفاق کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ یہی اصولی طور پر اسلام میں مطلوب ہے۔ اگر یہ اصولی طور پر مطلوب نہ ہوتا تو یقینی طور پر قرآن میں اس کا واضح بیان موجود ہوتا۔ اِس بنا پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اکمالِ دین (5:3) وہی ہے جو بالفعل قرآن میں موجود ہے، یعنی قرآن میں فرد کی نسبت سے جس دین کا بیان ہے، وہی دین کامل دین ہے اور اجتماع کی نسبت سے قرآن میں جس دین کا بیان ہے، وہی دین اجتماع کی نسبت سے کامل دین ہے۔

قرآن کی سورہ الشوریٰ میں کہا گیا ہے کہ جو دین تمام نبیوں کے درمیان مشترک تھا، وہی 'الدین' ہے اور اُسی الدین کی تم پیروی کرو (42:13)۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ تمام نبیوں کے درمیان مشترک دین وہی تھا جو فرد کی نسبت سے مطلوب ہے۔ اجتماع کی نسبت سے اگر کوئی مکمل نظام مطلوب تھا تو وہ مشترک طور پر تمام نبیوں کو دیا ہی نہیں گیا۔ اِس فرق سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے انفرادی دین اور اجتماعی دین دونوں کا معاملہ ایک دوسرے سے الگ ہے، دونوں کا مطالعہ ایک واحد معیار کے تحت نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں 'أقیموا الدین' کا

خطاب فرد سے ہے، یعنی ایک فردِ مسلم کی نسبت سے جو دین مطلوب ہے، اس کو چاہیے کہ اپنی انفرادی زندگی میں وہ اس پر قائم ہوجائے۔

اصولِ عملیت

اِس سلسلے میں ایک حدیث رسول کا مطالعہ کیجیے۔ زیر بحث موضوع کی نسبت سے ایک اہم روایت ہے جو حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: إن اللہ فرض فرائض فلا تضیّعوھا، وحرّم حرمات فلا تنتھکوھا، وحدّ حدوداً فلا تعتدوھا، وسکت عن أشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا (مشکاۃ المصابیح، رقم الحدیث: 197) یعنی اللہ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں، تم اُن کو ضائع نہ کرو۔ اللہ نے کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، تم اُن کا ارتکاب مت کرو۔ اللہ نے کچھ حدود مقرر کیے ہیں، تم اُن سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ نے کچھ چیزوں کے بارے میں سکوت اختیار فرمایا ہے، تم اُن امور کے معاملے میں بحث مت کرو۔

اِس حدیث رسول میں چار باتوں کا ذکر ہے۔ اِن میں سے ابتدائی تین چیزوں کا تعلق فرد سے ہے۔ فرائض کا اہتمام فرد کرتا ہے۔ حدود سے تجاوز نہ کرنے کا تعلق فرد سے ہے، حرام چیز سے بچنے کا تعلق فرد سے ہے۔ گویا کہ اِن تین فقروں میں ایک شخص کے انفرادی دین کو بتایا گیا۔ حدیث کے آخری فقرے میں جو بات کہی گئی ہے، اس کا ایک پہلو اجتماعی زندگی سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ اجتماع کے معاملے میں دینی روش کا تعلق خود اجتماع یا سماج کے حالات پر منحصر ہے۔ اجتماع کے معاملے میں ایک مومن کی روش کسی پیشگی معیار (ideal) کی بنیاد پر متعین نہیں ہوگی، بلکہ اِس بنیاد پر متعین ہوگی کہ خود اجتماع کے حالات کیا ہیں، یعنی اجتماع کے قبولیت کی سطح (level of acceptance) کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ایک مومن کو اپنی انفرادی زندگی میں معیار پسند (idealist) بننا ہے اور اجتماعی زندگی میں وہ روش اختیار کرنا ہے جس کو اصولِ عملیت (pragmatism) کہا جاتا ہے۔

حدیث کے آخری فقرے میں 'سکوت' کا مطلب مطلق سکوت نہیں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی معاملات، یعنی سماجی اور سیاسی معاملات کو اہلِ ایمان کے لیے کھلا (open) رکھا گیا ہے۔ اُن کو یہ

موقع دیا گیا ہے کہ وہ حالات کی رعایت کرتے ہوئے اپنے لیے کوئی مناسب روش اختیار کریں۔

اسلام میں فرد کے دین اور اجتماع کے دین کے درمیان تفریق کا یہ اصول اُس مشہور اصول کی بنیاد پر نہیں ہے جو مغرب میں چرچ اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ کے بعد پیدا ہوا اور جس کو مذہب اور سیاست کے درمیان علاحدگی کا نام دیا جاتا ہے۔ اِس معاملے میں مغرب کا اصول مطلق تفریق یا نظریاتی تفریق کے اصول پر قائم ہے۔ اِس کے برعکس، اسلام میں فرد اور اجتماع کے درمیان جو تفریق ہے، وہ ممکن اور ناممکن کے درمیان پائے جانے والے فطری فرق کے اصول پر مبنی ہے، یعنی تقریباً وہی اصول جس کو عام طور پر اِس مقولے میں بیان کیا جاتا ہے کہ — سیاست ممکن کا آرٹ ہے:

Politics is the art of the possible.

اجتماعی اور انفرادی اصول کے درمیان فرق کی حکمت

خالق نے انسان کو کامل آزادی دی ہے۔ انسانی آزادی خالق کے منصوبے کا ایک لازمی حصہ ہے جس کو منسوخ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر فرد اور اجتماع کا معاملہ ایک دوسرے سے الگ ہوجاتا ہے۔ چناں چہ جہاں تک فرد کا معاملہ ہے، ہر فرد کی زندگی اس کے اپنے اختیار میں ہوتی ہے، لیکن فرد سے باہر جو انسانی مجموعہ ہے، اس کا معاملہ کسی کے اختیار میں نہیں۔ گویا حرکیاتِ فرد کا اصول الگ ہے اور حرکیاتِ اجتماع کا اصول الگ۔

ایک فرد اپنی ذاتی زندگی میں کوئی دینی مسلک اختیار کرے تو اس سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا، لیکن جب آپ اجتماعی زندگی، یعنی سماجی نظام یا سیاسی نظام میں کوئی تبدیلی لانا چاہیں تو فوراً ٹکراؤ کا ماحول پیدا ہوجائے گا، کیوں کہ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ سماجی اور سیاسی نظام پر کوئی شخص یا گروہ پہلے سے اپنا اقتدار قائم کیے ہوئے ہوتا ہے۔ جب آپ سماجی اور سیاسی نظام میں تبدیلی کا علم بلند کرتے ہیں تو فوراً ہی آپ کا ٹکراؤ اُن لوگوں سے شروع ہوجاتا ہے جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ اُن کو اُن کے اقتدار کے منصب سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ کوئی بھی شخص یا گروہ اِس قسم کی معزولی کو برداشت نہیں کرسکتا، اِس لیے وہ فوراً اپنے دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پھر طرفین کے درمیان ایک ایسی لڑائی شروع

ہو جاتی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اِس طرح کے معاملے میں کسی ایک فریق کی جیت کبھی لڑائی کا خاتمہ نہیں کرتی، کیوں کہ جو فریق ہارتا ہے، وہ فوراً ہی انتقام (revenge) کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے دوبارہ ایک نئی جنگ چھیڑ دیتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی جوابی کارروائی کی پوزیشن میں نہ ہو، تب بھی وہ خودکش بم باری شروع کر دیتا ہے، تاکہ اگر وہ فریقِ ثانی کو ہرا نہیں سکتا تو کم از کم اس کو نقصان پہنچائے یا اُس کو کم از کم غیر مستحکم (unstable) کر دے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ اگر ''کامل دین'' کے نام پر اِس اصول کو اختیار کر لیا جائے کہ فرد نے جس دین کو اپنے لیے اختیار کیا ہے، اُسی دین کو اُسے اجتماع پر بھی نافذ (implement) کرنا ہے، تو اِس کے نتیجے میں دونوں فریق کے درمیان ایک ایسی لڑائی شروع ہو گی جو کبھی ختم نہ ہو گی۔ یہ کوئی قیاسی بات نہیں، بلکہ یہی پوری تاریخ کا عملی تجربہ ہے۔

پریکٹکل فارمولا

ایسی حالت میں خالق کے منصوبے کو برقرار رکھتے ہوئے اسلام میں ایک ایسا اصول بتایا گیا جو ہمیشہ کے لیے امن کا ضامن بن جائے، جو ہر حال میں امن کے قیام کو یقینی بنانے والا ہو۔ کیوں کہ کسی بھی قسم کی تعمیر کے لیے امن لازمی طور پر ضروری ہے امن نہیں تو تعمیری سرگرمیاں بھی نہیں۔

مذکورہ صورتِ حال کی بنا پر اجتماع کے لیے کوئی معیاری فارمولا ممکن نہیں، اِس لیے اسلام میں ایڈجسٹ مینٹ کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے ایک ایسا فارمولا اختیار کیا گیا ہے جس کو اِس معاملے میں پریکٹکل فارمولا (practical formula) کہا جا سکتا ہے۔ اِس فارمولے کو قرآن میں أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (42:38) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی اجتماعی معاملے میں وہی طریقہ اختیار کیا جائے گا جس پر اجتماعی مشورے کے بعد لوگ راضی ہو جائیں۔

شوریٰ یا جمہوریت کا اصول

اجتماعی معاملے میں کسی مطلق معیار کے بجائے لوگوں کی رائے سے فیصلہ کیا جانا کوئی سادہ بات

نہیں، یہ ایک اہم اجتماعی اصول ہے۔ جب انسانی مجموعہ یا مجتمع (human society) کا معاملہ ہو تو اس کے اندر نظمِ اجتماعی قائم کرنے کی دو صورتیں ہیں — ایک یہ کہ ایک شخص کو حاکمِ مطلق کی حیثیت حاصل ہو اور وہ سب کے اوپر اپنی مرضی نافذ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مجموعے کے ہر فرد کو اپنی رائے دینے کا موقع دیا جائے اور پھر یا تو اتفاقِ عام یا کثرتِ رائے کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے۔ پہلے طریقے کو آمریت (dictatorship) کہا جاتا ہے اور دوسرے طریقے کو جمہوریت (democracy)۔ اسلام میں شوریٰ کا اصول عملاً وہی ہے جس کو موجودہ زمانے میں جمہوریت کہا جاتا ہے۔

شوریٰ یا جمہوریت کا یہ اصول شرعی عقیدے کا مسئلہ نہیں ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے، یہ فطرت کے ایک اصول پر مبنی ہے۔ خالق نے مصلحتِ امتحان کے تحت ہر عورت اور مرد کو کامل آزادی عطا کی ہے، یہ آزادی قیامت سے پہلے منسوخ ہونے والی نہیں۔ ایسی حالت میں نظمِ اجتماعی (socio-political system) کو کس بنیاد پر قائم کیا جائے۔ اگر نظمِ اجتماعی کے لیے ایک معیاری اصول مقرر کر دیا جائے اور یہ مطلوب ہو کہ پورے انسانی مجموعے کو اسی معیاری اصول کے تابع بنانا ہے۔ ایسی حالت میں لازماً یہ ہوگا کہ ابدی طور پر لوگوں کے درمیان ٹکراؤ کی حالت جاری رہے گی۔ کچھ لوگ اِس معیاری اصول کو مانیں گے اور کچھ لوگ اپنے چوائس (choice) کا آزادانہ استعمال کرتے ہوئے اس کے خلاف ہو جائیں گے۔ اِس طرح سماج مستقل طور پر دو متحارب گروہ میں تقسیم ہو جائے گا، اُن کے درمیان ایسی لڑائی جاری ہو جائے گی جو کبھی ختم نہ ہو۔

ایسی حالت میں ہمارے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب (choice) ہے — ایک، معیاری اجتماعی اصول پر اصرار کرنا، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ معیاری اجتماعی اصول تو عملاً کبھی قائم نہ ہو اور نتیجۃً انسانی معاشرہ ہمیشہ کے لیے امن (peace) سے محروم ہو جائے۔ اس معاملے میں دوسرا انتخاب یہ ہے کہ نظمِ اجتماعی کے لیے کوئی مطلوب اصول نہ ہو، بلکہ پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کے اصول پر یہ کیا جائے کہ اجتماعی نظم کے معاملے میں رائے عامہ کو عملاً تسلیم کر لیا جائے۔ اِس طرح سماج میں فوری طور پر امن قائم ہو جائے گا اور ہر فرد کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ اپنے انفرادی دائرے میں

تعمیر وترقی کا جو منصوبہ چاہے، اس کو بروئے کار لاسکے۔

فطرت کے اِس اصول کو ایک حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: کما تکونون، کذلك يؤمّر عليكم (البيهقي، شعب الإيمان: 22/6) یعنی جیسے تم لوگ ہوگے، ویسے ہی تمھارے حکمراں ہوں گے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی انتظام (political administration) مطلق معنوں میں کسی اصول کے تابع نہیں ہوگا، بلکہ معاشرے کی رائے عامہ کے مطابق، اس کا تعین کیا جائے گا۔ اِس بات کو دوسرے الفاظ میں اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں حکومت کے معاملے کو کسی مطلق معیار (political idealism) کے تابع نہیں کیا گیا، بلکہ وہ عملی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جس کو سیاسی بندوبست (political adjustment) کا طریقہ کہا جاسکتا ہے۔

فطرت کا نظام

قرآن کی سورہ الفرقان اِس آیت سے شروع ہوتی ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ (25:1) یعنی بڑا بابرکت ہے اللہ جس نے فرقان (قرآن) اتارا، تاکہ وہ سارے عالم کے لیے آگاہ کرنے والا بنے۔

اِس آیت کے مطابق، قرآن ایک کتابِ فرقان ہے، یعنی فرق کرنے والی کتاب۔ فرقان فرق کا مبالغہ ہے۔ اِس کا مطلب ہے: الفصل بين الشيئين (دو چیزوں کے درمیان فرق کرنا)۔ یہ بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ موجودہ دنیا میں امتحان کی مصلحت کی بنا پر تمام چیزیں غیر ممیّز حالت میں پائی جاتی ہیں۔ انسان کی یہ لازمی ضرورت ہے کہ وہ اِن چیزوں کو درست طور پر سارٹ آؤٹ (sort out) کرسکے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں انسان فکری اعتبار سے، کنفیوژن (confusion) کا شکار ہوجائے گا اور عملی اعتبار سے وہ اپنے کاموں کی نتیجہ خیز پلاننگ نہ کرسکے گا۔ اِس اصول کو دوسرے الفاظ میں فطرت کا نظام کہا جاسکتا ہے۔ اِس دنیا میں کوئی بھی کامیابی صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ فطرت کے اِس نظام کو ملحوظ رکھتے ہوئے زندگی کا نقشہ بنایا جائے۔

انسان بظاہر وسیع کائنات کا ایک حصہ ہے، لیکن انسان کی ایک ممیز صفت ہے جو بقیہ کائنات

میں موجود نہیں، وہ یہ کہ انسان کی زندگی بیک وقت دو مختلف تقاضوں کا مجموعہ ہوتی ہے — فرد (individual) اور اجتماع (society)۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ فرد اور اجتماع کے تقاضے مشترک ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہیں، بلکہ بعض اوقات ایک دوسرے سے متضاد ہیں، حتی کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان کی زندگی گویا ایک قسم کا مجموعۂ اضداد (mixture of opposites) کی حیثیت رکھتی ہے۔

بقیہ کائنات کا معاملہ اِس سے مختلف ہے، بقیہ کائنات میں یہ تقسیم موجود نہیں۔ بقیہ کائنات کا معاملہ یہ ہے کہ جو ایک درخت کا کیس ہے، وہی پورے باغ کا کیس ہے، جو ایک قطرۂ آب کا کیس ہے، وہی پورے سمندر کا کیس ہے، جو ایک ستارے کا کیس ہے، وہی پوری کہکشاں کا کیس بھی ہے۔ بقیہ کائنات میں واحدہ (unit) اور مجموعہ دونوں کا کیس یکساں ہے، دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں — انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انسانی زندگی کی منصوبہ بندی میں اِس فرق یا اختلاف کو ملحوظ رکھنے کا نام کامیابی ہے اور اِس فرق یا اختلاف کو ملحوظ نہ رکھنے کا نام ناکامی۔

تاریخ کی تصویر

تاریخ میں جو سوچنے والے لوگ (thinkers) گزرے ہیں، اُن میں سے تقریباً ہر ایک کا یہ حال ہوا ہے کہ انھوں نے اپنی سوچ کے مطابق، ایک عظیم فکری نشانہ (great vision) کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن ساری کوشش کے بعد آخر میں وہ اپنے نشانہ (goal) کو حاصل کرنے کے بارے میں ناامید ہوگئے۔ اور جب وہ دنیا سے گئے تو وہ مایوسی (despair) کا کیس بن چکے تھے۔ ارسطو (Aristotle) سے لے کر برٹرنڈ رسل تک کتنے لوگ ہیں جنھوں نے آئڈیل گورنمنٹ کے قیام کو اپنا نشانہ بنایا، لیکن ساری کوشش کے باوجود وہ عملاً آئڈیل گورنمنٹ نہ بنا سکے۔ لیوٹالسٹائے (Leo Tolstoy) سے لے کر مہاتما گاندھی تک کتنے لوگ ہیں، جنھوں نے پرامن دنیا (peaceful world) بنانے کا خواب دیکھا، لیکن اُن کا خواب کبھی عملی واقعہ نہ بن سکا، یہاں تک کہ ناکامی کے احساس کے ساتھ وہ اس دنیا سے چلے گئے۔

سید قطب سے لے کر ڈاکٹر محمد مرسی (مصر) تک کتنے لوگ ہیں جنھوں نے اپنا یہ مشن بنایا کہ ان کو دنیا میں انصاف (justice) پر مبنی نظام قائم کرنا ہے، مگر اُن کا آخری احساس یہ تھا کہ ساری کوشش کے باوجود دنیا میں وہ اپنا مطلوب نظام قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اُن سب کا حال وہی ہوا جو رابندر ناتھ ٹیگور نے تمثیل کی زبان میں اِس طرح بیان کیا تھا— ساری عمر بینا (ستار) کے تاروں کو سلجھانے میں بیت گئی، مگر جو اَنتم گیت میں گانا چاہتا تھا، وہ میں نہ گا سکا۔

منصوبۂ تخلیق

یہ پوری تاریخ کا ایک عظیم فکری المیہ (intellectual tragedy) ہے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے— زندگی کے بارے میں خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) سے بے خبر ہونا اور خود ساختہ ذہن (self-styled mindset) کے تحت منصوبہ بنا کر اس کو ایک ایسی دنیا میں بروئے کار لانے کی کوشش کرنا جو اُس کے مطابق، بنائی نہیں گئی تھی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (17:84) یعنی ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کر رہا ہے۔ اب تمھارا رب بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستے پر ہے۔

قرآن کی اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ خالق کا منصوبۂ اشیا (scheme of things) ہی صحیح تخلیقی منصوبہ ہے۔ اُس کا اتباع کر کے دنیا میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ خالق کے منصوبے کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ صرف اپنے فکری شاکلہ (mindset) کو جانتے ہیں اور اُسی کے مطابق، عمل شروع کر دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ اپنے کاگ (cog) کو خالق کے کاگ سے نہیں ملاتے۔ اِس بنا پر اُن کا منصوبہ غیر حقیقت پسندانہ بن جاتا ہے۔ اِس معاملے میں لوگوں کی عمومی ناکامی کا اصل سبب یہی ہے۔

اِس سلسلے میں ایک بنیادی پہلو یہ ہے کہ خالق نے انسان کو مصلحتِ امتحان کی بنا پر مکمل آزادی (total freedom) عطا کیا ہے۔ ہر انسان کو کلی طور پر یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور

جو چاہے نہ کرے۔ اِس تخلیقی نقشے کی بنا پر عملاً یہ بات ناممکن ہوگئی ہے کہ اِس دنیا میں عوام (masses) کی سطح پر کوئی آئڈیل نظام بنایا جاسکے۔ کیوں کہ کچھ لوگ اگر اُس سے اتفاق کریں گے تو کچھ لوگ اپنے اختیار کا آزادانہ استعمال کرتے ہوئے اس کے خلاف ہو جائیں گے اور پھر وہ مجوّزہ اجتماعی اسکیم کو درہم برہم کردیں گے۔ تاریخ میں بار بار ایسے واقعات پیش آئے ہیں، جب کہ ایک شخص یا چند اشخاص نے بڑی بڑی اسکیموں کا خاتمہ کردیا۔

خالق کے اِس نقشے کی بنا پر حقیقت پسندانہ رویہ یہ ہے کہ آدمی اِس سے مطابقت کرتے ہوئے اپنا نقشہ بنائے۔ ہر انسان کو پیشگی طور پر یہ جاننا چاہیے کہ اس کا منصوبہ صرف اُس وقت کامیاب ہوسکتا ہے، جب کہ وہ خالق کے نقشے کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتا ہو۔ خالق کے نقشے سے ادنی انحراف بھی یقینی طور پر اس کے منصوبے کو ناکام بنادے گا، خواہ بطورِ خود وہ اس کو کتنا ہی زیادہ اچھا سمجھتا ہو۔

انفرادی معیار پسندی، اجتماعی عملیت

اِس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے غور کیا جائے تو موجودہ دنیا میں قابلِ عمل منصوبے کا اصول صرف ایک ہے، اور وہ ہے فرد (individual) اور اجتماع (society) کو ایک دوسرے سے الگ کرکے منصوبہ بنانا۔ فرد کے تقاضے اور اجتماع کے تقاضے کے درمیان فرق کی رعایت کرتے ہوئے اپنے عمل کا نقشہ بنانا یہی فطری طریقہ ہے۔ اِس فطری طریقے کا اصول مختصر طور پر یہ ہے:

1۔ فرد کے لیے نظری معیار (individual idealism)

2۔ اجتماع کے لیے عملی امکان (social pragmatism)

فرد کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں عامل اور معمول دونوں ایک ہوتے ہیں۔ فرد کے کیس میں ایک آدمی خود معیار مقرر کرتا ہے اور خود اس کے اپنے اختیار میں یہ ہوتا ہے کہ وہ اِس معیار کو اپنی زندگی میں اختیار کرے۔ اِس لیے فرد کے کیس میں کسی معیار کو عمل کی صورت دینا پوری طرح ممکن ہوتا ہے۔ اِسی لیے اللہ کے یہاں لوگوں کا درجہ فرد کی نسبت سے متعین ہوگا، نہ کہ مجموعہ کی نسبت سے۔

ہر فرد کو چاہیے کہ وہ جس اصول کو درست سمجھتا ہے، اس کو وہ اپنی ذاتی زندگی میں پوری طرح اختیار کرے۔ وہ اِس معاملے میں کسی سے سمجھوتہ (compromise) نہ کرے۔ یہی وہ اصول ہے جس کو ہم نے انفرادی معیار پسندی (individual idealism) کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اِس کے بعد جہاں تک اجتماع یا انسانی مجموعہ کا تعلق ہے، اس کے معاملے میں قانونِ فطرت کے مطابق، جو چیز قابلِ عمل ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ممکن الحصول اور ناممکن الحصول کے درمیان فرق کرتے ہوئے اپنا منصوبہ بنانا، یعنی ذاتی ماڈل کو چھوڑ کر عملی ماڈل اختیار کرنا، اجتماع کے درجۂ قبولیت (level of acceptance) کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے عمل کا نقشہ بنانا۔ یہی وہ عملی حقیقت (practical wisdom) ہے جس کو ہم نے اجتماعی عملیت (social pragmatism) کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

تاریخ میں جو مفکرین عملاً ناکام ہوگئے، اُن کی ناکامی کا مشترک سبب یہی ہے کہ انھوں نے ذاتی سوچ کے تحت اپنے ذہن میں اجتماع کا ایک خوب صورت ماڈل بنایا اور پھر اس کو وقوع میں لانے کے لیے پُرشور تحریکیں شروع کردیں۔ اِس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا تصوراتی ماڈل حقائق کی چٹان سے ٹکرا کر بکھر گیا — معیار (ideal) مجموعے کی سطح پر ناقابلِ حصول ہے، لیکن فرد (individual) کی سطح پر بلاشبہہ وہ قابلِ حصول ہے۔

مذہب اور سیاست

فرد اور اجتماع کے درمیان اِسی فرق کی بنا پر اسلام میں مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ کردیا گیا۔ مذہب کا نشانہ ذاتی ارتقا (personal development) ہے، یعنی ربانی بنیادوں پر فرد کی تعمیر۔ اِس اعتبار سے، مذہب اُس دائرے کی چیز ہے جس کے لیے ہم نے انفرادی معیار پسندی (individual idealism) کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اِس کے برعکس، سیاسی اقتدار کا معاملہ پورے انسانی مجموعے سے تعلق رکھتا ہے اور قانونِ فطرت کے مطابق، پورے انسانی مجموعے کو ایک معیار پر ڈھالا نہیں جاسکتا۔ ایسی حالت میں قابلِ عمل

صورت صرف یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کے معاملے کو اُس دائرے کی چیز قرار دیا جائے جس کے لیے ہم نے اجتماعی عملیت (social pragmatism) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

مذہب اور سیاست کے درمیان تفریق اِسی عملی اصول (practical wisdom) کی بنا پر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرد کو معیاری اصول پر قائم ہونے کی تاکید کی جائے، لیکن ذاتی اقتدار کے معاملے میں اُس اصول کو اختیار کرلیا جائے جس کو ایک حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: کماتکونون کذلك یؤمّر علیکم (البیهقي، رقم الحدیث: 7391) یعنی تم جیسے ہوگے، ویسے تمھارے حکمراں ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں، یہ کہ سیاسی اقتدار کے معاملے میں سماجی قبولیت (social acceptability) کو دیکھا جائے گا، نہ کہ کسی مطلق معیار (absolute ideal) کو۔

یہ فطرت کا اصول ہے۔ اِس اصول کی بنیاد پر زندگی کی تشکیل کی جائے تو سماج میں ہمیشہ امن قائم رہے گا، کیوں کہ امن کی حالت ہر قسم کی ترقی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ اِس کے برعکس، اگر فطرت کے اِس اصول کو نظر انداز کر دیا جائے اور فرد اور مجموعہ کو ایک ہی نظام کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے تو ابدی طور پر امن کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اِس کے بعد سماج میں نفرت اور ٹکراؤ اور تشدد جیسی برائیاں جنم لیں گی جو کبھی ختم نہ ہوں گی۔

اسلام کا اصل نشانہ

ہر نظام میں ایسا ہے کہ کچھ چیزیں اِس نظام کا اصل حصہ (real part) ہوتی ہیں اور کچھ چیزیں وہ ہیں جو اِس نظام کا اضافی حصہ (relative part) ہوتی ہے۔ اسلام میں خارجی اعتبار سے، اصل نشانے کی حیثیت صرف ایک چیز کو حاصل ہے، اور وہ دعوت یا شہادت ہے۔ اس کے سوا جو خارجی چیزیں ہیں، اُن کی حیثیت اسلام کے اضافی حصہ (relative part) کی ہے۔ اسلام کو عقلی طور پر سمجھنے کے لیے اِس حقیقت کو جاننا بہت ضروری ہے۔ اِس حقیقت کو جانے بغیر اسلام کی جو توجیہہ کی جائے گی، وہ کبھی درست نہیں ہوسکتی۔

شہادتِ عظمیٰ

اسلام کا نشانہ اقامتِ نظام نہیں ہے، بلکہ دعوت الی اللہ ہے، یعنی تمام انسانوں کو اللہ کا پیغام پہنچانا۔ تمام انبیا کا مشن یہی دعوت الی اللہ تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اِسی دعوتی مشن کے لیے کام کیا۔ یہ دعوتی مشن پوری تاریخ میں جاری رہا۔ عالمی ابلاغ کے اعتبار سے، اِس کا کامل اظہار دورِ آخر میں ہوگا۔ اِس کامل اظہار کو ایک حدیثِ رسول میں شہادتِ عظمیٰ کہا گیا ہے، یعنی تمام انسانیت کے سامنے اللہ کے دین کی عالمی گواہی (هذا أعظم الناس شهادة عند رب العالمين)۔

احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس شہادتِ عظمیٰ یا عالمی گواہی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مطابق، وسائل دستیاب ہوچکے ہوں۔ اِس معاملے کے دو پہلو ہیں — ایک یہ کہ اِس طرح کی عالمی شہادت کے لیے عالمی مواصلات (global communication) لازمی طور پر ضروری ہے۔ بیسویں صدی میں عالمی مواصلات کے معاملے میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے، یہاں تک کہ موجودہ زمانے کو مواصلات کا زمانہ (age of communication) کہا جاتا ہے۔ اِس واقعے میں اِس بات کا اشارہ ہے کہ موجودہ زمانے میں پوری طرح وہ وقت آگیا ہے کہ شہادتِ عظمیٰ یا عالمی دعوت کا کام موثر طور پر انجام دیا جاسکے۔ موجودہ زمانے میں ایک طرف، مکمل معنوں میں مذہبی آزادی آگئی ہے اور دوسری طرف مواصلات کی ترقی نے اِس بات کو آخری حد تک ممکن بنا دیا ہے کہ کسی رکاوٹ کے بغیر عالمی دعوت کا کام کیا جاسکے۔ یہ وہی کام ہے جس کو حدیث میں 'ادخال الكلمة في كل البيوت' کہا گیا ہے۔

اِس سلسلے میں دوسری بات وہ ہے جس کا ذکر مذکورہ حدیث میں آیا ہے۔ شہادتِ عظمیٰ کی روایت میں 'حجيج' کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی مطلوب دعوت کے کام کو حجت یا دلیل کی سطح پر انجام دینا۔ یہ بھی موجودہ زمانے کی ایک خصوصیت ہے۔ چناں چہ موجودہ زمانے کو دورِ تعقل (age of reason) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں علم کی ترقی کی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ عقلی ڈیٹا (rational data) کی بنیاد پر کسی بات کو مدلل کیا جاسکے۔

زمانے کی یہ تبدیلی بھی حدیث کی پیشین گوئی کے عین مطابق ہے۔موجودہ زمانے میں پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ اسلام کی صداقت کو عقلِ انسانی کی بنیاد پر مدلل کرکے اس کو انسان کے سامنے پیش کیا جا سکے۔گویا شہادتِ عظمیٰ کے دو تقاضے موجودہ زمانے میں پہلی بار انسان کی دسترس میں آئے ہیں— عالمی مواصلات اور عقلِ انسانی کی مسلّمہ سطح پر حقائق کا اثبات۔

حدیثِ رسول کے مطابق، دورِ آخر میں شہادت عظمیٰ کا جو واقعہ ظہور میں آنے والا ہے، وہ حدیث کے مطابق، ایک ایسا واقعہ ہوگا جو اِس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا۔اُس کے لیے ضروری ہے کہ انسانی علم عقلی ارتقا کے اعلیٰ درجے تک پہنچ چکا ہو۔اِسی کے ساتھ وہ تمام وسائل موجود ہو چکے ہوں جو اِس طرح کی عالمی شہادت کی ادائیگی کے لیے ضروری ہیں۔موجودہ زمانے میں یہ تمام وسائل پوری طرح وجود میں آ چکے ہیں۔اِس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ موجودہ زمانہ ہی وہ زمانہ ہے جب کہ شہادتِ عظمیٰ کا وہ واقعہ ظہور میں آئے جس کی پیشین گوئی حدیثِ رسول میں کی گئی ہے۔

خلاصہ کلام

اسلام میں انفرادی دین اور اجتماعی دین کے بارے میں یہاں جو کچھ کہا گیا، وہ اِس معاملے میں کوئی نئی اسکیم نہیں ہے۔اس کی حیثیت صرف یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں بالفعل جو کچھ پیش آیا، یہاں اس کی ایک قابلِ قبول توجیہہ (acceptable explanation) بیان کی گئی ہے۔اِس توجیہہ کی روشنی میں اسلام کی تاریخ ایک بامعنی تاریخ بن جاتی ہے۔اِس کے بعد تاریخ کے بارے میں یہ نظر آنے لگتا ہے کہ جو کچھ ہوا، وہ قانونِ فطرت کے مطابق ہوا اور اجتماعیات کے معاملے میں اسلام کا اصول وہی ہے جو خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق، فطرت کا اصول ہے۔

یہ ایک معلوم واقعہ ہے کہ اسلام کی بعد کی تاریخ میں کئی ایسے واقعات پیش آئے جو خالص معیار (ideal) سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔مثلاً خلیفہ یا امیر المومنین کے تقرر کے لیے مختلف طریقے اختیار کرنا۔بعد کے زمانے میں حکومتی ادارے کا خاندانی حکومت (dynasty) کی صورت اختیار کر لینا، اہلِ اسلام کا مختلف گروہوں میں بٹ جانا اور ان کے درمیان پر تشدد ٹکراؤ پیش آنا،

بیت المال کے نظام میں بظاہر خلل واقع ہونا، وغیرہ۔

اسلام کی بعد کی تاریخ میں جو واقعات پیش آئے، وہ بظاہر معیار کے مطابق نہ تھے۔ اِس طرح کے واقعات کے معاملے میں عام طور پر اہلِ علم نے دو قسم کا موقف اختیار کیا ہے — ایک موقف اُن لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بعد کی تاریخ میں اسلام کا ابتدائی معیار باقی نہ رہا، وہ بگاڑ کا شکار ہو گیا۔ دوسرا موقف اُن لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ وہ معاملات ہیں جن کے بارے میں ہمیں خاموشی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، ہمیں اُن کا تجزیہ نہیں کرنا چاہئے۔

مگر یہ دونوں موقف ناقابلِ قبول ہیں، کیوں کہ اسلام انسان کے لیے ہے اور انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ہر واقعے کی عقلی توجیہہ (rational interpretation) چاہتا ہے۔ اِس لیے اسلام کی تاریخ کی ایسی توجیہہ کرنا ضروری ہے جو عقلی طور پر قابلِ فہم ہو۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں لوگ اسلام کی صداقت کے بارے میں مشتبہ ہو جائیں گے، وہ کامل یقین کے ساتھ اسلام کو اختیار نہ کرسکیں گے — مذکورہ وضاحت کا یہ فائدہ ہے کہ اِس سے اسلامی تاریخ کی ایک قابلِ فہم توجیہہ حاصل ہو جاتی ہے، بغیر اِس کے کہ اسلام کی کامل صداقت پر کوئی حرف آیا ہو۔

تخلیقِ انسانی کا مقصد

ہر زمانے کے اہلِ فکر ہمیشہ یہ سوچتے رہے ہیں کہ انسان کی تخلیق کا مقصد (purpose of creation) کیا ہے۔ معلوم تاریخ کے مطابق، تقریباً 5 ہزار سال سے انسان اِس سوال کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ مگر اکیسویں صدی عیسوی کے ربع اول تک اِس کا کوئی متفق علیہ جواب انسان دریافت نہ کرسکا۔

مشہور برٹش سائنس داں سر جیمز جینز (وفات: 1946) نے اپنی کتاب پراسرار کائنات (*The Mysterious Universe*) میں لکھا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان بھٹک کر ایک ایسی دنیا میں آگیا ہے جو اس کے لیے بنائی نہیں گئی تھی:

It seems that man was strayed in a world that was not made for him.

اِس موضوع پر سوچنے والے لوگوں نے عام طور پر مایوسی کی باتیں کی ہیں۔ ایک روسی مصنف نے لکھا ہے کہ اِس دنیا میں ہر چیز حسین (beautiful) ہے، صرف ایک چیز ہے جو حسین نہیں، اور وہ انسان ہے۔

ڈاکٹر الکسس کیرل نے اِس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اِس موضوع کی پیچیدگیوں کی بنا پر انھوں نے اِس کا نام انسانِ نامعلوم (*Man the Unknown*) رکھ دیا ہے۔ برطانی مصنف ایڈورڈ گبن نے لکھا ہے کہ انسانی تاریخ جرائم کے رجسٹر سے کچھ ہی زیادہ ہے۔

فرانس کے مشہور فلسفی ڈیکارٹ نے انسان کی ہستی پر غور کیا۔ اس نے کہا کہ میں سوچتا ہوں، اِس لیے میں ہوں (I think, therefore, I exist)۔ ڈیکارٹ کے اِس قول سے صرف انسان کے وجود کی تصدیق ہوتی ہے، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ انسان کے وجود کا مقصد (purose of existence) کیا ہے۔

مشہور یونانی فلسفی ارسطو (وفات: 322 ق م) نے اِس مسئلے پر غور کیا۔ انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا کہ — صرف قانونی نظام یہ کرسکتا ہے کہ وہ لوگوں کو اُن کے وحشیانہ سلوک سے بچائے:

The legal system alone saves people
from their own savagery.

ارسطو کو معلمِ اول کہا جاتا ہے۔ چناں چہ یہی سوچ بعد کی تاریخ میں رائج ہوگئی۔ ارسطو کی سوچ کا مطلب یہ تھا کہ انسان کو اعلیٰ اوصاف کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، لیکن یہ اوصاف ابتدائی طور پر بالقوہ حالت میں ہوتے ہیں۔ اِس بالقوہ کو بالفعل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک موافق سماجی اور سیاسی نظام (socio-political system) موجود ہو۔ اُس وقت کا یونانی بادشاہ سکندر اعظم (وفات: 323 ق م) ارسطو کا شاگرد تھا۔ ارسطو نے چاہا کہ بادشاہ کے تعاون سے وہ یونان میں مطلوب سیاسی اور سماجی نظام بنا سکے، مگر ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ چناں چہ ارسطو مایوسی (despair) کی حالت میں صرف 62 سال کی عمر میں مر گیا۔

ارسطو کے نزدیک انسانی فلاح صرف صالح اجتماعی نظام کے ذریعے ممکن ہوسکتی تھی۔ ارسطو نے اپنے اس تصور کو فلسفہ کی زبان میں بیان کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس نے اپنے اِس تصور کو فلاسفائز (philosifise) کیا۔ اِس کے ایک عرصہ بعد جرمنی میں کارل مارکس (وفات: 1883) کا دور آیا۔ کارل مارکس نے اِس تصور کو اقتصادی اصطلاحوں میں بیان کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مارکس نے اِس تصور کو سیکولرائز (secularise) کیا۔ مگر کارل مارکس، عالمی کمیونسٹ پارٹی اور اِس تصور پر بننے والی سوویت ریاست (USSR) سب کی سب، اپنے اجتماعی نشانے کے حصول میں مکمل طور پر ناکام ہوگئے۔

اِس کے بعد یہ فکری منہج مسلمانوں کے درمیان رائج ہوا۔ عرب دنیا میں سید قطب (وفات: 1966) اور برصغیر ہند میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (وفات: 1979) پیدا ہوئے۔ اِن لوگوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس فکری منہج کو اسلام میں داخل کردیا۔ انھوں نے اسلام کی سیاسی تفسیر بیان کی۔ انھوں نے اسلامی زندگی کے لیے اس کے مطابق، سماجی اور سیاسی نظام (socio-political system) کے

قیام کو ضروری قرار دیا— ارسطو نے اِس تصور (concept) کا فلسفیانہ ایڈیشن تیار کیا تھا۔ کارل مارکس نے اِس تصور کا سیکولر ایڈیشن بنایا اور سید قطب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اِس تصور کا اسلامی ایڈیشن تیار کردیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پچھلے ڈھائی ہزار سال کے دوران یہ نظریہ کبھی بھی واقعہ نہ بن سکا۔ کبھی کسی ملک میں ایسا نہیں ہوا کہ مصلح کے بیان کردہ نشانے کے مطابق، کوئی اجتماعی نظام یا کوئی سماجی نظام قائم ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اِس نظریے کے تمام علم بردار آخر کار مایوسی کی حالت میں مرے، وہ دنیا کو اپنے تصور کے مطابق، مطلوب نظام نہ دے سکے۔

اِس سے بھی زیادہ تلخ بات یہ ہے کہ اِس قسم کے تمام نام نہاد مصلحین کا انجام یہ ہوا کہ وہ تعمیر کے نام پر اٹھے اور دنیا کو عملاً تخریب کا تحفہ دے کر چلے گئے۔ ارسطو کے شاگرد سکندر اعظم نے ساری دنیا کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ کارل مارکس کے ماننے والوں نے اپنا مفروضہ نظام قائم کرنے کے نام پر روس میں 25 ملین انسانوں کو ہلاک کردیا۔ سید قطب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک کے نتیجے میں مختلف ملکوں میں اپنے مطلوب نظام کے قیام کے لیے مسلح جدوجہد (armed struggle) شروع ہوئی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو مزید تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

اجتماعی اصلاح کی اِن تحریکوں کا یہ منفی انجام کیوں ہوا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ اجتماعی نظام کا تعلق براہِ راست سیاسی اقتدار سے ہے۔ جب بھی آپ کسی ملک میں اپنی پسند کا اجتماعی نظام قائم کرنے کے لیے اٹھیں گے تو وہاں لازماً اُن لوگوں سے آپ کا ٹکراؤ پیش آئے گا جو بروقت سیاسی اقتدار پر قابض ہیں۔ اِس طرح اجتماعی نظام کا نظریہ اول دن سے ٹکراؤ کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

سیاسی ٹکراؤ کوئی سادہ بات نہیں۔ سیاسی ٹکراؤ کا طریقہ عین اپنے نتیجے کے طور پر انسان کو دو طبقوں میں تقسیم کردیتا ہے۔ اسلام کے پولٹکل مفسرین کے الفاظ میں، ایک، ''طاغوت'' اور دوسرے، مخالفِ طاغوت۔ مخالفِ طاغوت گروہ اپنی تحریک کو پہلے قائم شدہ حکومت کے مقابلے میں اپوزیشن کے طور پر شروع کرتا ہے۔ آغاز میں یہ کام بظاہر پُرامن طور پر شروع ہوتا ہے، لیکن جب پُرامن ذریعہ

ناکام ہوجاتا ہے تو اس کے بعد دھیرے دھیرے قائم شدہ حکومت کے خلاف تشدد شروع ہوجاتا ہے، پھر جب تشدد سے بھی مطلوب کامیابی حاصل نہیں ہوتی تو اس کے بعد آخری چارۂ کار کے طور پر خودکش بم باری شروع کردی جاتی ہے۔ اجتماعی انقلاب کا نتیجہ اپنے آخری انجام کو پہنچ کر صرف اجتماعی ہلاکت بن کر رہ جاتا ہے۔

اِس معاملے میں تباہ کن ناکامی کا سبب یہ ہے کہ اجتماعی انقلاب کا نظریہ اپنے آپ میں ایک غیر فطری نظریہ ہے۔ وہ خالق کے تخلیقی نقشہ کے خلاف ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اِس دنیا میں کوئی ایسا نظریہ کبھی مثبت نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا جو خالق کے تخلیقی نقشہ کے خلاف ہو۔

خالق کا نقشۂ تخلیق

خالق کا نقشۂ تخلیق (creation plan) کیا ہے۔ اس کو جاننے کا واحد مستند ذریعہ صرف قرآن ہے۔ قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق نے انسان کو جس نقشے کے مطابق، پیدا کیا ہے، وہ کسی مفروضہ اجتماعی نظام پر مبنی نہیں ہے، وہ تمام تر انفرادی اصلاح کے تصور پر مبنی ہے۔ خالق نے دنیا میں اپنی اسکیم کو برروئے کار لانے کے لیے ہر دور میں پیغمبر بھیجے۔ اِن تمام پیغمبروں کا نشانۂ دعوت ہمیشہ فرد (individual) ہوا کرتا تھا، نہ کہ کسی قسم کا سوشیو پولٹکل سسٹم (socio-political system) خالق کا اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، اصل کنسرن (concern) یہ نہیں ہے کہ دنیا میں اجتماعی سطح پر کوئی آئڈیل نظام بنایا جائے۔ خالق کا نشانہ فرد سازی ہے، مجتمع سازی نہیں، کیوں کہ تخلیقی نقشے کے مطابق، مجتمع سازی آئڈیل معنوں میں ممکن ہی نہیں۔ آئڈیل نظام یا آئڈیل سماج صرف جنت میں قائم ہوسکتا ہے۔ موجودہ دنیا کی حیثیت انتخابی میدان (selection ground) کی ہے۔ خالق کی منشا یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ایسے اعلیٰ افراد چنے جائیں جو آخرت کی ابدی جنت میں بسائے جانے کے مستحق ہوں۔ اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے قرآن کی سورہ البقرہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی متعلق آیتوں کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین بنانے والا ہوں۔

فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اس میں فساد کریں اور خون بہائیں۔ اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھا دئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ''۔ (2:30-31)

اللہ تعالی نے جب انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ زمین کو اِس آزاد مخلوق کے چارج میں دے دے، اُس وقت فرشتوں نے یہ شبہہ ظاہر کیا کہ آزادی پا کر انسان زمین پر فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ فرشتوں کا یہ شبہہ بے بنیاد نہ تھا۔ خود قرآن کے بیان سے ثابت ہے کہ فی الواقع ایسا ہی ہوا۔ ساتویں صدی کے ربع اول میں جب قرآن اترا تو اللہ تعالی نے اس میں یہ آیت شامل فرمائی: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (30:41) یعنی خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا، لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی کے سبب سے۔

یہاں یہ سوال ہے کہ جب بطور واقعہ وہی ہوا جس کا شبہہ فرشتوں نے ظاہر کیا تھا، تو پھر اللہ نے اولادِ آدم کو کیوں پیدا کیا اور کیوں اُن کو زمین پر بسنے کا موقع دیا۔

جیسا کہ معلوم ہے، آدم کی پیدائش سے لے کر ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول تک جب کہ قرآن نازل ہوا، ہر قوم اور ہر بستی میں مسلسل طور پر اللہ کی طرف سے نذیر (بتانے والے) آتے رہے، اس کے باوجود آدم کی بعد کی نسلوں میں پیدا ہونے والے لوگوں کی اکثریت مفسد ثابت ہوئی، حتی کہ پوری تاریخ فساد سے بھری ہوئی تاریخ بن گئی۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو کیوں پیدا کیا۔ اِس سوال کا جواب قرآن کی مذکورہ آیتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کی اِن آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے آدم کو اُن کی اولاد کے نام (أسماء) بتائے۔ یہاں علمِ اسماء سے مراد علمِ مسمَّیات ہے۔ یہاں اسم سے مراد افراد کے نام (names) نہیں، بلکہ یہاں اسم سے مراد مُسمّٰی (named) ہے، یعنی نام سے موسوم افراد۔ دوسری بات یہ کہ اُس وقت آدم کے سامنے اللہ نے اُن کی اولاد کے جن لوگوں کو پیش کیا، وہ پوری ذریتِ آدم یا پورا مجموعۂ انسانی نہ تھا۔ کیوں کہ اگر تمام

پیدا ہونے والے انسان اُن کے سامنے پیش کیے جاتے تو فرشتوں کا شبہہ رفع نہیں ہوسکتا تھا، بلکہ اِس قسم کے مظاہرے سے فرشتوں کے شبہہ کی تصدیق ہو جاتی۔ کیوں کہ خود قرآن کی تصدیق کے مطابق، پیدا ہونے والے انسانوں کی عظیم اکثریت عملاً مفسد ثابت ہوئی۔

اِس پہلو پر غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس وقت پوری اولادِ آدم کو نہیں بلکہ صرف اولادِ آدم کے منتخب افراد کو پیش کیا تھا۔ یہ منتخب افراد وہی تھے جن کو قرآن میں دوسرے مقام پر نبی اور صدیق اور شہید اور صالح کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے (4:69)۔ یہ مظاہرہ اللہ تعالیٰ نے صرف فرشتوں کے لیے نہیں کیا تھا، بلکہ بالواسطہ طور پر اُس کا مخاطب وہ انسان بھی تھے جو اللہ کے مقصدِ تخلیق کو سمجھنا چاہتے ہوں۔

اِس معاملے کی مزید وضاحت قرآن کی سورہ الملک کی ایک آیت سے معلوم ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (67:2)۔ اِس آیت سے اور قرآن کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق سے اللہ تعالیٰ کا مقصود احسن العمل افراد ہیں، پورے مجموعۂ انسانی میں عدل اور فلاح کا نظام قائم کرنا منصوبہ الٰہی کا نشانہ نہیں۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ خالق نے جس نقشے کے تحت انسان کو پیدا کیا، اس میں ایسا ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ کیوں کہ اِس منصوبۂ تخلیق کے مطابق، ہر انسان کو کامل آزادی دی گئی تھی۔ ہر انسان کے لیے کامل معنوں میں آزادانہ انتخاب (fredom of choice) کا موقع کھلا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں یہ بالکل فطری بات تھی کہ لوگ اپنی آزادی کا غلط استعمال کریں اور اِس طرح اکثر لوگ عملاً مفسد بن جائیں۔ اِس بنا پر اللہ تعالیٰ نے ایک قابلِ عمل نشانے کا انتخاب کیا، یعنی اپنے منصوبہ تخلیق کو مبنی بر فرد کے اصول پر قائم کرنا، نہ کہ مبنی بر مجموعہ کے اصول پر۔ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نقشہ تخلیق کے مطابق، اب جو ہو رہا ہے، وہ یہ کہ زمین پر کامل معنوں میں آزادی کا ماحول ہے۔ لوگ ایک کے بعد ایک پیدا ہو رہے ہیں۔ اُن میں سے کوئی فرد اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور کوئی غلط استعمال۔ عین اُسی وقت ایک غیبی نظام کے تحت فرشتے ہر ایک کا پورا ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔ یہ ریکارڈ قیامت کے دن اللہ کے سامنے پیش ہوگا۔ اُس وقت

جو ہوگا، اس کو قرآن میں پیشگی طور پر مختلف الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے: فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ (42:7) یعنی ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ جہنم میں۔

تخلیق کے اِس تصور کے مطابق، آخرت میں یہ ہوگا کہ پوری نسلِ انسانی سے صالح افراد چنے جائیں گے، یعنی وہ لوگ جنھوں نے یہ ثبوت دیا تھا کہ آزادی کے باوجود انھوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال نہیں کیا۔ آزادی کے باوجود وہ کامل معنوں میں بااصول زندگی کے پابند رہے، آزادی کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو پوری طرح بے راہ روی سے بچایا۔ اِس طرح انھوں نے ثابت کیا کہ وہ جنت کے آئڈیل معاشرے میں بسائے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ آخرت میں پوری تاریخ بشری کے اِن منتخب افراد کو جنت کے معیاری معاشرے میں بسا دیا جائے گا، اور بقیہ لوگ جو اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرنے میں ناکام رہے، اُن کو دوسرے انسانوں سے الگ کرکے کائناتی کوڑا خانہ (universal litterbin) میں ڈال دیا جائے گا، جس کا دوسرا نام جہنم ہے۔

خلافت کا تصور

قرآن کی سورہ البقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے جب انسان کو پیدا کیا تو اللہ اور فرشتوں کے درمیان ایک مکالمہ ہوا۔ اِس مکالمے کے دوران اللہ نے انسان کی پیدائش کا مقصد اِس طرح بیان کیا: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (2:30) یعنی یاد کرو اُس وقت کو جب کہ تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

'خلافت' کے لغوی معنی ہیں: بعد کو آنا۔ 'خلیفہ' کا مطلب ہے: کسی کے بعد اس کی جگہ پر آنے والا، یعنی جانشین (successor)۔ خلیفہ کا اصل لفظی مطلب یہی ہے، لیکن اِس طرح کسی کے بعد جو شخص جانشین بنتا ہے، وہ عام طور پر صاحبِ اقتدار ہوتا ہے، اس لیے استعمال میں خلیفہ کا لفظ مجرد طور پر صاحبِ اقتدار کے لیے بولا جانے لگا، خواہ ایسا شخص جانشین کے طور پر صاحبِ اقتدار بنا ہو یا جانشینی کے بغیر اس کو یہ پوزیشن حاصل ہوگئی ہو۔

قرآن کی اِس آیت میں خلیفہ کا لفظ اِسی دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو زمین پر ایک بااختیار مخلوق کی حیثیت سے آباد کیا۔ ایک عارضی مدت کے لیے زمین انسان کے چارج میں دے دی گئی۔ نظامِ فطرت کے مطابق، اگر چہ زمین کا انتظام انسان چلا رہے ہیں جس طرح کائنات کے دوسرے حصوں کا انتظام فرشتے چلا رہے ہیں۔ لیکن محدود معنی میں زمین انسان کے چارج میں ہے۔ قیامت تک کے لیے انسان کو کامل اختیار ہے کہ وہ اپنے دائرے میں زمین پر آزاد مخلوق کی حیثیت سے زندگی گزارے، خواہ وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرے یا غلط استعمال۔

قرآن فہمی کا ایک اصول یہ ہے: القرآن یفسر بعضہ بعضا (قرآن کا ایک حصہ اُس کے دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے)۔ اِس اصول کے مطابق، غور کیا جائے تو قرآن کی متعدد آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کو خلیفہ بنانے کا مطلب کیا ہے۔ اُن میں سے ایک آیت یہ ہے: ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (10:14)۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک کامل مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے، پہلا انسان اتنا ہی کامل تھا، جتنا کہ اکیسویں صدی کا انسان۔ لیکن جس سیارہ ارض (planet earth) پر انسان کو بسایا گیا، وہاں تمام چیزیں موجود تھیں، لیکن یہ چیزیں زیادہ تر بالقوہ (potential) طور پر موجود تھیں۔ اب یہ انسان کا کام تھا کہ وہ اِس بالقوہ کو بالفعل (actual) بنائے۔ پوری انسانی تاریخ اِس معاملے کی تصویر ہے۔ وہ بالقوہ سے بالفعل کی طرف سفر کر رہی ہے۔

اِس سفر کے لیے انسانی زبان میں سب سے زیادہ موزوں لفظ تہذیب ہے۔ پوری انسانی تاریخ، آدم سے لے کر قیامت تک، اِسی تہذیبی سفر کا دوسرا نام ہے۔ خالق نے کرہ ارض کو تہذیب کے مقام یا مقر (abode of civilization) کے طور پر بنایا۔ انسان کا کام یہ تھا کہ وہ اِس پوٹنشیل تہذیب (potential civilization) کو ایکچول تہذیب (actual civilization) کی صورت میں ڈیولپ کرے — اِسی رول کو انجام دینے والے کا نام خلیفہ ہے، خواہ وہ مذہبی انسان ہو یا سیکولر انسان۔

تہذیب کا لفظ عام طور پر مادی ترقی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ معروف تصور کے مطابق، تہذیب کا مطلب ہے — سوشل، کلچرل اور سائنٹفک ترقی کا اعلیٰ مرحلہ۔ مگر تہذیب کی یہ تعریف ایک محدود تعریف ہے۔ تہذیب کے تصور کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کے پس منظر میں دیکھا جائے۔ چوں کہ تہذیب کے معمار خود سے کوئی چیز تخلیق نہیں کرتے، وہ خالق کے پیدا کردہ ذرائع (natural resources) یا انفراسٹرکچر کو استعمال کرتے ہوئے تہذیب کا سفر جاری کرتے ہیں۔ گویا کہ تہذیب کے تمام انسانی معمار، خالق کے کارندے ہیں۔ وہ خدا کے تخلیقی منصوبے کو واقعے کی صورت دے رہے ہیں۔

تہذیب کا یہ سفر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، ربانی تہذیب کا سفر ہے۔ وہ انسان کو اُس منزل کی طرف لے جانے والا ہے جہاں وہ حمدِ الٰہی اور شکرِ خداوندی کا اعلیٰ تجربہ کرے، جہاں وہ ربانی معرفت کے اعلیٰ مراتب کو حاصل کر سکے۔ مگر یہ کام چوں کہ انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے انجام دیا جا رہا ہے، اِس لیے لوگ اس کی معنویت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ تہذیب کے اِس سفر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ

آدمی انسانی آزادی سے پیدا ہونے والی خرابیوں (evils) کو الگ کر کے یہ دیکھ سکے کہ خدا کس طرح انسانی تاریخ کو مینیج کر رہا ہے۔انسانی تاریخ کو بامعنی طور پر سمجھنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ مبصر، انسانی عنصر کو الگ کر کے تاریخ میں عمل کرنے والے خدائی عنصر کو دیکھ سکے۔

ایک جائزہ

اللہ نے انسان کو کامل آزادی عطا فرمائی ہے۔یہ آزادی اِس لیے ہے تاکہ انسان خود سے چیزوں کو دریافت کرے، وہ اپنے اندر ایک خود تعمیر کردہ شخصیت (self-developed personality) بنائے۔انسان کبھی اپنی آزادی کو صحیح استعمال کرتا ہے اور کبھی غلط استعمال۔لیکن اللہ اپنی قوتِ قاہرہ کے ذریعے تاریخ کو مینیج کرتے ہوئے اُس کو اُس منزل کی طرف لے جا رہا ہے جو اس کی اصل منزل ہے، یعنی معرفتِ خداوندی(realization of God) کی تکمیل۔

اللہ نے انسانیت کے آغاز سے پیغمبروں کو بھیجنے کا جو سلسلہ جاری کیا، وہ اِس لیے تھا کہ پیغمبر، انسان کو خدا کے تخلیقی منصوبے سے باخبر کریں اور یہ کوشش کریں کہ انسانی تہذیب کا سفر صحیح رخ (right direction) میں جاری رہے۔مگر تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان اپنی آزادی کو استعمال کرنے میں زیادہ ذمے دار ثابت نہیں ہوا۔بہت جلد ایسا ہوا کہ تاریخ عمومی طور پر توحید کے راستے سے ہٹ کر شرک کے راستے پر چل پڑی۔اس کا سبب یہ تھا کہ انسان نے پایا کہ پیغمبر جس اللہ کی خبر دے رہے ہیں، وہ اللہ اس کو دکھائی نہیں دیتا، البتہ اللہ کی پیدا کردہ مخلوقات ہر طرف دکھائی دے رہی ہیں۔اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے نہ دکھائی دینے والے خدا کو چھوڑ کر، دکھائی دینے والی چیزوں کو اپنا خدا سمجھ لیا۔

یہ واقعہ کس طرح ہوا، اس کا اشارہ قرآن کے اِن الفاظ میں ملتا ہے: هَـٰذَا رَبِّي هَـٰذَا أَكْبَرُ (6:78) یعنی ہر وہ چیز جو بظاہر بڑی (great) دکھائی دے، اس کو خدا یا شریکِ خدا سمجھ لینا۔اِسی سے قدیم تاریخ میں شرک کی وہ صورت پیدا ہوئی جس کو مظاہر فطرت کی پرستش (nature worship) کہا جاتا ہے۔فطرت پرستی کا یہ نظریہ لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔اِس کا سبب یہ تھا کہ پچھلے زمانے کے تمام بادشاہ فطرت پرستی کو اپنے لیے موزوں (convenient) سمجھ کر اِس مذہب کی سرپرستی کرنے لگے۔

انھوں نے اِسی مشرکانہ مذہب سے اپنے لیے حق حکم رانی (mandate) لینا شروع کردیا۔ اِس طرح ایسا ہوا کہ قدیم زمانے میں ساری دنیا میں شرک کو سرکاری مذہب (official religion) کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ شرک اور سیاسی اقتدار کے اِسی تعلق (nexus) کے نتیجے میں قدیم زمانے میں شرک کو ساری دنیا میں دبدبہ حاصل ہوگیا۔ شرک کا یہ دبدبہ مذہبِ توحید کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ شرک کے اِسی دبدبے کو قرآن میں فتنہ (8:29) کہا گیا ہے۔

شخصی حکومت

قدیم زمانے میں ہزاروں سال سے ساری دنیا میں حکومت کا وہ نظام قائم تھا جس کو شخصی بادشاہت (Monarchy) کہا جاتا ہے۔ شخصی بادشاہت بہت جلد شخصیت پرستی (personality cult) میں تبدیل ہوجاتی تھی۔ اور پھر شخصیت پرستی رفتہ رفتہ بت پرستی (idol worship) کی صورت اختیار کرلیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں ایسا ہوا کہ شخصی حکومتیں آخرکار مشرکانہ حکومتیں بن گئیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت موسی کے معاصر بادشاہ فرعون نے کہا کہ: أنا ربکم الأعلی (79:24)۔

قدیم زمانے میں شخصی حکومت کا نظام سب سے بڑی برائی (greatest evil) بن کر ابھرا۔ یہ انسانی آزادی کا سب سے زیادہ سنگین استعمال تھا۔ دنیا میں اِس نظام کو جمہوری انقلاب کے ذریعے سیاسی طور پر ختم کیا گیا۔ آخرت میں باعتبارِ حقیقت اُس کی مجرمانہ حیثیت کا اعلان کیا جائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: يقبض الله تبارك وتعالى الأرض يوم القيامة ويطوي السماء بيمينه ثم يقول أنا الملك، أين ملوك الأرض (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4994)۔

خلافت کے تین دور

قرآن میں خلافت کے معنی ''اسلامی خلافت'' کے نہیں ہیں۔ قرآن کے مطابق، وہ تمام لوگ خلائف في الأرض (10:14) ہیں جن کو مختلف زمانوں میں بااختیار رول ملا، خواہ وہ اپنے عقیدے کے اعتبار سے، مذہبی ہوں یا غیر مذہبی۔ تاریخ میں جن لوگوں کو باری باری خلافتِ ارضی کا

رول ادا کرنے کا موقع ملا، اُن کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1۔ مشرکین کی خلافت — یہ دور قدیم زمانے سے لے کر ساتویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔

2۔ موحدین کی خلافت — یہ مسلم سلاطین کا دور ہے۔ یہ دور تقریباً آٹھویں صدی سے لے کر اٹھارھویں صدی تک قائم رہا۔

3۔ سیکولر لوگوں کی خلافت — یہ دور انیسویں صدی عیسوی میں شروع ہوا اور اب تک قائم ہے۔

قدیم زمانے میں جن مشرک گروہوں کو خلافتِ ارضی کا رول ادا کرنے کا موقع ملا، انھوں نے اپنی آزادی کا نہایت غلط استعمال کیا۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے ناحق طور پر ساری دنیا میں جبر کی حکومت (despotic rule) کا نظام قائم کر دیا۔ اِس دور میں انسان کو مذہبی آزادی حاصل نہ تھی۔ اِس دور میں ہر جگہ وہ کلچر قائم تھا جس کو مذہبی تشدد کا دور کہا جاتا ہے۔

اِس مشرکانہ دور میں آزادانہ سوچ (free thinking) کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اِس بنا پر فکری ارتقا کا عمل پوری طرح ختم ہو گیا تھا۔ علم کی ترقی عملاً ناممکن ہو گئی تھی۔ اِس کا ایک شدید نقصان یہ تھا کہ فطرت (nature) میں تحقیق کا کام پوری طرح رک گیا تھا۔ اللہ کو یہ مطلوب تھا کہ انسان فطرت میں چھپے ہوئے قوانین کو دریافت کرے، تاکہ انسان پر اعلیٰ معرفت کے دروازے کھلیں، دعوتی عمل کو زیادہ موثر طور پر انجام دینا ممکن ہو جائے۔ مگر مشرکانہ اقتدار کے زمانے میں اِس قسم کا عمل پوری طرح بند ہو گیا تھا۔ اللہ نے کثیر تعداد میں پیغمبر بھیجے، تاکہ وہ انسان کو بتائیں کہ وہ اپنی آزادی کو غلط استعمال کر کے اللہ کے منصوبے میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ لیکن پیغمبروں کی پُرامن دعوتی کوشش عملاً غیر موثر ہو گئی۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے تخلیقی منصوبے کی بنا پر انسان کی آزادی کو تو ختم نہیں کیا، البتہ یہ فیصلہ کیا کہ خلافتِ ارضی کا رول مشرکین سے چھین لیا جائے اور اس کو موحدین کے حوالے کر دیا جائے۔ یہی خدائی فیصلہ تھا جس کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (8:29)۔ قرآن کی اِس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، اُس کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگی کہ دورِ شرک اپنے وجود کا جواز ختم کر چکا ہے، اس کو توڑ کر دورِ توحید کا آغاز کرو،

تاکہ انسان کے اوپر اللہ کی ابدی رحمتوں کے دروازے کھلیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر اور آپ کے پیروؤں نے واقعتاً ایسا ہی کیا۔ پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں نے دورِ قدیم کی تقریباً پوری آباد دنیا میں وہ کام کیا جس کو ایک مبصر نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے کہ — پیغمبر اور اُن کے پیروؤں نے قدیم زمانے کے پورے سیاسی نقشے کو بدل دیا۔

اِس طرح خلافتِ ارضی کا رول مسلمانوں یا موحدین کے ہاتھ میں آگیا۔ مسلمانوں نے اِس عہد میں جو رول ادا کیا، وہ کوئی نظام قائم کرنا نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام قائم کرنا امتِ مسلمہ کا نشانہ ہی نہیں۔ مسلم عہد میں جو کام انجام پایا، اس کے دو بڑے پہلو تھے — ایک تھا دنیا میں آزادی کا دور لانا اور دوسرے، علومِ فطرت کے انکشاف کا دروازہ کھولنا۔

قرآن میں کہا گیا تھا کہ: أمرهم شورى بينهم (42:38)۔ یہ آیت کسی محدود معنی میں نہیں ہے۔ اِس آیت میں دراصل ایک مطلوب عالمی انقلاب کی خبر دی گئی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو یہ مطلوب ہے کہ دنیا سے شخصی حکومت کا دور ختم ہو اور اس کے بجائے جمہوری حکومتوں کا دور آئے، تاکہ انسان کو یہ موقع ملے کہ وہ آزادی کے ساتھ سوچ سکے، تاکہ انسان کے پوٹنشیل کی انفولڈنگ ہو، تاکہ انسان کو فطرت کے رموز کی دریافت کا موقع ملے، تاکہ ربانی تہذیب کو قلم بند کرنے کا وہ دور شروع ہو جس کا ذکر قرآن میں اِن شاہانہ الفاظ میں کیا گیا ہے: وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (31:27)

جمہوریت کا دور

دورِ جمہوریت دراصل دورِ آزادی کا دوسرا نام ہے۔ اللہ کے تخلیقی نقشے کے مطابق، زمین پر آزادانہ ماحول کا باقی رہنا بے حد ضروری ہے۔ انسان سے جو رول مطلوب ہے، وہ صرف آزادی کے ماحول میں ممکن ہے۔ جمہوریت کا یہ دور مسلم عہد میں شروع ہوا۔ وہ پراسس کے روپ میں آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ 1789 میں انقلابِ فرانس کی صورت میں اس کی تکمیل ہوئی۔

جمہوریت (democracy) انسانی تاریخ کا ایک عظیم مرحلہ ہے۔ اِس دور میں پہلی بار

ایسا ہوا ہے کہ آزادی اور امن انسان کا اپنا چوائس (choice) بن گیا ہے۔ اِس سے پہلے ایسا تھا کہ کسی انسان کو آزادی اور امن صرف اُس وقت ملتا تھا، جب کہ حاکمِ وقت اس کو بطور عطیہ اُسے دے دے۔ اب یہ معاملہ کسی دینے والے کا عطیہ نہیں رہا، بلکہ وہ ہر انسان کا مطلوب حق (absolute right) بن چکا ہے۔ کسی بھی شخص یا گروہ کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اِس حق کو آپ سے چھین لے۔

موجودہ زمانے میں بہت سے لوگ ملیں گے جو یہ شکایت کریں گے کہ اُن کو آزادی اور امن کے ماحول میں کام کرنے کے مواقع حاصل نہیں۔ ایسے لوگ بلاشبہہ زندگی کے راز سے بے خبر ہیں۔ موجودہ زمانے میں آزادی اور امن کی جو نعمت ملی ہے، اس کو استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اِس حکمت کو جانے کہ اس کو اپنے عمل کے لیے ایسا نشانہ مقرر کرنا ہے جو دوسرے سے ٹکراؤ کیے بغیر جاری کیا جا سکے۔ اگر آپ اپنے لیے ایسا نشانہ مقرر کریں جو دوسروں کی زندگی میں خلل ڈالنے والا ہو تو آپ کے حصے میں صرف شکایت اور پروٹسٹ آئے گا، لیکن اگر آپ اپنے عمل کے لیے ایسا نشانہ مقرر کریں جو کسی حال میں دوسروں کے لیے مسئلہ (problem) نہ بنے، تو آپ ساری عمر کام کرتے رہیں گے اور کبھی آپ کو دوسروں کے خلاف شکایت نہ ہوگی۔

یہی وہ راز ہے جو قرآن کی اِس آیت میں بتایا گیا ہے: الصلح خیر (4:128)۔ اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم ایسا نشانہ مقرر کرو جس میں دوسروں سے ٹکراؤ نہ پیش آتا ہو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمھارے لیے اِس دنیا میں خیر ہی خیر ہوگا۔ تمھارے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ تم دوسروں کے خلاف شکایت سے محفوظ رہتے ہوئے اپنے کام کو مکمل کرو۔ جو آدمی شکایت کی زبان بولے، وہ صرف یہ اعلان کر رہا ہے کہ اس نے اپنے لیے غلط نشانے کا انتخاب کیا تھا۔ یہ معاملہ خود اپنے نشانے کی غلطی کا معاملہ ہے، نہ کہ دوسروں کے ظلم یا دشمنی کا معاملہ۔

مسلم دورِ سلطنت میں دوسرا جو بڑا کام ہوا، وہ یہ کہ فطرت کو پرستش کے موضوع سے ہٹا کر تحقیق کا موضوع بنا دیا گیا۔ یہ عمل بھی تدریجی طور پر جاری ہوا اور آخر کار اُس علمی انقلاب تک پہنچا جس کو سائنسی انقلاب (scientific revolution) کہا جاتا ہے۔ اِس سائنسی انقلاب نے اُس پیشین گوئی کو

واقعہ بنادیا جس کی خبر قرآن میں اِن الفاظ میں دی گئی تھی: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ موجودہ زمانے میں جمہوری انقلاب اور سائنسی انقلاب کی صورت میں جو انقلابات ظہور میں آئے، وہ پوری طرح اسلام کے حق میں تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید دور (modern age) پورے معنوں میں ایک موافقِ اسلام دور ہے۔ اِس دور کا آغاز مسلمانوں کے سیاسی عروج کے زمانے میں ہوا، لیکن اِس دور کی تکمیل تاریخ کے اُس تیسرے دور میں ہوئی جس کو اوپر کی تقسیم میں ''سیکولر لوگوں کی خلافت'' کہا گیا ہے۔

امتِ مسلمہ کا نیا رول

قرآن کی سورہ آل عمران میں فطرت کے ایک اصول کو اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (3:26) یعنی تم کہو، اے اللہ، سلطنت کے مالک، تو جس کو چاہے، سلطنت دے اور جس سے چاہے، سلطنت چھین لے۔ اور تو جس کو چاہے، عزت دے اور جس کو چاہے، ذلیل کرے۔ تیرے ہاتھ میں ہے سب خوبی۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ خلافتِ ارضی کسی گروہ کی اجارہ داری (monopoly) نہیں۔ یہ ایک رول ہے جس کو اللہ اپنے منصوبے کے تحت کبھی ایک گروہ کو دیتا ہے، کبھی دوسرے گروہ کو۔ جب کسی گروہ کو خلافتِ ارضی ملے تو اس کو یہ دریافت کرنا چاہیے کہ اس کو یہ رول کس مقصد کے لیے دیا گیا ہے۔ اور جب اُس سے خلافتِ ارضی چھین لی جائے تو اُس وقت بھی اس کو جاننا چاہئے کہ یہ منصب کیوں اُس سے چھینا گیا۔ اِس حقیقت سے بے خبری کا یقینی نقصان یہ ہے کہ متعلقہ گروہ کو اللہ کی نصرت نہ ملے اور نتیجۃً وہ ہر اعتبار سے ناکام ہو کر رہ جائے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں مسلم ایمپائر قائم ہوا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب خلافتِ ارضی کا رول مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔ وہ رول یہ تھا کہ دنیا سے قدیم طرز کی بادشاہت (kingship) کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ کام مسلمانوں کے ذریعے عالمی پیمانے پر انجام پایا۔ صدیوں تک مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ وہ

جس ملک میں داخل ہوئے، وہاں انھوں نے قدیم طرز کی سیاسی آمریت کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن پھر وہ وقت آیا کہ مسلم سلطنتوں کا زوال شروع ہوا۔ انیسویں صدی کا آغاز مسلمانوں کے سیاسی غلبے کے خاتمے کا اعلان تھا۔ پوری دنیا میں ایک کے بعد ایک، مسلم سلطنتیں مغربی اقوام سے مغلوب ہو کر رہ گئیں۔ اِس کے بعد مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر یہ کوشش کی کہ وہ اپنی سیاسی عظمت کو دوبارہ حاصل کر سکیں، لیکن دو سو سالہ جدوجہد کے باوجود وہ اپنی ان کوششوں میں مکمل طور پر ناکام رہے۔

یہ کوئی سادہ واقعہ نہ تھا۔ یہ عملاً مسلمانوں کے رول میں تبدیلی کا اعلان تھا۔ اٹھارھویں صدی میں مسلمانوں کا سیاسی رول ختم ہو چکا تھا۔ اب اُن سے جو رول مطلوب تھا، وہ دوسرا رول تھا، اور وہ تھا — جدید امکانات کو استعمال کر کے عالمی سطح پر دینِ خداوندی کی اشاعت۔ دورِ جدید میں اللہ نے اپنی مصلحت کے تحت اہل مغرب کو یہ موقع دیا کہ وہ نئے وسائل کی دریافت کر کے اُن کو عام کریں۔ اہلِ مغرب کے ذریعے دنیا میں پہلی بار وہ چیزیں آئیں جو عالمی دعوت کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً مذہبی آزادی، کھلاپن، عالمی آمدورفت، پرنٹنگ پریس، عالمی کمیونکیشن، وغیرہ۔

یہ نئے حالات اِس بات کا اشارہ تھے کہ اب امتِ مسلمہ کا رول بدل گیا ہے۔ اب اُن کا رول یہ ہے کہ نئے مواقع کو استعمال کرتے ہوئے وہ اسلام کے فطری پیغام کو تمام قوموں اور تمام انسانوں تک پہنچا دیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ تقریباً پوری امت اِس عظیم حقیقت سے بے خبر رہی۔ انھوں نے رول کی اِس تبدیلی کو نہیں سمجھا۔ وہ اپنی گزری ہوئی سیاسی عظمت کی واپسی کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے اپنے مفروضہ دشمنوں سے لڑائی کرتے رہے۔ یہ عمل خدائی منصوبے کے خلاف تھا، اِس لیے اس کو خدا کی مدد حاصل نہیں ہوئی اور وہ مکمل طور پر ناکام ہو گیا۔ امتِ مسلمہ کے اِس نئے رول کو حدیث میں بطور پیشین گوئی اِن الفاظ میں بیان کر دیا گیا تھا:

لا يبقى على ظهر الأرض بيت مدر ولا وبر إلا أدخله الله كلمة الإسلام -

رول کی تبدیلی

انیسویں اور بیسویں صدی نے امت مسلمہ کو ایک نئے دور میں پہنچا دیا۔ نئے دور کے حالات بتا رہے تھے کہ امتِ مسلمہ کا رول اب بدل گیا ہے اور وہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے — عالمی دعوت۔

مگر نئے دور کے مسلم رہنما ناقابلِ فہم طور پر جدید دور سے بے خبر رہے۔ چناں چہ وہ امتِ مسلمہ کو اس کا نیا رول بھی نہ بتا سکے۔ نئے دور میں امتِ مسلمہ کی بہت بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ امت دورِ جدید میں اپنے اِس نئے رول سے بے خبر ہوگئی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری امت کا کیس اُس قوم کا کیس بن گیا جو اپنی سمتِ سفر (direction) سے بے خبر ہوگئی ہو۔

یہ زمانہ وہ تھا جب کہ امت اپنے دورِ زوال میں پہنچ چکی تھی۔ اِس دور میں امت کے تقریباً تمام رہنماؤں نے ایک ہی کام کیا، وہ ایسی باتیں لکھنے اور بولنے لگے جو امت کی زوال یافتہ نفسیات سے مطابقت رکھتی تھی، لیکن وہ یقینی طور پر خدا کے تخلیقی نقشے کے خلاف تھی۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی امتِ مسلمہ کے لیے زبردست سرگرمیوں کی صدی ہے، مگر یہ سرگرمیاں خود ساختہ قومی رول کے لیے تھیں، نہ کہ خدا کے مطلوب رول کے لیے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت اپنی سرگرمیوں میں خدا کی نصرت سے محروم ہوگئی۔ اِس دور میں اُس نے جو نشانے مقرر کیے، وہ سب قومی نشانے تھے جو زوال یافتہ نفسیات کے تحت بنے تھے۔ اِس بنا پر اِن نشانوں کے لیے یہی مقدر تھا کہ وہ پورے نہ ہوں۔

اِس قومی ناکامی کے بعد دوسری زیادہ بڑی ناکامی سامنے آئی، وہ یہ کہ پوری امت منفی نفسیات میں مبتلا ہوگئی — مایوسی، منفی سوچ، شکایت اور پروٹسٹ کا ذہن، مشتعل مزاجی، تشدد، ساری دنیا کو اپنا دشمن سمجھ لینا، ہر طرف سازش دکھائی دینا، گن کلچر اور بم کلچر اور آخر میں احساس ناکامی کی بدترین صورت، یعنی خودکش بم باری۔ اکیسویں صدی میں امتِ مسلمہ کی یہ ایک عمومی تصویر ہے۔ اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ پوری قوم تشدد کی نفسیات میں مبتلا ہوگئی، اِس فرق کے ساتھ کہ کچھ لوگوں کا کیس فعال تشدد (active violence) کا کیس ہے اور کچھ لوگوں کا کیس منفعل تشدد (passive violence) کا کیس ہے۔

یہ ایک عمومی بربادی کی حالت ہے۔ امت کو اس بربادی سے نکالنے کی صورت صرف یہ ہے کہ اس کے اندر سے منفی سوچ کو مکمل طور پر ختم کیا جائے اور اس کے اندر مکمل طور پر مثبت سوچ (positive thinking) لائی جائے، اس کو تیار کیا جائے کہ وہ دوبارہ اپنے اصل مشن پر کھڑی ہوجائے، یعنی دعوت الی اللہ کا مشن۔ اِس معاملے میں کوئی بھی عذر (excuse) قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

دعوہ ایمپائر

قدیم زمانے میں مسلمانوں کا سیاسی ایمپائر قائم تھا۔ آج بھی تمام مسلمان اِسی ماضی کی واپسی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ مگر یہ ایک قسم کی خلافِ زمانہ بات (anachronism) ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ تاریخ کے بارے میں اللہ کے منصوبے کو سمجھیں اور اس کے مطابق، اپنے عمل کا نقشہ بنائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب سیاسی ایمپائر بنانے کا زمانہ ختم ہوگیا، لیکن امتِ مسلمہ کے لیے ایک اور زیادہ بڑا موقع پوری طرح کھل چکا ہے اور وہ ہے پُرامن اسلامی دعوت کا عالمی ایمپائر قائم کرنا۔ اِس قسم کے دعوہ ایمپائر کا امکان ایک حدیثِ رسول میں پیشگی طور پر بتا دیا گیا ہے۔ مکی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا: کلمة واحدة تعطونها، تملكون بها العرب، و تدين لكم بها العجم (البداية والنهاية: 3/123) یعنی میں تم کو ایک ایسے کلمہ کی طرف بلاتا ہوں جس کے ذریعے تم عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم تمھاری اطاعت کریں گے۔

قدیم زمانے میں سیاسی ایمپائر بنانے کے لیے بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں، لوگوں کو جانوں کی قربانیاں دینی پڑیں، مگر آج اسلام کا دعوہ ایمپائر یا آئڈیا لاجکل ایمپائر بنانے کے لیے کسی لڑائی کی ضرورت نہیں۔ نئے حالات میں پوری طرح ممکن ہوگیا ہے کہ اسلام کا پرامن دعوہ ایمپائر بنایا جائے اور دنیا اس کے خلاف مزاحمت کرنے کے بجائے اس کے ساتھ اپنا بھرپور تعاون پیش کرے۔

دورِ مسائل کا خاتمہ

قرآن کی سورہ البقرہ کے آخر میں اُس وقت کے اہلِ ایمان کی زبان سے ایک دعا نقل ہوئی ہے۔اِس دعا کا ایک حصہ یہ ہے: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا (2:286) یعنی اے ہمارے رب، ہم پر بوجھ نہ ڈال جیسا بوجھ تونے ڈالا تھا ہم سے اگلوں پر۔

اِس دعا میں 'اِصر' کا لفظ آیا ہے۔اصر کا مطلب بوجھ (burden) ہے۔اِس بوجھ سے مراد کوئی محدود بوجھ نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد وہ ناموافق عالمی حالات ہیں جو ہزاروں برس سے چلے آرہے تھے۔اِسی اصر کو قرآن میں دوسرے مقام پر 'فتنہ' کہا گیا ہے اور حکم ہوا ہے: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (8:39)۔قرآن کی مذکورہ آیت میں 'اِصر' سے مراد قدیم شرائع نہیں، بلکہ وہ قدیم حالات ہیں جو اہلِ توحید کے لیے رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

اصل یہ ہے کہ قدیم زمانے میں جس کلچر کا عمومی طور پر دبدبہ تھا، وہ شرک اور شخصی بادشاہت کے تحت بنا تھا۔اِس کلچر نے مذہبی آزادی کا خاتمہ کر دیا تھا۔اسی بنا پر پچھلے زمانے میں اہلِ ایمان کو ستایا گیا۔اِسی بنا پر ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھیوں کو ستایا گیا اور ان کے خلاف جنگیں چھیڑی گئیں۔اللہ کو یہ مطلوب تھا کہ خدائی دین کے خلاف اِن ناموافق اسباب کا خاتمہ ہو اور عالمی سطح پر ایسے حالات پیدا ہوں جب کہ ایک انسان پوری آزادی کے ساتھ اللہ کے دین کی پیروی کرسکے۔

اِس حقیقت کو قرآن کی ایک اور آیت میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (28:48)۔ قرآن کی اِس طرح کی آیتوں سے مراد ایک عظیم انقلاب ہے۔مگر اِس سے مراد کوئی سیاسی یا حکومتی انقلاب نہیں۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں سے لڑ کر ''اسلامی حکومت'' قائم کرو۔اِس سے مراد مکمل طور پر ایک غیر سیاسی انقلاب ہے، یعنی ایک ایسا انقلاب جس کے بعد تمام مواقع (opportunities) اہلِ ایمان کے لیے کھل جائے۔اہلِ ایمان کے لیے یہ ممکن ہو جائے کہ وہ

کسی رکاوٹ کے بغیر دینِ توحید کی پیروی کریں اور کسی رکاوٹ کے بغیر دعوت الی اللہ کا کام کرسکیں اِس انقلاب سے مراد بہ اعتبار مواقع (in terms of opportunities) انقلاب ہے، نہ کہ بہ اعتبار سیاسی اقتدار (in terms of political power) انقلاب۔

اسلامی حکومت کا تصور

اسلامی حکومت یا خدائی حکومت کا تصور قرآن میں سرتاسر اجنبی (alien) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت انسان کی ہوتی ہے، نہ کہ اسلام کی۔ اِس لیے قرآن میں جہاں حکومت کا ذکر ہے، وہاں اُس کو انسان سے منسوب کیا گیا ہے۔ مثلاً: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ ((22:41)۔ اور وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (24:55)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، یہ اللہ کا مطلوب ہی نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ اہلِ ایمان کی حکومت قائم رہے یا لوگوں سے لڑ کر حکومت پر قبضہ کیا جائے، تاکہ دنیا میں نظامِ حکومت قائم کیا جاسکے۔ اِس قسم کا سیاسی نشانہ اللہ نے کبھی نہیں دیا۔ اللہ کو جو چیز مطلوب ہے، وہ صرف یہ کہ عمل کے مواقع ہمیشہ کھلے رہیں۔ ہر شخص کے لیے یہ ممکن ہو کہ وہ آزادانہ طور پر دین کے انفرادی تقاضوں کو پورا کرسکے۔ یہی اللہ کا اصل مطلوب ہے اور قرآن میں جو انقلاب برپا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اُس سے مراد یہی غیر سیاسی انقلاب ہے۔

اقامتِ نظام، اقامتِ مواقع

اللہ کے تخلیقی پلان کے مطابق، دنیا میں جو چیز مطلوب ہے، وہ اقامتِ نظام نہیں، بلکہ اقامتِ مواقع ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ ایک مقرر قسم کا سوشیو پولٹکل (socio-politicial) نظام ہے اور اہلِ ایمان کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اِس نظام کو اُس کے تمام اطراف وجوانب کے ساتھ زمین پر قائم کریں۔ دین کا یہ مبنی بر نظام تصور (system-based concept) سرتاسر ایک مبتدعانہ تصور ہے۔ اِس قسم کا تصورِ دین صرف کچھ لوگوں کے خود اپنے ذہن کی پیداوار ہے، خدا اور رسول کے دین سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ اِس قسم کا تصورِ دین وہی چیز ہے جس کو مضاہات (9:30) کہا گیا ہے۔

اللہ کے نقشۂ تخلیق کے مطابق، اصل مطلوب چیز یہ ہے کہ ہر قسم کے مواقع پوری طرح

کھلے ہوئے ہوں، ہر انسان کو مکمل آزادی ہو کہ وہ دین کے معاملے میں جس طرح چاہے اپنی قوتوں کو استعمال کرے۔ قدیم زمانے میں جارحانہ شرک، مذہبی جبر اور استبدادی حکومت (despotism) کا نظام قائم تھا۔ ہزاروں سال کی روایات کے نتیجے میں یہ ذہن لوگوں کے اوپر اِس طرح چھا گیا کہ وہ اس کے خلاف سوچ نہیں پاتے تھے۔ پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کو جو انقلاب برپا کرنے کا حکم دیا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ جدوجہد کر کے اِس دور کو ختم کرو اور وہ حالات برپا کرو جب کہ ہر ایک کو مکمل آزادی حاصل ہو جائے اور ہر ایک کے لیے تمام مواقع یکساں طور پر کھل جائیں۔

پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کے ذریعے ساتویں صدی میں جو انقلاب آیا، اُس کی اصل حقیقت یہی تھی۔ وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، حکومت یا خلافت قائم کرنا نہ تھا، بلکہ یہ تھا کہ ہدایت کے تمام مواقع تمام انسانوں کے لیے کھل جائیں، دینِ خداوندی کے معاملے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ اسلام کے دورِ اول میں پیش آنے والا یہی وہ انقلابی واقعہ ہے جس کا ذکر فرانسیسی مورخ ہنری پرین نے اِن الفاظ میں کیا ہے — اسلام نے زمین کے نقشے کو بدل دیا۔ روایتی دورِ تاریخ کا خاتمہ کردیا گیا۔

اِس معاملے میں اللہ تعالیٰ کو جو انقلاب مطلوب تھا، وہ ایک نسل یا دو نسل میں انجام نہیں پا سکتا تھا، اِس لیے اِس انقلاب کو تاریخ میں ایک پراسس کے روپ میں جاری کیا گیا۔ مزید یہ کہ اِس عمل میں صرف مسلمان نہیں، بلکہ سیکولر قومیں بھی شریک ہوئیں۔ اِس طرح یہ تاریخی عمل چلتا رہا۔ آخر کار انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں مغرب میں اس کی تکمیل ہوئی۔ موجودہ مغربی تہذیب اِسی عمل کا نقطۂ انتہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے تاریخ میں پہلی بار ایسا کیا ہے کہ جو دنیا مسائل سے بھری ہوئی تھی، وہ ہر اعتبار سے کھلے ہوئے مواقع میں تبدیل ہو گئی۔

دین کا اصل مطلوب یہ نہیں ہے کہ موجودہ دنیا میں معیاری اجتماعی نظام بنایا جائے۔ معیاری معاشرہ یا معیاری اجتماعی نظام کی جگہ جنت ہے، نہ کہ موجودہ زمین۔ اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، موجودہ دنیا میں جو چیز مطلوب ہے، وہ انفرادی سطح پر شخصیت کی تعمیر ہے، یعنی ایسے افراد کا وجود میں آنا جو اپنے اعلیٰ اوصاف کے اعتبار سے، جنت میں داخلے کے مستحق قرار پائیں۔

جنت کی دنیا

جنت کیا ہے، قرآن کے مطابق، جنت وہ وسیع دنیا ہے جس کا کیمپس پوری کائنات کے برابر ہوگا۔ جنت وہ معیاری جگہ ہے جہاں تمام محدودیتیں (limitations) اور ناموافق اسباب (disadvantages) ختم ہوجائیں گے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان اِس قابل ہوگا کہ وہ زمان ومکاں سے ماورا چیزوں کا احاطہ کرسکے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان براہِ راست طور پر اللہ رب العالمین کو دیکھے گا اوراس سے کلام کرے گا۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کی نگاہ پوری انسانی تاریخ کا احاطہ کرسکے گی۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں پوری تاریخ کے تمام منتخب بندے یکجا کیے جائیں گے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ اعلیٰ معیاری مناظر کا مشاہدہ کرے، وہ اعلیٰ معیاری نغموں کو سنے، وہ اعلیٰ معیاری ذائقوں کا ٹیسٹ لے سکے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کا لامحدود دماغ انفولڈ (unfold) ہوگا۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں آلاء اللہ اورکلمات اللہ کو قلم بند کیا جائے گا۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کو کامل معنوں میں فل فل مینٹ لے گا۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کو اللہ کی قربت حاصل ہوگی۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں ہر قسم کی اعلیٰ سرگرمیاں موجود ہوں گی، لیکن یہ تمام سرگرمیاں معیاری معنوں میں پرمسرت سرگرمیاں (joyful activities) ہوں گی، وغیرہ۔

جنتی شخصیت

اِس طرح کی معیاری دنیا (perfect world) میں قیام کے لیے اعلیٰ ترین سطح کے تیار افراد درکار ہیں۔ صرف اعلیٰ سطح کی تیار شدہ شخصیت ہی اِس قابل ہے کہ اس کو جنت جیسی دنیا میں جگہ ملے۔ موجودہ دنیا اِسی قسم کی اعلیٰ شخصیتوں کے بننے کا مقام ہے۔ اِس قسم کی اعلیٰ شخصیت کسی کو پیدائشی طور پر نہیں ملتی۔ یہ ہر انسان کا اپنا کام ہے کہ وہ اِس معاملے میں اپنے آپ کو باشعور بنائے اور پھر پورے اہتمام کے ساتھ وہ اپنے اندر اِس قسم کے انسان کی تشکیل کرے۔

مذکورہ قسم کی جنتی شخصیت بلاشبہہ صرف ایک صاحبِ ایمان کے اندر بنتی ہے، مگر صاحبِ ایمان سے مراد وہ شخص ہے جس کو معرفت کے درجے میں ایمان حاصل ہو، وہ اپنے اندر اتنا زیادہ تخلیقی فکر

پیدا کرے کہ وہ خوددریافت کردہ معرفت (self-discovered realization) پر کھڑا ہوسکے۔ اس کے اندر وہ آفاقی ذہن پایا جائے جو ساری کائنات کو اپنے ربانی رزق کا دسترخوان بنا سکے، جس کی مثبت سوچ (positive thinking) اتنی بڑی ہوئی ہو کہ وہ منفی آئٹم (negative item) کو بھی مثبت آئٹم (positive item) میں تبدیل کرسکے۔ اس کا عبادتی شعور اتنا ترقی یافتہ ہو کہ وہ اِس طرح اللہ کی عبادت کرے، جیسے کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے۔

انسان کی تخلیق کے بارے میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (67:2)۔ قرآن کی اِس آیت کے مطابق، موجودہ دنیا میں انسان کو اِس لیے بسایا گیا ہے کہ یہاں احسن العمل افراد کا انتخاب کیا جاسکے۔ یہ عمل پوری انسانی تاریخ میں جاری ہے۔ خدائی نظام کے تحت اِس دنیا میں ہر فرد کا مکمل ریکارڈ تیار کیا جارہا ہے۔ اِس مقصد کے لیے انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے۔ کیوں کہ آزادی کے ماحول ہی میں یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کون شخص احسن العمل تھا اور کون شخص احسن العمل نہ تھا۔ قدیم زمانے میں مذہبی جبر کا جو نظام قائم تھا، وہ اِس میں رکاوٹ تھا کہ کوئی فرد آزادانہ طور پر اپنی شخصیت کی مثبت تعمیر کرے اور اپنے آپ کو احسن العمل بنائے۔ یہ نظام، اللہ کے تخلیقی منصوبے کے خلاف تھا۔ اِس لیے قرآن میں اس کو فتنہ کہا گیا ہے اور اہلِ ایمان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اللہ کی خصوصی مدد کے ذریعے اِس ناموافق نظام کو توڑ دیں، تاکہ ہر انسان کو یہ موقع مل جائے کہ وہ اگر چاہے تو اپنے آپ کو احسن العمل کی حیثیت سے تیار کرے۔

اسلام کا انقلابی رول

مورخ ابنِ کثیر نے اپنی مشہور کتاب البداية والنهاية میں ابنِ اسحاق کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے۔ اِس روایت میں ایک واقعے کا ذکر ہے جو نبوت کے دسویں سال مکہ میں پیش آیا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب اپنی آخر عمر میں جب بیمار ہوئے اور اُن کا مرض بڑھ گیا تو قبیلہ قریش کے لوگوں نے آپس میں کہا کہ حمزہ اور عمر نے اسلام قبول کرلیا اور محمد کا امر (دین) پورے قبیلہ قریش میں پھیل گیا۔ آؤ ہم ابو طالب کے پاس چلیں۔ وہ ہم سے عہد لے لیں اپنے بھتیجے کے بارے میں اور بھتیجے سے عہد لے لیں ہمارے بارے میں۔ کیوں کہ خدا کی قسم، ہم اِس سے مامون نہیں ہیں کہ وہ ہمارے امر (دین) پر غالب آجائے۔ چناں چہ قریش کے سردار ابو طالب کے پاس آئے اور اُن سے بات کی۔ یہ تھے — عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابو جہل بن ہشام، امیہ بن خلف، ابو سفیان بن حرب، وغیرہ۔ انھوں نے کہا کہ اے ابو طالب، آپ کا ہمارے نزدیک جو درجہ ہے، وہ آپ کو معلوم ہے۔ آپ پر جو وقت آچکا ہے، وہ آپ خود دیکھ رہے ہیں۔ آپ کے بارے میں ہمیں تشویش ہے۔ ہمارے اور آپ کے بھتیجے کے درمیان جو معاملہ ہے، اُس سے آپ باخبر ہیں۔ آپ ان کو بلایئے۔ اُن سے ہمارے بارے میں عہد لے لیجئے اور ہم سے ان کے بارے میں عہد لے لیجئے، تاکہ وہ ہم سے باز رہیں اور ہم اُن سے باز رہیں، تاکہ وہ ہمارے دین سے تعرض نہ کریں اور ہم ان کے دین سے تعرض نہ کریں۔ پھر ابو طالب نے رسول اللہ کو بلایا اور آپ ان کے پاس آئے۔ ابو طالب نے آپ سے کہا کہ اے میرے بھتیجے، یہ تمھاری قوم کے بڑے لوگ ہیں۔ یہ تمھارے پاس جمع ہوئے ہیں، تاکہ تمھارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہوجائے۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''یا عم، كلمة واحدة تعطونها تملكون بها العرب وتدين لكم بها العجم (البداية والنهاية 3/123) یعنی اے میرے چچا، میں اُن سے صرف ایک کلمہ چاہتا ہوں جس کو اگر وہ دے دیں تو وہ عرب کے مالک بن جائیں گے اور عجم تمھارے تابع ہوجائیں گے۔

اس کے بعد آپ نے بتایا کہ وہ کلمہ یہ ہے کہ تم کہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور تم چھوڑ دو اُن چیزوں کو جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو(تقولون لا إله إلا الله و تخلعون ماتعبدون من دونه) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس قول میں ایک تاریخی بات کو مخاطبین کی مانوس زبان میں کہا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مشن کوئی محدود مشن نہیں ہے۔ یہ خالق کی ایک عظیم منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک دور کو ختم کرکے دوسرے دور کو لانے کا منصوبہ ہے۔ اگر تم اُس کا ساتھ دو تو یہ تمھارے لیے سرفرازی کا باعث ہوگا۔ اِس مشن کا ساتھ دے کر تم ایک نئے دورِ تاریخ کے نقیب (harbinger) بن سکتے ہو۔

توحید کے مشن کے ذریعے بعد کی تاریخ میں یہ انقلابی دور آیا۔ اُس نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلم علما اور مورخین نے اِس واقعے کو صرف امتِ مسلمہ کے ایک سیاسی فخر (political glory) کے طور پر لیا۔ وہ اِس انقلاب کے وسیع تر پہلوؤں کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ لیکن سیکولر مورخین نے اِس پہلو کو دریافت کیا اور کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا۔ انھیں میں سے ایک فرانس کا مورخ ہنری پرین (وفات: 1935) ہے۔ ہنری پرین نے اِس حقیقت کا اظہار اِن الفاظ میں کیا ہے — اسلام نے زمین کے نقشے کو بدل دیا۔ تاریخ کا روایتی ڈھانچہ توڑ دیا گیا:

> Islam changed the face of the globe. The traditional order of history was overthrown.

اِس تاریخی واقعے کی اصل اہمیت اِس اعتبار سے نہیں تھی کہ اس کے نتیجے میں ایک مسلم ایمپائر وجود میں آئے۔ اِس واقعے کی اصل اہمیت یہ تھی کہ اُس نے انسانی تاریخ کے سفر کو صحیح رخ کی طرف موڑ دیا، اس نے انسانی تاریخ کو خدائی منصوبے کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا۔

اللہ تعالی نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو زمین پر بسایا اور اس کو ہر طرح کی آزادی دی۔ اِس تخلیق کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انسان موجودہ دنیا میں آئڈیل حکومت بنائے یا آئڈیل سماج قائم کرے۔ انسان کی آزادی کی بنا پر دنیا میں وہی ہونا تھا جس کو فرشتوں نے فساد (2:30) سے تعبیر کیا تھا۔ تخلیق کے اعتبار سے، فساد کا لفظ کوئی منفی لفظ نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں

مختلف قسم کے ناموافق حالات پیدا ہوں، تاکہ انسان کے لیے مسلسل طور پر چیلنج کی صورت حال باقی رہے۔ چیلنج کی یہ صورتِ حال عین مقصودِ تخلیق ہے، کیوں کہ اِسی صورتِ حال کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ افراد کے لیے امتحان کا ماحول جاری رہے اور مطلوب افراد کا انتخاب ممکن ہو سکے۔

قرآن کی سورہ الانعام میں انسان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: **وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی** (6:94)۔ قرآن کے اِن الفاظ کا لفظی ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی نے اِس طرح کیا ہے — اور آئے تم ہمارے پاس ایک ایک۔ شاہ عبدالقادر دہلوی کا یہ ترجمہ قرآن کی مذکورہ آیت کا نہایت صحیح ترجمہ ہے۔ 'فرادی' کا لفظ 'فرد' کی جمع ہے، یعنی افراد۔ قرآن کی یہ آیت خدا کے تخلیقی منصوبے کے ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کو زمین پر بسایا۔ اِس آبادکاری کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انسان دنیا میں بہتر سماجی نظام بنائے۔ بہتر سماجی نظام کی جگہ صرف جنت ہے۔

خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، موجودہ دنیا اقامتِ نظام کے لیے نہیں ہے، بلکہ انتخابِ افراد کے لیے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی آزادی کی بنا پر اِس دنیا میں کسی معیاری نظام کا بننا ممکن ہی نہیں۔ پوری تاریخ میں تقریباً تمام ذہن، مسلم اور غیر مسلم دونوں، ایک ہی مشترک غلطی میں مبتلا رہے ہیں۔ انھوں نے بہتر سماجی نظام قائم کرنے کو اپنی جدوجہد کا نشانہ بنایا۔ مگر بلا استثنا سب کے سب اِس مقصد میں ناکام رہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اِس قسم کا نشانہ عملی طور پر ممکن ہی نہ تھا، کیوں کہ وہ منصوبہ خداوندی کے خلاف تھا۔

خالق نے اپنے منصوبے کے مطابق، دنیا کو اِس طرح بنایا ہے کہ وہ ہمیشہ 'دار الکبد' بنی رہے۔ اِس طرح یہ ممکن ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر قسم کے حالات پیدا ہوں۔ لوگوں کو بار بار نقصان (2:155) کا تجربہ ہو۔ طرح طرح کے حادثات پیش آئیں۔ انسان اور شیطان کی طرف سے آزادی کے غلط استعمال کی بنا پر لوگوں کے درمیان کشمکش جاری رہے۔ یہ ناموافق حالات عین مطلوب ہیں۔ کیوں کہ اِسی صورتِ حال کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہر انسان کے بارے میں یہ دیکھا جائے کہ مختلف حالات کے درمیان اس نے کیسا رسپانس دیا۔ اُس نے حالات کو اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے

استعمال کیا یا منفی ردعمل میں اپنا وقت ضائع کر دیا۔

امتحانی صورتِ حال کے اِس نتیجے کا تعلق افراد سے ہے۔ ہر فرد الگ الگ حالتِ امتحان میں ہے۔ ہر فرد الگ الگ اپنا ریکارڈ تیار کر رہا ہے۔ ہر فرد الگ الگ یہ بتا رہا ہے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہے یا نہیں۔

اسلامی انقلاب کا مقصد

رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے جو انقلاب آیا اور آخر کار اس کے نتیجے میں دنیا کا نقشہ بدل گیا، وہ اِسی لیے تھا کہ مذکورہ قسم کی حالت دنیا میں غیر منقطع طور پر جاری رہے۔ اسلامی انقلاب کا مقصد نہ کوئی ایمپائر قائم کرنا تھا اور نہ کوئی بہتر سیاسی یا سماجی نظام۔ اِس انقلاب کا واحد مقصد یہ تھا کہ فرد کے لیے اپنی شخصیت کی تعمیر کے مواقع لامحدود طور پر کھل جائیں۔ جو فرد یہ چاہے کہ اس کو حقیقتِ اعلیٰ کو دریافت کرنا ہے، اُس کو اپنی شخصیت کو جنتی شخصیت کے طور پر ڈیولپ کرنا ہے، اِسی کے ساتھ اُس کو دعوت الی الخیر (3:104) کے مشن کو اپنی زندگی کا مشن بنانا ہے، جو فرد یا افراد ایسا چاہیں، اُن کے لیے ہر قسم کے مواقع پوری طرح کھلے رہیں۔

اسلامی انقلاب کا مقصد اصلاً یہی تھا۔ اسلامی انقلاب کا مقصد یہ تھا کہ زمین پر عالمی مواقع کی ایک دنیا (world of universal opportunities) وجود میں آئے۔ اِس قسم کی ایک دنیا صرف لمبے عمل کے ذریعے بن سکتی تھی۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد تاریخ میں جو پراسس جاری ہوا تھا، وہ تقریباً ہزار سال تک اپنا کام کرتا رہا، یہاں تک کہ بیسویں صدی میں وہ اپنی آخری تکمیل تک پہنچ گیا۔

عجیب بات ہے کہ اسلامی انقلاب کی اِس نوعیت کو نہ مسلم مفکرین نے سمجھا اور نہ غیر مسلم مفکرین نے۔ دونوں کے لیے اس کا مشترک سبب یہ تھا کہ وہ تاریخ کا مطالعہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کی روشنی میں نہ کر سکے۔ وہ خود اپنے خود ساختہ ذہن کے تحت تاریخ کا مطالعہ کرتے رہے۔ اِس بنا پر دونوں گروہوں کا حال یہ ہوا کہ وہ اُس خدائی حکمت (divine wisdom) سے بے خبر رہے جو انسانی تاریخ کے

درمیان مسلسل طور پر اور موثر طور پر جاری رہی۔

دورِ آزادی

اسلام کا ظہور تاریخ میں ایک انقلاب کا ظہور تھا۔ رسول اور اصحابِ رسول کی کوششوں کے ذریعے تاریخ انسانی میں پہلی بار آزادی کا دور آیا۔ اِس سے پہلے ہزاروں سال سے دنیا میں شخصی سلطنت کا مستبدانہ نظام (despotism) قائم تھا۔ اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہوچکی تھیں کہ بظاہر اُن کو ختم کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ رسول اور اصحاب رسول کی قربانیوں سے تاریخ میں ایک ایسا طاقت ور پراسس جاری ہوا جس نے شخصی مطلق العنانی کے نظامِ حکومت کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ قرآن میں اِس انقلابی واقعے کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (24:55) یعنی ایسا لازماً ہونا ہے کہ دنیا سے دورِ خوف کا خاتمہ ہو اور دورِ امن ابدی طور پر دنیا میں آجائے۔

حضرت عمر فاروق نے ایک عظیم سلطنت کے حکمراں کی حیثیت سے اپنے عہد خلافت میں اِسی حقیقت کا اظہار کیا تھا، جب کہ انھوں نے ایک واقعے کے بعد مصر کے مسلم گورنر کو خطاب کرتے ہوئے کہا: یا عمرو، متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا (سيرة عمر بن الخطاب، علي محمد الصلاّبي: 1/306) یعنی اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا، جب کہ ان کی ماؤں نے اُن کو آزاد پیدا کیا تھا۔

یہ انقلابی عمل تاریخ میں جاری رہا، یہاں تک کہ وہ سفر کرتے ہوئے یورپ تک پہنچ گیا۔ گیارہ سو سال کے بعد فرانس کے جمہوری مفکر روسو (Rousseau) نے اپنی کتاب 'سوشل کنٹریکٹ' میں لکھا کہ — انسان آزاد پیدا ہوا تھا، لیکن میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں:

Man was born free, but I see him in chains.

اِسی انقلابی عمل (revolutionary process) کے بعد کے مرحلے میں 1789 میں فرانسیسی انقلاب (French Revolution) کا واقعہ ہوا۔ اِس انقلابی عمل کی تکمیل 1948 میں ہوئی جب کہ دنیا کی تمام قوموں کے اتفاق سے اقوامِ متحدہ (UNO) کی عالمی تنظیم وجود میں آئی۔

انسانی تاریخ میں آزادی کے دور کا آنا کوئی سادہ بات نہ تھی۔ یہ گویا کہ تاریخ میں ایک شاہ ضرب (master stroke) کا معاملہ تھا جس کے نتیجے میں اُن تمام امکانیات کی انفولڈنگ (unfolding) شروع ہوگئی جس کو خالق نے انسان کے لیے مقدر کیا تھا۔

اِس دورِ آزادی کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ اللہ کے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسانی زندگی میں آزادی کا وہ دور شروع ہوا جب کہ کھلے ماحول میں ہر عورت اور مرد کا امتحان (test) ممکن ہو سکے۔ اِسی کے نتیجے میں دنیا کی سیاست میں سیکولرازم اور جمہوریت کا زمانہ آیا جس نے تاریخ میں پہلی بار مذہبی جبر کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ اِسی کے بعد یہ ممکن ہوا کہ انسان ہر قسم کے توہمات (superstitions) سے آزاد ہو کر فطرت کا مطالعہ کرے۔ اِسی مطالعے کا نتیجہ سائنسی علوم کا ظہور تھا جس نے پہلی بار انسان کے لیے اعلیٰ معرفت (higher realization) کا دروازہ کھول دیا۔ اِسی کے نتیجے میں پرنٹنگ پریس اور جدید مواصلات کی دریافت ہوئی جس نے تاریخ میں پہلی بار عالمی دعوت کو ممکن بنا دیا، وغیرہ۔

موجودہ زمانے میں آزادی کو خیر اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ لیکن موجودہ دنیا میں آزادی کے ساتھ آزادی کے غلط استعمال (misuse of freedom) کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اِس بنا پر آزادی کی قدر وقیمت کو صرف اُس وقت سمجھا جا سکتا ہے، جب کہ لوگوں کی طرف سے آزادی کے غلط استعمال کے پہلو کو الگ کر کے اس کا مطالعہ کیا جائے۔

دورِظلم، دورِدجل

دعوت الی اللہ کا کام ہمیشہ کسی نہ کسی چیلنج کے مقابلے میں انجام دیا جاتا ہے۔ داعی کے خلاف یہ چیلنج مدعو کی طرف سے پیش آتا ہے۔ مدعو اپنے زمانے کے حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ داعی، ابدی حقیقت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں، مدعو زمانی حالات کے زیر اثر عمل کرتا ہے۔ داعی کی طاقت اس کی نظریاتی صداقت ہوتی ہے۔ اِس کے برعکس، مدعو کی طاقت وقت کا قائم شدہ نظام ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال بظاہر وقت کے ماحول میں داعی کو تنہا بنادیتی ہے۔ اِس کے برعکس، مدعو کے بارے میں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ پورا زمانہ اس کے ساتھ ہے۔

اِس اعتبار سے، دعوت کے دو بڑے دور ہیں — ایک، ماضی کا دور جب کہ داعی کو ظلم کا مقابلہ کرکے دعوت کا کام کرنا پڑا۔ اِس قدیم دور کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (85:8)۔

قرآن کی اِس آیت میں اُس گزرے ہوئے دور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب کہ توحید کا اعلان جان کی قربانی کی قیمت پر کیا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں ہر جگہ جبر کا نظام (despotism) قائم تھا۔ جبر اور شرک دونوں متحد ہو کر داعی کے مخالف بن جاتے تھے اور یہ کوشش کرتے تھے کہ طاقت کے زور پر وہ اس کو کچل دیں۔

چیلنج کا دوسرا دور وہ ہے جو سائنسی علوم کے ظہور سے پیدا ہوا۔ جب یہ دوسرا دور آیا تو اُسی کے ساتھ آزادی اور جمہوریت کا انقلاب آچکا تھا۔ اب داعی کے خالف جو چیلنج تھا، وہ ظلم اور جبر کا چیلنج نہیں تھا، بلکہ وہ انسان کے پیدا کردہ علوم کا چیلنج تھا۔ اب داعی کا کام یہ تھا کہ وہ علم کا جواب علم سے دے۔ وہ توحید کی صداقت کو علم کی طاقت کے ذریعے ثابت شدہ بنائے۔

اِس دوسرے دور کا ذکر قرآن کی اِس آیت میں کیا گیا ہے: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ قرآن کی یہ آیت ساتویں صدی کے

ربع اول میں اتری۔ اُس وقت مستقبل کے صیغے میں بتایا گیا کہ آئندہ وہ دور آئے گا جب کہ انسانی علم کی بنا پر ایسے افکار وجود میں آئیں گے جو دین توحید کو علم کی سطح پر چیلنج کریں گے۔ اُس وقت داعی کا یہ کام ہوگا کہ وہ جوابی علم کے ذریعے اس چیلنج کا مقابلہ کرے۔ وہ آفاق وانفس کی نشانیوں، بالفاظ دیگر، دلائل فطرت کے ذریعے توحید کی صداقت کو مبرہن کرے۔ اِسی واقعے کو قرآن میں تبیین حق کہا گیا ہے۔

اِس دوسرے دور میں نظریہ توحید کو چیلنج کرنے والے جو افکار پیدا ہوں گے، وہ بظاہر علمِ انسانی کی بنیاد پر پیدا ہوں گے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ علم کی غلط تعبیر (wrong interpretation) کی بنیاد پر کھڑے ہوں گے۔ دعوتِ توحید کے خلاف یہ بظاہر ایک فکری چیلنج ہوگا، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ ایک بے بنیاد (false) چیلنج ہوگا۔ وہ از اول تا آخر حقائق کی غلط تعبیر پر کھڑا ہوگا۔

دعوت کے خلاف یہی دوسرا چیلنج ہے جس کو حدیث میں ''دجال'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دجال مبالغے کا ایک صیغہ ہے۔ اس کا مطلب ہے: بڑا دھوکے باز (great deciever)۔ عربی زبان میں سونے کے ملمّع (golden polish) کو دجل کہا جاتا ہے۔ جیسے پیتل کے برتن کے اوپر سونے کا ملمّع کرکے اس کو غلط طور پر سونے کا برتن ظاہر کیا جائے۔

حدیث میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ بعد کے زمانے میں دجال کا ظہور ہوگا۔ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، بات نہیں ہے، بلکہ وہ ایک دور کی بات ہے۔ اِس پیشین گوئی سے مراد بعد کے زمانے میں آنے والا وہ دور ہے جب کہ دعوتی مشن کو ایک نئے چیلنج کا سامنا پیش آئے گا۔ اُس زمانے میں داعی کے خلاف جسمانی ظلم (physical persecution) ختم ہو چکا ہوگا۔ اس کے بجائے شدید تر قسم کا فکری چیلنج (intellectual challenge) پیش آئے گا۔ یہ فکری چیلنج دجل کی زمین پر کھڑا ہوگا، یعنی علمی حقیقتوں کی باطل تعبیر کرکے اُس سے خود ساختہ طور پر غلط مفہوم نکالنا اور اِس طرح انسان کو گمراہ (mislead) کرکے سچائی سے ہٹانے کی کوشش کرنا۔

فکری دجل کے اِس دور میں داعی کا کام یہ ہوگا کہ وہ علم کا مقابلہ علم کے ذریعے کرے۔

قدیم زمانے میں اگر داعی کو جہاد بالسیف کرنا پڑتا تھا تو اِس دوسرے دور میں داعی کو جہاد بالعلم کا طریقہ اختیار کرنا ہوگا، یعنی وہ اہلِ باطل کے علمی مغالطوں کا بے حقیقت ہونا ثابت کرے گا۔ وہ علم کی غلط تعبیر کی جگہ علم کی صحیح تعبیر پیش کرے گا۔

اِسی دعوتی عمل کو حدیث میں، دجال کے مقابلے میں 'حجیج' کے کردار سے تعبیر کیا گیا ہے (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2937) یعنی حجت کے ذریعے دجالی فتنے کا ابطال۔ دوسرے الفاظ میں، علمی چیلنج کا جواب برتر علمی دلائل سے دینا۔

عظیم ترین شہادت

دجال کا یہ دور بیسویں صدی میں اپنی پوری صورت میں ظاہر ہو چکا ہے۔ اِس دجالی چیلنج کے مقابلے میں جو دعوتی عمل کیا جائے گا اور صداقتِ خداوندی کو جس طرح اعلیٰ علمی دلائل کے ذریعے مبرہن کیا جائے گا، وہ پوری تاریخِ دعوت کا سب سے بڑا واقعہ ہوگا۔ اِسی لیے حدیث میں اس کو هذا أعظم الناس شهادة عند ربّ العالمين (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2938) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی خداوندِ عالم کے نزدیک، حق کی سب سے بڑی گواہی۔

حق کی سب سے بڑی گواہی کا مطلب حق کی سب سے افضل گواہی نہیں ہے۔ مذکورہ حدیثِ رسول میں یہ بات کمیاتی معنوں (quantitative terms) میں کہی گئی ہے، نہ کہ کیفیاتی معنوں (qualitative terms) میں۔ یہ بات اِس معنی میں نہیں ہے کہ اس کا درجہ اللہ کے یہاں زیادہ ہوگا، بلکہ اِس معنی میں ہے کہ اپنے ظاہر کے اعتبار سے، وہ شہادت کا سب سے بڑا کام ہوگا۔

اِن دو دوروں کو روایتی دور اور سائنٹفک دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ روایتی دور میں، دعوت کی حمایت میں فطری دلائل استعمال کیے جاتے تھے، لیکن سائنسی دور میں دعوت کے حق میں نئے دریافت شدہ علمی دلائل استعمال کیے جائیں گے۔ روایتی دور میں دعوت کی تائید کے لیے سادہ قسم کے ذرائع استعمال کیے جاتے تھے، لیکن سائنسی دور میں دعوت کی تائید کے لیے جدید قسم کے ذرائع (پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا) کا استعمال کیا جائے گا۔

روایتی دور میں ایسا تھا کہ داعی الگ ہوتا تھا اور مدعو الگ، لیکن سائنسی دور میں ایک انوکھا واقعہ یہ ہوگا کہ خود مدعو داعی کی طاقت بن جائے گا۔ مدعو کی پیدا کردہ تہذیب اور اس کے دریافت کردہ علوم داعی کے لیے پرامن ہتھیار کا کام کریں گے۔ خود مدعو کے ذریعے نئے نئے دعوتی مواقع کھل جائیں گے جن کو استعمال کر کے داعی کے لیے یہ ممکن ہوجائے گا کہ وہ تاریخ کی عظیم ترین شہادت دے سکے — غالباً یہی وہ واقعہ ہے جس کی طرف ایک حدیث رسول میں اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ، فاجر انسان کے ذریعے بھی اِس دین کی تائید کرے گا (صحیح البخاري: رقم الحدیث: 3062)

قدیم لادینیت، جدید لادینیت

قدیم زمانے کی لادینیت ظلم پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کو تاریخ مذاہب میں مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا ہے۔ یہ دور اُس وقت ختم ہوگیا جب دنیا سے بادشاہت (kingship) کا دور ختم ہوا اور دنیا میں مسلّمہ طور پر مذہبی آزادی (religious freedom) کا دور آ گیا۔ اِس دور کا آغاز اسلام کے ذریعے ہوا، مگر اس کی تکمیل نشاۃِ ثانیہ کے بعد یورپ میں ہوئی۔

دورِ جدید کی لادینیت اپنے دعوے کے مطابق، علم (سائنس) پر کھڑی ہوئی ہے۔ اِس دوسرے دور کی لادینیت جہاد بالسیف کے ذریعے ختم نہیں ہوسکتی، اس کا خاتمہ صرف جہاد بالعلم کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ تاہم یہاں علم سے مراد حقیقی علم نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد علم کی توجیہہ وتعبیر (interpretation) ہے۔ یہ توجیہہ تمام تر مغالطے پر قائم ہے۔ ذیل میں اس کی کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

1۔ اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ برٹش سائنس داں سر آئزاک نیوٹن (وفات: 1727) نے مادی دنیا کا مطالعہ کیا۔ اِس مطالعے میں اس نے پایا کہ مادّی دنیا کے اندر سبب اور نتیجہ (cause and effect) کا اصول پایا جاتا ہے۔ ہر مادی واقعے کے پیچھے ایک مادی سبب ہوتا ہے۔ اِس اصول کو اصولِ تعلیل (principle of causation) کہا جاتا ہے۔ نیوٹین نے جو بات

کہی تھی، اس کا تعلق مذہب یا عقیدہ سے نہیں تھا، اس نے یہ بات صرف ایک مادی ظاہرہ کی علمی توجیہہ کے طور پر کہی تھی۔

لیکن الحاد پسند مفکرین نے اس کو بطور خود مذہب کے ساتھ وابستہ کردیا اور کہا کہ یہ سائنسی دریافت خدا کے وجود کی نفی کر رہی ہے۔ انھوں نے اِس سے یہ فارمولا بنایا کہ — اگر واقعات طبیعی اسباب کے تحت پیش آرہے ہیں تو وہ مافوق الطبیعی اسباب کا نتیجہ نہیں ہو سکتے:

If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes.

یہ صرف ایک مغالطے کی بات ہے، وہ کوئی دلیل نہیں۔ نیوٹن یا دوسرے سائنس دانوں نے جو بات کہی، وہ صرف ایک طریقہ (method) کی بات تھی۔ اِس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ یہ متھڈ کس نے قائم کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ طبیعی قانون اصل واقعے کی توجیہہ نہیں کرتا، بلکہ طبیعی قانون خود توجیہہ کا طالب ہے:

Nature does not explain, nature herself is in need of an explanation.

اصولِ تعلیل پر مزید مطالعے کے لیے ملاحظہ ہو: سر جیمز جینز کی کتاب 'پراسرار کائنات' (*The Mysterious Universe*)

2۔ علم کے حوالے سے ایک معروف الحادی استدلال یہ ہے کہ دنیا کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں مختلف قسم کے نقائص پائے جاتے ہیں۔ اِن حضرات کے نزدیک، یہ پرابلم آف اِول (problem of evil) ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اگر اِس دنیا کا خالق ایک ایسا خدا ہے جو قادرِ مطلق ہے تو دنیا میں برائی کیوں ہے۔ خدا اِس برائی کو ختم کیوں نہیں کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خدا کے وجود کے خلاف سب سے بڑی دلیل ہے۔

مگر یہ دلیل صرف ایک غلط فکر پر مبنی ہے۔ یہ حضرات دنیا کا مطالعہ خود اپنے ذاتی ذہن کے تحت کرتے ہیں، حالاں کہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کا مطالعہ خود خالق کے تخلیقی منصوبہ (creation plan)

کی روشنی میں کیا جائے۔ خالق نے اپنے نقشے کے مطابق، اِس دنیا کو دار الامتحان (testing graound) کے طور پر پیدا کیا ہے۔ اِسی مصلحت کی بنا پر خالق نے انسان کو آزادی دی ہے۔ وہ چیز جس کو 'برائی کا مسئلہ' کہا جاتا ہے، وہ دراصل اِس لیے ہے کہ کچھ انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہیں جس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔

خالق کے نقشے کے مطابق، یہ صورتِ حال قیامت تک باقی رہے گی۔ برائی سے پاک دنیا (evil-free world) موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں بنے گی، نہ کہ موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات میں۔ موجودہ دنیا میں برائی سے پاک فرد (evil-free individual) کا بننا تو ممکن ہے، لیکن موجودہ دنیا میں برائی سے پاک سماج (evil free society) کا قیام ممکن نہیں۔

3۔ کہا جاتا ہے کہ خالق کے وجود کے خلاف سب سے بڑی عقلی دلیل وہ نظریہ ہے جس کو نظریۂ ارتقا (theory of evolution) کہا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نظریۂ ارتقا محض ایک مفروضہ ہے، نہ کہ کوئی سائنٹفک حقیقت۔ ارتقا کے ایک عالم کے الفاظ میں — ارتقا کا نظریہ صرف ایک ورک ایبل (workable) نظریہ ہے، خالص سائنسی معیار پر وہ کوئی ثابت شدہ نظریہ نہیں۔

4۔ موجودہ زمانے کا ایک نظریہ وہ تھا جس کو ہیومن ازم (humanism) کہا جاتا ہے۔ نظریہ ہیومن ازم کا خلاصہ یہ ہے کہ اِس دنیا میں انسان ہی سب کچھ ہے، انسان کے اوپر کوئی اور طاقت موجود نہیں۔ ہیومن ازم کے نظریے کو اِس طرح بیان کیا جاتا ہے — سیٹ کی منتقلی خدا سے انسان کی طرف:

Transfer of seat from God to man.

ہیومن ازم کا نظریہ سراسر ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان کے پاس کسی بھی قسم کی کوئی طاقت نہیں۔ ایسی حالت میں انسان، خدا کی جگہ کیوں کر لے سکتا ہے۔ اِس نظریہ کے ایک حامی جولین ہکسلے نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا ٹائٹل یہ تھا — انسان تنہا کھڑا ہوتا ہے:

Man Stands Alone

جولین ہکسلے کی اِس کتاب کا نہایت مدلل جواب ایک امریکی سائنس داں نے دیا ہے۔

اِس امریکی مصنف کا نام کریسی ماریسن (Cressy Morison) ہے۔اس کی کتاب کا نام یہ ہے:

Man Does not stand Alone

جدید مادیت کی پشت پر مختلف ملحدانہ افکار کا حوالہ دیا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جدید مادیت کے پھیلاؤ کا اصل سبب کوئی فلسفہ یا نظریہ نہیں ہے۔ جدید مادیت کی توسیع زیادہ تر عملی بنیادوں (practical reasons) پر ہوئی ہے، نہ کہ نظریاتی بنیادوں (theoritical reasons) پر۔

جدید مادیت کے حامی اکثر اپنی حمایت کے لیے سائنس کا حوالہ دیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ جدید مادیت سائنس پر کھڑی ہوئی نہیں ہے، بلکہ وہ انطباقی سائنس (applied science) پر کھڑی ہوئی ہے جس کا دوسرا نام ماڈرن ٹکنالوجی ہے۔

دورِ جدید کی مسحور کن ترقیاں جس چیز کا نتیجہ ہیں، وہ یہی ماڈرن ٹکنالوجی ہے۔ یہ ماڈرن ٹکنالوجی ہے جس کے نتیجے میں جدید قسم کے شہر بنے، جس کے نتیجے میں جدید قسم کے شاپنگ سنٹر وجود میں آئے، جس کے نتیجے میں جدید قسم کی سواریاں وجود میں آئیں۔ وہ قومیں جن کو ترقی یافتہ قومیں (developed nations) کہا جاتا ہے، ان کی ترقی کی بنیاد یہی ماڈرن ٹکنالوجی ہے۔

موجودہ زمانے میں عمومی طور پر جو اباحیت (permissiveness) آئی ہے، وہ زیادہ تر اِسی کا نتیجہ ہے۔ لوگ جدید ٹکنالوجی سے پیدا ہونے والی ترقیوں کو دیکھ کر مسحور ہوئے اور اس میں اپنا مستقبل تلاش کرنے لگے۔ یہ مزاج ابتداءً صرف دنیوی ترقی کے ہم معنی تھا، لیکن دھیرے دھیرے ہر قیمت پر ترقی حاصل کرنے کا مزاج پیدا ہوا جو بڑھ کر کامل اباحیت تک پہنچ گیا۔

چار نظریاتی ستون

وہ چیز جس کو جدید فکر (modern thought) کہا جاتا ہے، اُس کے چار نظریاتی ستون ہیں۔ یہ چار نظریاتی ستون خالص علمی اعتبار سے، ابھی تک غیر ثابت شدہ ہیں، لیکن عملاً یہی چار نظریات دنیا کے ذہن پر چھائے ہوئے ہیں۔

دنیا کی بیش تر آبادی کے لیے یہ چار نظریات گویا سیکولر عقیدہ (secular belief) کی

حیثیت رکھتے ہیں، کچھ لوگوں کے لیے شعوری طور پر اور کچھ لوگوں کے لیے غیر شعوری طور پر۔

1۔ اِن میں سے ایک نظریاتی ستون وہ ہے جس کو نظریہ ارتقا (evolution theory) کہا جاتا ہے۔ یہی مبنی بر ارتقا فکر (evolution-based thinking) ہے جس کے تحت موجودہ زمانے میں تمام حیاتیاتی مظاہر کی توجیہہ کی جاتی ہے۔ یہ توجیہات اگرچہ خالص علمی اعتبار سے مفروضات کی حیثیت رکھتی ہیں، مگر عملاً عصر حاضر کے ذہن پر اِنھیں کا غلبہ ہے۔ نظریہ ارتقا کا بانی چارلس ڈارون (Charles Robert Darwin) تھا۔ ڈارون 1809 میں برطانیہ میں پیدا ہوا اور 1882 میں اس کا انتقال ہوا۔

2۔ دوسرا نظریاتی ستون وہ ہے جس کو اصولِ تعلیل (principle of causation) کہا جاتا ہے۔ یہی مبنی بر اسباب فکر (causation-based thinking) ہے جس کے تحت تمام طبیعی واقعات کی توجیہہ کی جاتی ہے۔ اِس نظریے کا بانی آئزک نیوٹن (Isaak Newton) تھا۔ نیوٹن 1642 میں انگلینڈ میں پیدا ہوا اور 1727 میں اس کی وفات ہوئی۔ طبیعی واقعات کی توجیہہ نیچرل اسباب (natural causes) سے کرنا سائنسی دنیا میں عام طور پر رائج ہو گیا اور عملاً وہ ابھی تک رائج ہے، اگرچہ بعد کی سائنسی تحقیقات اِس توجیہہ کو غیر علمی ثابت کر چکی ہیں۔

3۔ تیسرا نظریاتی ستون وہ ہے جس میں انسانی شخصیت کی توجیہہ خواہش کی بنیاد پر کی جاتی ہے، یعنی مبنی بر خواہش فکر (desire-based thinking)۔ اِس نظریے کے مطابق، انسان کے اندر جو خواہش ہے، وہی اس کی شخصیت کی تشکیل کرتی ہے۔ گویا انسان کو اپنی خواہش پر کنٹرول کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا اتباع کرنا ہے۔ اِس نظریے کا بانی سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) تھا۔ وہ 1856 میں آسٹریا (مشرقی یورپ) میں پیدا ہوا اور 1939 میں اس کی وفات ہوئی۔

4۔ چوتھا نظریاتی ستون وہ ہے جو کارلس مارکس (Karl Henrich Marx) کے افکار (thoughts) پر مبنی ہے۔ کارل مارکس 1818 میں جرمنی میں پیدا ہوا اور 1883 میں لندن میں اس کی وفات ہوئی۔ کارل مارکس کے پیش کردہ نظریاتی ستون کو میں اپنے الفاظ میں،

مبنی بر نظام فکر (system-based thinking) کہوں گا۔ کارل مارکس کے افکار کے تحت تاریخ میں پہلی بار وہ اجتماعی فکر پیدا ہوا جس نے سماج کی تشکیل میں نظام (system) کو بنیادی حیثیت دے دی۔ کارل مارکس کا اصل فلسفہ اگرچہ اب زیادہ تر کتب خانے کے چیز بن چکا ہے، لیکن مبنی بر نظام فکر اب بھی بہت سے لوگوں کے ذہن کا سرگرم حصہ بنا ہوا ہے۔

یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد جو تہذیب وجود میں آئی اور جو افکار دنیا میں رائج ہوئے، ان کے یہی چار نظریاتی ستون تھے۔ اِن چار نظریاتی ستونوں کو ایک لفظ میں، زندگی اور کائنات کی مادی توجیہہ (material interpretation) کہا جا سکتا ہے۔ یہ نظریاتی توجیہات موجودہ زمانے میں اتنا زیادہ عام ہوئیں کہ انھوں نے قدیم الٰہیاتی توجیہہ (theological interpretation) کی جگہ لے لی۔ موجودہ زمانے میں جو دنیا پرستانہ ذہن رائج ہوا، اس کا سبب یہی جدید افکار تھے۔ اِن جدید افکار کا اثر کم وبیش تمام قوموں پر پڑا، مسلم اقوام پر بھی اور غیر مسلم اقوام پر بھی۔ مذکورہ چار نظریاتی ستون اگرچہ خالص علمی اعتبار سے، ابھی تک غیر ثابت شدہ ہیں، مگر عملی اعتبار سے ابھی تک انھیں کا رواج ساری دنیا میں قائم ہے۔

زندگی کا مقصد

11 مارچ 2006 کو شام کی فلائٹ سے میں حیدر آباد سے دہلی آ رہا تھا۔ میرے ساتھ سی۔ پی۔ ایس ٹیم کے کئی اور افراد شامل تھے۔ اِس جہاز میں ایک خاتون نیہا بٹوارا (Neha Batwara) بھی سفر کررہی تھیں۔ ہماری ٹیم کے لوگ جہاز کے اندر مسافروں کے درمیان دعوہ ورک کررہے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مز نیہا سے بھی بات کی اور انھیں دعوتی پمفلٹ دیے۔ یہ خاتون دہلی ائر پورٹ پر اُتر کر اپنے وطن اَلور (راجستھان) چلی گئیں۔ بعد کو حیدر آباد سے ان کا ایک خط مورخہ 28 مارچ 2006 بذریعے ای میل موصول ہوا۔ وہ خط حسب ذیل تھا:

Respected Maulana!

I am Neha, working in an MNC for some people, it cannot be better than to get a job in top MNC just after graduation. But believe me, I am in search of a more purposeful life. That's why I am writing to you.

I met Priya Malik, Khalid Ansari and Sadia Khan on a flight to Delhi and could apparently see the difference your guidance has made to their lives.

Maulana, I know we have been created by God, and we all have a purpose here to fulfill on earth, which, if done, will be more satisfying than getting heaven after death.

The point where I am lacking is to know the purpose for which I have been sent here. I could not come to your class in Delhi, because my family was against going to some spiritual classes. You understand.

I will be grateful to you for the whole of my life if you could help me in any way. I am currently in Hyderabad.
(Neha Batwara, Software Engg. MIEL, Hyderabad)

یہ خط سادہ طور پر صرف ایک خاتون کا خط نہیں ہے، بلکہ وہ ہر رُوح کی پکار ہے۔ یہ خط گویا ہر

عورت اور مرد کے دل کی ترجمانی ہے۔ ہر انسان ایک بامقصد زندگی (purposeful life) کی تلاش میں ہے۔ یہ ہر انسان کی فطرت کی آواز ہے۔ لیکن لوگ یہ چاہتے ہیں کہ یہ بامقصد زندگی ان کو پوری طرح موت سے پہلے کے دورِ حیات میں مل جائے۔ موت کے بعد کے دورِ حیات کا نہ اُن کو شعور ہے اور نہ وہ اس کا انتظار کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اِس سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ آدمی اس بامقصد زندگی کو کہاں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں یا خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اس کو خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں حاصل کرنا ہے۔ کیوں کہ خود اپنی بنائی ہوئی دنیا اُس کے لیے سِرے سے موجود ہی نہیں۔

ایسی حالت میں یہ بالکل فطری بات ہے کہ آدمی سب سے پہلے یہ جانے کہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے قوانین کیا ہیں اور اس کے بنانے والے نے کس تخلیقی منصوبے کے تحت اس کو بنایا ہے۔ کیوں کہ اس کی مطابقت کے بغیر وہ کسی بھی حال میں اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکتا۔

اگر آپ کے پاس ایک اچھی کار ہو اور اس کو آپ سڑک پر دَوڑانا چاہیں تو آپ کو سب سے پہلے یہ جاننا ہوگا کہ جس ملک میں آپ اپنی گاڑی دوڑانا چاہتے ہیں وہاں لفٹ ہینڈ ڈرائیو (left-hand drive) کا اصول ہے یا رائٹ ہینڈ ڈرائیو (right-hand drive) کا۔ کامیاب سفر کے لیے اِس بات کو جاننا ضروری ہے۔ اگر آپ ایسا کریں کہ لفٹ ہینڈ ڈرائیو کے ملک میں اپنی گاڑی دائیں طرف دَوڑانے لگیں، یا رائٹ ہینڈ ڈرائیو کے ملک میں اپنی گاڑی بائیں طرف دوڑانے لگیں تو دونوں حالتوں میں آپ کامیاب سفر سے محروم رہ جائیں گے۔

یہی معاملہ زندگی کے وسیع تر سفر کا بھی ہے۔ انسان اپنی زندگی کا وسیع تر سفر کسی خلا میں یا خود اپنی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں کرتا۔ وہ اپنا یہ سفر خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں کرتا ہے۔ اِس لیے ہر عورت اور مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کے تخلیقی منصوبے کو سمجھے اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ اپنے آپ کو ناکامی سے نہیں بچا سکتا۔

خود انسان کا اپنا تجربہ اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ ہر انسان کا یہ مسئلہ ہے کہ اس کو

پیاس لگتی ہے۔ وہ اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہے۔ مگر یہ ایک معلوم بات ہے کہ ہر انسان اپنی پیاس بجھانے کے لیے پانی کو استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ پانی کے سوا کسی اور چیز سے وہ اپنی ضرورت پوری نہیں کرسکتا۔ اِسی طرح انسان کو بھوک لگتی ہے۔ بھوک کے معاملے میں بھی انسان یہی کرتا ہے کہ وہ فطرت کی فراہم کردہ غذا کے ذریعے اپنی بھوک مٹائے۔ ہر انسان کو سانس لینے کے لیے آکسیجن کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہر انسان آکسیجن لینے کے لیے اُسی نظام کو استعمال کرتا ہے جو اس کے باہر فطرت نے قائم کیا ہے۔ یہی تمام دوسری ضرورتوں کا معاملہ ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ مقصدِ حیات کا بھی ہے۔ مقصدِ حیات کے معاملے میں بھی انسان کو اپنے خالق کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کو جاننا ہے۔ اِس معاملے میں کوئی دوسرا متبادل، انسان کے لیے نہیں۔

قرآن خالقِ فطرت کی کتاب ہے۔ قرآن میں اِس سوال کا جواب اس کی سورہ العصر میں دیا گیا ہے۔ قرآن کا یہ جواب اپنے مفہوم کے اعتبار سے یہ ہے:

> History is a witness that man is in loss, except those who follow the course of life set by the Creator.

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خالق نے انسان کی زندگی کو دو دَوروں میں تقسیم کیا ہے قبل از موت دَور، اور بعد از موت دَور۔ موت سے پہلے کا دَور عمل کرنے کا دَور ہے اور موت کے بعد کا دَور عمل کا انجام پانے کا دَور۔ جو کچھ موت کے بعد ملنے والا ہے وہ موت سے پہلے نہیں مل سکتا۔ جو کچھ موت سے پہلے کرنا ہے اس کو کرنے کا موقع موت کے بعد باقی نہیں رہے گا۔

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر انسان لامحدود خواہشوں (unlimited desires) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ڈیزائر ہر ایک کو بہت محبوب ہوتی ہیں۔ مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک شخص بھی اپنی اِن خواہشوں کی تکمیل نہ کرسکا۔ مختلف انسانوں نے اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے ساری عمر محنت کیا۔ بظاہر انھوں نے بڑی بڑی کامیابی حاصل کی۔

مگر ہر ایک اِس حسرت کے ساتھ مرا کہ وہ اپنی خواہشوں کی تکمیل نہ کرسکا۔ آج کی دنیا میں وہ جس خوشی کو پانا چاہتا تھا اس کو پانے میں وہ ناکام رہا۔

دنیا کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں جوڑا (pair) کا اصول قائم ہے۔ یہاں ہر چیز اپنا جوڑا رکھتی ہے۔ ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر اپنے وجود کی تکمیل کرتی ہے۔ یہ اصول عالمی سطح پر قائم ہے۔ زمین سے لے کر اسپیس تک ہر جگہ یہی نظام رائج ہے— نگیٹیو پارٹکل کا جوڑا پازیٹیو پارٹکل، نباتات میں میل سیکس اور فی میل سیکس، حیوانات میں مؤنث حیوان اور مذکر حیوان، انسان میں عورت اور مرد، وغیرہ۔

جوڑا یا زَوجین کا نظام تمام مخلوق میں عالمی سطح پر قائم ہے۔ اِس وسیع اور کامل نظام میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ انسانی خواہشات کا ہے۔ ہر انسان خواہشات کا گہرا احساس لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ہر انسان اپنی اِن خواہشات کی تکمیل کیے بغیر مرجاتا ہے۔ دنیا میں خواہش ہے مگر اس کا جوڑا، تکمیلِ خواہش یہاں موجود نہیں۔

یہ سوال اس دنیا میں آنے والے ہر عورت اور مرد کا سوال ہے۔ ہر پیدا ہونے والا اِس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے سوال کا تشفی بخش جواب پائے وہ حسرت کے ساتھ اِس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

امریکی مشنری بلی گرہم (Billy Graham) نے لکھا ہے کہ ایک بار اس کے پاس امریکا کے ایک عمر رسیدہ دولت مند کا ارجنٹ مسیج آیا۔ بلی گراہم اپنے پروگرام کو ملتوی کرکے فوراً روانہ ہوگیے۔ وہ امریکی دولت مند کے گھر پہنچا تو اس کو ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ وہاں اس کی ملاقات امریکی دولت مند سے ہوئی۔ امریکی دولت مند نے کسی تمہید کے بغیر کہا:

> You see, I am an old man. Life has lost all meaning. I am going to take a fateful leap into the unknown. Young man can you give me a ray of hope.

بلی گرہم کے پاس اِس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب نہ تھا۔ امریکی دولت مند جواب سے محرومی کا

احساس لے کر مر گیا۔ خود بلی گرہم کا یہ حال ہوا کہ تازہ اطلاع کے مطابق، وہ شدید حادثے کا شکار ہو کر معذوری کی حالت میں بستر پر پڑا ہوا ہے، اور اپنے آخری انجام کے طور پر موت کا انتظار کر رہا ہے۔

یہی معاملہ اِس دنیا میں ہر عورت اور مرد کا ہے۔ ہر ایک اپنی زندگی کا مقصد جاننا چاہتا ہے۔ ہر ایک، ایک پُر مسرت زندگی کی تلاش میں ہے۔ ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کو ایسی زندگی ملے جس میں اس کو پوری طرح فُل فلمینٹ (fulfillment) حاصل ہو۔ مگر ہر ایک کا انجام صرف ناکامی پر ختم ہو رہا ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ہر عورت اور مرد نے یہ سمجھا کہ دنیا کے مادّی ساز و سامان ہی اصل ہیں۔ ہر ایک نے مادی ساز و سامان اکھٹا کر کے اس کے ذریعے فل فلمینٹ کی زندگی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر کسی استثنا کے بغیر ایک شخص کو بھی مطلوب فل فلمینٹ حاصل نہ ہو سکا۔

ایسی حالت میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اِس ناکام تجربے کو دہرایا جاتا رہے۔ اب اِس معاملے میں اصل مسئلہ نظر ثانی (reassessment) کا ہے۔ اب اصل کام یہ ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچا جائے کہ دنیا کی قابلِ حصول مادّی چیزوں میں تو ثابت شدہ طور پر فل فلمینٹ کا سامان موجود نہیں۔ ایسی حالت میں پھر یہ سامان کہاں ہے۔ جب انسانی خواہش کا تسلسل جاری ہے تو یہ ماننا ہوگا کہ وہ ایک حقیقی چیز ہے، اور جب وہ ایک حقیقی چیز ہے تو یقینا اس کی تکمیل کا سامان بھی کائنات میں ہونا چاہیے۔

اِس معاملے کو سفر کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ کوئی شخص جب سفر کرتا ہے، خواہ وہ ٹرین سے سفر کرے یا ہوائی جہاز سے، اس کے سفر کے دو مرحلے ہوتے ہیں۔ ایک، وہ جب کہ وہ حالتِ سفر میں ہوتا ہے۔ دوسرا وہ جب کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ کامیاب سفر کے لیے ضروری ہے کہ مسافر دونوں حالتوں کے فرق کو سمجھے۔ جو مسافر اِس فرق کو نہ جانے وہ ذہنی تناؤ کا شکار ہو جائے گا اور غیر ضروری پریشانی میں مبتلا ہو کر اپنی عقل کھو بیٹھے گا۔

صحیح مسافر وہ ہے جو سفر کو سفر سمجھے، وہ سفر کو منزل کی حیثیت نہ دے۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ سفر کے دَوران وہ سہولتیں حاصل نہیں ہوتیں جو منزل پر پہنچ کر حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن ہر مسافر اِس کو

گوارا کرتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ سفر کی حالت ایک وقتی حالت ہے۔ آخر کار اس کا سفر ختم ہوگا اور وہ اپنی مطلوب منزل پر پہنچ جائے گا۔ منزل پر پہنچنے کے بعد اس کو وہ سب کچھ مل جائے گا جس کو وہ چاہتا تھا لیکن سفر کے دَوران وہ اُن کو حاصل نہ کر سکا۔

ہماری موجودہ زندگی بے حد مختصر مدت کے لیے ہوتی ہے۔ اس کا مختصر مدت کے لیے ہونا خود اِس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دَورانِ سفر کی حالت ہے، وہ منزل پر پہنچنے سے پہلے کا لمحہ ہے۔ اِس بنا پر یہ ممکن نہیں کہ موجودہ مختصر زندگی میں ہم وہ تمام چیزیں پالیں جن کو ہم پانا چاہتے ہیں۔ یہ چیزیں بلاشبہہ ہم کو ملیں گی لیکن وہ منزل پر پہنچ کر ملیں گی، سفر کے درمیانی مرحلے میں وہ ہرگز ہم کو ملنے والی نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، ہماری زندگی دو مرحلوں میں تقسیم ہے— موت سے پہلے کا مرحلہ اور موت کے بعد کا مرحلہ۔ موت سے پہلے کا مرحلہ گویا حالتِ سفر کا مرحلہ ہے، اور موت کے بعد کا مرحلہ گویا منزل پر پہنچنے کا مرحلہ۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو جاننا ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ہر انسان کی زندگی کو بامعنیٰ بناتی ہے، جو ہر عورت اور مرد کو اُس مقصد سے متعارف کرتی ہے جو اس کی زندگی کو پوری طرح بامعنیٰ بنادے جو اس کو اطمینان کا سرمایہ عطا کرے۔

زندگی کی یہ توجیہہ اِس سوال سے جُڑی ہوئی ہے کہ موت کے بعد دوبارہ انسان زندہ ہوتا ہے۔ کیا موت کے بعد بھی اسی طرح زندگی ہے جس طرح موت سے پہلے ہم زندگی کا تجربہ کر رہے ہیں۔ اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ اِس سوال کا جواب ہم عین اُسی سائنسی طریقے کے ذریعے جان سکتے ہیں جس سائنسی طریقے سے دوسری حقیقتوں کو جانا جاتا ہے۔

حقیقتوں کو جاننے کے معاملے میں سائنٹفک متھڈ کیا ہے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ جس بات کو جاننا ہے وہ اپنی کامل صورت میں سائنس داں کے سامنے آجائے۔ اگر یہ شرط ہو تو ساری حقیقتیں سائنسی طور پر غیر معلوم رہ جائیں۔ علم کی ترقی رُک جائے۔ حقائق کی نسبت سے انسان ہمیشہ کے لیے اندھیرے میں پڑا رہے۔ کیوں کہ کوئی بھی حقیقت اِس طرح علم میں نہیں آتی کہ وہ پہاڑ کی

طرح مشہود چیز کے طور پر سامنے آجائے۔

اِس کے بجائے جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مطالعے کے دَوران سائنس داں کے سامنے ایک سُراغ (clue) آتا ہے۔ اِس سُراغ پر غور کرکے وہ ایک ایسی حقیقت تک پہنچتا ہے جو پہلے اس کو معلوم نہ تھی۔ اِس دنیا میں ہر حقیقت سراغ کی سطح پر دریافت ہوتی ہے۔ اِس دنیا میں سراغ ہی تمام حقیقتوں کی دریافت کی کنجی ہے۔

مثلاً سائنس میں اِس کو بطور حقیقت مان لیا گیا ہے کہ تیرہ بلین سال پہلے بِگ بینگ کا واقعہ پیش آیا۔ اِسی طرح سائنس میں یہ مان لیا گیا ہے کہ زمین پر حیاتیاتی ارتقا کا واقعہ ہوا۔ اسی طرح سائنس میں یہ مان لیا گیا ہے کہ ہماری کائنات ایک پھیلتی ہوئی کائنات (expanding universe) ہے، وغیرہ۔

اِس قسم کی حقیقتیں جو آج مسلّم حقیقت بن چکی ہیں وہ اِس طرح حقیقت نہیں بنیں کہ انسان نے اس کو مشاہداتی سطح پر دیکھ لیا۔ اِس کے بجائے جو کچھ ہوا وہ صرف یہ تھا کہ ایک سراغ انسان کے علم میں آیا۔ پھر اِس سراغ پر غور کرکے انسانی علم ایک بڑی حقیقت تک پہنچا۔ یہ بڑی حقیقت اگر چہ دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر وہ موجود تھی۔ اس کی موجودگی کو بطور ایک واقعہ کے تسلیم کرلیا گیا۔ اگر چہ اِس سلسلے میں سُراغ کے سوا کوئی اور چیز انسان کے مشاہدے میں نہیں آئی تھی۔

یہی معاملہ موت کے بعد زندگی کا یا اگلے دَورِ حیات کا ہے۔ اگلے دَورِ حیات کے بارے میں بھی واضح سُراغ (clue) موجود ہیں۔ سراغ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے تو وہ ہمیں اِس یقین تک پہنچاتے ہیں کہ موت کے بعد بھی زندگی ہے۔ موت کے بعد بھی اِسی طرح ایک اور مرحلۂ حیات ہے جو لازمی طور پر ہر ایک کے سامنے پیش آئے گا۔

وہ سراغ کیا ہے۔ مثلاً انسان کا جسم بے شمار خلیوں (cells) پر مبنی ہے۔ یہ خلیے ہر وقت ٹوٹتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارا نظامِ ہضم یہ کام کرتا ہے کہ جو کچھ ہم کھاتے ہیں وہ خلیّوں کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ ہمارا نظام ہضم گویا خلیہ ساز فیکٹری ہے۔ اِس نظام کے تحت یہ ہوتا ہے کہ

عملاً تقریباً ہر دس سال میں ہمارا پورا جسم بدل جاتا ہے۔ نئے خلیوں کے ساتھ مکمل طور پر ایک نیا جسم وجود میں آجاتا ہے۔

گویا کہ ہمارے جسم پر بار بار ''موت'' طاری ہوتی رہتی ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کا ذہنی وجود نہیں مرا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ذہنی وجود ہی انسان کا اصل وجود ہے۔ یہ ذہنی وجو بظاہر جسمانی موت کے باوجود یکساں طور پر باقی رہتا ہے۔ یہ ایک سراغ ہے جو بتاتا ہے کہ انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ابدی مخلوق ہے۔ اس کے ابدی وجود کا تھوڑا سا حصہ قبل از موت مرحلۂ حیات میں ہے، اور اس کا بقیہ پورا حصہ بعد از موت مرحلۂ حیات میں۔

اِسی طرح اِس معاملے کا ایک سُراغ یہ ہے کہ انسان کے اندر استثنائی طور پر عدل (justice) کا تصور پایا جاتا ہے۔ انسان اپنے فطری ذہن کے تحت، یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عدل قائم ہو۔ یعنی اچھا عمل کرنے والوں کو اچھا انجام ملے اور بُرا عمل کرنے والوں کو بُرا انجام ملے۔ اِس سراغ کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو انسانی ذہن اِس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ موجودہ مرحلۂ حیات چوں کہ اپنی مدت کے اعتبار سے نہایت ناکافی ہے اس لیے بعد کے مرحلۂ حیات میں عدل کے تقاضے کی تکمیل ہو۔ بعد کے مرحلۂ حیات میں ہر انسان کو اس کے کیے کے مطابق، جزا یا سزا ملے۔

اِسی طرح اِس معاملے کا ایک سراغ یہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر معیاری دنیا (perfect world) چاہتا ہے۔ مگر موجودہ دنیا کی محدودیت (limitations) کی بنا پر یہاں مطلوب معیاری دنیا بن نہیں پاتی۔ اِس سراغ پر غور کرتے ہوئے انسانی ذہن اِس دریافت تک پہنچتا ہے کہ جو معیاری دنیا قبل از موت مرحلۂ حیات میں محدود حالات کی بنا پر حاصل نہ ہوسکی وہ بعد از موت مرحلۂ حیات میں اپنی مطلوب معیاری صورت میں حاصل ہوگی۔

اِسی طرح اِس معاملے میں ایک سراغ یہ ہے کہ انسان استثنائی طور پر ایک ایسی مخلوق ہے جو کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ کسی بھی دوسرے حیوان یا غیر حیوان کے اندر کل کا تصور موجود نہیں۔ اِس سراغ کو لے کر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ موجودہ محدود حالات میں آدمی

اپنی جس مطلوب دنیا کو نہیں پاتا اس کو وہ موت کے بعد آنے والے لامحدود مرحلۂ حیات میں پالے گا۔ یہ دنیا وہ ہوگی جہاں آدمی اپنے لیے پوری طرح فُل فلمینٹ کا تجربہ کر سکے گا۔

موت کے بعد معیاری دنیا بننا ویسا ہی ایک ثابت شدہ واقعہ ہے جیسا کہ دوسرے ثابت شدہ واقعات۔ تاہم مستقبل کی اِس معیاری دنیا میں ہر ایک کو خود بخود جگہ نہیں مل جائے گی بلکہ صرف وہ عورت اور مرد اِس معیاری دنیا میں جگہ پائیں گے جو موت کے پہلے کی اِس دنیا میں اس کا استحقاق ثابت کرسکیں۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ ہر انعام مستحقین کو ملتا ہے۔ غیر مستحقین کے لیے کبھی کوئی بڑا انعام مقدر نہیں ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ کسی شخص کے لیے اپنے آپ کو اس معیاری دنیا کا مستحق بنانے کا فارمولا کیا ہے۔ وہ فارمولا صرف ایک ہے، اور وہ ہے اپنے روح کی تطہیر (purification of soul)۔

جو آدمی مستقبل کی اس معیاری دنیا میں اپنے لیے جگہ حاصل کرنا چاہتا ہو اس کو آج کی اِس دنیا میں یہ ثبوت دینا ہے کہ اس نے دکھائی دینے والی دنیا (seen world) میں نہ دکھائی دینے والی دنیا (unseen world) کو اپنی بصیرت سے جانا۔ اس نے کنفیوژن کے جنگل میں سچائی کو دریافت کیا۔ اس نے منفی تجربات کے ماحول میں اپنے آپ کو مثبت رویّے پر قائم رکھا۔ اس نے اپنے آپ کو حیوانی سطح سے اوپر اٹھایا اور انسانیت کی اعلیٰ سطح پر کھڑا کیا۔ اس نے اپنے آپ کو بے اعترافی، بددیانتی، سرکشی، خودغرضی، خواہش پرستی اور انانیت جیسی پست صفات سے بچایا۔ جو پورے دل اور جان کے ساتھ جنت کا طالب بنا۔ خلاصہ یہ کہ جس نے خدا رُخی زندگی (God-oriented life) کو پوری طرح اختیار کیا۔

یہ صفات رکھنے والے عورت اور مرد خلاصۂ انسانیت ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مستقبل کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے لیے منتخب کیے جائیں گے۔ جو لوگ اس معیار پر پورے نہ اتریں ان کو رد کرکے کائناتی کوڑا خانے میں ڈال دیا جائے گا۔ جہاں وہ ہمیشہ کے لیے حسرت کی زندگی گزاریں گے۔ وہ کبھی اِس ذلّت اور حسرت کی زندگی سے نجات نہ پاسکیں گے۔

انسان کی کہانی

حیوانات کے لیے زندگی صرف ایک بار ہے مگر انسان کے لیے استثنائی طور پر زندگی دو بار ہوتی ہے۔ ہر انسان اصلاً ابدی حیات کا مالک ہے۔ اِس ابدی زندگی کا بہت مختصر حصہ قبل از موت دورِ حیات میں ہے۔ اور اس کا بقیہ تمام حصہ بعد از موت دورِ حیات میں۔

کائنات کی دوسری چیزیں قانون فطرت کے ماتحت ہیں۔ یہاں کی ہر چیز جبری طور پر وہی کرتی ہے جو اس کے لیے قانونِ فطرت کے تحت مقدر کر دیا گیا ہے۔ لیکن انسان کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ انسان استثنائی طور پر ایک آزاد مخلوق ہے۔ وہ اپنا مستقبل خود اپنے آزاد ارادے کے تحت بناتا ہے۔ وہ اپنی آزادی کا یا تو صحیح استعمال کرتا ہے یا غلط استعمال۔ وہ اپنے مواقع کو یا تو پاتا ہے یا اس کو نادانی کے ساتھ کھو دیتا ہے۔

اس حقیقت کو قرآن میں مختلف انداز سے بتایا گیا ہے۔ قرآن کی سورہ التین میں خدا نے یہ اعلان کیا ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین بناوٹ کے ساتھ پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچے درجے میں پھینک دیا:

We created man in the best mould, then we cast him down to the lowest of the low. (95:4-5)

یہ گویا انسان کے لیے ایک وارننگ ہے جو اس کو اس کے حال اور اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اعلیٰ امکانات کے ساتھ پیدا کیا، مگر انسان اپنے امکانات کا کم تر استعمال کر کے اپنے آپ کو بدترین ناکامی میں ڈال دیتا ہے:

God created man with great potential, but by under-utilizing his potential he makes himself a worst case of failure.

انسان کی شخصیت ایک دوہری شخصیت ہے — جسم اور روح (یا ذہن)۔ سائنسی مطالعہ بتاتا ہے کہ دونوں کا معاملہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ جہاں تک انسان کے جسم کا تعلق ہے،

وہ غیر ابدی ہے۔ جب کہ انسان کی روح ایک ابدی وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کی روح ایک غیر مادّی حقیقت ہے۔ وہ مادّی قوانین سے بالاتر ہے۔ جب کہ انسان کا جسم مادی قوانین کے ماتحت ہے اور مسلسل طور پر فنا پذیر ہے۔

حیاتیاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کا جسم بہت چھوٹے چھوٹے خلیوں (cells) سے بنا ہے۔ یہ خلیے ہر لمحہ ہزاروں کی تعداد میں ٹوٹتے رہتے ہیں۔ انسان کا نظامِ ہضم گویا ایک خلیہ ساز فیکٹری ہے۔ یہ فیکٹری مسلسل طور پر خلیّات کی سپلائی کرتی رہتی ہے۔ اِس طرح جسم اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے۔ یہ عمل اِس طرح ہوتا ہے کہ ہر چند سال کے بعد آدمی کا جسم بالکل ایک نیا جسم بن جاتا ہے۔ لیکن اس کا روحانی وجود کسی تبدیلی کے بغیر اسی طرح باقی رہتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ انسان کی شخصیت تغیر کے درمیان عدم تغیر کا نام ہے:

Personality is changelessness in change.

انسان کی ناکامی کا پہلا مظہر یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے غیر متغیر حصے کو نظر انداز کرتا ہے، اور اپنی شخصیت کے تغیر پذیر حصے کو اچھا بنانے میں لگا رہتا ہے۔ وہ اپنی ساری توجہ فانی انسان کی بہتری میں لگا دیتا ہے، اور ابدی انسان کی بہتری کے لیے وہ نہ کچھ سوچتا ہے اور نہ کچھ کرتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک محدود مدت گزار کر جب وہ مرتا ہے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کا فانی وجود اپنی تمام ظاہری ترقیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے مٹ جاتا ہے اور اس کا ابدی وجود ترقیات سے محروم حالت میں زندگی بعد موت کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کو قرآن میں انسان کی ناکامی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ بلاشبہہ بدترین ناکامی ہے کہ انسان انتہائی اعلیٰ امکانات (potentials) کے ساتھ پیدا کیا جائے مگر وہ اپنے امکانات کو صرف ناقص طور پر استعمال کرے اور اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے اپنے اِس عدم استعمال کی قیمت دینے کے لیے اپنے ابدی دورِ حیات میں داخل ہو جائے۔

اِسی طرح مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان استثنائی طور پر سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تصوّراتی فکر

(conceptual thought) انسان کی ایک ایسی صفت ہے جو وسیع کائنات کی کسی بھی چیز میں نہیں پائی جاتی۔ حتی کہ حیوانات میں بھی نہیں۔ اِسی لیے کہا گیا ہے کہ انسان ایک سوچنے والا حیوان ہے:

Man is a thinking animal.

اِس اعتبار سے دیکھیے تو انسان کی شخصیت دو چیزوں پر مشتمل ہے— غیر تفکیری جسم، اور تفکیری روح۔ جو لوگ اپنے امکانات کو محدود طور پر صرف مادّی دائرے میں استعمال کریں وہ گویا اپنے وجود کے غیر تفکیری حصے کی تو خوب تزئین کر رہے ہیں لیکن اپنے وجود کے تفکیری حصے کی ترقی کے لیے وہ کچھ نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ موت سے پہلے کی اپنی تمام عمر جسمانی ترقی (physical development) میں صرف کر دیتے ہیں، اور جہاں تک ذہنی ترقی (intellectual development) کی بات ہے وہ اس کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں پر جب موت آتی ہے تو اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اُسی طرح مرجاتے ہیں جس طرح کوئی حیوان مرتا ہے، یعنی اپنے جسم کو خوب فربہ بنانا، اور اگلے دورِ حیات میں اِس طرح داخل ہونا کہ ان کا ذہن تمام ترقیوں سے محروم ہو اور اگلے دورِ حیات میں طویل حسرت کے سوا کچھ اور ان کے حصے میں نہ آئے۔

اِسی طرح مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کے اندر استثنائی طور پر کل (tomorrow) کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس کائنات کی تمام چیزیں، بشمول حیوانات، صرف اپنے آج (today) میں جیتے ہیں۔ یہ صرف انسان ہے جو کل کا شعور رکھتا ہے، اور کل کو نشانہ بنا کر اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ گویا کہ بقیہ چیزیں صرف حال (present) میں جیتی ہیں اور انسان استثنائی طور پر مستقبل (future) میں۔

قرآن کے بیان کے مطابق، وہ لوگ بدترین محرومی کا شکار ہیں جو اپنی صلاحیتوں کو صرف آج کی چیزوں کے حصول میں لگا دیں اور اپنے کل کی تعمیر کے لیے وہ کچھ نہ کریں۔ ایسے لوگ موت سے پہلے کی زندگی میں بظاہر خوش نما دکھائی دے سکتے ہیں لیکن موت کے بعد کی زندگی میں وہ محرومی کی

بدترین مثال بن جائیں گے۔ کیوں کہ موت کے بعد کی زندگی میں جو چیز کام آنے والی ہے وہ ذہنی اور روحانی ترقی ہے نہ کہ دنیوی مفہوم میں مادّی ترقی۔

اِسی طرح مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر انسان اپنے اندر لامحدود خواہشیں رکھتا ہے۔ اِسی کے ساتھ ہر انسان کے اندر لامحدود صلاحیتیں پائی جاتی ہیں جن کو استعمال کر کے وہ لامحدود حد تک اپنی خواہشوں کی تکمیل کرے، مگر ہر انسان کا یہ انجام ہوتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا صرف اتنا استعمال کر پاتا ہے جو اس کو موت سے پہلے کی محدود دنیا میں کچھ وقتی راحت دے سکے۔ مگر آخر کار ہر انسان کا یہ انجام ہوتا ہے کہ وہ اپنی اِن تمام صلاحیتوں کو لیے ہوئے موت کے بعد والی ابدی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے جہاں وہ ابدی طور پر بے راحت زندگی گزارے، کیوں کہ اُس نے اِس دوسرے دورِ حیات کے لیے اپنی صلاحیتوں کو استعمال ہی نہیں کیا تھا۔

ایسی حالت میں انسان کے لیے حقیقت پسندانہ طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی منصوبہ بندی اِس طرح کرے کہ اس کی فطری صلاحیتیں بھرپور طور پر اس کے ابدی مستقبل کی تعمیر میں استعمال ہوں۔ وہ اپنے امکانات (potentials) کو سمجھے اور اُن کو اِس طرح استعمال کرے کہ وہ اپنے ابدی دورِ حیات میں ان کا مفید نتیجہ پاسکے۔ وہ اپنے آپ کو اِس بُرے انجام سے بچائے کہ آخر میں اس کے پاس صرف یہ کہنے کے لیے باقی رہے کہ میں اپنے امکانات کو استعمال کرنے سے محروم رہا:

I was a case of missed opportunities.

انسان کے لیے حقیقت پر مبنی منصوبہ بندی یہ ہے کہ وہ موت سے پہلے کے دورِ حیات میں مادی چیزوں کے معاملے میں صرف ضرورت (need) پر قناعت کرے، اور اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کا بیش تر حصہ اِس پر خرچ کرے کہ وہ موت کے بعد کی زندگی میں ایک مُطہّر شخصیت (purified personality) کے ساتھ داخل ہو۔ تاکہ اس کو ابدی دورِ حیات کی معیاری دنیا (perfect world) میں عزت اور راحت کی مطلوب زندگی مل سکے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ موت سے پہلے کے دورِ حیات اور موت کے بعد کے دورِ حیات دونوں میں

کامیابی کا اصول صرف ایک ہے، اور وہ ہے اپنے آپ کو تیّار شخصیت (prepared personality) بنانا۔ مادّی معنوں میں تیار شخصیت موت سے پہلے کے دورِ حیات میں ترقی کا ذریعہ بنتی ہے، اور روحانی معنوں میں تیار شخصیت اُس دورِ حیات میں کام آئے گی جہاں موت کے بعد آدمی کو رہنا ہے۔

مادی معنوں میں تیار شخصیت یہ ہے کہ آدمی پروفیشنل ایجوکیشن حاصل کرے۔ آدمی کے اندر تجارتی صلاحیت ہو۔ آدمی کے اندر وہ صفات ہوں جن کے ذریعے کوئی شخص لوگوں کے درمیان مقبول ہوتا ہے۔ آدمی قریبی مفاد (immediate gain) کو آخری حد تک اہمیت دیتا ہو، وغیرہ۔

موت کے بعد کے دورِ حیات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جو تیار شخصیت درکار ہے وہ ایسی شخصیت ہے جس نے موجودہ دنیا کے مواقع کو روحانی ارتقا (spiritual development) اور فکری ارتقا (intellectual development) کے لیے استعمال کیا۔ ایسی ہی شخصیت موت کے بعد کے دورِ حیات میں باقیمت ٹھہرے گی۔

یہ شخصیت وہ ہے جس نے اپنی عقل کو استعمال کرکے سچائی کو دریافت کیا۔ جو شبہات کے جنگل میں یقین پر کھڑا ہوا۔ جس نے خدا کو اپنی زندگی کا واحد کنسرن بنایا۔ جس نے خود پسندی کے جذبات کو کچل کر خدا پرستی کے طریقے کو اختیار کیا۔ جو منفی حالات میں مثبت سوچ پر قائم رہا۔ جس نے نفسانی انسان بننے کے بجائے ربّانی انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ جس نے مفاد پرستی کے بجائے اصول پسندی کا طریقہ اختیار کیا۔ جس نے اپنے آپ کو نفرت سے بچایا اور اپنے اندر انسانی خیر خواہی کے جذبات کی پرورش کی۔ جس نے آزادی کے باوجود اطاعت (submission) کا طریقہ اختیار کیا۔

دیوارِ قہقہہ

The Story of the Wall of Laughter

ایک پُرانا قصہ ہے کہ کسی مقام پر ایک مضبوط دیوار تھی۔ یہ دیوار بہت اونچی تھی۔ اِسی کے ساتھ وہ دونوں طرف بہت زیادہ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار کے اِس طرف رہنے والوں کو کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ دیوار کے دوسری طرف کیا ہے، اور کس قسم کے لوگ اُدھر رہتے ہیں۔ دیوار کے اِس طرف جو لوگ

رہتے تھے، انھوں نے یہ چاہا کہ دیوار کے دوسری طرف کا حال معلوم کریں۔

اِس مقصد کے لیے انھوں نے ایک بہت لمبی سیڑھی بنائی، پھر انھوں نے اُس سیڑھی کو دیوار کے ایک طرف کھڑا کیا اور اپنے ایک آدمی کو سیڑھی پر چڑھایا، تاکہ وہ دیوار کے اوپر تک جائے اور وہاں سے دیکھے کہ دیوار کے دوسری طرف کیا ہے۔ اِس مشاہدے کے بعد وہ نیچے آکر دیوار کے اِس طرف رہنے والوں کو دیوار کے دوسری طرف کا حال بتائے۔ لیکن جب یہ آدمی لمبی سیڑھی پر چڑھ کر دیوار کے اوپر پہنچا تو دوسری طرف کی دنیا اُس کو اتنی زیادہ خوب صورت معلوم ہوئی کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور قہقہہ لگا کر دیوار کے دوسری طرف کود پڑا۔

اِس کے بعد دیوار کے اِس طرف رہنے والوں نے اپنے ایک اور آدمی کو تیار کیا اور اس کو لمبی سیڑھی کے اوپر چڑھایا، لیکن دوبارہ یہی ہوا کہ جب وہ آدمی دیوار کے اوپر پہنچا تو قہقہہ لگا کر وہ دوسری طرف کود پڑا۔ یہ تجربہ بار بار کیا جاتا رہا، لیکن ہر بار یہی ہوا کہ اوپر چڑھنے والے آدمی کو دوسری طرف کا منظر اتنا پُرکشش نظر آیا کہ وہ قہقہہ لگا کر دیوار کے دوسری طرف کود پڑا۔ اِس طرح دیوار کے اِس طرف رہنے والوں کے لیے دیوار کے دوسری طرف کا حال بدستور نامعلوم بنا رہا۔

اِس افسانوی دیوار کو اگر موت کی دیوار مانا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ انسان کی زندگی کا ایک حصہ دیوار کے اِس طرف ہے، اور اس کا دوسرا حصہ دیوار کے دوسری طرف۔ دیوار کے دوسری طرف خوشیوں کی دنیا، یا دوسرے لفظوں میں، جنت کی دنیا بسی ہوئی ہے اور دیوار کے اِس طرف محنت اور مشقت کی دنیا ہے، تو یہ کہانی انسانی تاریخ کے اوپر مکمل طور پر صادق آئے گی۔ یہ تمثیلی کہانی گویا کہ پوری انسانی تاریخ کی کہانی ہے۔

انسان پیدائشی طور پر اپنے لیے خوشیوں کی ایک زندگی چاہتا ہے۔ اِس اعتبار سے انسان کو متلاشیٔ مسرت حیوان (joy-seeking animal) کہا جاسکتا ہے۔ قدیم انسان نے جب یہ دیکھا کہ اُس کی زندگی مختلف قسم کے غم سے بھری ہوئی ہے، تو اس نے اپنے لیے ایک پُرمسرت زندگی کی تلاش شروع کردی۔ اِس تلاش کا غالباً پہلا نمایاں واقعہ پہیہ (wheel) کی دریافت تھی۔ پہیے کی

دریافت کے بعد تلاشِ مسرت کا یہ انسانی سفر شروع ہوگیا۔ اِس سفر کو ایک متعین نام دینا ہو تو اُس کو تہذیب (civilization) کا سفر کہا جا سکتا ہے۔ تہذیب کا یہ سفر چلتا رہا۔ لمبی مدت کے بعد آخر کار یہ سفر جدید تہذیب (modern civilization) کے دَورتک پہنچ گیا۔ اب اُس کو تیز رفتار سفر کے لیے مشین کی طاقت حاصل ہوگئی۔ جدید کمیونی کیشن کا زمانہ آیا اور جسمانی سفر کے بغیر انسان کی آواز اور اس کی متحرک تصویر بعید ترین مسافت تک پہنچنے لگی۔ جدید انڈسٹری نے کنزیومرازم (consumerism) کا دور پیدا کیا، جب کہ راحت اور آسائش کی تمام چیزیں غلّے اور سبزی کی طرح بازار میں بکنے لگیں، وغیرہ۔

اِس طرح انسانی تہذیب کامیابی کے ساتھ لمبا سفر طے کرتے ہوئے آخر کار اکیسویں صدی عیسوی میں پہنچ گئی، لیکن اِس آخری منزل پر پہنچ کر انسان کے لیے ایک نیا شدید تر مسئلہ پیدا ہوگیا۔ اب یہ ہوا کہ دیوارِ قہقہہ (laughter wall) اُن کے لیے ایک نئی قسم کی دیوارِ گریہ (wailing wall) بن گئی۔ اب معلوم ہوا کہ انسان نے لمبی جدو جہد کے بعد جو دنیا اپنے لیے بنائی تھی، وہ انسان کے لیے خوشیوں کی دنیا نہ تھی، بلکہ وہ صرف نئی نا قابلِ عبور مصیبتوں کی ایک دنیا تھی۔ چناں چہ اکیسویں صدی میں انسانی تہذیب ایک بند گلی (blind alley) تک پہنچ کر انسانی تاریخ کے خاتمہ (end of history) کے ہم معنٰی بن گئی۔

ایسا کیوں ہوا۔ اِس کا سبب بنیادی طور پر صرف ایک ہے، وہ یہ کہ خوشیوں کی ایک دنیا بنانے کے لیے ایک مکمل انڈسٹری درکار ہے۔ انسان نے لمبی جدو جہد کے بعد ایک ایسی انڈسٹری تیار کی، لیکن جب یہ انڈسٹری تیار ہوگئی تو اس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ انڈسٹری ایک نیا نا قابلِ عبور مسئلہ لے کر آئی ہے۔ یہ مسئلہ فضائی کثافت (air pollution) کا مسئلہ ہے، جو کہ انسانی انڈسٹری کے ساتھ لازمی طور پر جُڑا ہوا ہے۔ ہم کو اپنی مطلوب راحتوں کی دنیا بنانے کے لیے بے کثافت انڈسٹری (pollution-free industry) درکار ہے، اور بے کثافت انڈسٹری کو وجود میں لانا انسان کے لیے سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اِس طرح کثافت کے مسئلے نے

عملی طور پر تہذیب کے تمام ثمرات (achievements) کی نفی کردی ہے۔

ایک طرف، اپنی مطلوب دنیا بنانے کے لیے انسان کے عجز کا یہ معاملہ ہے اور دوسری طرف، اِسی دنیا میں یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ یہاں ایک بے کثافت انڈسٹری عملاً ہزاروں سال سے مکمل طور پر قائم ہے۔ یہ فطرت (nature) کی انڈسٹری ہے۔ تہذیب، بے کثافت انڈسٹری کو وجود میں لانے میں مکمل طور پر ناکام رہی، لیکن اِسی دنیا میں فطرت (nature) ایک مکمل قسم کی بے کثافت انڈسٹری بہت بڑے پیمانے پر بالفعل (in action) قائم کیے ہوئے ہے۔

موجودہ سیارۂ زمین جس پر انسان رہتا ہے، وہ مسلسل طور پر گردش میں ہے۔ وہ اپنے محور (axis) پر ایک ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے گھوم رہا ہے۔ اِسی کے ساتھ وسیع خلا میں سورج کے گرد وہ اپنے مدار (orbit) پر 19 کروڑ میل کا لمبا سفر طے کرتا ہے، پہلا سفر 24 گھنٹے میں پورا ہوتا ہے اور دوسرا سفر ایک سال میں۔ سیارۂ زمین کا یہ دوطرفہ تیز رفتار سفر مسلسل طور پر جاری ہے، لیکن یہاں نہ کوئی شور (noise) ہے اور نہ کسی قسم کی کثافت (pollution)۔

سورج آگ اور انرجی کا بہت بڑا ابھنڈار ہے۔ وہ اتنا زیادہ بڑا ہے کہ اُس سے 12 لاکھ زمینیں بن سکتی ہیں۔ وہ زمین سے 9 کروڑ 30 لاکھ میل دور رہتے ہوئے مسلسل طور پر ہم کو روشنی اور حرارت بھیج رہا ہے، لیکن دوبارہ یہاں کسی قسم کی کوئی کثافت (pollution) مطلق موجود نہیں۔ اِسی طرح نیچر میں ایک اور انڈسٹری ہے۔ یہ درختوں اور پودوں کی صورت میں قائم ہے۔ یہ انڈسٹری ایک نہایت پیچیدہ نظام کے تحت، انسان کو مسلسل طور پر صحت بخش آکسیجن سپلائی کر رہی ہے۔ اِسی کے ساتھ وہ ہماری سانس سے نکلی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ کو اپنے اندر جذب کر رہی ہے۔ یہ بلاشبہہ ایک عظیم انڈسٹری ہے، لیکن یہ انڈسٹری بھی شور اور کثافت جیسی نامطلوب چیزوں سے مکمل طور پر پاک ہے۔

اِسی طرح پانی کو دیکھیے۔ پانی کا بہت بڑا ذخیرہ بڑے بڑے سمندروں کی صورت میں ہماری زمین پر موجود ہے۔ اِس ذخیرے میں تحفّظاتی مادّہ (preservative) کے طور پر تقریباً 10 فی صد نمک ملا ہوا ہے۔ اِس بنا پر وہ براہِ راست طور پر انسان کے لیے قابلِ استعمال نہیں۔

یہاں بارش کی صورت میں ایک عظیم آفاقی عمل جاری ہے، جس کو ازالۂ نمک (desalination) کا عمل کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ناقابلِ بیان حد تک ایک عظیم انڈسٹری ہے، لیکن یہ انڈسٹری کسی قسم کی کوئی کثافت پیدا نہیں کرتی۔

یہی معاملہ انسانی خوراک کا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ خوراک غلّہ اور سبزی اور پھل اور دودھ اور مچھلی اور گوشت، وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تمام خوراک بھی مسلسل طور پر انسان کے لیے وجود میں لائی جارہی ہے۔ یہ عمل بھی ایک عظیم انڈسٹری کے ذریعے انجام پاتا ہے، لیکن یہاں بھی انسانی صنعتوں کی مانند کوئی کثافت پیدا نہیں ہوتی۔

یہ دو مختلف قسم کے تجربے ہیں۔ ایک، انسانی تہذیب کی انڈسٹری اور دوسرے، ڈوائن نیچر کی انڈسٹری۔ انسانی تہذیب کی انڈسٹری ہمارے لیے خوشیوں اور راحتوں کی دنیا بنانے میں ناکام ہے۔ وہ راحت کے سامان وجود میں لانے کی کوشش میں مصیبتوں کا ایک نیا جنگل اُگا دیتی ہے۔ دوسری طرف، عین اُسی وقت، ڈوائن نیچر کی انڈسٹری راحت کے تمام سامان پیدا کر رہی ہے، لیکن وہ مکمل طور پر ایک بے کثافت انڈسٹری ہے، نہ کہ انسانی انڈسٹری کی طرح پُر کثافت انڈسٹری۔

اب اگر قدیم کہانی کے مطابق، دیوار کو موت کی دیوار قرار دیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اِس دیوار کے ایک طرف دنیائے گریہ (wailing world) ہے، اور اِس دیوار کے دوسری طرف دنیائے قہقہہ (laughter world) ہے۔ اکیسویں صدی میں پہنچ کر تہذیبِ انسانی کی ناکامی ہمیں ایک نیا پُرامید سبق دے رہی ہے، وہ یہ کہ ہم ''دیوار'' کے اِس طرف ناکام طور پر اپنی دنیائے قہقہہ بنانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ ''دیوار'' کے دوسری طرف کی ''دنیائے قہقہہ'' میں اپنی سیٹ حاصل کرنے کی کوشش کریں، جو کہ بَروقت ہی ڈوائن نظام کے تحت ''دیوار'' کے دوسری طرف موجود ہے۔

جنت اور انسان

غالباً 1998 کی بات ہے، ڈاکٹر مہیش چندر شرما نے مجھے دہلی کے ایک سینئر اسکالر سے ملایا۔ یہ پروفیسر نونہال سنگھ (پیدائش: 1923) تھے۔ امریکا سے رٹائر ہو کر آنے کے بعد یہاں ان کو

راجیہ سبھا کا ممبر (1998-1992) بنا دیا گیا تھا۔ اُن کا گھر ایک کتب خانہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس میں ہر طرف لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا۔ وہ پورے معنوں میں ایک اسکالر دکھائی دیتے تھے۔

ملاقات کے وقت انھوں نے بتایا کہ پولٹکل سائنس میں انھوں نے ایم اے کیا تھا۔ اِس کے بعد انھوں نے انٹرنیشنل ریلیشنس (international relations) کے سبجیکٹ پر ڈاکٹریٹ کیا۔ اُس زمانے میں امریکا کی ایک یونی ورسٹی کو اپنے لیے اِس موضوع پر ایک پروفیسر کی ضرورت تھی۔ اُس کا اشتہار دیکھ کر پروفیسر سنگھ نے اس کے لیے اپنی درخواست بھیج دی۔ جلد ہی انھیں یونی ورسٹی کی طرف سے ایک لیٹر ملا، اِس میں انھیں انٹرویو کے لیے امریکا بلایا گیا تھا۔

وہ امریکا پہنچے تو ائرپورٹ پر ایک صاحب اُن سے ملے۔ اُنھوں نے کہا کہ میں یونی ورسٹی کی طرف سے بھیجا گیا ہوں، تاکہ یہاں میں آپ کو گائڈ کروں۔ اِس کے بعد اُس آدمی نے پروفیسر سنگھ کو اپنی گاڑی پر بٹھایا اور اُن کو لے کر یونی ورسٹی پہنچا۔ یونی ورسٹی میں پروفیسر سنگھ کو وہاں کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھیرایا گیا۔

اِس کے بعد وہ آدمی روزانہ پروفیسر سنگھ کے پاس آتا اور ان کو لے کر صبح سے شام تک یونی ورسٹی کے وسیع کیمپس میں گھماتا رہتا۔ اِس طرح وہ آدمی پروفیسر سنگھ کو یونی ورسٹی کے ہر شعبے میں لے گیا اور یونی ورسٹی کی ہر سرگرمی میں انھیں شامل کیا۔ مثلاً لائبریری، ڈائننگ ہال، کلاس روم، ٹیچرس کلب، اسٹوڈنٹس میٹنگ، یونی ورسٹی ورکرس، وغیرہ۔

اِس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ پروفیسر سنگھ کو تشویش ہوئی۔ انھوں نے اپنے ڈپارٹمنٹ کے چیئرمین سے کہا کہ میں ایک ہفتے سے یہاں ہوں۔ مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا، لیکن اب تک میرا انٹرویو نہیں ہوا۔ چیئرمین نے کہا کہ آپ کا انٹرویو ہو چکا ہے۔ ہم نے آپ کا سلیکشن کرلیا ہے، اور اب آپ کل سے ہمارے یہاں جوائن کر لیجیے۔ اِس کے بعد چیئرمین نے بتایا کہ ائرپورٹ پر ہمارا جو آدمی آپ سے ملا تھا، وہ یہاں کا سینئر پروفیسر تھا۔ اور وہی آپ کا انٹرویور بھی تھا۔

چیئرمین نے کہا کہ آپ کے بھیجے ہوئے کاغذات کو دیکھنے کے بعد ہم نے جان لیا تھا کہ

جہاں تک تعلیمی لیاقت کا تعلق ہے، آپ اس کے پوری طرح اہل ہیں۔ اب ہم کو یہ جاننا تھا کہ آپ ہمارے یونی ورسٹی کلچر کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ آپ کا مذکورہ انٹرویور یہی کام کر رہا تھا۔ وہ آپ کو یونی ورسٹی کے ہر شعبے میں لے گیا۔ اس نے یہاں کی تمام ایکٹوٹیز (activities) سے آپ کو متعارف کرایا۔ اس نے اسٹوڈنٹس اور ٹیچرس دونوں کے ساتھ آپ کے سلوک کو دیکھا۔ اِس دوران وہ آپ کی ہر بات کا دقّتِ نظر کے ساتھ معائنہ کرتا رہا۔ انٹرویور کی رپورٹ آپ کے بارے میں پوری طرح مثبت ہے۔ چناں چہ آپ کے ریکارڈ کو دیکھنے کے بعد ہم نے آپ کا انتخاب کرلیا ہے۔ آپ کل سے یہاں اپنا کام شروع کر دیں۔

یہ واقعہ ایک حقیقی مثال کی صورت میں، جنت اور انسان کے معاملے کو بتاتا ہے۔ خدا نے ایک وسیع دنیا بنائی، جنت کی دنیا۔ یہ دنیا پورے معنوں میں ایک کامل دنیا تھی۔ یہاں ہر چیز اعلیٰ معیار کے مطابق تھی۔ خدا نے چاہا کہ اِس کامل دنیا میں وہ ایسے لوگوں کو بسائے جو اپنے کردار کے اعتبار سے اُس کے لیے پوری طرح اہل ہوں، جو اِس معیاری دنیا میں معیاری انسان کی حیثیت سے رہ سکیں۔

اب خدا نے اِس دنیا کے تعارفی نمونے کے طور پر موجودہ زمینی سیّارہ بنایا۔ یہاں وہ ساری چیزیں پائی جاتی ہیں جو جنتی دنیا کے اندر موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جنتی دنیا، معیاری دنیا (perfect world) ہے اور موجودہ زمینی دنیا، غیر معیاری دنیا (imperfect world)۔ جنتی دنیا کامل ہے اور موجودہ زمینی دنیا غیر کامل۔ جنتی دنیا ابدی ہے اور موجودہ زمینی دنیا غیر ابدی۔ جنتی دنیا ہر قسم کے خوف اور حُزن سے خالی ہے، جب کہ موجودہ دنیا کا حال یہ ہے کہ وہ خوف اور حزن سے بھری ہوئی ہے۔ جنتی دنیا انعام (reward) کی دنیا ہے اور موجودہ دنیا آزمائش (test) کی دنیا۔

اِس منصوبے کے تحت، خدا نے انسان کو پیدا کرکے اس کو موجودہ زمینی دنیا میں بسایا۔ خدا نے انسان کو کامل آزادی دے دی۔ اُس نے انسان کو یہ موقع دیا کہ وہ یہاں کسی پابندی کے بغیر رہے۔ اُس کو اختیار ہے کہ وہ اپنی آزادی کو چاہے تو غلط طور پر استعمال کرے اور چاہے تو درست طور پر

استعمال کرے۔ ہر انسان جو زمین پر پیدا ہوتا ہے، اُس کے ساتھ خدا کے دو غیر مَرئی (invisible) فرشتے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ وہ انسان کے ہر قول اور عمل کا مکمل ریکارڈ تیار کررہے ہیں۔ اِسی ریکارڈ کی بنیاد پر اس کے لیے اگلی دنیا میں جنت یا جہنم کا فیصلہ ہوگا۔

جنتی دنیا میں انسان کامل آزادی کے ساتھ رہے گا، لیکن وہ اتنا زیادہ پختہ اور اتنا زیادہ باشعور ہوگا کہ وہ کسی بھی حال میں اپنی آزادی کا غلط استعمال نہیں کرے گا۔ وہ پوری طرح آزاد ہوتے ہوئے بھی پوری طرح ڈسپلن میں رہے گا۔ یہی وہ انسان ہے جس کے سلیکشن کے لیے موجودہ زمینی سیّارہ بنایا گیا۔ موجودہ دنیا میں بھی وہ سارے حالات پائے جاتے ہیں جو جنتی دنیا میں موجود ہوں گے۔ اب یہ دیکھا جارہا ہے کہ وہ کون انسان ہے جس نے ہر قسم کے حالات سے گزرتے ہوئے جنتی کیریکٹر کا ثبوت دیا۔ اُسی انسان کا انتخاب کرکے اس کو جنتی دنیا میں ابدی طور پر بسادیا جائے گا۔

ہر انسان کے ساتھ خدا کے غیر مرئی فرشتے لگے ہوئے ہیں اور وہ ہر لمحہ اس کا ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔ یہی انسان کا ٹسٹ ہے، اور اِسی ٹسٹ کے نتیجے کی بنیاد پر ہر آدمی کے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وہ ٹسٹ یہ ہے کہ آدمی ہر موقع پر خدا کی بڑائی کا اعتراف کرے، یعنی آدمی کے ضمیر نے جب اس کو ٹوکا تو اس نے ضمیر کی آواز کو مانا، یا اس کو نظر انداز کردیا۔ جب اس کے سامنے دلیل کے ساتھ ایک سچائی آئی تو وہ اس کے آگے جھک گیا، یا اس نے اس کے خلاف سرکشی دکھائی۔ جب اپنی انا اور سچائی کا مقابلہ ہوا تو وہ اپنی انا کے پیچھے چلا، یا اُس نے سچائی کا اعتراف کیا۔

اِسی طرح لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ انصاف پر قائم رہا، یا اپنے انٹرسٹ کی خاطر بے انصافی کرنے لگا۔ وہ صرف لوگوں کے سامنے اچھا بنا رہا، یا اپنی پرائیویٹ زندگی میں بھی وہ اچھائی پر قائم رہا۔ اس نے حق کو اپنا سپریم کنسرن بنایا، یا حق کے سوا کسی اور چیز کو وہ اپنا کنسرن بنائے رہا۔ اسی طرح یہ کہ جب اس کو اقتدار ملا تو وہ بگاڑ کا شکار ہوگیا، یا اقتدار کے باوجود اس نے اپنے آپ کو انصاف پر قائم رکھا۔ جب اس کو دولت حاصل ہوئی یا اس کو غریبی کا تجربہ ہوا تو دونوں حالتوں میں یکساں طور پر اس نے اعتدال کا ثبوت دیا، یا وہ اعتدال کے راستے سے ہٹ گیا۔ سماجی زندگی میں جب اس کو آگے کی

سیٹ ملی، اس وقت وہ کیسا تھا اور جب اس کو پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنا پڑا تب اس کا رویہ کیا تھا۔ اس نے اپنے جذبات اور اپنی خواہشوں کو اصول کا پابند رکھا، یا اصول سے ہٹ کر وہ اپنی خواہشوں کے پیچھے چلنے لگا۔ اِسی ریکارڈ کی بنیاد پر ہر عورت اور مرد کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

موجودہ زمینی دنیا ایک محدود مدت کے لیے بنائی گئی ہے۔ اِس مدت کے پورا ہونے کے بعد یہاں پیدا ہونے والے تمام انسان، خدا کے سامنے حاضر کیے جائیں گے۔ خدا، فرشتوں کے تیار کیے ہوئے ریکارڈ کے مطابق، ہر ایک کے مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ جس عورت یا مرد کا ریکارڈ بتائے گا کہ وہ زمینی دنیا میں جنتی کردار کے ساتھ رہا، اُس نے اپنی آزادی کو خدا کے مقرر کیے ہوئے دائرے کے اندر استعمال کیا اور اِس طرح یہ ثابت کیا کہ وہ جنتی دنیا کے ماحول میں بسائے جانے کے قابل ہے، ایسے لوگوں کو جنت کے باغوں میں رہنے کے لیے منتخب کرلیا جائے گا۔ اور وہ تمام لوگ جو جنتی کردار کا ثبوت نہ دے سکے، اُن کو رد کر کے کائنات کے ابدی کوڑے خانے میں ڈال دیا جائے گا، تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے مایوسی اور حسرت کی زندگی گزارتے رہیں اور کبھی اُس سے چھٹکارا نہ پاسکیں۔

ذہنی سکون کا راز

چارلس ڈیوک (Charles Mass Duke Jr.) ایک امریکی خلاباز (astronaut) ہیں۔ وہ 1935 میں امریکا (North Carolina) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اسپیس سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ 1966 میں ناسا (NASA) کے پانچویں خلاباز گروپ کے لیے منتخب کیے گئے۔ انھوں نے خلا (space) میں کئی پروازیں کیں۔ 1972 میں انھوں نے اپالو (Apollo-16) کے ذریعے چاند کا سفر کیا۔ 16 اپریل 1972 میں وہ چاند کی سطح پر اُترے۔

21 فروری 2008 کی شام کو ہماری ٹیم کے دو ممبر (رجت ملہوترا، سعدیہ خان) ڈاکٹر چارلس ڈیوک سے نئی دہلی کے اشوکا ہوٹل میں انٹرویو کے لیے ملے۔ ملاقات کے وقت انھوں نے اپنے دست خط کے ساتھ اپنی ایک تصویر دی۔ اِس تصویر میں وہ خلائی سوٹ میں چاند کی سطح پر کھڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تصویر اِس مضمون کے ایک الگ صفحے پر دیکھی جاسکتی ہے۔

ہماری ٹیم کے مذکورہ دونوں ممبروں نے امریکی خلاباز ڈاکٹر چارلس ڈیوک کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اِس انٹرویو کا موضوع اسپریچولٹی (spirituality) تھا۔ انٹرویو کے دوران اُن سے ایک سوال یہ کیا گیا کہ کیا آپ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں، اور آپ کو پُرمسرت زندگی حاصل ہے۔

اِس کے جواب میں امریکی خلاباز ڈاکٹر چارلس ڈیوک نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ — ابتدائی طور پر میری زندگی میں سکون نہ تھا۔ میں نے یہ سمجھا کہ چاند مجھ کو سکون دے گا۔ میں نے یہ سمجھا کہ خلابازی کی زندگی مجھے سکون عطا کرے گی۔ میں خلاباز (astronaut) بن گیا، مگر خلابازی کی زندگی نے مجھ کو سکون نہیں دیا۔ پھر میں نے سوچا کہ میں اپنا کیریر بدل دوں۔ میں نے ناسا (NASA) میں ایسٹروناٹ کا جاب چھوڑ دیا اور بزنس شروع کردیا۔ میں نے کافی دولت کمائی، مگر اب بھی میری زندگی میں سکون نہ تھا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب بھی

میری زندگی میں کوئی چیز مفقود ہے:

> I had no peace in life. I thought the moon would give me peace. I thought all these goals, all these accomplishments, this great career would give me peace, but it didn't, So I thought I'll change career. So I left NASA as an astronaut and went into business. Imade a lot of money but I still had no peace in my life. There was still something missing.
>
> (Charlse Duke Jr., New Delhi, February 21, 2008)

یہ معاملہ صرف ڈاکٹر چارلس ڈیوک کا نہیں، یہی موجودہ زمانے میں تمام لوگوں کا معاملہ ہے۔ موجودہ زمانے میں دولت اور شہرت اور اقتدار حاصل کرنے کے مواقع بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ لوگ نہایت تیزی کے ساتھ اِن چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے دوڑ رہے ہیں۔ بہت سے لوگ اِن چیزوں کو پانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سپر اچیورس (super achievers) کہا جاتا ہے۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ تمام سپر اچیور کا کیس سپر ناکامی (super failure) کا کیس تھا۔ سب کچھ پانے کے باوجود اِن لوگوں کو داخلی مسرت حاصل نہیں ہوئی۔ آخر کار وہ مایوسی کا احساس لے کر مر گئے۔

کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرنے کا زمانہ ہے۔ اِس صورتِ حال نے موجودہ زمانے میں ایک نئی اصطلاح پیدا کی ہے جس کو اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے والے (super achievers) کہا جاتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ہر بڑی کامیابی آخر میں صرف بڑی ناکامی (super failure) بن گئی۔ اِس قسم کے لوگ نئے قسم کے سنگین مسائل میں مبتلا ہوگئے۔ مثلاً مہلک بیماریاں، وغیرہ۔

اِنھیں نئے مسائل میں سے ایک ٹنشن (tension) یا اسٹریس (stress) ہے۔ لوگوں کے پاس دولت اور شہرت اور اقتدار سب کچھ موجود ہے، لیکن اِن ظاہری کامیابیوں کے باوجود لوگ مسلسل طور پر ٹنشن اور اسٹریس میں مبتلا رہتے ہیں۔ زیادہ دولت صرف زیادہ بیماری کا سبب بن رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ ریسرچ میڈیکل سائنس میں ہو رہی ہے، تاکہ نئی نئی بیماریوں کا علاج دریافت کیا جاسکے۔

اِس صورتِ حال کے نتیجے میں ایک نیا بزنس شروع ہوگیا ہے جس کو ڈی اسٹریسنگ (de-stressing) کہا جاتا ہے۔ اِن اداروں میں بڑے بڑے ماہرین، لوگوں کو اسٹریس سے نجات دینے کے لیے سرگرم ہیں۔لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ لوگوں کا ٹنشن اوراسٹریس بدستور بڑھتا جارہا ہے۔کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانے کا سب سے بڑا خطرہ تیسری عالمی جنگ کا خطرہ نہیں ہے، بلکہ ٹنشن اوراسٹریس کا خطرہ ہے۔

یہ صورتِ حال ہم کو قرآن کی ایک آیت کی یاد دلاتی ہے۔وہ آیت یہ ہے: اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ (13:28)۔ اِسی بات کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن الفاظ میں فرمایا: اللہم لاعیش إلاّ عیش الآخرۃ (صحیح البخاری، کتاب الرّقاق)۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدائے برتر ہی کو اپنا سپریم کنسرن (supreme concern) بنانے سے انسان کوسکون حاصل ہوتا ہے اور اپنی پسند کی جو زندگی انسان چاہتا ہے، وہ صرف موت کے بعد کے دورِحیات میں کسی انسان کو ملے گی۔موت سے پہلے کے دورِحیات میں کسی کو اپنی پسند کی زندگی ملنے والی نہیں۔

اِس معاملے کا براہِ راست تعلق خالق کے کریشن پلان (creation plan of God) سے ہے۔خالق نے موجودہ دنیا کوامتحان گاہ (testing ground) کے طور پر بنایا ہے۔موجودہ دنیا کسی کے لیے بھی اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی جگہ نہیں بن سکتی۔موجودہ دنیا ہرعورت اور مرد کے لیے سفر کا مرحلہ ہے،اور بعد کو آنے والی آخرت کی دنیااس کی ابدی منزل ہے۔

آپ،بس یا ٹرین یا ہوائی جہاز میں سفر کررہے ہوں اور اس کے اندر آپ گھر والی سہولتیں حاصل کرنا چاہیں،توآپ اس کو حاصل نہ کرسکیں گے۔کیوں کہ سواری صرف سواری ہے، وہ گھر کا بدل نہیں۔اِس طرح موجود دنیا میں خواہشوں کی تکمیل (fulfillment) کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔جو آدمی اپنی خواہشوں کی تکمیل چاہتا ہو، اس کو آخرت کے لیے کام کرنا چاہیے۔یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ (37:61)۔

تخلیق کس لیے

Creation For What

3 جنوری 2006 کی رات کو میں دہلی میں اپنی رہائش گاہ (سی۔29، نظام الدین ویسٹ) میں تھا۔ رات کو پچھلے پہر میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ امریکا کے صدر جارج بش جو نیئر، میرے پاس آتے ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ آپ میرے بیٹے کو پڑھا دیجئے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ میں ایک بڑے مکان میں ہوں۔ میں اس مکان کے اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں جاتا ہوں۔ وہاں جارج بش کے بیٹے مغربی لباس پہنے ہوئے میرے پاس آتے ہیں۔ ان کی عمر تقریباً بارہ سال ہے۔ بیٹے نے مجھ سے پہلا سوال یہ کیا:

Why was man created

نیند کھلی تو میں نے اس خواب پر غور کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آج کی پوری دنیا کا سوال ہو۔ آج پوری انسانیت شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سوال سے دوچار ہے۔ آج ہر انسان یہ جاننا چاہتا ہے کہ موجودہ دنیا میں اس کے آنے 0 کا حقیقی مقصد کیا ہے۔ زندگی کیا ہے اور موت کیا۔ کائنات کے وسیع نقشے میں اس کا مقام کیا ہے۔ وہ کون سا راستہ ہے جس پر چل کر وہ اپنی اس مطلوب منزل تک پہنچ سکتا ہے، جو اس کے دماغ میں بسی ہوئی ہے۔

وہ دنیا جس کو جدید دنیا کہا جاتا ہے، وہ پوری بشری تاریخ کا ایک انوکھا دور ہے۔ انسان ہر زمانے میں اپنے اندر کچھ آرزوئیں لے کر پیدا ہوتا تھا۔ وہ ان آرزوؤں کو صرف اپنی کہانیوں میں ظاہر کرسکتا تھا۔ مگر ساری عمر کی کوشش کے باوجود وہ ان آرزوؤں کی تکمیل نہیں کرسکتا تھا اور محرومی کے احساس کے ساتھ مرجاتا تھا۔

موجودہ دنیا میں بظاہر اِن آرزوؤں کی تکمیل کا سامان حاصل ہوچکا ہے۔ جس اڑن کھٹولے کا تصور صرف کہانیوں میں پایا جاتا تھا وہ اب ہوائی جہاز کی صورت میں ایک واقعہ بن چکا ہے۔ جو عالمی کمیونی کیشن صرف افسانوی کبوتر کے ذریعے متصور ہوتا تھا وہ اب جدید کمیونی کیشن

کے ذریعے ایک عملی واقعہ بن چکا ہے۔

یہی معاملہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہوا ہے۔ قدیم زمانے کے تمام خواب آج بظاہر واقعہ بن چکے ہیں۔ قدیم زمانے کے افسانوی شہر اب بظاہر عملاً بنائے جا چکے ہیں جن کے اندر دنیا بھر میں عورت اور مرد رہ رہے ہیں۔ قدیم زمانے کی افسانوی زندگی اب بظاہر واقعہ بن چکی ہے۔

لیکن جہاں تک حقیقی خوشی کا سوال ہے، انسان آج بھی حقیقی خوشی حاصل نہ کرسکا۔ درخت کی شاخوں پر چہچہانے والی چڑیاں خوش ہوں گی لیکن انسان اب بھی خوشی سے محروم ہے۔ آج دنیا کے بازار میں ہر چیز مل سکتی ہے، مگر سکون کا سرمایہ کسی بازار میں میسر نہیں۔

اِس اَلم ناک صورتِ حال کا واحد سبب ایک ہے۔ اور وہ ہے — صرف قبل از موت دورِ حیات (pre-death period) کو سامنے رکھ کر زندگی کو اکسپلین کرنے کی کوشش کرنا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا ایک بعد از موت دورِ حیات (post-death period) ہے، اور اس ابدی دورِ حیات کو شامل کیے بغیر زندگی کی اطمینان بخش توجیہہ کرنا ممکن نہیں۔

اصل یہ ہے کہ خالق کے کریشن پلان (creation plan) کے مطابق، انسان کی زندگی دو دَوروں میں تقسیم ہے — قبل از موت دَور، اور بعد از موت دَور۔ قبل از موت دَور کی مدتِ حیات گویا فصل بونے کی مدت ہے، اور بعد از موت دَور کی مدتِ حیات گویا پھل حاصل کرنے کی مدت۔ اِس دنیا کا قانون یہ ہے کہ فصل کے بغیر پھل نہیں اور پھل کے بغیر زراعت کی کوئی معنویت نہیں۔ انسانی زندگی کے اِس معاملے کو جانے بغیر، انسانی زندگی کی اطمینان بخش توجیہہ کرنا ممکن نہیں۔

قدیم شرک، جدید شرک

موجودہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی کے دو راستے ہیں — سیدھا راستہ اور بھٹکاؤ کا راستہ (16:9)۔ سیدھا راستہ یہ ہے کہ آدمی خالق کو اپنی زندگی میں مرکزی مقام دے، وہ خالق کو اپنا سب کچھ بنالے۔ بھٹکاؤ کا راستہ یہ ہے کہ آدمی مخلوق میں گُم ہوجائے، وہ مخلوق کی نسبت سے اپنی زندگی کا پورا نقشہ بنائے۔ پہلے طریقے کا نام توحید ہے، اور دوسرے طریقے کا نام شرک ہے۔ ہماری کائنات میں

صرف دو چیزیں ہیں — خالق اور مخلوق۔ خالق کو اپنا کنسرن بنانے کا مذہبی نام توحید ہے، اور مخلوق کو اپنا کنسرن بنانے کا مذہبی نام شرک۔

جیسا کہ معلوم ہے، انسانیت کے آغاز ہی سے ہر زمانے میں خدا کے پیغمبر آتے رہے اور انسان کو صحیح اور غلط کی رہ نمائی دیتے رہے۔ ہر پیغمبر کا مشن ایک ہی تھا — انسان کو توحید کی طرف بلانا، اور اس کو شرک سے بچنے کی تلقین کرنا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح ہر زمانے میں توحید ایک تھی، اسی طرح شرک بھی ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔

قدیم شرک یا شرک کا قدیم ورژن (ancient version of shirk) نیچر پرستی (nature worship) پر قائم تھا۔ نیچر کی حیثیت مخلوق کی ہے۔ قدیم زمانے کے انسان نے نیچر کو معبود کا درجہ دے دیا۔ وہ نیچر پرستی (nature worship) کی بُرائی میں مبتلا ہوگیا، یعنی خالق کی پرستش کے بجائے مخلوق کی پرستش کرنا۔ اِسی کو مظاہرِ فطرت کی پرستش کہا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں بھی یہ شرک اپنی پوری طاقت کے ساتھ موجود ہے۔ آج کا انسان بھی یہی کر رہا ہے کہ وہ خالق کے بجائے مخلوق کو اپنا سب کچھ (supreme concern) بنائے ہوئے ہے۔ قدیم شرک اور جدید شرک کے درمیان جو فرق ہے، وہ ظاہر کے اعتبار سے ہے، نہ کہ حقیقت کے اعتبار سے۔

قدیم انسان نے نیچر کو پرستش کا موضوع (object of worship) بنایا تھا۔ جدید انسان نے نیچر کو تفریح کا موضوع (object of entertainment) بنالیا ہے۔ جذباتِ عُبودیت کا مرکز پہلے بھی مخلوقات تھیں، اور اب بھی جذباتِ عبودیت کا مرکز مخلوقات ہیں۔

موجودہ زمانے کے انسان کا نظریہ یہ ہے کہ اپنے آج (now) میں خوش رہو، کل کی فکر چھوڑ دو۔ یہ ''آج'' کیا ہے۔ یہ وہی سامانِ حیات ہے جو ہم کو نیچر کی صورت میں ملا ہے۔ یہ سامانِ حیات خدا کی دی ہوئی نعمتیں ہیں۔ تفریح کے سامانوں میں سے کوئی بھی سامان انسان نے خود نہیں بنایا، وہ اس کو خالق کی طرف سے ملا ہے۔ یہ خالق ہے جو ساری چیزوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ آج کے انسان نے

یہ کیا کہ اُس نے نعمت (blessing) کو لیا، اور منعم (giver) کو چھوڑ دیا۔ یعنی خالق رُخی نظریے کو ترک کر کے، مخلوق رخی نظریے کو اختیار کرلیا۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ اُس کو جب کوئی چیز ملے تو وہ دینے والے کا اعتراف کرے۔ احساسِ تشکُّر (gratitude) انسان کی فطرت کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ موجودہ زمانے میں انسان نے دوبارہ یہ کیا کہ اُس نے اپنے احساسِ تشکر کو خالق کے بجائے مخلوق کی طرف موڑ دیا۔ جو قلبی اعتراف اس کو مُنعم کے لیے پیش کرنا چاہیے تھا، اُس کو وہ منعم کی پیدا کردہ مخلوق کے لیے پیش کرنے لگا۔

آج کل کے لوگوں کی باتیں سنیے، یا ان کی تحریریں پڑھیے تو بار بار اِس قسم کے نمونے سامنے آتے ہیں۔ ہر آدمی اپنے روزانہ کے تجربات میں اِس کے نمونے دیکھ سکتا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر میں ایک حوالہ نقل کروں گا۔

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (27 جنوری 2008) میں اِس موضوع پر ایک مضمون چھپا ہے۔ اِس کے لکھنے والے کا نام ڈونا (Donna Devane) ہے۔ اِس مضمون کا عنوان یہ ہے:

Be happy here and now.

آج کل کے زمانے میں انسان ایک عام مسئلے سے دوچار ہے۔ وہ ٹنشن یا اسٹریس (stress) ہے۔ یہ ٹنشن کیوں ہے، اِس کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کو اُس کی مطلوب خوراک نہیں دے رہا ہے۔ وہ خالق کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے بھرپور انتفاع کر رہا ہے، لیکن وہ خالق کا اعتراف نہیں کرتا۔ یہ بے اعترافی، یا عدم تشکر فطرت کے خلاف ہے۔

اِس لیے وہ انسان کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر ٹنشن یا اسٹریس کا سبب بنا ہوا ہے۔ موجودہ انسان نے اِس کا یہ غیر فطری حل دریافت کیا ہے کہ دینے والے کے بجائے، خود دی ہوئی چیزوں پر تشکر کا اظہار کرنا۔ مذکورہ مضمون اِسی جدید ذہن کی نمائندگی کر رہا ہے۔ چناں چہ اس میں

کہا گیا ہے کہ — تم ملی ہوئی چیزوں پر خوب تشکر کا اظہار کرو اور تم ٹنشن سے بچ جاؤ گے۔ اِس سلسلے میں مضمون نگار کے الفاظ یہ ہیں:

Gratitude feels my soul as I enjoy my computer, more about my home, enjoy the feeling of a hug from my daughter. There is so much to be grateful for each moment of each day. I find that where gratitude goes, joy flows, spend a few moments throughout the day with thought shifter statements. A few of the thought shifter statements that I use are— I am so happy and joyful to believe. I am so happy and grateful for this wonderful mind, and body that allows me to enjoy touch, taste, sound, and movement. I am so happy and grateful for my family, and friends, and the love we share. I am so happy and grateful for my home and utilities. I am so happy and grateful for my computer, my internet, my ability to type and share with friends all over the world.

انسان کے اندر جس طرح بھوک اور پیاس کا طاقت ور جذبہ موجود ہے، اُسی طرح یہ جذبہ بھی انسان کے اندر نہایت طاقت ور شکل میں موجود ہے کہ وہ اپنے محسن کے احسان کا اعتراف کرے۔ اپنی فطرت کے اعتبار سے انسان اِس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ اُس کو کسی سے کوئی بڑی چیز ملے اور وہ اس کا اعتراف نہ کرے۔ آدمی کا فطری مزاج یہ ہے کہ جب اُس کو کسی سے کوئی بڑا فائدہ پہنچتا ہے تو اس کی پوری شخصیت چاہتی ہے کہ چیخ کر وہ اس کا اعتراف کرے۔ یہ انسان کی ایک ایسی صفت ہے جس سے کوئی بھی عورت یا مرد خالی نہیں۔

انسان کے پاس جو کچھ ہے، وہ سب خدا کا عطیہ ہے۔ خواہ اس کا اپنا وجود ہو یا اس کے باہر کا وہ پورا نظام جس کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے، سب کا سب اس کو خدا کی طرف سے یک طرفہ عطیہ کے طور پر ملا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کی فطرت چاہتی ہے کہ وہ اِن تمام عطیات (blessings) کے لیے ان کے مُعطی (giver) کا بھرپور اعتراف کرے۔ اِن عطیات میں سے ایک قسم اُن عطیات کی ہے جو براہِ راست طور پر خدا کی طرف سے انسان کو مل رہے ہیں۔

مثلاً ہوااور پانی اور روشنی، وغیرہ۔اور دوسری چیزیں وہ ہیں جو بالواسطہ طور پر خدا کا عطیہ ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کو انسان نے عالمِ فطرت میں دریافت کر کے خدا کی دی ہوئی عقل کے ذریعے اُن کو مختلف قسم کی مصنوعات میں تبدیل کیا ہے۔مثلاً تمام قسم کے کنزیومر گُڈس (consumer goods)۔

یہ تمام عطیات تقاضا کرتے ہیں کہ انسان اپنے سارے دل اور سارے دماغ کے ساتھ اُن کا اعتراف کرے۔لیکن خود ساختہ فلسفوں کے تحت، انسان نے یہ کیا کہ اُس نے عطیات کو لیا، اور اُن کے معطی (giver) کو حذف کر دیا۔ یہ ایک بھیانک غلطی تھی۔اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی فطرت ایڈریس ہونے سے رہ گئی:

The human nature was left unaddressed.

یہ کسی انسان کے لیے ایک داخلی تضاد کا معاملہ ہے۔موجودہ زمانے میں تمام عورت اور مرد اِسی داخلی تضاد میں جی رہے ہیں۔موجودہ زمانے کا وہ مسئلہ جس کو ٹنشن اور اسٹریس کہا جاتا ہے، وہ براہِ راست طور پر اِسی داخلی تضاد کا نتیجہ ہے۔

اِس حقیقت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ** (13:28) یعنی اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے:

Peace of mind can be achieved only through the remembrance of God.

جنّت: ایک آفاقی تصور

پیراڈائز (جنت) کا تصور تمام انسانی سماجوں میں پایا گیا ہے۔ پیراڈائز تمام عورتوں اور مردوں کا ایک عالمی خواب ہے۔ ہر انسان جو پیدا ہوتا ہے، وہ ایک خوب صورت دنیا کا تصور لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اِسی کو پیراڈائز کہا گیا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان ایک متلاشیٔ جنت حیوان (Paradise-seeking animal) ہے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ پیراڈائز کا تصور ہر سماج میں اور ہر کلچر میں ہمیشہ پایا گیا ہے۔ اِس اعتبار سے پیراڈائز ایک عالمی لفظ ہے۔ معمولی تغیر کے ساتھ وہ ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ قرآن کا لفظ فردوس (18: 107) بھی خود پیراڈائز ہی کی ایک معرّب (Arabicized) صورت ہے۔ ذیل میں چند زبانوں کی مثالیں درج کی جاتی ہیں، جس سے پیراڈائز کی عالمی نوعیت کا اندازہ ہوگا:

Avesta	:	Pairidaêza	Persian	:	Firdaus
Greek	:	Paradeisas	Latin	:	Paradisus
French	:	Paradis	English	:	Paradise
Hebrew	:	Pardes	Akkadian	:	Pardesu
Aramaic	:	Pardaysa	Sanskrit	:	Paradesha
Arabic	:	Firdaus			

پیراڈائز (جنت) کا تصور انسانی فطرت میں اتنا زیادہ پیوست ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ پیراڈائز کو پانا، ہر عورت اور مرد کا مشترک خواب ہے، خواہ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور پر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر عورت اور مرد نے عالمِ تصور میں ایک انتہائی خوب صورت دنیا کو پہلے سے دیکھا ہے، اور اب وہ اِس دیکھی ہوئی جنت کو عملی طور پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انسان کی اِس خواہش کے تحت، پیراڈائز کے تقریباً ایک درجن ماڈل بن گئے ہیں۔ ہر انسان اپنے اِس معلوم ماڈل کو واقعاتی طور پر حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے۔

پیراڈائز کا مطالعہ میری پوری زندگی میں شامل رہا ہے۔ تاریخ میں پیراڈائز کے جتنے ماڈل بنائے گئے ہیں، تقریباً اُن سب کو میں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اپنے طویل مطالعے اور تجربے کے بعد پایا ہے کہ پیراڈائز کا صرف وہی ماڈل مطابقِ فطرت ماڈل ہے جو قرآن میں ملتا ہے۔ بقیہ تمام ماڈل یا تو فطرت سے مطابقت نہیں رکھتے، یا وہ صرف جزئی طور پر فطرت کے مطابق ہیں۔ اور یہ دونوں حالتیں اُن کو ناقابلِ قبول قرار دے دیتی ہیں۔

اِس فہرست میں صرف قرآن کا ماڈل واحد قابلِ قبول ماڈل ہے۔ اِسی لیے قرآن میں سچے انسانوں کی بابت یہ ارشاد ہوا ہے کہ خدا اُن کو ایسی جنت میں داخل کرے گا جس کی اُس نے اُنھیں خوب پہچان کرادی ہے: وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (47: 6)۔ جنت کے معروف ماڈلوں میں سے کون سا ماڈل درست ہے، اس کا معیار وہی اصول ہے جس کو اِس طرح کے معاملات میں سائنس میں استعمال کیا جاتا ہے، یعنی اصولِ مطابقت (principle of corroboration)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نظریے کی صحت کو معلوم کرنے کے لیے یہ کیا جائے گا کہ اُس کو تمام متعلق (relevant) واقعات یا مظاہر کی نسبت سے جانچا جائے گا۔ اگر یہ نظریہ تمام متعلق چیزوں سے مطابقت (corroborate) کر رہا ہو تو اس کو درست مان لیا جائے گا اور اگر کوئی ایک واقعہ بھی اس نظریے سے مطابقت نہ کرے تو اس نظریے کو غلط قرار دے کر اُس کو رد کر دیا جائے گا۔

یہی واحد اصول ہے جس کی روشنی میں پیراڈائز کے مختلف تصورات کا مطالعہ کر کے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اُن میں سے کون سا نظریہ درست نظریہ ہے۔ ذیل میں اِسی اصول کی روشنی میں پیراڈائز کے مختلف ماڈلوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اِس مطالعے سے واضح ہو جائے گا کہ سائنٹفک طریقِ مطالعہ کے مطابق، اِن میں سے کون سا ماڈل علمی طور پر قابلِ قبول ماڈل ہے۔

بدھسٹ ماڈل

سب سے پہلے بُدھسٹ ماڈل (Buddhist model) کو لیجئے۔ بدھ ازم میں اگرچہ مہایانا (Mahayana) اسکول کو چھوڑ کر، بقیہ کسی اسکول میں پیراڈائز کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔

لیکن اصولی طور پر بدھ ازم میں پیراڈائز کا تصور موجود ہے۔ بدھ ازم کے نظریے کے مطابق، انسان پُنر جنم (re-birth) کے ذریعے لمبا ارتقائی سفر کرتا ہے۔ اِس ارتقائی سفر کے دوران وہ ہر قسم کی خواہشوں سے مکت ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ انسانی ارتقا کی آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے، جو بدھسٹ نظریے کے مطابق، ابدی سعادت (eternal bliss) کی منزل ہے۔

مگر یہ بدھسٹ ماڈل واضح طور پر انسانی فطرت کے مطابق نہیں۔ انسان ایک باشعور مخلوق ہے۔ انسان کے لیے اعلیٰ یافت وہی ہوسکتی ہے جو شعور کی سطح پر اُس کو ملے، لیکن بدھسٹ ماڈل میں لاکھوں سال کا پورا سفر، اور آخری منزل سب بے شعوری کی حالت میں طے ہوتے ہیں۔ انسان نہ تو حالتِ سفر میں شعوری طور پر اِس عمل (process) سے باخبر رہتا ہے اور نہ وہ سفر کے خاتمے پر شعوری طور پر اس کا تجربہ کرتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بدھسٹ ماڈل انسان کے لیے ناخوش گوار باتوں سے بے خبری کا سُکھ (blissful ignorance) ہے، وہ انسان کے لیے حقیقی معنوں میں مطلوب سعادت نہیں۔

یہودی ماڈل

اس کے بعد یہودی ماڈل (Jewish model) کو لیجئے۔ اِس ماڈل میں اگر چہ پیراڈائز کا تصور موجود ہے، لیکن اس کا نقص یہ ہے کہ موجودہ یہودیت کے مطابق، اس کی بنیاد ایک مخصوص نسل پر رکھی گئی ہے۔ موجودہ یہودیت کا ماننا ہے کہ یہودی نسل ایک منتخب گروہ (chosen people) کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی منتخب گروہ پیراڈائز کا حق دار ہے۔ یہ تصور انسان کی آفاقی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اِس لیے علمی اعتبار سے وہ درست نہیں قرار پاسکتا۔

مسیحی ماڈل

یہی معاملہ کرسچن ماڈل (Christian model) کا ہے۔ موجودہ مسیحیت میں پیراڈائز کے وجود کو مانا گیا ہے۔ لیکن موجودہ مسیحیت کے مطابق، پیراڈائز کا استحقاق عقیدۂ کفّارہ (atonement) سے جڑا ہوا ہے، یعنی آدم کی خطا کے بعد تمام انسان پیدائشی طور پر گنہ گار اور پیراڈائز سے محروم ہو چکے ہیں۔ اب پیراڈائز صرف ان عورتوں اور مردوں کے لیے ہے، جو اِس عقیدے کو مانیں کہ

مسیح مصلوب ہوکر اُن کی طرف سے ان کے تمام گناہوں کا کفّارہ بن گئے ہیں۔

موجودہ مسیحیت کا یہ تصور بھی انسانی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ پیدائشی گناہ (original sin) کا نظریہ ایک فلسفیانہ نکتہ تو ہوسکتا ہے، لیکن وہ انسان کی فطرت کے اعتبار سے بالکل اجنبی ہے۔ انسان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ جو شخص کوئی بُرا عمل کرے، وہی اپنے عمل کی سزا بھگتے۔ گناہ کوئی اور شخص کرے اور اس کی گنہ گاری پیدائشی طور پر کسی اور شخص تک پہنچ جائے، یہ وراثتی گنہ گاری (hereditary sin) ہے۔ اور وراثتی گنہ گاری کا نظریہ انسانی فطرت سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا۔

تہذیبی ماڈل

اِسی طرح ایک ماڈل وہ ہے جس کو تہذیبی ماڈل (civilizational model) کہا جاسکتا ہے۔ تہذیب (civilization) سے مراد ہے — سماجی ترقی کا برتر مرحلہ:

An advanced stage or system of social development.

موجودہ زمانے میں جب تہذیبی ترقی یہاں تک پہنچی کہ نئی قسم کی ٹکنالوجی اور نئی قسم کی ترقی انسان کی دست رس میں آگئی، تو یہ سمجھا جانے لگا کہ اب پیراڈائز کے لیے ایک اور دنیا کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب اِسی دنیا میں انسان اپنی پیراڈائز آپ بناسکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ انسان اب اِس پوزیشن میں ہوگیا ہے کہ وہ اپنی پیراڈائز آپ بناسکے۔ لیکن جلد ہی یہ خواب منتشر ہوگیا۔ بیسویں صدی عیسوی کے آخر میں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ پیراڈائز کو تعمیر کرنے والی انڈسٹری اپنے آخری اسٹیج میں پہنچ کر ایک نئے قسم کا جہنم وجود میں لانے کا سبب بن رہی ہے۔ اس نئے جہنم کا نام موجودہ زمانے میں گرین ہاؤس گیس (green house gas) ہے، یعنی دنیا کا ایسی مضر گیسوں سے بھر جانا جس میں انسان کی زندگی ہی ممکن نہ رہے۔

اِس تجربے نے بتایا کہ پیراڈائز کو وجود میں لانے کے لیے بے کثافت انڈسٹری (pollution free industry) درکار ہے، اور تمام تجربات بتاتے ہیں کہ بے کثافت انڈسٹری کو وجود میں لانا انسان کے لیے سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اس طرح تہذیبی جنت کا نظریہ،

پیراڈائز کو وجود میں لانے سے پہلے ہی اپنی آخری ناکامی کے ساتھ ختم ہوگیا۔

بھلاوہ کلچر

پیراڈائز کے معاملے میں ایک اور قسم کا تصور بہت اہم ہے۔ اس کو تمثیل کی زبان میں آسٹرچ پیراڈائز (ostrich paradise) کہا جاسکتا ہے۔ یہ اُن لوگوں کا تصور ہے جن کے سامنے پیراڈائز کی بات کہی جائے تو وہ اپنا یہ فارمولا پیش کردیں گے — آج کی بات آج، کل کی بات کل۔ اُن کا کہنا ہے کہ ابھی اور آج جو کچھ مل رہا ہے، اُس کو حاصل کرو۔ ایک لفظ میں اُن کا فارمولا یہ ہے:

right here, right now

ان کی زندگی اِس نظریے پر مبنی ہے کہ — محنت سے پیسہ کماؤ اور عیش کی زندگی گزارو:

work hard, party hard

اِس نظریے کی صحت کو جانچنے کے لیے ہمیں اس کو نتیجہ (result) کے نقطۂ نظر سے دیکھنا ہوگا، اور جب نتیجے کے پہلو سے اِس نظریے کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے سے قابلِ عمل ہی نہیں۔ جو لوگ اِس قسم کے الفاظ بولتے ہیں، وہ خود اِس کا مثبت نتیجہ حاصل کرنے میں ناکام ہیں۔ بظاہر یہ خوب صورت الفاظ ہر ایک کے لیے صرف منفی نتیجہ لے کر سامنے آئے ہیں۔

اِس قسم کے لوگ زیادہ پیسہ کماتے ہیں، مگر زیادہ پیسہ صرف ان کے لائف اسٹائل اور ان کی غذائی عادت (food habit) کو بگاڑ دیتا ہے، جس کے نتیجے میں شوگر، بلڈ پریشر اور کینسر جیسی مہلک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ زیادہ پیسہ کما کر یہ لوگ اپنا اسٹریس (stress) دور کرنے کے لیے آؤٹنگ پر جاتے ہیں، لیکن جب وہ اپنی آؤٹنگ سے لوٹتے ہیں تو ان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نیا مسئلہ ہالی ڈے اسٹریس (holiday stress) کی صورت میں لے کر واپس آئے ہیں۔

زیادہ پیسہ کما کر وہ اپنی شاپنگ کو بڑھاتے ہیں، لیکن اُس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ سطحی چیزوں میں اپنی مشغولیت کی وجہ سے اُس چیز سے محروم ہوجاتے ہیں، جس کو اعلیٰ سوچ (high thinking) کہا جاتا ہے۔ زیادہ پیسہ کما کر وہ لَو افئر (love affair) کا کلچر چلاتے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ برعکس طور پر

ہیٹ افیر (hate affair) کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے لوگ فیملی لائف کی خوشی سے یک سر محروم ہو کر رہ جاتے ہیں، وغیرہ۔

بالفرض اِس قسم کا کوئی انسان اپنے نظریے کے منفی انجام سے بچ جائے، تب بھی یہ واقعہ تو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ لازمی طور پر پیش آتا ہے کہ وہ سو سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی بوڑھا ہو کر بستر پر پڑ جاتا ہے اور اس کا انجام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اسپتال میں داخل ہو جائے اور پھر اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک دن اِس دنیا سے چلا جائے۔

اِس کی ایک مثال 12 جنوری 2008 کے اخبارات میں سامنے آئی ہے۔ نیوزی لینڈ کے سر ایڈ منڈ ہیلیری نہایت طاقت ور انسان تھے۔ جب وہ کوہ پیمائی کرتے ہوئے دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ایورسٹ (Everest) پر پہنچ گئے تو ساری دنیا کے اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر چھپی۔ وہ فاتحِ ایورسٹ کہے جانے لگے۔ جب انھوں نے ایورسٹ کی چوٹی پر قدم رکھا تھا تو اس وقت اُن کی زبان سے یہ پُرفخر الفاظ نکلے تھے:

To my great delight, I realized we were on top of Mount Everest and the whole world spread out below us.

(*The Times of India*, New Delhi, January 12, 2008, p. 12)

لیکن 11 جنوری 2008 کو جب 88 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا تو وہ اسپتال کے بستر پر ایک نہایت کم زور انسان کی حیثیت سے پڑے ہوئے تھے اور ان کے سامنے اس کے سوا کوئی اور انتخاب (option) نہ تھا کہ موت کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے وہ اپنے تمام اثاثے اور اپنی تمام تمناؤں کے ساتھ اِس دنیا کو چھوڑ کر ایک ایسی دنیا میں چلے جائیں، جس کا سامنا کرنے کے لیے اُن کے پاس بظاہر کچھ بھی موجود نہ تھا۔

قرآنی ماڈل

اب پیراڈائز کے بارے میں قرآنی ماڈل (Quranic model) کو لیجیے۔ اِس معاملے میں قرآن کا ماڈل، خدا کے تخلیقی پلان (creation plan of God) پر مبنی ہے۔ قرآن کے مطابق،

خداوندِ عالم کا تخلیقی پلان اور پیراڈائز دونوں ایک دوسرے سے پوری طرح جُڑے ہوئے ہیں۔ اِسی لیے قرآن کے مطابق، پیراڈائز کے معاملے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو خداوندِ عالم کے تخلیقی پلان کی روشنی میں سمجھا جائے۔

قرآن، خدا کی کتاب ہے۔ وہ پوری طرح اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔ قرآن کے مطابق، خدا نے انسان کو بنایا اور اس کو موجودہ زمین پر آباد کیا۔ یہ آبادکاری بطور امتحان تھی، نہ کہ بطور انعام، یعنی یہ آبادکاری اِس لیے تھی کہ دنیا کی عارضی زندگی میں انسان اپنے آپ کو پیراڈائز کا اہل ثابت کرے اور پھر موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا میں اس کو اس کے عمل کے مطابق، پیراڈائز میں بسایا جائے۔

اِس اعتبار سے موجودہ دنیا گویا کہ ایک انتخابی میدان (selection ground) ہے۔ یہاں آدمی کو مختلف قسم کے احوال میں رکھ کر جانچا جارہا ہے کہ کون اپنے عمل سے اِس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہے۔ جو لوگ اِس جانچ میں پورے اتریں، ان کو منتخب کرکے جنت کی ابدی دنیا میں داخل کردیا جائے گا۔ اور جو لوگ اِس جانچ میں ناکام ہوگئے، اُن کو ابدی طور پر کائنات کے کوڑے خانے (جہنم) میں ڈال دیا جائے گا۔

قرآن کے مطابق، یہ جنت ابدی ہوگی اور اِسی کے ساتھ ایک معیاری اور آئڈیل جنت۔ یہاں یہ ممکن ہوگا کہ انسان ہر قسم کے خوف اور ہر قسم کے حزن سے بچ کر زندگی گزارے۔ جنت کی یہ دنیا ہر قسم کے ناموافق حالات (disadvantages) اور ہر قسم کی محدودیت (limitations) سے خالی ہوگی۔ یہاں انسان وہ سب کچھ پالے گا جس کی تمنا وہ اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔

جنت کی اِس دنیا میں آدمی کی تمام خواہشیں (desires) پوری ہوں گی۔ یہاں اُس کو مکمل فلفل مینٹ (fulfilment) حاصل ہوگا۔ موجودہ دنیا میں بھی اگر چہ تمام اچھی چیزیں موجود ہیں، لیکن یہ دنیا ایک غیر معیاری دنیا (imperfect world) ہے، جب کہ جنت کی دنیا ہر اعتبار سے ایک معیاری دنیا (perfect world) ہوگی۔ جنت کی دنیا میں نہ شور ہوگا اور نہ کسی قسم کی کثافت۔ یہ دنیا ہر قسم کی منفی باتوں سے خالی ہوگی۔ موجودہ دنیا ایک ناقص دنیا ہے، اور جنت ایک کامل دنیا ہوگی۔ اور کسی معاملے میں

ناقص نمونے کا وجود میں آنا، اپنے آپ اِس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں کامل نمونہ بھی وجود میں آسکتا ہے۔ یہی ہے جنت کا قرآنی ماڈل۔ یہ ماڈل بلاشبہہ فطرت کے تقاضے سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ وہ تمام متعلق مظاہر سے مطابقت (corroborate) کررہا ہے۔

پیراڈائز کے قرآنی ماڈل کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں آدمی کامل شعور کے ساتھ اور اپنے مائنڈ کی اعلیٰ ترقیاتی سطح پر جیئے گا۔ یہ جنت انسان کے لیے نہ کوئی محدود دنیا ہوگی اور نہ ایسا ہوگا کہ وہ شعور سے کم تر کسی سطح پر اُس کو حاصل ہوگی۔

پیراڈائز کے بارے میں قرآنی ماڈل کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ کوئی پراسرار (mysterious) جگہ نہیں ہوگی، بلکہ وہ ہماری دنیا جیسی ایک جگہ ہوگی۔ قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ جنت میں وہ تمام اچھی چیزیں اہلِ جنت کو ملیں گی، جو اُنھیں دنیا کی زندگی میں ملی تھیں، مگر یہ تمام چیزیں نہایت اعلیٰ صورت میں ہوں گی۔ اِسی طرح جنت میں اس کے باشندوں کو ہر قسم کی سرگرمیوں کا موقع ہوگا، مگر یہ سرگرمیاں اوّل سے آخر تک پُرکیف ہوں گی۔ وہاں نہ کوئی بورڈم ہوگا اور نہ کوئی تکان۔ مزید یہ کہ دنیا میں آدمی چیزوں سے محظوظ ہونے کی بہت کم طاقت رکھتا ہے۔ جنت میں ایسا ہوگا کہ وہاں کے باشندوں کو چیزوں سے انجوائے کرنے کی لامحدود طاقت حاصل ہوگی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ پیراڈائز کے قرآنی ماڈل میں انسان، خدا کے پڑوس میں رہنے کا موقع پالے گا، جو کہ ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کا اتھاہ خزانہ ہے۔

معرفت کا سفر

نومبر 1959 کا واقعہ ہے۔آر یہ سماج نے اپنی گولڈن جُبلی (golden jubilee) منائی۔ اِس سلسلے میں مختلف مقامات پران کے پروگرام ہوئے۔بجنور (سیوہارہ) میں 29 نومبر 1959 کو ایک آل مذاہب کانفرنس ہوئی۔ اِس میں مختلف مذاہب کے نمائندوں کو بلایا گیا۔اُن سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے مذہب کی روشنی میں ایک سوال کا جواب دیں۔وہ سوال یہ تھا— گیان کا آغاز کس طرح ہوا:

How was the beginning of knowledge.

اِس کانفرنس کی دعوت پر راقم الحروف نے اس میں شرکت کی، اِس سفر میں میرے ساتھ مولانا محمد عبدالحی رام پوری (وفات: 1987) بھی تھے۔اِس کانفرنس کی دعوت پر راقم الحروف نے اس میں شرکت کی اوراسلامی تعلیمات کی روشنی میں وہاں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر ''اسلام کا تعارف'' کے نام سے ایک پمفلٹ کی صورت میں چھپ چکی ہے۔اِس کانفرنس کے چیرمین مراد آباد کے ایک ہندو وکیل تھے۔وہ خود بھی آر یہ سماج کے ایک ممبر تھے۔انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ— تمام تقریروں میں صرف ایک تقریر تھی جو موضوع سے متعلق (relevant) تھی اور وہ مولانا صاحب کی تقریر تھی۔بقیہ تقریروں میں اصل سوال کا جواب نہیں دیا گیا۔

اُس وقت میں نے انگریز مصنف جولین ہکسلے (Sir Julian Sorell Huxley) (وفات: 1979) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ کچھ لوگ زندگی اور کائنات کوصرف ایک حادثاتی چیز سمجھتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ چھ بندر ایک ایک ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جائیں اور ملین اور ملین سال تک الل ٹپ طریقے سے ان کو پیٹتے رہیں،تو ہوسکتا ہے کہ ان کے سیاہ کیے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں کسی صفحے پر شیکسپئر کی ایک نظم (Sonnet) نکل آئے۔ اِس طرح ملین اور بلین سال تک مادّے کے اندھے عمل کے دوران بالکل اتفاق سے یہ دنیا بن گئی ہے۔

اِس طرح کی مثالیں یہ تاثر پیدا کرنے کے لیے دی جاتیں ہیں کہ اِس دنیا میں زندگی کا سفر

کوئی شعوری سفر نہیں، وہ صرف بے شعوری کا ایک معاملہ ہے۔ افکار کی تاریخ اتفاقی اسباب کے تحت پیش آنے والے ایک بے شعوری سفر کی کہانی ہے۔ لیکن راقم الحروف کے مطالعے کے مطابق، یہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معرفت کا سفر مکمل طور پر شعور کے تحت پیش آنے والا ایک سفر ہے۔ وہ ایک ابتدائی منزل سے اپنی آخری منزل کی طرف چلا جا رہا ہے۔ معرفت کا سفر انسان کی ایک شعوری ضرورت ہے۔ یہ ہر انسان کی ایک ذاتی ضرورت ہے، خواہ اس نے اِس کا اعلان کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

گیان (معرفت) کے آغاز کا سوال ایک نہایت سنجیدہ سوال ہے۔ میں برابر اِس تلاش میں رہا ہوں کہ اِس سوال کا زیادہ واضح جواب معلوم کروں۔ یہ سوال میرے ذہن میں تقریباً 40 سال تک رہا۔ حال میں انتھراپالوجی (Anthropology) کے ایک سروے میں مجھے اس کا جواب ملا۔ محققین کے مطابق، یہ جواب آرکیالوجی کے شواہد (archaelogical findings) پر مبنی ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ اسٹون ایج (stone age) میں دو آدمیوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مارنے کے لیے ایک دوسرے کی طرف پتھر پھینکا۔ دونوں پتھر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ اِس ٹکرانے کے سبب سے وہاں اسپارکنگ (sparking) ہوئی، یعنی دونوں پتھروں کے ٹکرانے سے چنگاری نکلی۔ یہ ظاہرہ دونوں آدمیوں کے لیے نیا تھا۔ اب وہ دونوں آپس کا اختلاف بھول کر وہاں بیٹھ گئے اور دو پتھروں کو آپس میں ٹکرا کر چنگاری نکالنے لگے۔

دو پتھروں کے ٹکرانے سے چنگاری کیوں نکلتی ہے۔ اِس کا سبب یہ نہیں ہے کہ خود اِن پتھروں کے اندر پہلے سے چنگاری موجود ہوتی ہے اور وہ ٹکراؤ کے وقت ان کے اندر سے نکل آتی ہے، بلکہ اِس چنگاری کا سبب خارج میں ہے۔ اصل یہ ہے کہ فضا میں مختلف قسم کی گیسیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہوا اِن گیسوں کا مجموعہ ہے۔ اِن میں سے ایک گیس وہ ہے جس کو ہائڈروجن (hydrogen) کہا جاتا ہے۔ ہائڈروجن ایک بھڑک اٹھنے والی گیس (inflammable gas) ہے۔ جب پتھر کے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ٹکرایا جاتا ہے تو فضا میں موجود ہائڈروجن کا کچھ حصہ اِس ٹکراؤ کی زد میں آجاتا ہے اور اچانک بھڑک اٹھتا ہے۔

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اگر یہ واقعہ پیش آیا تو بلاشبہہ یہی وہ واقعہ تھا جس سے انسانی تاریخ میں گیان (معرفت) کا آغاز ہوا۔ اِس واقعے کا ایک نہایت اہم پہلو تھا، وہ یہ کہ اس واقعے نے انسان کو بتایا کہ معلوم یا مشہود دنیا کے ماورا ابھی ایک دنیا موجود ہے:

There is an invisible dimension beyond the visible world.

یہ مسئلہ ہسٹری آف تھاٹ (History of Thought) سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، ہسٹری آف تھاٹ کے بارے میں ماضی کے بہت کم واقعات تاریخ میں ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ اِس لیے اس معاملے میں کوئی تفصیلی نقشہ نہیں بنایا جا سکتا۔ تاہم قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالباً یہی واقعہ تھا جس سے انسانوں کے درمیان گیان (معرفت) کے سفر کا آغاز ہوا اور پھر ایک کے بعد ایک، چیزیں دریافت ہوتی چلی گئیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہر دریافت نے صرف یہ بتایا کہ اس کے آگے بھی علم کی کوئی سطح موجود ہے جو ابھی تک دریافت نہیں ہوئی:

Every discovery tells us that there is something more to discover.

مثلاً حضرت مسیح سے ہزار سال پہلے عراق میں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے وقت کے بادشاہ نمرود (Nemrud) کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا کہ یہ خدا ہے جو سورج کو مشرق کی طرف سے نکالتا ہے اور اس کو مغرب کی طرف لے جاتا ہے۔ کوئی انسان اس نظام کو بدلنے پر قادر نہیں۔ یہ سادہ انداز میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ تھا جس کو بعد کے زمانے میں علماءِ فلکیات (astronomers) نے دریافت کیا، یعنی زمین اپنے لمبے مدار (orbit) پر گردش کرنے کے علاوہ اپنے محور (axis) پر گھومتی ہے جس سے رات کے بعد دن پیدا ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی آخری بات نہ تھیں۔ اس دریافت نے انسان کے اندر مزید جستجو کے دروازے کھولے اور بعد کو خلائی اجرام کے بارے میں نئی نئی دریافتیں ہوئیں۔

اِسی طرح تیسری صدی قبل مسیح میں یونان میں مشہور اسکالر ارشمیدس (Archimedes) پیدا ہوا۔ اس کے ہم عصر بادشاہ نے اس کو حکم دیا کہ وہ اِس سوال کا جواب دے کہ کشتی پانی میں کیسے تیرتی ہے اور

اس کا قانون کیا ہے۔ ارشمیدس اِس سوال کا جواب تلاش کرنے میں مشغول ہوگیا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ وہ پانی کے ٹب میں نہا رہا تھا۔ اِس دوران ایک موقع پر اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا جسم پانی کے اوپر تیر رہا ہے۔ اس پر غور کرتے ہوئے اس نے وہ سائنس دریافت کی جس کو ہائیڈرواسٹیٹک (hydro static) کہا جاتا ہے۔ اس دریافت کا خلاصہ یہ تھا کہ جب پانی میں کوئی چیز ڈالی جاتی ہے تو وہ پانی کی جتنی مقدار کو ہٹاتی (displace) ہے، اسی کے بقدر وہاں اوپری دباؤ (upward pressure) پیدا ہوتا ہے۔ اِسی فطری عمل کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ کشتی پانی میں تیرنے لگتی ہے:

> Hydrostatics: upward thrust exerted on a body immersed in fluid equals weight of fluid displaced.

اِس طرح، انسان ایک کے بعد ایک دریافتیں کرتا رہا، مگر یہ تمام دریافتیں طبیعیات کے دائرے میں تھیں۔ آخر کار معلوم ہوا کہ طبیعیات (physics) کے ماورا ابھی ایک دنیا ہے۔ اِس فوق الطبیعی دنیا کے بارے میں عام ذرائع سے کچھ معلوم نہیں کیا جاسکتا۔ اِس طرح ایک وقت آیا، جب کہ انسانی سائنس اپنی آخری حد پر پہنچ گئی۔ اِس آخری حد کے بعد علم کا جو اگلا مرحلہ ہے، اِس میں سائنس براہِ راست مددگار نہیں ہوسکتی۔

یہی وہ مقام ہے، جہاں سے پیغمبرانہ رہنمائی کی حد شروع ہوتی ہے۔ آدمی طبیعیات کی دنیا میں بطور خود واقفیت حاصل کرسکتا ہے، لیکن بالائے طبیعیات جو دنیا ہے، اس کے بارے میں صرف پیغمبر کے ذریعے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ پیغمبر، خدائی وحی کے ذریعے بولتا ہے، نہ کہ انسانی تجربات کے ذریعے۔ یہ پیغمبرانہ رہنمائی اب قرآن کی شکل میں موجود ہے جو محفوظ کلام الٰہی کی حیثیت رکھتا ہے۔

افکار کی تاریخ

فلسفے کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ قدیم یونان میں اس کا ابتدائی نشو ونما ہوا۔ یونانی فلاسفہ عام طور پر یہ سمجھتے تھے کہ مادّہ (matter) قدیم ہے، یعنی وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے یونانی فلسفی ارسطو (Aristotle) کا نظریہ یہی تھا۔ بعد کو یونان کے باہر بھی

بڑے بڑے دماغ پیدا ہوئے، جنھوں نے فلسفے کے شعبے میں نمایاں کام انجام دیے۔ تاہم یہ تمام لوگ مادّہ (matter) کو قدیم سمجھنے میں مشترک (common) تھے۔ مگر بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں پہنچ کر کائنات کا یہ قدیم مادّی تصور (material concept) ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا، وہ برطانی عالمِ فلکیات سر جیمز جینز (وفات: 1946) کے الفاظ میں یہ تھا کہ — علم کا دریا میکانکل حقیقت (mechanical reality) سے نان میکانکل حقیقت (non-mechanical reality) کی طرف چلا جا رہا ہے (*The Mysterious Universe*, p. 138)۔

مذکورہ مادّی تعبیر کے تحت یہ نظریہ بنا کہ ہمیں خدا جیسے کسی وجود کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ جس فکری ضرورت کے تحت خدا کے وجود کو مانا جا رہا تھا، وہ خود اب مادہ (matter) کے ذریعے پوری ہو رہی ہے۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ مادّہ نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا۔ تمام موجودات، مادّہ کے اندر اِسی طبیعی اور کیمیاوی سرگرمیوں (physical and chemical activities) کا نتیجہ ہیں۔

مگر بیسویں صدی کے رُبع اوّل میں بگ بینگ (Big Bang) کا نظریہ دریافت ہوا۔ بِگ بینگ کے نظریے نے بتایا کہ پندرہ بلین سال پہلے خلا میں ایک سُپر ایٹم ظاہر ہوا۔ پھر اچانک اس میں ایک دھماکہ (explosion) ہوا۔ اِس سُپر ایٹم کے بے شمار ذرات وسیع خلا میں بکھر گئے، پھر یہ ذرات مختلف فلکیاتی اَجسام (astronomical bodies) کی صورت میں اَن گنت تعداد میں اکھٹا ہوئے، اِس طرح ہماری کائنات وجود میں آئی۔ بِگ بینگ کے نظریے نے کائنات کی قدیم مادّی تعبیر کا خاتمہ کر دیا۔ اب خالص علمی اعتبار سے یہ ماننا ممکن ہو گیا کہ اِس کائنات کا ایک خالق موجود ہے۔ وہی اس کو کنٹرول کر رہا ہے اور وہی اس کو انتہائی بامعنیٰ طور پر چلا رہا ہے۔

سر آئزاک نیوٹن (وفات: 1727) کو ماڈرن سائنس کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ نیوٹن کے بعد سائنس میں جو نیا دور آیا، اُس میں کچھ نئی حقیقتیں دریافت ہوئیں۔ انھیں میں سے ایک حقیقت وہ ہے جس کو ضابطۂ ناکارگی (Law of Entropy) کہا جاتا ہے۔ اِس طبیعی قانون نے یہ ثابت کیا کہ کائنات اپنی عمر کے لحاظ سے لامحدود (endless) نہیں ہے۔ اس کی ایک مدت ہے اور

اِس مدت کے پورا ہونے پر اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

میری مراد اُس قانون سے ہے جس کو حرکیاتِ حرارت کا دوسرا قانون (second law of thermodynamics) کہا جاتا ہے۔ اِس طبیعی قانون کو دوسرے لفظوں میں، ضابطۂ ناکارگی (Law of Entropy) کہتے ہیں۔ یہ قانون ثابت کرتا ہے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود نہیں ہو سکتی۔ ضابطۂ ناکارگی بتاتا ہے کہ حرارت مسلسل باحرارت وجود سے بے حرارت وجود میں منتقل ہوتی رہتی ہے، مگر اِس چکر کو الٹا نہیں چلایا جاسکتا۔ ناکارگی، دستیاب توانائی (available energy) اور غیر دستیاب توانائی (unavailable energy) کے درمیان تناسب کا نام ہے۔ اور اِس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اِس کائنات کی ناکارگی برابر بڑھ رہی ہے اور ایک وقت ایسا آنا مقدر ہے، جب کہ تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی اور کوئی کارآمد توانائی باقی نہ رہے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کیمیائی اور طبیعی عمل کا خاتمہ ہو جائے گا اور زندگی بھی اُسی کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: *God Arises*، صفحہ 27)

مگر اکیسویں صدی کے آغاز میں صورتِ حال یک سر بدل گئی۔ پچھلے ہزاروں سال کے درمیان فلاسفہ اور مفکرین اور سائنس دانوں نے تہذیبی جنت کو وجود میں لانے کا جو خواب دیکھا تھا، وہ اپنی تکمیل سے پہلے ختم ہو گیا۔ ثابت شدہ حالات کے مطابق، اب اس کی تکمیل کا کوئی امکان نہیں۔

ہزاروں سال سے انسان کا یہ خواب تھا کہ وہ اپنے لیے اِس دنیا میں ایک بہتر زندگی بنائے۔ انسان کی اِس تمنا نے وہ چیز پیدا کی جس کو تہذیب (civilization) کہا جاتا ہے۔ تہذیب کا یہ سفر اپنی واضح صورت میں اُس وقت شروع ہوا، جب کہ انسان نے پہیہ (wheel) دریافت کیا۔ لمبے سفر کے بعد تہذیب یہاں تک پہنچی کہ صنعتی انقلاب وجود میں آگیا اور انسان، موٹر کار اور ہوائی جہاز کے ذریعے تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر طے کرنے لگا۔

1970 میں الون ٹافلر کی کتاب فیوچر شاک (*Future Shock*) چھپی۔ اِس میں مصنف نے یہ اعلان کیا کہ انسانی تہذیب اب انڈسٹریل دور سے نکل کر سپر انڈسٹریل دور میں داخل ہونے والی ہے۔

یہ گویا انسان کے تہذیبی سفر کا آخری مرحلہ ہوگا، جب کہ انسان کے تمام مادّی خواب پورے ہوجائیں گے اور انسان مادی راحت کے تمام سامان پالے گا، مگر جلد ہی گلوبل وارمنگ کا ظاہرہ سامنے آیا اور یہ منصوبہ تکمیل سے پہلے ہی ختم ہوگیا۔

جیسا کہ معلوم ہے، موجودہ زمانے کی تمام مادی ترقیاں جدید صنعتی انقلاب کے ذریعے حاصل ہوئی ہیں۔ یہ جدید صنعتی دور، مشینوں کے ذریعے وجود میں آیا ہے۔ پہلے انسان، فطرت کی پیداوار پر زندگی گزارتا تھا۔ فطرت کا کارخانہ کوئی مسئلہ پیدا کیے بغیر انسان کو اپنی پیداوار دے رہا تھا۔ مگر صنعتی دور میں انسانی ساخت کی مشینوں کو متحرک رکھنے کے لیے مسلسل ایندھن (fuel) کی ضرورت تھی۔ انسانی ساخت کی اِن مشینوں کے حرکت میں آنے سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ وہ کاربن ایمیشن (carbon emission) کا مسئلہ تھا۔ شروع میں یہ مسئلہ بظاہر کوئی سنگین مسئلہ نظر نہیں آتا تھا، لیکن اکیسویں صدی عیسوی کے آتے ہی یہ مسئلہ انتہائی سنگین صورت اختیار کرگیا۔

مثال کے طور پر قدیم زمانے میں انسان، فطرت کے فراہم کردہ گھوڑے اور اونٹ پر سواری کرتا تھا۔ یہ گھوڑے اور اونٹ کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتے تھے۔ گھوڑے اور اونٹ فطرت کی پلوشن فری انڈسٹری (pollution free industry) میں پیدا ہوتے تھے اور خود بھی کوئی پلوشن (کثافت) پیدا کیے بغیر ساری عمر اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ اِس کے مقابلے میں، موجودہ زمانے کی کار اور ہوائی جہاز انسانی ساخت کے کارخانوں میں بنائے گئے ہیں۔ یہ کارخانے لازمی طور پر مہلک قسم کی فضائی کثافت پیدا کرتے ہیں۔ یہ کثافت اب بڑھتے بڑھتے اُس خطرناک نقطے تک پہنچ گئی ہے، جہاں سے اُس کے لیے واپسی ممکن نہیں۔ اب انسان کے لیے اس کی تاریخ کا اگلا مرحلہ صرف یہ ہے کہ وہ موجودہ دنیا سے گزر کر اگلی دنیا میں پہنچ جائے۔

سورہ التین کا پیغام

قرآن کی سورہ التین میں اللہ کے تخلیقی منصوبہ (creation plan of God) کو بتایا گیا ہے۔اس سورہ کا متن اور ترجمہ یہ ہے: وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ○ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ○ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ○ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ○ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ○ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (95:1-8) یعنی قسم ہے تین کی اور زیتون کی اور طورِسینا کی اور اس امن والے شہر کی۔ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچے پھینک دیا۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔تو اب کیا ہے جس سے تم بدلہ ملنے کو جھٹلاتے ہو۔کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں۔قرآن کے اِس بیان کے مطابق، انسان کو بہترین شخصیت کے ساتھ پیدا کیا گیا،لیکن اس کے بعد انسان کو ایک ایسی دنیا میں ڈال دیا گیا جو انسان جیسی مخلوق کے لیے اسفل سافلین کی حیثیت رکھتی تھی:

We have created man in the best of mould, then We cast him down as the lowest of the low.

اسفل سافلین میں ڈالنے سے کیا مراد ہے۔اِس کا جواب قرآن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے۔قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آدم اور اُن کی بیوی حوا کو پیدا کرنے کے بعد پہلے جنت میں رکھا گیا۔ اس کے بعد اُن کو (اوران کی نسلوں کو) موجودہ دنیا (planet earth) میں منتقل کر دیا گیا۔اِس سلسلے میں آیت کے الفاظ یہ ہیں: قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا (2:38) یعنی ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اترو (زمین پر)۔قرآن کی اِن دونوں آیتوں میں ایک گہری مشابہت ہے۔ "رددنا" اور "اھبطوا" دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں۔اِس لفظی مشابہت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسفل سافلین سے مراد یہی موجودہ زمین ہے۔اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو جنتی مخلوق کی حیثیت سے

پیدا کیا گیا، پھر اس کو ایک مخصوص منصوبے کے تحت سیارۂ زمین کے اوپر بسا دیا گیا جو کہ تخلیق کے اعتبار سے، جنتی انسان کا ہیبی ٹیٹ (habitat) نہ تھا۔ اسفل سافلین سے مراد کوئی پراسرار چیز نہیں، اس سے مراد موجودہ زمین ہے جو انسان جیسی مخلوق کا مسکن (habitat) نہیں۔

ہیبی ٹیٹ کی اہمیت

ہیبی ٹیٹ کیا ہے۔ ہیبی ٹیٹ ایک ارضیاتی اصطلاح ہے۔ اِس سے مراد وہ جغرافی مقام ہے جو کسی حیوان یا کسی پودے کے لیے فطری طور پر موزوں ہو:

Habitat: The natural abode of an animal or plant.

گویا ہیبی ٹیٹ زمین کا وہ مخصوص علاقہ ہے جو کسی جان دار مخلوق کے لیے موزوں جائے قیام کی حیثیت رکھتا ہو، جہاں وہ حالات موجود ہوں جس میں کوئی جان دار مخلوق بھرپور طور پر نشوونما پاسکے۔

اخروی حقیقتوں کو قابلِ فہم بنانے کے لیے خالق نے دنیا کی زندگی میں حیوانات کے ہیبی ٹیٹ کا ظاہرہ (phenomenon) قائم کیا ہے۔ حیوانات اپنے ہیبی ٹیٹ میں پرسکون طور پر رہتے ہیں۔ ہیبی ٹیٹ کے باہر ان کو سکون نہیں ملتا۔ اس کی ایک مثال مچھلی ہے۔ مچھلی ایک جان دار مخلوق ہے اور اس کا فطری ہیبی ٹیٹ پانی ہے۔ مچھلی پانی کے اندر پرسکون طور پر رہتی ہے، لیکن اگر مچھلی کو پانی کے باہر رکھ دیا جائے، مثلاً کسی محل میں، کسی گارڈن میں، کسی صوفہ سیٹ پر، کسی کار یا ہوائی جہاز میں تو ہر جگہ وہ تڑپتی رہے گی۔ لیکن جیسے ہی آپ اس کو دریا یا سمندر میں ڈالیں، وہ فوراً پرسکون ہو کر اس میں تیرنے لگے گی۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ مچھلی اپنی ساخت کے اعتبار سے ہوا سے آکسیجن نہیں لے سکتی۔ مچھلی کے لیے آکسیجن حاصل کرنے کا ذریعہ صرف تحلیل شدہ آکسیجن (dissolved oxygen) ہے جو پانی کے اندر فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔

موجودہ دنیا انسان کا ہیبی ٹیٹ نہیں۔ انسان کے خالق نے انسان کو احسن تقویم پر پیدا کیا ہے، جب کہ موجودہ دنیا اِس کے مطابق نہیں۔ انسان اور اس کے رہائشی سیارہ کے درمیان اِسی تبایُن (disparity) کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ زمین انسان کا فطری ہیبی ٹیٹ نہیں۔ انسان کو اِس دنیا میں

اُس مچھلی کی طرح رہنا پڑتا ہے جو پانی کے باہر کسی غیر آبی جگہ پر ہو- اگر چہ اِس دنیا میں پھل اور میوے ہیں، اگر چہ اس دنیا میں سرسبز پہاڑ ہیں، اگر چہ اِس دنیا میں متمدن آبادیاں ہیں، پھر بھی انسان کو اِس دنیا میں ذہنی سکون حاصل نہیں- انسان اپنی زندگی کے اِس تباین پر غور کرے تو وہ ایک عظیم حقیقت کو دریافت کرے گا، وہ یہ کہ موجودہ دنیا اس کا ہیبی ٹیٹ نہیں-

اسفل سافلین کیا ہے

اِس نکتے کو ذہن میں رکھ کر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اسفل سافلین سے مراد کوئی پراسرار چیز نہیں ہے- اس سے مراد یہی موجودہ زمین ہے- موجودہ زمین کا اسفل سافلین ہونا خود زمین کی نسبت سے نہیں، بلکہ وہ انسان کی نسبت سے ہے- انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے، معیار پسند ہے- موجودہ زمین چوں کہ ہر اعتبار سے آئڈیل سے کم (less than ideal) ہے، اِس لیے عملاً وہ انسان جیسی مخلوق کے لیے اسفل سافلین بن جاتی ہے- اِس نکتے کی وضاحت کے بعد سورہ التین کا پورا مفہوم واضح ہوجاتا ہے- اِس سورہ کے ابتدائی الفاظ علامتی الفاظ ہیں- اِس میں انجیر اور زیتون کے الفاظ سے زمین کی روئیدگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس کی بنا پر یہاں پھل اور اناج جیسی چیزیں پیدا ہوتی ہیں- جبلِ طور سے مراد زمین کے لیے پہاڑوں کی وہ اہمیت ہے جس کا ذکر قرآن کے مختلف مقامات پر کیا گیا ہے- بلدِ امین سے مراد موجودہ زمین کی وہ صلاحیت ہے جس کی بنا پر یہاں شہر آباد ہوتے ہیں اور انسانی تہذیب ظہور میں آتی ہے-

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمین ایک استثنائی کرہ ہے- یہاں جو حالات ہیں، وہ کائنات کے کسی اور کرہ پر موجود نہیں- مگر یہاں ایک فرق ہے، وہ یہ کہ انسان اپنی ذات میں ایک معیار پسند مخلوق ہے، جب کہ موجودہ زمین دار الامتحان کے طور پر بنائی گئی ہے، اِس لیے وہ انسانی معیار کے مطابق نہیں- یہی وجہ ہے کہ موجودہ دنیا انسان کے لیے عملاً دار الکبد بن جاتی ہے، یعنی ایک ایسی دنیا جہاں انسان کو چین اور سکون حاصل نہیں- یہ صورتِ حال بتاتی ہے کہ انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک عدم مطابقت (disparity) پائی جاتی ہے- موجودہ زمین پر انسان کی حیثیت ایک ایسے طالب کی ہے جس کا مطلوب اس کو یہاں حاصل نہیں- یہ صورت حال بتاتی ہے کہ انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان

ایک عدم مطابقت (disparity) پائی جاتی ہے۔موجودہ زمین پر انسان کی حیثیت ایک ایسے طالب کی ہے جس کا مطلوب اس کو یہاں حاصل نہیں۔یہی وجہ ہے کہ اِس زمین پر پیدا ہونے والے تمام عورت اور مرد بے سکونی کی زندگی گزارتے ہیں اور اِسی حال میں مر جاتے ہیں۔یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اللهم لا عيش إلا عيش الآخرة(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1805)یعنی انسان کو اس کی مطلوب زندگی تو صرف آخرت میں مل سکتی ہے۔

قرآن کی اِس سورہ میں اسفل سافلین کا لفظ خارجی حالات کی نسبت سے نہیں آیا ہے، بلکہ وہ انسان کی اپنی داخلی نفسیات کی نسبت سے آیا ہے،یعنی ایک ایسی مخلوق جو اپنی تخلیق کے اعتبار سے، احسنِ تقویم ہے،اس کے لیے یہ دنیا عملاً اسفل سافلین کے ہم معنی بن جاتی ہے۔انسان کے لیے یہاں رہنا ایسا ہی ہے جیسے مچھلی کا پانی کے باہر رہنا۔

انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان یہ عدم مطابقت ایک سراغ (clue) ہے۔ وہ عدم مطابقت یہ ہے کہ انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے، جس ہیبی ٹیٹ کا طالب ہے، زمین اس کے لیے وہ ہیبی ٹیٹ نہیں ۔یہ عدم مطابقت انسانی زندگی کا ایک ایسا پہلو ہے جس پر غور کرکے انسان ایک عظیم حقیقت کو دریافت کرسکتا ہے،یعنی یہ حقیقت کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اپنے آپ کو کامیاب بنانے کے لیے اس کو کیا کرنا چاہئے ۔

سورہ کے اگلے الفاظ اِسی بات کا جواب ہیں۔سورہ کے اگلے الفاظ یہ ہیں: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۔یعنی جو لوگ اللہ کے تخلیقی منصوبے کو دریافت کریں اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کی تشکیل کریں تو موت کے بعد وہ ایک ایسی دنیا (جنت) میں داخل کیے جائیں گے، جو اُن کا مطلوب ہیبی ٹیٹ ہوگا اور اِس بنا پر وہاں عدم مطابقت کا مسئلہ باقی نہ رہے گا۔اِس دنیا میں اُن کو اپنی مطلوب زندگی مل جائے گی جس کو قرآن میں غیر ممنون اجر (unending award) کہا گیا ہے۔

اجر غیر ممنون

قرآن کی اِس آیت میں ’اجرِ غیر ممنون‘ کا لفظ ایک ذو معنی لفظ ہے، یعنی بلاغت کے

اصول کے مطابق ، اِس لفظ میں مذکور معنی کے ساتھ ایک غیر مذکور معنی بھی پوشیدہ ہے، یعنی اجر غیر ممنون کے ساتھ اجرِ ممنون کا تصور، یا غیر منقطع اجر کے ساتھ منقطع اجر کا تصور۔

اِس آیت میں آخرت کے اجر کو غیر ممنون (غیر منقطع) اجر بتایا گیا ہے۔ یہ لفظ دنیا کے اجر کے مقابلے میں آیا ہے، کیوں کہ دنیا کا اجر ممنون (منقطع) اجر ہے اور آخرت کا اجر، غیر ممنون (غیر منقطع) اجر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دنیا کا اجر عارضی اجر ہے اور آخرت کا اجر ابدی اجر۔ یہ فرق بے حد اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے اجر کا ممنون (منقطع) اجر ہونا ہی وہ چیز ہے جو دنیا کو اسفل سافلین بنا دیتا ہے، کیوں کہ انسان کا معیار پسند ذہن معیار سے کم پر راضی نہیں ہوتا۔ انسان اپنے مزاج کے اعتبار سے صرف معیار پر مطمئن ہوسکتا ہے، معیار سے کم پر مطمئن ہونا بہ اعتبار مزاج اس کے لیے ممکن نہیں۔ انسان کا یہی مزاج ہے جو موجودہ دنیا کو اس کے لیے دار الکبد بنا دیتا ہے۔ موجودہ دنیا مطلق معنوں میں دار الکبد نہیں ہے۔ انسان کے معیار پسندانہ ذہن کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا اس کو ایک ایسی جگہ محسوس ہونے لگتی ہے جو گویا کہ اس کے لیے دار الکبد ہو۔ اللہ نے دنیا کو دار الکبد کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے، یہ انسان کا اپنا مزاج ہے جس کی بنا پر دنیا اس کو دار الکبد نظر آتی ہے۔ یہ معاملہ انسان کی نسبت سے ہے، نہ کہ تخلیق کی نسبت سے۔

سورہ کے آخر میں فرمایا: اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ ۔اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں جو عدم مطابقت ہے یا طالب کو اس کا مطلوب حاصل نہیں، یہ خالق کی حکیمانہ شان کے خلاف ہے۔ لازماً ایسا ہونا چاہیے کہ خالق کی حکیمانہ شان کا ظہور ہو، اِس عدم مطابقت کا خاتمہ ہو اور طالب کو اس کا مطلوب مل جائے۔ آخرت اِسی شانِ خداوندی کے ظہور کا دن ہے۔

خلاصۂ کلام

سورہ التین میں جو بات رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ کے الفاظ میں کہی گئی ہے، وہی بات دوسری سورتوں میں دوسرے الفاظ میں کہی گئی ہے۔ مثلاً لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ اور اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ وغیرہ۔ قرآن کے الفاظ پوری انسانی تاریخ پر منطبق ہوتے ہیں۔ اول دن سے اب تک جو

عورت یا مرد اس کرۂ ارض پر پیدا ہوئے، اُن سب کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا کہ آخر کار وہ محدود مدت کے بعد مر گئے اور اُن کی بنائی ہوئی دنیا بالکل اجڑ گئی۔ اِس معاملے میں کسی بھی انسان کا کوئی استثنا نہیں۔

تاریخ کا یہ تجربہ ایک سوالیہ نشان ہے، بلکہ سب سے بڑا سوالیہ نشان، وہ یہ کہ انسان احسنِ تقویم کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ تمام مخلوقات میں افضل مخلوق اور مکرم مخلوق ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جو اپنی ساخت کے اعتبار سے، معیار پسند (idealist) اور کمال پسند (perfectionist) واقع ہوا ہے۔ یہ انسانی شخصیت کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان جس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ اس کا ہیبی ٹیٹ نہیں۔ ایک سائنس داں کے الفاظ میں، بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان بھٹک کر ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہے جو اس کے لیے نہیں بنائی گئی تھی:

It appears that man has strayed into a world that was not made for him.

انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان یہ عدم مطابقت ہر عورت اور مرد کے لیے دعوتِ فکر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر آدمی حقیقی معنوں میں حق کا متلاشی ہو تو انسانی زندگی کا یہ پہلو اس کے لیے ایک ایسا سراغ (clue) بن جائے گا جس پر غور کرتے ہوئے وہ زندگی کی اصل حقیقت کو دریافت کر لے۔ اِس دریافت کے بعد اس کو معلوم ہوگا کہ موجودہ دنیا اس کے لیے صرف ایک عارضی قیام گاہ ہے، وہ اس کا ہیبی ٹیٹ نہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اِس کا مستحق بنائے کہ موت کے بعد اس کو ابدی جنت میں داخلہ ملے جو کہ انسان کا اصل ہیبی ٹیٹ ہے۔

جنت کی نرسری

کسی انسان کے لیے اس دنیا میں سب سے پہلی جاننے کی چیز یہ ہے کہ وہ یہ دریافت کرے کہ جس ہستی نے انسان کو اور اس دنیا کو بنایا ہے، اس کی اسکیم آف تھنگس (scheme of things) کیا ہے۔ قرآن خدا کی کتاب ہے۔ قرآن کے مطالعے سے جو چیز معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ خدا نے سب سے پہلے ایک وسیع اور معیاری دنیا بنائی جس کا نام جنت (Paradise) ہے۔ پھر اس نے انسان کو پیدا کیا اور انسان کو اس جنت میں بسایا۔

انسان کو خدا نے مکمل آزادی (freedom of choice) عطا کی۔ انسان سے یہ مطلوب تھا کہ وہ خالق کا اعتراف کرے، وہ خود اپنے اختیار سے سلف ڈسپلنڈ (self disciplined) زندگی گزارے۔ لیکن انسان اِس امتحان میں پورا نہیں اترا۔ اُس نے آزادی کا غلط استعمال کیا۔ اس کے بعد خدا نے انسان کے بارے میں دوسرا اصول مقرر کیا۔ پہلے انسان کو عمومی بنیاد (general basis) پر جنت میں بسایا گیا تھا، لیکن جب انسان مقرر کردہ معیار پر پورا نہیں اترا تو اس کے بعد خدا نے یہ طے کیا کہ انسان کے لیے جنت کا فیصلہ انتخابی بنیاد (selective basis) پر کیا جائے، یعنی صرف اُن افراد کو جنت میں آباد کیا جائے جو سلف ڈسپلن (self discipline) کے مطلوب معیار پر پورے اتریں۔ اس مقصد کے لئے خدا نے ابدی جنت کے سوا ایک اور عارضی دنیا بنائی۔

یہ عارضی دنیا ہمارا موجودہ سیارۂ ارض (planet earth) ہے۔ سیارۂ ارض گویا ابدی جنت کو فیڈ (feed) کرنے کے لئے عارضی قسم کی ایک زندہ نرسری (living nursery) ہے۔ اس سیارۂ ارض پر انسان گویا پودے (plants) کی مانند اگائے جاتے ہیں۔ اُن کو یہاں کے مختلف حالات میں محدود مدت کے لئے زندگی گزارنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اِس مدت میں انسان فرشتوں کے سپر وژن (supervision) میں ہوتا ہے۔ فرشتے مسلسل واچ (watch) کرتے ہیں کہ کوئی انسان مختلف حالات میں کس قسم کا رسپانس (response) دے رہا ہے اور اپنے اندر کس قسم کی پرسنالٹی کی

تشکیل کر رہا ہے۔ پھر جو فرد (individual) اپنے قول وعمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ مطلوب معیار کے مطابق ہے، اس کو عارضی نرسری سے نکال کر جنت کی ابدی باغ میں نصب کر دیا جاتا ہے، تاکہ وہ وہاں جنت کے ماحول میں فروغ پائے اور ابدی طور پر ترقی کا سفر طے کرتا رہے۔ موت وہ دن ہے جب کہ کسی فرد کو سیارۂ ارض سے ٹرانسفر کر کے ابدی جنت میں پہنچا دیا جائے۔

دو دنیائیں

قرآن کی سورہ الذاریات میں تخلیق کا ایک اصول اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: **وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ** (51:49) یعنی ہم نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

فطرت کا یہ نظام ہے کہ یہاں تمام چیزیں جوڑے جوڑے کی صورت میں پیدا کی گئی ہیں۔ اِسی طرح موجودہ دنیا بھی دو دنیا (pair world) کی صورت میں بنائی گئی ہے۔ سیارۂ ارض (planet earth) اس کا ایک جوڑا ہے۔ اس کا دوسرا جوڑا آخرت کی دنیا ہے، جہاں جنت (paradise) واقع ہے۔ جنت موجودہ دنیا کا تکمیلی حصہ (complementary part) ہے۔ جنت کے بغیر موجودہ دنیا ناقابلِ فہم ہے، لیکن جنت کے ساتھ وہ پوری طرح قابلِ فہم بن جاتی ہے۔

جنت کی نرسری

خالق نے ایک عظیم دنیا بنائی۔ یہ دنیا ہر لحاظ سے آئڈیل اور پرفکٹ تھی۔ اِس دنیا کا نام جنت ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنت آدم کی تخلیق سے پہلے بنائی گئی (2:35)۔ اس کے بعد خالق نے چاہا کہ وہ اُن عورتوں اور مردوں کا انتخاب کرے جو اِس جنتی دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ اِس مقصد کے لیے خالق نے سیارہ ارض بنایا۔ یہ سیارہ ارض گویا جنتی دنیا کی نرسری (nursery) ہے۔ نرسری اُس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں پودے اگائے جائیں اور پھر منتخب پودوں کو وہاں سے نکال کر اُن کو باغ میں نصب کیا جائے:

Nursery: A place where plants are reared for transplantation.

موجودہ زمین اِسی قسم کی ایک نرسری ہے۔ یہاں مسلسل طور پر انسان پیدا کیے جا رہے ہیں۔ زمین پر وہ تمام حالات رکھے گئے ہیں جو نرسری کی حیثیت سے اس کے تقاضے پورے کرنے والے ہیں۔ ہر عورت اور مرد اپنے عمل سے اپنے اندر مثبت شخصیت یا منفی شخصیت کی تعمیر کر رہے ہیں۔ موت وہ وقت ہے جب کہ ایک ''پودا'' اپنی مدت پوری کرنے پر نرسری سے اکھاڑ دیا جائے، پھر اگر وہ نامطلوب شخصیت بنا ہے تو اس کو رد کر دیا جائے اور اگر اس نے اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کی ہے تو اس کو وہاں سے نکال کر جنت میں بسا دیا جائے — موجودہ دنیا اِس لیے ہے، تا کہ یہاں ایک فرد اپنے آپ کو اسپریچول شخصیت کی حیثیت سے تیار (develop) کرے اور پھر جنت میں وہ اسپریچول تہذیب کا ابدی حصہ بن جائے۔

جنت کی دنیا انسان کی اصل منزل ہے۔ موجودہ عارضی دنیا نرسری (nursery) کی مانند ہے۔ یہاں پیدا ہونے والے عورت اور مرد کی حیثیت گویا نرسری کے پودے کی ہے۔ اِس محدود مدت میں جو ''پودے'' صحت مندی کا ثبوت نہ دیں، ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا اور جو ''پودے'' اپنی نشوونما کے دوران صحت مند ثابت ہوں، اُن کو باعزت طور پر موجودہ عارضی دنیا سے منتقل کر کے آخرت کی ابدی دنیا میں پہنچا دیا جائے گا، یعنی جنت کی دنیا میں۔ اِس حقیقت کو ایک اور آیت میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ (67:2) یعنی اللہ، جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا، تا کہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر بے شمار عورت اور مرد پیدا ہوتے ہیں۔ وہ محدود مدت تک زندگی گزار کر مر جاتے ہیں، یہ ساری بھیڑ خالق کا مطلوب نہیں۔ خالق کا مطلوب صرف وہ فرد ہے جو اِس امتحانی دورِ حیات میں یہ ثابت کرے کہ وہ پورے معنوں میں احسن العمل (best in deeds) ہے۔ زمین کی حیثیت نرسری کی ہے، اِس لیے یہاں ہر قسم کے پودے اگتے ہیں۔ لیکن جنت کی حیثیت مطلوب منزل کی ہے، اِس لیے وہاں صرف وہی استثنائی افراد بسائے جائیں گے جن کو اُن کے ریکارڈ کی بنیاد پر منتخب کیا جائے۔

موجودہ دنیا میں جو انسان پیدا ہوتا ہے، وہ گویا نرسری کا ایک پودا ہے۔ ایک محدود مدت تک وہ اِس ابتدائی دنیا میں رہتا ہے۔ اِس دوران اُس کے ساتھ مختلف قسم کے حالات گزرتے ہیں۔ یہ حالات گویا اُس کے لیے تربیتی کورس (training course) ہیں۔ یہ حالات اس کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کرے۔ موت اِس تربیتی کورس کے خاتمے کا اعلان ہے۔ جو انسان اِس ملی ہوئی مدت کے دوران اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کرلے، اس کو نرسری سے نکال کر دوسری دنیا میں ابدی طور پر بسا دیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ مطلوب انداز میں اپنی تعمیر نہ کرسکیں، اُن کو نرسری سے نکال کر باہر پھینک دیا جائے گا۔

اِس دنیا کے لیے خالق کا نشانہ اجتماعی نہیں ہے، بلکہ انفرادی ہے۔ اِس اعتبار سے، یہ کہنا درست ہوگا کہ موجودہ دنیا تعمیر نظام کے لیے نہیں ہے، بلکہ وہ تعمیر شخصیت کے لیے ہے۔ یہاں صرف تعمیرِ شخصیت ممکن ہے، آئڈیل معنوں میں تعمیرِ نظام یہاں سرے سے ممکن ہی نہیں۔ انسانی زندگی کی یہی تعبیر صحیح تعبیر ہے۔ اِس کے صحیح ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس کو ماننے کی صورت میں زندگی کے تمام سوالات کا قابلِ فہم جواب مل جاتا ہے:

With this description of human life, everything falls into place.

ایک حدیث

تخلیق کا یہ منصوبہ قرآن وحدیث میں مختلف انداز سے بتایا گیا ہے۔ ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ اِس سلسلے کی دو روایتیں یہ ہیں:

1۔ عن ابن مسعود قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لقيتُ إبراهيم ليلة أسري بي- فقال يا محمد، أقرئ أمتك مني السلام، وأخبرهم أن الجنة طيبة التربة، عذبة الماء، وأنها قيعان، وأن غراسها: سبحان الله، والحمد لله، ولا إله إلا الله، والله أكبر -(سنن الترمذي، رقم الحديث: 105)

حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا کہ معراج کی رات میں میری ملاقات حضرت ابراہیم سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اے محمد، اپنی امت کو میرا اسلام پہنچا دو۔ اور اُن کو بتاؤ کہ جنت کی مٹی بہت پاکیزہ مٹی ہے، اس کا پانی بہت میٹھا ہے اور وہ ایک ہموار میدان ہے۔ اس کا پودا سبحان الله، و الحمدلله، و لا إله إلا الله، و الله أكبر ہے۔

2۔ عن أبي أيوب الأنصاري أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة أسري به مرّ على إبراهيم، فقال من معك يا جبريل، قال: هذا محمد- فقال له إبراهيم: مُر أمتك فليكثروا من غراس الجنة، فإن تربتها طيبة و أرضها واسعة- قال: وما غراس الجنة، قال: لاحول ولا قوة إلا بالله- (مسند أحمد، رقم الحديث: 7966)

حضرت ابوایوب انصاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات میں حضرت ابراہیم کے پاس سے گزرے۔ انھوں نے کہا کہ اے جبریل، یہ تمھارے ساتھ کون ہیں۔ جبریل نے کہا کہ یہ محمد ہیں۔ حضرت ابراہیم نے آپ سے کہا کہ اپنی امت کو بتاؤ کہ وہ جنت میں کثرت سے پودے لگائیں، کیوں کہ جنت کی مٹی بہت پاکیزہ ہے اور اس کی زمین بہت وسیع ہے۔ آپ نے پوچھا کہ جنت کا پودا کیا ہے؟ حضرت ابراہیم نے کہا کہ: لا حول و لا قوة إلا بالله۔

مذکورہ روایات میں جنت کے لیے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں— قیعان اور ارضِ واسعہ۔ دونوں کا مفہوم ایک ہے، یعنی وسیع اور ہموار زمین۔ یہ تمثیل کی زبان میں جنت کی اصل حقیقت کا بیان ہے۔ اِس معاملے کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ نے یہ چاہا کہ وہ ایک اعلیٰ مخلوق پیدا کرے اور پھر اِس مخلوق کو وہ اپنی اعلیٰ ترین نعمت سے نوازے۔ اِس منصوبے کے تحت، اللہ نے ایک معیاری دنیا بنائی۔ یہ دنیا اپنی وسعت کے اعتبار سے، اپنے آپ میں ایک مکمل کائنات تھی۔ اِس میں ہر قسم کے اعلیٰ امکانات رکھے گئے تھے۔ اِس میں نہ صرف ہر قسم کی نعمتیں تھیں، بلکہ اس میں اعلیٰ ترقی کے ابدی مواقع موجود تھے۔

اس کے بعد اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو مکمل آزادی عطا کی۔ جنت اِسی انسان کے فطری ہیبی ٹیٹ (natural habitat) کے طور پر بنائی گئی ہے۔ اِس جنت میں انسان کا داخلہ

انتخاب (selection) کی بنیاد پر مقرر کیا گیا۔ موجودہ سیارہ ارض اِس مقصد کے لیے سلیکشن گراؤنڈ یا نرسری کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کو پیدا کرکے اس کو مکمل آزادی دے دی گئی ہے۔ آزادی کے اِس ماحول میں جو عورت یا مرد اپنے آپ کو جنت کی دنیا میں بسائے جانے کا مستحق ثابت کریں، اُن کو منتخب کرکے یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ جنت میں آباد ہوکر مزید ترقی کی منزلیں طے کریں۔ اِس کے برعکس، جو افراد زمینی زندگی کے امتحان میں ناکام ہوجائیں، اُن کو رد کرکے کائناتی کوڑے خانے میں پھینک دیا جائے۔

مذکورہ حدیثِ رسول میں تمثیل کی زبان میں بتایا گیا ہے کہ جنت کا معاملہ کیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جنت اللہ کے سچے بندوں کے رہنے کی بہترین جگہ ہے۔ وہ ایک عالی شان رہائش گاہ ہے، مگر اپنی ابتدائی صورت میں وہ ایک غیر آباد جگہ ہے۔

اِس ابدی جنت کی آبادکاری کے لیے اللہ تعالی نے یہ انتظام کیا کہ موجود سیارہ ارض کو ایک نرسری یا سلیکشن گراؤنڈ کے طور پر بنایا۔ موجودہ زمین پر جو عورت اور مرد پیدا ہوتے ہیں، وہ گویا نرسری میں لگائے جانے والے پودے ہیں۔ ان پودوں میں جو پودا یہ ثابت کرے گا کہ وہ صحت مند پودا (healthy plant) ہے، اس کو دنیا کی نرسری سے نکال کر جنت کے زیادہ بہتر اور ابدی مقام پر نصب کردیا جائے گا، تاکہ وہ وہاں کے بہتر ماحول میں پرورش پاکر مزید ترقی کرے اور ابدی طور پر جنت کے شاداب باغ کا حصہ بن جائے۔

اِس حدیث میں جن کلمات (سبحان اللہ، والحمد للہ، ولا إلہ إلا اللہ، واللہ أکبر، ولا حول ولا قوۃ إلا باللہ) کا ذکر ہے، وہ بہ اعتبار لفظ مراد نہیں ہیں، بلکہ وہ باعتبارِ معنی مراد ہیں، یعنی اِن الفاظ میں جس آئڈیالوجی کا ذکر ہے، یہ الفاظ جس معرفت کی نمائندگی کرتے ہیں، وہ جس طرزِ فکر (way of thinking) کو بتاتے ہیں، اُس کے مطابق، اپنی سوچ کو بنانا، اس کے مطابق، اپنی شخصیت کی تعمیر کرنا، اِن کلمات کی اسپرٹ کو اپنے دل ودماغ میں اتارنا، یہاں تک کہ آدمی ربانی صفات والا انسان بن جائے۔ جو آدمی قبل از موت دورِ حیات میں اِن کلمات کے تقاضے کے مطابق، اپنے آپ کو

ڈھالے گا، وہ بعد از موت دورِ حیات میں خدا کے اُس باغ میں بسنے کا مستحق قرار پائے گا جس کو جنت (paradise) کہا جاتا ہے۔

قرآن میں جنت کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ قرآن ایک اعتبار سے، جنت کا تعارف ہے۔ یہ تعارف اتنے موثر انداز میں ہے کہ اس کو پڑھنے والا آدمی گویا جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اگر آپ اِس اعتبار سے، قرآن کا تتبع کریں اور جنت کی آیتوں کو یکجا کرکے اس کا مطالعہ کریں تو آپ کے اندر شدید طور پر یہ جذبہ ابھرے گا کہ آپ جنت کو اپنی منزل بنالیں، آپ کی تمام سرگرمیوں کا رخ جنت کی طرف ہوجائے گا۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ (37:61)۔

ابدی عمر، ابدی صحت، ابدی امن

قرآن اور حدیث میں جنت اور اہلِ جنت کا تذکرہ نہایت تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ اِس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں ابدی طور پر ہر قسم کی نعمتیں کمال درجے میں موجود ہوں گی۔ وہاں انسان کی ہر اشتہا (desire) کی تکمیل کا سامان ہوگا۔ وہاں انسان کو کامل معنوں میں فل فِل مینٹ (fulfulment) حاصل ہوگا۔ جنت میں انسان کے لیے یہ موقع ہوگا کہ وہ مسلسل طور پر وہاں کی نعمتوں کو انجوائے کرے اور کبھی بورڈم کا شکار نہ ہو۔ جنت ہر اعتبار سے اہلِ جنت کے لیے آئڈیل اور پرفکٹ دنیا ہوگی۔

مگر اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے موجودہ وجود کے ساتھ جنت کی نعمتوں سے حقیقی معنوں میں محظوظ نہیں ہوسکتا۔ اِس لیے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو جو وجود ملا ہے، وہ ہر اعتبار سے، ایک محدود وجود ہے — اِس وجود پر بڑھاپا آتا ہے، یہ وجود بیماری اور حادثات سے دوچار ہوتا ہے، یہ وجود زوال (de-generation) کا شکار ہوتا ہے، اِس وجود پر موت طاری ہوتی ہے، اِس وجود کے آرگن (organs) کمزور ونا کارہ ہوتے رہتے ہیں، اِس وجود پر نیند اور تھکاوٹ طاری ہوتی ہے، اِس وجود کے حواس (senses) معطل ہوتے رہتے ہیں، وغیرہ۔

ایسی حالت میں انسان کو اگر جنت اِس طرح ملے کہ جنت میں ہر قسم کا سامانِ عیش تو کامل طور پر موجود ہو، لیکن انسان کا وجود یہی موجودہ دنیا والا وجود ہو، جو کہ ہر قسم کی کمزوریوں (weaknesses) کا شکار رہتا ہے، اس کو ہر قسم کی محدودیت (limitations) لاحق ہوتی ہے، اس کو بدستور جسمانی زوال (physical degeneration) پیش آتا رہے، جیسا کہ وہ اِس دنیا میں پیش آتا تھا۔ اگر ایسا ہو تو انسان کے لیے جنت اینٹ پتھر کا ایک ڈھیر بن جائے گی، وہ اس کے لیے لذت اور خوشی کی جگہ ثابت نہ ہوگی۔ جنت انسان کے لیے صرف اُس وقت جنت ہے جب کہ وہ خود جنت سے انجوائے کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

اگر انسان کے اپنے اندر جنت سے انجوائے کرنے کی طاقت نہ ہو تو جنت اس کے لیے بلا شبہہ ایک مصیبت خانہ ہوگی، نہ کہ کوئی عیش خانہ۔ جنت اسی طرح اس کے لیے ایک دار الکبد ہوگی، جیسا کہ موجودہ دنیا اس کے لیے دار الکبد تھی۔ اِس کا تقاضا ہے کہ اہلِ جنت کو آخرت میں جنت کے ساتھ ایک نیا وجود بھی عطا کیا جائے، ایسا وجود جو ابدی عمر رکھتا ہو، اس کو ایسی صحت ملے جو بھر پور صحت (health in full swing) کی حامل ہو۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص موجودہ دنیا کی زندگی میں اپنے آپ کو روحانی اعتبار سے، مطہَّر شخصیت (spiritually purified personality) کی حیثیت سے ڈیولپ (develop) کرے، اس کو آخرت میں اللہ کے خصوصی عطیہ کے طور پر جسمانی اعتبار سے، مطہَّر شخصیت (physically purified personality) حاصل ہوگی۔ ایسی شخصیت اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے اعتبار سے، کامل صفات کی حامل ہوگی۔ وہ اِس قابل ہوگی کہ جنت کی نعمتوں سے بھر پور طور پر خط (enjoyment) حاصل کرے، وہ کسی بھی پہلو سے محدودیت (limitation) اور ڈس ایڈوانٹج (disadvantage) میں مبتلا نہ ہو، وہ ابدی طور پر کامل فل فل مینٹ (fulfilment) کے احساس میں جیتا رہے۔

چناں چہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جنتی انسان ہمیشہ جوانی کی عمر (youth age) میں رہیں گے،

جیسے کہ وہ صرف 30 سال کی عمر کے ہوں۔ وہ ہر اُس جسمانی کمزوری (physical weakeness) سے مکمل طور پر پاک ہوں گے جو دنیا کی زندگی میں اُن کے جسم کا لازمی حصہ تھی۔

اِسی طرح جنت کے باشندے ہر قسم کی جسمانی کمی سے پاک ہوں گے۔ مثلاً وہ کبھی بیمار نہیں ہوں گے۔ اُن کو بول وبراز کی حاجت نہ ہوگی۔ اہلِ جنت کو جو جسم ملے گا، وہ ایسا جسم ہوگا جو ابدی طور پر شباب کی حالت میں رہے گا۔ اس پر نیند اور تھکاوٹ اور بڑھاپا طاری نہیں ہوگا۔ جنت میں اہلِ جنت کو خطاب کر کے یہ اعلان کیا جائے گا کہ اب تم ہمیشہ صحت مندر رہو گے، کبھی بیمار نہ ہو گے۔ اب تم ہمیشہ زندہ رہوں گے، کبھی تم پر موت نہ آئے گی۔ اب تم ہمیشہ جوان رہو گے، کبھی تم بوڑھے نہ ہو گے۔ اب تم ہمیشہ خوش حال رہو گے، کبھی تنگی میں مبتلا نہ ہو گے، وغیرہ۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مشکاۃ المصابیح: جلد 3، کتاب أحوال القیامۃ وبدء الخلق، باب صفۃ الجنۃ وأھلھا)

حقیقت یہ ہے کہ جنت اور انسان دونوں ایک دوسرے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ جنت مکمل طور پر انسان کے مطابقِ حال ہے اور انسان مکمل طور پر جنت کے مطابقِ حال۔ جنت انسان کا ہیبی ٹیٹ (habitat) ہے اور انسان جنت کا مطلوب باشندہ (citizen)۔ انسان کے بغیر جنت کا وجود ادھورا ہے اور جنت کے بغیر انسان کا وجود ادھورا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے طالب اور مطلوب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنت کے بغیر انسان کی زندگی بے معنی ہے اور انسان کے بغیر جنت کے وجود کی کوئی معنویت نہیں۔ یہ طالب اور مطلوب دونوں آخرت میں اکٹھا کیے جائیں گے اور اس کے بعد ابدی طور پر ایک دورِ کمال شروع ہوگا، جس کی خوشیاں کبھی ختم نہ ہوں گی، اور نہ اس کی رونق پر کبھی زوال آئے گا۔ یہ جنت انسان کا انتظار کر رہی ہے، لیکن اِس جنت میں داخلہ صرف اُس انسان کو ملے گا جو اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کرے۔

کلماتِ ذکر کی حقیقت

مذکورہ روایات میں پانچ کلمات کا ذکر ہے۔ وہ کلمات یہ ہیں — سبحان اللہ، والحمد للہ، ولا إلہ إلا اللہ، واللہ أکبر، ولا حول ولا قوۃ إلا باللہ۔ اِن کلمات کے جو الفاظ ہیں، وہ محض الفاظ

نہیں ہیں، بلکہ وہ گہرے معانی کو بتارہے ہیں اور یہ الفاظ اپنے اِنھیں گہرے معانی کے اعتبار سے مطلوب ہیں، نہ کہ محض الفاظ کے اعتبار سے، یعنی اُن کا فائدہ محض اُن کی لفظی تکرار میں نہیں ہے، بلکہ ان کی اسپرٹ یاان کی معنویت کواپنانے میں ہے۔

لا حول ولا قوۃ کیا ہے۔ وہ اِس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تمام طاقتوں کا مالک (all-powerful) ہے۔ 'سبحان اللہ' کیا ہے سبحان اللہ اِس حقیقت کی دریافت ہے کہ خدا ہرقسم کے عیب اور نقص سے کامل طور پر پاک ہے۔ الحمد للہ کیا ہے۔ الحمد للہ دراصل یہ ہے کہ ایک صاحبِ معرفت آدمی اللہ کے کمالات کودریافت کرکے اس کا شعوری اعتراف کرے۔ لا إله إلا الله کیا ہے۔ لا إله إلا الله دراصل تمام معبودوں کو رد کرکے اللہ کو معبودِ حقیقی کے طور پر دریافت کرنے کا دوسرا نام ہے۔ الله أكبر کیا ہے۔ یہ وہ عارفانہ کلمہ ہے جو ایک شخص کی زبان سے اُس وقت بے تابانہ طور پر نکل پڑتا ہے، جب کہ وہ تدبر کے نتیجے میں اللہ کے مقامِ عظمت کودریافت کرے۔

یہ کلمات دراصل ذکرِ الٰہی کے کلمات ہیں۔ ذکر کی حقیقت معرفت ہے اور معرفتِ الٰہی بلاشبہہ سب سے بڑی نیکی (virtue) ہے۔ لیکن معرفت کوئی سادہ چیز نہیں۔ معرفت سے پہلے دریافت ہے۔ دریافت سے پہلے تدبر ہے، تدبر سے پہلے یکسوئی (concentration) ہے، یکسوئی سے پہلے سنجیدگی ہے۔ آدمی سب سے پہلے سنجیدگی کا ثبوت دیتا ہے، پھر وہ اپنے ذہن کو غیر متعلق چیزوں سے یکسو کرتا ہے، اس کے بعد وہ غور وفکر کرتا ہے، جس کو تدبر کہا جاتا ہے۔ تدبر اس کو دریافت تک پہنچاتا ہے اور دریافت معرفت تک۔ سنجیدہ تفکر کے ان مراحل سے گزرنے کے بعد جب کسی انسان کو اللہ رب العالمین کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو اس کے ذہن میں ایک فکری بھونچال آتا ہے، اس کے اندر حقیقت شناسی کا ایک سیلاب امنڈ پڑتا ہے۔ یہ ربانی کیفیت جب ایک انسان کی زبان سے بے تابانہ طور پر ظاہر ہوتی ہے تو اسی کا نام ذکرِ الٰہی ہے۔

یہ کلمات دراصل اُس شعوری عمل (intellectual process) کو بتاتے ہیں جو ایک صاحبِ ایمان کے اندر موجودہ دنیا میں جاری ہوتا ہے۔ موجودہ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے

ایک صاحبِ ایمان پر مختلف احوال اور تجربات گزرتے ہیں۔ اگر اس کے اندر ایمانی شعور زندہ ہو تو یہ تمام احوال وتجربات اس کے لیے رزقِ رب کا ذریعہ بنتے رہیں گے۔ آخرکار وہ اُس مطلوب انسان کا درجہ حاصل کر لے گا جو آخرت کی جنت میں داخلے کے لیے ایک مستحق امیدوار (deserving candidate) کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن کا موضوع

قرآن خالقِ کائنات کی کتاب ہے۔ قرآن کا موضوع (subject) یہ ہے کہ انسان کے بارے میں اللہ کے تخلیقی منصوبہ سے اس کو آگاہ کیا جائے۔ قرآن کے تمام بیانات براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اِسی معاملے کی وضاحت ہیں۔ مثلاً قرآن کی سورہ ابراہیم میں بتایا گیا ہے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں — ایک انسان وہ ہے جو اپنی زندگی کی تعمیر 'کلمۂ طیبہ' (14:24) کی بنیاد پر کرے اور دوسرا انسان وہ ہے جو 'کلمہ خبیثہ' (14:26) کی بنیاد پر اپنے آپ کو کھڑا کرے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو انسان اپنی زندگی کی تعمیر 'کلمۂ طیبہ' کی بنیاد پر کرے، وہ موجودہ دنیا میں بھی اپنا رزق پائے گا اور موت کے بعد کی زندگی میں اس کو اعلیٰ مقامات حاصل ہوں گے۔ اِس کے برعکس، جو آدمی 'کلمۂ خبیثہ' کو اپنی زندگی کی بنیاد بنائے، اس کو استحکام حاصل نہیں ہوگا، اس کو غیر صحت مند پودے کی طرح اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا، وہ جنت میں داخلے کے لیے نااہل قرار پائے گا۔

تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ انسانوں کی بڑی اکثریت نے اِس تخلیقی حکمت کو نظر انداز کیا، انھوں نے اپنے آپ کو آخرت کے اعتبار سے نہیں بنایا، وہ موجودہ دنیا کی ظاہری چیزوں میں پھنس کر رہ گئے۔ اِسی حقیقت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إن ہؤلاء یحبون العاجلة ویذرون وراءہم یوما ثقیلا (76:27)۔

تاریخ کا تجربہ

تاریخ کے ہر دور میں تمام سوچنے والے انسان ایک ہی آبسیشن (obsession) میں مبتلا رہے ہیں — موجودہ دنیا کو کس طرح بہتر دنیا بنایا جائے۔ ہر دور کے انسانوں کا یہ ایک مشترک خواب

رہا ہے۔ مذہبی لوگ اپنے اِس خواب کے لیے صالح نظام کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور سیکولر لوگ اس کو آئڈیل سسٹم کا نام دیتے ہیں۔ تاریخ میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، خواہ وہ فکشن ہو یا نان فکشن، تقریباً ان سب کا خلاصہ یہی ہے۔ کوئی کتاب براہِ راست طور پر اِس موضوع پر لکھی گئی ہے اور کوئی کتاب بالواسطہ طور پر اِس موضوع سے متعلق ہے۔

یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ تاریخ کی تمام سرگرمیوں کا نشانہ (goal) عملاً یہی ایک تھا۔ مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ اِس سلسلے کی تمام انسانی سرگرمیاں نتیجے کے اعتبار سے، ناکام ہوکر رہ گئیں، کوئی بھی کوشش اپنے مطلوب نشانے تک نہیں پہنچی، نہ سیکولر لوگ اپنا مفروضہ آئڈیل سسٹم بنا سکے اور نہ مذہبی لوگ اپنا مذکورہ صالح نظام بنانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا سوال ہے۔ اِس سوال کا جواب معلوم کرنا خود انسان کے وجود کی معنویت کو معلوم کرنا ہے اور بلاشبہہ اِس سے بڑی کوئی دریافت (discovery) نہیں ہوسکتی کہ انسانی وجود کی معنویت کو حقیقی طور پر دریافت کیا جائے۔ سیکولر مفکرین اور مذہبی مصلحین کی اِس عمومی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ ان کا منصوبہ خالق کے منصوبہ تخلیق سے مطابقت نہیں رکھتا تھا، اور جو منصوبہ خالق کے تخلیقی نقشے کے مطابق نہ ہو، اس کے لیے اِس دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔ خالق کے منصوبے کے مطابق، یہ دنیا ایک جوڑا دنیا (pair world) کی صورت میں بنائی گئی ہے۔ ایک دنیا دوسری دنیا کا تکملہ (complement) ہے۔ اِس تخلیقی منصوبے کے مطابق، کرۂ ارض (planet earth) کی حیثیت ایک وقتی نرسری (nursery) کی ہے، اور دوسری دنیا کی حیثیت ایک ابدی باغ (eternal garden) کی، جس کو معروف طور پر جنت (paradise) کہا جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام

قرآن میں جنت کی تخلیق کے لیے ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (3:133) یعنی جنت اہلِ تقوی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ (32:17) یعنی کسی کو نہیں معلوم کہ اُن کے لیے اُن کے اعمال کے صلے میں

آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے، وغیرہ۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق نے اپنے منصوبے کے مطابق، پہلے جنت کی دنیا بنائی۔ اس کے بعد اہلِ جنت کا انتخاب کرنے کے لیے موجودہ سیارۂ ارض کو بنایا، جو کہ دراصل جنت کی ابدی دنیا کے لیے ایک عارضی نرسری کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِس عارضی نرسری میں عورت اور مرد محدود مدت کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں۔ منصوبہ تخلیق کے مطابق، جب انسانوں کی تعداد پوری ہوجائے گی، اُس وقت سیارہ ارض پر قیامت کا زلزلہ آئے گا اور اس کی موجودہ حیثیت کا خاتمہ ہوجائے گا۔

انسان کو موجودہ دنیا میں بسنے کے لیے صرف محدود وقت ملتا ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کی عمر کا اوسط تقریباً 70 سال ہے۔ اِس مدت میں جو افراد اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں، اُن کو موت کے بعد لے جا کر جنت کی دنیا میں آباد کر دیا جاتا ہے اور جو عورت یا مرد اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر میں ناکام رہتے ہیں، اُن کو ''خبیث پودے'' کی مانند اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ زمین کی صورت میں جو نرسری بنائی گئی ہے، وہ صرف عارضی مدت کے لیے ہے، اور جنت کی صورت میں جو معیاری دنیا بنائی گئی ہے، وہ ابدی ہے، وہ کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

تہذیب کے دو دھارے

تہذیب (civilization) کے لفظ سے عام طور پر صرف ایک چیز مراد لی جاتی ہے اور وہ مادی تہذیب ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تہذیب کے دو دھارے ہیں جو مسلسل طور پر تاریخ میں جاری رہے ہیں۔ پہلے دھارے کو مادی تہذیب (material civilization) کہا جاتا ہے۔ دوسرے دھارے کو روحانی تہذیب (spiritual civilization) کہہ سکتے ہیں۔ روحانی تہذیب سے مراد کوئی مبہم چیز نہیں۔ اِس سے مراد عین وہی چیز ہے جو پیغمبروں کی ہدایت کے ذریعے تاریخ میں قائم ہوئی۔ روحانی تہذیب کا لفظ ہم نے صرف اِس لیے استعمال کیا ہے کہ وہ لوگوں کے لیے قریب الفہم ہے۔

مادی تہذیب کا دھارا ایک دکھائی دینے والا دھارا (visible stream) ہے، اِس لیے ہر آدمی اس سے واقف ہے۔ اِس کے برعکس، روحانی تہذیب کا دھارا ایک نہ دکھائی دینے والا دھارا (invisible stream) ہے، اِس لیے اُس کو صرف گہرے غور وفکر کے ذریعے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ دونوں کے درمیان یہ فرق ایسا ہی ہے جیسے ایک انسان کے وجود میں دو چیزوں کا فرق۔ انسانی وجود کا ایک پہلو اس کا مادی جسم ہے جو پوری طرح دکھائی دیتا ہے۔ اس کے وجود کا دوسرا حصہ روح (soul) ہے جو کہ پوری طرح موجود ہوتی ہے، لیکن بظاہر وہ دکھائی نہیں دیتی۔

مادی تہذیب، مادی امکانیات کو انفولڈ کرکے وجود میں آتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ مادی تہذیب اب سے تقریباً 6 ہزار سال پہلے میسوپوٹامیا (Mesopotamia) کے علاقے میں ابتدائی طور پر شروع ہوئی، پھر وہ ترقی کرتے کرتے موجودہ تکمیلی دور تک پہنچی۔

یہی معاملہ روحانی تہذیب یا اسپریچول تہذیب کا ہے۔ روحانی تہذیب بھی کچھ امکانیات کو انفولڈ کرکے وجود میں آتی ہے، لیکن دونوں کے درمیان ایک فرق ہے۔ مادی تہذیب کا واقعہ اجتماع یا سوسائٹی کی سطح پر وجود میں آتا۔ اِس کے برعکس، روحانی تہذیب کا

واقعہ ایک انفرادی واقعہ ہے اور وہ فرد کی سطح پر وجود میں آتا ہے۔ فرد کے اندر ذہنی بےداری، فرد کے اندر مقصدِ اعلیٰ کا شعور، فرد کے اندر خدا کے لیے حب شدید اور خوفِ شدید، فرد کے اندر جنت کا اشتیاق، وغیرہ۔

روحانی تہذیب فرد کے اندر مذکورہ قسم کے غیر مرئی (invisible) فکری انقلاب سے شروع ہوتی ہے، پھر وہ ترقی کر کے ربانی شخصیت تک پہنچتی ہے۔ اِس طرح کے افراد ہر دور اور ہر زمانے میں برابر پیدا ہوتے ہیں۔ اِن افراد کی سطح پر روحانی تہذیب کا غیر مرئی دھارا نسل درنسل چلتا رہتا ہے۔ مادی تہذیب اگر اجتماعی اداروں (social organisations) کی سطح پر چلتی ہے تو روحانی تہذیب افراد کی داخلی کیفیات اور افکار کی سطح پر جاری رہتی ہے۔

قرآن کا حوالہ

قرآن تاریخ تہذیب کی کتاب نہیں، لیکن قرآن میں دونوں قسم کی تہذیبوں کے بارے میں اشاراتی حوالے موجود ہیں۔ قرآن کی آیتوں میں تدبر کر کے ان کو سمجھا جاسکتا ہے۔ جہاں تک مادی تہذیب کی بات ہے، اس کا اشاراتی حوالہ قرآن کی سورہ الروم میں اِن الفاظ میں آیا ہے: أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (30:9) یعنی کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا اُن لوگوں کا جو اُن سے پہلے تھے۔ وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے۔ اور انھوں نے زمین کو جوتا اور اس کو اُس سے زیادہ آباد کیا جتنا انھوں نے آباد کیا ہے۔ اور ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے۔ پس اللہ اُن پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔

قرآن کی اِس آیت میں ایک خصوصی واقعے کے حوالے سے ایک عمومی قانون کو بتایا گیا ہے۔ اِس قانون کا اشاراتی ذکر آیت کے اِن الفاظ میں ہے: وعمروھا أکثر مما عمروھا۔

عمومی انطباق کے اعتبار سے، اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر دور میں اپنی بڑھی ہوئی سرگرمیوں کے ذریعے اپنی زندگی کی مادی تعمیر کرتا رہا ہے۔ اِن سرگرمیوں کے ذریعے ارتقائی طور پر جو محسوس واقعہ ظہور میں آیا، اُسی کا نام مادی تہذیب ہے۔ اِس کے مقابلے میں سرگرمیوں کا دوسرا کلچر جو فرد کی سطح پر جاری رہا، وہی وہ واقعہ ہے جس کو ہم نے روحانی تہذیب کا نام دیا ہے۔ جس طرح مادی تہذیب کا تسلسل تاریخ میں برابر جاری رہا اور جس کا اشارہ قرآن کی مذکورہ آیت میں موجود ہے، اِسی طرح روحانی تہذیب کا غیر مرئی تسلسل بھی تاریخ میں برابر جاری رہا ہے۔ روحانی تہذیب کے تسلسل کا اشاراتی حوالہ قرآن کی سورہ المومنون کے اِن الفاظ میں ملتا ہے: ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (23:44) یعنی پھر ہم نے لگا تار اپنے رسول بھیجے:

We sent Our messengers in succession.

خدا کے پیغمبر ہر دور میں مسلسل آتے رہے اور ان کی تعلیم و تلقین کے ذریعے تاریخ میں روحانی تہذیب کا غیر مرئی تسلسل قائم رہا۔ مادی تہذیب کا تسلسل اگر اجتماعی سطح پر دکھائی دینے والے مظاہر کی صورت میں قائم رہا تو روحانی تہذیب کا تسلسل افراد کے اندر غیر مرئی احوال کی صورت میں جاری رہا۔

برطانی مورخ آرنلڈ ٹائن بی (وفات: 1975) نے 21 بڑی تہذیبوں کا مطالعہ کیا جن کی مدت تقریباً 5 ہزار سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ اِس مطالعے کے نتائج کو اس نے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں مرتب کیا ہے جو 12 جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Arnold Toynbee, *The Study of History*

مادی تہذیب کے بارے میں اِس طرح کی کتابیں اور اِس طرح کے مقالات بڑی تعداد میں شائع ہوئے ہیں، مادی تہذیب کے تاریخی آثار (monuments) زمین کے مختلف حصوں میں موجود ہیں جو سیاحوں کی دلچسپی کا اہم مرکز ہیں۔ مادی تہذیب کو پروجیکٹ کرنے کے لیے بڑے بڑے میوزیم بنائے گئے ہیں۔ بڑے بڑے ادارے، بڑی بڑی تنظیمیں اور بڑے بڑے شہر گویا اُن کے تعارفی مراکز ہیں۔ اِن مراکز کو دیکھ کر لوگ کہہ پڑتے ہیں — ونڈرفل، ونڈرفل (wonderful, wonderful)۔

اِسی طرح روحانی تہذیب کے واقعات بھی متوازی طور پر موجود ہیں جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے، مادی تہذیب سے بہت زیادہ بڑے ہیں۔ یہ واقعات پوری تاریخ میں مسلسل طور پر پیش آتے رہے ہیں، لیکن اِن واقعات کے محسوس مظاہر کہیں موجود نہیں، اِس لیے لوگ اُن سے واقف نہیں۔ روحانی تہذیب کے واقعات ہمیشہ افراد کی سطح پر ان کی داخلی دنیا میں غیر مرئی طور پر پیش آتے ہیں۔ یہ افراد اگرچہ انسانی تاریخ کے اعلیٰ ترین افراد ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنی طبیعی عمر پوری کرکے اِس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ ان کی پیدا کردہ روحانی تہذیب کو نہ ان کی زندگی میں لوگ دیکھ پاتے اور نہ ان کی وفات کے بعد۔

اسپریچول تہذیب کے اجزا

مصر کے بادشاہوں نے 2300-2700 قبل مسیح کے درمیان مصر میں بڑی بڑی سنگی عمارتیں بنائیں جو اہرام (pyramids) کے نام سے مشہور ہیں۔ ہندستان کے بادشاہ شاہ جہاں نے 48-1630 عیسوی کے درمیان آگرہ (یوپی) میں تاج محل بنوایا۔ اِس طرح کی ہزاروں عمارتیں ہیں جو مادی تہذیب کے تاریخی مظاہر کے طور پر دنیا کے مختلف ملکوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسپریچول تہذیب کے تحت جو واقعات ظہور میں آئے، اُن کا ریکارڈ کہاں ہے۔ کیا وہ اِسی لیے تھے کہ وقتی ظہور کے بعد وہ معدوم ہوجائیں اور ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں۔ یہ تاریخ انسانی کا سب سے بڑا سوال ہے۔

مثال کے طور پر آدم کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کے درمیان ایک معاملے پر نزاع ہوئی۔ قابیل سخت غصہ ہوگیا۔ اس نے کہا کہ میں تم کو مار ڈالوں گا۔ اِس کے جواب میں ہابیل نے کہا: لَئِنْ بَسَطْتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِيَ إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ (5:28) یعنی اگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں تم کو قتل کرنے کے لیے تم پر اپنا ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو سارے جہان کا رب ہے۔

چناں چہ ہابیل قتل ہوگیا، مگر اس نے اپنے بڑے بھائی قابیل پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اُس وقت

ہابیل کے سینے میں خوفِ خدا کا جو طوفان آیا ہوگا، وہ بلاشبہہ اہرامِ مصر اور تاج محل جیسی عمارتوں سے بے شمار گنا زیادہ بڑا واقعہ تھا۔ فرشتوں نے یقیناً اس کو ریکارڈ کیا، لیکن انسان کی آنکھوں نے کبھی اِس واقعے کو نہیں دیکھا۔ کیا یہ عظیم ربانی واقعہ صرف اس لیے تھا کہ وہ ایک شخص کے دل میں پیدا ہو اور ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جائے۔

اِسی طرح چار ہزار سال پہلے جب پیغمبر ابراہیم نے ایک خدائی منصوبے کے تحت اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو عرب کے صحرا میں بسا دیا۔ اُس وقت ہاجرہ نے پیغمبر ابرہیم سے پوچھا کہ کیا خدا نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ اس کے بعد ہاجرہ کی زبان سے نکلا: إذن لا یضیعنا (پھر اللہ ہم کو ضائع نہیں کرے گا)۔ صحرا کے اِس بے آب و گیاہ ماحول میں جب ہاجرہ نے یہ الفاظ کہے ہوں گے، اُس وقت ان کے دل میں اعتماد علی اللہ کا ایک عظیم کیفیاتی طوفان برپا ہوا ہوگا۔ یہ طوفان بلاشبہ مصر کے اہرام اور آگرہ کے تاج محل سے بے شمار گنا زیادہ بڑا واقعہ تھا۔ یہ واقعہ بلاشبہہ فرشتوں کے ریکارڈ میں آیا، لیکن انسان کے لیے وہ ایک نا قابلِ ذکر واقعہ بنا رہا۔ کیا یہ عظیم ربانی واقعہ اِسی لیے پیش آیا کہ وہ ایک فرد کے دل میں برپا ہو، اِس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جائے۔

اِسی طرح ایک واقعہ وہ ہے جو تقریباً تین ہزار سال پہلے حضرت موسی کے زمانے میں پیش آیا۔ قرآن میں اِس واقعے کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ اُس وقت کے بادشاہ فرعون نے مصر کے ماہر جادوگروں کو بلایا، تاکہ وہ حضرت موسی کے معجزے کا مقابلہ کریں۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق، ایک میدان میں اہلِ مصر بڑی تعداد میں اکٹھا ہوئے۔ وہاں جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں میدان میں پھینکیں۔ لوگوں کو نظر آیا کہ وہ رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن کر میدان میں چل رہی ہیں۔ اُس وقت حضرت موسی نے اپنا عصا میدان میں ڈالا۔ حضرت موسی کا عصا اژدہا بن کر جادوگروں کے سحر کو نگل گیا۔

جادوگروں نے جب اِس واقعے کو دیکھا تو اُن پر ظاہر ہو گیا کہ اُن کا کیس جادو کا کیس تھا، لیکن موسی کا کیس اِس سے مختلف ہے، موسی کا کیس رب العالمین کے پیغمبر کا کیس ہے۔ اِس صداقت کے ظاہر ہوتے ہی جادوگروں نے اپنی غلطی کو مان لیا۔ وہ پکار اٹھے: آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَى (20:70)۔

فرعون جادوگروں پر سخت غضبناک ہوا۔ اس نے ان کے قتل کا حکم دے دیا، لیکن جادوگر اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ اِس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، اس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (20:72) یعنی جادوگروں نے کہا کہ ہم تجھ کو ہرگز اُن دلائل پر ترجیح نہیں دیں گے جو ہمارے پاس آئے ہیں اور اُس ذات پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ پس تم کو جو کچھ کرنا ہے، اُسے کرڈالو۔ تم جو کچھ کر سکتے ہو، اِسی دنیا کی زندگی کا کر سکتے ہو۔

مصر کے جادوگروں نے یہ جملہ موت کی قیمت پر کہا تھا۔ اُس وقت اُن کے دل میں سچائی کا جو طوفان برپا ہوا ہوگا، وہ بلاشبہہ اہرامِ مصر اور تاج محل جیسی سنگی عمارتوں سے بے شمار گنا زیادہ عظیم ہے۔ کیا سچائی کا یہ طوفان صرف اِس لیے تھا کہ وہ کچھ انسانوں کے سینے میں وقتی طور پر برپا ہو اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کا وجود مٹ جائے۔

اِسی طرح کا ایک واقعہ وہ ہے جو صحیح البخاری کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے۔ قدیم زمانے میں بنی اسرائیل کے تین صالح افراد ایک سفر پر روانہ ہوئے۔ درمیان میں بارش آ گئی۔ چناں چہ انھوں نے پہاڑ کے ایک غار میں پناہ لی۔ اُس وقت وہاں لینڈ سلائڈ (landslide) کا ایک واقعہ ہوا۔ اس کی وجہ سے غار کا منہ بند ہوگیا۔ یہ پتھر اتنا بڑا تھا کہ تینوں آدمی مل کر بھی اس کو ہٹا نہیں سکتے تھے۔ اُس وقت انھوں نے طے کیا کہ ہر ایک اپنے کسی خاص عمل کے واسطے سے دعا کرے۔ چناں چہ انھوں نے دعا کی اور پتھر ہٹ گیا، پھر وہ لوگ غار سے باہر نکل آئے۔

اِن تینوں میں سے ایک شخص وہ تھا جس نے دعا کرتے ہوئے کہا کہ اے اللہ، میں مزدوروں سے کام لیا کرتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ایک مزدور کسی بات پر غصہ ہوگیا۔ وہ اپنی مزدوری لیے بغیر چلا گیا۔ اِس کے بعد میں نے اس کی مزدوری کی رقم سے ایک گائے خریدی۔ اِس گائے میں اتنی برکت ہوئی کہ ڈھیرے ڈھیرے گائے اور بکری اور اونٹ کا ایک بہت بڑا گلّہ اکھٹا ہوگیا۔ ایک عرصے کے بعد وہ مزدور دوبارہ آیا اور اپنی مزدوری کا تقاضا کیا۔ اُس وقت میرے گھر کے سامنے کا میدان جانوروں کے گلّے سے بھرا ہوا تھا۔

میں نے کہا کہ یہ سب تمھارا ہے، اِس کو لے جاؤ۔ مزدور نے کہا کہ مجھ سے استہزا نہ کرو۔ میں نے کہا کہ یہ استہزا کی بات نہیں، یہ سب تمھاری مزدوری کی رقم کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد وہ مزدور اُن تمام جانوروں کو ہنکا کر لے گیا اور ایک بھی نہ چھوڑا۔ میں نے مزدور کو نہیں روکا اور اُس پر راضی رہا۔ (صحیح البخاري، أحادیث الأنبیاء، حدیث الغار، رقم: 3465)

اُس آدمی نے جب یہ فیصلہ کیا تو اُس وقت اس کے سینے میں دیانت داری (honesty) کا ایک عظیم طوفان برپا ہوا ہوگا۔ یہ واقعہ بلاشبہہ اہرامِ مصر اور تاج محل جیسی سنگی عمارتوں سے بے حساب گنا زیادہ بڑا تھا۔ کیا یہ واقعہ محض اِس لیے ہوا کہ وہ صرف ایک شخص کے سینے میں برپا ہو اور پھر ہمیشہ کے لیے معدوم ہوجائے۔ اِس طرح کے واقعات جو افراد کی زندگی میں داخلی طور پر پیش آئے، ایسے کسی واقعے کو اُس فرد نے تو یقیناً جانا جس کو اس کا تجربہ پیش آیا تھا، لیکن اس کی اپنی ہستی کے باہر اُس کا کوئی وجود دکھائی نہیں دیا، وہ صرف غیر مرئی قسم کا ایک ذاتی احساس بن کر رہ گیا۔ ہر عورت اور مرد شعوری یا غیر شعوری طور پر چاہتے ہیں کہ اُن کے داخلی احساسات خارجی واقعہ بن کر نمایاں ہوں۔ جو کچھ انھوں نے وقتی طور پر محسوس کیا تھا، وہ اُسی طرح تاریخ کا مستقل حصہ بن جائے جس طرح دوسری بہت سی چیزیں تاریخ کا مستقل حصہ بنی ہوئی ہیں۔

یہ ایک سوال ہے اور قرآن کے مطالعے سے اِس کا واضح جواب معلوم ہوتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل مادی تہذیب ہے جو قیامت کے دن معدوم ہوجائے گی اور جہاں تک روحانی تہذیب کا سوال ہے، وہ اپنی پوری صورت میں ظاہر ہو کر ابدی طور پر اپنا جلوہ دکھاتی رہے گی۔

دو مختلف انجام

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مادی تہذیب کی ترقیاں صرف وقتی ترقیاں ہیں۔ قیامت کا بھونچال مادی تہذیب اور اس کے تمام آثار کو یکسر مٹا دے گا۔ قیامت کے بعد بننے والی دنیا میں اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا (18:46) یعنی مال اور اولاد دنیوی زندگی کی رونق ہیں۔ اور باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ

تمھارے رب کے نزدیک اجراور امید کے اعتبار سے بہتر ہیں۔

قرآن کی اِس آیت میں 'زینۃ الحیاۃ الدنیا' سے مراد وہی چیز ہے جس کو مادی تہذیب کہا جاتا ہے۔ یہ مادی تہذیب خواہ بظاہر کتنا ہی زیادہ پُررونق ہو، بہر حال وہ وقتی طور پر صرف امتحان کی مدت تک کے لیے ہے۔ قیامت کا بھونچال اس کو پوری طرح مٹادے گا۔ اِس کے بعد زمین کا وہ حال ہوگا جس کو قرآن میں قاعاً صفصفاً (20:106) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی چٹیل میدان۔

'باقیات الصالحات' کا لفظی ترجمہ ہے: باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ۔ صالح عمل حقیقۃً وہ ہے جو صالح نیت سے کیا گیا ہو۔ 'باقیات الصالحات' دوسرے لفظوں میں کسی عمل کے کیفیاتی حصہ (qualitative content) کا نام ہے۔ عمل کا یہ کیفیاتی حصہ کہاں واقع ہوتا ہے، وہ ایک مرد یا عورت کے داخلی وجود میں واقع ہوتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے قابلِ فہم بنانے کے لیے روحانی تہذیب کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ قیامت کا بھونچال یہ کرے گا کہ انسانی عمل کے کمیاتی حصہ (quantitative content) کو ڈھا دے گا۔ اِس کے بعد انسانی عمل کا صرف کیفیاتی حصہ (qualitative content) باقی رہے گا۔

قرآن میں اہلِ جنت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ (10:26)۔ اِس آیت میں ''زیادہ'' کا لفظ غالباً اِس معنی میں ہے کہ آخرت میں اہلِ جنت کے ساتھ جو معاملہ ہوگا، وہ صرف یہ نہیں ہوگا کہ ان کے نیک عمل کو قبولیت کا درجہ ملے گا، بلکہ مزید یہ ہوگا کہ عمل کے دوران اُن کے اندر جو اعلیٰ ربانی کیفیات پیدا ہوئی تھیں، وہ خارجی طور پر متشکل ہوجائیں گی۔ یہی خارجی اظہار وہ چیز ہے جس کو ہم نے اسپریچول تہذیب کا نام دیا ہے۔

مادی تہذیب مادی واقعات کے متشکل ہونے سے وجود میں آتی ہے۔ اِس کے برعکس، اسپریچول تہذیب وہ تہذیب ہے جہاں اعلیٰ ربانی کیفیات متشکل ہوں۔ موجودہ دنیا جن قوانین کے تحت بنی ہے، وہاں کمیاتی عمل (quantitative deeds) تو بخوبی طور پر متشکل ہو سکتے ہیں، لیکن کیفیاتی عمل (qualitative deeds) یہاں متشکل نہیں ہو سکتے۔ آخرت کی دنیا کے قوانین

بالکل مختلف ہوں گے۔ اِس طرح وہاں یہ ممکن ہوجائے گا کہ ایک کیفیاتی واقعہ بھی اُسی طرح عملی صورت میں متشکل ہوجائے جس طرح موجودہ دنیا میں کمیاتی واقعہ عملی صورت میں متشکل ہوتا ہے۔

اِس سلسلے میں قرآن کی دو آیتوں کا مزید مطالعہ کیجئے۔ اِن آیتوں کے الفاظ اوران کا ترجمہ یہ ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (11:15-16) یعنی جولوگ دنیا کی زندگی اوراس کی زینت چاہتے ہیں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیتے ہیں۔ اوراس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے دنیا میں جو کچھ بنایا تھا، وہ نابود ہوگیا اور باطل ہوگیا جو کچھ انھوں نے کمایا تھا۔

قرآن کی اِس آیت میں زینتِ دنیا سے مراد تاریخِ انسانی کا وہی ظاہرہ ہے جس کو ہم نے مادی تہذیب کے معروف نام سے بیان کیا ہے۔ اِس مادی تہذیب کی عمر صرف قیامت تک کے لیے ہے۔ اِس کے بعد وہ مٹا دی جائے گی۔ اس کا انجام وہی ہوگا جس کو قرآن کی مذکورہ آیت میں 'حبط ما صنعوا' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی انھوں نے دنیا میں جو کچھ بنایا تھا، وہ نابود ہوگیا (vain are all their deeds)۔

وہ چیز جس کو مادی تہذیب کہا جاتا ہے، وہ گویا کہ اِسی موجودہ دنیا میں اپنے لیے ایک دنیا بنانا ہے۔ یہ بلاشبہہ خدا کے تخلیقی منصوبے کے خلاف ہے۔ خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، موجودہ دنیا عمل کے لیے بنائی گئی ہے، نہ کہ تعمیرِ جنت کے لیے۔

ایسا کرنے والے لوگ خدا کے منصوبے کے خلاف چل رہے ہیں۔ اُن کی ساری سرگرمیاں خدا کے نزدیک غیر مقبول ہیں، اِس لیے اُن کا وجود صرف اُس وقت تک ہے جب تک اُن کی امتحان کی مدت ختم نہیں ہوتی۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اُن کی بنائی ہوئی یہ مادی دنیا اُسی طرح ختم کردی جائے گی جس طرح غیر منظور شدہ تعمیر

(unauthorised construction) کو سرکاری طور پر ڈھادیا جاتا ہے۔

اسپریچول تہذیب کا دور

قیامت دو دنیاؤں کے درمیان حد فاصل ہے۔ قیامت کا مطلب یہ ہے کہ مادی تہذیب کا دور ختم ہوا اور روحانی تہذیب کا دور شروع ہوگیا۔ اِسی دوسرے دور کو قرآن میں آخرت کا دور کہا گیا ہے۔ اِس دوسرے دور میں یہ ہوگا کہ پوری تاریخ میں بکھرے ہوئے روحانی اجزا (spiritual contents) کو جنت میں یکجا کردیا جائے، یعنی اسپریچول اجزا کے حامل انسانوں کو بقیہ انسانوں سے الگ کرکے جنت کی معیاری دنیا میں بسا دینا۔ اِسی حقیقت کو قرآن کی ایک آیت میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (21:105)۔

اِس واقعے کا ذکر بائبل میں بھی موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں — پر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔ صادق زمینوں کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے:

> But the descendants of the wicked shall be cut off. The righteous shall inherit the land and dwell in it forever. (Psalm 37:28-29)

اسپریچول تہذیب یا ربانی تہذیب قیامت سے پہلے کی دنیا میں صالح افراد کی سطح پر ظہور میں آئے گی۔ قیامت کے بعد یہ تمام صالح افراد پوری تاریخِ بشری سے منتخب کرکے جنت میں بسا دئے جائیں گے۔ اِس دوسرے دورِ حیات میں ان کی داخلی اسپریچولٹی یا داخلی ربانیت خارجی واقعہ بن کر چمک اٹھے گی۔ جو چیز دنیا کی زندگی میں داخلی کیفیت (inner spirit) ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دکھائی نہیں دیتی تھی، وہ آخرت کے بدلے ہوئے ماحول میں خارجی طور پر دکھائی دینے والا واقعہ بن جائے گا۔ اِسی حقیقت کو قرآن میں نور کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ صالح افراد کی ربانیت جو موجودہ دنیا میں ایک چھپی ہوئی حقیقت بنی ہوئی تھی، وہ آخرت کی دنیا میں ایک دکھائی دینے والی حقیقت بن جائے گی۔ اِس سلسلے میں قرآن کی دو آیتوں کا مطالعہ کیجیے۔

پہلی آیت قرآن کی سورہ الحدید میں ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ

وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (57:12) یعنی جس دن تم مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کی روشنی اُن کے آگے اور ان کے دائیں چل رہی ہوگی — آج کے دن تم کو خوش خبری ہے اُن باغوں کی جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، تم اُن میں ہمیشہ رہو گے، یہ بڑی کامیابی ہے۔

اِسی طرح سورہ الحدید کی ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ڰ وَالشُّهَدَاۗءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (57:19) یعنی جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر، وہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ ان کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور ہے۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا، وہی دوزخ والے ہیں۔

اِسی قسم کی ایک آیت قرآن کی سورہ التحریم میں آئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (66:8) یعنی اے ایمان والو، اللہ کے آگے سچی توبہ کرو۔ امید ہے کہ تمھارا رب تمھارے گناہ معاف کردے اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ جس دن اللہ، نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ اُن کی روشنی ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف دوڑ رہی ہوگی، وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب، تو ہمارے لیے ہمارے نور کو کامل کردے اور ہماری مغفرت فرما۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

قرآن کی اِن آیتوں میں نور (روشنی) کے دوڑنے کا ذکر لفظی طور پر دوڑنے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ پھیلنے کے معنی میں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں اُن کا نور دور دور تک پھیلا ہوا ہوگا۔ مزید یہ کہ نور کا لفظ سادہ طور پر روشنی کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ اِس معنی میں ہے کہ

ان کے عمل کا روحانی حصہ (spiritual content) جو دنیا میں اعلیٰ داخلی تجربے کی حیثیت رکھتا تھا، وہ آخرت میں متشکل (materialised) ہو کر خارجی طور پر دکھائی دینے لگے۔ بہ الفاظ دیگر، جو چیز دنیا کی زندگی میں صرف غیر مرئی نور کی حیثیت رکھتی تھی، وہ آخرت میں قابلِ مشاہدہ اسپریچول تہذیب کی صورت اختیار کرلے گی۔ مادی تہذیب جس طرح دنیا میں قابلِ مشاہدہ ہے، اسی طرح اسپریچول تہذیب آخرت میں قابلِ مشاہدہ ہوجائے گی۔

مذکورہ آیت میں 'أجرھم ونورھم' کا لفظ نہایت اہم حقیقت کو بتارہا ہے۔ اِس آیت میں اجر سے مراد جنت کی مادی نعمتیں ہیں اور نور سے مراد وہ تہذیب ہے جو جنت میں ایک روشن واقعہ بن جائے۔ اہلِ جنت ایک طرف 'لکم فیھا ما تشتھی أنفسکم' کے بمصداق، جنت کی اعلیٰ نعمتوں سے محظوظ ہوں گے اور دوسری طرف یہ ہوگا کہ ان کے اندر داخلی سطح پر پیدا ہونے والی ربانی کیفیات جو دنیا میں غیر مرئی حقیقت بنی ہوئی تھیں، آخرت میں وہ قابلِ مشاہدہ نور کی صورت میں نمایاں ہوجائیں گے۔ آخرت میں ظاہر ہونے والے اِس واقعے کو نورانی تہذیب یا اسپریچول تہذیب کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

اِسی طرح مذکورہ آیت میں اہلِ جنت کی زبان سے یہ لفظ ادا ہوا ہے: 'أتمم لنا نورنا'۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تو نے ہمیں جس اعلیٰ ربانی تجربے کی توفیق دی، وہ دنیا میں غیر مرئی بنا رہا۔ اب آخرت میں تو ہمارے ساتھ یہ مزید احسان فرما کہ اِن داخلی ربانی تجربات کو خارجی واقعے کی صورت میں ظاہر کردے۔ جس طرح مادہ پرست انسان کی داخلی دریافت خارجی طور پر دنیا میں مادی تہذیب کی صورت میں متشکل ہوئی تھی، اُسی طرح اب تو آخرت میں ہماری داخلی ربانی دریافتوں کو خارجی طور پر نورانی تہذیب یا اسپریچول تہذیب کی صورت میں متشکل کردے۔ یہی مطلب ہے مذکورہ آیت میں اتمامِ نور کا۔

آئڈیا کا متشکّل ہونا

خواہ مادی تہذیب کا معاملہ ہو یا اسپریچول تہذیب کا معاملہ، دونوں کی نوعیت اس اعتبار سے

یکساں ہے۔ دونوں کا وقوع ابتداءً ایک غیر مرئی آئڈیا(invisible idea) کی صورت میں ہوتا ہے، بعد کو وہ خارجی صورت میں متشکل ہوجاتا ہے۔ یہی معاملہ مادی تہذیب کا بھی ہے اور یہی معاملہ اسپریچول تہذیب کا بھی۔

اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ مائکل فریڈے(Michael Faraday, d. 1867)ایک برٹش سائنس داں تھا۔ کچھ تجربات کے دوران اُس کے دماغ میں ایک آئڈیا آیا، جو اب اصطلاحی طور پر الیکٹرومیگنٹزم (electromagnetism) کے طور پر معروف ہے۔ یہ آئڈیا فطرت کے اُس قانون کے بارے میں تھا جس کو الیکٹری سٹی (electricity) کہا جاتا ہے۔ اِس آئڈیا کے تحت یہ فارمولا بنایا گیا کہ بجلی کا مطلب ہے — الیکٹران کا بہاؤ:

Electricity means flow of electrons.

وہ چیز جس کو مادی تہذیب کہا جاتا ہے، وہ براہِ راست یا بالواسطہ طور پر فطرت کے دو قوانین کا نام ہے — روشنی (light) اورحرکت (motion)۔ فطرت کے اِن دو غیر مرئی قوانین نے جب عملی صورت اختیار کی تو اس کے نتیجے میں وہ مرئی ظاہرہ وجود میں آیا جس کو مادّی تہذیب کہا جاتا ہے۔

یہی معاملہ اسپریچول تہذیب کا بھی ہے۔ اسپریچول تہذیب ابتداءً ایک مخفی واقعے کی صورت میں ایک بندہ مومن کے سینے میں غیر مرئی طور پر وجود میں آتی ہے۔ اسپریچول تجربہ کیا ہے، اس کو قرآن کی اِن آیتوں کے مطالعے سے سمجھا جاسکتا ہے: والذین آمنوا أشد حباً لله (2:165)، ولم یخش إلا الله (9:18)، مما عرفوا من الحق (5:38)، وقلوبھم وجلة (23:60)، في أھلنا مشفقین (52:26)، لاتحزن إن الله معنا (9:40)، وغیرہ۔

مذکورہ حوالے ایک مومن کے سینے میں پیدا ہونے والے اسپریچول تموجات کو بتاتے ہیں۔ یہ اسپریچول تموجات(spiritual waves) اپنی حقیقت کے اعتبار سے بلا شبہہ ہمالیائی تموجات تھے، لیکن دنیا کی زندگی میں وہ غیر مرئی واقعہ بن کر رہ گئے۔ یہ خدا کی شانِ رحمت کے خلاف ہے کہ ایک سائنس داں کی مادی معرفت تو مادی تہذیب کی صورت میں متشکل ہو،

لیکن ایک مومن کی ربانی معرفت محسوس اسپریچول تہذیب کی صورت میں متشکل نہ ہو۔

قرآن کے مذکورہ بیانات اِسی سوال کا جواب ہیں۔ اِن آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سائنس دانوں کی مادی معرفت خارجی طور پر متشکل ہو کر دنیا میں مادی تہذیب کی صورت میں ظاہر ہوئی، اِسی طرح آخرت میں مزید اضافے کے ساتھ یہ ہوگا کہ مومن بندوں کی ربانی معرفت، جو دنیا میں غیر مرئی تھی، وہ آخرت میں خارجی طور پر متشکل ہوگی۔ اِسی واقعے کو قرآن میں نورانی ظہور سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی واقعے کا دوسرا نام آخرت کی ابدی دنیا میں بننے والی اسپریچول تہذیب ہے۔

دو قسم کے چہرے

قرآن میں مختلف مقامات پر بتایا گیا ہے کہ قیامت میں انسانوں کو چھانٹ کر الگ کیا جائے گا، اہلِ جنت الگ اور اہلِ جہنم الگ۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (3:103) یعنی جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے، تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے، اُن سے کہا جائے گا کہ کیا تم اپنے ایمان کے بعد منکر ہو گئے، تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کے سبب سے۔

"روشن چہرہ" سے مراد کیا ہے۔ اِس سے مراد وہی روشن شخصیت ہے جس کی وضاحت اِس سے پہلے ہو چکی ہے۔ "سیاہ چہرہ" سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کے چہروں پر سیاہ رنگ لگا دیا جائے گا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی داخلی برائی ظلمت بن کر اُن کے چہرے پر نمایاں ہو جائے گی۔ جس غیر ربانی شخصیت کو وہ اپنی جھوٹی تدبیروں سے اپنے اندر چھپائے ہوئے تھے، وہ ظاہر ہو کر لوگوں کو محسوس طور پر دکھائی دینے لگے گی۔ یہ کوئی پُر اسرار بات نہیں ہے، یہ وہی بات ہے جو دنیا کی زندگی میں بھی جزئی طور پر مشاہدات میں آتی ہے، چناں چہ کہا جاتا ہے کہ:

Face is the reflection of one's inner personality.

دنیا کی زندگی میں برے لوگوں کا حال یہ تھا کہ وہ اندر سے بالکل غیر سنجیدہ تھے، مگر اوپر سے

وہ اپنے آپ کو سنجیدہ ظاہر کرتے تھے۔ وہ جھوٹ اور بددیانتی پر کھڑے ہوئے تھے، لیکن خوب صورت الفاظ کے ذریعے وہ اپنی حقیقت پر پردہ ڈالے ہوئے تھے۔ دل اور دماغ کے اعتبار سے، وہ صرف ایک دنیا پرست انسان تھے، لیکن اپنے ظاہر فریب رویّے سے وہ آخرت پسندی کے اسٹیج پر پُررونق جگہ حاصل کیے ہوئے تھے۔ قیامت کے بعد جو آخرت کی دنیا آئے گی، وہاں تمام حقیقتیں اپنی اصل صورت میں ظاہر ہوجائیں گی۔ وہاں ہر عورت اور مرد اپنی اصل داخلی صورت میں نمایاں ہوجائے گا۔ یہی مطلب ہے قیامت میں چہروں کے سیاہ ہونے کا۔

برے لوگ وہاں اِس طرح اٹھیں گے کہ ان کے چہروں پر سخت قسم کی حسرت اور ندامت چھائی ہوئی ہوگی۔ وہ بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہوں گے۔ ان کا احساسِ محرومی ان کے پورے وجود کو بے قیمت بنائے ہوئے ہوگا۔ اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں ان کی کامل مایوسی کی بنا پر ان کا احساس یہ ہوگا کہ وہ حیوان سے بھی زیادہ بے قیمت ہیں۔ ان کی بے بسی کا یہ حال ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں سے چھپانا چاہیں گے، لیکن وہاں انھیں کوئی جگہ نہیں ملے گی جہاں وہ اپنے آپ کو چھپالیں۔

جنت کا معاشرہ

جنت کے معاشرے میں وہ خوش قسمت افراد جگہ پائیں گے جنھوں نے موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو جنتی شخصیت کی حیثیت سے تیار کیا ہوگا۔ جنتی شخصیت کا لفظ کوئی پراسرار لفظ نہیں ہے۔ اِس سے مراد وہ افراد ہیں جو انتہائی معنوں میں بلند فکری (high thinking) کے مالک ہوں۔ یہی وہ اعلیٰ کردار ہے جس کو قرآن میں خُلقِ عظیم (68:4) یا مزکّی شخصیت (20:76) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ اعلیٰ شخصیت والا انسان کون ہے، یہ وہ انسان ہے جس نے اپنے آپ کو ہر قسم کے دنیوی محرکات (worldly motivations) سے اوپر اٹھایا، جس نے اپنے آپ کو کامل طور پر متعصّبانہ فکر (biased thniking) سے پاک کیا، جس نے اپنے آپ کو نفس اور شیطان کی ترغیبات سے بچایا، جس نے اپنے اندر اُس انسان کی تعمیر کی جس کو کامپلکس فری سول (complex free soul) کہا جاتا ہے، جس نے دنیا کی زندگی میں یہ ثابت کیا کہ وہ انٹیگریٹیڈ پرسنالٹی (integrated personality) کا

حامل انسان ہے— یہی وہ صفات ہیں جن سے متصف افراد کو ایک لفظ میں، ربانی انسان کہا جا سکتا ہے۔انھیں صفات کے حامل افراد کو جنت میں آبادکاری کے لیے منتخب کیا جائے گا۔

جنتی شخصیت کی تعمیر

مذکورہ اعلیٰ ربانی صفات پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے، وہ صبر ہے۔ صبر کے ذریعے آدمی اِس قابل بنتا ہے کہ وہ مختلف قسم کے غیر موافق احوال کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے اندر جنتی شخصیت کی تعمیر کرے۔ وہ منفی اسباب کے اندر اپنی مثبت سوچ کو مستقل طور پر برقرار رکھے۔ وہ مسائل کو عذر (excuse) نہ بناتے ہوئے اپنا ربانی سفر جاری رکھے۔ اِسی بنا پر قرآن میں کہا گیا ہے کہ صبر کرنے والے جنت کے اعلیٰ مقامات میں جگہ پائیں گے۔(25:75)

صبر کی اِسی اہمیت کی بنا پر صبر کو اعلیٰ ترین انعام کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ہر عملِ خیر کی لازمی بنیاد ہے۔ اِسی لیے قرآن میں صبر کرنے والوں کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (39:10) یعنی بے شک صبر کرنے والوں کو اُن کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

جسمانی سرگرمیاں، ذہنی سرگرمیاں

انسانی تاریخ کی تصویر اگر یہ ہو کہ اس میں انسان کے جسم (body) کی سرگرمیاں (activities) تو خوب بیان ہوئی ہوں، مثلاً پہلوانی (wrestling) اور باکسنگ (boxing) جیسی سرگرمیاں تفصیل کے ساتھ ریکارڈ کی گئی ہوں، لیکن انسان کے وجود کا دوسرا اہم تر حصہ جس کو ذہن (mind) کہا جاتا ہے، اس کا سرے سے کوئی ذکر نہ ہو، پوری تاریخ میں انسان کی ذہنی سرگرمیاں (intellectual activities) غیر مذکور (unrecorded) ہو کر رہ جائیں تو ایسی انسانی تاریخ کو نہ صرف نامکمل، بلکہ آخری حد تک بے معنی (meaningless) کہا جائے گا۔

یہ فرضی بات نہیں، بلکہ یہ انوکھا واقعہ عملاً مزید اضافے کے ساتھ پوری دنیا میں پیش آیا ہے۔ وہ اِس طرح کہ انسان کی مادی سرگرمیاں مادی تہذیب کی صورت میں متشکل (materialized) ہو کر

اپنی پوری صورت میں لوگوں کے سامنے موجود ہیں۔ مادی تہذیب کو ہر آدمی جانتا ہے اور ہر آدمی اس کو دیکھ رہا ہے۔ مادی تہذیب ہر آدمی کے لیے ایک معلوم واقعہ ہے۔ لیکن انسانی سرگرمیوں کی ایک اور قسم ہے۔ اس کو اسپریچول سرگرمیاں (spiritual activities) کہا جاسکتا ہے۔ یہ وہ سرگرمیاں ہیں جو انفرادی سطح پر سچے انسانوں کی زندگی میں پیدا ہوئیں۔ وہ پوری طرح غیر مرئی (unobservable) تھیں۔ افراد کی داخلی زندگی میں مکمل طور پر موجود ہونے کے باوجود وہ ظاہری طور پر کبھی متشکل نہیں ہوئیں۔ مثلاً تاریخ کے ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جنھوں نے خدا کو اپنا سول کنسرن (sole concern) بنایا، جن کی سوچ تمام تر سچائی اور دیانت داری پر مبنی تھی، جنھوں نے دنیا کے بجائے آخرت کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا، جن کی آخری آرزو یہ تھی کہ اُن کو جنت میں داخلہ ملے، جنھوں نے خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کو سمجھا اور ان سے تجاوز نہیں کیا، جن کا ربانی شعور اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ ہر وقت داخلی طور پر توبہ واستغفار میں مشغول رہتے تھے۔

یہ تمام اعمال انتہائی اعلیٰ اعمال ہیں، لیکن وہ ہمیشہ کیفیات کی سطح پر پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کو کمیاتی اصطلاح (quantitative term) میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ربانی اعمال یا اسپریچول سرگرمیاں افراد کی داخلی دنیا میں پیدا ہوئیں اور پھر افراد کی موت کے ساتھ بظاہر ختم ہوگئیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ اعلیٰ اسپریچول تہذیب کی حیثیت رکھتی تھیں، مگر اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود وہ کبھی ظاہری طور پر متشکل نہیں ہوئیں جس طرح مادی تہذیب اپنی ظاہری صورت میں متشکل ہوئی۔

آخرت کی دنیا جو قیامت کے بعد آئے گی، وہ اِسی کی تلافی اور تکمیل کے لیے ہے۔ قیامت ایک طرف مادی تہذیب کو پوری طرح نابود کردے گی، اگلے مرحلہ حیات میں اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا، دوسری طرف یہ ہوگا کہ آخرت کے موافق ماحول میں ماضی کے اسپریچول واقعات پوری طرح متشکل ہوکر ایک اسپریچول تہذیب کی صورت اختیار کرلیں گے۔

یہ اسپریچول تہذیب ایک ابدی تہذیب ہوگی۔ قیامت سے پہلے کے دورِ تاریخ میں دونوں قسم کے افراد باہم ملے ہوئے تھے، لیکن قیامت کے بعد کے دورِ تاریخ میں دونوں کو

چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے گا۔(27:83)

خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کے مطابق، قیامت سے پہلے کا دورِ حیات انفرادی اعتبار سے تعمیرِ شخصیت کا دور تھا، وہ اجتماعی اعتبار سے تعمیرِ تہذیب کا دور نہ تھا۔ آخرت کی دنیا میں یہ ہوگا کہ جن افراد نے اپنی شخصیت کی تعمیر نہ کی، وہ رد کر دئے جائیں گے اور جن افراد نے اپنی شخصیت کی تعمیر کی، وہ خدا کے مطلوب بندے ٹھہریں گے۔ ایک گروہ کا کیس کامیابی کا کیس ہوگا اور دوسرے گروہ کا کیس ناکامی کا کیس۔(42:7)

قرآن میں دونوں قسم کے افراد کو مختلف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ کامیاب افراد روشن چہروں (bright faces) والے ہوں گے اور ناکام افراد سیاہ چہروں (dark faces) والے۔ کامیاب افراد ابدی طور پر خوشیوں کی زندگی پائیں گے اور ناکام افراد ابدی طور پر حسرت کی آگ میں جلتے رہیں گے۔

خاتمۂ کلام

اللہ کو مطلوب تھا کہ اسپریچول تہذیب کا تسلسل دنیا کے آغاز سے لے کر اس کے خاتمے تک جاری رہے۔ اللہ نے دیکھا کہ انسان کو دی گئی آزادی کی بنا پر یہ تسلسل مجموعے کی سطح پر جاری نہیں ہوسکتا، اس لئے اللہ نے اس کو افراد کی سطح پر جاری کر دیا۔ چناں چہ انسانی مجموعے کی سطح پر اگر چہ اسپریچول تہذیب کا تسلسل جاری نہیں ہے، لیکن افراد کی سطح پر یہ تسلسل مکمل طور پر جاری ہے۔ اِس سلسلے کا پہلا فرد غالباً ابتدائی دور کا ہابیل ابن آدم تھا، جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے (5:27) اور اِس سلسلے کا آخری فرد غالباً دورِ آخر کا وہ رجلِ مومن ہوگا جس کا ذکر صحیح مسلم کی ایک روایت میں آیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2938)

انسان کی آزادی کی بنا پر اس دنیا میں اسپریچول تہذیب کا اجتماعی تسلسل عملاً ناممکن ہے، لیکن اسپریچول تہذیب کا انفرادی تسلسل پوری طرح ممکن ہے اور بلاشبہہ وہ ہر دور میں اور ہر زمانے میں جاری رہا ہے۔ اسپریچول تہذیب کے عملی ظہور کے معاملے کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔

آپ ایک وسیع کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں آپ کے سامنے کی میز پر ایک ٹی وی سیٹ رکھا ہوا ہے۔ بظاہر کمرے میں صرف کچھ مادی چیزیں ہیں۔ مثلاً دیوار، کرسی، میز، وغیرہ۔ اِن چیزوں کو آپ دیکھ رہے ہیں، لیکن اِسی کے ساتھ وہاں ایک اور چیز ہے جو بظاہر دکھائی نہیں دیتی، مگر وہ مکمل طور پر موجود ہے۔ یہ دوسری چیز غیر مرئی لہروں (invisible waves) کی صورت میں ہے۔ اِس غیر مرئی دنیا میں زندہ انسان ہیں، آوازیں ہیں اور مختلف قسم کی عملی سرگرمیاں ہیں، لیکن بظاہر وہ مکمل طور پر غیر مرئی ہیں۔ اس کے بعد آپ اپنے ٹی وی سیٹ کو آن کرتے ہیں تو اچانک اسکرین پر ایک پوری دنیا نظر آنے لگتی ہے، جو اُسی طرح کامل اور بامعنی ہے جس طرح ٹی وی سیٹ کے باہر کی دنیا۔

اِس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اسپریچول تہذیب کیا ہے۔ وہ کس طرح آج بظاہر غیر موجود ہے اور آخرت کی دنیا میں وہ مکمل طور پر موجود ہوجائے گی۔ آخرت میں پیش آنے والا یہی وہ واقعہ ہے جس کے ایک پہلو کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (41:21)۔

آخرت میں اسپریچول تہذیب کے عملی ظہور کا واقعہ قدیم زمانے میں صرف ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا تھا، مگر موجودہ زمانے میں ٹیلی ویژن کی ایجاد گویا کہ اس معاملے کا ایک پیشگی مظاہرہ ہے۔ ٹیلی ویژن کی ایجاد نے اسپریچول تہذیب کے عملی ظہور کو مشاہداتی سطح پر قابلِ فہم (understandable) بنا دیا ہے۔

جنتی تہذیب

قرآن کی سورہ یاسین میں اہلِ جنت کے ذکر کے تحت یہ الفاظ آئے ہیں: اِنَّ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ الۡیَوۡمَ فِیۡ شُغُلٍ فٰکِهُوۡنَ (36:55) یعنی بے شک، اہلِ جنت آج ایک عظیم مشغلے میں ہوں گے، خوش — ہر آئینہ اہلِ بہشت امروز در کارے باشند، شاداں:

> Surely the dwellers of the paradise shall on that day be in an occupation quite happy.

آخرت میں سچے اہلِ ایمان کو جنت میں داخلہ ملے گا۔ وہاں وہ ابدی طور پر خوشیوں کی زندگی گزاریں گے۔ جنت ہر اعتبار سے، پرفکٹ (perfect) ہوگی۔ وہاں ہر اعتبار سے، اہلِ جنت کے لیے فل فل مینٹ (fulfilment) کا سامان ہوگا۔ وہاں اہلِ جنت نہ کبھی حزن کا شکار ہوں گے اور نہ وہ کبھی اکتاہٹ (boredom) میں مبتلا ہوں گے۔

تاہم جنت صرف آرام وعیش کی جگہ نہ ہوگی، بلکہ اسی کے ساتھ وہ اہلِ جنت کے لیے ایک اعلیٰ ترین سرگرمی کا مقام ہوگا۔ مذکورہ آیت میں اِس حقیقت کو بتانے کے لیے 'شغل' کا لفظ آیا ہے۔ شغل کے لفظی معنی مشغلہ (activity) کے ہیں۔ شغل کا لفظ اِس آیت میں نکرہ استعمال ہوا ہے۔ نحوی قاعدے کے مطابق، تنکیر برائے تفخیم ہوتی ہے۔ اِس لیے یہاں شغل سے مراد ہے ایک عظیم مشغلہ۔

اِس عظیم مشغلہ سے کس قسم کا مشغلہ مراد ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے مراد وہی مشغلہ ہے جو دنیا کی زندگی میں انسان کے لیے عظیم مشغلہ تھا۔ یہی مشغلہ بہت زیادہ اضافہ کے ساتھ آخرت میں بھی ابدی طور پر جاری رہے گا۔ اِس مشغلہ کو دنیا میں قوانینِ فطرت کی دریافت (discovery of natural laws) کہا جاتا ہے، اِسی کو قرآن میں کلمات اللہ (31:27) کہا گیا ہے۔ دنیا میں کلمات اللہ کی دریافت ابتدائی طور پر ہوئی تھی۔ آخرت میں دوبارہ 'کلمات اللہ' کی دریافت ابدی طور پر اور غیر مختتم طور پر جاری رہے گی۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے کلمات ناقابلِ قیاس حد تک زیادہ ہیں، اتنے زیادہ کہ اگر اُن کو لکھا جائے تو وہ ضبطِ تحریر میں نہ آسکیں۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (31:27) یعنی اگر زمین میں جو درخت ہیں، وہ قلم بن جائیں اور سمندر، سات مزید سمندروں کے ساتھ روشنائی بن جائیں، تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ بے شک اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

'کلمات اللہ' کا لفظی مطلب ہے اللہ کی باتیں (word's of God)۔ اللہ کا کلمہ سادہ طور پر صرف کلمہ نہیں ہوتا، وہ ایک محکم فیصلہ یا اٹل قانون ہوتا ہے۔ کلمات اللہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو قرآن میں مختلف مقامات پر 'امرِ رب' یا 'امر اللہ' کہا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، اس کو قوانینِ الٰہیہ (divine laws) کہا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اہلِ سائنس اِس واقعے کو قوانینِ فطرت (laws of nature) کہتے ہیں۔

یہی قوانینِ الٰہیہ یا قوانینِ فطرت ہیں جن کی بنیاد پر کائنات کی تخلیق ہوئی اور یہی قوانین ہیں جن کے تحت نہایت محکم انداز میں کائنات کا پورا نظام مسلسل طور پر چل رہا ہے۔ یہی قوانین انسان کے لیے اس کی تمام فکری اور عملی ترقیوں کا ماخذ ہیں۔ اِنھیں قوانین میں تدبر کرکے انسان معرفت حاصل کرتا ہے۔ اِنھیں قوانین میں تدبر کرکے انسان تخلیق کی معنویت کو دریافت کرتا ہے۔ انھیں قوانین میں تدبر کرکے انسان اللہ کی عظمت (glory) سے آشنا ہوتا ہے۔ انھیں قوانین میں تدبر کرکے انسان کے اندر وہ صفات پیدا ہوتی ہیں جن کو اللہ کے لیے حبّ شدید اور خوفِ شدید کہا جاتا ہے۔ انھیں قوانین پر تدبر کرکے آدمی اپنے اندر وہ ربانی شخصیت پیدا کرتا ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ یہ قوانین الٰہیہ اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ انسان ابد تک اُن میں تدبر کرتا رہے اور وہ کبھی ختم نہ ہوں۔

یہی قوانین یا قوانینِ فطرت ہی تمام علوم کا خزانہ ہیں۔ موجودہ زمانے میں جس ظاہرے کو تہذیب (civilization) کہا جاتا ہے، وہ اِنھیں قوانین الٰہیہ یا قوانین فطرت کی جزئی دریافت کے

نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔ سائنس کے علوم تمام تر انھیں قوانین میں غور وفکر کے ذریعے حاصل ہوئے ہیں۔ یہی قوانین، حکمت (wisdom) کا خزانہ ہیں۔ حقیقت ہے کہ اِن قوانین کے ساتھ انسان انسان ہے۔ اگر اِن قوانین کو انسان سے جدا کر دیا جائے تو انسان صرف ایک حیوان بن کر رہ جائے گا۔ جو چیز انسان کو انسان بناتی ہے، وہ اس کی صرف یہ خصوصیت ہے کہ وہ فطرت کے قوانین کو دریافت کرکے اُن کو اپنے لیے استعمال کرتا ہے۔

امریکی مصنف الون ٹافلر (Alvin Tafler) کی ایک کتاب 'فیوچر شاک' (*Future Shock*) ہے، جو پہلی بار 1970 میں امریکا سے شائع ہوئی۔ اس نے اِس کتاب میں کہا تھا کہ ہمارا انڈسٹریل ایج (industrial age) مزید ترقی کرکے اب سپر انڈسٹریل ایج (super industrial age) میں داخل ہونے والا ہے۔ مغربی مصنف نے اپنی یہ پیشین گوئی بیسویں صدی میں کی تھی، لیکن صدی کے آخر میں اس کا یہ خواب منتشر ہوگیا۔ ماحولیاتی مسائل (ecological problems) نے بتایا کہ زمین پر انسانی تہذیب کی آخر حد آچکی ہے۔ اِس زمین پر انسانی تہذیب کا سفر مزید آگے جاری رہنے والا نہیں۔

تہذیب کیا ہے۔ تہذیب تمام تر قوانین فطرت پر مبنی ایک ظاہرہ ہے۔ قوانینِ فطرت سے الگ تہذیب کا کوئی وجود نہیں۔ جب یہ واقعہ ہے کہ قوانینِ الٰہیہ یا قوانین فطرت کی کوئی حد نہیں تو لازمی طور پر یہ بھی ہونا چاہئے کہ تہذیب کی ترقی کی کوئی حد نہ ہو، تہذیب کی ترقی کا سفر ابدی طور پر جاری رہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن ہم کو رہنمائی دیتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ تہذیبِ انسانی کا سفر موجودہ دنیا کے دورِ حیات میں ختم نہ ہوگا، بلکہ وہ مزید ترقی کے ساتھ زیادہ اعلیٰ صورت میں آخرت کے ابدی دورِ حیات میں جاری رہے گا۔

قرآن میں یہ بات، نعوذ باللہ، بطور بوسٹنگ (boasting) نہیں ہے، بلکہ وہ بطور پیشین گوئی ہے، یعنی اِس قرآنی بیان میں دراصل یہ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ تہذیب کا نامکمل سفر اپنی تکمیل کو پہنچے۔ موجودہ دنیا میں 'کلمات اللہ' کا جو اظہار جزئی صورت میں ہوا ہے،

آخرت کی دنیا میں اس کا اظہار کامل صورت میں ہوگا۔

قرآن یہ خوش خبری دیتا ہے کہ انسانی تہذیب کا سفر ادھورا نہیں رہے گا، بلکہ وہ مزید ترقی کے ساتھ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ ارتقا کا جو موقع انسان کو حیاتِ دنیا میں نہیں ملا تھا، وہ آخرت کی زندگی میں مزید اضافے کے ساتھ اس کو حاصل ہو جائے گا۔

تہذیب کے دو دور

تہذیب کے دو دور جن کا ذکر اوپر کیا گیا، اُن کا حوالہ قرآن میں صراحتاً موجود ہے۔ تہذیب کا پہلا دور جو قوانینِ فطرت کی جزئی دریافت کے ذریعے موجودہ دنیا میں ظہور میں آئے گا، اس کا ذکر قرآن کی سورہ حٰم السجدہ میں اِن الفاظ میں آیا ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) یعنی عن قریب ہم اُن کو اپنی نشانیاں (signs) دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی، یہاں تک کہ اُن پر پور طرح آشکارا ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں قوانینِ الٰہیہ پر مبنی تہذیب کے اُس دور کا ذکر ہے جو موجودہ دنیا میں پیش آنے والا تھا۔ قرآن کی یہ پیشین گوئی انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں سائنس کے ظہور کی صورت میں واقعہ بن چکی ہے۔ سائنس کی دریافتوں نے یہ کیا ہے کہ آفاق وانفس میں جو خدائی نشانیاں (signs of God) موجود تھیں، اُن کو جزئی طور پر دریافت کیا اور اِس طرح انسان کے لیے تبیینِ حق کے نئے مواقع کھول دئے۔ اِن دریافتوں کے ذریعے انسان کو ایک نیا فریم ورک (frame work) ملا۔ اِس کے ذریعے یہ ممکن ہو گیا کہ انسان خالص علمی اور عقلی سطح پر اللہ کی معرفت حاصل کرے۔

قوانینِ الٰہیہ پر مبنی تہذیب کا دوسرا عظیم تر ظہور آخرت کے دورِ حیات میں پیش آئے گا۔ تہذیب کے اِس دوسرے دور کو ربانی تہذیب کہا جا سکتا ہے۔ یہ دور اپنے تمام کمالات کے ساتھ ابدی طور پر جاری رہے گا۔ اِس دوسرے دورِ تہذیب کا ذکر قرآن کی سورہ الکہف میں اِن الفاظ میں آیا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ○ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ○ قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ

تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (18:107-109) یعنی بے شک جولوگ ایمان لائے اورانھوں نے عملِ صالح کیا، اُن کے لیے فردوس کے باغوں کی ضیافت ہے۔ اِس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہ وہاں سے نکلنا نہ چاہیں گے۔ کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی نشانیوں کو لکھنے کے لیے روشنائی ہوجائے تو سمندر ختم ہوجائے گا، اِس سے پہلے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں، اگر چہ ہم اس کے ساتھ اسی کی مانند اور سمندر ملادیں۔

قرآن کی اِن آیات پر غور کیجئے۔ سب سے پہلے فرمایا کہ ”جولوگ ایمان لائے اورانھوں نے عمل صالح کیا، یعنی جن لوگوں نے دریافت کی سطح پر اللہ کی معرفت حاصل کی اور پھر اس معرفت کے مطابق، اپنی عملی زندگی کو ربانی زندگی بنا دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ”اُن کے لیے فردوس کے باغوں کی ضیافت ہے“، یعنی آخرت میں اُن کو اللہ کے آفاقی گیسٹ ہاؤس (universal guest house) میں ابدی طور پر رہنے کا موقع دیا جائے گا۔ اِس کے بعد فرمایا کہ ”اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہ وہاں سے نکلنا نہ چاہیں گے“۔

انسان کا مزاج یہ ہے کہ اگراس کو یکساں قسم کی مادی نعمتیں دی جائیں تو یہ نعمتیں خواہ کتنی ہی زیادہ ہوں، کچھ دنوں کے بعد وہ ان کی یکسانیت کی بنا پر بورڈم (boredom) کا شکار ہوجائے گا، وہ اُن سے محظوظ نہ ہوسکے گا۔ اِس کے بعد فرمایا کہ ”وہ جنت سے نکلنا نہ چاہیں گے“۔ اِس طرح کی کیفیت پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اہلِ جنت کو مادی نعمتوں کے سوا ایک اور چیز حاصل ہو اور وہ ہے — بار بار نئی چیزوں کا ملنا، بار بار نئی دریافتوں کا تجربہ پیش آنا، مسلسل طور پر فکری ارتقا کا جاری رہنا جن کی بنا پر اہلِ جنت کی تخلیقیت (creativity) کبھی ختم نہ ہوگی۔ اہلِ جنت کی شخصیت میں یہ ارتقا معرفتِ خداوندی میں ارتقا کے ذریعے پیش آئے گا۔

جنت میں تخلیقی سرگرمیوں (creative activities) کے جو اتھاہ مواقع ہوں گے، اُن کو آیت کے اگلے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، اور وہ ہے اہلِ جنت کے ذریعے ’کلمات اللہ‘ کی ابدی انفولڈنگ (eternal unfolding)۔ قرآن کے مطابق، ’کلمات اللہ‘ کی تعداد لا محدود ہے۔

سائنس کے ذریعے اِن ’کلمات اللہ‘ کا جزئی ظہور (partial unfolding) ہوا، جس کے نتیجے میں دنیا کی تہذیب وجود میں آئی۔ آخرت میں اہلِ جنت کے ذریعے ’کلمات اللہ‘ کا کامل ظہور ہوگا۔ اِس کے نتیجے میں وہ دورِکمال وجود میں آئے گا جس کو جنتی تہذیب کہا جاتا ہے۔

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر انسان جو یہاں پیدا ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو تیاری میں لگا دیتا ہے۔ ہر آدمی اپنے اندر کسی نہ کسی شعبے کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر آدمی آخری حدتک یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے اندر کوئی خاص ہنر مندی (skill)، کوئی خاص لیاقت (qualification)، کوئی خاص مہارت (expertise) پائی جائے، تاکہ وہ موجودہ دنیا میں قائم شدہ تہذیب کے نقشے میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل کرسکے۔ ہر عورت اور مرد زندگی کی اِس حقیقت کو جانتے ہیں اور اس کے لیے پوری طرح سرگرم رہتے ہیں۔

یہی معاملہ آخرت میں بننے والی بلندتر تہذیب کا ہے۔ وہاں بھی سرگرمیاں ہوں گی، وہاں بھی مناصب ہوں گے، وہاں بھی ہر قسم کے اعلیٰ شعبے ہوں گے۔ جنتی دنیا کے ان اعلیٰ مواقع کو حاصل کرنے کے لیے بھی تیار ذہن اور تربیت یافتہ افراد درکار ہیں۔ موجودہ دنیا ایک اعتبار سے، اِسی اعلیٰ تیاری کی تربیت گاہ ہے۔

موجودہ دنیا کے حالات میں لوگوں کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندر وہ ربانی صلاحیت پیدا کریں جو اُن کو اِس قابل بنائے کہ وہ آخرت میں بننے والی برتر تہذیب کے مناصب کے لیے منتخب کیے جاسکیں اور پھر ابدی طور پر نہ صرف آرام وعیش کی زندگی گزاریں، بلکہ ایک ایسے تہذیبی سفر کا حصہ بن جائیں جس کی ترقیاں کبھی ختم نہ ہوں۔ یہ لامحدود خوشی (endless pleasure) کی زندگی ہوگی، جو اللہ کی خصوصی رحمت سے اہلِ جنت کو حاصل ہوگی۔

موجودہ دنیا میں کسی آدمی کو جو عزت کا مقام ملتا ہے، وہ اِس بنیاد پر ملتا ہے کہ اس نے تہذیب کے تقاضوں کے مطابق، اپنے آپ کو کتنا تیار کیا ہے۔ یہی معاملہ آخرت کی جنتی تہذیب میں بھی ہوگا۔ موجودہ دنیا کی تہذیب میں ہر آدمی کو ڈاکٹر، انجینئر، اسکالر اور ٹکنکل اکسپرٹ، وغیرہ کی نسبت سے

مقام ملتا ہے۔آخرت میں عارف، متقی اور خاشع، وغیرہ کی نسبت سے اس کو مقام حاصل ہوگا۔ دنیا میں آدمی کو دنیوی تقاضے کے مطابق تیاری کی نسبت سے اپنا مقامِ استعمال ملتا ہے۔آخرت میں ہر آدمی کو ربانی تقاضے کے مطابق تیاری کی نسبت سے اپنا مقامِ استعمال ملے گا۔

خلاصۂ کلام

تہذیب (civilization) کیا ہے۔تہذیب، اپنی حقیقت کے اعتبار سے،کلماتِ الٰہیہ کے ظہور کا نام ہے۔ قیامت سے پہلے کے دورِ حیات میں یہ ظہور جزئی طور پر ہوگا اور قیامت کے بعد کے دورِ حیات میں کامل طور پر۔موجودہ دنیا میں انسان کو آزادی حاصل تھی، اِس لیے موجودہ دنیا میں کلماتِ الٰہیہ کے جزئی ظہور سے جو تہذیب بنی، اس میں انسانی فساد کی بنا پر منفی اجزا شامل ہوگئے۔ لیکن آخرت میں کلماتِ الٰہیہ کے کامل ظہور سے جو تہذیب وجود میں آئے گی، وہ انسانی فساد سے پوری طرح پاک ہوگی۔ اِس لیے آخرت میں ظہور میں آنے والی تہذیب تمام تر مثبت اجزا پر مبنی ہوگی۔اِسی لیے اس کو جنتی تہذیب کہا گیا ہے۔

قرآن میں جنت کے حوالے سے ارشاد ہوا ہے کہ: لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ (37:61)؛ یعنی انسان کو چاہیے کہ وہ موجودہ دنیا کو ایک موقع (opportunity) کے طور پر لے۔وہ اپنے آپ کو اِس اعتبار سے تیار کرے کہ وہ آخرت میں بننے والی جنتی تہذیب میں اپنے لیے باعزت جگہ پا سکے۔اِسی لیے کہا گیا ہے کہ موجودہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت کی دنیا دار الجزا۔

قیامت کے دروازے پر

25 جون 2008 کی صبح کو میں آل انڈیا ریڈیو سے خبریں سن رہا تھا۔ خبروں کے آخر میں حسب معمول کھیل کی کمنٹری آنے لگی۔ ومبلڈن (Wimbledon) سے رپورٹ دیتے ہوئے، رپورٹر نے کہا کہ — ندال (Rafael Nadal) زبردست جیت کے دروازے پر:

Nadal on the threshold of a landslide victory.

اِن الفاظ کو سُن کر میں نے سوچا کہ لوگ کتنی زیادہ بڑی بھول میں مبتلا ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ عظیم کامیابی کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں، حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ندال سمیت پوری انسانیت آج قیامت کے دروازے پر کھڑی ہوئی ہے:

Nadal as well as whole humanity is on the threshold of Doomsday.

قرآن کی سورہ المومنون میں تمام انسانیت کو خطاب کرتے ہوئے خداوندِ عالم نے فرمایا: تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے:

Do you think that we created you without any purpose, and that you shall not be returned to Us. (23:115)

قرآن میں اِس طرح کی مختلف آیتیں ہیں جن میں خدا کا کری ایشن پلان (creation plan) بتایا گیا ہے۔ اِس کے مطابق، خدا نے ایک آئڈیل دنیا بنائی جس کو جنت (paradise) کہا گیا ہے۔ یہ آئڈیل دنیا ابدی ہے (2:25)۔ وہ خوف اور حُزن سے خالی ہے (35:34)۔ وہاں انسان کے لیے کامل فُل فِل مینٹ (fulfilment) کا سامان موجود ہے (41:31)۔

اِس کے بعد خدا نے سیارۂ زمین کو بنایا اور پھر یہاں انسانی نسل کو آباد کیا۔ خدا نے انسان کو آزادی (freedom) عطا کی اور زمین پر بقاءِ حیات کے تمام اسباب فراہم کیے، جن کے مجموعے کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔ خدا کے تخلیقی پلان کے

مطابق، سیارۂ زمین کی حیثیت ایک سلیکشن گراؤنڈ (selection ground) کی ہے۔ خدا کے فرشتے یہاں رات دن انسان کا ریکارڈ تیار کررہے ہیں۔ جو لوگ اپنے اعلیٰ ریکارڈ کے مطابق، جنت کے مستحق ٹھیریں گے، اُن کو منتخب کرکے موت کے بعد کی ابدی زندگی میں جنت میں بسایا جائے گا، جہاں وہ ہمیشہ کے لیے خوشیوں اور راحتوں کی زندگی گزاریں گے۔

یہی وہ بات ہے جو قرآن کی اِس آیت میں کہی گئی ہے: ''بڑا بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے، اور وہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے'':

> Glory is to God in whose hand is the kingdom, and He has power over all things; who created death and life, so He may test you, which of you is best in action. He is the mighty, the Most Forgiving. (67: 1-2).

انسانِ اوّل (آدم) کے بعد بے شمار لوگ پیدا ہوکر زمین پر آباد ہوئے اور بدستور پیدا ہوکر آباد ہورہے ہیں، مگر خدا کو صرف وہ عورت اور مرد مطلوب ہیں جو اُس کے تخلیقی پلان کے مطابق، احسنُ العمل (best in deed) ثابت ہوں۔

خدا کے اِس تخلیقی پلان کے مطابق، انسان اگرچہ ابدی مخلوق (eternal being) کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے، لیکن سیارۂ زمین پر اس کو ابدی طور پر نہیں رہنا ہے، موجودہ سیارۂ زمین اس کی عارضی قیام گاہ ہے۔ اِسی عارضی مدت کے خاتمے کے دن کا نام قیامت (Doomsday) ہے۔

سیارۂ زمین پر خدا نے وہ تمام اسباب اکھٹا کیے جو مذکورہ تخلیقی پلان کے مقصد کی نسبت سے ضروری تھے۔ اِن اسباب کی حیثیت وہی ہے جو امتحان ہال (examination hall) میں موجود سامان کی ہوتی ہے۔ یہ سامان، امتحان کی ضرورت کے تحت، امتحان ہال میں اکھٹا کیے جاتے ہیں۔ امتحان کے ختم ہوتے ہی ان کی مطلوبیت بھی ختم ہوجاتی ہے۔ طالب علم کو یہ اسباب

صرف امتحان کے سامان کے طور پر دیے جاتے ہیں، نہ کہ ذاتی انعام کے طور پر۔ اس لیے امتحان کے ختم ہوتے ہی طالبِ علم سے یہ تمام اسباب چھن جاتے ہیں۔

اِس معاملے میں خدا کے تخلیقی پلان کا ایک اور پہلو وہ ہے جو قرآن کی سورہ نمبر 8 میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (8:42) یعنی جس کو ہلاک ہونا ہے، وہ حجت کے ساتھ ہلاک ہو اور جس کو زندہ رہنا ہے، وہ حجت کے ساتھ زندہ رہے۔

اِس قانونِ الٰہی کا ایک پہلو وہ ہے جو قیامت سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ قیامت جب آئے گی تو وہ براہِ راست خدائی فیصلے کے تحت آئے گی، لیکن انسانی معاملات میں خدا اپنا فیصلہ پُراسرار بنیاد پر نہیں کرتا، بلکہ اِس طرح کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو پوری طرح معقول اور جائز (justified) معلوم ہو۔ حالات بتاتے ہیں کہ، قرآن کے الفاظ میں، آنے والی گھڑی بالکل قریب آچکی ہے، اور کوئی اس کو ٹالنے والا نہیں (53:57-58)۔

اِس معاملے کی پہلی علامت وہ تھی جس کو پری فائنل وارننگ (pre-final warning) کہا جاسکتا ہے۔ یہ واقعہ 1991 میں کمیونسٹ ایمپائر کے ٹوٹنے کی صورت میں پیش آیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، 1917 میں سوویت روس قائم ہوا۔ اِس کے بعد ایسے حالات پیش آئے کہ اس کو غیر معمولی توسیع و ترقی ہوئی۔ یہاں تک کہ 1957 میں سوویت روس نے پہلا راکیٹ (Sputnik) خلا میں بھیجا، تو اس کو عالمی سپر پاور کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

لیکن سوویت یونین، یا کمیونسٹ ایمپائر کی آئڈیالوجی میں آغاز ہی سے ایک ایسی چیز شامل تھی جو خدا کے تخلیقی پلان کے خلاف تھی۔ خدا نے اپنے تخلیقی پلان کے مطابق، انسان کو لازمی طور پر آزادیٔ انتخاب (freedom of choice) عطا کیا ہے۔ کیوں کہ آزادی کے بغیر ٹیسٹ (امتحان) ممکن نہیں۔ لیکن کمیونسٹ ایمپائر نے خود ساختہ نظریے کے تحت، اپنے علاقے میں مذہبی آزادی کا مکمل خاتمہ کردیا۔ کسی بھی قسم کی مذہبی سرگرمی اس کے اندر خلافِ قانون

قرار پاگئی۔ حکومتی سطح پر اینٹی ریلجس ڈپارٹمینٹ قائم ہوا۔ اس کا کام یہ تھا کہ کمیونسٹ ایمپائر کے اندروہ ہر قسم کی مذہبی سرگرمی کو کچل کر ختم کردے۔

یہ بات واضح طور پر خدا کے تخلیقی پلان کے خلاف تھی، اور اِس قسم کی کوئی چیز خدا کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوسکتی جو خدا کے تخلیقی پلان کی منسوخی کے ہم معنیٰ ہو۔ چناں چہ سوویت یونین میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ 1991 میں سوویت یونین کا سیاسی محل تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر ختم ہوگیا۔ یہ گویا کہ مادّی تہذیب کے فائنل خاتمہ سے پہلے دیا جانے والا ایک خدائی انتباہ (divine warning) تھا۔ لیکن اِس کے بعد بھی انسان نے اِس واقعے سے سبق نہیں لیا۔ اِس کے بعد بھی اُس نے ایسی سرگرمیاں جاری رکھیں جو خدا کے تخلیقی پلان سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔

خدا نے اپنے تخلیق پلان کے مطابق، انسان کے لیے دو نہایت اہم چیزوں کا انتظام کیا ہے — اِن میں سے ایک کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح دوسرے کو مارل سپورٹ سسٹم (moral support system) کہا جاسکتا ہے۔ پچھلے برسوں میں انسان نے اِن دونوں فطری نظاموں کو نا قابلِ تلافی حد تک تباہ کردیا ہے اور اِس طرح اُس نے اِس کا جواز (justification) کھو دیا ہے کہ اس کو سیارۂ زمین پر مزید باقی رکھا جائے۔ کیوں کہ انسان کو زمین کے فطری نظام کو برقرار رکھتے ہوئے اپنا کام کرنا تھا، اس کو یہ رائٹ نہیں تھا کہ وہ زمین کے فطری نظام کو تباہ کر ڈالے۔

لائف سپورٹ سسٹم

خدا نے جب سیارۂ زمین پر اِنسان کو بسایا، تو یہاں اُس نے وہ تمام مادّی سامان مہیا کیے جو انسان جیسی مخلوق کی زندگی اور بقا کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً ہوا، پانی، روشنی اور غذا، وغیرہ۔ موجودہ زمانے میں اِن انتظامات کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔

موجودہ زمین پر انسان کو اس کے خالق نے ایک محدود مدت کے لیے بسایا ہے، اس لیے یہ انتظامات محدود پیمانے پر کیے گیے ہیں۔ اِن انتظامات کو لامحدود طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

مثال کے طور پر لائف سپورٹ سسٹم کا انتظام، انسان کی فطری ضرورت (natural need) کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ اب اگر انسان ایسا کرے کہ وہ ہوس پرستانہ تعیش (luxury) کے لیے لامحدود طور پر اُن کو استعمال کرنے لگے، تو اِس سے فطرت کا نظام غیر متوازن ہوجائے گا اور وہ چیز پیدا ہوجائے گی جس کو قرآن میں فساد (7:85) کہا گیا ہے۔

موجودہ زمانے میں عملاً ایسا ہی پیش آیا ہے۔ انسان نے اپنی لامحدود خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے اور تعیّشات کا انبار اپنے گرد اکھٹا کرنے کے لیے بڑی بڑی صنعتیں قائم کیں۔ بڑی بڑی موٹر کاریں بنائیں، بے شمار قسم کے کنزیومر گڈس (consumer goods) تیار کیے، ہر چیز کو ائر کنڈیشنڈ کرنے کی کوشش کی، ہتھیار کی صنعت (armament industry) کو چلانے کے لیے بڑے بڑے اسلحہ ساز کارخانے قائم کیے، وغیرہ۔

اِس قسم کی چیزیں انسان کی ضرورت (need) نہ تھیں، وہ صرف اس کی ہوس (greed) کا تقاضا تھیں۔ اِس انتخابی دنیا میں خدا کا نظام ضرورت کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے، نہ کہ ہوس کی بنیاد پر۔ مگر اتباعِ ہویٰ (18:28) کی وجہ سے یہ توازن ٹوٹ گیا۔ اِس طرح انسان، فطرت کے مقرر راستے سے ہٹ گیا۔ اِس کا بھیانک نتیجہ ائر پلوشن، واٹر پلوشن، نوائز پلوشن اور پلاسٹک پلوشن، وغیرہ کی صورت میں نکلا۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کو قرآن میں فَسَادٌ فِي الْأَرْضِ (7:85) کہا گیا ہے، یعنی فطرت میں قائم کردہ توازن (balance) کا ٹوٹ جانا۔ موجودہ زمانے میں یہ واقعہ بڑے پیمانے پر پیش آیا ہے۔ قدیم روایتی زمانے میں انسان، فطرت (nature) کو صرف بقدر ضرورت استعمال کرتا تھا۔ اِس لیے دنیا میں فطری توازن کا نظام بگڑنے نہیں پایا۔

موجودہ صنعتی تہذیب کے زمانے میں انسان کو جدید طاقتوں پر دست رس حاصل ہوگئی۔ اب اُس نے لامحدود طور پر فطرت (nature) کا استعمال شروع کردیا۔ اِس کے نتیجے میں فطرت کا توازن مختل ہوکر رہ گیا۔

انسان نے جو کارخانے بنائے، اُن میں ایسا ایندھن استعمال ہوتا تھا جس سے وہ سنگین مسئلہ پیدا ہوا جس کو کاربن ایمیشن (carbon emission) کہا جاتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری فضا، مضر گیسوں سے بھر گئی۔ سمندر، خالص پانی کی فراہمی کا ذریعہ تھے، لیکن صنعتی کثافتیں جو ندیوں وغیرہ کے ذریعے بہہ کر سمندر میں پہنچیں۔

ان صنعتی کثافتوں کے نتیجے میں یہ ناقابلِ حل مسئلہ پیدا ہوا کہ سمندروں میں پانی کا عظیم ذخیرہ پنچانوے فی صد تک خطرناک طور پر آلودگی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ حالات کی شدت کے نتیجے میں صحت بخش کیڑے مکوڑے (insects) روزانہ بہت بڑی تعداد میں مر کر ختم ہو رہے ہیں، جن کا کوئی بھی بدل فراہم کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں۔

جدید صنعتوں ہی کے نتیجے میں وہ سپر پرابلم پیدا ہوا جس کو گلوبل وارمنگ کہا جاتا ہے۔ تمام دنیا کے سائنس داں متفقہ طور پر یہ کہہ رہے ہیں کہ زمین کے اوپر لائف سپورٹ سسٹم میں جو خطرناک بگاڑ آیا ہے، وہ ناقابلِ اصلاح (irreversible) ہے۔ تمام سائنس داں جدید سائنسی مشاہدات کی بنیاد پر یہ وارننگ دے رہے ہیں کہ بیس سال کے اندر حالات اتنے زیادہ خراب ہو جائیں گے کہ سیارۂ زمین، انسان جیسی کسی مخلوق کے لیے ناقابلِ رہائش (inhabitable) ہو جائے گا۔

موجودہ سیارۂ زمین، انسان کو بقدرِ ضرورت استعمال کے لیے دیا گیا تھا، لیکن انسان نے تجاوز کر کے زمین کو بقدرِ تعیّش استعمال کرنا چاہا۔ اِس کے نتیجے میں انسان نے زمین پر اتنا زیادہ بگاڑ پیدا کر دیا کہ اُس نے زمین پر مزید رہنے کا جواز کھو دیا۔ بظاہر اب آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے، جب کہ انسان کو زمین سے بے دخل کر دیا جائے۔ اِسی بے دخلی کے دن کا دوسرا نام قیامت ہے۔

مارل سپورٹ سسٹم

خدا نے انسان کو فطرتِ صحیحہ (30:30) پر پیدا کیا۔ اُس نے انسان کے اندر پیدائشی طور پر بُرائی اور بھلائی کی تمیز رکھ دی (91:8) پھر خدا نے انسان کے اندر ضمیر (conscience) رکھ دیا، جس کو قرآن میں نفسِ لوّامہ (75:2) کہا گیا ہے۔ یہ نفسِ لوامہ، ہر انسان کے لیے ایک داخلی گائڈ کی حیثیت

رکھتا ہے۔ وہ ہر موقع پر انسان کو صحیح اور غلط کا علم دیتا رہتا ہے۔

یہ پورا نظام جو نفسیات کی سطح پر قائم کیا گیا ہے، وہ گویا کہ انسان کے لیے ایک قسم کا مارل سپورٹ سسٹم (moral support system) ہے۔ وہ اِس لیے ہے کہ زندگی کے ہر مرحلے میں انسان کو درست رویّے پر قائم رکھے، وہ انسان کو اخلاقی بگاڑ کی طرف جانے سے روکتا رہے۔

موجودہ زمانے میں انسان نے یہ سنگین جرم کیا کہ اُس نے خدا کے قائم کردہ اِس مارل سپورٹ سسٹم کو تباہ کردیا۔ مغربی تہذیب کے فروغ کے بعد ایسے نظریے وضع کئے گئے جنھوں نے انسان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ نیچر کوئی چیز نہیں، سب کچھ صرف نرچر (nurture) پر منحصر ہے، یعنی یہ دراصل سماجی اثرات ہیں جو کسی انسان کی شخصیت کو بناتے ہیں۔

اِس فلسفیانہ اسکول کو عام طور پر بہیویر ازم (Behaviourism) کہا جاتا ہے۔ اس نظریے نے لوگوں کے اندر یہ ذہن بنایا کہ ربانی فطرت (divine nature) کوئی حقیقی چیز نہیں، وہ صرف ایک سماجی ظاہرہ (social phenomenon) ہے:

Behaviourism: The doctrine that valid data consists only of the observable and measurable in individual's responses, not valuing subjective or introspective accounts.

اِسی طرح وہ فلسفہ وضع کیا گیا جس کو اِفادی نظریہ (Utilitarianism) کہا جاتا ہے۔ اِس نظریے نے اِفادیت پسندی کو وہ جگہ دے دی جو فطرت کے نظام کے تحت، اخلاقی اقدار (moral values) کو حاصل تھی۔ ذاتی مفاد نے زندگی میں وہ حیثیت اختیار کرلی جو اِس سے پہلے اعلیٰ اصولی معیارات کو حاصل تھی۔ اِس نظریے کا خلاصہ اِن الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

Utilitarianism: The doctrine that the greatest happiness of the greatest number should be the aim of all action. The doctrine that the worth, or value of anything is determined solely by its utility.

اِس نظریے نے ذاتی خوشی، یا ذاتی مفاد کو کسی شخص کی زندگی میں واحد قابلِ لحاظ چیز قرار دے دیا۔ اِس نظریے کے مطابق، جس چیز سے آدمی کو خوشی ملے اور جس میں اس کو اپنا مادّی فائدہ

نظر آئے، وہ اس کو بلا تأمل اختیار کرسکتا ہے۔ اِس معاملے میں ضمیر، یا فطرت کی آواز کا لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اِس نظریے نے فطرت کے قائم کردہ مارل سپورٹ سسٹم کو زندگی کے معاملات میں اضافی (relative) قرار دے دیا۔ اِس طرح، فطرت کا قائم کیا ہوا اخلاقی نظام عملاً غیر موثر ہوکر رہ گیا۔

اِسی طرح، مارل سپورٹ سسٹم کو غیر موثر بنانے میں سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) کا بہت بڑا دخل ہے۔ اس نے اپنے نظریات کے ذریعے انسان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ مطلق اخلاقی اقدار کا کوئی وجود نہیں۔ اُس نے بتایا کہ نفسیاتی پیچیدگیاں ابتدائی دور کے جذباتی صدمات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ وہ دبی ہوئی صنفی توانائی کا اظہار ہیں۔

سگمنڈ فرائڈ نے اپنے اِس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے مختلف قسم کی تکنیک اور خواب کی صنفی تعبیر کا سہارا لیا، اس طرح اس نے بتایا کہ نفسیاتی مسائل، دبے ہوئے جذبات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اُس نے اِس بات پر زور دیا کہ بعد کی زندگی میں شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ کم عمری سے صنفی تعلقات قائم کیے جائیں:

> ...Symptoms were caused by early trauma, and were expressions of repressed sexual energy. Devised 'free association' technique and dream interpretation discover repressed experiences. Emphasized importance of infantile sexuality in personality's develpment in later life.

مذکورہ قسم کے نظریات، انسان کے ہوس پرستانہ جذبات کے عین مطابق تھے۔ چناں چہ ان کو آج کی دنیا میں خوب پھیلاؤ حاصل ہوا۔ اِسی کے نتیجے میں اِباحیت پسند سوسائٹی (permissive society) بنی۔ اِسی کے نتیجے میں ''آج'' میں جینے کا نظریہ بنا، جس کو عام طور پر رائٹ ہیئر، رائٹ ناؤ (right here, right now) کہا جاتا ہے۔

اِسی نظریے کے نتیجے میں برہنگی (nudity) ماڈرن کلچر کا حصہ بن گئی۔ ڈوز اینڈ ڈونٹس (do's and don'ts) کا قدیم نظریہ، لوگوں کو بے معنی نظر آنے لگا۔ شراب اور سیکس جیسی چیزوں پر

عائد رکاوٹیں ختم ہوگئیں۔ انسان کے مطالعے کے لیے حیوان کو معیار سمجھ لیا گیا۔ زندگی کا مقصد صرف یہ بن گیا کہ — کماؤ اور عیش کرو۔

پریس میں ایک واقعہ آیا ہے کہ مغربی دنیا کے ایک شخص نے سرجری کے ذریعے اپنی صنف تبدیل کی۔ وہ مرد کے بجائے عورت بن گیا۔ پھر اس نے مرد جوڑے سے تعلقات قائم کیے۔ اُس کو حمل قرار پایا۔ اِس معاملے کو فخر کے ساتھ بتاتے ہوئے، اُس نے کہا کہ — عورت ہونا، یا مرد ہونا، یہ ہمارے اپنے انتخاب کی بات ہے:

Sex is a matter of choice.

یہ قول موجودہ زمانے کے انسان کی ترجمانی کرتا ہے۔ موجودہ زمانے کے انسان کی یہ سوچ بن گئی ہے کہ تمام اخلاقی قدریں اضافی (relative) ہیں، نہ کہ حقیقی (real)۔ کسی نے اعلان کے ساتھ اور کسی نے اعلان کے بغیر یہ مان لیا ہے کہ نیکی اور بدی کا اصول کوئی ابدی اصول نہیں، نیکی اور بدی ہمارے اپنے انتخاب کی چیزیں ہیں:

Virtue and sin both are matter of personal choice, rather than a matter pertaining to good and bad.

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، خالق کے قائم کردہ مارل سپورٹ سسٹم کا رول، انسانی زندگی میں بہت زیادہ اہم تھا۔ وہ انسان کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کی ایک داخلی ضمانت تھا۔ مارل سپورٹ سسٹم، خدا کے تخلیقی پلان کا ایک لازمی حصہ تھا، مگر انسان نے آزادی کے غلط استعمال کو اُس کی آخری حد تک پہنچا دیا۔

خدا نے انسان کی زندگی میں مارل سپورٹ سسٹم کی صورت میں چیک اینڈ بیلنس (check and balance) کا نظام قائم کیا تھا، تا کہ انسان، خدا کے مطلوب معیار کے منمم (minimum) پر قائم رہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں انسان اِس منمم حد پر قائم نہ رہ سکا۔ اِس طرح، اس نے یہ جواز (justification) کھو دیا کہ اس کو موجودہ زمین پر مزید مدت کے لیے باقی رکھا جائے۔

اخلاقی برائی کی آخری صورت

قومِ لوط کا زمانہ چار ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ یہ قوم بحر مُردار (Dead Sea) کے علاقہ میں رہتی تھی۔ پیغمبر کے انذار کے باوجود وہ لوگ خدا کی پکڑ سے بے خوف ہوگئے۔ وہ بڑے پیمانے پر اُسی اخلاقی برائی میں مبتلا ہو گئے جس کو ہم جنسی (Homosexuality) کہا جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں یہ برائی صرف ایک اخلاقی برائی کی حیثیت رکھتی تھی، مگر آج یہ اخلاقی برائی ایک خوب صورت فلسفہ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ دنیا بھر میں تیزی سے اس کا رواج بڑھ رہا ہے، حتی کہ بعض ملکوں میں ہم جنسی کے نکاح کو ایک قانونی نکاح کی حیثیت دے دی گئی ہے۔

نئی دہلی میں ہم جنس گروہ (gay community) بڑی تعداد میں موجود ہے۔ اِس قسم کے تقریباً ایک ہزار افراد نے 29 جون 2008 کو دہلی کی سڑکوں پر اپنا ایک پُرفخر پریڈ (pride parade) نکالا۔ ان کا نعرہ تھا کہ ہم جنسی کو برا سمجھنا، یا اس کے خلاف قانون بنانا، یہ سوشل ڈس کری منیشن (social discrimination) ہے، اس کو بند ہونا چاہیے۔ یہ رپورٹ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (30 جون، 2008) میں حسب ذیل عنوان کے ساتھ چھپی ہے:

Gay pride out on capital's streets, p. 3.

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اِس مظاہرہ کے وقت لوگوں کی طرف سے کسی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اِس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ افراد نے شرم وحیا کو کھو دیا ہے، اور سماج میں اخلاقی ضمیر کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

یورپ اور امریکا اور کینڈا میں یہ موضوع کھلے ڈسکشن کا موضوع بن چکا ہے۔ مختلف یونی ورسٹیوں میں اِس موضوع پر باقاعدہ رسرچ ہو رہی ہے۔ رسرچ کرنے والے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ہم جنسی کا رجحان خود نیچر کے اندر موجود ہے۔ اِس معاملے میں وہ بعض چڑیوں اور بعض کیڑوں (insects) کی مثال دیتے ہیں۔

اِن نام نہاد تحقیقات کے بارے میں کئی کتابیں چھپی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا

نام یہاں درج کیا جاتا ہے:

Biological exuberance: Animal Homosexuality and Natural Diversity, by Bruce Bagemihl (Published in 1999)

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (29 جون، 2008) میں اِس کی رپورٹ تفصیل کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے:

Homosexuality: Nature or Nurture

یہ صرف ایک مغالطہ ہے، نہ کہ کوئی حقیقی رسرچ۔ انسان کے بارے میں سائنٹفک رسرچ وہ ہے جو خود انسان پر کی گئی ہو اور انسان کے حیاتیاتی نظام کے مطالعے سے نتیجہ اخذ کیا گیا ہو۔ مذکورہ رسرچ میں یہ کیا گیا ہے کہ بعض کیڑوں کا مطالعہ کیا گیا اور اِن کیڑوں کی بعض عادات معلوم کرکے ان کو انسان کے اوپر چسپاں کردیا گیا۔ یہ ایک قیاس مع الفارق ہے، اور اِس قسم کا قیاس سائنسی طور پر معتبر نہیں۔

چار ہزار سال پہلے قومِ لوط ٹھیک اِسی عمل میں مبتلا ہوئی تھی۔ جب پیغمبرانہ اِنذار کے باوجود انھوں نے اپنی اس روش کو ترک نہیں کیا، تو اُن پر خدا کی طرف سے ہلاکت خیز عذاب بھیجا گیا۔ اِس کے بعد ہمیشہ کے لیے اُس قوم کا خاتمہ ہوگیا۔ اب یہی عمل مزید اضافے کے ساتھ، ساری دنیا میں پھیل گیا ہے۔ قومِ لوط کا بگاڑ صرف اخلاقی بگاڑ کے ہم معنی تھا، موجودہ زمانے میں یہ اخلاقی بُرائی فلسفیانہ جواز کے تحت کی جارہی ہے۔ اِس طرح، موجودہ زمانے کی برائی، قدیم زمانے کی برائی کے مقابلے میں ہزاروں گنا زیادہ شنیع حیثیت رکھتی ہے۔ مزید یہ کہ قدیم زمانے میں یہ برائی زمین کے صرف ایک محدود رقبے میں پائی جاتی تھی، آج یہ برائی پورے کرۂ ارض میں پھیل گئی ہے۔

یہی وہ صورتِ حال ہے جس کو حدیث میں، قربِ قیامت کے آخری دور کی علامت کے طور پر، اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ویبقیٰ شرار الناس، یتھارجون فیھا تھارُجَ الحُمُر (صحیح مسلم، کتاب الفتن) یعنی اُس وقت صرف برے لوگ دنیا میں باقی رہیں گے جو گدھوں کی طرح بے حیائی کا فعل کریں گے۔

یہ صورتِ حال اپنے آپ میں اِس بات کا ایک اعلان ہے کہ خدا کی پکڑ کا وقت بالکل قریب

آ چکا ہے۔قومِ لوط کے زمانے میں، خدا کا عذاب ایک محدود قیامت کے طور پر آیا تھا، جس کو قرآن میں عذابِ ادنیٰ (32:21) کہا گیا ہے۔ اب یہ عذاب عالمی قیامت کے طور پر آنے والا ہے، جس کو قرآن میں عذابِ اکبر (32:21) کہا گیا تھا۔قومِ لوط نے محدود طور پر اپنے وجود کا جواز (justification) کھو یا تھا، اب انسانیت نے عالمی سطح پر اپنے وجود کا جواز کھو دیا ہے۔

حالات پکار رہے ہیں کہ کاؤنٹ ڈاؤن اب اپنی آخری گنتی تک پہنچ چکا۔ قیامت کا فرشتہ اب ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ جاگنے والو، جاگو۔ دیکھنے والو، دیکھو۔ کان والو، سنو۔ دماغ والو، سوچو۔ آج کا دن تمھارے لیے آخری دن ہے۔ اگر آج تم اپنے اختیار سے ہوش میں نہ آئے تو کل تم کو مجبورانہ طور پر ہوش میں آنا پڑے گا۔ مگر کل ہوش میں آنا، کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

موجودہ دنیا، انسان کو نہ انعام کے طور پر ملی ہے اور نہ کسی استحقاق کے طور پر۔ یہ دنیا خدا نے بنائی ہے، اور خدا نے یہ دنیا انسان کو صرف ایک مقصد کے تحت عطا کی ہے، اور وہ یہ کہ یہاں کے حالات میں رکھ کر یہ دیکھا جائے کہ انسانوں میں سے کون ہے جو مطلوب خدائی معیار پر پورا اترا، تاکہ اس کا انتخاب (selection) کرکے اُس کو ابدی طور پر جنت کی معیاری دنیا میں بسایا جائے اور باقی لوگوں کو رد کرکے ان کو عالمی کوڑاخانے میں ڈال دیا جائے۔

آدم کی پیدائش کے بعد سے اب تک پورے سیارۂ زمین پر یہی عمل جاری رہا ہے۔ اِس دنیا میں انسان کی آبادکاری کا یہی واحد مقصد تھا، اِس کے سوا دوسرا کوئی مقصد نہیں جس کے لیے انسان کو اِس دنیا میں رہنے اور بسنے کا موقع دیا جائے۔

اب انسان کی تاریخ اکیسویں صدی عیسوی میں پہنچ چکی ہے، اور بظاہر حالات بتاتے ہیں کہ اب یہ مقصد آخری حد تک پورا ہوگیا ہے۔ اب انتخاب کا عمل اپنے نقطۂ انتہا (culmination) کو پہنچ چکا ہے۔ اب انتخاب کی اِس فہرست میں مزید کسی اضافے کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

موجودہ زمانے میں جب فطرت کے خزانوں کا انکشاف ہوا، تو اس کے بعد یہ ہونا چاہیے تھا کہ

انسان اوربھی زیادہ اضافے کے ساتھ خدا کا اعتراف کرے، انسان اور زیادہ خدا پرست بن کر خدا کی انتخابی فہرست میں نمایاں جگہ پائے، مگر نتیجہ برعکس صورت میں نکلا۔ انسان سرکشی کے راستے پر چل پڑا۔ اپنی ذمے داریوں کو ادا کرنے کے بجائے، وہ اپنے لیے خود اِسی دنیا میں راحت اور عیش کا محل تعمیر کرنے میں مصروف ہوگیا۔

آج کی دنیا میں لوگوں کی سوچ کیا ہے، اُس کا اگر خلاصہ کیا جائے، تو وہ صرف ایک ہے— آج اور صرف آج (right here, right now) یعنی کل کو نظر انداز کرکے صرف آج میں جینا، اور آج کی دنیا میں خوشی اور راحت کی زندگی حاصل کرنا، کیوں کہ اس کے آگے کچھ اور نہیں۔ یہی آج کی دنیا میں ہر عورت اور مرد کا کلمہ ہے، خواہ اس نے لفظوں میں اس کا اعلان کیا ہو، یا اس نے لفظوں میں اس کا اعلان نہ کیا ہو۔ اِس طرح، موجودہ زمانے میں پہلی بار میٹیریل ازم نے نظریاتی طور پر ایک مبرَّر میٹریل ازم (ideologically justified materialism) کی صورت اختیار کرلی ہے۔ یہ بلاشبہہ بُرائی کا آخری درجہ ہے، اِس کے آگے برائی کا کوئی اور درجہ نہیں ہوسکتا۔

یہ صورتِ حال سرتاسر خدا کے تخلیقی پلان کے خلاف ہے۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان نے اب اِس کا حق کھو دیا ہے کہ اُس کو موجودہ زمین پر مزید بسنے اور آباد رہنے کا موقع دیا جائے۔ مسیح کے الفاظ میں— کسان درانتی اٹھاتا ہے، کیوں کہ کاٹنے کا وقت آپہنچا۔

بیسویں صدی عیسوی کے رُبع آخر میں خدا کے اِس فیصلے کی علامتیں ظاہر ہونا شروع ہوئیں، اور اکیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی ایسے آثار ظاہر ہونے لگے جو یہ بتاتے تھے کہ اب انسان کے لیے بالکل آخری وقت آپہنچا ہے، اب اُس کو مزید مہلت ملنے والی نہیں۔

جون 2008 میں، جب یہ سطریں لکھی جارہی ہیں، انسانی تاریخ کے خاتمہ کی یہ علامت ایک مسلّمہ سائنسی واقعہ کی حیثیت اختیار کرکے روزانہ کی ایک خبر بن چکی ہے۔ آپ ہر دن میڈیا میں اِس سے متعلق کوئی نہ کوئی خبر پاسکتے ہیں۔

یہاں اِس نوعیت کی ایک تازہ سائنسی خبر درج کی جاتی ہے۔ امریکا کے مشہور سائنسی ادارہ

ناسا(NASA) کے ممتاز سائنس داں جیمس ہانسین (James Hansen) نے بیس سال پہلے سائنسی مطالعے کے بعد گلوبل وارمنگ کے سنگین خطرے کا اعلان کیا تھا۔ اب انھوں نے مزید تحقیق کے بعد دوبارہ سائنسی مطالعے کے بعد گلوبل وارمنگ کے سنگین خطرے کا اعلان کیا ہے۔

اب انھوں نے مزید تحقیق کے بعد دوبارہ بتایا ہے کہ — حالات اتنے زیادہ خراب ہو چکے ہیں کہ دنیا کے لیے واحد امید یہ ہے کہ ذمے داروں کی طرف سے نہایت سخت قسم کے انقلابی اقدامات کیے جائیں۔ دنیا بہت پہلے، خطرے کی حد کو پار کر چکی ہے۔ ضرورت ہے کہ مضر گیسوں کو 1988 کی حد پر دوبارہ واپس لے جایا جائے۔ زمین کی فضا میں انسانی ساخت کے کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ اگر مزید بیس سال تک یہ جاری رہے، تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ انسان کا وجود ہی سرے سے مٹ جائے گا۔ یہ ہمارے لیے بالکل آخری موقع ہے:

NASA warming expert says this is the last chance

Washington: Exactly 20 years after warning America about global warming, a top NASA scientist said the situation has gotten so bad that the world's only hope is drastic action. James Hansen told Congress that the world has long passed the "dangerous level" for greenhouse gases in the atmosphere and needs to get back to 1988 levels. He said Earth's atmosphere can only stay this loaded with man-made carbon dioxide for a couple more decades without changes such as mass extinction, ecosystem collapse and dramatic sea level rises. "We're toast if we do't go on a very different path," Hansen, director of the Goddard Institute of Space Sciences who is sometimes called the godfather of global warming science said. "This is the last chance". Hansen brought global warming home to the public in June 1988 during a US heat wave. Hansen said that in five to 10 years, the Arctic will be free of sea ice in the summer. (The Times of India, New Delhi, June 25, p. 38)

موجودہ زمانے میں جس چیز کو گلوبل وارمنگ (global warming) کہا جاتا ہے، وہ دراصل

گلوبل وارننگ (global warning) ہے۔ یہ خالقِ کائنات کی طرف سے، اِس بات کا اعلان ہے کہ انسانی تاریخ کے خاتمے کا وقت بالکل قریب آپہنچا۔ جلد سے جلد جنت کی خدائی فہرست میں اپنا نام درج کرادو، کیوں کہ بہت جلد وہ لمحہ آنے والا ہے، جب کہ اِس کا موقع آخری طور پر ختم ہوجائے گا۔

حالات بتاتے ہیں کہ انسان موجودہ زمین پر اب اپنی مزید آبادکاری کا جواز (justification) کھو چکا ہے۔ اب خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، بہت جلد انسانی تاریخ کا اگلا دور شروع ہونے والا ہے، جب کہ منتخب لوگوں کو ابدی جنت میں بسا دیا جائے، اور بقیہ لوگوں کو رد (reject) کرکے اُنھیں حسرت کے صحرا میں ابدی طور پر ذلت اور محرومی کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

رائٹ ہیئر، رائٹ ناؤ کا فارمولا عام طور پر، قبل از موت زندگی (pre-death period of life) کی تعمیر کے لیے بولا جاتا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ''رائٹ ہیئر، رائٹ ناؤ'' کا فارمولا بعد از موت زندگی (post-death period of life) کی تعمیر کے لیے استعمال کیا جائے، یعنی ''رائٹ ہیر، رائٹ ناؤ'' کا مطلب مستقبل کی تیاری ہونا چاہیے، نہ کہ حال کا وقتی انجوائے مینٹ۔

واقعات بتاتے ہیں کہ اب انسانی تاریخ کے خاتمے کا وقت بالکل قریب آچکا ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ انسان جاگے اور اپنے باقی ماندہ وقت کو اگلے مرحلۂ حیات (post-death period) کی تیاری میں لگا دے۔ بہت جلد وہ لمحہ آنے والا ہے، جب کہ انسان کے پاس نہ کچھ کرنے کا وقت ہوگا اور نہ تلافیٔ مافات کے لیے پیچھے لوٹنے کا وقت۔

تاریخِ انسانی کا خاتمہ

12 اگست 2012 کو امریکا کی ایک خبر تمام اخباروں میں نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ وہ خبر یہ تھی کہ ایک امریکی صحافی کو نظریاتی سرقہ (plagiarism) کا مرتکب پایا گیا اور اِس بنا پر اس کو اس کے صحافتی جاب سے فوری طور پر معطل کردیا گیا۔ اس خبر کی سرخی یہ تھی:

American journalist suspended for plagiarism.

نظریاتی سرقہ (plagiarism) کیا ہے، وہ دراصل کسی شخص کی فکری پراپرٹی (intellectual property) کا سرقہ کرنے کا نام ہے۔ نظریاتی سرقہ یہ ہے کہ کسی شخص کے آئڈیا کو اصل مصنف کے حوالے کے بغیر اپنا بنا کر نقل کیا جائے:

Plagiarism: Copying someone's idea without crediting the original author. *(Merriam-Webster Dictionary)*

یہ معاملہ امریکا کے مشہور صحافی مسٹر فرید زکریا کا ہے۔ وہ امریکی میگزین ٹائم (Time) کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے ٹائم کے شمارہ 20 اگست 2012 میں اپنا ایک مضمون گن کلچر کے موضوع پر شائع کیا۔ اِس کا عنوان یہ تھا: The Case for Gun Control

اِس مضمون میں انھوں نے ایک پیراگراف شامل کیا تھا جو پورا کا پورا، ایک اور شائع شدہ مضمون سے لیا گیا تھا۔ یہ دوسرا مضمون امریکا کی ایل (Yale) یونی ورسٹی کی ایک خاتون پروفیسر جل لیپور (Jill Lepore) کا تھا، جس کو مسٹر فرید زکریا نے بلاحوالہ اپنے مضمون میں شامل کرلیا تھا۔ یہ مضمون امریکا کے ایک اخبار نیو یارکر *(The New Yorker)* کے شمارہ 22 اپریل 2012 میں اس عنوان کے تحت چھپا تھا— Battleground America

نظریاتی سرقہ کا یہ واقعہ جو عالمی میڈیا میں آیا ہے، وہ کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ وہ دراصل اِس قسم کے ایک زیادہ بڑے سرقہ (super plagiarism) کے لیے ایک یاددہانی (reminder) کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک انسان کی برخاستگی کے حوالے سے یہ یاد دلا رہا ہے کہ شاید وہ وقت

آ گیا ہے جب کہ کائنات کا مالک پوری تہذیب کو برخاست کر دے۔

سترھویں صدی عیسوی سے پہلے دنیا میں روایتی دور قائم تھا۔ اس کے بعد دنیا میں سائنٹفک دور کا آغاز ہوا۔ سائنٹفک دور سے مراد وہ دور ہے جب کہ انسان نے نیچر (nature) پر آزادانہ غور وفکر شروع کیا۔ اِس غور وفکر کے بعد یہ ہوا کہ نیچر میں چھپے قوانین ایک کے بعد ایک دریافت ہونے لگے۔ مثلاً پانی میں اسٹیم پاور کی دریافت، اور مادّہ (matter) میں بجلی (electricity) کی دریافت، وغیرہ۔ جدید دنیا، خاص طور پر مغربی دنیا میں کئی سو سال تک اِس موضوع پر رسرچ جاری رہی، یہاں تک کہ فطرت میں چھپے ہوئے ہزاروں قوانین دریافت ہوگئے۔ اِن کے ذریعے ایک نئی ٹکنالوجی بنی اور بہت سے نئے فنی علوم وجود میں آئے۔ وہ ظاہرہ جس کو جدید مغربی تہذیب کہا جاتا ہے، اس کی تشکیل تمام تر انھیں دریافت کردہ قوانین فطرت پر مبنی ہے۔

یہ قوانین جو موجودہ زمانے میں معمارانِ تہذیب نے دریافت کیے، اُن کو سائنسی قوانین (scientific laws) کہا جاتا ہے۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، یہ سائنسی قوانین نہیں ہیں، بلکہ وہ خدائی قوانین (divine laws) ہیں۔ خدائی قوانین کو نظامِ فطرت سے لینا اور اُن کو سائنس قوانین کے نام پر اپنا بنا کر پیش کرنا، یہ بلاشبہہ ایک سپر سرقہ (super plagiarism) کا کیس ہے۔ تہذیب جدید کے معماروں کا یہ واقعہ بھی بلاشبہہ اِسی قسم کا ایک سرقہ ہے۔ امریکی صحافی کا سرقہ اگر جرنلسٹک سرقہ (journalistic plagiarism) تھا تو معمارانِ تہذیب کا سرقہ سائنٹفک سرقہ (scientific plagiarism) ہے۔ امریکی صحافی نے تو صرف اپنے ایک آرٹکل میں نظریاتی سرقہ کا ارتکاب کیا تھا، جب کہ مغربی تہذیب کا پورا کا پورا ڈیولپمنٹ اِسی قسم کے عظیم تر نظریاتی سرقہ کی بنا پر ہوا ہے۔ امریکی جرنلسٹ کا سرقہ اگر صرف ایک انفرادی سرقہ تھا تو مغربی تہذیب کا سرقہ اس کے مقابلے میں ایک عالمی سرقہ (global plagiarism) کی حیثیت رکھتا ہے۔

دنیا سے انسان کی بے دخلی

تہذیب کی ترقی کے نام پر مذکورہ سائنسی سرقہ کئی سو سال سے بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں

جاری ہے، مگر اِس مدت میں اہلِ تہذیب کے درمیان کوئی شخص نہیں اٹھا جو یہ اعلان کرے کہ یہ تمام تہذیبی ترقیاں خدائی قوانین (divine laws) کی بنا پر ممکن ہوئی ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ ہم کھلے طور پر اِس حقیقت کا اعتراف کرلیں۔ بے اعترافی کا یہ معاملہ اب اپنی آخری حد پر پہنچ چکا ہے۔ اب آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے، جب کہ کائنات کا خالق انسان کو زمین کے چارج سے بے دخل کردے اور زمین کا اور پوری دنیا کا نظام حقیقتِ واقعہ کی بنیاد پر قائم کرے۔

دنیا کا یہ انجام پیشگی طور پر مقدر تھا۔ خدا نے پیشگی طور پر یہ اعلان کردیا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب کہ انسان کو زمین کے چارج سے بے دخل کردیا جائے اور دنیا کا نیا نظام بنایا جائے۔ اِس سلسلے میں قرآن کا ایک بیان یہ ہے: وَمَا قَدَرُوا اللهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۚ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (39:67)۔

اِس آیت میں 'قدر' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قدر کا مطلب ہے اندازہ کرنا، یعنی انسان جو کچھ دنیا میں کررہا ہے، وہ اِس لیے کررہا ہے کہ اس نے خالق کا کم تر اندازہ (under-estimation) کررکھا ہے۔ یہ کم تر اندازہ کیا ہے، اِس کم تر اندازہ کو قرآن کی ایک آیت میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (23:115) یعنی کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے۔

اس سلسلے میں حدیث کی کتابوں میں ایک روایت آئی ہے۔ یہ روایت قرآن کی مذکورہ آیت (وما قدروا اللہ حق قدرہ) کی مزید تشریح کرتی ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: عن ابن عمر أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قرأ هذه الآية ذات يوم على المنبر "وما قدروا الله حق قدره، والأرض جميعاً قبضته يوم القيامة والسماوات مطويات بيمينه، سبحانه وتعالى عما يشركون" ورسول الله صلى الله عليه وسلم يقول هكذا بيده ويحركها يقبل بها ويدبر يمجد الرب نعته: أنا الجبار، أنا المتكبر، أنا الملك، أنا العزيز، أنا الكريم، فرجف برسول الله صلى الله عليه وسلم المنبر حتى قلنا ليخرن به (السلسلة الصحيحة، 7/596) یعنی عبد اللہ بن عمر بیان

کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ممبر کے اوپر قرآن کی مذکورہ آیت پڑھی۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے کہا کہ اللہ اپنی تمجید کرے گا اور کہے گا کہ میں ہوں جبار، میں ہوں متکبر، میں ہوں بادشاہ، میں ہوں زبردست، میں ہوں کریم۔ کہاں ہیں زمین کے بادشاہ، کہاں ہیں جبار، کہاں ہیں متکبر۔ یہ کہتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لرزہ طاری ہوا، یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ شاید آپ گر پڑیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے جب کہ خالقِ کائنات ظاہر ہو اور براہِ راست طور پر دنیا کا چارج لے لے۔ اسباب کے اعتبار سے، یہ کہنا درست ہوگا کہ قرآن میں جس آنے والے وقت کی پیشین گوئی کی گئی تھی، وہ وقت بالفعل آچکا ہے، اُس وقت کے آنے میں اب کوئی دیر نہیں۔

لائف سپورٹ سسٹم کی تباہی

دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے انسان کو بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔ مثلاً پانی، روشنی، آکسیجن، نباتات، وغیرہ۔ اِن چیزوں کے مجموعے کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے، یعنی معاونِ حیات نظام۔ سائنس کی تحقیقات بتاتی ہیں کہ زمین پر یہ معاونِ حیات نظام خطرناک حد تک بگڑ گیا ہے، سائنس داں برابر یہ انتباہ دے رہے ہیں کہ زمین پر انسان کی آبادکاری بہت جلد ناممکن ہو جائے گی، یہاں تک کہ مشہور برٹش سائنس داں اسٹفن ہاکنگ نے اِس صورت حال کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم کو اب خلائی بستیاں (space colonies) بنانا چاہیے، حالاں کہ اسٹفن ہاکنگ اور دوسرے تمام لوگ جانتے ہیں کہ یہ تجویز عملاً ممکن نہیں۔

زمین کا وہ حصہ جس کو آرکٹک (Arctic) کہا جاتا ہے، یہ برف کے بہت بڑے پہاڑ کی مانند ہے جو کئی ہزار مربع میٹر کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ برفانی پہاڑ زمین پر موسم کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ آرکٹک (قطب شمالی) کا یہ منطقہ مختلف پہلوؤں سے زمین پر انسان کی آبادی کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ مگر بیسویں صدی کے ربع آخر میں، جب سے گلوبل وارمنگ کے ظاہرے نے شدت اختیار کی ہے، قطب شمالی کی یہ برف بہت تیزی سے پگھل رہی ہے۔

سائنس دانوں کے اندازے کے مطابق، شاید اندیشہ ہے کہ اگلے 10 برسوں میں یہ پورا برفانی پہاڑ پگھل کر سمندروں میں چلا جائے۔ اِس کی بنا پر مختلف قسم کے خطرناک نتائج پیدا ہوں گے جو زمین کو انسان کے لیے ناقابلِ رہائش بنا دیں گے۔اس سائنسی تحقیق کا خلاصہ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (14 اگست 2012) میں حسب ذیل عنوان کے تحت شائع ہوا ہے:

Arctic Sea Ice May Vanish in 10 Years (p. 19)

خلاصہ کلام

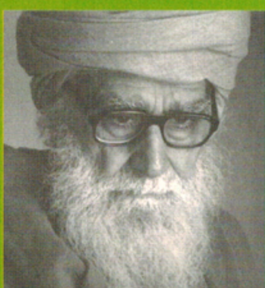
اوپر جو کچھ لکھا گیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان نے اُس نوعیت کا ایک بہت بڑا واقعہ کیا ہے جس کو نظریاتی سرقہ کہا جاتا ہے۔ وہ چیز جس کو جدید تہذیب کہا جاتا ہے، وہ پوری کی پوری اِسی جرم کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔اِس جرم میں موجودہ زمانے کی پوری آبادی شریک ہے۔جن لوگوں نے اِس تہذیب کو وجود دیا، وہ اِس جرم میں براہِ راست طور پر شریک ہیں، اور بقیہ لوگ جو تہذیب کے اِس جرم پر نکیر (denial) کیے بغیر اُس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، وہ بالواسطہ طور پر اِس جرم میں شریک ہیں۔

اِس نظریاتی سرقہ (plagiarism) کے خلاف خالق کی کارروائی اب مستقبل بعید کی چیز نہیں رہی۔ یہ کارروائی اب عملاً شروع ہوچکی ہے۔ اِس کارروائی کو ایک لفظ میں اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ خالق نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ انسان کو مذکورہ جرم کی بنا پر زمین سے بے دخل کر دیا جائے۔ خالق کا یہ فیصلہ لائف سپورٹ سسٹم کے خاتمے کی صورت میں بتدریج ظاہر ہو رہا ہے۔ بظاہر وہ وقت بہت قریب آچکا ہے جس کی پیشین گوئی قرآن کی مختلف آیتوں میں کی جاچکی تھی۔

اظہارِ دین

عصری اسلوب میں اسلام کا علمی اور فکری مطالعہ

دورِ حاضر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، دورِ اسلام ہے۔ دورِ حاضر کی علمی ترقیوں نے اسلام کی عالمی اہمیت کو ازسرِ نو واضح کیا ہے۔ سائنس اسلام کا علمِ کلام ہے۔ دورِ جدید کو ایک آئڈیالوجی کی ضرورت ہے۔ اسلام اِسی آئڈیالوجی کا دوسرا نام ہے۔ روحِ عصر سب سے زیادہ جس چیز کی طالب ہے، وہ بلاشبہہ دینِ اسلام ہے۔ اسلام اپنے نظریے کے اعتبار سے، مبنی بر توحید دین ہے اور اپنے طریقِ کار کے اعتبار سے، مبنی بر امن دین — عصری اسلوب میں اسلام کے اِن تمام پہلوؤں کو جاننے کے لیے 'اظہارِ دین' کا مطالعہ کیجئے۔



www.goodwordbooks.com

ISBN 978-81-7898-976-1

9 788178 989761

₹ 200

Goodword

e-book available